مداری

احمد اقبال

1

یہ کہانی وطن کے پُرآشوب حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔

آساتھ مرے اور دیکھ ذرا جس دنیا میں تُو رہتا ہے
یہ دنیا اک تماشا ہے اور سب انسان مداری ہیں

کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، کیا کیا کھیل دکھاتے ہیں
یہ لیڈر، ووٹر، پیر مُرید، شاگرد اُستاد مداری ہیں

آدیکھ مری آنکھوں سے انہیں، ان سب کے ہاتھ میں جھُرلو ہے
یہ قوم کے خادم، دانشور، فن کار، وزیر مداری ہیں

ان چہرہ بدلنے والوں کو ایمان اصول وفا سے کیا
یہ ڈاکو تاجر، چور افسر، عاشق معشوق مداری ہیں

آئین، الیکشن، یو این او، انصاف، حقوقِ انسانی
اے بچہ جمہورا یہ باتیں جو کرتے ہیں وہ مداری ہیں

احمد اقبال

Rs.60/-

ISBN 969-517-084-6

وطن عزیز کے پرآشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

پہلا حصہ

احمد اقبال

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰-عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴

بار اوّل ——— ۲۰۰۲ء
مطبع ——— یوایندمی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور

پیش لفظ

تمام عمر یہ عادت سی تھی کہ کسی بھی کتاب سے پہلے اس کا پیش لفظ پڑھا جائے۔ اس کے باوجود آج اپنی تحریر کے حوالے سے خود اپنے لئے کوئی پیش لفظ ترتیب دینا میرے لئے ایک مشکل مرحلہ بن گیا ہے۔ اگر میں خودستائی کے فن سے آشنا ہوتا تو شاید یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ میں پیش لفظ کسی سے لکھوا بھی سکتا تھا۔ میرے کچھ دوست ایسے بامروت اور فراخ دل لوگ ہیں۔ مستند ہے جن کا فرمایا ہوا۔ وہ خیال خاطر احباب رکھتے ہوئے میری تعریف و توصیف میں اتنا لکھ دیتے کہ بعد میں خود مجھے خوشی سے زیادہ شرمندگی ہوتی لیکن بات پھر بھی نہ بنتی کیونکہ جتنی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا مجھے تھی شاید اس سے کہیں زیادہ میں پہلے ہی وصول کر چکا ہوں۔ پڑھنے والوں کی نگاہ انتخاب نے مجھے اتنی عزت عطا کی کہ ذرے کو آفتاب کیا۔ وگرنہ من ہمیں خاکم کہ ہستم۔

اگر میں اپنی داستان کی تعریف کروں تو اس سے داستان نہیں بدلے گی۔ داستان کے حسن و قبح کے حق میں آخری فیصلہ بہرحال خود پڑھنے والا ہی کر سکتا ہے۔ زیب داستان کے لئے میری مدح سرائی پھر وہی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی فضول کوشش شمار ہوگی۔ زندگی کے اس دور میں جب میں لکھتا نہیں تھا صرف پڑھتا تھا تو خود میرے لئے ہر مصنف کی ذات کا نقش خیال ایک پرکشش پراسراریت کی دھند میں معلق رہتا تھا جس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش ہر تحریر کو پڑھنے کے بعد دوچند ہو جاتی تھی۔ آج جب میں زبردستی (اور بزعم خود) مصنفوں کی صف میں شامل ہو گیا ہوں یا کر دیا گیا ہوں تو یہ سوال از خود میرے ذہن میں آتا ہے کہ کیا میری کہانیاں پڑھنے والے بھی میری کہانی پڑھنا چاہتے ہیں۔

میں فرض کر لیتا ہوں کہ اس سوال کا جواب ہاں میں ہے اور آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ اے ہم نفسو' نام تو میرا اقبال احمد خاں تھا پھر میں احمد اقبال کیسے ہو گیا۔ اگر کہیں لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کیسے لکھتے ہیں تو جواب میں مجھے بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اس سے بھی مشکل سوال شاید یہ ہو سکتا ہے جو لوگ اخلاقاً مجھ سے نہیں پوچھتے کہ آخر آپ کیوں لکھتے ہیں اور لاجواب ہو کے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ پاتا کہ جناب میں کہاں لکھتا ہوں۔ میرا قلم لکھتا ہے۔ رہی بات کیوں کی تو آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔ کہانی میرے خیال میں جنم لیتی ہے۔ تصور میں پرورش پاتی ہے اور میں اسے الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اگر آپ اسے فن اور قابل تعریف سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی مرضی۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔

یہ سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا۔ اس ضمن میں بھی مجھے یہی عرض کرنا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کہا۔ جو ہر تھا اس خاک میں تھا جس سے میرا خمیر اٹھا۔ میری سرشت کے تارو پود میں تھا اور میری ذات کے عناصر میں تھا چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں داستان گوئی اور قصہ خوانی کے سوا کوئی پیشہ اختیار کرتا۔ والد مرحوم' اللہ ان کی مغفرت کرے چشتی احمد خاں کے بجائے شمیم نعمانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بلحاظ پیشہ صدر مدرس تھے لیکن خود یکتائے روزگار شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ عربی اور فارسی کے عالم تھے اور اپنے عہد کی جید و سید ادبی شخصیات علامہ نیاز فتح

پوری (مدیر نگار) شاہد احمد دہلوی (مدیر ساقی) حافظ محمد عالم (مدیر عالمگیر) اور حکیم محمد یوسف حسن (مدیر نیرنگ خیال) جیسے لوگوں کے ساتھ نشست و برخواست رکھتے تھے۔ انہوں نے اوائل عمر سے ہی میرے ادبی ذوق کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا اور میں نے خود انہی کے نقش قدم پر اپنی غزل کی راہ بنائی۔

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ ابتدائی تعلیم میں نے راولپنڈی کے سی بی ہائی اسکول میں پائی جہاں ایک سابق ہیڈ ماسٹر منشی ترلوک چند محروم بھی تھے۔ ان کی نظم "مزار نور جہاں" میٹرک کے اردو نصاب میں شامل رہی۔ اس کا ایک شعر مجھے آج بھی یاد ہے۔ دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے کہتے ہیں یہ آرام گہ نور جہاں ہے۔ انٹر میں نے گورڈن کالج راولپنڈی سے کیا جہاں مجھے پروفیسر خواجہ مسعود اور قدرت اللہ فاطمی جیسے اساتذہ میسر آئے۔ بی اے میں نے پشاور کے ایڈورڈز کالج جیسی تاریخی درس گاہ سے کیا۔ یہ سو سالہ روایات کے امین وہ تعلیمی ادارے تھے جہاں نصابی تعلیم سے زیادہ شخصیت کی تعمیر پر توجہ دی جاتی تھی اور اساتذہ خود اپنے قول و فعل سے طلبا کے سامنے قابل تقلید مثال قائم کرتے تھے۔

اس ماحول نے میری صلاحیت کو جلا بخشی اور اسی دور سے میں نے لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ ایک فطری رجحان کے باعث شاعری سے بھی شوق کیا مگر میرے اندر کا داستان گو ایک ڈراما رائٹر کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔ یہ ٹیلی وژن کی رونمائی سے پہلے ریڈیو کا سنہرا دور تھا۔ میں نے ریڈیو پاکستان کے لئے متعدد ڈرامے تحریر کئے جو پشاور اور راولپنڈی سے نشر ہو کے مقبول بھی ہوئے لیکن پھر مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ ریڈیو کسی فنکار کا پیٹ تو خیر نہیں بھر سکتا لیکن وہاں کاروباری ماحول اس کی عزت نفس اور تخلیقی انا کے سارے تصورات کو خاک میں ضرور ملا سکتا ہے۔ بعد میں یہی بات ٹی وی کے ماحول پر بھی صادق آئی۔ میں نے ٹی وی کے لئے طویل دورانیے کے کھیل اور سیریل بھی لکھے مگر برائے نام معاوضے کے لئے کسی پروڈیوسر کے دربار کا خوشامدی مصاحب ہونا میری طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ درمیان میں تیرہ سال کا وقفہ میری زندگی کے ایک تاریک دور کی طرح گزرا جب میں نے آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس جوائن کر کے سرکاری غلامی کے سوا کچھ نہیں کیا اور اس کے عوض مشاہرے کے علاوہ خود کو یور موسٹ اوبیڈینٹ سرونٹ لکھنے کا احساس کمتری پایا۔

اس عذاب سے میری نجات سن اکاسی میں ہوئی جب ڈائجسٹوں نے مجھے سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے روزگار کے باعزت اور تخلیق کے حوصلہ افزا مواقع فراہم کئے۔ تحریر و تصنیف کا یہ سفر گزشتہ تیس برسوں پر محیط ہے اور اس میں مجھے جو تھوڑا بہت نشانِ منزل ملا ہے اس کے لئے میں سب سے زیادہ اردو ادب کے روشن افق پر درخشاں ستارے کا شکر گزار ہوں جن کی تخلیقات نے مجھے ذوق سلیم آگہی اور شعور عطا کیا۔ میں نے جو سیکھا اپنے ہر پیش رو سے سیکھا۔

میں زاہدہ حنا کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے سب سے پہلے میری صلاحیت اور میرے فن کو تسلیم کیا اور مجھے حوصلہ دیا کہ میں سرکاری غلامی چھوڑ سکوں۔ میں شکیل عادل زادہ کا ممنون ہوں جنہوں نے اقبال احمد خاں کے نام کو احمد اقبال کی سند قبولیت پانے میں معاونت کی اور میں جناب معراج رسول کا ازحد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی روش بندہ پروری اور حوصلہ افزائی سے میرے نئے کامیابی کے سفر میں ہر مشکل کو آسان کیا لیکن سب سے زیادہ شکریہ مجھے اپنے ان لاکھوں قارئین کا ادا کرنا ہے جنہوں نے اپنی بے پایاں تحسین اور عنایت سے مجھے سرخرو کیا۔

احمد اقبال

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کرتے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے رول کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اس خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچے جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

اپنی قبر پر فاتحہ خوانی اور دعائے مغفرت کا موقع مجھے کل رات ملا۔

موت کو مردانہ وار گلے لگانے کے ایک ہفتے بعد۔

مجھے اس دنیا سے اسی طرح رخصت کیا گیا تھا جیسے کبھی آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس جہاں سے میری دائمی جلاوطنی کا حکم صادر کرنے والے (نعوذباللہ) خدا نہ تھے۔ وہ بھی میرے جیسے ہی یا شاید مجھ سے بھی بڑھ کر گنہ گار فانی انسان تھے۔

ایک ہفتے تک میرے مزار پر حاضری دینے والے عقیدت مندوں کا زبردست ازدحام رہا۔ اس ہجوم میں دھکے کھانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے مفصل رپورٹ ہر رات ایک وڈیو فلم سے مل جاتی تھی۔ میں دیکھ لیتا تھا کہ عوام و خواص کا جذباتی ردعمل کیسا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی مقبولیت کے جو اندازے میں نے زندگی میں قائم کیے تھے وہ کچھ غلط ہو گئے تھے۔ عوام میں میں اپنی توقعات سے بڑھ کر مقبول تھا اور لوگ مجھے اس سے زیادہ چاہتے تھے جتنا میرا خیال تھا۔

یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات تھی۔

خواص کی اکثریت کے بارے میں نہ مجھے اپنی زندگی میں کوئی خوش فہمی تھی اور نہ مر جانے کے بعد میری کوئی غلط فہمی سامنے آئی۔ انہوں نے پرانے بیانات دہرا دیئے۔ یہ بیانات ان کے پی آر او... یا سیکریٹری لکھتے تھے۔ الفاظ کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ صرف نام بدل کے یہ بیان اخبارات کو جاری کر دیا جاتا تھا۔ ایسے ریڈی میڈ تعزیتی پیغامات تو آپ کو بھی ازبر ہوں گے جن میں صدر مملکت سے لے کر سیاسی پیروں اور وڈیروں سے لیڈروں تک سب فرماتے ہیں کہ مرحوم کی وفات ملک اور قوم کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ خدا سے سفارش کرتے ہیں کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور مرحوم کے لواحقین کو طرزاً خبردار کرتے ہیں کہ وہ صبر سے کام لیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

میں نے وفات پائی یا عالم فانی سے عالم جاودانی کی جانب رحلت فرمائی۔ میں جہنم رسید ہوا یا منصب شہادت پر فائز ہو کے سرخرو ہوا، یہ سب الفاظ کی بازی گری ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ جو شاہ عالم تھا، وہ اب نہیں رہا۔ چنانچہ اس کے اعمال پر جزا یا سزا کا اختیار صرف داورِ محشر کے پاس ہے۔

میرے حریف اور دشمن.... اور کل کے کچھ دوست بھی، خوشی سے بغلیں بجاتے پھر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہیں کہ مر گیا مردود، کیسی فاتحہ کہاں کا درود۔ لو منہ میٹھا کرو۔

اس کے برعکس میرے مخلص دوست اور عزیزہ ساتھی اور دل زدہ عقیدت مند اپنے انتقامی جذبات کی خاموش آگ میں بے بسی

کرنے کے لیے وہ ٹھنڈی سانس لے کر یہ شعر پڑھ سکتے ہیں کہ۔ موت سے کس کو رستگاری ہے' آج ہم کل تمہاری باری ہے۔ یہ خبریں تو آپ نے بھی پڑھی ہوں گی کہ جب کچھ لوگوں نے مٹھائی تقسیم کی تو اس سے اشتعال پھیلا پھر خون خرابا ہوا۔ دو اسپتال پہنچ کے مر گئے۔ دو پھانسی چڑھ جائیں گے' رہے نام اللہ کا!

کچھ نام سیاسی اور معاشرتی حلقوں میں خاصے معتبر اور قابلِ احترام ہیں۔ خود مجھے ان سے منافقت کی امید نہ تھی مگر شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے جو بیانات دیئے وہ میرے لیے بھی حیران کن تھے اور دنیا کے لیے بھی۔ دو کو میں نے وڈیو فلم میں دیکھا۔ اپنے سابقہ رویئے پر نادم ہوئے بغیر انہوں نے کیمروں کی فلیش لائٹس میں اداس نظر آنے کی پوری کوشش کی اور اپنے حسنِ اخلاق کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے میرے حق میں دعائے مغفرت فرمائی۔ اب ان کے حاشیہ بردار کالم نویس ان کی شخصیت کا امیج ابھارنے کے لیے اپنا زورِ قلم صرف کردیں گے۔ اس پر میرے خاص معتمد چراغ پا ہیں لیکن یہ میری جانشینی کی جنگ ہے اور لاشوں کی سیاست کا یہی چلن ہے۔

ابھی میری قبر پر کوئی کتبہ بھی نصب نہیں کیا گیا ہے جس پر میری تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات درج ہو۔ اصل مسئلہ تاریخِ پیدائش کا ہے جو خود مجھے معلوم نہیں تھی۔ اب مزار کمیشن نے اس پر تحقیق کے لیے ایک کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔ مزار کمیشن کے سامنے بہت بڑا کام ہے۔ اس میں بڑے بڑے لوگ شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں کوئی بہت بڑا آفس چاہیے جو ان کے اور میرے لیے شایانِ شان ہو۔ سرِدست ایسی کوئی عمارت دستیاب نہیں چنانچہ پچاس کروڑ روپے سے (یہ ابتدائی تخمینہ ہے) شاہ عالم شہید اکیڈمی قائم کرنے کی تجویز بھی زیرِ غور ہے۔ اس سے بھی بہتوں کا بھلا ہوگا۔

اپنی قبر تک پہنچنے کے لیے میں نے اپنی چم چم کرتی سیاہ مرسیڈیز' لوئن کلر بجھیر دیا اسپورٹس ریڈ "بی ایم ڈبلیو" نہیں نکالی۔ میں نے سفید رنگ کی اس مختصر اور ہلکی پھلکی کار میں اسلام آباد لاہور ہائی وے پر سفر کیا جو آج کل ہرایرے غیرے نتھو خیرے کے پاس ہے۔ دراصل میں کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ کہاں ہائی وے چھوڑ کے مجھے بائیں جانب کچے علاقے میں دس کلومیٹر اندر جانا ہوگا۔ کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرنے والے اس راستے پر بالکل نئے ماڈل کی ایک شاندار کرولا نے مجھے اوورٹیک کیا اور اپنے پیچھے گرد و غبار کا بادل چھوڑتی ہوئی تاریکی میں گم ہوگئی۔ اس کی ٹیل لائٹس اندھیرے میں دو سرخ آتشیں آنکھوں کی طرح مجھے دیر تک گھورتی رہیں۔

میں نے اتفاق سے اس کا نمبر دیکھ لیا تھا۔ یہ سرکاری گاڑی [illegible] پلیٹ پر دس عربی ہندسے ہی ظاہر کرتے تھے کہ وہ گاڑی کسی وی آئی پی کی ہوگی مگر بہت سوچنے پر بھی مجھے یاد نہ آیا کہ یہ کار کس کی تھی۔

اس دھول بھرے راستے پر میں اکیلا نہیں تھا۔ واپس جانے والی تین کاریں میرے قریب سے گزر گئیں۔ وہ عام قسم کی پرانی کاریں تھیں مگر میں پرانے لوگوں کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ بیک ویو مرر میں مجھے کافی پیچھے ایک اور گاڑی بھی نظر آرہی تھی۔ میں اب اپنے مزار سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں اندھیرے جنگل میں سیکڑوں بلب' ٹیوب لائٹس اور مرکری لیمپ روشن تھے۔

میری تدفین کے لیے اس دور افتادہ مقام کا انتخاب کرنے والے بھی وہی تھے جن کو زبانِ خلق پُرخوف سرگوشی میں میرے قتل کا ذمے دار قرار دیتی تھی۔ نہ میں نے کوئی وصیت کی تھی کہ مجھے یہاں دفنایا جائے اور نہ میرے کسی عزیز دوست' لواحقین یا ناصحین کی خواہش تھی۔ ان سے کسی نے مشورہ تک نہیں کیا تھا۔ اگر میں عام آدمی ہوتا تو کیا میرے لیے میانی صاحب کے قدیم اور لامحدود شہرِ خموشاں میں یا میاں میر صاحب کے یا لاہور کے کسی بھی قبرستان میں دو گز زمین حاصل کرنا مشکل ہوتا؟ لیکن مشکل یہی تھی کہ نہ میں عام آدمی تھا' نہ میرے قاتل عام لوگ تھے اور نہ میرے قتل کے اسباب عام یعنی زر' زمین یا زن تھے۔

یہ میرے آبائی شہر' قصبے یا گاؤں کا قبرستان بھی نہیں۔ نہ یہاں کہیں کوئی آبادی ہے۔ بس ایک بے نام و نشاں ویرانہ ہے میرا مدفن۔ ہے زمیں اس کی اور اس کا آسماں سب سے الگ۔ مجھے یہاں لا کے گاڑنے والے یقیناً نہیں جانتے تھے کہ میرے دوست اور ہمنوا' ساتھی اور کارکن' پرستار و جاں نثار ایک جمِ غفیر کی صورت میں یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔ وہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کرکے آئیں گے۔ بس' ٹرین اور ہوائی جہاز سے۔ کاروں میں اور موٹر سائیکلوں پر۔ تانگوں اور ریڑھوں میں لد کر۔ ایک سائیکل پر تین سوار ہوکے اور پیدل بھی۔ راہ کی تمام صعوبتوں کو جھیلتے۔ ہر رکاوٹ کو عبور کرتے۔ خوف کی ساری زنجیریں توڑتے اور پابندیوں کی سب دیواریں گراتے وہ سڑک سے دس کلومیٹر اندر تک یوں دندناتے آئیں گے کہ ان کے قدموں کی دھمک سے دھرتی کانپے گی۔ ان کے نقوشِ پا' کاروں' بسوں اور ٹرکوں کے ربڑ کے ٹائر اور تانگے' ریڑھے کے پہیے پتھروں کو پیس دیں گے۔ ناہموار سطح کو برابر کردیں گے۔ کیکر اور ببول کی پُرخار شاخوں کے راستہ روکنے والے بازو کاٹ دیں گے۔ گھاس پھوس اور جھاڑیوں کو کچل کے ختم کردیں گے اور چند دن میں وہ پکی سڑک جیسا راستہ ہر راہ نوردِ شوق کو خود منزل کا نشاں دے گا جس پر اس وقت میں رواں تھا۔

ابھی میں اپنے مدفن سے ایک فرلانگ دور تھا کہ سیٹی بجاتے ہوئے ایک شخص نے عین سڑک کے درمیان آکے مجھے روکنے اور گاڑی کو موڑنے کا اشارہ دیا۔ مستعد کارکنوں نے ڈنڈے گاڑ کے اور رسی باندھ کے کاریں پارک کرنے کے لیے ایک احاطہ سا بنادیا تھا۔ اس میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے راستے الگ الگ تھے۔

ایک طرف دو بانسوں پر دو بلب روشن تھے۔ مجھے اس گیٹ سے گزر کے گاڑی کو اس احاطے میں پارک کرنا تھا جہاں اس وقت پندرہ بیس گاڑیاں ہی رہ گئی تھیں۔ دن میں شاید کاروں کو ڈسپلن کے ساتھ چونے سے ڈالی ہوئی لکیروں کے درمیان ترچھا کھڑا کرنا ضروری ہوگا تاکہ کسی کو بھی گاڑی نکالنے میں دشواری نہ ہو۔ اس وقت میں اپنی کار کہیں بھی کھڑی کرسکتا تھا مگر ایک جنگلی قسم کے تھانے دار ٹائپ شخص نے مجھے ڈانٹ کے کہا۔ "اوئے کدھر لگا رہے ہو گاڑی۔ یہ لکیریں ہم نے کس لیے ڈالی ہیں۔ پڑھے لکھے بندے لگتے ہو۔ فیروی سمجھتے نہیں۔"

میں نے گاڑی کو اس کی ہدایات کے مطابق دو لکیروں کے درمیان کھڑا کردیا۔ میرے دائیں بائیں پچاس گز تک دوسری گاڑی موجود نہیں تھی۔

ابھی میں نے انجن بند کیا ہی تھا کہ اس تھانے دار ٹائپ شخص نے مجھے ایک کوپن پکڑا دیا "دس روپے!"

میں نے شریفانہ لہجے میں احتجاج کیا "دس روپے کس بات کے؟"

"دیار' پارکنگ فیس ہے۔ ٹھیکا ہے ہمارا' جلدی کرو۔"

وہ اس قدر عجلت میں تھا جیسے ٹریفک جام ہوگیا ہے۔ میرے پیچھے کاروں کی لمبی قطار ہے اور اسے سب سے پارکنگ فیس وصول کرنی ہے۔ اندھیرے میں اس نے میری صورت پر غور کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید اس کا سارا دن ایسے ہی صرف دس روپے کی خاطر بحث کرنے والوں سے سر کھپاتے گزرا تھا۔ اب وہ صرف دس کے نوٹ کی شکل دیکھنا چاہتا تھا' میری نہیں۔

میرے ہاتھوں سے دس روپے کا نوٹ اچکتے ہی وہ دوسری طرف دوڑا "اوئے' اوئے حرامی روک اپنے پیو نوں" اس نے کچھ فاصلے پر موجود ایک لڑکے سے کہا اور باہر جانے والی ایک کار کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکا کار کے پیچھے بھاگا مگر کار نکل گئی۔

ٹھیکے دار چلانے لگا "یہ تیسری گاڑی والا ہے.... جو بغیر پیسے دیے نکل گیا۔ کتا تھا واپسی پر دوں گا۔"

"استاد جی!" لڑکے نے مجرمانہ لہجے میں پوچھا "کیا اس نے کوپن نہیں لیا تھا؟"

ٹھیکے دار نے فرار ہوجانے والے کو دوسری گالی سے نوازا۔ "..... کتا تھا کھلا نہیں ہے میرے پاس۔ پانچ سو کا نوٹ دکھا رہا تھا۔"

کرخت نقوش والے چہرے' گنجے سر اور گھنی مونچھوں والے اس شخص کے کرتے کی جیب کسی تھیلے کی طرح بھری ہوئی تھی۔ اس میں وہ نوٹ تھے جو اس نے سارا دن کاروں کی پارکنگ فیس وصول کرتے ہوئے جمع کیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ دن بھر میں ہزار کاریں تو ضرور آئی ہوں گی اور اس حساب سے دس ہزار تو ہو ہی گئے ہوں گے۔

میں نے نیلے رنگ کے اس کوپن کو غور سے دیکھا جس پر نہ کوئی بُک نمبر تھا اور نہ سیریل نمبر جس سے اندازہ ہوتا کہ اب تک کتنے کوپن جاری ہوئے ہیں اور اس نے صرف کاروں کی پارکنگ فیس کی مد میں کتنا مال اکٹھا کرلیا ہے۔ کوپن بڑی عجلت میں بڑے گھٹیا کاغذ پر چھپوائے گئے تھے۔ اس کے اوپر انگریزی کے نمایاں حروف میں "ایس اے ایس مزار ٹرسٹ رجسٹرڈ" لکھا ہوا تھا اور پس منظر میں وہ فاختہ نظر آرہی تھی جو ساری دنیا میں امن کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ یہ فاختہ پر پھیلائے محوِ پرواز تھی۔

یہ فاختہ آج ہر جگہ نظر آرہی تھی۔ نیلے رنگ کے گول اور چوکور بیج پر جو یہاں آنے والوں نے اپنے سینے پر کسی میڈل کی طرح احساسِ تفاخر کے ساتھ سجا رکھے تھے۔ نیلے رنگ کے اسٹکرز پر جو کاروں کے ونڈ اسکرین سے بچوں کی تین پہیوں والی کھلونا سائیکل تک ہر جگہ چسپاں تھے۔ چھوٹے بڑے نیلے پرچموں پر جو سائیکلوں پر لہرا رہے تھے۔ پُرشکوہ تمکنت کے ساتھ عالی نسب اور مغرور کاروں پر لہراتے تھے۔ دڑبے جیسے فلیٹوں کی بالکنی پر' کچی آبادیوں میں زنگ خوردہ ٹین والی چھتوں پر۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے محل جیسے عشرت کدوں کی بلندی پر۔ ٹیلی فون کے کھمبوں سے مناروں تک نیلے رنگ کے پرچم پر یہ سفید فاختہ اسی طرح پُرفشاں نظر آتی تھی۔

پارکنگ کے ٹھیکے دار کا برابر کا پارٹنر ایس پی غلام محمد ایک دوغلا کتا تھا۔ وہ بیک وقت سرکار کا نمک خوار تھا لیکن خود کو میرا مچیچ کہلوانا پسند کرتا تھا۔ میں نے اس کا نام اپنے دشمنوں کی فہرست میں بہت پہلے لکھ لیا تھا۔ جب میں اس کے پاس سے گزرا تو اس نے نظر اٹھا کے بھی مجھے نہیں دیکھا۔ وہ گردن اکڑائے بغل میں اختیار کی چھڑی دبائے وہاں آنے جانے والوں کو یوں دیکھتا رہا جیسے انہیں کھلی دھمکی دے رہا ہو کہ میں سب دیکھ رہا ہوں۔ ایک ایک کو پہچان رہا ہوں۔

اس کے قریب ہی قناتوں کے نزدیک "وہ" کھڑی تھی۔ اندر جانے والے راستے سے چند قدم کے فاصلے پر۔ آج اس نے کالے رنگ کا ٹیپر پہن رکھا تھا ورنہ عموماً وہ جینز میں نظر آتی تھی۔ اس کے ایک کندھے پر تھیلے جیسا بدنما بیگ تھا اور دوسرے پر کیمرا۔ اس نے مردانہ وضع کی ڈھیلی ڈھالی مردانہ شرٹ پہن رکھی تھی جو سال بھر پہلے میں پہنتا تھا۔ نیالے رنگ کے پھولے ہوئے اور بھاری بھرکم نظر آنے والے جوگرز سے اس کے خوب صورت گلابی پیروں کی نزاکت کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا یہ حلیہ ہی اس کی نسوانیت کے حسن کے احساس اور تاثر کو مجروح کرتا تھا۔ لیکن اس کا اپنا ایک اسٹائل تھا۔ حسن کو وہ اپنی طاقت نہیں سمجھتی تھی۔

اس کے بال پریشان تھے اور ہر قسم کے میک اپ سے عاری

چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ اس کے عارض کے گلاب مرجھائے ہوئے لگتے تھے اور بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ ان آنکھوں کی ویرانی کا تاثر عارضی طور پر نمودار ہو جانے والے سیاہ حلقوں کے باعث کچھ زیادہ ہی حزنیہ اور دل گداز ہو گیا تھا۔ بظاہر وہ سب کو دیکھ رہی تھی لیکن اسے قطعی احساس نہ تھا کہ ہر نگاہ اسے کس نظر سے دیکھ رہی ہے۔

اس کی صورت کے خدوخال میں کوئی بات ایسی نہ تھی کہ شاعر دیکھے تو غزل کہنے پر مجبور ہو اور ہر غزل کے بعد اپنے الفاظ کی کم مائیگی کا احساس بھی شدید سے شدید تر ہوتا جائے۔ اس کے سراپا میں تصوراتی حسن کا وہ پیکر خیال بھی نہیں تھا جسے کینوس پر اتارنے کے لیے مصور کو اس کائنات کے سارے رنگ ناکافی محسوس ہوں۔ وہ نہ مس ورلڈ منتخب ہو سکتی تھی اور نہ مس یونیورس۔

اس کے باوجود وہ ایک عورت تھی۔ اس میں کچھ تھا' کوئی ایسی بات تھی' کوئی ساحرانہ قوت' کوئی حیوانی کشش یا شیطانی طاقت جو بڑی بے نیازی اور عاجزی سے دعوتِ تسخیر دیتی تھی لیکن مرد اس کے مقابل خود کو کمزور اور بے بس' ہتھیار ڈالنے پر آمادہ پاتے تھے۔ وہ مسحور ہو جاتے تھے پھر طلب کی شدت انہیں مغلوب کر لیتی تھی لیکن اس کی نظر اٹھتے ہی پتھر کے پہاڑ پگھل کر موم ہو جاتے تھے اور اس کے قدموں میں بچھ جاتے تھے۔ آتش فشاں عزائم کا خاکستر کر دینے والا لاوا برف کے گالوں کی طرح بکھر جاتا تھا۔

چنانچہ خجالت آشنا اور خفت شناسا مرد اپنی جبیں سے پسینہ پونچھ کے کہتے تھے۔ "او مائی گاڈ۔ وہٹ وومن۔۔۔ وہ اتنی حسین ہے۔۔۔ اتنی حسین ہے کہ۔۔۔" پھر ان کے پاس اظہار اور الفاظ کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا تو وہ کہتے تھے "الّو کی پٹھی' ایک خبیث بدروح کی طرح جان نہیں چھوڑتی۔ اندر گھس کے بیٹھ جاتی ہے۔ اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔"

خود اس کے وجود میں ایک بے چین روح تھی جو اسے ہر گھڑی مضطرب رکھتی تھی۔ وہ قرار اور سکون کی تلاش میں سرگرداں ہر ایسی جگہ نظر آتی تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً میرا مزار۔ اتنی رات گئے اس کا یہاں کیا کام تھا۔

میں اس سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آیا' ترس بھی۔۔۔ اور پیار بھی۔ کاش میں اسے سمجھا سکتا۔ مگر وہ ایسی چیز ہی نہیں تھی جو کچھ سمجھے یا جسے کوئی سمجھ سکے۔

ایک گاڑی سیدھی قناتوں کے پاس آ کے رکی تو اس نے فوراً کیمرا فوکس کیا اور کار کا دروازہ کھلتے ہی اس کا فلیش چمکا۔ کار سے اترنے والا ٹھٹک کے رکا اور پھر مسکرا کے اندر چلا گیا۔

ایس پی آہستہ آہستہ اس کی طرف کھسک رہا تھا۔ اس میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ مردانہ وار قدم بڑھائے اور اس کے سامنے جا کھڑا ہو۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو ڈیئر شبو؟" ایس پی نے کہا۔

شبنم نے سپاٹ لہجے میں کہا "کیمرے سے تصویریں ہی بنائی جا سکتی ہیں ڈیئر گلو۔"

ایس پی نے کھسیا کر ادھر ادھر دیکھا "حد کرتی ہو تم۔۔۔ میرا نام غلام محمد ہے۔"

"میرا نام بھی شبنم ہے' شبنم انشاں۔ تمہیں گھر میں سب گلو کہتے ہیں نا؟"

"آخر کون بتاتا ہے تمہیں یہ باتیں؟"

"فرشتے۔"

"ذرا اپنی حالت دیکھو مس شبنم۔ بھتنی لگ رہی ہو تم۔"

"تمہاری نظر بالکل ٹھیک دیکھ رہی ہے ایس پی صاحب۔" اس نے واپس جاتی ہوئی دوسری کار کی تصویر اتار لی۔

"اچھا تم کیا کرو گی ان تصویروں کا۔ کوئی فیچر لکھو گی نا ہمارے خلاف؟"

اس نے سوچتے ہوئے کہا "کیا پتا؟"

"اس سے کچھ نہیں ہو گا" ایس پی بولا۔

"کچھ نہیں ہو گا" اس نے بے خیالی میں ایس پی کے الفاظ دہرائے "یہ تو مجھے معلوم ہے۔"

"پھر کیوں خوار ہو رہی ہو' جاؤ اپنے گھر۔"

اس نے ایس پی کو حیرانی سے دیکھا "تم گھر کیوں نہیں جاتے۔ تم کیوں خوار ہو رہے ہو؟"

"میری تو ڈیوٹی ہے۔"

"میری بھی ڈیوٹی ہے" شبنم نے چلّا کے کہا "اب جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

"میرا خیال ہے کہ شاہ عالم کی موت کے صدمے نے پاگل کر دیا ہے تمہیں۔ تمہیں بہت محبت تھی اس سے؟"

"ہاں۔۔۔" وہ بلا جھجک بولی "سارا زمانہ جانتا ہے۔"

"پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی تھی؟"

وہ خلا میں دیکھتی رہی "چودھویں کا چاند اچھا لگتا ہے' تمہیں؟"

ایس پی نے محتاط ہو کے سر ہلایا "ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔"

شبنم نے اس کی بات کاٹ دی "پھر اسے اپنے ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں لگا لیتے۔ فانوس کی جگہ۔"

جس شخص کی کار عین قنات کے پاس آ کے رکی تھی وہ فاتحہ خوانی کر کے لوٹ آیا۔ وہ پارٹی کا بہت اہم عہدے دار تھا۔ وہ بھی خود کو نمبر دو سمجھتا تھا۔ اس کی کار پر نیلے رنگ کا ریشمی جھنڈا سرنگوں تھا اور امن کی فاختہ کے پر سمٹے ہوئے تھے۔

وہ کار میں بیٹھ کے روانہ ہونے سے پہلے رکا "شبنم۔ کیا آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہیں؟"

"آپ جواب دیں گے؟ ایمان داری سے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ تو چوتھا ستون ہیں مملکت کا۔" وہ طنز سے بولا۔

"آپ کے گھر کا نیا چوتھا ستون کون ہے؟" شبنم نے پاکٹ سائز پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر آگے کر دیا۔

"یہ ذاتی سوال ہے۔ میری نجی زندگی۔۔۔"

"کیا وہ اسی کی بہن نہیں ہے جس کو آپ نے ضمنی انتخاب میں شکست دی تھی؟" شبنم کار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"ڈرائیور۔ گاڑی نکالو" وہ برہمی سے بولا "یہ لڑکی تو پاگل ہے۔"

"پھر سپریم کورٹ میں فیصلہ الٹ گیا تھا" اس نے الٹی واپس جاتی ہوئی کار میں سر ڈال کے ٹیپ ریکارڈر اندر رکھا۔

"یہ کون سا موقع ہے ایسے سوالات کا۔ پیچھے ہٹو۔۔۔"

شبنم دوڑنے لگی "ان کے اور آپ کے درمیان تو سیاسی دشمنی تھی۔ اسمبلی کے اندر۔۔۔ آپ دست و گریباں رہتے تھے۔۔۔ کیا وہ ڈراما تھا؟"

کار ہجوم کی پروا کیے بغیر تیزی سے نکل گئی۔ دو افراد سائڈ کی ٹکر لگنے سے گر پڑے۔ ان میں سے ایک شبنم سے ٹکرایا "بلے بلے۔" وہ بولا۔

شبنم کی سانس پھول گئی تھی۔ اس نے اپنا ٹیپ ریکارڈر بیگ میں ڈالا اور پھر انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی "ٹھیکے دار صاحب۔ یہ جو گاڑی ابھی گئی ہے' اس کو تم نے اندر پارکنگ کے لیے نہیں کہا۔ اس سے فیس نہیں لی۔ اور بھی ہیں بائیس گاڑیاں ایسے ہی نکل گئیں۔"

ٹھیکے دار نے اسے دلچسپی سے دیکھا "تم کو کیا تکلیف ہے؟"

"تمہاری ہمت نہیں پڑتی۔ تم ان سے دس روپے مانگو گے تو وہ دس جوتے مار سکتے ہیں تمہارے سر پر۔"

ٹھیکے دار نے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا "وہ مالک ہیں جی۔ وی آئی پی۔۔۔"

"ٹھیکا انہی کے دم سے ہے!" شبنم بولی۔

"آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو جی۔"

"اگر کوئی گاڑی یہاں روک دے' اندر نہ لے جائے اور تمہیں پیسے بھی نہ دے پھر تم کیا کرو گے؟"

اس نے کہا "یہ پولیس کس لیے ہے؟"

"یہ کیا کریں گے؟"

"پھونک نکال دیں گے چاروں پہیوں کی۔ ادھر تو کوئی پمپ بھی نہیں ہے۔ پتا لگ جائے گا بدمعاشی کا۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"کس کی بدمعاشی؟ تمہاری اور پولیس والوں کی؟"

وہ غرا کے بولا "چلو پھٹو ادھر سے۔ تمہیں پتا ہے۔۔۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم کس مخدوم کے باڈی گارڈ ہو۔"

شبنم اسی طرح کھڑی رہی "پولیس کے ساتھ فضلی نفشی کا معاملہ ہے تمہارا۔"

ایس پی نے پیچھے سے آ کے کہا "مس شبنم۔ فار گاڈ سیک۔ ایسے لوگوں کے منہ مت لگیں۔ اتنی سینئر جرنلسٹ ہیں آپ۔"

"میری گاڑی چار فلیٹ ٹائروں پر کھڑی ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میری جیپ لے جائیں۔ آپ کی گاڑی کل آپ کے گھر پہنچ جائے گی" ایس پی نے چابیاں آگے بڑھائیں "پلیز۔۔۔!"

شبنم نے سر ہلایا اور چابیاں لے لیں۔ شکریہ ادا کیے بغیر۔ وہ واضح طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس کی یہ دوسری شخصیت کسی کے سامنے نہیں آتی۔ ہر جگہ وہ صرف جرنلسٹ رہتی ہے۔ شاید کبھی خلوت میں آئینہ دیکھتے ہوئے وہ خود اپنا دوسرا پیکرِ حسن دیکھتی ہو۔ ایک سراپا قیامت۔ وہ عورت جس کا شباب کی رعنائیوں سے چھلکتا بدن مجسم فتنۂ محشر ہے۔ جو لوگ صرف عورت کو دیکھتے ہیں وہ صحافی شبنم کو نہیں جانتے لیکن ان کو وہ اس طرح نہیں دیکھتی جیسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے والوں کو یا بجلی کے کھمبوں کو اور آسمان میں اڑنے والے گدھ اور زمین پر رینگنے والے کیڑوں کو نہیں دیکھتی تھی۔

وہ کسی بہت گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ صحافی نہیں' اس کے اندر کی عورت۔ صحافی پوری طرح مستعد' باخبر اور ذہنی طور پر وہاں موجود تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن آج وہ دوسری شبنم بھی اس کے ساتھ آ گئی تھی جس کو وہ ہمیشہ گھر میں چھوڑ کے آتی تھی لیکن اس بات کو صرف میں سمجھ سکتا ہوں یا محسوس کر سکتا ہوں۔ آپ کو بتانے سے فائدہ؟

ایس پی نے پیچھے سے کہا "اب اتنی بھی کیا بداخلاقی۔۔۔ شکریہ دل سے نہ سہی' زبان سے ادا کر دو۔"

اس نے پلٹ کے ایس پی کو دیکھا "میری گاڑی کے چاروں ٹائر فلیٹ کرانے کا شکریہ۔"

"تم اپنے ماموں کے ساتھ جا سکتی تھیں۔ اگر ان کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہ کرتیں" ایس پی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"سوال ماموں نے کیا تھا۔"

"ان کا مقصد صرف تم کو متوجہ کرنا تھا۔ تم سے بات کرنے کا بہانہ۔"

"مجھ سے بات کرنے کے لیے کسی کو بھی بہانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم کو ان کا کوئی لحاظ نہیں۔۔۔ اپنی بیٹی سمجھتے ہیں وہ تمہیں۔۔۔ اب بھی۔"

"جس کا جو دل چاہے' سمجھے۔۔۔ گلو ماموں!"

غلام محمد کا موڈ آف ہو گیا "یہ میری جیپ ہے۔ خدا کے لیے

احتیاط سے چلانا۔ تمہاری حالت ایسی ہو رہی ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"آپ بھی ڈرتے ہیں' کمال ہے!" وہ جیپ میں بھی چڑھ کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"ڈر لگتا ہے کہ کوئی بے گناہ نہ مارا جائے۔ تم ویسے ہی کاٹنے کو دوڑ رہی ہو۔ جیپ چڑھادوگی کسی پر۔"

"پھر کیا ہوا... ایس پی صاحب۔ آپ کو سات خون معاف ہیں۔ اب تک کتنے کرچکے ہیں آپ؟" وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے زوم سے نکل گئی۔

ایس پی غلام محمد نے دور کھڑے ہوئے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ویسے وہ ہمیشہ جیپ کے پاس کھڑا رہتا تھا۔ اس جیپ کی چھت پر ایک سائرن نصب تھا اور ایک گھومنے والی نیلی لائٹ تھی مگر ابھی وہ ایک سفید کار کے پاس جیسے اسی اشارے کا منتظر کھڑا تھا۔ ایک منٹ کے فرق سے یہ کار بھی روانہ ہوگئی۔

مجھے ان لوگوں کی غلطی پر ہنسی بھی آئی' رونا بھی آیا۔ چھلاوا کس کے ہاتھ آتا ہے۔ بدروح کا تعاقب کون کرسکتا ہے۔ ایک منٹ تو بہت ہوتا ہے۔ اگر ایک سیکنڈ کا فرق ہوتا تب بھی اس حکم کے غلام' بزعم خود ہوشیار مگر احمق کانسٹیبل کو پتا نہ چلتا کہ وہ کدھر گئی۔ ایس پی نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑادیے تھے۔ گھوڑا دوڑتا جائے گا' وہ اس سے بہت پیچھے اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی رہے گی۔ گاڑی ایک ہی رفتار سے خود چلتی جائے گی۔

ایس پی مطمئن انداز میں واپس چلنے لگا۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا پھر میں نے دوسری کار کو پارکنگ ایریا سے گولی کی طرح نکلتے دیکھا۔

دھماکا شاید ایک منٹ بعد سنائی دیا تھا۔ رات کے ماتمی سناٹے میں یہ آواز واضح طور پر سب نے سنی تھی۔ اندھیرے میں بھڑکنے والا شعلہ بھی سب نے دیکھا تھا۔ میرے مزار سے ایک کلومیٹر دور۔

میں واپس قبر کی طرف جانے والے راستے پر ہولیا۔ اس راستے کے دونوں جانب ٹھیلے والے لائن میں کھڑے ہوئے تھے۔ اب صرف پھول اور اگربتی بیچنے والوں کا تھوڑا بہت دھندا ہو رہا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ مزار پر سب آنے والے پھول مانگتے تھے۔ پھول ختم ہونے سے پہلے مزید مال اندر سے آجاتا تھا۔ بریانی اور بن کباب' حلیم اور انڈا چھولے بیچنے والوں کی خوب کمائی ہو رہی تھی۔ ان کے دیگچے پتیلے خالی پڑے تھے اور اب وہ دن بھر کی آمدنی اور خرچ کا حساب کرنے میں مصروف تھے۔ شاید انہیں افسوس ہوگا کہ مال کم پڑگیا۔ ان کے اندازے سے زیادہ سیل ہوگئی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر دگنی قیمت لینے کے بجائے وہ تین گنا قیمت لگاتے۔ میلے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ چائے والا ایک کپ کے دس روپے چارج کررہا تھا لیکن اسے دم لینے کی فرصت نہ تھی۔

مزار کے گرد احاطہ کھینچنے کے لیے قنات لگائی گئی تھی۔ اس قنات پر بلبوں کی قطار روشن تھی۔ شامیانے کی چھت کا وسطی حصہ عین میری قبر کے اوپر سایہ فگن تھا۔ شامیانے کی چھت سے آرک لائٹس اور مرکزی لیمپ آویزاں تھے۔ اس چندھیا دینے والی روشنی میں ڈھیروں اگربتیوں کا اوپر اٹھتا ہوا دھواں بڑا ڈرامائی تاثر دے رہا تھا۔ پُرتقدس سوگ کا۔

قنات کے ساتھ ساتھ دریاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر کچھ لوگ اس وقت بھی ختم قرآن میں مصروف تھے۔ عورتوں کے اندر آنے کے لیے راستہ مخالف سمت میں رکھا گیا تھا اور وہ وہیں بیٹھ کے قرآن خوانی کرسکتی تھیں لیکن اس حصے میں اس وقت کوئی عورت نہیں تھی۔ صرف مکروہ خباثت زدہ چہرے والی لیڈی پولیس تھی۔

مجھے اپنی قبر پر پھولوں کا ڈھیر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ قبر کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے دو ہٹے کٹے مجاور ٹائپ عقیدت مند بڑی احتیاط سے پھولوں کو سمیٹ رہے تھے۔ جب ڈھیر زیادہ ہو جاتا تھا تو وہ اوپر کے پھول بڑے بڑے ٹوکروں میں بھردیتے تھے۔ دو لڑکے یہ ٹوکرے باہر لے جاتے تھے اور ریڑھی والوں میں دوبارہ فروخت کے لیے تقسیم کردیتے تھے۔ سارا کام بڑے منظم طریقے پر ہو رہا تھا۔ صبح تک یہ پھول مرجھا کے خشک ہو جائیں گے اور انہیں سمیٹ کر ایک جگہ ڈھیر کردیا جائے گا مگر یہ کوڑا کرکٹ بھی ضائع نہیں ہوگا۔ جذبۂ خدمتِ خلق سے معمور ایک حکیم صاحب اسے اٹھوالیں گے۔ طبِ مشرق پر ان کی صد سالہ تحقیق کا حاصل وہ کشتۂ گلاب احمریں وقند ابیضی ہے جس کے طلسماتی خواص نے نوشتۂ دیوار پڑھنے والوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ حکیم اچھا کاروباری ذہن رکھتا ہے۔ اسے وہ گل قند کہتا تو کون لیتا۔

مزار کے پیچھے بہت سے بینر لگے ہوئے تھے۔ جب کوئی میری قبر پر کسی وی آئی پی کو فوکس کرتا تھا تو پس منظر میں بینر صاف نظر آتے تھے۔ بینر لگانے والے میرے وہ جوشیلے یا ڈرامے باز ساتھی تھے جو ہر جگہ خود ایسی تشہیر کے بہانے تلاش کرتے تھے اور اس کے اسباب بھی پیدا کرلیتے تھے۔ وہ خود کو میری اور پبلک کی نظر میں نمایاں رکھنے کے لیے آگے بڑھ کے نعرے لگاتے تھے۔ ڈنڈے کھاتے تھے اور جیل جاتے تھے کہ جب یہ دورِ ابتلا تمام ہوگا اور اقتدار کا عہدِ زریں آئے گا تو وہ بھی قافلہ سالاروں میں شمار ہوں گے اور انہیں اپنی وفاداری اور قربانی کے صلے میں پارٹی یا حکومت کا کوئی عہدہ ضرور ملے گا تو سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ وہ میرا ساتھ نہیں دیتے تھے' سرمایہ کاری کرتے تھے۔ پانسا پلٹ جانے سے یہ جواری ہار گئے تھے۔

بینرز پر لہو کی سرخی کے رنگ میں وہی مفید اور مؤثر اشعار لکھے گئے تھے جو ہمارا قومی اثاثہ ہیں۔ جب ضرورت پڑی استعمال کرلیا۔ "مصلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ۔" ... اور جناب "شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے" ... اور ... "جو چپ

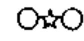
رہے گی زبانِ خنجر۔ لہو پکارے گا آستیں کا۔" ... اور اس سے بڑھ کر "ظلم جب حد سے گزرتا ہے تو مٹ جاتا ہے' خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا۔"

کیا ان شاعروں کو پہلے سے الہام ہوگیا تھا کہ ہم کیا قومی تاریخ بنانے والے ہیں؟

نصف شب کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس تماشے میں اب کوئی لطف نہیں رہا۔ یہ سب کچھ بالکل وہی اور ویسے ہی ہو رہا تھا جیسا میں نے سوچا تھا۔ صرف ایک سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ یا تھا بھی تو میں اسے جانتا نہیں تھا۔ یہ سوال میری روح میں ازل سے اپنی خلش کے ساتھ موجود تھا۔ نوکِ خار کی طرح۔ اسے نکالنے کی خواہش اور جدوجہد ہنوز لاحاصل تھی۔ زخم کو کرید کرید کے میں نے دل میں ایک ناسور بنالیا تھا۔ درد جب حد سے گزر جاتا تھا تو میں آسمان کی طرف دیکھتا تھا... خداوندا! آخر میں کون ہوں اور کیوں ہوں؟ دنیا میں کچھ بھی تو بے سبب نہیں ہے۔ میں نے واپسی کے سفر میں پھر اسی سوال پر غور کیا۔

اس رات میں اسی طرح اکیلا تھا جیسے روح سے جدا ہوکے جسم اپنی قبر میں کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میری خلا میں سرگرداں روح کے اندر بھی ایک خلا تھا۔

احساس کے عذاب سے نجات پانے کے لیے میں نے وہ ڈائری کھول لی۔



مزارِ قائد کے احاطے کی جگہ پہلے ایک وسیع اور ناہموار میدان تھا۔ یہاں ہزاروں جھگیاں تھیں اور ان میں وہ لوگ آباد تھے۔ بلکہ شاد و آباد تھے جو صرف پاکستان کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ آئے تھے۔ اپنے گھر اور آبائی زمینیں۔ قدیم حویلیاں اور پرانے قبرستان جن میں ان کے آباواجداد صدیوں سے صورِ اسرافیل کے انتظار میں چپ لیٹے ہوئے تھے۔ دوست احباب' عزیز واقارب' تاریخ اور روایات کے رشتے۔ ملازمت اور کاروبار' سب ایک نعرے پر قربان ہوگیا تھا۔ بن کے رہے گا پاکستان... اور پاکستان بن گیا تھا۔

نعرے لگانے والے اور لگوانے والے بڑے مخمصے میں پڑگئے۔ پاکستان تو بن گیا یار' اب کیا کریں۔ ہمنند پہلے ہی فرماچکے تھے کہ بیکار مباش کچھ کیا کر' کچھ نہیں تو کپڑے پھاڑ کر سیا کر۔ چنانچہ وہ کپڑے پھاڑنے لگے۔ ایک دوسرے کے' سینے والی بات انہیں یاد نہ رہی پھر وہ ایک دوسرے کے سر پھاڑنے لگے۔ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک پلاٹ کی خاطر یا کاغذ کے ان پرزوں کے لیے جن پر لکھا ہوا تھا۔ "حکومتِ پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا۔"

اب مزارِ قائد کے چاروں طرف خوب صورت درختوں اور لائٹوں والی پختہ سڑکیں ہیں جن پر سے کاریں زوم زوم گزرتی رہتی ہیں۔ اندر سرسبز لان ہیں اور سایہ دار درخت۔ دودھیا روشنی دینے والے کھمبے اور درختوں سرچ لائٹس سے رات میں دن کا اجالا پیدا کرنے والے دیوہیکل ٹاور۔ قطار میں بنے ہوئے تالاب اور ان گنت فوارے جو پانی میں سے نکلنے والی روشنی میں رقص کرتے ہیں۔ یہ ایک پُرسکون خلوت گاہ ہے۔ تفریح کی جگہ ہے۔ اندر نوجوان جوڑوں کی موٹرسائیکلیں اور فیملی کے ساتھ آنے والوں کی کاریں صف بستہ نظر آتی ہیں جن کو یہاں آئس کریم کے کپ' پوپ کارن کے لفافے اور پوٹیٹو چپس کے پلاسٹک بیگ' گنڈیری کا پھوک اور پھلوں کے چھلکے پھیلانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

باہر گیٹ پر دہی بھلے' بن کباب اور شربت بیچنے والے۔ ٹیکسی اور رکشہ والے' فقیر' جیب تراش اور پولیس والے سب خوب کماتے ہیں۔ اللہ سب کا رازق ہے۔ مزار کے سامنے نمائش کے چوک سے کاروں کے سیلاب کا ریلا گزرتا رہتا ہے۔

وہیں میں نے اس بوڑھے پاگل فقیر کو دوسری بار دیکھا تھا جو لنگوٹی کا بھی روادار نہ تھا اور ٹریفک کنٹرول کرنے کے انداز میں ڈانس کر رہا تھا مگر کوئی بھی اس کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہر روز قائداعظم کے مزار کے سامنے سے گزرنے والے صرف سامنے دیکھتے تھے۔ اپنی کاروں کو ڈینٹ سے بچانے کے لیے وہ پوری توجہ اور انہماک سے ڈرائیونگ کرتے تھے۔ ان کے لیے ادھر ادھر دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ شاید ضروری بھی نہیں تھا۔

اخبار فروش لڑکے اس سے فحش مذاق کررہے تھے اور وہ ہنس رہا تھا۔ کبھی کوئی اس کے لات رسید کردیتا تھا۔ وہ گر پڑتا تھا اور اٹھ کے پھر ناچنے لگتا تھا۔ گاڑی کو ایک سائڈ میں روک کر میں نے پان سگریٹ کے کھوکھے والے سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

"پاگل ہے جی اور کون ہے۔" پان والے نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں بھی پاگل ہوں۔

میں نے اس سے سگریٹ کا ایک پیکٹ مانگا تو اس کا رویّہ بدل گیا۔

"پاگل ہے تو پھر یہاں کیوں ننگا ناچ رہا ہے؟" میں نے سگریٹ کا ریپر اتارتے ہوئے کہا "عورتیں بچے گزرتے ہیں یہاں سے' اس کو پاگل خانے میں ہونا چاہیے۔"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا "آپ لے جاؤنا جی۔"

میں نے کہا "یہ کام حکومت کا ہے... پولیس کا ہے۔"

"جناب' وہ سامنے پولیس چوکی ہے۔ آپ ان سے کہو۔ مگر وہ فالتو کام کوئی نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "کیا یہ واقعی پاگل ہے؟"

اس نے رازدارانہ پراسرار لہجے میں کہا "سنا ہے خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔"

اس بات پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی "ہر روز یہاں ڈیوٹی دیتا ہے؟ بالکل اسی طرح۔"

آپ مذاق سمجھ رہے ہو میری بات کو۔ تین سال ہو گئے۔ یہاں بیٹھ کے صرف کتھا چونا ہی نہیں لگا رہا ہوں۔ آپ بے شک آزمالو۔ آج یہاں ہے، پھر اچانک غائب ہو جائے گا۔ کبھی نظر آئے گا ناظم آباد چورنگی پر۔ کبھی لیاری میں۔ تین چار مہینے بعد یہاں دوبارہ آیا ہے" وہ پان لگا کے لائن میں رکھتا گیا اور ان پر مختلف چیزیں ڈالتا رہا "اللہ جانے سچ کیا ہے۔ سنا ہے رات کو گاڑی لے جاتی ہے اسے۔ جیسی آپ کی ہے نا جی۔ اس جیسی شاندار۔"

"اسے میں نے لاہور کے لکشمی چوک میں دیکھا تھا" میں نے اس سے ایک اسپیشل میٹھا پان لے لیا۔

پان والے کی نظر میں میری حیثیت مشکوک ہو گئی "آپ کیوں لگے ہو اس کے پیچھے جناب عالی!"

"دراصل۔۔۔ میں نے کچھ اور سنا ہے۔"

لیکن دوسرا گاہک آجانے کے بعد پان والے کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی کہ میں نے کیا سنا ہے۔ اس کا خفیہ پولیس والا نظریہ مسترد کر دینے کے بعد میں اس سے تعلقات میں بہتری کی امید نہیں رکھ سکتا تھا مگر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس بار حقیقت معلوم کر کے ہی رہوں گا۔

اس سے براہِ راست بات کرنا لاحاصل تھا۔ یہاں میں سارا دن گاڑی میں بیٹھ کے نہیں گزار سکتا تھا۔ آس پاس کوئی ریسٹورنٹ تھا اور نہ کوئی ایسی جگہ جہاں بیٹھ کے میں خود نظر میں آئے بغیر اس پر نظر رکھ سکوں۔ بس اسٹاپ ہی واحد جگہ تھی جہاں میں دن بھر کھڑا رہتا تو کوئی غور نہ کرتا۔ بسوں کے اڈے پر مسافر دن لگے رہتے ہیں۔ نئے آنے والے نہیں جانتے کہ کون کب سے اور کیوں کھڑا ہے؟ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کار کو کسی گلی میں چھوڑ دوں جہاں سے اس پر نظر رکھی جا سکے۔ یہاں سے پولیس چوکی بھی دور تھی اور پولیس والوں کو بس اسٹاپ کے مسافروں سے کیا لینا دینا۔ وہ ٹریفک پولیس پوسٹ پر ہی مرغے پھانستے رہتے تھے اور خاصے مصروف تھے۔

گاڑی کو گلی میں کھڑا کرتے ہوئے میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ گاڑی کسی کے گیٹ پر نہ ہو بلکہ وہ گھروں کے درمیان رہے ورنہ اپنے دروازے پر کسی کار کو لاوارث کھڑا دیکھ کر لوگ پولیس کو فون کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ زمانہ خراب ہے، زمانہ اکثر خراب ہی ہوتا ہے۔ میں نے کسی سے سنا نہیں کہ زمانہ اچھا ہے۔

شام سے رات ہو گئی۔ ٹریفک کو نظروں کے سامنے سے گزرتا دیکھ دیکھ کے میرا سر چکرانے لگا۔ دھوئیں، شور، ڈیزل اور پیٹرول کی بُو سے میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ میں نے چھ گھنٹے میں صرف سگریٹ پیے تھے، ایک بھٹا کھایا تھا۔ ایک پیکٹ بھنے ہوئے چنے چبائے تھے اور اس فقیر کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ تھک جاتا تھا تو سڑک کے درمیانی حصے میں لگی ہوئی لائٹوں والے فٹ پاتھ جیسے حصے پر سمٹ کے پڑ جاتا تھا۔ اسے کسی نے چوک کے دوسری طرف سے پلاسٹک کے لفافے میں چاول لا کے دیئے تھے جو وہ کبھی بھر بھر کے کھاتا رہا تھا۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا اور لائٹس جل اٹھیں تو میں نے کار نکالی اور مزار کی سائڈ والے بس اسٹاپ کے فٹ پاتھ سے ملا کے کھڑی کر دی۔ میں نے اس کا بونٹ اٹھا دیا تاکہ گاڑی خراب نظر آئے اور پولیس مجھ پر ٹریفک میں خلل ڈالنے کا الزام عائد کرنے نہ آئے۔ یہاں سے میں چند سیکنڈ میں روانہ ہو سکتا تھا۔ پہلی بار معمولی سی تاخیر نے بنا بنایا کام خراب کر دیا تھا اور مجھے تین مہینے بعد پھر اس کا سراغ ملا تو وہ کراچی میں تھا۔

اب میں اطمینان سے کار میں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ خالی چھوڑ دی تھی۔ سیمنٹ کے سائبان کے نیچے بنی ہوئی بینچ پر نشے باز اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ غلیظ دیواروں پر اشتہاروں کی بھرمار تھی۔ نعروں کے اوپر نعرے اور مطالبے لکھے ہوئے تھے۔ فلاں کافر، فلاں کتا، فلاں کو رہا کرو۔ فلاں کو پھانسی دو۔ زندہ باد، مردہ باد۔ سب گڈمڈ تھے۔ میں نے ایک بھیک مانگنے والے بچے کو اشارے سے قریب بلایا۔ آٹھ دس سال کے اس بچے نے سائز سے بڑی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جو شاید کبھی نہیں دھلی تھی۔ خود اس نے ہفتہ دس روز یا مہینہ پہلے منہ دھویا ہوگا۔ اس کے سر کے بالوں میں گرد و غبار، تنکے اور جوئیں دیکھ کے گھن آتی تھی۔

یہ سوچنا فضول تھا کہ اس کی ماں کون تھی اور باپ کون تھا۔ گھر تھا یا نہیں؟ اس کا ماضی اتنا ہی قابلِ نفرت تھا جتنا اس کا حال یا مستقبل۔

وہ ڈرتا ڈرتا قریب آیا۔ کچھ دیر پہلے اس نے ہاتھ پھیلا کے اپنی پُردرد اپیل کا ٹیپ چلایا تھا تو میں نے اسے جھڑک کے بھگا دیا تھا۔ جب وہ قریب آگیا تو میں نے کہا "دس روپے لوگے؟"

اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوئی مگر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ وہ سامنے ہوٹل ہے۔ یہ دس روپے لے جاؤ اور وہاں سے مجھے ایک کپ چائے لا دو۔ گاڑی خراب ہے، میں یہاں سے جا نہیں سکتا پھر میں تمہیں بھی دس روپے دوں گا۔"

اس نے مجھ سے دس کا نوٹ لے لیا اور ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ بچہ مجھ سے زیادہ عقلمند تھا۔ وہ دس کے نوٹ سمیت غائب ہو گیا۔ کچھ کئے بغیر دس روپے مل جاتے ہوں تو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دس کے دو نوٹ ملنے کی امید ہوتی تو شاید وہ مجھے چائے لا دیتا۔

ایک پولیس مین واضح عزائم کے ساتھ میری طرف بڑھا۔ "سری!" اس نے سر اندر ڈالا "کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے چونک کے کہا "کہاں، کہاں کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے مجھے گھور کے کہا "آپ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ بس بیٹھا ہوں۔"

"او جی، یہی تو پوچھا اس کی ہے میں نے کہ ادھر کیوں بیٹھے ہو۔ یہ جگہ ہے گاڑی کھڑی کرنے کی؟ کاغذات ہیں؟"

میں نے کہا "پتا نہیں۔۔۔"

اب وہ مشتعل ہو چکا تھا "پتا نہیں کا کیا مطلب۔۔۔"

"مطلب یہ کہ گاڑی کا مالک ہی بتا سکتا ہے کاغذات کے بارے میں۔ میں کیا بتاؤں؟"

"مالک کون ہے؟"

میں نے کہا "میرا دوست۔ تمہاری ہی برادری کا بندہ ہے۔"

"کدھر دفع ہو گیا ہے وہ؟"

"یہ بھی مجھے معلوم نہیں۔ تم بیٹھو، ابھی آجاتا ہے۔ مکینک کو لینے گیا تھا" میں نے کہا۔

وہ مایوس ہو کے سیدھا کھڑا ہو گیا "ایسے بولو نا کہ گاڑی خراب ہے۔"

"بلاوجہ یہاں گاڑی کا بونٹ کھول کے کون رکتا ہے حوالدار صاحب۔ ایک مہربانی کرو" میں نے اسے سو کا نوٹ دیا "آپ بھی چائے پیو، ایک پیالی مجھے بھی بھجوا دو۔"

"اور کوئی حکم!" اس نے سو کا نوٹ وصول کرتے ہوئے مسکرا کے جذباتِ خیرسگالی کا اظہار کیا۔ لوٹ کے وہ بھی نہیں آیا مگر مجھے ہوٹل کا چھوکرا ایک پیالی چائے دے گیا۔

رات ساڑھے نو بجے ایک ڈاٹسن سنی ذرا سی دیر کے لیے فقیر کے پاس رکی۔ پلک جھپکتے میں فقیر غائب ہو گیا۔ گاڑی کا دروازہ پہلے ہی کھول دیا گیا تھا۔ شاید کسی نے بھی اسے اندر بیٹھتے نہیں دیکھا ہوگا سوائے اس پان والے کے۔ فقیر کو اندر گھسیٹ لیا گیا تھا۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کے پیچھے لگ گیا۔ ڈاٹسن نمائش کے چوک کے گرد گھوم کے واپس ہوئی اور سیدھی گرومندر کی جانب بڑھی۔ ٹریفک کے ازدحام میں اس پر نظر رکھنا اور اس کا تعاقب کرنا اپنی ڈرائیونگ کی مہارت کا امتحان تھا لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے غلط موڑ کاٹا۔ غلط سائڈ سے اوورٹیک کیا اور بہت سی گاڑیوں کے پاس سے ان کو تقریباً چھو کے گزرا۔ بروقت بریک لگانے والوں نے بھی مجھے بہت گالیاں دی ہوں گی۔ یہ نودولتیے، سالے اسمگلر، منشیات فروش۔ جن کے باپ دادا جوتیاں چٹخاتے، اٹھاتے اور کھاتے ہوں گے، ہنڈا اکارڈ میں یوں دندناتے پھرتے ہیں جیسے سڑک پر ان کا راج ہے۔ شریف آدمی کہاں جائے۔

شریف آدمی جائے جہنم میں۔ میں نے ڈاٹسن کے ساتھ ریس لگاتے ہوئے سوچا۔ آخر وہ جیتا ہی کیوں ہے جب زندگی میں رونے پیٹنے کے سوا کچھ نہیں۔ مہنگائی کا دکھڑا، بدمعاشی کا شکوہ، بے حیائی بڑھ گئی ہے۔ ہر جگہ چور ڈاکو بیٹھے ہیں۔ غضب خدا کا، پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر بھی کہتا ہے کہ پیسے دو اور لاش لے جاؤ۔ اسکول والے تعلیم کے نام پر لوٹ رہے ہیں۔ اسپتالوں میں قصاب اور گدھ بیٹھے ہیں۔ گزارہ مشکل ہو گیا ہے بھائی۔ بڑا خراب زمانہ ہے۔ نئی نسل تو چوپٹ ہو گئی ہے۔ قربِ قیامت کے آثار ہیں۔

یہ سب اس کا باپ بھی کہتا ہوگا۔ شریف آدمی کا زیادہ شریف باپ اور اس کا بھی باپ۔ اس کا بیٹا بھی کہے گا اور پوتا بھی۔

ڈاٹسن اچانک رک گئی۔ پھر میری کار بھی ٹھہر گئی۔

عینک والا خوش پوش جوان اور صحت مند شخص جو گاڑی چلا رہا تھا، تیزی سے میری طرف آیا "کیا بات ہے۔ تم ہمارا پیچھا کر رہے ہو؟" اس نے برہمی سے کہا۔

اس سے کچھ کم عمر دوسرا نوجوان بھی گاڑی سے اترا اور چیونگم چباتا ہوا پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کے میری گاڑی کے بمپر پر پاؤں رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ وہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ وہ بہت بڑا بدمعاش ہے۔

میں نے کہا "بالکل ٹھیک سمجھے تم۔"

عینک والے کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں "مگر کیوں۔۔۔ کیا چاہتے ہو آخر تم؟"

میں نے نرمی سے کہا "کچھ نہیں۔ میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے؟"

"کیا بات کرنا چاہتے ہو۔ کون ہو تم؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"جانتا تو میں بھی نہیں" میں نے اعتراف کیا "صرف ایک بار تمہیں پہلے دیکھا ہے میں نے۔ لاہور میں، تین مہینے ہو گئے۔"

دوسرا نوجوان ایک دم دوسری طرف آگیا۔ اس نے مجھے گالی دی۔

میں نے باہر آکے کہا "میں جھگڑا بالکل نہیں چاہتا لیکن یہ مت سمجھو کہ میں لڑنے سے ڈرتا ہوں۔ بولو کیسے لڑو گے۔ ہاتھ سے یا ہتھیار سے؟"

عینک والے نے صورتِ حال کو سنبھالا۔ اس نے نوجوان کو جو اس کا چھوٹا بھائی لگتا تھا، ہاتھ سے اشارہ کیا "مجھے بات کرنے دو۔"

بدمعاش بھائی میرے تیور اور اسٹائل دیکھنے کے بعد باعزت طور پر اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے پسپائی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور گویا بڑے بھائی کو اجازت دی کہ وہ مجھے سمجھا سکتا ہے تو سمجھا لے ورنہ۔۔۔؟

میں اس ورنہ سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس بوڑھے فقیر کی طرف دیکھا جو کار کی پچھلی سیٹ پر سمٹا سمٹا ہوا پڑا تھا۔ "لاہور میں بھی تم اسی طرح اس بوڑھے کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور مجھے موقع نہیں ملا تھا تم سے بات کرنے کا۔ آج میں پوری تیاری کے ساتھ تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"تمہاری کیا دلچسپی ہے اس میں؟" بڑے بھائی نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

"تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ باپ ہے ہمارا۔" بڑے بھائی نے کہا۔
میں نے کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
چھوٹا بھائی گرم ہوگیا۔ "پھر کیا تمہارا باپ ہے؟"
میں نے سکون سے کہا "کیا یہ ناممکن ہے؟"
"یہ کیا فضول بات ہے" بڑے بھائی نے جھنجلا کے کہا۔
میں نے کہا "نہیں۔ یہ فضول بات نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا نام عظیم بیگ ہے۔ اپنی بیوی کے قتل کے جرم میں اس نے چودہ سال جیل میں گزارے۔ کچھ عرصہ ایک جیل میں، پھر کچھ عرصہ دوسری جیل میں۔ یہ راولپنڈی سینٹرل جیل سے رہا ہوا تھا۔ یہ بھی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میرے پاس چند پرانے اخباروں کے تراشے ہیں۔ یہ دہرے قتل کی واردات تھی۔ اس کی تفصیلات راولپنڈی کے دو اخبارات "کوہستان" اور "تعمیر" نے شائع کی ہیں۔ دوسری خبر تین سال بعد کی ہے جب سیشن جج راولپنڈی نے اس جرم میں عظیم بیگ کو مجموعی طور پر بائیس سال قید سخت کی سزا سنائی تھی۔ واردات ۶ دسمبر انیس سو اکہتر کی ہے۔ ہندوستان، پاکستان کی جنگ چل رہی تھی۔ سیشن کورٹ میں سماعت تقریباً تین سال جاری رہی۔ عظیم بیگ کا وکیل راجا حق نواز تھا۔ جس کا انتقال ہوچکا ہے۔ سزا سنائی گئی تھی سات نومبر انیس سو چوہتر کو۔ اپیل خارج ہوئی ایک سال بعد۔ عظیم بیگ نے سات سال کوٹ لکھپت جیل میں گزارے۔ اس کی رہائی ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔"
دونوں بھائی اب سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔
میں نے کہا "کیا اب بھی تمہارا خیال ہے کہ میں فضول بات کررہا ہوں۔ میرے پاس اور بہت کچھ ہے سنانے کے لیے لیکن یہاں سڑک کے کنارے کھڑے رہ کر بات کرنے میں رات بیت جائے گی۔"
بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھ کے کچھ دیر سوچا اور پھر سرہلادیا "او کے۔ ہمارے ساتھ آؤ۔"
"دیٹ از بیٹر" میں نے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔
اب وہ فرار نہیں ہورہے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ نہ مجھے ٹالا جاسکتا ہے اور نہ خوف زدہ کرکے بھگایا جاسکتا ہے۔ میرے انکشافات نے ان کو پریشان کردیا تھا۔ وہ کسی بات کی تردید نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں یہ جان کے شاک لگا تھا کہ مجھے عظیم بیگ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے جوان کا خیال تھا کہ اب کوئی بھی نہیں جانتا۔ پرانا وقت اور پرانے لوگ اس ماضی کا حصہ تھے جس سے وہ لاتعلق ہوگئے تھے۔
اس طرح کوئی اجنبی جو میرے نام سے بھی واقف نہ ہو اچانک نمودار ہوکے میری زندگی کی کتاب کا ایک سیاہ باب خود مجھے سنانے لگے جس کو میں نے پھر مرتب کرتے ہوئے عمداً اسی طرح خارج کردیا ہو جیسے برسرِاقتدار حکومت پچھلی حکومت کے ہر کارنامے کو نصاب سے خارج کردیتی ہے تو میں بھی یہی سمجھتا کہ وہ مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔
دونوں گاڑیاں سوسائٹی کے نسبتاً جدید علاقے میں پہنچ کے ایک شاندار کوٹھی کے سامنے رک گئیں۔ ڈائسن سن گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ میں نے اپنی گاڑی گیٹ چھوڑ کے پارک کردی تھی۔ ان کے ساتھ ہی اندر داخل ہوجانا خلافِ تہذیب تھا۔ میں باہر رک کے انتظار کرتا رہا کہ ان میں سے کوئی آئے، مجھے اندر لے جائے۔ تین منٹ بعد میں نے گھڑی دیکھی۔ پانچ منٹ بعد پھر دیکھی اور کال بیل بجاکے دونوں بھائیوں کو یاد دلانے کا فیصلہ کیا کہ میں باہر موجود ہوں۔ اسی وقت اندر سے گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز آئی۔ یہ اسی بوڑھے کی آواز تھی جو کرب اور اذیت میں چلایا تھا۔
پھر شاید آواز دبادی گئی اور بڑے بھائی نے دروازے پر آکے کہا "اندر آئیے پلیز۔"
"میں تو سمجھا تھا کہ آپ بھول گئے۔"
"اوہ نو۔ دراصل انہیں اندر لے جانا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔"
میں نے کہا "یہ انہی کی آواز تھی؟"
اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا "ہاں۔"
میں نے کہا "تم اس پر تشدد کرتے ہو؟ اس بوڑھے پر جس کو اپنا بھی ہوش نہیں؟ وہ پاگل ہے، تم تو پاگل نہیں ہو۔"
چھوٹا بھائی پھنکارتا ہوا اندر آیا "شٹ اپ۔ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ اسے ہم سمجھتے ہیں، مطلب کی بات کرو۔ تم کیا چاہتے ہو؟"
میں نے غصے کو ضبط کرکے کہا "میں اس بوڑھے سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم نے اسے کیوں قید کررکھا ہے۔ کیا تم نے اسے کسی تہ خانے میں زنجیریں ڈال کے رکھا ہے اور اسے کوڑے مارتے ہو؟ آخر کیوں، ایسے تو وہ مرجائے گا۔ اسے قتل کرنا چاہتے ہو تم۔ اچھی طرح سمجھ لو یہ بات کہ اسے کچھ ہوا تو میں کیس کردوں گا تم پر۔ میں تمہارے خلاف قتلِ عمد کی رپورٹ لکھوادوں گا۔ کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔"
بڑے بھائی نے اندر کا دروازہ بند کردیا۔ "پلیز۔ ایسے چلّانے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہم کررہے ہیں۔۔۔ یہ خود ہمارے لیے انتہائی شرم کی اور دکھ کی بات ہے۔ ہم انہیں کیسے قتل کرسکتے ہیں۔ آخر وہ ہمارے والد ہیں۔"
میں نے کہا "والد۔۔۔؟ وہ تمہارے والد ہیں؟"
اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "کیا تمہیں واقعی معلوم نہیں؟"
"اور سب کچھ معلوم ہے تمہیں!" چھوٹے بھائی نے طنز سے کہا۔
میں نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور عظیم بیگ سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"
انہوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں

کے ساتھ دیکھا کہ کیا واقعی یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔
"ہم کیسے مان لیں۔۔۔ کہ تم ہمارے والد کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمہارے پاس ان کی پوری کیس ہسٹری ہے۔"
"ہاں۔ کورٹ کا ریکارڈ حاصل کرنے کی میں نے کوشش نہیں کی لیکن جیل کے ریکارڈ سے مجھے سب معلوم ہوگیا تھا۔ میرے کچھ دوست صحافی ہیں۔ انہوں نے میری مدد کی۔ عظیم بیگ کو گرفتار کرنے والا انسپکٹر ریٹائر ہوگیا ہے مگر وہ زندہ ہے۔ ایک ڈی ایس پی تھا۔ وہ ڈی آئی جی ہے آج کل۔ سینٹرل جیل راولپنڈی کے جیلر نے بہت کچھ بتارہا۔ ایک سال کے عرصے میں یہ سب معلومات اکٹھی کی تھیں میں نے۔"
ان دونوں کی صورت پر حیرانی کے ساتھ پریشانی بھی عیاں تھی۔ "ایک سال تک یہ جدوجہد کرنے کا مقصد کیا تھا۔ اس سے پہلے تم کو کچھ معلوم نہیں تھا؟"
میں نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔۔۔ لیکن جیسے ہی مجھے عظیم بیگ کا پتا چلا، میں نے دن و رات ایک کردیا۔۔۔ اور سب معلوم کرلیا۔۔۔ اور دیکھ لو، آج میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔"
"مقصد اب بھی واضح نہیں ہوا۔"
"مقصد۔۔۔" میں نے کہا "میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جس نے میری ماں کو قتل کیا تھا۔"
ان دونوں پر جیسے بجلی گری۔ وہ مجھے ایسے دیکھتے رہے جیسے اچانک میں انسان سے جن بن گیا ہوں یا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔
بالآخر بڑے بھائی نے کہا "ہمارے۔۔۔ ہمارے والد نے۔۔۔ تمہاری ماں کو قتل کیا تھا؟ واٹ نان سنس۔"
"عظیم بیگ کو جس عورت کو قتل کرنے پر سزا ہوئی تھی وہ میری ماں تھی۔ فرزانہ نام تھا اس کا لیکن میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی تصویر میں نے اخبار میں دیکھی تھی مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔"
وہ مجھے اسی طرح گھورتے رہے پھر بڑے بھائی نے کہا "اب تک کہاں تھے تم۔ کسی دوسری دنیا میں؟"
"میرا لاہور میں اچھا خاصا بزنس ہے۔ ایک ہوٹل اور سینما ہے۔ میں بھی زندگی کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اپنا راستہ بنارہا تھا۔ کوئی بھی ایک مقصد کو لے کر آگے نہیں چلتا۔ میرے سامنے بھی بہت سے مقاصد تھے اور ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔۔۔ جس میں بالآخر مجھے کامیابی ہوئی۔"
"اس کامیابی کے بعد تم کیا کروگے؟ اوّل تو میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی نے بہکایا ہے یا اس تلاش میں خود تم کہیں بھٹک گئے ہو لیکن فرض کرلو کہ عظیم بیگ ہی وہ شخص تھا جس کو تم ایک سال سے تلاش کررہے تھے تو اس سے مل کے تمہیں کیا ملے گا؟ اگر تمہارے یقین کے مطابق اسی نے تمہاری ماں کو قتل کیا تھا تو اس جرم کی جو سزا تھی وہ اس نے پوری کاٹ لی۔ اب انتقام کے جذبات کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔"
"میرا انتقام لینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اگر سزا نہ ہوتی تب بھی میں کچھ نہ کرتا۔" میں نے کہا۔
"تم عجیب آدمی ہو۔ اس شخص سے ملنا چاہتے ہو جس کے لیے تمہارے دل میں صرف نفرت کے جذبات ہوں گے۔"
"ایسا ہونا ضروری تو نہیں" میں نے کہا۔
"کیوں ضروری نہیں۔ آخر اس نے تمہاری ماں کو قتل کیا تھا؟"
"جو شخص پاگل پن کی حالت میں یا اشتعال کی کیفیت میں قتل کردے یا قتل کا معقول جواز رکھتا ہو پھر اتنا عرصہ جیل میں گزار چکا ہو اور اب ذہنی طور پر معذور ہو، اس پر صرف ترس کھایا جاسکتا ہے۔ اس سے نفرت کرنے سے کیا حاصل؟"
"او کے مسٹر۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟"
"ناصر عظیم" میں نے کہا۔
وہ اچھل پڑا "ناصر عظیم!"
"دراصل یہ بڑی غیررسمی بلکہ غیردوستانہ سی ملاقات تھی ورنہ

غاز تعارف سے ہوتا۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت سے سر لگا کے بولا۔ میرا نام طاہر عظیم ہے... اور یہ میرا چھوٹا بھائی ہے' طارق عظیم۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب ایک ہی بات سوچتے رہے مگر ہمارے درمیان اجنبیت کے جذبات کی خلیج موجود تھی۔ شکوک و شبہات کی دھند میں ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ ہم جاننا چاہتے تھے کہ کون کیا ہے؟

بالآخر طاہر بولا "ابھی تم ان سے نہیں مل سکتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیوں؟ اس لیے کہ وہ لہولہان ہوں گے' زنجیروں میں بندھے ہوئے..."

"بند کرو اپنی بکواس" طاہر نے چلّا کے کہا "تم جیسے حرام زادے شاید ایسا کرتے ہوں۔ طارق' لے جاؤ اسے اندر اور دکھادو کہ ہم ناخلف اولاد نہیں ہیں۔ وہ جیسا بھی ہے' ہمارا باپ ہے۔"

طارق نے میرا بازو پکڑلیا "آؤ میرے ساتھ... لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے۔ میں تمہاری کھوپڑی اڑادوں گا۔ اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی..."

طاہر اس کی طرف بڑھا "طارق۔ ادھر لاؤ' ریوالور مجھے دو۔ بات کو بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ پریشان مت ہوں" چھوٹے بھائی نے سرکشی سے کہا۔ اور پھر مجھے دھکیلا "چلو۔"

ہم ایک لاؤنج سے گزرے اور پھر ایک بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ کمرے میں ائرکنڈیشنر کی خنک سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ پاگل فقیر جسے میں نے چوک میں ننگا ناچتے دیکھا تھا' صاف ستھرے کپڑوں میں سکون سے بستر پر سو رہا تھا۔ خواب گاہ کا قالین' پردے اور اسباب آرائش نائٹ لیمپ کی نیلی سکون آور مدھم روشنی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر چیز اس گھر کے مکینوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ نرس بھی جو عظیم بیگ کے بیڈ کے پاس بے داغ سفید یونیفارم میں مستعد کھڑی تھی۔

ندامت کا پسینہ میرے جسم پر بہنے لگا تھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں طارق عظیم سے نظر ملا سکوں۔ میں نے کیا سمجھا تھا' کیا فرض کرلیا تھا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس نکلی۔ شاید یہ میرے بیمار ذہن کی منفی سوچ کا نتیجہ تھا کہ میں نے آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک دیوانے کو لہولہان دیکھ لیا تھا۔ ایک درد بھری آہ سن کے میرا تصور بھٹک گیا تھا اور میں نے مان لیا تھا کہ اس پر تشدد کیا جارہا ہے۔ اب میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ نہ تھا۔ ندامت کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔

میں الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ طاہر ڈرائنگ روم میں اسی طرح افسردہ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں نفرت کا زہر اتر آیا۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری...!"

طارق نے ریوالور نکال لیا "سوری کے بچے۔ اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔"

طاہر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا "ٹھہرو۔ پہلے میں ناصر عظیم صاحب کی غلط فہمی رفع کردوں۔ دراصل قصور ان کا نہیں۔ کچھ اتفاقات ہی ایسے ہوتے ہیں۔ عظیم بیگ نام کے تو ایک ہی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دس لوگ ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عظیم بیگ نے اپنی بیوی کو قتل کردیا تھا مگر وہ ہماری ماں نہیں تھی۔ ہماری ماں عظیم بیگ کی پہلی بیوی تھی۔ فرزانہ سے اس نے بعد میں مجبوراً شادی کی تھی۔ اس نے عظیم بیگ کو اپنی ناز و ادا کے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ ایک اسپتال میں نرس تھی جہاں عظیم بیگ مہینہ بھر داخل رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی پرائیویٹ وارڈ میں ہوتی تھی اور وہ ایک بدچلن عورت تھی۔ جب وہ کسی پر اپنے حسن کا جادو چلانے میں کامیاب ہوجاتی تھی تو نائٹ شفٹ میں آجاتی تھی۔

فاحشہ...!"

اب تک میں برداشت کررہا تھا لیکن یہ بات سن کے میرا خون کھول اٹھا' میں نے کہا "اس کے بعد تم نے میری ماں کو کچھ کہا تو..."

طارق نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹادیا "پہل تم نے کی تھی۔ ہم نے سب سن کے برداشت کیا تھا۔ اب تمہاری باری ہے' تم سنوگے۔"

طاہر تلخی سے مسکرایا "اگر وہ تمہاری ماں ہوتی ناصر عظیم تو میں تمہارے منہ پر یہ سب نہ کہتا۔ تم فرزانہ نام کی اس نرس کے بیٹے ہوتے تو پھر ہمارے بھی سوتیلے بھائی ہوتے... مگر تم اس کے بیٹے نہیں ہو۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "کیا... کیا مطلب ہے تمہارا؟"

طاہر نے کہا "مطلب یہ کہ فرزانہ نے ہمارے والد کو بلیک میل کیا تھا کہ وہ ان کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اب یا تو مجھ سے شادی کرلو ورنہ میں جاتی ہوں تھانے رپورٹ لکھوانے... اور تھانے سے میں جاؤں گی پریس کلب اور تمام اخبار والوں کو بتادوں گی کہ یہ دولت مند جو اسپتالوں کے پرائیویٹ وارڈز میں بیماری کے بہانے آتے ہیں' دکھی انسانیت کی خدمت گزار مجبور نرسوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

"میرے والد انکار نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے خاموشی سے شادی کرلی اور نکاح نامے پر دستخط کردیے۔ اس میں مہر کی رقم ہندسوں میں دس ہزار لکھی گئی تھی۔ بعد میں اسے ایک صفر بڑھا کے ایک لاکھ کیا گیا اور رقم الفاظ میں بھی لکھ دی گئی۔ گواہ اس کے اپنے تھے اور قاضی زرخرید۔

"اس شادی کا علم ہماری ماں کو اس وقت ہوا جب سوکن گھر

میں آگئی۔ وہ بڑی صابر و شاکر عورت تھی۔ اس نے عام جاہل عورتوں کی طرح رونے پیٹنے اور چیخنے چلّانے کو لاحاصل سمجھا اور تقدیر کے اس فیصلے کو شوہر کی وضاحت کے بعد قبول کرلیا۔ میرے والد نے اعتراف جرم کرلیا۔ اپنی مجبوری بتائی اور ہماری ماں نے اسے معاف بھی کردیا حالانکہ اس کا دل کانچ کے برتن کی طرح بکھر گیا تھا۔ اس آدمی کی خاطر وہ اپنے سارے رشتوں کو قربان کر آئی تھی۔ اس نے اپنی ساری کشتیاں جلادی تھیں۔ ہزیمت قبول کی تھی۔ اپنی محبت کی شکست سے بڑا صدمہ اس کے لیے کیا ہوسکتا تھا۔

"گھر کے نصف حصے پر فرزانہ قابض ہوگئی۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہیں گی۔ مصالحت اور مفاہمت کی ہر کوشش کو اس نے ناکام بنادیا۔ مجھے الگ ٹی وی چاہیے' اپنا فریج چاہیے۔ اس کچن اور کچن کی ہر چیز الگ چاہیے۔ میرے باپ نے سب کچھ کیا۔ اوپر اور نیچے کی منزل میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اب اوپر بھی وہ سب کچھ فراہم کرنا عظیم بیگ کی ذمے داری بن گیا جو پہلے سے نیچے موجود تھا۔ اس کے باوجود فرزانہ کی ہنگامہ آرائی جاری رہتی تھی۔ اس کی انتہا اس دن ہوئی جب فرزانہ نے کہا کہ مجھے بھی ایسی ہی گاڑی چاہیے جیسی تمہاری پہلی بیوی کے پاس ہے۔

عظیم بیگ نے کہا "گاڑی وہ اپنے جہیز میں لائی تھی۔"

اس نے تڑخ کے کہا "طعنہ دے رہے ہو مجھے جہیز کا؟"

"یہ طعنہ نہیں' حقیقت ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہے' اس کا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی" فرزانہ نے چلّا کے کہا "مجھے اس سے کم تر حیثیت قبول نہیں عظیم بیگ۔ میں یہاں شودرن کے نہیں رہوں گی۔"

عظیم بیگ نے بھی دھاڑ کے کہا "کس چیز کی کمی ہے تمہیں' اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"تمہارا باپ بھی کرے گا کمینے" فرزانہ نے چیخ کے کہا۔

عظیم بیگ نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ وہ یہی چاہتی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کے چیخنا شروع کردیا "ارے بچاؤ... مارڈالا... مجھے اس ظالم نے... ہائے میں مرگئی' ارے محلے والو...!"

عظیم بیگ نے اسے پیچھے کھینچا اور کھڑکی بند کردی مگر فرزانہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکی تھی۔ دو تین محلے دار ہمارے دروازے پر آکر گھنٹی بجانے لگے۔ فرزانہ اس وقت بھی چیخ رہی تھی اور خودکشی کرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے ایک راہ گیر اور ایک موٹر سائیکل والا رک گئے تھے۔ پھر کوئی کار میں سے نکلا اور اس نے فرزانہ کو غور سے دیکھا جو بالکونی میں کھڑی چلّا رہی تھی۔

عظیم بیگ کی پوزیشن بہت خراب ہوئی مگر وہ سب لوگوں کے سامنے اس صورتِ حال کی وضاحت کرنے سے قاصر رہا۔ یہ دلیل ایسے وقت میں کوئی تسلیم نہیں کرتا کہ یہ خانگی معاملہ ہے اور کسی کو اس میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں۔ مظلوم عورت کی فریاد ہر مرد کو متاثر کرتی ہے خواہ وہ خود عورت پر اس سے زیادہ ظلم کرتا ہو۔

O☆O

میں زندہ رہنے کے لیے مصنوعی سہاروں کا قائل نہیں' خواہ وہ بیساکھی ہو یا مصنوعی تنفس کی مشین۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے پھیپھڑے یا گردے ناکارہ ہوچکے ہیں چنانچہ وہ مشینی پھیپھڑوں یعنی IRON LUNGS سے سانس لیتے ہیں اور گردوں کے فعل سرانجام دینے والی DYLASIS مشین ان کے خون کو صاف کرتی ہے۔

ایٹم بم اور خلائی شٹل اور سپر کمپیوٹر بنانے والے ابھی تک انسانی جسم کی مشینری کے لیے ایک چھوٹا سا پرزہ نہیں بنا سکے۔ دل یا گردہ دیکھنے میں تو بہت بڑی چیز نہیں لگتے۔

رات مجھے نیند کے لیے ایک گولی کا مصنوعی سہارا لینا پڑا تھا۔ یہ میڈیکل سائنس کی جدید ایجاد خلا نوردوں کے لیے تھی جو ہفتوں اور مہینوں خلا کی وسعت میں سرگرداں رہتے تھے جہاں دن و رات نہیں ہوتے چنانچہ ان کی دنیا کے یعنی انسانی دنیا کے معمولات گھڑی کی سوئیوں کے تابع رہتے ہیں۔ دنیاوی وقت کے مطابق جسم کو خوراک مہیا ہوجاتی ہے اور ایک گولی کھا کے وہ ٹھیک آٹھ گھنٹے تک سکون سے سوتے ہیں اور جاگنے کے بعد اتنے ہی تر و تازہ ہوتے ہیں جتنے عام صحت مند انسان' جو خواب آور گولی استعمال نہیں کرتے۔ عام خواب آور گولی کے اثرات جاگنے کے بعد بھی غنودگی' تھکن کے احساس یا سر کے بھاری پن کی صورت میں محسوس ہوتے ہیں۔ اس خاص گولی سے ایسا نہیں ہوتا۔

وہ ڈائری میرے سرہانے موجود تھی جسے میں نے سونے سے پہلے کچھ دیر پڑھا تھا۔ عام طور پر لیٹنے کے بعد دس پندرہ منٹ تک کوئی کتاب پڑھ کے مجھے نیند آجاتی تھی۔ بعض اوقات کتاب میرے ہاتھوں سے گرجاتی تھی اور مجھے پتا نہیں چلتا تھا۔ گزشتہ شب ذہن بے قابو ہورہا تھا۔

بیڈ سائڈ ٹیبل پر تین فون خاموش پڑے تھے۔ میں نے خود ہی ان کا رابطہ ساری دنیا سے منقطع کردیا تھا۔ صرف ایک سفید ٹیلی فون کی ننھی سی سرخ روشنی مجھے بتارہی تھی کہ انٹرکام سسٹم کام کررہا ہے۔ سینٹرل ائرکنڈیشننگ کا سسٹم بھی کام کررہا تھا۔ میں نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک بٹن دبا کے دیکھا۔ میرے سامنے والی دیوار پر ٹی وی اسکرین روشن ہوگیا۔ الیکٹرانک سیکیورٹی سسٹم بھی کام کررہا تھا۔ سارے سسٹم اپنی تمام موروثی اور طبعی خرابیوں کے باوجود اسی

طرح کام کر رہے تھے اور یہی سب سے بڑی خرابی تھی کہ ہر سسٹم کی خرابیوں کو سمجھنے والے' سمجھانے والے اور انہیں دور کرنے کی پوری صلاحیت رکھنے والے بھی کچھ نہیں کر رہے تھے۔ سوائے مزید خرابیاں پیدا کرنے کے کیونکہ یہی ان کے مفاد میں تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتے تھے۔

"شاہ پیلس" کے بلند و بالا آہنی گیٹ پورے کھلے ہوئے تھے۔ گیٹ پر کمانڈو ٹاپ گن مین پوری طرح مستعد کھڑا ہوا تھا۔ اس گیٹ سے اندر آنے والا راستہ وسیع نیم دائرہ بناتا ہوا پورچ سے گزر کے دوسرے گیٹ تک جاتا تھا جو باہر جانے کے لیے مخصوص تھا۔ بلند فصیل کے پیچھے کا منظر دوسرے گیٹ پر نصب کیمرے سے نظر آتا تھا۔ میں نے ریموٹ سے چینل بدلا تو ٹی وی سیٹ پر وہ عالی شان کاریں نظر آنے لگیں جو شاہ پیلس کے باہر روک دی گئی تھیں۔ ان میں لیل پیکر لینڈ کروزر' پجیرو' نسان پٹرول جیسی فور وہیل ڈرائیو لگژری ماڈل کے ساتھ شاہانہ مزاج اور جاہ و جلال رکھنے والی سبک خرام مرسیڈیز بھی تھیں اور ان کی حریف ذرا ادنیٰ نسل کی سمجھی جانے والی جاپانی اکارڈ' لانسر اور ٹویوٹا بھی۔ ان سب میں ایک بات بہرحال مشترک تھی۔ ان پر سفید فاختہ والے نیلے پرچم بڑی خوب صورتی سے ڈھانپ دیئے گئے تھے۔ سوگ کی علامت کے طور پر۔

شاہ پیلس کے پورچ پر سونے جیسی آب و تاب رکھنے والے پیتل کے ماسٹ کی بلندی پر لہرانے والا خالص ریشم کا وسیع نیلا جھنڈا بھی آدھی بلندی پر سرنگوں تھا اور فاختہ جو ہوا میں پر پھیلائے پرواز کرتی نظر آتی تھی اس پرچم کی شکنوں میں چھپی بیٹھی تھی۔

اس نصف دائرے کے سرسبز لان میں جو بیرونی فصیل اور دونوں گیٹوں کو ملانے والی سڑک کے درمیان تھا' صرف ایک میز لگی ہوئی تھی۔ اس پر نیلے پرچم کو میز پوش کی جگہ استعمال کیا گیا تھا اور اس پر نیلی جلد والا ایک ضخیم رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے شاہ پیلس آنے والے اس تعزیتی کتاب میں اپنے تاثرات قلم بند فرما رہے تھے۔ یہ وی آئی پی کلچر کا ڈپلومیٹک ڈراما تھا۔ میں نے بھی کئی بار کیمروں اور فلیش لائٹس کی طرف دیکھے بغیر انتہائی رقت انگیز چہرے اور نمناک آنکھوں کے ساتھ تعزیتی کتابوں میں بقلم خود بہت کچھ لکھا تھا۔ ہر ایرے غیرے کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اس میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے پہنچ جائے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ تاثرات بیان کرنے والے کا وی آئی پی ہونا شرط ہے۔ لواحقین بعد میں اسے فخریہ دیکھتے ہیں۔ دیکھو صاحب' صدر نے کیا لکھا ہے اور یہ وزیراعظم کی تحریر ہے۔ ہاں' چاروں گورنر بھی آئے تھے... کون سا پانچواں گورنر؟... اوہ' یو مین گورنر اسٹیٹ بینک۔ آف کورس۔ صفحہ نمبر تیرہ دیکھو۔

جو کچھ ایسی تعزیتی کتابوں میں لکھا جاتا ہے ان میں سچ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا جلسۂ عام کی سیاسی تقریروں میں جو انتخابات سے پہلے کی جاتی ہیں۔ اس منافقت کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ ایسا کون ہے جو صاف لکھ سکے کہ مرنے والا پہلے معمولی بدمعاش تھا۔ پھر ہسٹری شیٹر ہو گیا۔ ڈرگ مافیا میں شامل رہا اور کروڑوں صرف کر کے اسمبلی میں پہنچ گیا۔ وزیر بنا اور منشیات کے خلاف بہت سے ملکوں میں ہونے والے سیمیناروں میں پاکستانی وفد کا قائد بنا۔ اس کے ہوتے کسی شریف آدمی کی عزت' کسی عورت کی عصمت' سرکاری خزانہ' سیاسی حریف' قانون کا احترام' آئین کی بالادستی' ملک کا وقار' کچھ بھی محفوظ نہ تھا۔ اس پر خدا کی لعنت۔ وہ انسان نہیں' شیطان تھا۔

اتنا کھلا اور خالص سچ بولنے والا اگر کہیں ہے تو اسے ایک بار یہ موقع فراہم کرنے کے بعد کسی شیشے کے تابوت میں کیمیائی عمل سے محفوظ کر کے قومی عجائب خانے میں یادگار کے طور پر رکھ دینا ضروری ہے۔ اس عبارت کے ساتھ کہ "آخری سچا پاکستانی" تاکہ آنے والی نسلیں اپنے ماضی پر اسی طرح فخر محسوس کریں جیسے ہم کرتے ہیں۔

یہ تماشا اب ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس ملک میں اتنے وی آئی پی کہاں ہیں کہ چہلم تک صبح سے شام تک قطار بنائے کھڑے رہیں اور اپنے دلی رنج و غم کی تحریر سند چھوڑنے کے لیے تعزیتی کتاب تک رسائی کے لیے اپنی باری کا انتظار کریں۔

ویسے بھی لائن میں لگنا اور باری کا انتظار کرنا کسی بھی وی آئی پی کے لیے قابلِ شرم اور باعثِ توہین بات ہے۔

میں نے ایک اور چینل بدل کے دیکھا۔ میرے دستِ راست یعنی دونوں نائب صدور کی گاڑیاں پورچ سے ذرا آگے والے پرائیویٹ پارکنگ ایریا میں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس کے پیچھے میرے گیراج تھے پھر چند چینل بدل کے میں نے دیکھا تو شاہ پیلس کے کانفرنس روم کا منظر سامنے آ گیا۔ اس سینما جیسے طویل ہال میں بلوریں فانوس قطار سے آویزاں تھے۔ ان کے نیچے سیاہ پالش سے چمکتی برما ٹیک کی وہ لمبی میز تھی جس کے گرد بہتر افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ پینتیس ایک طرف' پینتیس ہی دوسری طرف اور دو آمنے سامنے۔ میز پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گلدانوں میں تازہ پھول سجا دیئے گئے تھے۔ ہر کرسی کے سامنے ایک مائیکروفون تھا۔ ایک نوٹ پیڈ اور پانی کا ایک گلاس جو ابھی خالی تھا۔

سرخ زمین اور نیلے پھولوں والے ایرانی قالینوں پر خاموش اور باادب ویٹر بے آواز قدموں سے چل رہے تھے۔ کانفرنس ٹیبل کے پیچھے دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیوں کی دوسری قطار تھی۔ ان پر کسی کانفرنس میں شریک وزیروں' سفیروں اور اعلیٰ عہدے داروں کے معاون و مددگار ضروری فائلیں لے کر بیٹھتے تھے یا مدعو کیے جانے والے صحافی۔

ابھی وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ملازمین دس بجے ہونے والے مزار کمیشن کے خصوصی اجلاس کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

گیسٹ ہاؤس ہر رات خاص خاص لوگوں سے بھرا رہتا تھا جو فرطِ غم سے اتنے بے حال تھے کہ بار بار ان کے مشک جیسے پھولے ہوئے پیٹ سے ٹھنڈی آہ نکلتی تھی یا شیرمال' قورمے کی خوشبو بھری ڈکار۔ رات کو سکون کے لیے وہ اپنے غم کو امپورٹڈ اسکاچ وہسکی اور فرانسیسی شیمپین کے جامِ شراب میں ڈبو دیتے تھے۔ یہ غم بھی بڑا سخت جان تھا۔ غیرت مند تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے ہیں۔ یہ غم مسلسل جام پر جام اتارنے کے باوجود باقی رہتا تھا پھر ان کا حوصلہ اور حواس ہی جواب دے جاتے تھے اور بس یہی مدہوشی علاجِ غم تھی۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو...!

میری زندگی میں بھی خود کو میرا دوست اور مخلص ساتھی کہنے والے یہی لوگ میرے اصل دشمن ثابت ہوئے تھے۔ میری موت نے اور بہت سے چہرے بے نقاب کر دیئے تھے لیکن یہ میرے لیے کوئی غیر متوقع یا صدمے کی بات نہیں تھی۔ میں خود بھی ان کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ مجھے ان کی حمایت' ان کے اثر رسوخ کی طاقت اور ان کے وسائل کی دولت سے غرض تھی۔ ہوا کا رخ بدلتا دیکھ کے کچھ تو پہلے ہی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے' کچھ اچانک نجی نوعیت کے کاروباری دورے پر بیرونِ ملک چلے گئے تھے اور کچھ "بیمار" ہو گئے تھے۔ اس حد تک کہ انہیں علاج کی غرض سے باہر جانا پڑا۔

یہ دور اندیش لوگ تھے۔ انہوں نے سارے راستے کھلے رکھے تھے۔ ان کے اشارے پر اخبار نویس کبھی مبہم اور کبھی واضح اشاروں میں بتا رہے تھے کہ ان کی خاموشی کیا معنی رکھتی ہے۔ ایک کالم لکھنے والا کہتا تھا کہ وہ سیاسی اختلافات کے باعث علیحدگی اختیار کر چکے ہیں تو دوسرا فوراً اس کی نفی کرتا تھا کہ ان کی وفاداری تو شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ لوگ آئندہ انتخابات تک سیاسی اونٹ کے کسی کروٹ بیٹھنے کے امکانات کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ کبھی تردید اور کبھی تائید سے واضح کر دیں گے کہ وہ برائے فروخت ہیں۔ پارٹی کی ہائی کمان بھی ان سے رجوع کر سکتی ہے۔ یہ موقع انتشار کا نہیں' اتحاد کا مظاہرہ کرنے کا ہے تاکہ عوامی جذبات کے ووٹ بینک میں کمی نہ ہو۔ حکومت انہیں وزارت پیش کر سکتی ہے تاکہ پارٹی میں قیادت کا بحران آ جائے۔

کرکٹ ورلڈ کپ کے فائنل میں مقابلہ اسی وقت سنسنی خیز ہوتا ہے جب روایتی حریف' پاکستان اور بھارت کھیل رہے ہوں۔ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔ کھیل کے میدان سے اپنے ملک اور دنیا میں ہر جگہ تماشائیوں کے جذبات میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوجوں کی طرح ہوں۔ کھیل جائے بھاڑ میں' ایسی کی تیسی اصولوں کی۔ اسپورٹس مین شپ پر لعنت۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ فتح اور صرف فتح۔ ہر قیمت پر۔ دشمن کی عبرتناک' ذلت آمیز شکست۔ یہ انا کا' قومی وقار کا اور ملک کی آبرو کا مسئلہ ہے۔

میری حیثیت تماشائی سے بھی بڑھ کر نازک اور حساس ہے۔ پہلے میں ایک ٹیم کا کپتان تھا۔ اب میری حیثیت چیف سلیکٹر کی ہے یا کوچ کی۔ یہ ٹیم میں نے بنائی تھی۔ اس کی فتح و شکست میرے لیے فنا و بقا کا مسئلہ ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے جانشین کتنے باصلاحیت ہیں۔ وہ ایک منظم اور مؤثر قوت ہیں یا نہیں۔ دعا تو دل سے ہو گی مگر عملی طور پر سازش یا جوڑ توڑ سے ہار کو جیت میں بدلنے کے لیے میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔ حالانکہ ابھی فیصلہ کن مرحلہ نہیں آیا۔

میں نے اس دنیا کو چھوڑ دیا تھا مگر میں بالکل اکیلا نہیں تھا۔ میں نے کانفرنس روم کی کارروائی کو ریکارڈ کرنے کے لیے وی سی آر میں ٹائمر کو سیٹ کیا۔ دس بجے والی کارروائی کے گیارہ بجے شروع ہونے کا امکان تھا۔ درمیان میں لنچ... سوری' نماز کا وقفہ آ جاتا اور دوسرا سیشن شام تک جاری رہتا تب بھی لانگ پلے پر چار گھنٹے چلنے والا ایک کیسٹ آٹھ گھنٹے تک ریکارڈنگ کر سکتا تھا۔ میں نے ساڑھے دس بجے کا ٹائم سیٹ کر دیا۔ شام ساڑھے چھ بجے تک اجلاس کا کسی فیصلے پر پہنچے بغیر ختم ہو جانا یقینی تھا مگر میں یہ دلچسپ

ڈراما دیکھنا چاہتا تھا۔

لائٹس اور ائرکنڈیشنر بند کرکے میں نے باتھ روم کا رخ کیا اور اس کا الیکٹرانک دروازہ کھولا۔ ایک نظر میں یہ دروازہ نظری نہیں آتا تھا کیونکہ تمام دیواروں پر پالش کی ہوئی پلائی ووڈ کی انسولیشن تھی اور جوڑ کہیں محسوس نہ ہوتا تھا۔ اصل باتھ روم اور وارڈروب بھی دیوار کا حصہ تھے نگران کے دروازے آسانی سے تلاش کیے جاسکتے تھے اور کھولے جاسکتے تھے۔ اس کونے والے باتھ روم کا راستہ کوئی دریافت نہیں کرسکتا تھا۔ ایک بٹن دبانے سے دیوار میں خلا نمودار ہوتا تھا جو اندر داخل ہوتے ہی برابر ہوجاتا تھا۔

دوسرا بٹن دباتے ہی باتھ روم لفٹ کی طرح اوپر چل پڑا اور سطح زمین تک پہنچ کے رک گیا۔ تیسرے بٹن نے بائیں جانب کا راستہ کھول دیا اور میں ایک مختصر سی سرنگ میں داخل ہوگیا جو شاہ پیلس کے پچھلے حصے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ یہ دہری دیوار ایسے بنائی گئی تھی کہ تین فٹ چوڑے خلا کو کسی ماہر انجینئر کی نظر بھی تلاش نہیں کرسکتی تھی۔ عقبی حصے میں ٹینس کورٹ تھا اور سوئمنگ پول تھا۔ یہ سرنگ سوئمنگ پول کی چوڑائی کے رخ دیوار کے ساتھ ساتھ تھی۔ میرے بائیں ہاتھ والی دیوار کے دوسری طرف سوئمنگ پول کا پانی تھا۔ میرے قد کی بلندی سے دو فٹ اوپر سرنگ کی چھت تھی جس پر پول سائڈ لان تھے۔ اس لان پر خوب صورت رنگین کرسیاں تھیں اور درمیان کی میز پر قوسِ قزح کے سات رنگوں والی چھتریاں' سوئمنگ پول کے چاروں طرف سرخ' سبز اور نیلے رنگوں والی روشنیاں تھیں۔ انہیں موڈ' موسم اور ماحول کے مطابق روشن کیا جاتا تھا۔ زندگی کے ان گنت خوب صورت پُرمسرت اور مدہوش کردینے والی راتوں کی خلوت کے لمحات' میری یادوں میں زندہ تھے۔ جب چودھویں رات کا چاند سوا نیزے پر آتا تھا تو چاندنی میں چاندی کے بدن شفاف پانی میں یوں آگ لگاتے تھے کہ مصنوعی روشنی کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ ان بے حد پرائیویٹ محفلوں میں آنے والے چند خاص لوگ ہوتے تھے۔ خفیہ انفراریڈ کیمرے کی آنکھ نے ان سب کی شرافت اپنے اصل روپ میں بے حجاب دیکھی تھی اور شرم سے اپنی آنکھ بند بھی نہیں کی تھی۔ مناسب طور پر ایڈٹ کی ہوئی یہ فلمیں میرے پاس محفوظ تھیں کہ سند رہیں اور وقتِ ضرورت کام آئیں لیکن برا وقت آئے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ میں نہ مومن تھا نہ سپاہی اور تیغ اس قاتل کے ایک ہاتھ میں تھی جس نے دوسرے ہاتھ سے میزانِ عدل تھام رکھی تھی۔

شاہ پیلس کے بالکل پیچھے' اس کی عقبی فصیل پر لگی ہوئی کانٹے دار تاروں کی باڑھ اور سرچ لائٹس والی فصیل سے ملی ہوئی دوسری دیوار ہے۔ پیچھے والے عام سے گھر کی جو باہر سے دیکھنے میں آسیب زدہ لگتا ہے کیونکہ اس کی بیرونی دیواروں کا سارا رنگ دھوپ میں اڑگیا ہے یا بارش میں بہہ گیا ہے۔ آخری بار اس پر کب رنگ ہوا تھا' اس کے موجودہ مکین بہرحال نہیں جانتے جو یہاں دس گیارہ سال قبل آئے تھے۔

اس گھر کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ یہ بھی ہزار گز پر بنی ہوئی قدیم طرز کی کوٹھی ہے۔ اس کے دو گیٹ ہیں۔ ایک گیٹ کو آج تک کسی نے نہیں کھولا۔ اس کے سامنے سڑک کی طرف اور اندر لمبی لمبی گھاس اور جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ دوسرا گیٹ بھی عموماً بند نظر آتا ہے' کچھ لوگوں نے کبھی کبھی یہاں سے انیس سو بیالیس ماڈل کی ملٹری جیپ کو نکلتا دیکھا ہے جس کو ایک سفید تراشی ہوئی داڑھی اور گھنے سفید بالوں والا بوڑھا چلا رہا ہوتا ہے۔ سردی گرمی بوڑھے کا لباس ایک ہی رہتا ہے۔ وہ سفید زین کی پتلون' سفید اسپورٹس شرٹ اور ٹینس شوز پہنتا ہے' اس کے چاندی جیسے چمکتے بالوں کی سفیدی سے اس کی عمر کا اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے مگر اس کی صحت قابلِ رشک ہے۔ صرف ایک بار دیکھنے والوں نے یہ دیکھا تھا کہ اس نے ڈکیتی کی نیت سے آنے والے چار افراد کو خالی ہاتھوں سے دھن کرڈال دیا تھا حالانکہ وہ سب جوان اور صحت مند تھے۔ پولیس انہیں سڑک پر سے اٹھاکے لے گئی تھی۔ یہ کرنل خان ہیں۔

کچھ لوگوں نے یہاں ایک لڑکی کو بھی دیکھا ہے جو اسی طرح سرتاپا سفید لباس میں' لمبے گھنے سیاہ بال کھولے اکثر چاندنی راتوں میں چھت پر نظر آتی ہے۔ کبھی رات کو گھر میں سے ستار بجانے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ لڑکی دوپہر کی دھوپ میں ننگے پاؤں چھت پر کھڑی کبوتر اڑاتی رہتی ہے اور انہیں چکر کاٹ کے واپس آتا دیکھتی رہتی ہے۔ وہ کبوتروں کو اشاروں سے کنٹرول کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ریموٹ سے ٹی وی کو ہی نہیں' کھلونوں کو اور تباہ کن بموں کو بھی کنٹرول کیا جاتا ہے۔ کبوتر اس کے خاموش اشاروں پر یا اس کی آنکھوں سے خارج ہونے والی غیر مرئی شعاعوں کے پیغام کو سمجھتے ہوئے اوپر اٹھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ نیلے آسمان میں ایک دھبا سا بن جاتے ہیں۔ پھر ایک دائرے میں اڑنے لگتے ہیں۔ دائرے کو پھیلا لیتے ہیں۔ پھر قطار میں پرواز کرتے ہوئے نہ جانے کدھر چلے جاتے ہیں اور مخالف سمت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اترنے لگتے ہیں اور پھر جیسے حکم ملتا ہے کہ لوٹ جاؤ تو وہ پَر پھیلا کے کسی اور سمت میں نکل جاتے ہیں۔

یہ لڑکی برسات کی موسلا دھار بارش میں چھت پر کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی نظر آتی ہے اور اسے بالکل پتا نہیں ہوتا کہ آس پاس کی چھتوں پر بارش میں نہانے والے اس کے بھیگے ہوئے کپڑوں میں سے اس کے سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے شفاف بدن کو کیسی دزدیدہ' للچائی ہوئی اور ہوسناک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے جسم کے سارے پیچ و خم اور نشیب و فراز۔ لہراتے

خطوط' گولائیاں اور قوسیں دستِ قدرت کے حسن آفریں صناع ہاتھوں کے کمالِ ہنر اور تخلیقی ذوقِ جمال کا شاہکار ہیں۔

یہ چاندنی ہے۔ کرنل خان کی پوتی۔ چندا۔ جو اسے پری۔ بدروح' چڑیل یا پاگل سمجھتے ہیں وہ خود پاگل ہیں۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور اندازہ کرلیا کہ خان اعظم اس وقت کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔ جب میں سرنگ سے نکلا اور میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو وہ شیشے کی طرح چمکتے سیمنٹ کے فرش پر دونوں ہاتھوں کے بل الٹے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے جوتے وہیں اتارے اور ننگے پاؤں چلتا ہوا ان سے چند قدم کے فاصلے پر خاموش کھڑا ہوگیا۔ خان اعظم کا جسم کڑی کمان بنا ہوا تھا۔ ان کے پیر آہستہ آہستہ نیم دائرہ بناتے ہوئے فرش کو چھونے کے لیے پیچھے کی طرف بڑھے۔ ان کی کمر کا خم ایک قوس بنانے لگا۔ پھر وہ ایک دائرے کی شکل میں ساکت ہوگئے۔ ان کے پنجے اٹھے ہوئے تھے اور گردن یوں پیچھے گھوم گئی تھی جیسے اس میں کوئی ہڈی نہیں ہے۔ وہ کسی پہیے کی طرح گھومے اور پیٹ کے بل ہوگئے۔ دائرہ مکمل رہا۔ اس میں کوئی جھول یا لچک پیدا نہیں ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس دائرے نے پھر حرکت کی اور وہ پہلے والی پوزیشن میں آگئے۔ انہوں نے اپنے سر کو بڑی احتیاط سے اوپر اٹھانا شروع کیا۔ ان کا جسم اسی طرح تنا رہا۔ سیدھا ہونے کے بعد وہ گھٹنوں کے بل ہوگئے۔ ان کے پیر پیچھے ہی رہے مگر ہاتھ آگے گھٹنوں پر آگئے۔ انہوں نے قیام جیسی حالت میں آنکھیں بند رکھتے ہوئے لمبی گہری سانس لی اور آنکھیں کھول کے سانس خارج کردی۔

ان کے لبوں پر خفیف سی مگر شفیق اور زندگی کے توانا جذبوں سے معمور مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

میں ان کے سامنے دوزانو ہوکے بیٹھ گیا "السلام علیکم خان اعظم۔"

"وعلیکم السلام۔ جمورے" انہوں نے اپنی پُرسکون آواز میں کہا۔

میں نے کہا "اب تو مجھے جمورا نہ کہیں۔"

"کیا تو خود کو مداری سمجھنے لگا ہے' تو جمورا ہے۔"

میں نے کہا "سب کچھ تو سکھادیا ہے آپ نے۔"

"سب کچھ!" خان اعظم نے کہا "سب کچھ صرف وہ جانتا ہے جس نے یہ کائنات تخلیق کی۔ جس کی وسعت کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا اور جس کے قبضے میں اس عاجز اور حقیر بندے کی ہر سانس ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں اس خیال سے کہ میں کچھ جانتا ہوں اور جو خود بے شعور' بے بصیرت اور جاہل ہو' وہ کسی اور کو کیا سکھا سکتا ہے جمورے۔"

ہمیشہ کی طرح ان کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کے اپنے چہرے کے سامنے کرلئے تھے۔

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں خان اعظم۔"

"بندے نے کمال کا گمان کیا تو جانو اس کا زوال آغاز ہوا۔ جمورے' آج تو اجنبی بن کے کیوں آیا ہے؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے خفت سے کہا۔

"تو مجھے خان اعظم کہتا ہے اور انکار بھی کرتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "میں احتجاج کررہا ہوں۔ آپ نے جمورے جمورے کی رٹ جو لگا رکھی ہے۔"

"میں تجھے احساس دلانا چاہتا ہوں کہ تو مداری نہیں ہے۔ تو نے دیکھ لیا تماشا کھیل مداری کا۔"

میں نے افسردگی سے کہا "ہاں خان جی۔"

"اچھا رونی شکل مت بنا۔ چل ناشتا کر۔ میرے ساتھ۔"

"آپ کے ساتھ" میں نے سہم کے کہا "خان جی۔ رحم۔۔۔"

"خدا نے بڑا رحم کیا تجھ پر" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا چھ فٹ دو انچ قد استقامت اور بے خوفی سے سربلندی کی علامت تھا۔ میں نے ان کے ساتھ خالی سپاٹ دیواروں والے اس کمرے کو عبور کیا جو خان اعظم کے لئے عبادت گاہ کی طرح تھا۔ یہاں وہ پنج وقتہ نماز ادا کرتے تھے۔ جسم اور روح کی صحت مندی' طہارت اور ہم آہنگی کے لئے ریاضت کرتے تھے۔ ذہن کی یکسوئی' روشنی اور کشادگی کے لئے مراقبہ اور یوگا کی مشق سے چندا کی تعلیم و تربیت۔ میری اور اس کی دفاعی صلاحیت کے لئے مارشل آرٹ کی پریکٹس سب کچھ یہیں ہوتا تھا۔ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر تھا اور ایک ضابطۂ کار۔ ان کا بنیادی فلسفۂ حیات تھا کہ ایک وقت میں ایک ذہن اور ایک جسم کی ساری صلاحیت اور توانائی ایک ہی مرکز پر رکھو۔ یہی وجہ تھی کہ اس خالی کمرے کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ جب تم کوئی ایک کام انجام دو تو باہر بھی تمہاری توجہ ہٹانے والی کوئی چیز نہ ہو اور تم کو اپنے خیال پر کنٹرول حاصل کرنا آسان ہو۔ پھر خیال تمہارے جسم کو کنٹرول کرے گا۔ سو فیصد کنٹرول حاصل کرنا انسان کے لیے ناممکن ہے مگر حیوان کے مقابلے میں انسان صرف خیال کے باعث افضل ہے۔ محبت' نفرت' لالچ' حسد' اشتعال اور کمزوری۔۔۔ سب خیال کے منفی ردِعمل ہیں۔ خیال کو کنٹرول کرو۔

اس کمرے کو ہم سب باری باری صاف کرتے تھے۔ اس میں خود جھاڑو دیتے تھے۔ پھر فینائل میں بھیگا ہوا کورا کپڑا لے کر اس کے فرش کو اور دیواروں کو صاف کرتے تھے۔ خشک کپڑے سے فرش کو چمکاتے تھے۔ خان اعظم کے نزدیک یہ خدمت حصولِ مقصد میں آسانی کے لیے تھی۔ "اگر لگن نہ ہو تو کوئی کام مت کرو۔ بے کار سمجھو گے تو بیزار ہوجاؤ گے۔"

ہم ساتھ والے کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گئے' آلتی پالتی مار کے ہم نے ایک فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی جاپانی طرز کی ڈائننگ ٹیبل درمیان میں کھسکالی۔ اس آٹھ فٹ لمبی میز کے نیچے رولر تھے۔ کھانے کے بعد اسے دیوار تک کھسکا کے سیدھا کھڑا

کردیا جاتا تھا اور ایک کپ اسے دیوار پر منطبق رکھتا تھا۔

چندا نے اُبلی ہوئی سبزیوں کا ایک باؤل ہمارے درمیان رکھا۔ پھر دودھ کا جگ لائی۔ اُبلے ہوئے بغیر زردی والے انڈے۔ براؤن بریڈ کے سلائس۔ بغیر دودھ اور چینی کی چائے۔ میری بھوک مرگئی۔ خان اعظم نے اپنے لیے ایک پیالی میں اُبلی ہوئی سبزیاں نکالیں۔ پھر اس میں اُبلے ہوئے انڈے توڑ کر ڈالے اور چمچ سے کھانا شروع کردیا۔

میں نے فریادی نظروں سے چندا کی طرف دیکھا۔ وہ بدن پر پھسلنے والے سفید ریشم کی ڈھیلی شرٹ اور سوتی پاجامہ پہنے آ جا رہی تھی۔

میں نے کہا "چندا۔ میں نے رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔"

وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے پلٹی "اوّل تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اور اگر سچ ہے تو پھر میں کیا کروں؟"

"مجھے کچھ کھانے کو لادو۔ میرا مطلب ہے انسانوں کے کھانے کی کوئی چیز۔ پراٹھے' تلے ہوئے انڈے۔ مغز نہاری' چائے۔"

"شرافت سے کھالو جو سامنے ہے ورنہ اٹھ جاؤ۔ یہ ہوٹل نہیں ہے کہ آرڈر دیا اور چیز آگئی۔"

"دیکھونا۔ تمہارے ہاتھ کے پراٹھے تو وہ نعمت ہیں جو امریکی صدر کے نصیب میں نہیں اور تمہارے انڈے.... میرا مطلب ہے جو تم فرائی کرتی ہو۔"

"یاد ہے پچھلی مرتبہ تم نے کیا کہا تھا؟"

میں نے معصومیت سے سوال کیا "کیا کہا تھا؟"

"آپ نے فرمایا تھا کہ پراٹھے اتنے مضبوط ہیں کہ باٹا والوں کو جوتے کے سول بنانے کی یہ ایجاد تم سے خرید لینی چاہیے۔ لکڑی کے بُرادے میں تارکول ڈال کے گینڈے کی چربی میں تلا ہے۔"

"میں نے جھک ماری تھی۔ بکواس کی تھی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں ڈیئر چندا۔" میں نے آواز میں رقت پیدا کی۔

"تم پھر جھک مارو گے' بکواس کرو گے...."

"تمہارے اس سر کی قسم جو اندر سے خالی ہونے کے باوجود مجھے عزیز ہے۔ تم سچ مچ وہی چیز بنالاؤ۔ جس کا ابھی حوالہ دیا تھا' تب بھی میں خندہ پیشانی سے کھاکے کہوں گا' جزاک اللہ۔ دیکھو میں خان اعظم نہیں ہوں۔ میری قوتِ برداشت اتنی کم ہے کہ یہ خوراک کھاکے میرا جینا محال ہے۔"

"پھر تو یہی کھاؤ تاکہ دنیا کی اور میری جان چھوٹے۔"

اب خان جی نے کہا "چل بیٹا۔ لادے اسے پراٹھا۔"

اس نے پیر پٹخ کے احتجاج کیا "دادا جی۔ آپ کیوں حمایت میں بولتے ہیں.... خدمت بھی کرو اور باتیں بھی سنو۔"

"ارے ایسے ہی تنگ کرتا ہے تجھے۔ تیرے سوا کسی اور کی تعریف نہیں سنی میں نے اس کے منہ سے۔"

وہ پگھل گئی "اچھا۔ صرف پراٹھا لا رہی ہوں میں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "انڈا فرائی کرنا مجھے بھی آتا ہے۔"

ایک چولھے پر اس نے پراٹھا تلنے کے لیے توا رکھا۔ دوسرے پر میں نے فرائی پان میں گھی ڈالا۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ میں نے فریج میں سے دو انڈے نکالے۔ ایک انڈا فرائی پان کے اوپر رکھا اور چھری ایسے ماری جیسے اناڑی قصاب بغدے سے گوشت کاٹتا ہے۔ نتیجتاً' خ انڈا چھلکے سمیت دھواں دیتے گھی میں گرا۔ ایک چھینٹا اچھل کے میرے ہاتھ پر آیا۔ میں نے ایک ہاتھ آنکھ پر رکھ کے کراہتے ہوئے کہا "آہ.... میں کانا ہوگیا۔"

وہ زور سے ہنسی "چلو دوسرا انڈا ڈالو۔ اندھے ہو جاؤ گے۔"

میں نے دوسرا انڈا بڑی نزاکت اور مہارت سے توڑا "یہ جو ظالمانہ سلوک تم میرے ساتھ کرتی ہو' اس کا بدلہ میں ضرور لوں گا" میں نے چولھا بند کرکے فرائی پان میں سے آدھے جلے ہوئے انڈوں کا ملغوبا پلیٹ میں منتقل کیا۔

"تم ہو اسی قابل۔ بدلہ تم کیا لوگے۔" وہ میرا مذاق اڑاتی رہی۔

"دیکھ لینا۔ ایک دن سب کے سامنے نکیل ڈالوں گا...."

"چلو' بڑے آئے نکیل ڈالنے والے۔ وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔"

میں نے غیر موجود داڑھی پر ہاتھ پھیرا "وہ دن ضرور آئے گا چندا۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ خان اعظم کا ووٹ میرے حق میں ہے۔"

"مجھے ویٹو پاور دے رکھی ہے دادا جان نے۔ یہ لو' ٹھونسو" اس نے پراٹھے پلیٹ میں رکھ کے مجھے تھما دیے۔

میں کچن کے دروازے میں رک کے پلٹا "چندا۔ کیا واقعی یہ ناممکن ہے۔ کوئی صورت نہیں...."

"ایک صورت ہے" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"وہ کیا صورت ہے؟"

"یہ جو کچھ تم کرتے ہونا' یہ سب چھوڑ دو۔ انسان کے بچے بن جاؤ۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سنجیدگی سے کہا۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ یہ مشکل ہی نہیں' ناممکن تھا۔

ناشتے کے بعد میں اور کرنل خلوت کدے میں آگئے۔ انہوں نے دروازہ بند کردیا۔ ہم دو زانو ہوکے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ خان اعظم نے آنکھیں بند کرلیں "تمہارے ذہن میں کیا خیال ہے؟"

"چندا کا" میں نے اعتراف کیا۔

"اس خیال کو نکال دو۔ یہ لاحاصل ہے' اپنے لیے سوچو۔"

میں نے چند سیکنڈ کے بعد کہا "کیا سوچوں؟"

"تم ایک جنگل میں ہو۔ تمہارے ہر طرف سانپ ہیں۔ سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔ کچھ صرف ڈنک مارتے ہیں۔ اس سانپ کو دیکھو جو سب سے زیادہ زہریلا ہے۔ اسے پہچانو' ایسے بہت سے سانپ ہوں گے۔ اب اسے دیکھو جو قریب ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کرکے کہا "میں اسے دیکھ رہا ہوں خان جی۔"

"تم اسے پکڑ سکتے ہو؟"

"ہاں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں" میں نے یقین سے کہا۔

"پھر اسے پہلے ختم کردو" خان اعظم نے کہا "دشمن کبھی رحم کا مستحق نہیں ہوتا۔ جارحیت ہی سب سے مؤثر دفاع ہے۔"

"میں سب کو ماردوں گا۔"

"ایک ساتھ؟ نہیں' ایک وقت میں ایک سے نمٹو۔ اسے لاٹھی سے مت مارو۔ لاٹھی ٹوٹ جائے گی تو تم نہتے رہ جاؤ گے۔ اسے دودھ پلاؤ اور مارو۔ زہر کو زہر سے مارو۔ اب جاؤ۔"

میں اٹھا اور جوتے پہن کے باہر آگیا۔ برآمدہ دراصل دو فٹ اونچا چبوترا تھا جس کا فرش سرخ سیمنٹ سے بنایا گیا تھا مگر اب جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا تھا۔ گول ستونوں کا پلاسٹر بھی جھڑ رہا تھا۔ برآمدے میں کھلنے والی سب کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ ایک دروازے کا پٹ تھوڑا سا ہلا۔

"ہے۔ جھورے!" چندا نے جھری سے جھانک کے کہا۔

اُلو کی پٹھی۔ غصے سے میرا برا حال ہوگیا مگر میں اندر چلا گیا "کیا بات ہے؟ شامت آئی ہے تمہاری؟"

وہ ایک رنگین پھول دار شرٹ پر استری کرچکی تھی "یہ پہن لو اور یہ لو" اس نے مجھے جینز کی لنڈے بازار والی پتلون تھمادی۔

"یہ.... لنڈے بازار کی پتلون!"

"ہاں۔ لیکن میں نے دھودی ہے بلکہ خوب ابالی ہے۔ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ۔" وہ ہنسی "کیا پتا وہ مرا ہو ایڈز سے' تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

اس نے بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا تھا مگر میرے لیے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اسے میرا خیال تھا۔ میں اس کے ساتھ کوئی شرارت کرنا چاہتا تھا مگر وہ پہلے سے ہوشیار تھی۔ ایسی کوئی بھی ناشائستہ حرکت میرے لیے مزید شرمندگی کے اسباب پیدا کرتی۔ وہ مجھے اِدھر اُدھر پھینک دیتی اور ہاتھ جھاڑ کے کھڑی ہو جاتی۔ دادا نے تین سال کی عمر سے اس کی تربیت شروع کی تھی اور سولہ سال میں وہ مہارت کے اس درجے پر تھی کہ جاپان سے سند حاصل کرنا چاہتی تو اسے بلیک بیلٹ مل جاتی۔ میری ٹریننگ بہت دیر سے شروع ہوئی تھی۔ بقول چندا کے' میں بوڑھا طوطا تھا جسے رٹایا جاسکتا ہے پڑھایا نہیں جاسکتا۔ میرا دل رکھنے کے لیے خان اعظم فرماتے تھے کہ بس ایک آنچ کی کسر ہے یا انیس بیس کا فرق ہے مگر میں جانتا تھا کہ اصل فرق اس سے بہت زیادہ ہے۔ میری عمر اٹھائیس سال تھی چنانچہ میں اسے انیس اٹھائیس کا فرق کہتا تھا تو غلط نہ تھا۔ پریکٹس کے مقابلے میں کبھی کبھی وہ خود ہار جاتی تھی۔ دادا جان کے اشارے پر' ورنہ اس کا بس چلتا تو ہر روز.... ہرا کے مجھے کنگال کردیتی۔ بے وقوفی میری تھی کہ میں نے اسے چیلنج کیا تھا۔ "پہلے دن کی جیت پر ایک ہزار۔ دوسرے دن دو ہزار۔ تیسری مرتبہ ڈبل ہوکے چار ہزار۔"

چندا نے ایک دن مجھے حساب لگاکے بتایا تھا کہ ایک مہینے بعد یہ رقم کتنی ہوسکتی ہے تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ ایک پرانے لطیفے کی بات سچ ہو جاتی تو میرے لیے شرط پوری کرنا ناممکن ہو جاتا۔ کہتے ہیں' کسی شاطر نے راجا سے کہا تھا کہ میں جیت جاؤں تو مجھے تھوڑی سی گندم انعام میں کافی ہوگی۔ شطرنج کے پہلے خانے میں ایک دانہ۔ دوسرے میں دو۔ اسی طرح ڈبل کرتے ہوئے سارے خانوں کے حساب سے جو گندم جیتنے والے کو ملتی وہ راجا کی ریاست کی ساری فصل سے بھی زیادہ ہوتی۔

چندا دوسرے تیسرے مقابلے میں ہار کے بھی جیت جاتی تھی۔ میری جیت کی خوشی میں ہمیشہ شرمندگی کا احساس غالب رہتا تھا۔

میں رنگین پھولدار شرٹ اور پرانی جینز پہن کے باہر نکلا تو اس نے مجھے اپنا دھوپ کا چشمہ پیش کیا۔ "یہ بھی لگالو تاکہ پورے کارٹون لگو۔"

میں نے کہا "یہ تو زنانہ ہے۔"

"تم کون سے مردانے ہو۔ جھورے" اس نے کہا اور اندر بھاگ گئی۔

اس نے مجھے مونچھیں منڈوانے کا طعنہ دیا تھا۔ میں ہنس پڑا۔ واقعی اب مجھے کون پہچان سکتا تھا۔ میں ہمیشہ شلوار قمیص اور واسکٹ میں پھرتا تھا۔ زبردست مونچھوں کے ساتھ۔

شاہ پیلس کے سامنے اب کافی رونق تھی۔ چند گاڑیوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ان میں ایک پولیس کی موبائل وین تھی۔ کچھ فاصلے پر فٹ پاتھ کے قریب ایک بھٹے والا کھڑا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھٹے وہ ٹھیک بھون رہا تھا۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ یہ کام کیسے کیا جاتا ہے یا اس کی پریکٹس کی ہوگی مگر نقل کے لیے عقل بہرحال چاہیے۔ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا جسے میں نے مختلف مقامات پر ایسے ہی فضول کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھتا تھا اور اپنے چھوٹے سے نظر نہ آنے والے ایم ایف مائکروفون پر تمام معلومات وہیں موجود پولیس موبائل کو فراہم کرتا تھا۔

احمقانہ بات یہ تھی کہ ابھی صبح ہوئی تھی۔ ناشتے کے بعد کون بھٹے کھاتا ہے اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں سے بچوں کا بھی گزر نہ ہو۔ شاہ پیلس میں نہ بھٹے کھانے والے آتے تھے اور نہ یہاں وہ بھٹے کھانے آرہے تھے۔ مخالف سمت میں موبائل سے اتنے ہی فاصلے پر ایک ایسا ہی بے وقوف آئس کریم کی ریڑھی لیے موجود تھا۔

کچھ لوگ پراسرار تجسس' حیرت اور خوف' غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ شاہ پیلس کو' اس پر سرنگوں پرچم کو اور آنے والوں کے چہروں کو تک رہے تھے۔ ظاہر ہے انہیں دنیا

میں اور کوئی کام نہیں تھا۔ پونے دس بجے دفتر' کارخانے' بینک اور عدالتیں۔ اسکول کالج' دکانیں اور بازار سب کھلے ہوئے تھے۔ دنیا کا سارا کاروبار اسی پرانے معمول پر چل رہا تھا۔

دس بجے ایک پک اپ آئی۔ اس کے آگے واضح حروف میں "پریس" لکھا ہوا تھا اور اس کے ڈرائیور نے گاڑی کو سیدھا اندر لے جانے کی کوشش کی مگر سامان ڈھونے میں استعمال ہونے والی اس حقیر گاڑی کو اندر موجود خاندانی قسم کی گاڑیوں کے ساتھ کھڑے ہونے کی اجازت کیسے دی جاسکتی تھی۔

گاڑی چلانے والا خود بڑا دبنگ قسم کا صحافی تھا مگر اس کے بارے میں کچھ لوگ کسی ثبوت کے بغیر کہتے تھے کہ وہ سی آئی اے کے پے رول پر ہے یعنی اسے امریکی امداد ملتی ہے۔ جواب میں یہی بات وہ کسی اور کے بارے میں کہتا تھا اور پھر وہ کسی اور کے متعلق مشہور کرتا تھا۔

کنفیوژن اور ڈس انفارمیشن میں حقائق خود کیمو فلاج ہوجاتے ہیں۔

"گاڑی کو اندر لے جانا ضروری ہے؟" ڈیوٹی پر موجود ڈی ایس پی نے کہا۔ وہ موبائل میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"ضروری تو یہ بھی نہیں ہے کہ تم یہاں نظر آؤ یا وہ بھٹے بیچنے والا اور آئس کریم والا اپنا وقت ضائع کریں۔ اویار کیوں وقت برباد کررہے ہو یہاں' جا کے کوئی کام کرو۔ اتنے مسئلے مسائل ہیں۔"

اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا "یہاں تو کچھ ملے گا بھی نہیں "گالیوں کے سوا۔"

میں گاڑی کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ وہ شبنم ہی تھی۔ اس نے رات والے کپڑے بدل لیے تھے۔ وہ نہا دھوکے آئی تھی۔ جینز' جوگرز اور بلیک شرٹ میں۔ اس نے بالوں کی پونی ٹیل بنائی تھی اور آنکھوں پر کالا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی۔ اس کی جلد کا زیتونی رنگ قدرتی طور پر صاف تھا۔ اس ملاحت میں ہلکی سی سنہرے پن کی جھلک تھی۔ قدرے ابھری ہوئی رخساروں کی ہڈیوں کے ساتھ اس کی بڑی اور لیوتری آنکھیں اور اس کے بھرپور' تھوڑے سے کھلے ہوئے لب۔ مردانہ کالر والی سیاہ قمیص کے اوپر والے کھلے بٹن سے جھلکنے والی گردن کی اور اس کے زیریں حصے کی ہیجان انگیز رنگ والی جلد کی جھلک۔ ان سب نے ڈی ایس پی کو گم صم کردیا تھا۔

ہر عورت کی طرح وہ بھی اپنی قوتِ تسخیر اور اپنے حسن کی تابکاری یا تباہ کاری سے واقف تھی لیکن اسے پوری ذہانت کے ساتھ' انتہائی مؤثر انداز میں استعمال کرنا ہر عورت کو نہیں آتا۔ شبنم کو آتا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے اپنی سیکس اپیل کو EXPLOIT کرتی تھی اور بڑے بڑے شاطر مردوں کی عقل کو مفلوج کرکے ان سے وہ معلومات اگلوالیتی تھی جن سے ایک سنسنی خیز اور EXCLUSIVE اسٹوری بن سکے۔ جب وہ کسی کو ایک فاحشہ کی طرح پھانستی تھی تو پوری طرح پھنسنے کا تاثر دیتی تھی لیکن شکاری کتنا ہی چالاک اور طاقتور کیوں نہ ہو' آخری وقت میں ایسے نکل جاتی تھی جیسے زندہ مچھلی ہاتھ میں تڑپ کے نکل جائے اور جھیل میں غوطہ مار کے غائب ہوجائے۔ میری معلومات کے مطابق وہ آج تک کہیں بھی ٹریپ نہیں ہوئی تھی۔ چیلنج وہ سب کو کرتی پھرتی تھی۔

پک اپ کے پچھلے حصے ہی سے پانچ مرد کود کے اترے۔ اپنے پیشے میں وہ سب کامیاب تھے مگر اس کی تشہیر وہ اپنے حلیوں سے بھی کرتے تھے۔ خود کو دانشور ٹائپ ثابت کرنے کے لیے لمبے الجھے ہوئے بال رکھنا۔ پرانے میلے اور بے تکے کپڑے پہننا اور منہ نہ دھونا یا شیو نہ بنانا۔ اپنی ظاہری شخصیت کے رکھ رکھاؤ سے یہ انداز تغافل ایک شعوری کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہ تاثر دینے کے لیے کہ وہ عام لوگ نہیں ہیں اور ان کی ذات ایسی غیر معمولی' الہامی نوعیت کی باطنی صفات کا قابلِ رشک مجموعہ ہے کہ اب بقول علامہ صاحب کے۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔

گاڑی کے پچھلے حصے میں سے دو نسوانی نمونے بھی برآمد ہوئے تھے۔ ایک انگریزی ہفت روزہ کی انتہائی ذہین اور خطرناک کالم رائٹر تھی۔ گہرے سانولے رنگ والی شمشاد عرف شمی' موٹے شیشوں والی عینک اور بے حس سپاٹ جسم کے باعث وہ اپنی جنس کے احساسِ محرومی پر ذہانت کا پردہ ڈالے رکھتی تھی۔ وہ خوب صورت اور حسین عورتوں کو مردوں کے کھلونے کہتی تھی جو عزت وعفت کے ڈرامے صرف اپنی مارکیٹ ویلیو کے لیے رچاتی ہیں۔ وہ جنس کو نیند اور بھوک کی طرح ایک جسمانی ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ کہیں کسی سے بھی دوستی کرلیتی تھی۔ ہروقت ہر جگہ جاسکتی تھی۔ مردوں کے ساتھ مردانہ مذاق کرتی تھی اور انہی کی طرح فحش [illegible] اس کا قول تھا کہ ساری غلاظت تو ذہن میں ہوتی ہے۔

دوسری خاموش [illegible] الگ تھلگ رہنے والی خاتون صحافی اپنے کام سے کام رکھتی [illegible] وہ کسی قبیلے یا گروپ میں شامل نہیں تھی اور اس مقدس پیشے کی آبرو کا اتنا ہی خیال رکھتی تھی جتنا اپنی عزت کا۔ صحافتی' سیاسی اور سماجی حلقوں میں اس کا احترام اپنے پرائے سب ہی کرتے تھے۔ وہ ایک ہفت روزہ کی مدیر تھی اور انگریزی میں بڑے مدلل مضامین لکھتی تھی۔ وہ قبول صورت عام سی عورت نظر آتی تھی۔ اس نے ایک اخبار کے مالک سے شادی کی پیش کش دوبار مسترد کردی تھی۔ سابقہ دورِ حکومت میں اسے اپنا اخبار نکالنے کے لیے سرمائے اور مشینری کی' نیوز پرنٹ اور سرکاری اشتہارات کی رشوت سے خریدنے کی کوشش بھی ناکام رہی تھی۔ جونیئرز کے لیے وہ باجی یا آپا صفیہ تھی۔

"آپا صفیہ!" شبنم نے اسے چیونگم پیش کی "ایک مسئلہ ہے۔"

صفیہ نے چیونگم لے لی مگر منہ میں نہیں رکھی "تمہارے عزائم خطرناک نظر آتے ہیں شبنم۔"

"ارے نہیں آپا۔" اس نے عاجزی سے کہا "کھودو پہاڑ تو نکلتا ہے چوہا' وہ بھی مرا ہوا۔"

"پرابلم کیا ہے؟"

"کیا قبروں کا ایکس رے کیا جاسکتا ہے؟" شبنم نے پُر خیال لہجے میں کہا "فرض کریں' میں قبرستان میں مشین لے جاؤں اور قبروں کے اندر دیکھنا چاہوں۔"

"میں سمجھی نہیں کیا قبر کھدوا کے کسی مردے کا پوسٹ مارٹم..."

"اوہو آپا۔ اب اتنی جاہل بھی نہیں ہوں میں۔" وہ ہنسی "مجھے ایکس رے اور پوسٹ مارٹم کا فرق معلوم ہے۔"

"کیا تم مُردوں کا ایکس رے کرنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔ ایکس رے کی ایک پورٹیبل مشین ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے۔"

"اگر وہ قبرستان میں لے جاؤں میں اور ہر قبر کے اوپر نصب کرکے اندر جھانکنا چاہوں' یہ دیکھنے کے لیے کہ مردہ کس حال میں ہے۔"

"توبہ کرو شبنم۔ یہ گناہ ہے۔ غیر اخلاقی اور غیر قانونی بات ہے۔ یہ کسی طرح بھی جائز نہیں... تم کو اس کی اجازت کوئی بھی نہیں دے گا۔ نہ ڈپٹی کمشنر نہ ایس ڈی ایم' نہ کمشنر۔ پوسٹ مارٹم ایک قانونی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے عدالتی طریقہ کار ہے۔"

"فرض کریں' میں کسی سے بھی اجازت نہ لوں۔ کون ہوتا ہے قبرستان میں دیکھنے والا' ایک گورکن' اسے دو چار سو دے کے ساتھ ملالوں گی۔ کچھ کام ہی کرے گا۔"

"آریو میڈ شبنم۔ آخر مقصد کیا ہے اس کام کا۔ جس میں خطرہ ہی خطرہ ہے؟"

"خطرہ کس سے' مُردے بالکل اعتراض نہیں کریں گے۔ ان کے لواحقین کو پتا ہی نہیں چلے گا... اور اس میں حرج یا خرابی کیا ہے۔ میں تو قبر کی مٹی کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گی۔ اوپر سے غیر مرئی شعاعیں ڈالوں گی جو مردے کو ذرا بھی ڈسٹرب نہیں کریں گی۔ ایسی غیر مرئی شعاعیں سورج کی روشنی میں بھی تو ہوتی ہیں۔ انفراریڈ اور الٹراوائلٹ۔"

"یہ سب مجھے مت پڑھاؤ۔ میں نے چھٹی جماعت میں پڑھا تھا۔ یہ سوچو کہ کسی نے دیکھ لیا تو بے سبب ہنگامہ ہوگا۔ معاملہ لوگوں کے جذبات کا ہے جو ایسی باتوں سے فوراً مجروح ہوجاتے ہیں۔"

"آپا' میں کوئی بے حرمتی نہیں کروں گی۔ تم کبھی دن میں جاکے دیکھو۔ قبروں پر چھپکلیاں اور گرگٹ دوڑتے پھرتے ہیں۔ کتے ہوتے ہیں قبرستانوں میں۔ قبروں پر بیٹھے رہتے ہیں اور جانور پھرتے ہیں تو کیا غلاظت نہیں کرتے ہوں گے۔"

"بی بی' منطق مت جھاڑو۔ فساد ہوتے نہیں' کرائے جاتے ہیں۔ تمہارے اس احمقانہ آپریشن کے دوران کوئی میت پہنچ گئی یا کوئی آگیا کسی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے۔ یہ جو تنگ نظر اور جاہل قسم کے خدائی فوجدار ہوتے ہیں نا' ہر مذہب کے ٹھیکے دار' وہ اس معاملے کو اچھالیں گے کہ دن دہاڑے ایک تم جیسی لڑکی..."

"بے حیا لڑکی!" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ قبرستان میں پراسرار کارروائی میں مصروف تھی۔ ایک مشین کے ساتھ۔ اس کے بعد اللہ دے اور بندہ لے۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی باتیں کہ وہ مشین سے قبر کھودے بغیر مردوں کی ہڈیاں نکال رہی تھی۔ نئے دفن ہونے والے مردوں کے سر میں سے مغز یا ٹلی میں سے گودا نکالنے والی مشین تھی۔"

اس نے سوچ کے کہا "اچھا اگر رات کو کسی وقت..."

"شبنم۔ فار گاڈ سیک۔ مجھے مقصد تو پتا چلے۔"

"آپا۔ بس ایک HAUNCH ہے۔ فرض کریں اس مفروضے پر کام کرتے ہوئے مجھے پتا چلے کہ کوئی قبر جس پر کتبہ لگا ہوا ہے' اندر سے خالی ہے یا نام ہے مرد کا مگر اندر عورت کا ڈھانچا ہے... یا سر غائب ہے۔"

"ایسے کام اگر بلیک میلر کریں تو وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ کیا کروگی تم یہ معلوم کرکے۔ کون شائع کرے گا ایسی اسٹوری اور اس سے کتنے قانونی مسائل' کتنی اشتعال انگیزی ہوگی۔ ایسا بھی ہوتا ہے قبرستانوں میں لیکن کسی کو اچانک ثبوت مل جائے کہ ابا جان تو قبر میں سے غائب ہیں تو بیٹا ہنگامہ کھڑا کردے گا۔ گورکن کے خلاف مقدمہ دائر کردے گا اور..."

"عام لوگوں کو چھوڑو آپا۔ یہ جو ہزاروں کی تعداد میں بے نام پیروں کے مزارات ہیں... دیکھتے ہی دیکھتے اس شہر میں بھی بن گئے ہیں' ان کے بارے میں تصدیق ہونی چاہیے۔ راولپنڈی میں جب نالہ لئی پر پل کی توسیع کا کام شروع ہوا... مری روڈ پر لیاقت باغ سے ذرا پہلے۔ تو پل کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ پل کو چوڑا کرنے کے لیے اس کے ستون یعنی پیڈسٹل پہلے بناتے ہیں۔ پھر اوپر شٹرنگ سے شہتیر جوڑ کے سڑک گزارتے ہیں۔ تو جناب عین اس جگہ جہاں بنیادیں کھودی جانی تھیں' کوئی پیر صاحب لیٹے ہوئے تھے مگر تحقیق پر پتا چلا کہ پیر صاحب کی قبر میں صرف لکڑی کا سال خوردہ تھا تھا۔ وہ لکڑی کا دیمک زدہ پرانا تھا سب کو دکھایا گیا تھا۔ پتا نہیں کب سے وہ مزار مرجعِ خلائق تھا۔ لوگ آرہے تھے منت ماننے' یہ ٹیکنیکل ہے آپا' آپ پرانے اخبار دیکھ لیں۔"

"شبنم' وہ ایک انتظامی ضرورت تھی۔ انتظامیہ نے ریکٹ چلا دیا۔ صبح منہ اندھیرے کھدائی ہوئی۔ دیکھنے والے چند روشن خیال قسم کے صحافی تھے اور مجسٹریٹ تھا۔ پبلک کو بعد میں پتا چلا۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ سب بوگس کارروائی تھی؟"

"ہو گیس ہی ہوگی ورنہ چھپ کے ہوتا یہ کام؟ ماہرین پہلے رائے دیتے اور پھر عدالت کی اجازت سے قبر کھودی جاتی سب کے سامنے۔ انہیں پل بنانا تھا۔ انہوں نے بنالیا۔ جو ہوا گواہوں کی موجودگی میں ہوا۔ اعتراض کرنے والے منہ دیکھتے رہ گئے ورنہ بلوا ہوجاتا۔ جو مرید اور معتقد ہیں وہ مرنے مارنے پر تل جاتے اور مسئلہ .... عدالتی کارروائی کے بعد بھی حل نہ ہوتا۔"

"خیر۔ میں شرط لگا سکتی ہوں کہ کچھ مزار ایسے ہی ہوں گے۔"

"ہوا کریں۔ تم کیوں چھیڑتی ہو ایسے خطرناک اشتعال انگیز معاملے کو۔ اس کے علاوہ تمہاری اطلاع کے لیے 'ایکس رے گوشت میں سے گزر سکتی ہے۔ ہڈیوں میں سے نہیں گزر سکتی تو مٹی پتھر کے ڈھیر میں سے کیسے گزرے گی اور قبر کے اندر مردے کے اوپر پتھر کے سلیب ہوتے ہیں یا سیمنٹ کے۔"

"افوہ آپا۔ یہ بات آپ پہلے بھی تو کہہ سکتی تھیں" شبنم نے مایوسی سے کہا۔

"ابھی تم تو کہہ رہی تھیں کہ میں اتنی جاہل نہیں۔ اچھی خاصی جاہل ہو تم ماشاءاللہ۔"

صفیہ کے لہجے کا شبنم نے بالکل برا نہیں مانا تھا لیکن اس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا بلکہ چونکا کردیا تھا۔ آخر اس لڑکی کے دماغ میں کیا تھا؟

وہ سرِعام شاہ عالم سے اپنے والہانہ عشق کا اظہار کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتی تھی اور اس کے شاہ عالم سے تعلقات پر کوئی کچھ بھی کہے' اس سے براہِ راست پوچھ لے کہ یہ عشق حقیقی ہے یا مجازی؟ غائبانہ ہے یا حاضرانہ۔ یہ ون وے ٹریفک ہے یا دو طرفہ۔ وہ ہر سوال کا جواب پوچھنے والے کی مرضی کے مطابق دے سکتی تھی۔ وہ کچھ دن کے لیے غائب ہوجائے اور کوئی سوال کرے کہ کیا شاہ پیلس کی خواب گاہوں کے راز ہائے سربستہ پر کوئی اسٹوری بنا رہی تھیں؟ یا شاہ عالم کے ساتھ ہنی مون منا رہی تھیں؟ وہ ہنس کے کہتی تھی کہ آپ جو چاہیں' سمجھ لیں۔ اب یہ مذاق بھی پرانا ہوگیا تھا اور لوگوں کا تجسس بھی ختم ہوچکا تھا۔ یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ اس کے شاہ عالم سے خصوصی ناجائز مراسم ہیں اور وہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتی ہے مگر شاہ عالم جیسا شخص بھلا ایک معمولی صحافی کے ساتھ زندگی بھر کا پیمانِ وفا کرسکتا ہے؟ نکاح تو دور کی بات ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لڑکی شاہ عالم کے لیے سب کچھ قربان کرسکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ افسردہ نہیں تھی۔ رو نہیں رہی تھی اور اسے یاد نہیں کررہی تھی۔ اب وہ بالکل نارمل تھی۔ آخر کیوں؟ اسے تو صدمے سے پاگل ہوجانا چاہیے تھا مگر وہ اس سوال کا بڑا گول مول جواب دیتی رہتی تھی "وہ مرا کہاں ہے؟ زندہ ہے۔ شہید کب مرتے ہیں۔"

جو اسے قریب سے جانتے تھے وہ اس کے رویے پر حیران تھے۔ کیا وہ سب ڈراما تھا؟ جھوٹ تھا۔ یہ دوسروں کو بے وقوف بناتی تھی یا اپنے آپ کو۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ۔ جب آنکھ کھل گئی تو نہ زیاں تھا نہ سود تھا۔

شاہ عالم اپنی نجی زندگی کے بارے میں کسی سوال کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن ایک بار کسی نے شبنم کے حوالے سے کچھ پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا کہ کمال ہے' اسکینڈل بنانے میں تو آپ لوگ کسی کا لحاظ نہیں کرتے مگر وہ تو آپ کی اپنی برادری کی معزز صحافی ہے۔ اس کی عزت کے پیچھے تو نہ پڑیں۔ اس پر سوال کرنے والے نے کہا تھا کہ سر..... جب وہ خود کہتی ہے۔ اور شاہ عالم نے سختی سے کہا تھا کہ نو کمنٹ۔ کوئی اور بات کریں۔

نو کمنٹ عام طور پر لاجواب ہونے کا اعتراف سمجھا جاتا ہے یا پھر دوہرا جواب' اقرار اور انکار۔

اگر میں چاہتا تو صحافیوں کے اس گروہ میں شامل ہوکے اندر بھی پہنچ سکتا تھا اور مزار کمیشن کے پہلے اجلاس کا دلچسپ ڈراما خود دیکھ سکتا تھا مگر میں چار پانچ گھنٹے ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر بنے ہوئے کھوکھے سے تین اخبار خریدے۔ دو اردو کے اور ایک انگریزی کا۔ اردو کے دو اخبارات میں سے ایک میرا حامی تھا' دوسرا مخالف۔ انگریزی کا اخبار ممکنہ حد تک غیر جانبداری کے ساتھ صرف خبر دیتا تھا۔ حامی اخبار نے میری "شہادت" کو سازش قرار دیا تھا۔ صیہونی سازش' ملک دشمن عناصر کی سازش۔ بیوروکریسی کی سازش۔ سی آئی اے کی سازش۔ ایجنسیوں کی سازش۔ جب ملک کے پہلے وزیراعظم کو شہیدِ ملت بنایا گیا تھا تو اسے بھی سازش کہا گیا تھا۔ یہ سازش تھی' لوگ سازش کرنے والوں کو جان گئے تھے مگر وہ معاملہ ایسے ہی ختم ہوگیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ملک کی تاریخ لکھنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ تاریخ لکھی جاتی تو اس میں قتل کا لفظ ہر باب میں آتا اور مؤرخ کے سامنے مسئلہ یہ ہوتا کہ۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

یہ بات یقینی تھی کہ وہ خود بھی قتل کردیا جاتا۔ پھر حکومت اس پر ایک انکوائری کمیشن قائم کرتی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک انکوائری کمیشن بنایا جائے جو انکوائری کرے کہ قیامِ پاکستان سے اب تک کتنے انکوائری کمیشن بنائے گئے۔ ان کا سراغ لگائے اور تمام ملک کے سرد خانوں کو سربمہر کردے جہاں ان کی دی ہوئی رپورٹوں کی حنوط شدہ لاشوں کے پائے جانے کا امکان ہو۔

خانِ اعظم نے کہا تھا۔ اس سانپ کو دیکھو جو سب سے زہریلا ہے۔ اسے پہچانو' دشمن رعایت کا مستحق نہیں ہوتا' زہر کو زہر سے مارو۔

لیکن سانپ ابھی بل میں تھا۔ ابھی میں اسے دودھ پلانے کے

لیے بین بجاکے باہر نہیں لاسکتا تھا۔ سانپ بہرا ہوتا ہے۔ اس مسئلے پر سوچ بچار کی ضرورت تھی۔ خیال کو کنٹرول کرو' خیال سے عمل ہے۔

اردو کے اخبار میں ایک دلچسپ خبر یہ تھی کہ مشہور صحافی مس شبنم کی گاڑی کے چاروں ٹائر ایس پی غلام محمد کے حکم پر فلیٹ کردیے گئے کیونکہ انہوں نے غیر قانونی کار پارکنگ فیس دینے سے انکار کرتے ہوئے اپنی گاڑی مزار سے کچھ فاصلے پر کھلے میدان میں کھڑی کی تھی۔

اس وقت تک شام کے اخبارات بھی شائع ہوکے بازار میں پہنچ گئے تھے اور ہاکر لونڈے چیختی دھاڑتی سرخیوں کے ادھورے حوالوں سے لوگوں کو اخبار خریدنے پر مجبور کررہے تھے۔ "شاہ عالم شہید کے مزار پر دھماکا' ایس پی کی جیپ دھماکے میں تباہ" ایک لڑکے نے چلاتے ہوئے مجھے دونوں اخبار پکڑادیے۔

شبنم کی ذہانت پر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ اس نے تاڑلیا تھا کہ گلو ماسوں کی عنایت بے سبب نہیں۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ وہ جیپ لے گئی اور اسے کچھ آگے جاکے چھوڑ دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ مزار پر شاید کچھ نہیں ہوگا۔ پھر بھی اس نے رسک لے کے بڑی ہمت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ضرور کسی سے لفٹ لے کر نکل گئی تھی۔ دھماکا بعد میں ہوا تھا۔ اگر وہ چلتی جاتی تو مین روڈ پر پہنچ کے مرتی۔

شام تک میں بہت سے کام نمٹا سکتا تھا جو میری ذاتی توجہ مانگتے تھے مگر میرا ذہن پوری طرح مستعد نہیں تھا۔ شاید یہ راتوں کو دیر تک جاگنے کا اور مسلسل بے آرامی کا نتیجہ تھا۔

میری چھوٹی سی سفید کار وہیں موجود تھی جہاں اسے میں نے گزشتہ رات چھوڑا تھا۔ اس احاطے کے باہر جس کی بیرونی دیوار پر ایک پرانا چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پر اوپر سرخ رنگ کے انگریزی حروف میں "وارننگ" لکھا ہوا تھا اور نیچے یہ عبارت تھی "مقدمہ عدالتِ عالیہ میں زیرِ سماعت ہے۔ اس پراپرٹی پر مالی معاملہ کرنے والے توہینِ عدالت کے مجرم ہوں گے۔ بحکم رجسٹرار۔"

اس بورڈ کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا مگر جہاں جائداد اور لین دین کے دیوانی مقدمات دیوانہ کردیتے ہوں اور ایک نسل کے دائر کردہ کیس کا فیصلہ دوسری نسل کی زندگی میں ہو۔ جہاں ہر عدالتِ عالیہ میں ایسے مقدمات کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہو وہاں کون تفتیش اور تصدیق کرسکتا ہے کہ مقدمہ کب' کس نے کہاں داخل کیا تھا اور فریقین کون ہیں۔ تاہم اس بورڈ سے فائدہ یہ تھا کہ اس کی خرید و فروخت یا اس جگہ کو کرائے پر لینے یا اس پر قبضہ کرنے کا کسی کے دل میں خیال ہی نہیں آسکتا تھا۔

اس کے قریب ہی دوسرے بورڈ پر یہ بھی درج تھا کہ "داخلہ منع ہے' خلاف ورزی کرنے والے کو گرفتار کرلیا جائے گا۔"

اس احاطے کی دیوار آٹھ فٹ اونچی تھی اور اس میں اتنا ہی بلند بھاری فولادی گیٹ بھی نصب تھا چنانچہ عام آدمی کو سڑک پر سے اندر کا منظر بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ خواہ وہ پیدل ہو یا کسی سواری پر۔ اندر جھانک کر دیکھنے والے کے لیے اس پرانی اینٹوں کی بے رنگ دیوار میں دلچسپی کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ اندر کچھ تھا بھی نہیں جس سے کسی کا تجسس بیدار ہوتا۔

میں نے دونوں بھاری کنڈیوں کے بڑے بڑے تالوں کو نہیں چھیڑا جن پر کپڑا سی کر تاگوں پر لاکھ سے مہر لگادی گئی تھی۔ ظاہر ہے اسے بھی لوگ عدالت کی سیل سمجھتے تھے۔ لاکھ کے اوپر میں نے پرانے ایک روپے والے سکے سے مہر لگائی تھی۔ لاکھ چپکانے کے بعد میں نے سکہ لائٹر سے گرم کیا تھا اور لاکھ پر دبادیا تھا۔ کوئی بہت کوشش کرتا تو شاید محدب عدسے کی مدد سے "حکومتِ پاکستان" اور ۱۹۸۵ء پڑھنے میں کامیاب ہوجاتا۔ اس سے وہ یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ یہ اپریل ۱۹۸۵ء میں سیل کی گئی ہوگی۔

اس آٹھ فٹ اونچے اور بارہ فٹ چوڑے گیٹ کے ایک پٹ میں تین فٹ کا چھوٹا دروازہ بھی تھا جو چھ فٹ اونچا تھا جو اندر سے بند لگتا تھا لیکن یہ الیکٹرانک لاک والا گیٹ تھا جو ریموٹ کنٹرول سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ اب تو ایسے لاک عام کوٹھیوں اور بنگلوں میں استعمال ہورہے ہیں۔ جدید ترین حفاظتی نظام میں گیٹ کمپیوٹر کھولتے ہیں۔ آپ اپنا انگوٹھا ایک خاص جگہ پر رکھتے ہیں۔ کمپیوٹر فنگر پرنٹس دیکھتا ہے۔ اسے اپنی میموری سے میچ کرتا ہے اور فرق نہ ہو تو گیٹ کھول دیتا ہے۔ یہ سارا عمل ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پورا ہوجاتا ہے۔ یا پھر وہ لاک ہیں جو آپ کی آواز سے کھلتے ہیں "کھل جا سم سم" اب الف لیلہ کی کوئی جادوئی کہانی والی بات نہیں رہی جس پر بچے یقین کرلیتے ہیں۔ فنگر پرنٹس کی طرح دو افراد کی آوازوں کی فریکوئنسی کے گراف ایک نہیں ہوتے۔ جب آپ کسی گیٹ کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا نام بتاتے ہیں تو اندر کہیں کوئی کمپیوٹر آواز پہچان کے کہتا ہے اوکے' پلیز کم اِن۔ اور گیٹ کھل جاتا ہے۔ اگر آپ لہجہ بدل کے یا مردانہ زنانہ آواز بنا کے نام بتائیں گے تو آپ کی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ آدمی کی ایجاد آدمی سے زیادہ ہوشیار ہے۔ اسے چکر نہیں دیا جاسکتا۔ امریکی خلائی ادارے اور ترقی یافتہ ممالک میں حساس اڈوں کے اور خفیہ تحقیق کے سائنسی مراکز میں کام کرنے والے اسی طرح اندر جاسکتے ہیں۔

پاکستان جیسے ملک میں ریموٹ کنٹرول لاک بھی عام آدمی کے لیے عجوبہ ہے۔ میں نے کار کی چابی سے منسلک چھوٹے سے ریموٹ کا ایک بٹن دبا کے گیٹ کو دھکیلا اور اندر غائب ہوتے ہی بند کردیا۔ اب اسے دوبارہ کھولنے کے لیے پھر یہی چابی والا ریموٹ کام کرسکتا تھا۔ کوئی دوسرا ریموٹ نہیں۔ اس ریموٹ کے بہت سے فنکشن تھے۔ اس سے میرے آفس کے اندر ایک خصوصی دروازے کا لاک آپریٹ ہوتا تھا۔ ایک خفیہ کیبنٹ' ایک الارم

جو آفس میں تھا اور دوسرا جو گاڑی میں تھا۔ یہ حفاظتی انتظامات ان سب کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتے ہیں جن کی زندگی صرف ان کی یا دوست احباب اور خاندان کی نہیں رہتی، پبلک پراپرٹی ہو جاتی ہے۔

احاطے کے اندر کا منظر کسی کباڑ خانے کا تھا۔ اس میں پرانی کنسٹرکشن میں کام آنے والی مشینری اور اس کے مختلف حصے پڑے تھے۔ زیادہ تر مسلسل بارش اور گرد سے زنگ خوردہ ہو رہے تھے۔ کچھ مشینری ناکارہ ہو جانے کے بعد یہاں ڈال دی گئی تھی تو کچھ پڑے پڑے ناکارہ ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اب بھی اس میں سے کچھ کار آمد ہوں یا بنائی جا سکتی ہوں مگر مجھے اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پانچ چھ سال قبل میں نے یہ کام ختم کر دیا تھا۔

ہزار گز کے اس احاطے میں شٹرنگ کا سامان بھی پڑا ہوا تھا اور باقی جگہ میں خودرو گھاس نظر آ رہی تھی۔ یہ جگہ دیکھنے والے کو لاوارث اور متروکہ سی لگتی تھی۔ اس کے آخری حصے میں ایک کمرا بنا ہوا تھا جو باہر سے کسی ٹھیکے دار کا دفتر یا چوکیدار کی رہائش گاہ معلوم ہوتا تھا اور خاصا بدنما تھا لیکن اندر سے یہ ایک مکمل پُرعشرت خواب گاہ، ایک شاندار آفس اور بہترین جائے پناہ یا رہائش گاہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک باتھ روم تھا اور ایک چھوٹا سا کچن۔ یہاں مجھے سب کچھ دستیاب تھا۔ چائے کافی سے درآمد شدہ شراب تک۔ یہاں دو فون تھے۔ ان میں سے ایک انٹرنیشنل ڈائلنگ تھا۔ دوسرا فیکس مشین کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کال وصول کرکے پیغام ریکارڈ کرنے والی مشین کو دونوں سے ملا دیا گیا تھا۔ تیسرا فون سب سے اہم تھا جس کا ریسیور میری دراز میں رہتا تھا۔ یہ وائرلیس فون تھا جسے عام طور پر کورڈلیس فون کہا جاتا ہے۔ پہلے دونوں نمبر ان سب کو معلوم تھے جن کا مجھ سے کوئی کاروباری تعلق تھا۔ تیسرا میرا پرائیویٹ نمبر تھا جو بدلتا رہتا تھا اور خاص لوگ ہی کوئی خاص بات کہنے کے لیے یہ نمبر ملاتے تھے۔ اب خاص لوگ کون ہیں۔ اس کا تعلق میری ضرورت سے ہوتا تھا چنانچہ یہ لوگ بھی بدلتے رہتے تھے۔

وسیع کمرے کا نصف حصہ آفس تھا جو ایک میز کرسی پر مشتمل تھا۔ اس کے سامنے قالین پر ایک اٹالین صوفہ سیٹ تھا اور درمیان میں کرسٹل گلاس ٹیبل۔ پھر دائیں طرف فریج رکھا ہوا تھا اور بائیں طرف دیوار کے ساتھ والی کیبنٹ میں ٹی وی اور وی سی آر تھے جو اس زاویے پر رکھے گئے تھے کہ میں آفس چیئر پر بیٹھ کے بھی ٹی وی دیکھ سکتا تھا اور بیڈ پر لیٹ کر بھی۔ بظاہر کمرے کے آخر میں خوب صورت اور پُرتکلف ڈبل بیڈ تھا مگر اس کے بعد پردوں سے ڈھکی ہوئی دیوار کے پیچھے باتھ روم اور کچن تھے۔ اس کمرے میں پردے، قالین اور فرنیچر سب بلحاظ قیمت ہی شاندار نہیں تھے، ان کے انتخاب میں حسنِ نظر کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ رنگوں کے امتزاج، ساخت اور آرائش کے اعتبار سے یہاں جو کچھ بھی نظر آتا تھا وہ کسی ماہر انٹیریئر ڈیکوریٹر کے ذوقِ جمال کا آئینہ دار محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میری سالگرہ پر یہ جگہ اپنا پیرہن بدل لیتی تھی۔ یہاں ہر چیز نئی، پہلے سے زیادہ خوب صورت اور مختلف آجاتی تھی۔ اندر کی فضا کا رنگ ہی نہیں، تاثر بھی بدل جاتا تھا۔ پردے اور قالین ہی نہیں، لائٹس تک تبدیل ہو جاتی تھیں اور میں اندر قدم رکھتا تھا تو احساسِ حسن سے دم بخود رہ جاتا تھا۔

یہ تحفہ مجھے اپنی فضول نام والی بزنس پارٹنر قمر کی طرف سے ملتا تھا۔ قمرالنسا آفریدی۔ جو اپنے طور پر ایک ٹاپ کلاس بیوٹی پارلر اور ایک بوتیک بھی چلاتی تھی۔ بلاشبہ وہ حسین تھی اور نام کی رعایت سے اس کو چاند کا ٹکڑا بھی کہا جا سکتا تھا مگر اس میں آفریدی والی کوئی بات نہیں تھی۔ آفریدی اس کا باپ تھا اور باپ بیٹی کی شخصیت اور مزاج کا تضاد ناقابلِ فہم تھا۔ قمر دبلی پتلی نازک سی اور بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح نظر آتی تھی۔ بیوٹی پارلر کی مالک ہونے کے باوجود اتنی سادگی پسند اور لباس کے معاملے میں حد درجہ قدامت پرست تھی۔ اس کے فیشن بوتیک میں جتنے ملبوسات نظر آتے تھے ان کا قمر سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ میں تو اسے دیکھ دیکھ کے خدا کی قدرت پر حیران ہوتا تھا کہ۔۔۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دفتر میں بھی وہ خاموش اور خائف سی رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میں عقل اور خود اعتمادی نام کی کوئی چیز نہیں ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنے کاروبار میں بھی کامیاب تھی۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کا باپ انتہائی چالاک اور عیار، بدکردار اور بدنام شخص تھا اور اس نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں شاید ہی دنیا کا کوئی برا کام نہ کیا ہو۔ اس کا انجام بھی برا ہونا لازمی تھا۔ بالآخر اسے خود اپنے ساتھیوں نے جو سب پولیس کے مخبر تھے، اسے ایک پولیس مقابلے میں ہلاک کروا دیا۔ یہ سات سال پہلے کی بات ہے جب قمر سولہ سال کی تھی۔ قمر کی ماں نے جو اس وقت خود بھی پینتیس سال کی بھرپور عورت تھی، اپنا سب کچھ میرے حوالے کر دیا تھا سوائے اپنے آپ کے۔ اس کے پیشِ نظر دوسرا مقصد تھا جو اس نے بعد میں حاصل کیا مگر اس سے پہلے وہ اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ مخصوص حالات کے پیشِ نظر میں نے اسے اپنے کاروبار میں برابر کا شریک بنا لیا اور اس کا سرمایہ محض میری شرافت اور ایمانداری کی وجہ سے دگنا ہو گیا۔ بالغ ہوتے ہی شراکت بدل گئی اور میری پارٹنر قمر ہو گئی۔ اس کے حصے میں باپ کی دو ہی چیزیں آئی تھیں۔ جرم کی کمائی اور اس کی کاروباری سمجھ بوجھ۔ باقی سب کچھ ماں کا تھا۔ حسن، شرافت، ایمانداری اور اصول پرستی وغیرہ۔

اگر میں چاہتا تو دو دن میں اس کی چھٹی کر دیتا۔ لاکھ سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود نہ وہ خود کو بچا سکتی تھی اور نہ اپنے سرمائے کو مگر ایک تو اسے مجھ پر اندھا اعتماد تھا۔ پھر وہ مجھے اتنی قابلِ رحم مظلوم

اور کمزور لگتی تھی کہ میں اس کو تحفظ فراہم کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے باپ کے سب پرانے دشمن الگ تھے اور وہ دوست الگ جن کو اب اس کی پٹھان ماں اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ قمر ہر طرف سے بھیڑیوں میں گھری ہوئی بھیڑ تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کی ماں نے گڈریا بنا کے مشکل میں ڈال دیا تھا۔

اس کمرے کا ایک دروازہ پیچھے والی کوٹھی میں کھلتا تھا۔ یہ بھی باتھ روم کا دروازہ تھا یعنی اس باتھ روم سے گزر کے میں دوسری کوٹھی کے ایک کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔ یہ بھی میرا بیڈ روم تھا اور یہاں میری ذاتی ضرورت کی ساری چیزوں کے علاوہ ایک فولادی سیف بھی تھا جسے بڑی مہارت سے لکڑی کے پینلوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ دیوار گیر کپڑوں کی الماری کے پیچھے والا حصہ سلائیڈ کرکے دیوار میں چلا جاتا تھا تو بالکل اسی رنگ کا اور ویسا ہی دوسرا حصہ سامنے آجاتا تھا۔ اس کا رنگ فولادی دروازے کو کیموفلاج کرتا تھا۔ یہ فولادی دروازہ میں اپنے ریموٹ کنٹرول سے کھول سکتا تھا۔ پیچھے والی الماری میں دنیا کی سب سے بڑی قوتِ خرید رکھنے والی کرنسی یعنی ڈالر تھے یا پھر برٹش پاؤنڈ تھے۔ احتیاطاً میں جرمن مارک اور فرانس کے فرانک بھی رکھتا تھا۔ اس کی مجموعی مالیت کتنی تھی، یہ میں کسی وقت بھی حساب کیے بغیر نہیں بتا سکتا۔ آپ لاکھوں میں سمجھ لیں۔

اس بیڈ روم میں بھی کوئی چیز کمتر نہیں تھی مگر یہاں فون صرف ایک تھا۔ دو بیڈ روم کا یہ پورشن میری رہائش گاہ سمجھا جاتا تھا اور یہاں آنے والے کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا اٹیچ باتھ درحقیقت پیچھے والے پلاٹ پر بنے ہوئے کمرے کا حصہ ہے۔ کپڑوں کی الماری اور سیف کی ڈبل وال کے باعث باتھ روم بیچ میں آگیا تھا۔ یہاں آنے والا۔۔۔ یا آنے والی اگر اس باتھ روم کو استعمال کرتے تو اسے کسی دوسرے دروازے کی موجودگی کا علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ آخری پوری دیوار لکڑی کے پینل کی بنی ہوئی تھی اور ایک پینل کو دوسرے سے جدا کرکے دروازے کی صورت میں دیکھنا محال تھا۔ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر چارخانے بنانی گہری سیاہ لکیریں سب چھپا لیتی تھیں۔

سامنے والے حصے میں میرا اور قمر کا آفس تھا۔ جب میں پیچھے رہائشی حصے سے برآمد ہوتا تھا تو کسی کو شک نہیں ہوتا تھا۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ میں پہلے سے اندر تھا۔ دفتر کھلنے کے اوقات سے پہلے ہی یا رات کو کسی وقت وہاں آیا تھا۔ میں سامنے والے مین گیٹ سے بھی آجاتا تھا۔ سوائے قمر کے یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ میں اندر ہوں یا باہر۔

قمر اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے وہیں سے اسے فون کیا تو وہ مجھے فیشن بوتیک میں ملی۔ میرے ہیلو کے جواب میں اس نے سلام کیا۔

میں نے کہا "مس قمرالنسا۔ کیا ہو رہا ہے؟ وہی بدصورت لڑکیوں کو خوب صورت کپڑے پہنانے کی فضول کوشش۔"

"نہیں جی۔۔۔ میرا مطلب ہے ہاں جی۔۔۔" وہ گھبرا کے بولی۔

میں نے کہا "یار کیا کرو گی آخر تم اتنا پیسہ کما کے؟ ان میں سے کوئی ایک جوڑا خود بھی پہن کے دیکھو، یا مجھے دکھاؤ۔"

وہ شاید مسکرائی ہو "کبھی حلوائی بھی خود اپنی مٹھائی کھاتا ہے جی؟"

"تم حلوائی نہیں، حلوا ہو۔ ندیدے لوگ ہڑپ کر جائیں تمہیں مگر تمہیں دیکھ کے تو آدمی کی بھوک مر جاتی ہے۔"

"آپ کب آئے جی؟" اس نے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔

"میں۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے۔ سوچا تھا تم سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"میں آجاتی ہوں۔"

"نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ خیریت سے ہیں نا جی۔"

"بالکل نہیں۔ میرا انتقال، سوم وغیرہ سب ہو چکا۔"

اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "ایسی باتیں مجھ سے مت کیا کریں۔"

میں نے کہا "بھئی میں تو اپنے مزار پر بھی ہو آیا رات۔"

"دیکھیں جی، میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔۔۔"

"کیوں۔ امی کا پتا نہیں چلا؟" میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔

"نہیں۔ ان کا فون بھی نہیں آیا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "تم کیسی پٹھانی ہو۔ ابھی دو ہفتے ہی ہوئے ہیں نا۔ کوئی دو مہینے تو نہیں ہو گئے۔ اس سے پہلے۔۔۔"

اس نے بے صبری سے کہا "پہلے ان کا فون آجاتا تھا۔"

"یار فون کیا وہ خود آجائیں گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اکیلی تو نہیں ہو۔ آخر چچا اور تایا ہیں تمہارے ساتھ۔"

"چچا اور تایا؟" اس نے تلخی سے کہا "دو مردار خور گدھ۔ یہ تو آپ کی وجہ سے میں محفوظ ہوں جی ورنہ وہ میری لاش پر سے ریشہ ریشہ نوچ کر کھا جاتے۔"

"ان کو سلام دینا میرا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

بے وقوف لڑکی۔ خود کچھ نہیں کرتی اور مجھے اجازت نہیں دیتی ورنہ حرام خور گدھ حرام موت مارے جائیں۔ امن کی فاختہ کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ گدھ ہلاک کر دیے جائیں۔

اندر اسٹاف معمول کے مطابق مصروف تھا۔ جنرل منیجر، منیجر اکاؤنٹس، منیجر پرسنل، منیجر کلائنٹ سروس۔ میں نے سب سے ان کی خیریت پوچھی۔ یہ معلوم کیا کہ کسی کو مجھ سے کوئی کام تو نہیں ہے۔ کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔ وہ میری خوش اخلاقی، فراخ دلی اور دوستانہ رویے کے باعث میری بہت عزت کرتے تھے اور مجھے ایک بہترین ٹیم کا تعاون حاصل تھا۔ میں نے ان کے ساتھ لنچ بھی شیئر کیا۔

اسے انہوں نے اپنی عزت افزائی سمجھا۔

سہ پہر کو واپس اپنے پرائیویٹ آفس میں پہنچ کر میں نے وائرلیس فون دراز میں سے نکالا اور ایک نمبر ملایا۔

"ایجنٹ زیرو زیرو سیون۔" میں نے ہیلو کے جواب میں کہا۔

اس نے ایک چیخ ماری "تم۔؟"

"ہاں۔ میں....."

"کہاں سے بول رہے ہو۔ یو باسٹرڈ" وہ ہسٹریائی ہو گئی۔

"عالم بالا سے" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جیسا کہ مجھے امید تھی' چند سیکنڈ بعد ہی میرے وائرلیس فون کی گھنٹی بجی۔ یہ گھنٹی تو خیر نہیں تھی۔ بیپ تھی مگر واضح اور صاف سنائی دیتی تھی۔ میں اس کی صورت کا تصور کیے مسکراتا رہا۔ ٹیلی فون کی بیپ شاید ایک منٹ تک چلتی رہی۔

سانپ کو بل سے وہی نکال سکتی تھی۔

میں جس راستے سے اندر گیا تھا اس سے واپس باہر آیا تو میرا لباس پھر بدلا ہوا تھا۔ میں نے واپسی کے ہر راستے کو اسی طرح لاک کیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کسی نے بھی مجھے اندر جاتے یا باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتا اور قانون پسند بن کے یا تجسس کے باعث سوال کرتا کہ تم کون ہو اور اس ممنوعہ علاقے میں کیوں گئے تھے تو میں اسے ایک کارڈ دکھا دیتا جس سے ثابت ہو جاتا کہ میں عدالتِ عالیہ کا مقرر کردہ مجاز افسر ہوں جو تمام ایسے ہی زیرِ تصفیہ معاملات میں ملوث پراپرٹی کا معائنہ کرتا رہتا ہے۔

اس پورے ہفتے میں پریکٹس دو ہی دن ہوئی تھی۔ خلوت کدے میں یہ ریاضت کا وقت تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے کپڑے بدلے اور ڈھیلے ڈھالے گاؤن کو پہننے سے پہلے جوتے اتار لیے۔ کوئی آہٹ کیے بغیر میں نے آہستہ سے دروازہ اندر کی طرف دھکیلا اور ان کے سامنے پہنچ گیا۔ خان اعظم یوگا کے ایک مشکل آسن میں تھے۔ چندا بالکل انہی کے انداز میں مجسم مورتی لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے زانو تہ کیے اور آنکھیں بند کر کے خلا کی وسعتوں کا تصور کیا اور نیلے بیکراں آسمان کی وسعت میں اڑنے کے لیے پر تولنے لگا۔ سفید فاختہ ذہن کی کثافت' آلودگی اور گرفت سے نکل گئی۔ اوپر' بہت اوپر پہنچ کے میری روح نے اڑتے بادل کا روپ دھار لیا۔ ہوا سے لطیف تر۔ محض ایک غبار۔ غیر مرئی وجود خلا میں تحلیل ہو گیا۔

پھر میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو وہ دونوں پیر تھوڑا سا پھیلائے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے پُرسکون انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے کمر تک پہنچنے والے بالوں کے سیاہ ریشم کو سمیٹ کر جوڑا سا بنا لیا تھا۔

میں نے مسکرا کے مقابل آتے ہوئے کہا "آج میں بہت غصے میں ہوں۔ تمہاری بہت پٹائی ہو گی۔ مجھے غصہ اتارنا ہے۔"

"تم سے زیادہ میں غصے میں ہوں۔ تم روز جان بچا کے بھاگ جاتے ہو' یہ کیا بے ایمانی ہے۔"

میں نے احتجاج کیا "خان جی!"

خان اعظم نے منع کرنے کے لیے انگلی کو جنبش دی۔ "تم اسے معاہدے کی خلاف ورزی کہہ سکتی ہو۔ کھیل میں بے ایمانی نہیں ہوتی۔"

چندا نے سر جھکایا' میں نے بھی سر جھکایا۔ اس کے بدن میں لچک زیادہ تھی۔ فطری طور پر وہ اپنے ہلکے پھلکے وجود کو زیادہ پھرتی کے ساتھ کنٹرول کر لیتی تھی۔ نیچے گرنے سے پہلے پلٹ جانا' ہوا میں گھوم کے غوطہ مار جانا اور ایک ہاتھ یا ایک پاؤں پر لٹو کی طرح چکر لگا کے وار کرنا اور پتنگ کی طرح سیدھا اوپر اٹھ کے خود کو جوابی وار سے بچا لینا۔ یہ سب اس کے لیے بہت آسان تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے نزدیک مشق کا ناغہ گناہ سے کم نہ تھا جب کہ میں ہفتے میں دو بار کسی مصروفیت میں الجھ کے سمجھتا تھا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

تیسری افسوس ناک بات یہ تھی کہ بعض اوقات میری قوتِ ارتکاز میں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر میری توجہ کھیل کی طرف نہیں بلکہ رقص کی طرف ہو جاتی تھی۔ جی ہاں' چندا کے جسم کی ہر تڑپ میں' ہر طوفانی لہر جیسی حرکت میں۔ آسمانی بجلی کی طرح بل کھانے کے انداز میں۔ شاخِ گل کی طرح جھک جانے میں' کلی کی طرح سمٹ جانے اور پھول کی طرح کھل جانے میں۔ اس کے موج در موج بدن کے مد و جزر میں ایک تسلسل' تناسب اور ہم آہنگی کا وہ نظرنواز امتزاج تھا جسے کھیل سے زیادہ اعضا کی شاعری بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں رقص کی ساری رعنائی اور نزاکت تھی چنانچہ میری حسن پرست جبلت کی کمزوری کے باعث کبھی ایسا ہو جاتا تھا کہ صرف ایک لمحے کے لیے میرا خیال پر کنٹرول نہیں رہتا تھا اور اس ایک لمحے کی غفلت کا نتیجہ فوراً سامنے آجاتا تھا جب میں چت پڑا چھت کو تکتا نظر آتا تھا۔

اب تک میں نے اپنا بھرپور دفاع کیا اور آہستہ آہستہ اپنے جسم کی خوابیدہ یا منتشر قوت کو سمیٹ کر اس طرح اکٹھا کرتا رہا جیسے سائنس داں روشنی کی لہروں کو مرتکز کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ لیزر بن جاتی ہیں جس کی شعاع پھول کی پتی کی طرح نازک آنکھ کے پردے کی سرجری نوکِ نشتر سے بہتر طور پر کر سکتی ہے تو ہیرے کا جگر رکھنے والی فولادی چادر کو بھی اسی طرح کاٹ دیتی ہے۔

یہ میری تکنیک تھی جسے چندا بھی سمجھتی تھی۔ اپنی قوت کو پوری طرح مدافعت سے جارحیت کے پوائنٹ تک لانے کا عمل اپنے وجود میں دباؤ کو مسلسل بڑھانے کا مرحلہ تھا جس کی حد آتے ہی میں اس پریشر ککر یا آتش فشاں کی طرح ہو جاتا تھا جو پھٹ جائے تو تباہی پھیلا دیتا ہے۔ میں اس حد کو محسوس کرتے ہی سیفٹی والو کھول دیتا تھا اور چندا میری آنکھوں میں یا میرے اعصاب کے تاروں کی لرزش سے یا اپنی چھٹی حس کی مدد سے سمجھ لیتی تھی کہ

اب کیا ہو گا؟

پھر وہ مدافعت کرتی تھی' بپھرے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تربیت سے حاصل ہونے والی مہارت کا بھرپور استعمال کرتی تھی اور یہ بھول جاتی تھی کہ وہ کون ہے اور میں کون ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا' کبھی خان جی اسے اشارہ کر دیتے تھے۔ کبھی میرا خیال اپنی سمت کھو دیتا تھا اور میں انتیس منٹ تک غالب رہنے کے بعد تیسویں منٹ میں مغلوب ہو جاتا تھا۔ ورنہ وہ طوفان کا زور توڑنے میں ناکام رہتی تھی اور بڑی بہادری سے ہار جاتی تھی۔

خان جی اتنی ہی غیر جانبداری کے ساتھ کھیل کی ایک ایک موومنٹ کا تجزیہ کرتے رہتے تھے جیسے خلائی اسٹیشن کے سائنس داں خلا میں معلق دیوہیکل HUBBLE نام کی ٹیلی اسکوپ سے اس بسیط کائنات کے سب سیاروں اور ستاروں کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

آج مجھے جیت کی ضرورت تھی۔ یہ اپنے لاشعور میں رخنہ انداز ہونے والی کم ہمتی کا علاج تھا۔ میں شکست دینا چاہتا تھا ان سب کے خیال کو جو آج طاقتور ہو گئے تھے۔ مخالف قوتوں کو اور مخاصمانہ عزائم میں اتفاق کے ساتھ صف آرا ہونے والوں کو اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ــ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۔

لیکن نہ جانے کیوں چندا نے پہلے سے مجھے شکست دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حالانکہ اسے فتح کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ خان اعظم کا نظریہ تھا۔ زہر کو زہر سے ختم کرو۔ شکست کے احساس کا علاج ایک اور شکست' پھر ایک اور شکست۔ مسلسل شکست اور پسپائی اور ہزیمت۔ اس حد تک کہ پیٹھ دیوار سے لگ جائے۔ اگلا مرحلہ فتح کا ہوتا ہے۔

میرے جسم پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور میں اب واقعی غصے میں تھا کیونکہ چندا مسکرا رہی تھی۔ ہم خان جی کے سامنے دوزانو بیٹھے اپنی اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی مشق کر رہے تھے اور خان جی کی آواز سن رہے تھے۔ کس نے کہاں غلطی کی تھی۔ کس نے کیا نہیں کیا تھا جو کرنا چاہیے تھا۔ کہاں کھیل میں تخلیقی خوب صورتی نظر آئی تھی اور کہاں مقابلے میں جذبات کی بدصورتی۔

میں انتظار کرتا رہا۔ موقع پاتے ہی میں نے کہا "خان اعظم۔ آپ کی تنقید بہت سخت ہوتی ہے۔ تعریف بہت نرم۔"

وہ مسکرائے "تیرا غصہ ابھی باقی ہے۔ کوئی بات نہیں۔"

"بس اس سے زیادہ میں نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہے۔"

"کیا یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ تو کیا کر سکتا ہے؟"

میں نے خفت سے کہا "بے شک آپ جانتے ہیں۔۔۔ لیکن....."

"لیکن کے بعد کہنے کو کچھ ہے؟" انہوں نے کہا "چل' پھر نہا دھو کے آجا۔ چائے۔۔۔"

میں نے چلا کے کہا "چائے نہیں' کافی۔ بلیک۔۔۔!"

چندا نے جاتے جاتے پلٹ کے مجھے ڈانٹا "درخواست کرو' ورنہ میں دودھ کا گلاس لا کے رکھ دوں گی سامنے' پینا پڑے گا۔"

میں نے سہم کے کہا "ٹھیک ہے جی۔ آپ سے یہ بندۂ عاجز مؤدبانہ التجا کرتا ہے۔ درخواست کرتا ہے۔ کہ اس حقیر فقیر کو۔۔۔"

جملہ مکمل کرنے کے بعد میں نے زیرِ لب کہا "الو کی پٹھی۔"

اس کے کان کھڑے ہو گئے "تم نے کچھ کہا؟"

"بالکل نہیں۔ یہ آپ یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے۔"

رات کو میں نے آدھا گھنٹا اپنے جنازے کی فلم کا کچھ حصہ فریم بائی فریم دیکھا۔ روک روک کے میں ہر صورت کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا اور ان صورتوں پر جذبات کی اصلی تحریر کو پڑھنے میں مصروف رہا۔ یہ بڑا بیزار کن اور تھکا دینے والا کام تھا۔

جب میں سونے کے لیے لیٹا تو میں نے وہ ڈائری پھر اٹھالی جو بیڈ سائڈ ٹیبل پر اسی نشان زدہ حالت میں موجود تھی۔

○☆○

جب بالآخر لوگ چلے گئے اور عظیم بیگ نے فرزانہ کو خاموش کرنے کے لئے اس کا ہر مطالبہ تسلیم کرنے کا جھوٹا وعدہ بھی کر لیا تو وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ عظیم بیگ نیچے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اس کی پہلی بیوی اپنے کمرے میں روتی رہی۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور عظیم بیگ نے کہا "ہیلو۔"

"تم فرزانہ کے شوہر ہو؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

عظیم بیگ چونکا "ہاں۔ تم کون ہو؟"

"میں بھی اس کا شوہر ہوں۔ سوری' شوہر تھا" جواب ملا۔

عظیم بیگ نے دہاڑ کے کہا "کون ہو تم۔ سؤر کے بچے۔"

اس نے کہا "یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ آج میں نے اس ڈرامے کا پہلا سین دیکھ لیا جو تمہارے گھر میں ہو رہا تھا۔ میں سؤر کا بچہ نہیں' تمہارا ہمدرد ہوں۔ میری بات ٹھنڈے دماغ سے نہیں سنو گے تو بہت نقصان اٹھاؤ گے عظیم بیگ" اس نے کہا۔

عظیم بیگ نے کہا "تم اس کے پہلے شوہر ہو؟"

"میں اس کا دوسرا شوہر تھا۔" وہ بولا "پہلا تو ملک میں ہی نہیں ہے اور مجھے اس کا پتا معلوم نہیں ورنہ میں اسے بھی تم سے ملواتا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے وہ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔ نمبرون اسٹوری بھی ایسی ہی ہے۔ میں نے معلوم کر لیا تھا۔"

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"میں بھی فرزانہ کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا تھا" وہ بولا "میں نے اس سے شادی کر لی تھی کیونکہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے اور اگر میں نے انکار کیا تو وہ معاملے کو پولیس اور عدالت میں لے جائے گی۔ میں

ایک عزت دار ڈاکٹر تھا۔ میں نے اسے ABORTION کے لئے کہا اور اخراجات اور ہرجانہ ادا کرنے کی پیش کش کی مگر وہ آمادہ نہ ہوئی۔ الٹا اس نے مجھے دھمکی دی کہ یہ بات بھی خلافِ قانون ہے اور وہ تو ایک معمولی نرس ہے۔ حدود آرڈیننس میں اندر ہو جانے سے بھی اس کو فرق نہیں پڑتا۔ خواتین پر ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والی تنظیمیں بہت ہیں جو بالآخر اسے رہائی دلا دیں گی۔ چاہے کہ میرا کوئی مستقبل نہ سہی۔ میں بچے کے ساتھ جی لوں گی مگر تم ڈاکٹر ہو۔ تمہاری عزت ہے اور تم جیل گئے یا تمہیں کوڑے لگے تو تمہارا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس کی یہ بات غلط نہیں تھی۔ یہ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ اس نے شادی صرف طلاق حاصل کرنے کے لئے کی تھی۔ نکاح کے سب گواہ اس کے اپنے تھے۔ دو بھائی' منہ بولے بھائی اور ایک ماموں۔ شادی کے بعد اس نے بدزبانی اور بدکلامی سے میری زندگی عذاب کر دی۔ اس نے میرے گھر کو جہنم بنا دیا۔ میری ماں اور بہنوں کو ذلیل کر کے رکھ دیا۔ میں بھی انسان تھا۔ کہاں تک برداشت کرتا۔ جب جھگڑا ہوتا تھا تو وہ خوب اشتعال انگیزی کرتی تھی۔ جلتی پر تیل چھڑکنے کا انجام یہ ہوتا تھا کہ میں غصے سے پاگل ہو کر اس کی ٹھکائی لگاتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کے سارا محلہ اکٹھا کر لیتی تھی۔ یہ سب اس پر ہونے والے ظلم کے گواہ بن جاتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر اچانک اس کے منہ بولے بھائی نمودار ہو گئے۔ انہوں نے مجھے مارا اور اپنی "بہن" کو ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد مجھ پر طلاق کا مقدمہ کر دیا گیا۔ میری بیوی کے وکیل نے حق مہر ایک لاکھ کے دعوے میں ایک لاکھ کا جہیز بھی شامل کر دیا۔ اس میں پچاس ہزار کا زیور بھی تھا جو میں نے اسے مار کے نکالتے وقت رکھ لیا تھا۔ قصہ مختصر' وہ کیس جیت گئی اور مجھے مجموعی طور پر تین لاکھ کا نقصان ہوا۔ مجھے اخراجات بھی ادا کرنے پڑے تھے۔ شادی کے پانچ ماہ بعد اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بچہ میرا نہیں تھا کیونکہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق وہ نو ماہ پورے کر کے دنیا میں آیا تھا۔ بعد میں صرف ایک ہفتہ زندہ رہ کے وہ بچہ نمونیا میں مبتلا ہوا اور مر گیا۔ اگر وہ میرا بچہ ہوتا تو میں اس کی لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کراتا اور مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیا اس بچے کو گرمی کے موسم میں نمونیا فریزر میں رکھنے سے ہوا تھا۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ مقصد کیا ہے تمہارا؟"

"میں اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

"تم ایک بے غیرت آدمی ہو۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو اسے قتل کر کے پھانسی چڑھ جانا منظور کرتا۔"

"عظیم بیگ۔ میری زندگی اتنی بے وقعت نہیں تھی۔ میں نے کسی سے محبت کی ہوتی اور وہ کوئی شریف لڑکی ہوتی تو میں یقیناً ایسا ہی کرتا مگر میں ایک فاحشہ' ایک کسبی کے لئے جان دوں! اتنا بے وقوف نہیں تھا میں۔ تین لاکھ کیا تین کروڑ بھی دے سکتا تھا۔ میری عزت' میرا مستقبل اور میری زندگی اس سے بہت زیادہ اہم تھے۔ میں نے تو خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ میں سستا چھوٹا۔"

"حق مہر تو میرا بھی ایک لاکھ ہے۔"

"دو لاکھ وہ اور وصول کرے گی تم سے۔ نان نفقہ۔ جہیز اور ذہنی و جسمانی تشدد کا جرمانہ۔"

عظیم بیگ فکرمند ہو گیا "تمہیں۔۔۔ کیسے معلوم ہوا کہ پہلے ہی۔۔۔"

"جیسے میں نے تمہیں بتایا' ایسے ہی کسی نے مجھے بتایا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے بعد میں اس وقت معلوم ہوا تھا جب میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے شوہر کو دو لاکھ کی چپت پڑی تھی مگر وہ مجھ سے بھی زیادہ بزدل تھا۔ اس نے بغیر تھانہ کچہری کیے طلاق دے دی تھی اور دو لاکھ کی چپت کھا کے باہر بھاگ گیا تھا۔ اگر اس کا بھی کورٹ ریکارڈ ہوتا تو فرزانہ پھنس جاتی۔ تم ثابت کر سکتے تھے کہ اس عورت کا یہی پیشہ ہے مگر صرف میرے کیس سے اس کی بدقسمتی ثابت ہوگی۔ دوسرا بھی ایسا ظالم شوہر ملا۔"

"ڈاکٹر صاحب' اب میں کیا کروں؟"

"دیکھو عظیم بیگ۔۔۔ تمہاری بیوی ہے' دو بچے ہیں۔"

"ہاں۔ بڑا پُرسکون گھرانا تھا ہمارا۔"

"ان کی خاطر تین چار لاکھ قربان کر دو۔ خیرات سمجھ کر صدقہ نکال دو۔۔۔ اگر تم نے اس نحوست کو اپنے گھر سے نہ نکالا تو تمہارا گھر تباہ ہو جائے گا۔ آئی بات سمجھ میں؟"

بات عظیم بیگ کی سمجھ میں آ گئی تھی اور اس کے پاس فرزانہ سے جان چھڑانے کے لئے پیسہ ہوتا تو وہ اپنے گھر کو برباد ہونے سے ضرور بچا لیتا مگر اس زمانے میں بے جا اخراجات کے باعث بھی وہ شدید مالی بحران کا شکار تھا۔ وہ یرقان میں مبتلا ہوا تھا اور دو ماہ HEPPITITIS میں مبتلا رہنے کے بعد اسپتال سے شفایاب ہو کے لوٹا تھا تو زیادہ جان لیوا بیماری یعنی فرزانہ اس کے ساتھ تھی۔ اگر وہ کچھ نہ کرتا' صرف آرام کرتا تو اسے اسپتال جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی مگر کچھ نہ کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس کا کام سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ جنرل آرڈر سپلائر تھا اور اس کو پہلے دس ہزار مالیت تک کے کنٹریکٹ ملتے تھے۔ وہ PETTY SUPPLIER شمار ہوتا تھا پھر ایک لاکھ تک کے ملنے لگے اور مالی حیثیت مزید مستحکم ہوئی تو اسے دس لاکھ تک کے ٹھیکے ملنے لگے تھے۔ اس کی گڈ ول اچھی تھی پھر یہ کام بھی تعلقات کی بنیاد پر چلتا تھا۔ کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر۔ جب وہ اسپتال میں تھا تو اس کا سب سے رابطہ ختم ہو گیا۔

اس کی بدقسمتی کہ انہی دو مہینوں میں سپلائی کے دو اہم کنٹریکٹ ختم ہو گئے۔ آخری تاریخ گزر جانے کے بعد اسے جو نوٹس بھیجے گئے وہ اسے ملے ہی نہیں یا وہ ان کا جواب نہ دے سکا۔ کاروبار میں رقابت بھی چلتی ہے اور کسی کی تباہی پر اپنی کامیابی کی بنیاد رکھنا عام سی بات ہے۔ دوسرے افسروں اور ٹھیکے داروں نے

موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور عظیم بیگ کے رسک پر ٹھیکے دوسروں نے حاصل کر لئے۔ عظیم بیگ کا سیکیورٹی ڈیپازٹ ایک لاکھ روپے تھا۔ ہرجانے کی رقم اس میں سے وضع کر لی گئی' نئے ٹھیکے داروں کے وارے نیارے ہو گئے۔ انہوں نے ایک روپے کی چیز جس کا ٹھیکا عظیم بیگ نے سوا روپے میں لیا تھا' دو روپے میں سپلائی کر دی۔ سارا نقصان تو عظیم بیگ کو برداشت کرنا پڑا۔ اس کا جما جمایا کاروبار ختم ہو گیا اور اسے بلیک لسٹ کر دیا گیا۔ وہ کاروباری طور پر دیوالیا ہو گیا۔ علاج معالجے میں کم خرچہ نہیں ہوا تھا۔ بیوی کو اس کی زندگی سے بڑھ کے کیا عزیز ہو سکتا تھا۔ اس نے شہر کے بہترین اسپتال کا انتخاب کیا تھا اور علاج کرنے والے بھی عام ڈاکٹر نہیں تھے۔ اس میں پہلے تو وہ سب نکل گیا جو بینک میں جمع تھا پھر بیوی نے اپنے زیور فروخت کر دیے۔ جو تقریباً ایک لاکھ مالیت کے تھے۔ اس زمانے میں ہی فرزانہ پرائیویٹ وارڈ میں عظیم بیگ کو ملنے والی بہترین توجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی۔ یہ توجہ پیسہ پانی کی طرح بہائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی اور پانی کی طرح پیسہ وہی بہا سکتا ہے جس کے گھر میں دولت کا دریا چھپر پھاڑ کے بہہ رہا ہو۔ عظیم بیگ پر معاہدوں کی خلاف ورزی کے مقدمات بھی ہو گئے تھے اور جن کا نقصان ہوا تھا وہ اس سے براہِ راست وصولی پر بھی آمادہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عظیم بیگ سب کا پیسہ کھا گیا اور بھاگ گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ مرتے مرتے بچا ہے تو مروت میں کچھ لوگ خاموش ہو گئے مگر بدخواہوں نے مشہور کر دیا کہ بیماری کا تو بہانہ تھا۔ اس نے ایک اور شادی کر لی ہے۔ جب فرزانہ نے اسے اپنے مخصوص طریقۂ واردات کے مطابق پریشان کرنا شروع کیا تو وہ سخت دباؤ کا شکار تھا۔ اسے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور مقدمات سے بچنے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی املاک کی قرقی نہ ہو جائے اور بیوی بچوں کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا نہ رہے۔ اگر اسے تھوڑی سی مہلت مل جاتی تو وہ سب ٹھیک کر لیتا۔ اس نے بیوی بچوں کو ہمیشہ آرام سے رکھا تھا۔ انہوں نے سختی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ ایک بات اور بتا دوں۔ میری ماں نے اپنے کروڑپتی والدین کی مرضی کے خلاف میرے والد سے شادی کی تھی۔ باپ نے شادی تو اپنی عزت بچانے کے لئے مجبوراً کر دی تھی لیکن میری ماں کو اس کا حصہ دے کر صاف کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ ان سے کوئی امید نہ رکھے۔ وہ دوبارہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ کچھ عرصے بعد وہ مر گیا اور دولت کے وارث اس کے بیٹے یعنی ہمارے ماموں بن گئے۔ وہ عظیم بیگ کے جانی دشمن تھے مگر بہن کی بیوگی کے خیال سے اس کی جان نہیں لے سکتے تھے۔ وہ مکان جس میں ہم رہتے تھے۔ وہ کار جس میں ہم شہزادوں کی طرح پھرتے تھے۔ عظیم بیگ کا بزنس۔ سب اسی پیسے کا کھیل تھا جو میری ماں کو رخصت کرتے وقت نقد دے دیا گیا تھا۔ اس سے ایک تحریر حاصل کرنے کے بعد کہ وہ باپ کی جائداد میں اپنے حصے سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہونا قبول کرتی ہے۔ اسے جہیز کی جگہ یہ حصہ مل گیا تھا۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال میں میری ماں فاقہ کشی منظور کر سکتی تھی مگر اپنے بھائیوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتی تھی۔ اسے ذلت کے سوا کچھ نہ ملتا۔

جب فرزانہ کے دوسرے شوہر۔ اس ڈاکٹر کا فون موصول ہوا تو عظیم بیگ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اس کے پاس اب زہر کھانے کے لئے اپنا پیسہ نہیں تھا۔ وہ مقروض تھا اور اسے قرض ادا کرنے کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ وہ فرزانہ سے جان چھڑانے کے لئے تین چار لاکھ روپے کہاں سے لاتا۔

وہ اپنی پہلی بیوی کے سامنے جا کے رویا اور اسے بتایا کہ ان حالات میں اس کے سامنے خودکشی کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔ پہلی بیوی ہماری ماں تھی اور ایک خاندانی عورت کی حیثیت سے اس نے اپنے سہاگ کو قربان کرنے پر اپنی عزتِ نفس قربان کرنے کو ترجیح دی۔

عظیم بیگ نے اس کے مشورے سے فرزانہ کے لئے کرائے کا الگ گھر لیا۔ اسے بے وقوف بنانے کے لئے کہا کہ یہ گھر اس نے

فرزانہ کے نام سے خریدا ہے۔ اسے ایک بوگس سیل ایگریمنٹ بھی دکھایا اور کہا کہ جب فائنل سیل ڈیڈ بنے گی تو وہ فرزانہ کو اپنے ساتھ لے جائے گا اور مکان کی رجسٹری اسی کے نام سے ہوگی۔ اس کے لئے کار بھی آجائے گی۔ وہ بہت جلد اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دے گا اور پھر وہی ہوگا جو فرزانہ چاہے گی۔ وہ آگئی چکر میں۔ عظیم بیگ ہفتے میں چھ دن اس کے ساتھ رہا۔ ساتویں دن آیا تو بیوی نے اس کے سامنے دو... لاکھ روپے رکھ دیئے۔ شوہر کی عدم موجودگی میں وہ اپنی خودداری اور غیرت کو بالائے طاق رکھ کے اور عزتِ نفس کا خون کرکے بھائیوں کے پاس پہنچ گئی۔ اب وہاں کیا ہوا۔ بھائیوں نے اسے کتنا ذلیل کیا اور کیا کہا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ بہرحال وہ ان سے دو لاکھ قرض مانگ لائی۔ ایک سال میں واپسی کے وعدے پر۔ عظیم بیگ کے لئے یہ رقم کاروبار کو پھر سے جمانے کے لئے کافی تھی۔ اس کے پرانے مراسم برقرار تھے اور کچھ لوگ جو اس کی عزت کرتے تھے اس کی مدد کرنے کے لئے تیار تھے لیکن عظیم بیگ کی بدقسمتی کہ فرزانہ کو اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کا پتا چل گیا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ مکان کرائے کا ہے پھر وہ سمجھ گئی کہ سیل ایگریمنٹ بھی بوگس ہوگا۔ اس نے خاموشی سے دوسرے معاملات کا پتا چلایا تو اسے اصل صورتِ حال کا علم ہوگیا کہ عظیم بیگ تو دوالیا ہے۔ اس کے خلاف وصولیابی کے مقدمات ہیں اور اس کا کوئی کاروبار نہیں۔ اس نے ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ وکیل نے کہا کہ وہ انتظار کرے۔ ایک جعلی سیل ایگریمنٹ ہی عظیم بیگ کا جھوٹ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے پھر ایک دن وکیل سازش کرکے فرزانہ سے ملنے پہنچا۔ جب عظیم بیگ آیا تو وہ کھڑکی سے کود کے نکل گیا مگر اپنے پیچھے کچھ شک پیدا کرنے والی چیزیں چھوڑ گیا۔ سگریٹ کی بُو' ایش ٹرے میں کچھ بجھے ہوئے سگریٹ اور ایک آدھا جلتا ہوا سگریٹ۔ فرش پر سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ۔ ایک مردانہ رومال۔ میرے باپ نے پوچھا کہ یہاں کون آیا تھا۔ فرزانہ نے ترخ کے جواب دیا کہ تم آئے ہو ابھی۔ اس سے پہلے تو کوئی نہیں آیا تھا۔ مشتعل ہوکر میرے باپ نے اس کو مارنا شروع کیا تو فوراً چشم دید گواہ اندر آگئے۔ وہ پہلے سے تیار کھڑے تھے۔ ان میں وہ وکیل بھی تھا۔ غصے میں میرے باپ نے دخل اندازی کرنے والوں سے بھی جھگڑا کیا اور بات بڑھ گئی پھر پولیس آگئی اور میرے باپ کے خلاف پرچہ کٹ گیا پھر جعلسازی کا اور دھوکا دہی کا مقدمہ ہوگیا۔ فرزانہ نے طلاق اور حق مہر کا کیس کردیا۔ جہیز مانگ لیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا مگر اس نے کہا کہ عظیم بیگ کی پہلی بیوی کے گھر میں سب موجود ہے۔ میری ماں جو دو لاکھ بطور قرض لائی تھی وہ عظیم بیگ کی ضمانت کرانے میں اور اسے پولیس کے تشدد سے بچانے میں صرف ہوگئے۔ حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ ہماری ماں اسے گھر لے آئی تھی لیکن اس کا ذہنی توازن برقرار نہیں تھا۔ اس خرابی میں پولیس کے تشدد کا زیادہ دخل تھا۔ مہینے بھر ڈاکٹر اسے گھر آکے

دیکھتا رہا اور سکون آور دوائیں دیتا رہا مگر وہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اس پر وقفے وقفے سے دورے پڑتے تھے۔ جب وہ ہم سب کو پہچاننے سے انکار کردیتا تھا یا گھر سے نکلتا تھا تو واپسی کا راستہ بھول جاتا تھا۔ دورے کی کیفیت ختم ہونے کے بعد وہ خود لوٹ آتا تھا مگر اسے یاد نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ ایسے ہی ایک دورے کی حالت میں وہ فرزانہ کے گھر پہنچ گیا۔ فرزانہ نے شور مچایا مگر وہ ایک جنونی کا کیسے مقابلہ کرسکتی تھی۔ عظیم بیگ نے اسے بھی گلا گھونٹ کے مار دیا اور اس کی بچی کو بھی۔"

ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے میں نے غلط سنا "کیا کہا تم نے۔ اس کی بچی...؟"

"ہاں۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ چھ ماہ کی بچی تھی۔ دہرے قتل کی یہی واردات تھی' جس میں اسے مجموعی طور پر بائیس سال کی سزا ہوئی تھی" طاہر نے کہا۔

"لیکن... اس میں تو..."

"وہ سب غلط ہے۔ عظیم بیگ نے اس کے کسی آشنا کا قتل نہیں کیا تھا۔ نہ اسے قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔ پولیس نے اخبار کے کرائم رپورٹر کو جانتے بوجھتے غلط معلومات فراہم کی تھیں۔ رپورٹر نے بعد میں جو صحیح خبر دی وہ شائع نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ خبر پرانی ہوچکی تھی لیکن تم عدالت کا ریکارڈ دیکھ سکتے ہو۔ عظیم بیگ کا بیان کچھ اور تھا۔ جب اس کے دورے کی کیفیت ختم ہوئی تو وہ پولیس کی تحویل میں تھا۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کرچکا ہے لیکن چشم دید گواہوں نے سب بتادیا۔"

"چشم دید گواہ!"

"ہاں۔ وہ مل جاتے ہیں پولیس کو۔ اس کیس میں عظیم بیگ کے سالوں نے گواہی دی تھی۔ اس کی بیوی کے دو بھائیوں نے جو قرض خواہ بھی تھے ان کا دو لاکھ روپے کا قرضہ ڈوب گیا تھا۔ انہیں عظیم بیگ سے پرانا حساب بھی برابر کرنا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح عظیم بیگ نے بقائمی ہوش و حواس اپنی بیوی اور بچی کو بے رحمی سے مارا۔ بہنوئی نے ان کی ایک نہیں سنی۔ وہ تو اس کے پیچھے پیچھے اسے سمجھانے ہی گئے تھے۔ عظیم بیگ نے بہت پہلے ان کے سامنے اپنے عزائم کا اعلان کردیا تھا کہ وہ اپنی فاحشہ بیوی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ ہمیشہ اس کے کردار پر شک کرتا تھا اور اسے بڑی بے رحمی سے مارتا تھا۔ اس کے گواہ اور لوگ بھی ہیں۔ جہاں فرزانہ کو پہلے رکھا گیا تھا وہاں بھی محلے والوں نے سب کچھ دیکھا اور سنا تھا۔ عدالت میں بوگس سیل ایگریمنٹ پیش کیا گیا۔ پھر بغیر لائسنس کا ریوالور جس پر عظیم بیگ کے فنگر پرنٹس تھے۔"

میں نے کہا "مگر ابھی تم نے کہا تھا کہ عظیم بیگ نے فرزانہ کو گلا گھونٹ کے مارا تھا۔"

"یہ سچ ثابت نہیں ہوا۔ فرزانہ کی گردن اور سر میں لگنے والی دو گولیاں اسی ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ یہ ثابت ہوگیا۔ عدالت

میں پولیس سب کچھ ثابت کرسکتی ہے۔ وہ فائر کی آواز سننے والے گواہ بھی لے آئے تھے۔ آتشیں اسلحے کے ماہر کی رپورٹ بھی۔ عظیم بیگ کو ڈاکٹروں نے ذہنی طور پر بالکل نارمل قرار دیا اور اس پر قتلِ عمد کا جرم ثابت ہوگیا۔"

میں نے کہا "جتنا عرصہ وہ جیل میں رہا' کیا اسے دورے پڑتے تھے؟"

"یہی تو عجیب بات ہے۔ وہ جیل میں بالکل ٹھیک رہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔"اس کی طرف سے اپیل دائر نہیں کی گئی تھی؟"

طارق نے طاہر کی طرف دیکھا "اپیل کون دائر کرتا؟"

"اپیل' تمہاری ماں کرسکتی تھی۔"

طاہر نے سر ہلایا "اس نے نہیں کی۔"

"خود اپنی مرضی سے!"

"دونوں ہی باتیں تھیں۔ اس پر بھائیوں کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ اگر اس نے قرض نہ لیا ہوتا تو وہ بہن کی زندگی کے معاملات میں کیسے دخل دے سکتے تھے۔ عظیم بیگ کے جیل جانے سے ان کے دل میں برسوں سلگنے والی انتقام کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ انہوں نے... اور ساری دنیا نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ اس کنگال شخص سے شادی مت کرو۔ دیکھا کیا صلہ دیا اس نے تمہیں محبت میں قربانی کا۔ یہ ہماری ماں کی جذباتی کمزوری بن گئی تھی جس کا خوب استحصال ہوا۔ وہ بھی زخم خوردہ عورت تھی اور اس کے اعتماد کی شکست کے بعد یہ ذلت اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اس کے بھائیوں نے اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ طلاق لے ورنہ اپنے قرض کی وصولیابی کے لئے وہ مکان پر قبضہ کرلیں گے۔ اکیلی عورت ساری دنیا سے نہیں لڑسکتی۔ اپنے بچوں کی وجہ سے بھی وہ مجبور ہوگئی اور اس کی طرف سے بھائیوں نے عدالت میں تنسیخ نکاح کا کیس کردیا۔ ظاہر ہے ان حالات میں طلاق ناگزیر تھی۔ عظیم بیگ کے وکیل نے بھی جو اسے سرکاری طور پر مہیا کیا گیا تھا' کوئی دلچسپی نہیں لی اور عظیم بیگ کی بیوی کو خلع حاصل ہوگیا۔ بھائی پھر اس کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر اس نے انکار کردیا۔"

"کیا وہ زندہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں" طاہر نے کہا۔

"پتا نہیں!"

"ہاں۔ قضائے الٰہی سے اس کا ایک بھائی فوت ہوگیا تھا۔ دوسرے کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھائی کے ساتھ عمرے پر گئی تھی اور مقاماتِ مقدس کی زیارت کے لئے۔ دراصل اس شادی میں ایک مسئلہ عقائد کے فرق کا بھی تھا۔ عظیم بیگ سنی تھا اور اس کی بیوی شیعہ۔ شادی کے بعد وہ اپنے اپنے مسلک پر قائم رہے لیکن اسی اختلاف کے باعث عظیم بیگ بھی اپنے خاندان سے کٹ گیا تھا۔ وہ ایران اور عراق بھی گئی تھی لیکن لوٹ کر نہیں آئی۔"

"اور جو بھائی ساتھ گیا تھا؟"

"وہ بھی لاپتا ہوگیا... وہ آتا تو پھر کیا مسئلہ تھا' سب معلوم ہوجاتا۔ ہم نے مختلف ذرائع سے تصدیق کی مگر کچھ پتا نہیں چلا۔ کسی نے کہا کہ وہ سڑک کے حادثے میں مارے گئے تھے۔ کسی نے کہا کہ... خیر' اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جانے سے پہلے اس نے ہم دونوں بھائیوں کی شادی کردی تھی اور اپنا سب کچھ ہمارے نام کرگئی تھی۔ ایسا ہوتا ہے' عمرے اور حج پر جانے والے دنیاوی ذمے داری کا بار اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔ سبکدوش ہوکے جاتے ہیں لیکن اس نے ایک اور بات کی جو ذرا عجیب تھی۔ اس نے کہا کہ اپنے باپ کا خیال رکھنا۔ کچھ دن میں وہ رہا ہوجائے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ پہلے ہی واپس نہ آنے کا فیصلہ کرکے گئی تھی۔ جب ہم نے جیل میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ جیل حکام کو باقاعدگی سے رقم ادا کی جاتی تھی۔ پہلے ماہانہ دو ہزار تھے پھر تین ہوئے' آخر میں چار ہزار۔ یہ نذرانہ وصول کرنے کے بعد جیل میں عظیم بیگ پر تشدد نہیں ہوتا تھا اور اسے مشقت بھی معاف تھی۔"

"تمہاری ماں اس سے ملنے جاتی تھی؟"

"نہیں۔ ملنے وہ کبھی نہیں گئی مگر چوری چھپے وہ جو کچھ کرسکتی تھی' اس نے کیا۔ اس کے دل میں احساسِ جرم و گناہ اور پچھتاوے کے دہرے عذاب والے کانٹے پیوست تھے۔ اس نے شادی کی تھی تو یہ غلطی تھی۔ طلاق لی تو یہ دوسری غلطی بن گئی۔ دونوں معاملات میں اس پر جبر ہوا۔ پہلی بار وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی تھی اور اس نے عظیم بیگ کے لئے خاندان کو اور گھر کو چھوڑ دیا تھا۔ دوسری مرتبہ وہ خاندان کے ہاتھوں مجبور ہوئی تو اس نے عظیم بیگ کو چھوڑا۔ وہ بہت مظلوم عورت تھی۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ ظلم تھا۔ جرم تھا اور گناہ تھا۔ عظیم بیگ نے غلطی کی تھی جس کی سزا اسے دنیا نے دی تو وہ بھی دنیا والوں کے ساتھ شامل ہوگئی۔ وہ آخری وقت تک اسے بھلا نہیں سکی تھی۔ جب عظیم بیگ رہا ہوکر نکلا تو ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ جب اس نے ہم سے ماں کے بارے میں پوچھا اور ہم نے اسے حقیقت بتادی تو وہ گم صم ہوگیا۔ اس کو پھر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل جاتا تھا۔ دو بار ہم اسے اپنے پرانے گھر کے سامنے سے پکڑ کے لائے جہاں وہ گیٹ کے سامنے والے لان پر سو رہا تھا۔ یہ گھر وہی تھا جہاں وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ہماری ماں نے بعد میں وہ گھر بیچ دیا تھا۔ اس کو وہم ہوگیا تھا کہ یہ گھر منحوس ہے۔ وہاں ایک دو پرانے لوگ باقی تھے۔ انہوں نے عظیم بیگ کو پہچان لیا اور ہمیں فون پر اطلاع دی۔ ہم نے اس کا نفسیاتی علاج کرانے کی کوشش کی مگر اس نے انکار کردیا۔ عام طور پر وہ نارمل رہتا تھا۔ مہینے دو مہینے' بعض اوقات چھ مہینے تک کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھر میں بہت خوش تھا۔ ہماری

کامیابی پر فخر کا اظہار کرتا تھا۔ اپنی بہووں کے ساتھ خوب گپ شپ کرتا تھا اور شاپنگ یا تفریح کے لئے جاتا تھا۔"

میں نے کہا "تمہاری ماں کے حصے کے علاوہ اس کے بھائیوں کی جائداد وغیرہ بھی تو تمہیں ہی ملی ہوگی۔"

"ظاہر ہے۔ ہم ہی وارث تھے۔ دولت جائداد کیا سارا بزنس ہمیں ہی ملا تھا۔ اس کے بعد ہم نے سنبھال لیا لیکن عظیم بیگ کا مسئلہ بہت سنگین ہوگیا ہے۔ تم نے ٹھیک کہا۔ گزشتہ بار ہم اسے لاہور سے لائے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کا سراغ لگایا تھا۔ یہ تین مہینے ٹھیک رہا اور پھر غائب ہوگیا۔ اب اس کے بارے میں کسی نے فون پر اطلاع دی تھی۔ بتانے والے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ ہم شرمندہ ہوں گے۔ تم نے تو اس کی حالت دیکھی تھی۔ ہم نے اسے رات کے وقت اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اب مجبوری ہے۔ ہم اسے کمرے میں مقفل تو نہیں رکھ سکتے مگر ایک محافظ صرف اس کی نگرانی کرے گا۔ ہر جگہ ساتھ رہے گا۔ رات کو اس کے بیڈ روم کو باہر سے لاک کرے گا کھڑکیوں میں گرل ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہوگیا "آئی ایم سوری۔ میری وجہ سے آپ پریشان ہوئے۔"

"چلیں اس طرح آپ کی ایک پریشانی دور ہوئی۔"

"پریشانی دور نہیں ہوئی۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا "ایک غلط فہمی رفع ہوگئی۔"

میں باہر آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے واپس جانا تھا مگر سڑک آگے جارہی تھی۔ شاید مجھے ابھی اور آگے جانا ہوگا۔ میں نے سوچا' میں سراب کے تعاقب میں ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ میری دسترس میں ہے' جتنا میں آگے جاتا ہوں اتنا ہی وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ میرے سفر کی کوئی سمت نہیں ہے مگر سفر جاری ہے۔ ایک امید مرتی نہیں کہ بالآخر اور اچانک منزل خود مجھے پالے گی۔

○☆○

مزار کمیشن کے پہلے اجلاس کی وڈیو فلم دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس میں ذاتی شمولیت کو اہمیت کیوں نہ دی۔ میرا خیال تھا کہ یہ اجلاس محض ایک رسمی کارروائی ہوگا۔ فاتحہ خوانی' پھر دو منٹ کی سوگوار خاموشی۔ تعزیت کی اور مذمت کی قراردادیں۔ جذباتی منافقت سے بھری ہوئی تقریریں۔ بے بنیاد اور کھوکھلے دعووں والی جوشیلی بکواس۔ عظیم مشن کو جاری رکھنے کے لئے جان و مال قربان کردینے کا عہد (عوام کے جان و مال کا) خون کا آخری قطرہ بہادینے کے عزم کا اظہار (عوام کے خون کا)۔ ممکن ہے کمیشن میں مزید ارکان شامل ہوں یا کسی نام کی شمولیت پر اعتراض کیا جائے۔ میموریل فنڈ کے قیام کا اعلان ہو اور دنیا کا آٹھواں عجوبہ... ایک ایسا مزار بنانے کی منظوری دی جائے جیسا نہ کسی کا تھا نہ ہوگا اور جسے دیکھ کر امریکی صدر بھی خواہش کرے کہ عظیم امریکی قوم "اسٹار وار" کا اربوں ڈالر کا منصوبہ ختم کرکے اس رقم سے ایک زیادہ شاندار مزار بنائے...!

مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ مزار کمیشن کا اجلاس تحقیقاتی کمیشن کا اجلاس بن جائے گا۔ اس میں اتنا سچ اتفاقاً بولا جائے گا اور اس کا اختتام اتنا ڈرامائی ہوگا۔

میں نے اس کی وڈیو ریکارڈنگ تفریح طبع کے لئے لگائی تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کون کیا فرماتا ہے۔ آغاز تو ویسا ہی تھا۔ موقع کی مناسبت سے منتخب کی جانے والی قرآنی آیت کی تلاوت پھر اس کا حسب منشا ترجمہ و تفسیر' پھر تعزیتی قرارداد۔

جو کیمرے کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ شرکا کی نظر سے مخفی تھا۔ وہ فرطِ غم سے نڈھال نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھے کیونکہ پریس فوٹو گرافر ان کی ہدایات کے مطابق صحیح تاثر دینے والی تصاویر بنا رہے تھے۔ مسلسل منافقانہ رویّوں کے باعث عام آدمی بھی خاصی ایکٹنگ کرلیتا ہے۔ وہ تو لیڈر تھے یعنی سپر اسٹار۔ تجربہ کار ایکٹر۔ ایک کا باپ مرگیا تھا تو اطمینان اور مسرت کے جذبات اس سے چھپائے نہ چھپتے تھے کیونکہ وہ قبیلے کا سردار اور ساری زمینوں کا مالک ہوگیا تھا مگر اس کا ہر لڑائی جیتنے والا کتا ایک لڑائی میں زخمی ہوکے مرگیا تھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رویا تھا اور کتے کو گولی مارنے کے بعد اس نے کتے کی دیکھ بھال اور تربیت کرنے والے کو بھی گولی ماردی تھی۔ دوسرے کی بیوی نے "خودکشی" کی تھی تو وہ چالیس دن تک سب کے سامنے کالے کپڑے پہنے پھرتا رہا تھا۔ رات کو جب وہ "وجۂ خودکشی" کے ساتھ ہوتا تھا تو مارے خوشی کے جامے سے باہر ہوجاتا تھا۔ یہ ایک نمبر خاندانی بیوی تو بیچ بیچ خود کو وزیراعظم کی طرح بااختیار اور خودمختار سمجھنے لگی ہے۔ او بابا' کیسا اختیار' اقتدار۔ درجن بھر وزیراعظم نکال پھینکے اور ماردیے... کیا ہوا؟

اکتالیسویں دن نمبر دو بیوی (سابقہ سیکریٹری) نمبر تین (سابقہ نامور اداکارہ) اور نمبر چار (تحفۂ پیر سائیں) کو اطلاع ملی کہ اب ان کے درجات بلند ہوگئے ہیں۔ نمبر چار پر ایک ماڈل آگئی تھی۔ تعدادِ ازدواج کی حد میں جو شرع کی پابندی نہ کرے وہ تو کافر ہوا ناجی...!

باقی معزز اراکین کی ذات سے وہ سچ منسوب تھے جو بوجوہ ضابطۂ تحریر میں نہیں لائے جاسکتے۔ میر نے کہا تھا۔ میر صاحب زمانہ نازک ہے۔ دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار۔ اب دستار یعنی پگڑی کوئی نہیں پہنتا۔ شلوار البتہ قومی پہناوا ہے اور ہر صوبے میں خاص و عام پہنتے ہیں۔

گڑبڑ کمیشن کے صدر کا نام پیش کرنے سے شروع ہوئی۔

نام پیش کرنے والا بھی چمچہ تھا اور اس کی تائید کرنے والا بھی' ان کو اندازہ تھا کہ مخالفت ہوگی اور دوسرا گروپ کسی اور کا نام تجویز کرے گا۔

"آخر کس بنیاد پر تیمور لنگ کو مزار کمیشن کا صدر بنایا جارہا ہے؟" ایک ممبر نے اٹھ کے اعتراض کیا جس کا تعلق دوسرے گروپ سے تھا۔

تیمور نے احتجاج کیا "آپ میرے نام کو بگاڑنے کی کوشش مت کریں جناب۔"

کسی صحافی نے آواز لگائی "اچھا جو بگاڑنا ہے میں خود بگاڑ لوں گا۔"

مخالف گروہ کے دوسرے شخص نے کہا "تیمور صاحب ایک ٹانگ میں گولی لگنے سے زخمی ہوگئے تھے... شکار کے دوران۔"

"اس وضاحت کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے کب کہا ہے کہ ان کی ایڑی پر پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا" کوئی اور مخالف بولا۔

تیمور نے کہا "یہ کیا فضول بات چل رہی ہے یہاں۔ میرا نام امیر تیمور ہے۔"

کوئی اور صحافی بولا "سات سال پہلے بھی غریب تیمور نہیں تھا۔"

ایک مخالف نے میز پر ہاتھ مار کے کہا "حالانکہ اس وقت یہ غریب تھے' یہ پیدائشی امیر نہیں ہیں.... میری طرح۔"

تیمور کے ایک حامی نے بھڑک کے کہا "ایسے غدار زادے بہت ہیں جن کے باپ انگریزوں سے وفاداری کے انعام میں جاگیریں لے کر امیر ہوگئے تھے۔"

"میرا باپ پکا مسلم لیگی تھا۔ جدوجہدِ آزادی اور پاکستان کے حصول کی خاطر اس نے جو کچھ کیا..."

"مجود میں بہت سے ایسے غدار بھی مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے۔ ہوا کا رخ دیکھ کر انہوں نے انگریز سے وفاداری چھوڑ دی تھی۔"

تیمور نے کہا "پلیز' پلیز جنٹلمین۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

ایک اور ممبر نے سہلایا "ہم یہاں مزار کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے آئے ہیں اور سب پارٹی کے سینئر کارکن ہیں۔"

تیمور نے سہلایا "میرا نام تجویز کرنے والے نے یقیناً مجھے سب سے سینئر سمجھتے ہوئے ایسا کیا تھا۔ میں سینئر نائب صدر ہوں۔"

نائب صدر نے کہا "سب جانتے ہیں کہ تم اس عہدے تک کیسے پہنچ گئے تھے۔ صرف سات سال میں۔"

"شمس صاحب۔ سات سال پہلے آپ کون سی جماعت کی حکومت میں شامل تھے؟" تیمور نے طنز سے کہا۔

دوسرے نائب صدر نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا "نائب صدر میں بھی ہوں مگر اپنی وفاداری کے باعث' پارٹی کے لئے سب سے زیادہ قربانی میں نے دی۔"

"ہاں۔ تم نے پارٹی کے نام کو' پارٹی کے مفادات کو' پارٹی لیڈر کو سب کو قربان کردیا" شمس نے کہا۔

اس کے ایک حامی نے کہا "شمس صاحب۔ یہ ان کالے بکروں کا حوالہ دے رہے تھے جو انہوں نے شاہ عالم شہید کے صدقے میں قربان کئے تھے۔ اخبارات دیکھ لیں' سب سے زیادہ تصویریں انہی کی ہیں۔"

"سچ ہے" کسی صحافی نے کہا "چار سو بیس بکروں کی قربانی ایک ریکارڈ ہے۔"

"بھئی قریشی ہیں آخر۔" کوئی اور بولا۔ کچھ لوگ ہنسے۔

تیمور نے پھر صورتِ حال کو کنٹرول کیا۔ "حضرات و خواتین۔ موقع کی مناسبت سے سنجیدہ رویّہ اختیار کریں۔ اس وقت ہم سب کے دل حزن و ملال میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"

"حزن و ملال کے کنوئیں میں یا سمندر میں؟" کسی نے کہا۔

"یار دل کو تیرنا آتا ہے نا۔ پہلے بھی کئی بار ڈوبا تھا لیکن نکل آیا تھا۔"

تیمور نے برہمی سے صحافیوں کو دیکھا "آپ لوگ یہاں رپورٹنگ کے لئے آئے ہیں یا رخنہ اندازی کے لئے؟"

"ہم جو دیکھ اور سن رہے ہیں کیا وہ رپورٹنگ کے قابل ہے؟" آپا صفیہ نے کہا "مزار کمیشن کی کارروائی تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔"

تیمور نے کہا "پلیز' آپ یہ سب حذف کردیں۔"

"کیوں حذف کردیں؟ کیا یہ اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی ہے اور آپ اسپیکر ہیں؟" یہ شبنم تھی۔

"اسے آف دی ریکارڈ سمجھ لیں" تیمور نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے والی نظروں سے گھورا۔۔۔ کہ بے وقوفو کیوں اخبار والوں کے سامنے سچ کا اعتراف کررہے ہو۔

اب ایک لہراتی داڑھی والے نے اخبار لہراتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ آئینہ ملاحظہ فرمائیں۔ جلال پور جٹاں کے جلالی پیر صاحب کا بیان۔"

"جلالی نہیں جعلی پیر" شمس نے کہا "وہ ایک کباڑیے کا بیٹا ہے۔"

مولانا نے چلا کے کہا "جلالی پیر صاحب کے روحانی درجات اور کشف و کرامات کا سلسلہ۔"

"اس وقت سے شروع ہوا تھا جب وہ راج کا کام کرتے تھے اور ان کے سر پر اینٹ گری تھی" شمس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جملہ پورا کردیا۔

"ہاں پھر وہ مجذوب ہوگیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا تھا۔"

مولانا نے آئینہ رکھ کے خاموشی سے تشریف رکھنا بہتر سمجھا۔

اب ایک کھدر پوش کھڑا ہوگیا۔ "آج ہی علامہ جلیل القدر نے شاہ عالم شہید کو شہید کا لقب دینے کے شرعی مسئلے پر رائے دی ہے۔"

"علامہ جلیل القدر کا نام بیہودہ ذلیل القدر ہونا چاہیے تھا" دوسرے نائب صدر قریشی نے مشتعل ہو کر کہا۔

"یہ ایک عالم دین کی توہین ہے۔"

"یہ شاہ عالم شہید کی توہین ہے۔"

"وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والا مُلّا خود کو علامہ کہتا ہے؟ نہیں چاہئے ہمیں اس کا فتویٰ۔"

کھدر پوش نے دبی سا دفاع کیا مگر اس کی آواز مخالف شور میں دب گئی۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا کہ جذباتی فضا اس قسم کے سچ کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ حقیقت کیا ہے' یہ سب ہی جانتے تھے۔

ایک بار پھر نظم و ضبط بحال ہوا تو اپنی عزت بچانے کے لئے اور پریس کے سامنے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے تیمور نے خود اپنا نام واپس لینے کا اعلان کردیا۔ اس کی یہ قربانی ریکارڈ پر آگئی۔ اس نے ثابت کردیا کہ وہ عہدہ نہیں چاہتا' پارٹی کے مخلص کارکن کی حیثیت سے وہ شاہ عالم شہید کے مزار پر مزدور بن کے کام کرسکتا ہے۔

اس کے جذباتی ڈائیلاگ کا متوقع ردِّعمل ہوا۔ کچھ لوگوں نے طنزاً بھی تالیاں بجائیں۔

اس نے ایک اور پوائنٹ اسکور کیا "بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگ تالیاں بجارہے ہیں اس موقع پر بھی۔"

تالیاں بجانے والے شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ ظاہراً' ورنہ وہ سب بڑے ڈھیٹ چیز تھے۔

تیمور نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ اس اعزاز کا مستحق وہی شخص ہوگا جس نے عملاً سب سے زیادہ قربانیاں دی ہوں۔ پارٹی کے لئے بھی اور شہید شاہ عالم کے لئے بھی۔"

"پھر تو میاں اس وقت ہمیں اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے ہاں۔۔۔ اپنے سوا۔" ایک کونے میں سے آواز آئی۔

سارے سر ایک دم گھوم گئے۔

"یہ کون بدتمیز ہے۔۔۔؟" تیمور نے خفگی سے کہا۔

"اجی اس میں کیا بدتمیزی ہے۔ آپ نے جو بات بولی' اس کے جواب میں ہم بولے' کوئی جھوٹ نہیں بولے۔"

شمس نے کہا "بابا جی۔ یہاں مزار کمیشن کا اجلاس ہورہا ہے۔"

قریشی نے کہا "یہ چپراسی یہاں کیا کررہا ہے؟"

"ہم سب جانتے ہیں" اس بڈھے نے سرہلا کے کہا جس پر اب سارے کیمرے فوکس ہوگئے تھے "ہم کیا کررہے ہیں یہاں اور تم سب کیا کررہے ہو۔ ارے آج تم ہم سے پوچھتے ہو کہ ہم کون ہیں؟ ہم بتاسکتے ہیں کہ تم کون ہو' تم سب۔۔۔۔"

"نکلواسے یہاں سے باہر۔" تیمور نے دہاڑ کے کہا۔

سفید داڑھی والا بڈھا چھلانگ مار کے آگے آگیا "کون مائی کا لال ہم کو نکال سکتا ہے ادھر سے۔ ہم اپنی بات کہے بنا نہیں جائیں گے۔ ہاں' ہمارا نام خداداد ہے۔ ہم چپراسی نہیں ہیں۔"

کسی نے کہا "پرانا کارکن ہے۔"

"دماغ چل گیا ہے بے چارے کا" کوئی اور بولا۔

تیمور کے حکم پر دو مسلح محافظ اسے زبردستی نکالنے کے لئے آگے آئے مگر خداداد نے چلا کے کہا "ارے ہم پاگل نہیں ہیں۔ اخبار والو' تم دیکھ رہے ہو۔ کوئی ہماری بات بھی نہیں سنتا۔"

شبنم نے کہا "کیا بات ہے۔ کیوں خائف ہیں آپ لوگ اس بوڑھے سے؟"

دوسرے صحافی نے کہا "کیوں اس کی بات سننا نہیں چاہتے؟"

تیمور نے مصلحت کو سمجھتے ہوئے محافظوں کو روک دیا۔

"خداداد۔ تم اپنی بات بعد میں بھی کہہ سکتے ہو۔"

"نہیں' ہم جو بولیں گے سب کے سامنے بولیں گے۔ ابھی بولیں گے۔ تم قربانی کی بات کرتے ہو۔ ہم سے پوچھو ہم نے کیا قربان کیا۔ ہم نے تو سب قربان کردیا۔" خداداد کو حمایت ملی تو وہ سینے پر ہاتھ مار کے چلانے لگا "اللہ اس کی مغفرت کرے۔ شہید شاہ عالم کے ساتھ ہم تھے اس وقت جب اور کوئی نہیں تھا۔ ہم نے اس کو بچانے کے لئے پولیس کے ڈنڈے کھائے۔ آگے بڑھ کے ہم نے جیل کاٹی' بہت مار کھائی۔"

"وہ سب ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

"ارے کیا اگر مگر۔۔۔ ایک گھر تھا ہمارے پاس اور ہم کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ ہماری دکان تھی۔ اپنا مکان تھا۔ ہم نے سب بیچ کے پارٹی کو دیا۔ خود کرائے کے مکان میں جاکر رہے۔ اس کو بھی دشمنوں نے آگ لگادی۔ ہماری۔۔۔ ہماری گھر والی اس آگ میں جل کے مرگئی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "ایک بچہ جل گیا۔ جوان لڑکی بچ گئی ہماری چھاتی پر سوار۔ شکل بگڑ گئی اس کی۔ کسی نے اس سے شادی نہیں کی۔ اتنی خوب صورت لڑکی بدشکل ہوگئی۔ چڑیل بن گئی۔ اس کا چہرہ آدھا جل گیا تھا۔ ہم نے وہ بھی برداشت کرلیا۔ شاہ عالم شہید خود ہمارے گھر آئے۔ ہم کو تسلی دی۔ فوٹو ہیں ہمارے پاس۔ ہمارا ایک جوان بیٹا کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کی نوکری گئی پھر اس پر پولیس نے کیس بنائے۔ اس کو مارڈالا ظالموں نے۔ ہم کو پاگل خانے میں ڈال دیا۔ ہمارے پیچھے وہ بدقسمت لڑکی مرگئی۔ اس نے خودکشی کرلی۔ ہم کو کس نے پوچھا۔ کسی نے ہماری ضمانت نہیں کرائی۔ ہم سے زیادہ کس نے قربانی دی ہے۔ بولو' آج تم لوگ ادھر مزار کمیشن بنا کے بیٹھے ہو۔ ہم بولتے ہیں پہلے ہمارا مزار بنادو۔ ہم جیسے تو بہت ہیں۔ ہم سے بھی زیادہ قربانی دینے والے مگر وہ سڑ رہے ہیں جیل خانوں میں۔ ختم کردیئے گئے ہیں۔ ادھر ہم تمہارے سامنے ہیں اس لئے یہ پوچھتے ہیں تم سب سے۔۔۔"

اجلاس میں ذرا سی دیر کے لئے سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ مزار کمیشن کے اراکین ایک دوسرے سے نظریں چرارہے تھے اور اس سفید ریش بڈھے سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ اس نے کہا تھا اس کا ایک ایک لفظ سچ تھا۔ کسی ثبوت کے بغیر بھی سچ تو سچ ہی رہتا ہے۔

پھر وہ سب جو سچ کی اتنی کڑواہٹ برداشت نہیں کرسکتے تھے' ایک آواز ہوگئے "نکالو باہر اس پاگل کو۔ یہ اندر آیا کیسے۔ بلاؤ سیکیورٹی والوں کو۔"

محافظوں نے اس چیختے چلّاتے بڈھے کو پکڑلیا اور باہر لے گئے۔

خداداد نے جو کچھ بتایا تھا اس کا ہر لفظ صداقت پر مبنی تھی۔ وہ سب جو وہاں جانتے بوجھتے انجان بننے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے' خداداد کو بہت اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے اور ایسے اَن گنت مخلص (یا بے وقوف) کارکنوں کو بھی جو آج صفِ مجرماں میں شامل تھے۔ انہی کے دستِ عنایت سے کنجِ زنداں میں تھے۔ خواری کے صدمات سے دل زدہ گمنامی قبول کئے بیٹھے تھے۔

مجھے مارنے والے طے شدہ طور پر میرے جانی دشمن تھے' اس کے باوجود مجھے انہی کی "عقیدت" کے باعث منصبِ شہادت پر فائز کرنے کی کوشش جاری تھی۔ اس کے برعکس ہزاروں' لاکھوں کارکن ایسے تھے جو اپنوں کی بے مروتی اور مفاد پرستی' خود غرضانہ شقاوت اور سفاکانہ بے حسی کے کند آلوں سے قتل ہورہے تھے۔ کچھ سخت جان تھے کہ برسوں زخم کھاتے اور چاٹتے رہے۔ جو درد بانٹتے تھے' انہی کے آگے درماں کے لئے دامانِ طلب پھیلاتے رہے۔ انہی سے ستم وجورِ ناخدا کہتے رہے جو ناخدا کو حکم صادر فرماتے تھے کہ ان کی امیدوں کا سفینہ کسی ساحلِ مراد تک نہ پہنچنے پائے۔ رو رو کے انہی خود ساختہ منصفوں سے گزارشِ احوالِ واقعی کرتے رہے جن کے نزدیک احوالِ واقعی کہنا ہی ناقابلِ معافی جرم تھا۔

خداداد جیسے جذباتی کارکن قابلِ رحم حد تک مظلوم و مجبور تھے۔ ان کی زندگی ہی تقدیر کے جبر کا عنواں تھی۔ وہ اپنے خاندان کے واحد کفیل تھے یا کسی معذور باپ کے بڑھاپے کی لاٹھی تھے یا کسی بیوہ ماں کی اندھی آنکھوں کے لئے امید کی روشنی تھے۔ ان کے یہ جذباتی رشتے۔ ان کی غلامانہ ملازمت' قرضوں کے بار' یہ سب زنجیریں توڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ورنہ نظریاتی اور عملی طور پر یہ میرے سب سے زیادہ مخلص' مضبوط اور قابلِ اعتماد ساتھی تھے۔ وہ میرے ووٹ بینک کا سب سے بڑا حصہ تھے جو میرے نام کی پرچی پر اپنے اعتماد کی مہر ثبت کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ حربے بازی اور جذباتی ڈراموں سے خود کو میری نظر میں نمایاں کرنے والے مٹھی بھر ابن الوقت قسم کے لوگوں کے مقابلے میں ان بے وقعت کارکنوں کی تعداد ہزار گنا یا کئی لاکھ گنا زیادہ تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کارخانے کی دیوہیکل مشینری کا سب سے غیر اہم' کسی کی نظر میں نہ آنے والا اور کم قیمت حصہ نٹ بولٹ اور اسکریو ہوتے ہیں جو خود بظاہر کچھ نہیں کرتے لیکن وہ تمام مشینی کل پرزوں کو مربوط اور مستحکم رکھتے ہیں ورنہ مشین منتشر اجزا کا ڈھیر بن جائے۔

کار ایک ہو تو اس کے پہیے چار ہوتے ہیں مگر ان کو کار سے جوڑنے والے نٹ بولٹ سولہ یا بیس ہوتے ہیں۔ یا اس سے بھی زیادہ' دروازہ ایک ہوتا ہے تو قبضے چار مگر دروازے کو ناقابلِ شکست رکاوٹ بنانے والے مضبوطی سے قائم رکھنے والے حقیر اور بے قدر و قیمت اسکریو بتیس ہوتے ہیں۔ میری اصل کامیابی یہی تھی کہ میں نے پسِ پردہ رہ کے اپنی خاموش حمایت سے خود کو طاقت فراہم کرنے والے لاکھوں افراد کا دل جیت لیا تھا۔ ان کے نصیب میں مفلسی کا عذاب موروثی تھا جسے یہ نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرتے تھے مگر ان کی زندگی کو جینے کی سزا بنانے والے وہی لوگ تھے جو آج مسندِ اقتدار پر فروکش تھے۔

آخری وقت میں جب محافظ کانفرنس روم کے گیٹ پر تھے' تیمور نے اخبار والوں کے تیور دیکھ کے آواز دی "دیکھو۔ خداداد صاحب کو میرے آفس میں بٹھاؤ۔ میں ان سے بعد میں بات کروں گا۔"

کسی نے کہا "خبردار۔ یہ کمرے سے بھاگنے نہ پائے۔"

صحافیوں کی طرف سے دو تین سوال آئے۔ آخر پرانے کارکنوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہورہا ہے؟ مخلص کارکن کیوں

پارٹی سے نکال دیے گئے ہیں۔ ان کی قربانیوں کا انھیں یہ انعام دیا جارہا ہے؟"

تیمور نے سب کو خاموش کردیا۔ "میں بہت جلد پرانے کارکنوں کی ساری شکایات دور کردوں گا۔ ہم ان کے جذبے کی قدر کرتے ہیں۔ ان کا تجربہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہوگا۔ ہم ان کا کنونشن بلائیں گے۔"

"اس راہ پر مشعل کیا کرے گی جس پر آپ چل رہے ہیں۔" اس کے روایتی حریف شمس نے کہا۔

"جو کرے گا ڈنڈا کرے گا" قریشی بولا۔

"ڈنڈے اور مشعل میں بہت فرق ہے۔ ڈنڈا روشنی نہیں دکھاتا" تیمور نے کہا۔

"ڈنڈے سے تو چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں" قریشی نے طنز سے کہا "ڈنڈا بڑا پیر ہے۔"

"آپ جیسوں کے لئے ہوگا" شمس نے کہا۔

تیمور نے کہا "خدا کے لئے آپ لوگ ایسی باتوں میں نہ الجھیں۔ میں پرانے کارکنوں کا کنونشن بلانے کی بات کررہا تھا۔"

"یہ مزار کمیشن کا اجلاس ہے یا ایگزیکٹو کمیٹی کی میٹنگ" شمس نے کہا "ایجنڈے کا پہلا پوائنٹ صدر کا انتخاب تھا۔ ابھی تک وہ نہیں طے ہوسکا۔"

تیمور کا نام تجویز کرنے والا بولا "آپ نے نہیں ہونے دیا۔"

"چلئے شمس صاحب۔ آپ صدر کا نام تجویز فرمائیے" تیمور نے طنز سے کہا۔

"یہ خود اپنا نام تجویز کرتے ہیں" قریشی بولا۔

"میں عہدوں کا بھوکا نہیں ہوں، تمہاری طرح" شمس نے پلٹ کے جواب دیا "بکروں کی گردن پر چھری پھیرنے والے قوم کی گردن پر چھری چلانے آگئے ہیں۔"

قریشی کا باپ کسی زمانے میں واقعی گوشت بیچتا تھا' اسے فخر ہونا چاہئے تھا کہ باپ نے پڑھا لکھا کے اسے کہاں پہنچادیا۔ آدمی کی عزت پیشے سے نہیں ہوتی۔ عزت کے قابل وہ باپ تھا جس نے محنت کی کمائی سے بیٹے کو تعلیم دلوائی۔ وہ چاہتا تو اسے اپنے ساتھ دکان پر بھی بٹھا سکتا تھا مگر آج قریشی اس طعنے پر آگ بگولا ہوجاتا تھا۔

"صدر کی بات ہوگی بعد میں۔ پہلے میں ممبران کی اہلیت کو چیلنج کرتا ہوں" مولانا صاحب نے شور شرابے میں میز پر مکا مار کے کہا "کس نے نامزد کئے ہیں یہ ممبر اور کس بنیاد پر؟"

قریشی نے کہا "پہلے آپ بتائیں کہ آپ کا کیا استحقاق ہے؟ آپ کیسے مزار کمیشن کے ممبر بن گئے۔ آپ تو مزارات کے خلاف تھے۔"

"میں۔۔۔ آج تک ہر اجلاس میں شریک رہا ہوں" مولانا چراغ پا ہوگئے "آپ بتائیں کہ شہید شاہ عالم کے زمانے میں ہر میٹنگ کا آغاز تلاوت سے کون کرتا تھا۔ ہر سیاسی جلسے میں سب سے پہلے کون مائیک کے سامنے آتا تھا؟"

شمس نے اس موقع پر اپنے دشمن کی حمایت کی "جیسے ٹیوب لائٹ میں ایک اسٹارٹر ہوتا ہے۔ ایسے ہی آپ پارٹی میٹنگ کے اسٹارٹر تھے۔ یہ خوش قسمتی ہے آپ کی۔ تلاوت میں بھی کرسکتا ہوں۔"

"اور آپ کے جو کیسٹ ملک بھر میں فروخت ہورہے ہیں' وہ کام آسکتے ہیں آپ کی جگہ۔ آپ ہی کی آواز ہے۔" کوئی اور بولا۔

"مگر ایک حافظ اور ایک ٹیپ ریکارڈر۔ کیا دونوں برابر ہیں؟" مولانا نے چیخ کے کہا۔

تیمور نے پھر صورتِ حال کو کنٹرول کیا "مولانا صاحب۔ ذرا موقع کے تقدس کا خیال فرمائیے۔ آہستہ آواز میں بات کیجئے اور باقی سب حضرات بھی یہ ذہن میں رکھیں کہ اس وقت ہم یہاں مزار کمیشن کے ممبران کی اہلیت کے سوال پر غور کرنے کے لیے جمع نہیں ہوئے ہیں۔ ممبران کا انتخاب ہوچکا ہے۔۔۔"

"یہ انتخاب نہیں تھا۔ نامزدگی تھی" شمس نے اس کی بات کاٹی۔

"چلئے یوں ہی سہی۔"

"نامزدگی ایک غیر جمہوری طریقہ ہے" قریشی نے کہا۔

ایک اور ممبر نے اس کی تائید کی "اہلیت کا کوئی معیار ضرور ہونا چاہئے ممبروں کے لئے بھی۔"

"قریشی صاحب۔ نامزد کرنے والا میں نہیں ہوں۔ پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی ہے۔" تیمور نے کہا۔

"اس کے اب آپ ہی چیئرمین ہیں" قریشی بولا۔

"اتفاق ہے۔ اتفاقِ رائے سے نہیں" شمس نے اپنے حریف کی حمایت کی۔

"آپ ایگزیکٹو کمیٹی کے فیصلے کو چیلنج نہیں کرسکتے۔ یہ پارٹی ڈسپلن کے خلاف ہوگا" تیمور نے برہمی سے کہا۔

"خود آپ نے کتنی بار پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی تھی تیمور صاحب۔ اگر آپ کو یاد نہیں تو ان اخبار والوں سے پوچھ لیں۔ آپ نے تو پارٹی کے صدر کے انتخاب پر بھی تنقید کی تھی۔ صدر کو آمر کہا تھا۔ مطالبہ کیا تھا کہ ایگزیکٹو کمیٹی کو توڑ دینا چاہئے کیونکہ اس میں سارے چمچے اور لوٹے ہیں" شمس نے کہا۔

"یہ تو سچ ہی بولا تھا انہوں نے" کسی صحافی نے کہا۔

"بس یہ نہیں بتایا تھا کہ کون چمچہ ہے اور کون لوٹا" دوسرا بولا۔

قریشی نے کہا "اب میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ایگزیکٹو کمیٹی توڑدی جائے۔ جنرل باڈی کا اجلاس بلایا جائے جو نئی کمیٹی کو منتخب کرے۔"

تیمور نے پریشانی سے کہا "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ۔ اس طرح تو یہ کام کبھی نہیں ہوگا۔ جنرل باڈی کا اجلاس چہلم سے پہلے نہیں بلایا جاسکتا۔"

"کیا یہ پارٹی کے منشور میں شامل ہے یا کوئی آئینی مسئلہ ہے؟" قریشی کے ایک حامی نے سوال کیا۔

تیمور ایک لمحے کے لئے لاجواب ہوا "یہ۔۔۔ شہید شاہ عالم سے ہماری محبت اور عقیدت کے جذبات کا تقاضا ہے۔"

"یہ محض ایک بہانہ ہے" ایک نے کہا۔

"ایگزیکٹو کمیٹی منتخب کرنے سے مرحوم کے احترام میں فرق نہیں پڑتا۔ یہ عین جمہوریت ہے اور شہید شاہ عالم کی تعلیمات اور ان کے نظریات کے مطابق۔"

تیمور سنبھل گیا۔ "آپ لوگ میری بھی سن لیں۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کا انتخاب فوری مسئلہ نہیں۔ یہ کام اطمینان سے بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ پورے ملک میں پھیلے ہوئے سارے کارکنوں سے رائے لینے سے پہلے نئے ارکان کو بھی وقت چاہئے کنویسنگ کے لئے تاکہ وہ ممبروں کے سامنے اپنی کارکردگی اور اپنی صلاحیت کو ثابت کرسکیں۔ انہیں ممبروں سے ملنا ہوگا یا ان تک اپنی بات پہنچانے کے لئے بروشر اور پمفلٹ تقسیم کرنے ہوں گے۔ یہ پورا انتخابی عمل ہے۔ اس میں چھ مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ نئی ایگزیکٹو کمیٹی منتخب ہونے کے بعد مزار کمیشن کے نئے ممبر نامزد ہوں گے۔ اس کے بعد صدر کے انتخاب تک ایک سال گزر جائے گا۔"

تیمور کو نامزد کرنے والے نے کہا "تیمور صاحب صحیح فرماتے ہیں۔"

"چپ کرو چمچے۔" شمس نے کہا۔

"تم نے مجھے چمچہ کہا' لوٹے کی اولاد۔"

"تم نے میرے باپ کو لوٹا کہا ہے" شمس بھڑک کے اٹھا۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ممبر نے شمس کا ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا۔ "چھوڑو جی شمس صاحب۔ کتا بھونکے تے نال بندا نئیں بھونکدا۔"

اب اجلاس میں مچھلی بازار کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

"کس کو کتا کہا ہے تم نے سؤر کے بچے؟"

"اوئے۔ اوئے' کیوں آخیا اے سؤر۔ کھوتے دے پتر۔"

"بکواس کی تو دانت توڑ کے ہتھیلی پر رکھ دوں گا" کھوتے دا پتر کھڑا ہوگیا۔

سؤر کا بچہ فوراً مقابلے کے لئے کھڑا ہوگیا لیکن اس نے قطعی ناقابلِ اشاعت بات کی۔

"بیٹھ جاؤ" تیمور نے دہاڑ کے کہا "ورنہ۔۔۔!"

"ورنہ کیا؟ باہر پھنکوادوگے؟ اسمبلی میں بھی تم یہی دھمکی دیتے تھے۔"

دوسرے نے کہا "جیل میں ڈلوادوگے یا اپنے غنڈوں سے پٹوادوگے؟"

ایک پٹھان ممبر نے ریوالور نکال لیا "چوپ کرو خنزیر کا بچہ۔ ابھی کوئی بولے گا تو ام اس کا مغز میں گولی مارے گا۔ خویارا یہ کیسا کیشن ہے۔"

"وہی دس فیصد جو تم ہمیشہ کھاتے رہے ہو ٹھیکے دار صاحب" شمس نے بے خوفی سے کہا "تم کس کس کو گولی مارو گے۔ یہاں ہر شخص کی جیب میں ریوالور ہے۔ تم کو اس لئے جلدی ہے کہ مزار کا ٹھیکا بھی تمہیں ہی ملے گا۔"

قریشی کو بھی بولنے کا حوصلہ ہوا "یہ توپ اپنی جیب میں رکھ لو خان صاحب۔" اس نے ریوالور نکال کے لہرایا "یہاں غنڈا گردی نہیں چلے گی۔"

تیمور نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اخبار والے اس اجلاس کی کارروائی سے بہت خوش تھے۔ کچھ تیزی سے نوٹ لے رہے تھے تو ان کے ساتھ آنے والے فوٹوگرافرز مسلسل کیمروں کے فلیش چمکا رہے تھے اور ہر منظر کو کیمرے کی فلم پر پارٹی کی تاریخ کے ناقابلِ فراموش لمحات کی تصویر بنا کے محفوظ کرتے جارہے تھے۔ کل یہ سب کچھ اخبارات میں سرخیوں اور تمسخر آمیز جملکیوں کے ساتھ شائع ہوگا۔ معزز اراکینِ مزار کمیشن ایک دوسرے پر ریوالور تانے ہوئے دلیل کی جگہ گولی سے قائل کررہے ہیں۔

"کیا آپ لوگ پاگل ہوگئے ہیں" تیمور نے چیخ کے کہا "آپ لوگوں کو ذرا احساس نہیں کہ کل یہ سب کچھ اخبارات میں آئے گا تو پارٹی کا امیج کتنا خراب ہوگا۔ آپ سب لوگوں کے بارے میں رائے عامہ کیا ہوگی۔ کیسے لوگ شاہ عالم شہید کا مزار بنانے کے لئے مزار کمیشن میں شامل تھے جو سب ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے تھے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ یہاں بھی آپ سب مسلح آئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں سب کی تلاشی لینے کا حکم دیتا۔"

"کس حیثیت میں یہ حکم دیتے تم؟" قریشی نے کہا۔

"قریشی صاحب۔ میں سینئر نائب صدر ہوں۔ صدر کے بعد نئے صدر کے انتخاب تک میں ہی پارٹی کا سربراہ ہوں۔ منشور کے مطابق" تیمور نے دہاڑ کے جواب دیا۔

"میں نہیں مانتا ایسے منشور کو" شمس نے حبیب جالب کی مشہور نظم میں معمولی سی ترمیم کے ساتھ کہا۔

"آپ منشور کو نہیں مانتے!" بیک وقت کئی آوازیں اٹھیں۔

شمس پڑھتا رہا "۔۔۔ صبح بے نور کو۔ میں نہیں مانتا۔۔۔ ایسے منشور کو۔"

تیمور نے میز پر مکا مارا "شمس صاحب۔ اتنے معتبر گواہوں کی موجودگی میں منشور سے انحراف کے جرم میں آپ کو پارٹی کی بنیادی رکنیت سے بھی خارج کیا جاتا ہے۔ آپ جاسکتے ہیں۔"

شمس نے سینہ تان کے کہا "اور میں نہ جاؤں تو۔۔۔؟"

"مجھے آپ کو زبردستی نکلوانا پڑے گا۔ باہر پولیس موجود

ہے۔"

"پولیس۔" شمس نے حقارت اور طنز سے کہا "دھمکی دیتے ہو تم مجھے۔ گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب میرے راز داں اور بھی ہیں۔ تیمور صاحب' علامہ اقبال نے یہ شعر اسی موقع کے لئے کہا تھا۔"

"منشور سے انحراف کرنے والے کا ساتھ کوئی نہیں دے گا۔" قریشی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "جو ساتھ دے گا وہ بھی بنیادی رکنیت سے' خود بخود محروم ہوجائے گا۔ میں اس معاملے میں تیمور صاحب کے فیصلے کی توثیق کرتا ہوں۔"

شمس کے اشارے پر دس افراد کھڑے ہوگئے "ہم سب شمس صاحب کے ساتھ ہی جائیں گے" ایک بولا۔

دوسرے نے کہا "ہم پارٹی کا فارورڈ گروپ بنائیں گے۔"

تیسرے نے کہا "پھر ہم پارٹی ٹکٹ دیں گے اور انتخابات لڑیں گے۔"

قریشی نے چیخ کے کہا "تم پارٹی کو ہائی جیک کرنا چاہتے ہو؟"

"پارٹی تو ہائی جیک ہوچکی ہے" شمس نے بھی غصے سے کہا۔

تیمور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ "میں اس سے زیادہ بے ہودگی برداشت نہیں کرسکتا۔ میں جارہا ہوں۔ آپ لوگ لڑتے رہیں تخت نشینی کی جنگ۔ اچھا تماشا ہوگا ساری دنیا کے سامنے۔ شاہ عالم کو شہید ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے کہ اس کی پارٹی دو ٹکڑے ہوگئی۔ کم سے کم میں اس جرم میں شریک نہیں ہوسکتا" وہ واک آؤٹ کرگیا۔

"اصل مجرم تم ہی ہو۔ اسی لئے بھاگ رہے ہو" پیچھے سے قریشی نے کہا۔

"نفاق کا یہ بیج بونے والے مجرم تم ہو" شمس نے بڑھ کے قریشی کو پکڑلیا۔

"تم مجھے الزام دے رہے ہو.... مجھے؟" قریشی نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کے کہا "ابھی سب کے سامنے سب سے پہلے منشور سے انحراف کا اعلان تم نے کیا تھا۔ تم باغی ہو' غدار ہو۔"

سینئر وائس پریذیڈنٹ کی وہ کرسی جس پر تیمور بیٹھا ہوا تھا' اٹھتے خالی پڑی تھی۔ کبھی اس پر میں بیٹھتا تھا لیکن میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اصل اہمیت کرسی کی تھی جس کی خاطر میرے مخلص اور دستِ راست پارٹی سے وفاداری کا حلف اٹھانے والے اور عوام کے خادم آج دست وگریباں تھے۔

نہ جانے کیسے خداداد پھر نمودار ہوگیا۔ اس مرتبہ وہ اسی راستے سے اندر آیا تھا جس سے ابھی ابھی تیمور باہر گیا تھا۔ وہ کرسی صدارت پر بیٹھ گیا۔

"ابی ہم بولتے ہیں خاموش!" اس نے گرج کے میز پر ہاتھ مارا "ہم صدر کی جگہ بیٹھ چکے ہیں۔ اب ہم صدر ہیں۔ جو ہم بولیں گے...."

وہ آپس میں لڑنا بھول گئے تھے اور غصے سے اس دیوانے کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ پاگل پھر کیسے آگیا یہاں؟" شمس نے چلّا کے کہا۔

"اسے تیمور نے چھوڑا ہے۔ یہ تیمور کی فتنہ انگیزی ہے۔"

"انگریزی۔۔۔ انگریزی تو ہم نہیں جانتے مگر ہم نے انگریز کو اس ملک سے جوتے مار مار کے بھگادیا تھا۔ اب جو ہم کو پاگل بولے گا' ہم اس کو بھی اتنے جوتے ماریں گے۔ اتنے جوتے ماریں گے۔"

"سارجنٹ!" شمس نے چیخ کے سیکیورٹی چیف کو پکارا "باہر نکلواسے اور پولیس کے حوالے کردو۔"

دو سارجنٹ دائیں بائیں سے نمودار ہوئے اور کرسی کے پیچھے باادب کھڑے ہوگئے۔ یوں جیسے وہ میرے پیچھے کھڑے ہوتے تھے۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟" شمس نے کہا "اسے اٹھا کے باہر پھینک دو۔"

قریشی نے کہا "سارجنٹ۔ کیا تم نے سنا نہیں؟"

سارجنٹ نے نفی میں سر ہلایا "جو بھی اس کرسی پر بیٹھا ہو سر' ہم اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔"

"میں نائب صدر ہوں پارٹی کا" شمس غصے سے پاگل ہوگیا "تم میرا حکم ماننے سے انکار کررہے ہو؟"

"میں بھی نائب صدر ہوں" قریشی نے کہا "یہ میرا بھی حکم ہے۔"

"سوری سر۔ سینئر نائب صدر تیمور صاحب ہیں" سارجنٹ بولا۔

دوسرے سارجنٹ نے کہا "شہید شاہ عالم کے بعد وہی پارٹی کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔ وہ یہاں موجود ہیں۔ انہوں نے ہمیں امن وامان کی صورت حال پر قابو پانے کے لئے بھیجا ہے اور اس کرسی کی حفاظت کے لئے۔"

"سیکیورٹی چیف نے ان کے حکم پر باہر جانے والے سب راستے بند کردیے ہیں۔" دوسرے سارجنٹ نے اعلان کیا "ہال سے باہر... آپ اسی صورت میں جاسکتے ہیں جب اپنا اسلحہ رضاکارانہ طور پر یہاں میز پر رکھ دیں۔"

"ہاں۔ ہم بولتے ہیں تم لوگ یہاں توپ خانہ' گولہ بارود لائے ہی کیوں تھے آخر۔ چلو' آپ شروع کرو جج صاحب!" خداداد نے حکم دیا۔

"میرا نام شمس ہے پاگل خانے" شمس نے برہمی سے کہا۔

"اور تو کون ہوتا ہے ہمیں حکم دینے والا۔ کل تک دکان پر دال چاول' نمک مرچ تولتا تھا پھر کریانہ مرچنٹ ایسوسی ایشن کا صدر ہوگیا تھا۔" قریشی بولا۔

"کل کی بات مت بولو ہمارے سامنے۔ کیا تم بھول گئے۔ ہمارے گھر بقرعید پر تم کس حلیے میں آتے تھے۔ چہرے پر بھتے

لے کر۔ اور معاوضے میں بکھال کندھے پر ڈال کے لے جاتے تھے۔ قریشی صاحب' ساتھ تمہارے ابا ہوتے تھے اور تایا۔ کیا نام تھے ان کے۔؟... ہاں' بابو مستانی اور کالو قسائی' ایک چھوٹا گوشت بیچتا تھا' دوسرا بڑا... ادھر کراچی میں' جیکب لائن۔"

"یہ جھوٹ ہے...." قریشی نے چیخ کے کہا "میں اس حرام زادے کو گولی ماردوں گا۔"

"ابی ہم کو گولی مارنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ تو سچ ہی رہے گا۔"

"یہ تیمور کی غنڈا گردی ہے۔" شمس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "وہ ہم سب کو ذلیل کرانا چاہتا ہے۔ اس دو ٹکے کے...."

"ہاں۔ دو ٹکے تم بھی لیتے تھے۔ اپنے لاہور کے اسلامیہ اسکول کے باہر گولے گنڈے کی ریڑھی تھی تمہاری۔ خیر کل کی بات چھوڑو۔ اب جو ہم نے بولا ہے وہ کرو۔ ادھر میز پر لا کے رکھ دو پستول' بندوق' توپ جو بھی ہے تمہاری جیب میں ورنہ ہم بلاتے ہیں اندر اپنی فوج کو۔ وہ سب نکال لیں گے.... گردن سے پکڑ کے...."

ایک لمحے کے لئے سب پر سناٹا طاری ہوگیا۔ تیمور نے بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ اس نے اخبار والوں کے سامنے اپنا امیج برقرار رکھا تھا اور صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کی مخالفت کو برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے خلاف بغاوت شروع ہوچکی تھی مگر فائدہ تیمور نے اٹھایا۔ اس نے اپنے آئینی اختیارات سے کام لیتے ہوئے پارٹی کی سیکیورٹی فورس کو آرڈر جاری کردیے تھے کہ وہ کانفرنس روم کے شرکا سے اسلحہ لے لیں اور چیئرمین کی کرسی کو بچانے کا قانونی فریضہ ادا کریں۔ اس سے پہلے وہ خداداد کو دھکے دے کر نکالنے والوں سے کہہ چکا تھا کہ اسے آفس میں بٹھایا جائے۔ اب اس نے خداداد کو چیئرمین کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے بھیج دیا تھا۔

خداداد کے پیچھے جدید اسلحے سے لیس محافظ کھڑے ہوئے تھے ورنہ وہ سب مل کے خداداد کی ساری چیئرمینی نکال دیتے۔ ایسے ہی مسلح محافظ کانفرنس روم کے ہر گیٹ پر موجود تھے۔ سامنے اخبار والے اور کیمرا مین تھے۔ اگر وہ مزاحمت کرتے تو ان کی زیادہ بے عزتی ہوتی۔ کسی میں اپنا اسلحہ لے کر مقابلے پر آجانے کا دم نہیں تھا۔ وہ خداداد کو جان سے ماردیتے مگر یہ ناممکن تھا اور اس سے اشتعال پھیلنے کا خطرہ تھا۔ نچلے درجے کے کارکنوں میں پہلے ہی مایوسی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اخباروں میں بھی پرانے کارکنوں کے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی کے چرچے تھے۔ تیمور نے مداری کا وہ کھیل دکھایا تھا کہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ اس نے ایک بچہ جمورا کو کرسی صدارت پر بٹھادیا تھا اور اب تماشائی اپنی جیب خالی کرنے پر مجبور تھے۔

وہ سب ایک ایک کرکے اٹھے اور انہوں نے اپنا اسلحہ میز پر رکھنا شروع کیا۔ خداداد خوش ہوتا رہا اور ہر پستول' ریوالور کو اٹھا کے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے محافظوں کو پکڑاتا رہا۔ مجھے سخت تعجب ہوا جب میں نے خوش الحان نعت خواں وشاعر حبیب اللہ حبیب کو بھی سفید کرتے کی اندرونی جیب سے ایک ریوالور نکالتے دیکھا۔ مشیر کوہستان علامہ گل محمد پشاوری اپنی دستارِ فضیلت' عبا اور عمامہ سنبھالتے سینے پر پھیلی ہوئی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے تشریف لائے اور ایک روسی ساخت کا ماؤزر رکھ گئے۔ اس پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ وہ جس علاقے سے تعلق رکھتے تھے وہاں اسلحہ تو مرد کا زیور مانا جاتا ہے۔ علاقہ غیر اور اسلحہ صدیوں سے لازم وملزوم رہے ہیں۔

اب صرف خداداد ہنس رہا تھا۔ باقی سب احتجاج کررہے تھے۔ بہ آوازِ بلند تیمور کی غنڈا فورس کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اسے کھلی فسطائیت قرار دے رہے تھے اور یہ بھولے ہوئے تھے کہ اخلاقی اور جمہوری قدروں کو پامال کرتے ہوئے پارٹی کے جذباتی اور جنونی نوجوانوں پر مشتمل سیکیورٹی کے نام پر یہ مسلح فورس خود انہی کی تجویز اور حمایت سے قائم ہوئی تھی اور اسے متعدد مواقع پر بے دریغ استعمال بھی کیا گیا تھا۔ کبھی مخالفین کے خلاف تو کبھی اپنے ہی کارکنوں کی آواز دبانے کے لئے۔ پارٹی کی مرکزی کمان کے تابع یہ پیرا ملٹری فورس جیسی تنظیم شاہ عالم کے ذہن کی تخلیق تھی چنانچہ "فاتح عالم" کہلاتی تھی۔ ان کے نام اور نظریاتی عقیدے کی بنیاد علامہ اقبال کا یہ مصرع تھا "یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتح عالم" یہ الگ بات ہے کہ ان کا عمل مقصد اور استعمال صریحاً اس خیال کے برعکس تھا۔

ابھی ہتھیار ڈالنے کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ تیمور پھر آگیا۔ اس نے جھک کر خداداد سے کچھ کہا اور اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ خداداد کھڑا ہوگیا اور اس کی جگہ تیمور نے سنبھال لی۔ تیمور کو دیکھتے ہی غصے میں بھرے ہوئے' ذلت کے احساس سے دوچار اور شکست کے خیال سے چراغ پا ممبر ایک ساتھ چلّانے لگے۔

تیمور نے دہاڑ کے کہا "خاموش۔ خاموش ہوجائیں سب اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔"

"ہم اجلاس کا بائیکاٹ کرتے ہیں" شمس نے کہا۔

"ہماری بے عزتی کی گئی ہے پریس کے سامنے" قریشی بولا۔

"سب سے پہلے میں واک آؤٹ کرتا ہوں" مولانا گل محمد نے کہا۔

تیمور نے پھر بلند آواز میں کہا "بیٹھ جائیے مولانا صاحب۔ ایسے کوئی باہر نہیں جاسکتا۔ میرے حکم پر گیٹ باہر سے بند کردیے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے آخر اس سلوک کا....؟" مولانا نے برہمی سے کہا۔ "کیا ہم قیدی ہیں تمہارے؟"

تیمور نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا لیکن مجھے مجبور کرنے والے بھی آپ سب لوگ تھے۔

آپ لوگوں کا رویہ انتہائی غلط تھا۔ یہ مزار کمیشن کا پہلا اجلاس تھا۔ آپ لوگ یہاں مسلح ہو کر کیوں آئے تھے؟ آپ لوگوں کو ایک مقدس ذمے داری سونپی گئی ہے۔ آپ کے سامنے ایک عظیم کام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پارٹی کی ایگزیکٹو باڈی نہ رہے۔ نئے انتخابات ہوں تو پارٹی کے یہ عہدے دار بھی نہ رہیں مگر مزار کمیشن رہے گا۔ مزار کمیشن کا چیئرمین کوئی اور ہو سکتا ہے۔ ممبر تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن مزار کمیشن کا نام وہی رہے گا۔ میری جگہ شمس صاحب ہوں یا قریشی صاحب... یا مولانا گل محمد پشاوری۔ چیئرمین کو مزار کمیشن کی کارروائی کسی قاعدے ضابطے کے تحت چلانی ہوگی۔ پارٹی ڈسپلن کو ملحوظ رکھنا ہوگا... مقصد کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔"

اس کی تقریر نے سب کو شرمندہ اور خاموش کردیا تھا۔

اچانک شبنم نے اس کی بات میں دخل اندازی کی "جناب تیمور صاحب...! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں اور آپ کے خیالات سے بھی متفق ہوں۔"

"آپ ابھی تشریف رکھیں" تیمور نے کہا۔

شبنم بولتی رہی "لیکن میں ایک سوال کرنا چاہتی ہوں سر...!"

"سوال بعد میں کریں۔ کمیشن کی کارروائی میں خلل مت ڈالیں مس شبنم" تیمور نے سخت لہجے میں کہا۔

شبنم نے اپنی بات جاری رکھی "سوال یہ ہے سر کہ آپ کس کا مزار بنانا چاہتے ہیں؟"

تیمور نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ خدا داد کی طرح پاگل ہے۔ باقی سب کی نظریں اس پر جم گئیں۔ اس کے چہرے پر' اس کے جسم کے نشیب و فراز پر۔ اس کی سیاہ قمیص کے گریبان پر جس کا ایک بٹن کھلا ہوا تھا۔

تیمور بولا "آپ خدانخواستہ نشے میں تو نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں مزار کمیشن کے تمام معزز ممبروں سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ یہ مزار کس کا ہوگا؟ شاہ عالم شہید کا؟ کہاں بنے گا یہ مزار؟ اس قبر پر جہاں آپ کے خیال میں اسے دفن کیا گیا تھا؟ کیا بنیاد ہے آخر آپ سب کے یقین کی... کہ شاہ عالم شہید کو اسی قبر میں دفن کیا گیا تھا؟"

آپا صفیہ نے کہا "شبنم... شبنم... یہ تم کیا کررہی ہو؟"

شبنم نے چلا کے کہا "مجھے بتائیں' کیا ثبوت ہے کہ وہ قبر شاہ عالم شہید کی ہے... اور اس قبر میں وہی ہے؟"

"سارا زمانہ جانتا ہے۔"

"زمانے کی بات مت کریں۔ آپ میں سے کسی نے دیکھا تھا شاہ عالم شہید کو دفن ہوتے؟ کون موجود تھا وہاں؟ کس نے دیکھا تھا اس کا چہرہ؟"

مزار کمیشن کے اجلاس میں ایسی افراتفری پھیل گئی تھی جیسے کانفرنس ہال کے دروازوں سے زہریلے سانپ کلبلاتے ہوئے اندر گھس آئے ہوں یا شبنم نے پن نکال کے درمیان میں دستی بم اچھال دیا ہو۔

ان سب کے چہرے ایک سوالیہ نشان بن گئے تھے اور وہ جواب کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے پر مجبور تھے۔ کیا یہ سوال پیدا ہوگا؟ ایسا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا پھر یہ سوال کیوں پیدا ہوا؟ اچانک کہاں سے نازل ہوگیا؟ اس سوال کا وجود اس بچے کی طرح تھا جس کی ولدیت کے بارے میں خود ماں ہی اپنے شوہر سے سوال کر بیٹھے کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ہی اس کے باپ ہو؟ کیا بنیاد ہے تمہارے یقین کی؟ یہی شبنم نے بھی پوچھا تھا۔

یقین کی بنیاد ہوتی ہے' ہونی چاہئے۔ بنیاد کے بغیر دیواریں کیسے اٹھائی جاسکتی ہیں خواہ وہ گھر کی ہوں یا مزار کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میری تدفین کے وقت ان سب میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا جو مزار کمیشن کے اجلاس میں شریک تھے۔

تیمور نے کہا "آج کا اجلاس ملتوی کیا جاتا ہے۔"

میں ان سب منتشر ہونے والوں کے چہرے دیکھتا رہا جو وہاں سے افراتفری میں فرار ہورہے تھے۔ ایک دھماکے نے سب کے حواس مختل کردیے تھے۔ خود اخبار والے بڑی عجلت میں نکل رہے تھے۔ اب تک وہ بہت خوش تھے کہ جتنا تماشا انہوں نے دیکھا وہ آنے والے دن کے اخباروں کو بہت سی سنسنی خیز سرخیوں اور باتصویر خبروں سے بھردے گا۔ اچانک ان پر یہ انکشاف ہوا کہ اصل تماشا تو اب شروع ہوا ہے۔ وہ سب رشک اور حسد کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پلٹ پلٹ کے شبنم کو دیکھتے جارہے تھے۔ وہ اسی ہیجان خیز شان دلربائی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے ڈگڈگی بجا کے سب کو متوجہ کرلیا تھا۔ دیکھو' مداری کا نیا تماشا دیکھو۔ اچھی طرح دیکھو میرے منہ میں کیا ہے؟... زبان' جیسی تم سب کے منہ میں ہے۔ کیا کام لیتے ہو تم اس زبان سے؟ کھٹا میٹھا' ٹھنڈا گرم چکھنے کا۔ روکھی سوکھی اور طعام شاہانہ کے ذائقے کو محسوس کرنے کا۔ لفظ بنانے اور آواز میں ڈھالنے کا۔ گیت گانے یا گالی دینے کا۔ زبان نفرت کا زہر اگلتی ہے یا محبت کا امرت ٹپکاتی ہے مگر میں اس زبان سے ایک اژدہا اگلنے لگی ہوں۔ تم سب کے درمیان چھوڑنے کے لئے۔ مداری کا ایسا کھیل تم نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ ٹھہرو' دیکھو۔

مگر تماشا دیکھنے والے بھاگ گئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اژدہا ان کو نگل لے گا۔ حالانکہ یہ نظر نہ آنے والا' احساس کا اژدہا تھا جس سے فرار ہو کے وہ کہیں بھی نہیں جاسکتے تھے۔

آپا صفیہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگیں۔ خوب صورت کبوتری کالی آنکھیں۔ ابھرے ہوئے رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں۔ نیم وا لب' مردانہ سیاہ قمیص اور اس کے گریبان کا کھلا ہوا بٹن۔ ایک غارت گر عقل و ہوش

حسن و شباب کی مالک شبنم کے وجود میں آخر کس کی روح تھی؟ کلوپیٹرا کی یا سامری جادوگر کی؟ ہندوؤں کی دیوی "کالی" کی یا خود اپنے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ تھامنے والے سقراط کی؟

آپا صفیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "یہ تم نے کیا کیا شبنم۔ تم جانتی ہو... اب وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

شبنم ان کے کندھے پر سر رکھ کے بولی "میں... میں جینا چاہتی ہوں آپا..." پھر وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

نہ جانے کب فلم بلینک ہوگئی۔ کسی نے کیمرا آف کردیا تھا۔ ٹی وی آن رہا۔ وی سی آر بھی چلتا رہا۔

○☆○

گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کے اور پیروں کو جوتوں سمیت میز پر رکھنے کے بعد میں نے کہا "میری پیاری بس قمرالنسا! الّو کا پٹھا آیا تھا؟"

قمر کے چہرے کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے لال ہوا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نے کس کے بارے میں سوال کیا ہے۔ پہلے وہ اس کا برا مانتی تھی اور کہتی تھی "آپ کو ان کا نام لینا چاہئے" اور میں قہقہہ مار کے کہتا تھا "ان کا' کی بچی۔ اس کا یہی اصل نام ہے۔"

قمر نے آہستہ سے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"ہوں..." میں نے کہا اور قمر کو ڈانٹنا شروع کیا "یعنی آج بھی غائب ہے وہ؟ آخر کیوں؟ میں پوچھتا ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

اس نے سہم کے کہا "میں... میں کیا بتاؤں جی۔"

"اور کون بتائے گا؟... بولو' کیا یہ میرا قصور ہے؟"

"تو میرا کیا قصور ہے...؟"

"تمہارا قصور ہے بے وقوف لڑکی۔" میں نے ٹانگیں سمیٹ کر میز پر مکا مارتے ہوئے کہا "تم نے ڈھیل دے رکھی ہے اسے۔ تم کو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ تم میں اگر صلاحیت ہوتی نا تو وہ ہر وقت تمہاری خدمت میں حاضر رہتا۔ تمہارے ایک اشارے پر کچے دھاگے سے بندھا آتا' کٹی پتنگ کی طرح نہ ڈولتا پھرتا۔"

اس نے دبے دبے لہجے میں مسکراہٹ کو دبا کے کہا "ہوگا کوئی ضروری کام۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ضروری کام۔ کاش' وہ ضروری کام کرتا لیکن مس قمر۔ افسوس ناک امر تو یہی ہے کہ وہ ہر غیر ضروری کام کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ میں مصروف تھا۔ مجھے تمہاری بے وقوفی سے زیادہ بدبختی پر رونا آتا ہے۔ کیا تمہیں میرے لہجے میں رقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے کہ میں باقاعدہ آنسو بہانے لگوں' مجھے کافی پلوادو۔ اس کے بعد پوچھنا کیوں؟"

قمر نے الیکٹرک کیتل کا پلگ آن کیا اور مگ میز پر رکھ دیے۔ انسٹنٹ کافی' کریم اور چینی کے ڈبے اس نے میز کی نچلی دراز سے نکالے پھر کافی بنا کے میرے سامنے رکھی اور بولی "کیوں؟"

میں نے احمقوں جیسی شکل بنا کے کہا "کیوں؟ کیا کیوں؟"

"ناصر بھائی۔ آپ نے کہا تھا... کہ کافی پلانے کے بعد پوچھنا۔"

"اوہ... لیکن پہلی بات تو یہ کہ کافی تم نہیں پلا رہی ہو۔ میں خود پلا رہا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ابھی میں نے کافی پینی شروع بھی نہیں کی لیکن خیر... کلیجا شق ہو رہا تھا تمہاری بدبختی کا سوچ کے بہن۔"

وہ کافی کی چسکی لے کر مسکرانے لگی "مجھے تو بدبختی کہیں نظر نہیں آتی۔"

"آف یہ ایک اور سانحہ ہے کہ تمہاری عقل کے ساتھ نظر بھی اتنی کمزور ہے کہ بدبختی تمہارے سامنے ہے اور تم دیکھ نہیں سکتیں۔"

"میرے سامنے تو آپ ہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اچھا؟ خیر اس کے علاوہ بھی غور کرو تو اسباب کی کمی نہیں جن سے ثابت ہو گا کہ تم کتنی بدنصیب ہو میری بہن۔ تم کو صبح شام چار چار آنسو بہانے چاہئیں... کہ تم سوئٹزرلینڈ' ہالینڈ' نیوزی لینڈ یا چاکلینڈ میں کیوں پیدا نہیں ہوئیں۔"

"چاکلینڈ... یہ بھی کوئی ملک ہے' ناصر بھائی؟"

"ہاں۔ وہاں سوائے چاکلیٹ کے کچھ نہیں۔ زمین چاکلیٹ کی ہے۔ درختوں پر پھلوں کی جگہ چاکلیٹ ہوتی ہے' ملک چاکلیٹ' کوکونٹ چاکلیٹ' لوگ ناشتے میں' لنچ میں اور ڈنر میں چاکلیٹ کھاتے ہیں۔ چاکلیٹ سوپ سے نہاتے ہیں۔ چاکلیٹ شیمپو' چاکلیٹ بیوٹی کریم" میں نے بریف کیس میں سے چاکلیٹ کا پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا "یہ میں نے خاص طور پر تمہارے لئے چاکلینڈ سے منگوائی ہے۔ ہزہائی نس کنگ آف چاکلینڈ کا تحفہ پرنسس قمرالنسا آف پاکستان کے لئے... دو پیکٹ تھے مگر ایک اس کی نندیدی ملکہ کھا گئی۔"

چاکلیٹ کی انتہائی شوقین ہونے کے باوجود اس نے پیکٹ لے کر کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ ابھی تک وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کے ہنسی بھی نہیں تھی۔ یہ میرے لئے تشویش کی بات تھی۔

میں نے کہا "تم چاکلینڈ میں پیدا ہوتیں تو عیش کرتیں۔ یہاں بھائی بھی ملا تو میرے جیسا۔ ایک ناک اور دو کانوں والا... اور جسے تم جیون ساتھی بنانے پر بضد ہو' وہ ہے ایک الّو کا پٹھا۔ گدھا ہوتا تو ساری عمر سواری کرتیں۔"

اس نے آہستہ سے کہا "آج امی کا خط آیا ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ محاورے کے مطابق۔ ورنہ حقیقت اس کے برعکس رہی۔ میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ زبان' سانس اور غالباً دل کی دھڑکن بھی رک گئی۔ میں ساری بک بک بھول گیا۔

چند سیکنڈ بعد میرے حلق میں پھنسی ہوئی آواز نکلی تو وہ مجھے اپنی آواز سے زیادہ کسی خلائی مخلوق کی آواز لگی "خط آیا ہے۔ امی کا...؟"

قمر نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

میں نے کہا "اتنی دیر کے بعد بتا رہی ہو یہ بات؟ کہاں سے آیا ہے خط؟"

اس نے روتے ہوئے کہا "پتا نہیں ناصر بھائی۔"

"اچھا اب آنسو مت بہاؤ" میں نے اٹھ کے اسی کے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کئے اور اس کی پیشانی کو چوما "کہاں ہے وہ خط؟"

قمر نے میز پر رکھی ہوئی فائل ٹرے کے نیچے سے لفافہ نکال کے مجھے تھما دیا۔ خط قمر کے نام بوتیک کے پتے پر آیا تھا۔ اس پر ڈاک خانے کی مہر صاف نہیں تھی۔ مہر کا زیادہ حصہ لفافے کے چھپے ہوئے ٹکٹ پر آ گیا تھا۔ اس کے اندر سے دو خط برآمد ہوئے۔ ایک قمر کے لئے تھا اور دوسرا میرے لئے۔ دونوں بے حد طویل خطوط تھے۔

قمر کو اس نے لکھا تھا۔ "پیاری بیٹی قمر۔ اللہ تمہیں سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ تم یقیناً مجھے ایک اچھی ماں نہیں سمجھتی ہو گی۔ باپ تو جیسا تھا' سو تھا۔ اللہ اس کے گناہ معاف کرے اور اس کی مغفرت کرے لیکن میں نے بھی تمہاری خوشی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اس کا بہت رنج ہے اور میں تم سے شرمندہ بھی ہوں مگر میں کیا کروں؟ میں بہت مجبور تھی۔ میں انہیں معاف نہیں کر سکتی تھی جنہوں نے مجھے بیوہ اور تمہیں یتیم کیا تھا۔ اگر تمہارے باپ کا کوئی بھائی یا بیٹا ہوتا تو اس کا انتقام لینے کی ذمے داری میں کیوں قبول کرتی۔ یہ ہماری روایت بھی ہے اور اس کا اثر میرے خون میں ہے۔ جب تک میں تیرے باپ کے قاتلوں کو ٹھکانے نہیں لگا دوں گی' لوٹ کے نہیں آؤں گی۔ صرف میں ہی ان کو جانتی ہوں اور پہچانتی ہوں۔ ان میں سے ایک کا خاتمہ گیارہ مہینے پہلے کر دیا تھا اور اب دوسرے کی باری ہے۔ بس مجھے موقع کا انتظار ہے۔ چند دن کی بات اور ہے۔ اس کے بعد تین باقی رہ جائیں گے۔ زندگی رہی تو ان سے بھی نمٹ لوں گی۔ میری طرف سے بالکل فکر مت کرنا۔ مجھے اطمینان ہے کہ تم بے سہارا نہیں ہو اور کسی پر بار بھی نہیں ہو۔ میں تم کو اس بھائی کے سپرد کر آئی ہوں جو تمہارے لئے بھائی بھی ہے اور باپ کی جگہ بھی۔ شاید ایک حقیقی بھائی ہوتا تب بھی تمہارا اتنا خیال نہ رکھتا۔ دنیا میں ایسے بھائی کم نہیں جو بہنوں کے حق غصب کر جاتے ہیں اور ان کی خوشیوں کے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ کا احسان ہے مجھ پر کہ تمہیں اپنے بھائی کا پورا تحفظ حاصل ہے اور اس کے ہوتے کوئی تمہاری طرف بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا اور خدا کے بعد تمہارے جان و مال کا نگہبان وہی بھائی ہے۔ یہ بھی خدا کا کرم ہے کہ آج تم اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور کسی کی بھی محتاج نہیں ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا فیشن بوتیک اور بیوٹی پارلر بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ باپ کی شفقت تمہارے نصیب میں نہیں تھی۔ اس کا گلہ تقدیر سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں تم اپنی ماں سے گلہ کر سکتی ہو کہ اس نے تمہیں تنہا چھوڑ دیا۔ لاکھوں کیا کروڑوں کی دولت کسی ماں کی محبت کا نعم البدل نہیں ہو سکتی لیکن میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میری کیا مجبوری تھی۔ ہر شخص زندگی میں کبھی اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ کبھی گھر' کبھی خاندان' کبھی شہر یا ملک تو کبھی اولاد۔ تاہم میں نے تمہاری زندگی کو بڑی مضبوط بنیادیں فراہم کی ہیں اور قابلِ اعتماد سہارا دیا ہے۔ خود تمہاری ذات میں اعتماد کی کمی نہیں اور تم دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ میں نہیں جانتی کہ پھر تم اور میں کب ایک چھت کے نیچے اکٹھے ہوں گے۔ ہوں گے بھی یا نہیں؟ میرے لئے اسی طرح دعا کرنا جیسے میں ہر روز خدا سے تمہارے مستقبل کی خوشیوں کے لئے دعا کرتی ہوں۔ میری تین باتیں کبھی مت بھولنا۔ ایک یہ کہ تمہارا اور میرا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ میں نے تمہیں اپنی کوکھ سے جنم دیا۔ سخت ترین حالات میں پالا اور ڈھال بن کے تمہاری حفاظت کی۔ سولہ سال تک میں نے پتھر سے ہیرا تراشا اور تمہیں قمرالنسا بنا دیا۔ اب تم قمرالنسا ہی رہو گی۔ تمہاری شخصیت اور کردار پر زمانے کی مخالف قوتیں اثر انداز نہیں ہوں گی۔ دوسری بات یہ کہ اپنے بھائی سے کبھی بدگمان نہ ہونا۔ خواہ بدخواہوں کی زبان اس کو شیطان ثابت کر دے مگر وہ فرشتہ ہی رہے گا۔ اس جیسے بیٹے جننے والی مائیں بڑی ہی خوش نصیب ہوتی ہیں۔ وہ مجھے اپنی ماں نہیں سمجھتا' یہ میری بدقسمتی ہے تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے۔ ماں باپ' بھائی بہن کی محبت' شفقت اور قابلِ اعتماد رفاقت کا مجسم روپ۔ اس پر بھی بھروسا مت کرنا جو تمہارے باپ کی کمائی تھی اور میں تمہارے لئے چھوڑ آئی تھی۔ تیسری اور آخری بات' اکیلی مت رہنا۔ زندگی کے سفر میں کوئی شریکِ سفر ضرور ہونا چاہئے۔ تنہا عورت کے لئے عمر کی مسافت اتنی ہی کٹھن اور جان لیوا ہو جاتی ہے جتنی صحرا کے سفر کی سختی اگر پانی ساتھ نہ ہو۔ مجھے تم پر بھی بھروسا ہے اور تمہارے بھائی پر بھی کہ تمہاری زندگی کا ساتھی ویسا ہی ہو گا جیسا تم چاہتی ہو۔ جیسا میں چاہتی تھی' ہر عورت چاہتی ہے۔

آخر میں وہ بات جو سب سے مشکل ہے۔ اپنی مجبور ماں کو معاف کر سکو تو تمہارا احسان۔ میں نے اپنے قبیلے کے ہی ایک شخص حاجی پیر محمد سے شادی کر لی ہے۔ ابھی میں نے کہا تھا کہ اکیلی عورت کے لئے زندگی کے راستوں پر چلنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ میرے اپنے خاندان کے لئے میں کب کی مر چکی ہوں اور میں کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتی کہ میرے حوالے کیا تھے۔ اگر باپ' بھائی یا بیٹے ہوں تو عورت خون کا قرض چکانے کے لئے گھر سے کب نکلتی ہے۔ تمہارے باپ کے خاندان نے مجھے قبول ہی نہیں کیا تھا اور ویسے بھی ان سب نے تمہارے باپ کو بھی قبیلے سے خارج کر دیا تھا۔ میری وجہ سے بھی اور اس کی اپنی حرکتوں کے باعث بھی۔ ان حالات میں حاجی پیر محمد کا سہارا لئے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اب وہ میرے ساتھ ہے تو میں خود کو بہت محفوظ خیال کرتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے باپ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے نیک کام میں میرے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ پیر محمد سے شادی کر کے میں نے کوئی اخلاقی یا شرعی گناہ نہیں کیا۔ بیوہ سے عقد سنتِ رسولؐ ہے مگر میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتی ہوں اس لئے گنہگار نہ ہونے کے باوجود وضاحت پیش کر رہی ہوں۔ تم مجھ سے نفرت کرو تو مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہو گا۔ اگر تم دل سے چاہو گی تو میں واپس آؤں گی ورنہ یہ سمجھ لینا کہ پہلے باپ مرا تھا۔ اب ماں بھی نہیں رہی۔ میری بات اور ہے۔ میں ہر حال میں تم کو اپنی بیٹی سمجھتی رہوں گی۔ تمہارے حالات سے بے خبر نہیں رہوں گی۔ سامنے آئے بغیر تمہیں دیکھتی رہوں گی اور تمہارے لئے زندگی کی ہر خوشی مانگتی رہوں گی۔ خدا میرے جیسی دکھی ماں کی دعا کو کیسے قبول نہیں کرے گا۔ وہ رحمان اور رحیم دلوں کا اور نیتوں کا حال جانتا ہے۔ بہت سی محبت بھری تمناؤں کے ساتھ... تمہاری ماں۔"

میں نے اس خط کو ایک بار پڑھا پھر دوسری بار۔ اس کے بعد میں نے وہ خط دیکھا جو میرے نام تھا۔ مجھے اس کو پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ قمر کے نام خط پڑھ کے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس عورت نے مجھے کیا لکھا ہو گا۔ میں نے اسے اٹھایا اور بغیر پڑھے پرزہ پرزہ کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

غصے اور نفرت سے میرا سارا وجود جل رہا تھا۔ سات سال پہلے یہ عورت اپنی بیٹی اور اپنا سارا مال و زر میرے حوالے کر کے غائب ہو گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا شوہر آفریدی کس قماش کا آدمی ہے اور مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ آفریدی کا پورا نام شاید سلیمان آفریدی تھا لیکن وہ اپنے نام بدلتا رہتا تھا۔ وہ میرے سامنے والے گھر میں رہتا تھا اور جب کسی خطرناک مشن پر جاتا تھا تو کبھی آدھی رات کو یا علی الصباح میرا دروازہ بجا کے کہتا تھا "خو یارا' ابھی ام جاتا اے۔ میرا بی بی اور بچی کا خیال کرنا۔ ان کا دنیا میں کوئی نئیں اے۔" اور میں کہتا تھا کہ سلیمان بھائی' آپ بالکل فکر نہ کریں۔

"فکر کا بات اے یارا۔ زمانہ بوت خراب اے۔ اکیلا عورت اور اس کا بچی۔"

میں کہتا تھا "وہ اکیلی نہیں ہیں خان۔ میں جو ہوں۔ کس کی مجال ہے جو ان کی طرف بری نظر سے بھی دیکھے۔"

مجھے کچھ اندازہ ضرور تھا کہ سلیمان آفریدی کا دھندا کیا ہے لیکن اس کی بیوی بڑی شریف اور پردہ دار عورت تھی۔ اس کی بیٹی

قمرالنسا میٹرک میں پڑھتی تھی اور بڑی دبلی پتلی کمزور سی لڑکی تھی جو ہر وقت ڈری ڈری رہتی تھی۔ وہ کوئی خاص خوب صورت بھی نہیں تھی اس وقت۔ وہ ایسے سر جھکا کے چلتی تھی کہ لگتا تھا کسی دن فٹ پاتھ کے کھمبے سے ٹکرا جائے گی۔ اس کی ناک ہمیشہ بہتی رہتی تھی۔

ایک دن سلیمان آفریدی نے مجھے آدھی رات کے وقت دروازہ بجا کے جگایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی خطرناک سفر پر روانگی سے پہلے مجھے میرا فرض یاد دلانے آیا ہوگا مگر وہ اندر آگیا۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ اس کے جبڑے تناؤ کو ظاہر کرتے تھے اور اس کی آنکھوں میں آگ تھی۔ وہ آگ نہیں جو کسان اور مزدور کے جھونپڑے میں چولہے کو روشن کرتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے "باربی کیو" میں ـــ جو دولی سینکتی ہے اور شادی میں بریانی کی دیگ کو دم دیتی ہے۔ جو یخ بستہ سرمائی راتوں میں آتش دان میں جل کے حرارت بخشتی ہے اور جہاں بجلی نہ ہو وہاں دیئے یا لالٹین میں روشنی بن جاتی ہے۔ یہ جلا کے خاکستر کر دینے والی' فنا کر دینے والی' آتش فشاں سے برسنے والی اور جہنم کے شعلوں کی آگ تھی۔

وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور مجھے گھورنے لگا۔

میں نے کہا "سلیمان خان' کیا بات ہے؟"

اس نے کہا "تم فرید خان کو جانتا اے؟"

میں نے سوچ کے کہا "وہ جو کونے والے گھر میں رہتا ہے۔ ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرتا ہے؟"

اس نے سر ہلایا "تمہارا دوست اے؟"

میں نے کہا "ہاں دوست ہے۔ پکا دوست ہے' بچپن کا..."

"خو ناصر' وہ کیسا آدمی اے؟"

میں نے پریشانی سے کہا "کیا مطلب ہے... اس نے کچھ کہا ہے تم سے؟"

"مطلب کو چھوڑو۔ ابھی بولو وہ اچھا آدمی اے یا خراب آدمی اے ہمارا طرح۔"

میں نے کہا "دیکھو سلیمان۔ اس کا باپ سب انسپکٹر ہے۔ آج کل کہیں ایس ایچ او ہے۔ انسپکٹر ہونے والا ہے۔ وہ بہت حرامی چیز ہے۔"

"باپ کو ام جانتا اے۔ بیٹا کا بات بولو۔"

میں نے کہا "شرابی کبابی' حرام خور عیاش باپ کی اولاد کیسی ہو سکتی ہے۔ پیسہ جیب میں ہو' کام کوئی نہ ہو تو ایسے لڑکے کیا کرتے ہیں جن کی تعلیم و تربیت کی فکر نہ ماں کو ہو اور نہ باپ کو۔ وہ شوقین مزاج اور آوارہ ہے۔ ٹی وی اسٹیشن پر بھی وہ کوئی فن کا مظاہرہ کرنے یا پیسہ کمانے نہیں' پیسہ لٹانے جاتا ہے۔ کچھ پروڈیوسروں پر' کچھ وہاں آنے والی لڑکیوں پر۔"

"ہوں!" اس نے کہا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

میں نے کہا "آخر کیا بات ہے خان صاحب؟"

"خو ام اُس کو قتل کردے گا" سلیمان نے بڑے سکون کے ساتھ اپنے فیصلے کا اعلان کیا "ابھی... ناصر عظیم۔ ام اس کو نئیں چھوڑے گا۔"

میرا سانس حلق میں اٹک گیا "ابھی؟... ایسی کیا بات ہو گئی اچانک؟"

"اس نے ہمارا قمرالنسا کو تنگ کیا۔ وہ کالج سے آتا' کالج جاتا۔ وہ موٹر سائیکل پر آگے پیچھے چلتا۔ اس کو بولتی ہمارا ساتھ بیٹھو۔ ہم تم کو عیش کرائے گا۔ خنزیر زادہ..."

میں نے کہا "میں اسے سمجھا دوں گا۔ تم اس کے باپ سے بات کر سکتے ہو۔"

"نئیں۔ ام قتل کرے گا اس کو" وہ دہاڑ کے بولا "آج اس نے قمرالنسا کو اٹھایا۔"

"اٹھا لیا... یعنی... اغوا کر لیا" میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"ہاں... وہ مادر بہ خطا... اس کو گاڑی میں ڈالا۔ اپنا بدمعاش ساتھی کے ساتھ اٹھایا لیکن وہ نکل گیا۔ گاڑی میں سے کود گیا۔ اس کا ہاتھ ٹوٹا... اور ماتھا پر اور کمر پر چوٹ آیا۔ ناصر' ہمارا عزت اللہ نے بچایا۔ ابھی ام اس کو قتل کرے گا..." اس نے ڈب میں سے ایک خنجر نکال کے چمکایا۔

میں نے تھوک نگل کے کہا "ہاں... ٹھیک ہے... تم جو مناسب سمجھو کرو مگر یہ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"خو تم ہمارا ساتھ جائے گا" اس نے کہا "چلو ابھی..."

"میں... میرا کیا کام ہے؟ میرا مطلب ہے..."

"تم قمرالنسا کو بہن بولتا اے... بولتا اے یا نئیں؟"

میں نے کہا "صرف کہتا نہیں... وہ میری بہن ہے۔"

"خو تم بے غیرت بھائی اے کیا؟ بولو' اگر تمہارا بہن کے ساتھ کچھ او گیا پھر...؟"

"نہیں!" میں نے کہا "اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کی عزت میری عزت ہے۔ کیا میں اپنا ریوالور لے لوں؟"

"نئیں" اس نے آبدار خنجر کی دھار پر انگلی پھیری "ام اس سے کاٹے گا۔ ٹکڑا کرے گا۔ تم اس کو گاڑے گا۔ ام کو بخار اے۔ ام زمین نئیں کھود سکتا اور اس کو تم ساتھ لائے گا' اُدھر۔ ام جگہ بتائے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے سلیمان خان۔ تم گاڑی میں ادھر جاؤ۔ میں فرید کو لے کر آتا ہوں۔"

فرید کا اور میرا ساتھ کم سے کم دس سال پرانا تھا۔ ہم میٹرک میں کلاس فیلو تھے۔ اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا پھر بھی تعلق باقی رہا۔ ہم محلے کے ساتھی ہو گئے۔ وہ مجھ پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ اس نے بارہا مجھے پریشانی اور مشکل سے بچایا تھا اور میں نے متعدد بار اس کی مدد کی تھی۔ کسی ایسے کام میں جو نہ اخلاقی اعتبار سے گناہ تھا نہ قانونی طور پر جرم۔ میں چاہتا تھا کہ وہ سنبھل جائے۔ سیدھے

راستے پر آجائے۔ اکثر وہ چڑ جاتا تھا اور مجھے گالیاں بھی دیتا تھا مگر بعد میں خود ہی مجھ سے معافی مانگنے بھی آجاتا تھا۔ "باقی سب تو تباہی کے غار میں دھکیلنے والے یار غار ہیں۔ بس ایک تو مخلص دوست ہے میرا۔ جو واقعی میرا بھلا چاہتا ہے۔"

میں نیک نیتی سے چاہتا تھا کہ فرید اپنے باپ کے نقش قدم پر نہ چلے۔ وہ اچھا آدمی بن جائے۔ اس سے پہلے کہ واپسی کے راستے بند ہو جائیں' وہ برائی کی طرف پیش قدمی روک دے۔ میرا خیال تھا کہ اس میں صلاحیت ہے۔ ہر آدمی کے اندر نیکی کرنے اور نیک بننے یا نیک کہلانے کی خواہش کبھی نہیں مرتی۔ مجھے یقین تھا کہ صرف میں ہی اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں اس کا واحد مخلص دوست تھا اور ایک پرانے تعلق کی بنا پر اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

وہ وقت جس سے میں ڈرتا تھا' آج اچانک آگیا تھا۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ایک ڈری سہمی معصوم ہرنی جیسی لڑکی کا چہرہ تھا جس کی آبرو پر ایک خونی بھیڑیے نے وحشیانہ حملہ کیا تھا۔ اسے اللہ نے محفوظ رکھا تھا مگر اس ہوسناک درندے کا خاتمہ ضروری تھا ورنہ کل وہ پھر زیادہ عیاری اور سفاکی کے ساتھ میری بہن کا راستہ روک لے گا اور اپنے ناپاک پنجوں سے اس کی پاک دامنی کا خون کر دے گا۔

سلیمان جب بھی لمبے سفر پر جاتا تھا' مجھ سے ملتا تھا تو ایک ہی بات کہتا تھا "اپنا چھوٹی بہن کا خیال کرنا۔ دنیا میں اس کا کوئی نئیں اے۔"

میں کہتا "تم جو ہو سلیمان خان۔"

"ناصر' خو الی ام جاتا اے۔ کیا پتا کب آئے گا۔ آئے گا یا نئیں آئے گا۔"

"تم ضرور آؤ گے خان صاحب۔"

"خو یارا۔ زندگی کا کس کو پتا اے؟ آدمی کا جسم میں کتنا سوراخ اے؟ لیکن ایک سوراخ اور ہوتی۔ اتنا چھوٹا سوراخ۔ اور اپنا مغز میں یا دل میں اور اس میں سے جان نکل جاتی... دا خدائے پہ امان" وہ مجھ سے مصافحہ کرتا اور چلا جاتا۔

اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا تھا کہ میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا جیسا کہ عام طور پر لوگ کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ چھوٹی بہن کو میری تحویل میں دے کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ معلوم نہیں اسے مجھ پر اتنا اعتماد کیوں تھا۔ شاید اس لئے کہ میں نے ہمسائگی کے حقوق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی اور قمرالنسا کے ساتھ میرا سلوک یا میرے ساتھ اس کا رویّہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ سچ مچ میری چھوٹی بہن ہو۔ آہستہ آہستہ اس لڑکی کے لئے میرے دل میں محبت' شفقت اور عزت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے جن سے میرا دل یکسر خالی تھا۔ اس نے بڑا کمال کیا تھا کہ پتھر میں جونک لگائی تھی۔

وہ جب اسکول میں تھی تب بھی مجھ سے پڑھنے آجاتی تھی۔ کبھی دن میں تو کبھی رات کو۔ سر کو بال پوائنٹ یا پنسل سے کھجاتی' بکھرے بالوں کو مزید بکھیرتی اور گلے میں پڑے دوپٹے کو گراتی گھسیٹتی وہ سیدھی اندر گھس آتی تھی "ناصر بھائی' یہ سوال سمجھا دو ذرا۔ سود کا سوال ہے۔"

"چل بھاگ... سود حرام ہے" میں کہتا۔

"مس مارے گی بھائی!"

"بہت اچھا ہوگا۔ مار پڑنی چاہئے تجھے۔ اتنی بڑی ہو گئی ہے اور گھروں میں ایسے گھس جاتی ہے منہ اٹھا کے۔" میں اسے ڈانٹتا۔

"کسی اور کے گھر میں نہیں صرف اپنے بھائی کے گھر میں جاتی ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے... لیکن دروازے پر گھنٹی آخر کس لئے لگائی گئی ہے۔"

"دروازہ تو کھلا ہوا تھا... اور تمہاری گھنٹی سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ ایک بار کرنٹ لگا تھا۔"

"بے وقوف... بارش ہو رہی تھی اس وقت۔ سوئچ گیلا ہو تو پانی کی وجہ سے کرنٹ لگ جاتا ہے... خیر بتا سوال کیا ہے؟"

ایک بار میں نے اس سے کہا تھا "کیا بات ہے تو برقع کیوں نہیں اوڑھتی' تیری ماں تو بہت سخت پردہ کرتی ہے۔"

"برقع تو میں ہرگز ہرگز نہیں پہنوں گی۔ ابا کو بھی بول دیا ہے میں نے۔"

"اور ابا نے کچھ نہیں کہا؟"

"ابا مجھے کچھ نہیں کہتا۔ میں سب کچھ کہہ سکتی ہوں ابا سے بھی اور تم سے بھی بھائی!" وہ بڑی خوشی اور غرور کے ساتھ کہتی۔

میں اس کی فرمائشوں سے عاجز بھی تھا اور وہ چند دن کوئی فرمائش نہ کرے تو مجھے پریشانی لاحق ہونے لگتی تھی۔ ادھر میں نے گاڑی اپنے گھر کے دروازے پر روکی' ادھر وہ کھٹاک سے کنڈی کھول کے نمودار ہو جاتی تھی۔

"ارے بھائی' گاڑی بند مت کرنا۔"

"کیوں۔ جانا ہے کہیں؟"

"نہیں... وہ مجھے ذرا دہی بھلے لادو۔ بانو بازار سے۔"

"بانو بازار سے...!" میں خفگی سے کہتا "میں ابھی تھکا ہوا ہوں۔ اب انارکلی جاؤں' چل بھاگ..."

"لادو ناصر بھائی۔ کب سے انتظار کر رہی تھی میں..." وہ منہ بسورتی اور پھر نہ جانے میرے دل کو کیا ہو جاتا کہ میں گاڑی اسٹارٹ کرکے دہی بھلے لانے کے لئے چار میل دور بانو بازار چلا جاتا۔

چاکلیٹ کی تو وہ دیوانی تھی اور یہ لت بھی اسے میں نے ہی لگائی تھی۔ میں باہر گیا تو واپسی میں اس کے لئے چاکلیٹ کے دو ٹن لے آیا۔ پہلے اسے ایک دیا کہ پتا نہیں اسے پسند آئے نہ آئے۔ ایک ہفتے میں اس نے اکیلے ہی پورا ٹن ختم کر دیا اور چھٹے یا ساتویں

وہ بولی "بھائی' وہ چاکلیٹ۔"
میں نے کہا "کیا ہوا چاکلیٹ کو۔"
"بہت اچھے تھے' بڑے مزے دار تھے' سب کھا لئے میں نے۔"
میں نے اسے دوسرا ٹن دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی مگر پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ وہ ہر ہفتے آجاتی۔ "ناصر بھائی!... وہ چاکلیٹ۔"
"ابھی تو نہیں ہیں۔ باہر سے لایا تھا میں۔"
"باہر کب جاؤ گے آپ!"
"کچھ پتا نہیں مگر تو جا' میں ایک ضروری کام میں مصروف ہوں۔ تجھے چاکلیٹ مل جائیں گے" میں نے کہا اور مجھے اچھے خاصے مہنگے چاکلیٹ اس کو خرید کر دینے پڑے۔ مسئلہ پیسے کا نہیں تھا۔ یاد رکھنے کا تھا۔ انتہائی اہم کاموں میں دن و رات سر کھپانے والا ایک بے وقوف لڑکی کو دینے کے لئے چاکلیٹ کہاں تلاش کرتا پھرے لیکن نہ جانے کیسے مجھے یہ بات یاد رہتی تھی۔
ایک بار میں نے گرمی کھا کے کہا "کیا ہر وقت چاکلیٹ چرتی رہتی ہے۔ دانت خراب ہو کے گر جائیں گے۔ جوانی میں بڑھیا لگے گی۔"
اس نے بتیسی کی نمائش کرنے کے لئے انگلی سے کلّوں کو چیرا۔ "آپ دیکھو بھائی' سارے دانت ٹھیک ہیں۔"
"چاکلیٹ کھانے سے لڑکیاں موٹی ہو جاتی ہیں۔ بھینس بن جاتی ہیں۔" میں نے اسے دوسری دلیل دی۔
"جھوٹ۔ ابھی تک میرا وزن ایک چھٹانک نہیں بڑھا۔ وہی پرانے کپڑے مجھے بالکل فٹ ہیں۔ آپ دیکھ لو" اس نے دوپٹہ لہرا کے اپنا سراپا معائنے کے لئے سامنے کر دیا۔
"اچھا بابا۔ دیکھ لیا' تو جا۔ کل کہیں سے لا دوں گا چاکلیٹ۔"
"ناصر بھائی!" وہ جاتے جاتے رک جاتی۔
"اب کیا ہوا؟"
"یہ جو کیڈبری کے چاکلیٹ ہیں' ان کا بڑا ڈبا نہیں ملتا' اتنا بڑا؟" اس نے زمین سے اپنی کمر کے برابر جسامت بتائی۔
"پاگل ہو گئی ہے لڑکی...."
"میں تو آپ کی تکلیف کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ مہینے بھر کے لئے لادیتے ایک ہی بار" اس نے منہ پھلا کے کہا۔
وہ کالج میں اور پھر انٹر میں پہنچ گئی۔ میرے ساتھ اس کا وہی رویّہ رہا بلکہ اس کی فرمائشوں کی نوعیت بدل گئی۔ اس لاڈلی بہن کی طرح جسے مان ہو کہ بھائی اس کی خوشی کے لئے آسمان سے چاند بھی زمین پر لا سکتا ہے اور نہیں لائے گا تو روٹھنے سے کام چل جائے گا۔ آخری مرحلہ رونے کا ہو گا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی بھائی کہے گا کہ اچھا بابا' ابھی جاتا ہوں' ناسا والوں سے پوچھتا ہوں کہ چاند کے لئے اگلی پرواز کب ملے گی اور کیا خلائی شٹل پر چاند کو توڑ کر کے لایا جا سکتا ہے۔

قمر النسا کی ماں میرے سامنے نہیں آتی تھی۔ ایک دو بار اتفاق سے قمر النسا نے دروازہ کھولا تو میں نے اسے بھی دیکھ لیا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنی بیٹی جیسی حسین تھی مگر قمر النسا ابھی کچی کلی تھی تو وہ بہار کے آخری دور میں پورا کھلا ہوا پھول۔ ایک بار میں نے اسے ایمبولینس میں جاتے بھی دیکھا تھا۔ سلیمان خان نے بعد میں بڑے دکھی دل سے بتایا "لڑکا تھا۔ ضائع ہو گیا۔ اللہ کا مرضی۔ ڈاکٹر بولتا اب کچھ نہیں ہو گا۔"
سلیمان خان نے کبھی قمر النسا کی مجھ سے بے تکلفی کا بُرا نہیں مانا تھا حالانکہ وہ پٹھان تھا اور جاہل بھی تھا مگر اس نے دنیا دیکھی تھی اور اسے انسانوں کی پرکھ تھی۔ وہ کبھی کہتا تھا۔ "یہ قمر النسا تم کو بہت تنگ کرتی اے" تو میں ہنس کے ٹال دیتا تھا کہ "سلیمان خان۔ ایک ہی چھوٹی بہن ہے میری اور اس کا بھی ایک ہی بڑا بھائی ہے۔ مجھے تنگ نہیں کرے گی تو پھر کسے کرے گی۔ کچھ دن کی بات ہے پھر یہ بھی ہو جائے گی اپنے گھر کی تو سب بھول جائے گی۔"
اس وقت یہ سب مجھے یاد نہیں آیا۔ مجھے تو یوں لگا جیسے قمر النسا رو رہی ہے۔ "بھائی' میری مدد کریں بھائی۔ بتائیں میں کیا کروں۔ میں لوٹ کے گھر کبھی نہ آتی اگر تمہارا وہ کمینہ دوست مجھے اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں جان دے دیتی کسی گاڑی کے نیچے آکے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے مرنے سے بھائی۔ قبر میں کتنا اندھیرا ہوتا ہو گا... اور ہر طرف چیونٹیاں اور کیڑے... اور ہلنے جلنے کی ذرا بھی جگہ نہیں لیکن آپ تو جانتے ہیں نا اس لفنگے کو.... وہ آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ وہ میری جان لے کر ہی رہے گا بھائی۔ مرنا پڑے گا مجھے۔"
میں نے دل ہی دل میں کہا "نہیں لڑکی۔ مریں تیرے دشمن۔ ارے کیا سمجھ رکھا ہے تو نے اپنے بھائی کو۔ چل بند کر رونا دھونا اور سو جا آرام سے۔"
پھر میں نے فون اٹھایا اور فرید کا نمبر ملایا۔ حسب توقع وہ جاگ رہا تھا۔ "کیا ہو رہا ہے شیر شاہ سوری کی اولاد۔"
وہ ہنسا "ناصر میرے باپ کا نام شیر علی ہے۔"
"شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خان تھا۔ تاریخ پڑھی ہوتی تو پتا ہوتا۔ خیر کیا ایک کام کر سکتا ہے تو میرا۔ بہت ضروری کام ہے۔"
"کام؟ اس وقت.... اچھا بول!"
میں نے کہا "مجھے پانچ ہزار کی ضرورت ہے۔ دو چار دن کے لئے۔"
"یار تو نے مجھے ڈرا دیا تھا' یہ بھی کوئی کام ہے؟"
میں نے کہا "وہ یار' ایک کھیپ پکڑی گئی ہے ولایتی شراب کی۔"
"ولایتی شراب؟ کون سی؟" اس کے لہجے میں لالچ تھا۔
"بلیک ڈاگ۔ ایک کریٹ کا سودا ہے۔ ادائیگی ابھی نقد کرنی

ہے۔ صبح تک جتنی نکل گئی ٹھیک ہے' باقی ظاہر کر دی جائے گی۔"
"یار تو کیا کرے گا بلیک ڈاگ کا' لسی پینے والے ملّا ناصر عظیم!"
میں نے کہا "پانچ کے دس بنا لوں گا اور کیا؟"
"یار' تو مجھے دے دے" وہ لجاجت پر اتر آیا "آج کل سالی بلیک میں بھی نہیں مل رہی ہے۔ دس لے لے ابھی۔"
"ابے چھوڑ۔ میں تجھ سے منافع لوں گا۔ چل یہ میری طرف سے گفٹ۔"
"میں ابھی آیا۔ تُو ہے کہاں؟"
میں نے اسے پتا سمجھا دیا۔ "گاڑی کو موڑ پر چھوڑ دینا اور دیکھ' کسی کو پتا نہ چلے تیرے آنے کا۔ تیرا نام نہاد ابا کدھر ہے؟"
"تھانے میں.... لیکن کسی کو پتا نہ چلے' یہ ذرا مشکل ہے۔ گاڑی کی آواز پر ہی ماں کے کان کھڑے ہو جائیں گے پھر وہ خود کھڑی ہو جائے گی اور باہر نکل آئے گی۔ کیوں نہ میں ٹیکسی میں آجاؤں؟"
میں نے کہا "تو بحری جہاز میں آجا' مجھے کیا؟"
"اچھا ہوا تو نے فون کر لیا۔ ایک اور بات بھی کرنی تھی مجھے۔"
میں نے کہا "کس بارے میں؟"
"ابے یار' وہ پٹھان نہیں ہے' سلیمان خان' اس کی لونڈیا ہے بڑی پٹاخا۔ سالی جال میں آکے نکل گئی۔"
"تجھے ڈر ہے کہ تھانے دار صاحب سے شکایت کر دے گا اس کا باپ؟"
"ابے شکایت کرے تو میرا باپ اسے تھانے میں مرغا بنا کے رات بھر میں انڈا دینے پر مجبور کر دے۔ دراصل مجھے ڈر لگتا ہے اس بلڈاگ جیسے منہ والے سلیمان خان سے۔"
میں نے کہا "اچھا تو آجا۔ فکر مت کر۔ یہ مسئلہ بھی حل کرتے ہیں۔"
"میں کھڑکی سے نکل کے اور دیوار پھاند کے آتا ہوں" وہ بولا۔ "مین روڈ پر ٹیکسی مل ہی جائے گی۔ دیر ہو جائے شاید...."
"مگر دیکھ۔ ٹیکسی کو چوک پر ہی چھوڑ دینا۔ اسے کہنا واپس جائے۔ وہاں سے پانچ منٹ کا فاصلہ ہے۔"
"اور واپسی پر....؟"
"او بے وقوف۔ میری گاڑی ہو گی نا" میں نے ریسیور رکھ دیا۔
پھر میں اپنی گاڑی لے کر نکلا۔ میں نے ہیڈ لائٹس آف رکھیں اور گاڑی کو واپس لے گیا تاکہ مجھے فرید خان کے گھر کے سامنے سے نہ گزرنا پڑے۔ تقریباً سو گز کے بعد میں نے گاڑی کا رخ پلٹا اور گھوم کے مین روڈ پر آگیا۔
سلیمان خان میرا انتظار کر رہا تھا مگر اس کی حالت خراب تھی۔ اس کو بہت تیز بخار تھا۔ وہ کمبل اوڑھے کھڑا تھا اور پھر بھی کانپ رہا تھا۔
"تمارا گاڑی کدر اے؟" وہ بولا۔
میں نے کہا "کچھ دور چھوڑ دی ہے میں نے۔ تم کیسے آئے تھے؟"
"پیدل..." اس نے کہا "یہ کیا ہے تمارے پاس؟"
"واپسی پر میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔" میں نے کہا "تمہارا جسم بخار سے جل رہا ہے۔ یہ کپڑے لایا ہوں میں۔"
"خوبیار۔ یہ اندر کا آگ اے' اندر کا۔ وہ تمارا دوست کدر اے؟"
"اب میرا دشمن کہو اسے۔ وہ آرہا ہے مرنے کے لئے۔ موت خود آدمی کو وہاں لاتی ہے جہاں اس کو مرنا ہو۔"
فرید خان چوروں کی طرح نمودار ہوا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا آرہا تھا کہ میں اچانک اس کے سامنے آگیا "یار تو نے پھر ڈرا دیا مجھے۔ تیری گاڑی کہاں ہے' مجھے نظر نہیں آئی۔ یہ لے پانچ ہزار۔"
"ابھی رکھ اپنے پاس" میں نے کہا "میرے ساتھ آجا۔ کریٹ اٹھالے اندر سے۔ بندہ پیسے کے انتظار میں سوکھ رہا ہے۔"
وہ میرے ساتھ احاطے کے اندر چلا گیا۔ اسے مجھ پر شک کیسے ہو سکتا تھا۔ دیوار کے پیچھے سلیمان خان خنجر تھامے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ فرید خان کو حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا۔ خنجر اس کے سینے میں اتر گیا اور میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے اس کی چیخ کو دبا لیا۔ وہ میری گرفت میں بہت تڑپا لیکن سلیمان خان کا خنجر اس کے دل میں اتر چکا تھا۔ میں نے جھٹکا دے کر اس کی گردن توڑ دی اور اسے نیچے ڈال دیا۔ سلیمان خان اس پر خنجر سے پے در پے وار کر رہا تھا۔ اس پر دیوانگی طاری تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے قابو کیا "بس۔ بس' سلیمان خان۔ دشمن مر گیا۔"
سلیمان خان نے خود کو چھڑا لیا۔ اس نے نیچے جھک کے فرید خان کا سر بال پکڑ کے تھاما اور اس کی گردن پر خنجر چلا دیا۔ فرید خان کا خوب صورت ہیئر اسٹائل والا سر اس کے بے جان جسم سے الگ ہو گیا۔ سلیمان خان نے اس پر تھوکا اور اسے دور پھینک دیا۔
میں نے کہا "بس اب تم جاؤ۔ دیکھو تمہارے کپڑے خون سے بھر گئے ہیں اور تمہارے ہاتھ بھی" میں نے کہا "اُدھر ایک ہینڈ پمپ ہے۔ ہاتھ منہ دھو کے کپڑے بدل لو' یہ کپڑے مجھے لا دو۔"
اس نے سر ہلایا "ام کدال لایا تھا۔"
"کہاں ہے کدال؟" میں نے کہا۔
"اُدر' دیوار کا پاس" وہ کانپتے ہوئے بولا۔
"اچھا تم جاؤ۔ اس بنڈل میں ایک جوڑا میرا ہے' ایک تمہارا۔"
یہ پرانے قبرستان کا آخری گوشہ تھا۔ میں نے ایک پرانی دھنسی ہوئی قبر کا انتخاب کیا اور خون میں بھرے ہوئے ہاتھ مٹی سے صاف کر کے قبر کھودنے لگا۔ یہ مشکل کام تھا۔ قبر میں کانٹے

تھے اور کیڑے مکوڑے۔ جب میں نے مٹی ہٹائی تو ایک گرگٹ اور پھر ایک گوہ نکل کے بھاگے۔

ساری مٹی نکالنے تک میں پسینے پسینے ہوگیا۔ اب میرے پیروں کے نیچے سیمنٹ کے سلیب تھے۔ نہ جانے کب اس مردے کو قبر میں لٹانے کے بعد یہ سلیب اوپر رکھے گئے ہوں گے۔ میں نے ان کو بڑی مشکل سے اٹھایا پھر فرید خان کو وہاں تک گھسیٹ کے لایا اور پرانے مردے کے ڈھانچے پر لٹادیا۔ فرید خان کے وزن سے اس کی ہڈیاں کڑکڑائیں۔

سلیب رکھ کے میں نے قبر کی مٹی دوبارہ اوپر ڈال دی اور ادھر ادھر سے مزید مٹی ڈال کے اوپر کانٹے اور خشک جھاڑیاں پھیلا دیں۔ کدال کو میں نے سلیمان خان کی طرف بڑھادیا اور اس سے خون آلود کپڑے لے لئے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ انہیں بھی فرید خان کے ساتھ ہی دفن کردوں گا مگر پھر یہ بات مجھے خلافِ عقل لگی۔ آج کل پولیس کے کتوں کی ناک بھی بہت تیز ہوگئی ہے۔ میں نے سلیمان خان سے کہا کہ وہ میری گاڑی میں جاکے بیٹھے اور انتظار کرے پھر سخت سردی کے باوجود میں نے سارے کپڑے اتار دیے اور ایک ہاتھ سے ہینڈ پمپ چلاکے نہایا۔ تولیے سے جسم خشک کرکے میں نے صاف کپڑے پہنے اور خون آلود جوڑے کو پلاسٹک بیگ میں ڈال دیا۔ اس میں سلیمان خان کا جوڑا پہلے سے موجود تھا۔

سلیمان خان گاڑی میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کا بدن بخار کی شدت میں تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ میں نے اس پر گیلا تولیہ ڈالا۔ اس کے جوتے اتارے اور پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔ کدال اور خون آلود کپڑوں کا بنڈل میں نے ڈکی میں ڈال دیا تھا۔

اسپتال میں سلیمان خان کو اتارنے سے پہلے میں نے تولیے سے اپنے جوتے بھی رگڑ کے صاف کئے۔ میں نے سلیمان خان کو پرائیویٹ روم میں داخل کرادیا اور ڈاکٹروں نے اسے سنبھال لیا۔ فرید خان جو پانچ ہزار دے گیا تھا وہ میں نے کاؤنٹر پر ایڈوانس جمع کرادیے۔

مجھے واپس گھر لوٹتے ہوئے صبح ہونے والی تھی۔ میں نے گاڑی کے ٹینک میں سے پٹرول پہلے ہی نکال کے ایک ڈبا بھرلیا تھا۔ جب میں کوئی کام کرتا ہوں تو پوری پلاننگ کے ساتھ کرتا ہوں۔ راستے میں مجھے ایک جھونپڑی ہوٹل نظر آیا جس کا مالک پلنگ پر لمبی تان کے سو رہا تھا۔ تنور اس سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے پٹرول سے خون میں بھرے ہوئے کپڑوں کو اچھی طرح تر کیا اور تیلی دکھاکے تنور میں پھینک دیا۔

روشنی پر تنور کا مالک ہڑبڑا کے اٹھا مگر اس وقت تک میں کار میں بیٹھ کے فرار ہورہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ میرے پیچھے دوڑا۔ اندھیرے میں وہ کار کی نمبر پلیٹ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ میں نے ٹیل لائٹس آف رکھی تھیں۔

جب میں اپنے دروازے پر پہنچا تو قمر ایک دم باہر نکل آئی۔ "بھائی، تم کہاں چلے گئے تھے؟" اس کا ایک بازو پلاسٹر میں تھا اور گلے سے لٹک رہا تھا۔

میں نے کہا "تم کیوں جاگ رہی ہے اس وقت؟"

"ابا رات کو نکلا تھا۔ ابھی تک آیا نہیں، اسے بخار تھا۔"

میں نے کہا "پاگل۔ وہ میرے پاس آیا تھا۔ میں اسے اسپتال لے گیا تھا۔ داخل کرادیا ہے۔"

"اسپتال میں داخل کرایا ہے ان کو، کیوں؟"

"علاج کے لئے اور کس لئے؟" میں نے ہنس کے کہا "چل جا آرام سے سوجا۔ وہ اب ٹھیک ہیں۔ اماں کو بھی بتادینا۔"

"تمہارا مہربانی بیٹا!" دروازے کے پیچھے سے قمر کی ماں نے کہا۔

"بیٹا" میں نے تڑپ کے کہا "میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں۔ خبردار جو پھر کبھی مجھے اپنا بیٹا کہا۔ میں کسی کا بیٹا نہیں ہوں۔"

میرا خیال ہے کہ دروازے کے پیچھے وہ حیران اور شرمندہ ہوئی ہوگی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ قمر میرا کھانا لاتی تھی تو یہ پوچھتی تھی۔ "اماں نے کہا ہے کہ کل سے تم کھانا کم کھارہے ہو۔ کیا کھانا خراب ہے؟" اور میں ہنس کے جواب دیتا تھا "نہیں، میرا دماغ خراب ہے" یا کہہ دیتا تھا... "میں بہت موٹا ہورہا ہوں۔ کھانا کم کردیا ہے" کبھی وہ پیغام بھی لے آتی تھی۔ "ماں کی طبیعت خراب ہے لیڈی ڈاکٹر کو بلادو۔"

"کون لیڈی ڈاکٹر؟"

وہ مجھے ایک پرچی تھمادیتی۔ کوئی پرانا نسخہ جس پر لیڈی ڈاکٹر کا نام اور فون نمبر ہوتا تھا۔ "میں فون کردیتا ہوں۔ مگر تمہارے گھر میں فون کیوں نہیں ہے؟"

"ناصر بھائی، یہ ابا سے پوچھنا۔" وہ کہتی "اور ہاں۔ اماں پوچھ رہی تھی کہ اتنے دن تم کہاں غائب رہتے ہو۔ تمہیں بہت لوگ پوچھنے آتے ہیں۔"

"آنے دو۔"

"فون کی گھنٹی بھی بجتی رہتی ہے۔"

"فون کی گھنٹی کا اور کام کیا ہے۔ ویسے اب میں چوکیدار کو رکھ لوں گا۔ تو بھی ایسے اندر نہیں آسکے گی گواچی گاں کی طرح۔"

"گواچی گاں؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

میں ہنس پڑتا "ہوتا ہے نہیں بے وقوف۔ ہوتی ہے، لاوارث پھرنے والی گائے۔"

"میں لاوارث گائے ہوں؟ کبھی تو اللہ میاں کی گائے کہتے ہو بھائی، کبھی پاگل اور بے وقوف۔"

"اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے؟"

"بھائی میں فرسٹ آئی ہوں کلاس میں۔"

"کلاس میں ہوں گی تین لڑکیاں۔ ایک نے امتحان نہیں دیا، ایک فیل ہوگئی۔ تو فرسٹ آگئی۔"

"جی نہیں۔ ایک سو بیس لڑکیاں تھیں فرسٹ ایئر میں۔ سب سے زیادہ میرے نمبر ہیں۔"

"فرسٹ ایئر کچھ نہیں ہوتا۔ ایف ایس سی میں اے ون گریڈ آنا چاہئے۔ کم سے کم اے گریڈ۔ اس کے بعد ہی میڈیکل کالج میں داخلہ ہوگا۔"

"بھائی پھر تو میں ڈاکٹر بن جاؤں گی نا؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں۔ بڑا برا زمانہ آگیا ہے اور آنے والا ہے۔"

"اچھا فرسٹ آنے پر میرا انعام۔ چاکلیٹ آئس کریم کیک۔"

"قمر ابھی چار دن پہلے سالگرہ پر جو ٹھونسا تھا۔"

"چار دن کہاں بھائی۔ وہ تو بہت دن ہوگئے۔ چھ... نہیں پانچ دن۔"

اس وقت وہ ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو جھولے جیسی پٹی میں لٹکائے حیران کھڑی تھی۔ میرا یہ لہجہ اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اس کی ماں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی، جس پر میں اتنے شدید ردِعمل کا اظہار کرتا، میں نے گاڑی بند کرکے اسے بلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بھائی، ابا نے کچھ بتایا آپ کو؟" اس نے کہا۔

"ہاں... اس نے بتایا کہ تو گر گئی تھی سیڑھیوں سے۔ صرف ایک ہاتھ ہی ٹوٹا تیرا؟"

اس نے حیران سوالیہ نظریں اٹھائیں "نہیں بھائی...!"

"کیا نہیں بھائی۔ نظر آرہا ہے ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا۔ کیا پتا یہ بھی تیرا ڈراما ہو" میں نے کہا۔

"ناصر بھائی، ابا نے یہ نہیں بتایا ہوگا۔ میں سیڑھیوں سے نہیں گری تھی۔"

"بکواس بند کر۔ ابا نے یہی بتایا تھا۔ میں ... بھی یہی کہہ رہا ہوں اور یہی سچ ہے" میں برہمی سے بولا "خبردار جو اور کچھ کہا۔"

وہ سہم گئی "اچھا بھائی!"

"اور دیکھ۔ کل سے تو گاڑی میں جائے گی کالج۔ ڈرائیور لے کر جائے گا اور واپس لائے گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"لیکن بھائی، کل کالج کیسے جاسکتی ہوں میں" اس نے پلاسٹر میں بندھے ہوئے ہاتھ کو ہلا کے کہا۔

"میرا مطلب تھا... جب تیرا یہ ہاتھ ٹھیک ہوجائے۔ میں نے تیرے ابا سے بھی کہہ دیا ہے" میں نے کافی بنانے کے لئے الیکٹرک کیتلی کا پلگ لگاتے ہوئے کہا۔

"ناصر بھائی، اس وقت کافی پیو گے؟"

"اور کیا پیوں؟ فیڈر سے دودھ پینے کے دن گزر گئے۔"

"میں بنادیتی ہوں..." اس نے پھر ٹوٹا ہوا بازو دکھایا۔

"چل بھاگ یہاں سے اور سوجا" میں نے کہا "اور ہاں، اماں سے معافی مانگ لینا میری طرف سے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔ دماغ خراب ہے میرا۔"

"اماں کو معلوم ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے۔"

میں نے اسے غصے سے دیکھا "آج خراب ہورہا ہے۔ بہت غصے میں ہوں میں۔"

"نہیں بھائی، پہلے سے خراب ہے۔" اس نے اصرار کیا۔ "ورنہ تم ایسے نہ رہتے۔"

"کیسے نہ رہتا؟" میں نے کہا "کیسے رہتا ہوں میں؟"

"گواچی گاں... نہیں۔ گواچے بیل کی طرح۔ دنیا میں اکیلے بھٹکتے پھرتے ہو۔ پتا نہیں کہاں رہتے ہو کیا کرتے ہو۔ ناصر عظیم صاحب۔"

میں نے کہا "زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں۔"

وہ اسی طرح بولتی رہی "کھانے پینے کا، سونے جاگنے کا کوئی وقت نہیں۔ کافی بھی خود بنانی پڑتی ہے۔ بھائی، آخر تم شادی کیوں نہیں کرلیتے؟"

میں ہنس پڑا "مجھے باؤلے کتے نے نہیں کاٹا۔"

"سچ بھائی، بڑا مزہ آئے گا، میں نے لڑکیاں بھی دیکھی ہیں کچھ۔ کہو تو تمہیں بھی دکھاؤں؟ ایک سے بڑھ کر ایک۔ سب چاند کا ٹکڑا ہیں۔"

میں نے کافی بناتے ہوئے کہا "ایک چاند کے آخر کتنے ٹکڑے ہیں؟ اور وہ ٹکڑا جو نیل آرم اسٹرانگ خود چاند پر سے اٹھا کے لایا تھا، وہ تو بالکل فضول اور بدصورت تھا۔ اگر ویسے ہی ٹکڑے ہیں تو مجھے معاف کرو بس۔"

وہ جاتے جاتے پھر صوفے کے بازو پر ٹک گئی "ایمان سے بھائی۔ آپ کے لئے کوئی ایسی ویسی لڑکی دیکھوں گی میں... لاکھوں میں ایک ہوگی۔"

میں نے کہا "قمر، تجھے پتا ہے، یہ لاڈلی بہنیں اپنے پیارے بھائیوں کے ساتھ کیا کرتی ہیں؟"

"کیا کرتی ہیں؟"

میں نے کہا "وہ ایسے ہی بھائیوں کو باتوں میں لگا کے الّو بناتی ہیں اور انہیں شادی پر آمادہ بھی کرلیتی ہیں پھر لاکھوں میں ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی بھی تلاش کرلیتی ہیں۔ ایسی کہ چراغ، سوری ٹارچ اور سرچ لائٹ لے کر ڈھونڈو پھر بھی نہ ملے۔ زمین و آسمان ایک کردیتی ہیں اس کی تعریف میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس جیسی بھابی تھی نہ ہوگی۔ اسپیشل ماڈل میڈ ٹو آرڈر۔ زیرو ڈیفیکٹ مگر بعد میں کیا ہوتا ہے۔"

"بھائی اپنی بہنوں کو انعام دیتے ہیں، جب لوگ کہتے ہیں کہ بھئی کیا چاند سورج کی جوڑی ہے۔"

"غلط۔ اس کے بعد بہن بن جاتی ہے نند اور اس زیرو

ڈیفیکٹ! اسپیشل ماڈل میڈ تو آرڈر بھائی میں خامیاں دیکھنے لگتی ہے اور ایک وقت آتا ہے جب وہ اعلانیہ کہتی ہیں کہ خوبی تو اس میں کوئی بھی نہیں اور یہ لاکھوں میں ایک ضرور ہے مگر وہ جو سب سے بری تھی پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ ساس بہو کا راؤنڈ نہ سہی نند بھاوج کا قیامت خیز مقابلہ....."

"ناصر بھائی! کیا میں ایسی ہوں" وہ برا مان گئی۔

میں نے ہنس کے کہا "چل بھاگ۔ ساری یہی پوچھتی ہیں پہلے کہ کیا میں ایسی ہوں۔ بعد میں سب ایسی نہیں ویسی ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی کی تیسی کرنے والی۔"

"بھائی! میں جب شادی کی بات کرتی ہوں....."

"نہیں کرنی مجھے کسی لڑکی سے شادی" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"اچھا تو پھر اس سے کرلو۔ وہ جو آتا ہے کہ آتی ہے۔ بدھائی دینے" اس نے پانچوں انگلیاں پھیلا کے ہتھیلی سے تالی بجانے کا تاثر دیا اور واک آؤٹ کر گئی۔

میں نے پیچھے سے کہا "اگر تجھے پسند ہے تو بات کرلینا بس۔" اور قہقہہ مار کے بستر پر لیٹ گیا۔ اب صبح ہو گئی تھی اور مجھے سب انسپکٹر شیر علی کے فون کا انتظار تھا۔

اس کا فون ساڑھے آٹھ بجے آیا تو میں کچھ غنودگی میں چلا گیا تھا مگر گھنٹی سن کے میں نے ریسیور اٹھالیا۔

حسب توقع اس نے پوچھا "بھئی یہ فرید کا کچھ پتا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے تو پرسوں ہی ملا تھا۔ کیوں، خیریت ہے؟"

"ہاں۔ ابھی تک تو ہے۔ رات اچھا بھلا کمرے میں سویا تھا۔ پتا نہیں کھڑکی کے راستے کہاں نکل گیا۔ اس کی گاڑی بھی باہر پورچ میں کھڑی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "کہاں جائے گا، آجائے گا۔"

"اچھا ناصر، میں اور لوگوں سے بھی پوچھ لوں..... تمہیں پتا چلے تو بتانا۔"

"جی۔ ضرور بتادوں گا، آپ فکر مت کریں" میں نے کہا۔

"فکر مجھے نہیں، اس کی ماں کو ہے۔ اس کی حرکتوں کی وجہ سے" وہ بولا اور فون بند کردیا۔

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ آج بیٹے کی حرکتوں کو روتا ہے۔ آخر کس کا بیٹا تھا وہ۔ اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کے اس نے خود کو حلالی تو ثابت کردیا کم سے کم۔ اب سر پکڑ کے رونے سے کیا ملے گا۔ جب ببول اور کیکر بوئے تھے تو سیب یا آم کیسے کھاؤ گے۔

اگلے ایک ہفتے میں انسپکٹر شیر علی نے اپنے لاپتا ہو جانے والے بیٹے کے لئے سب کچھ کرکے دیکھ لیا۔ پولیس نے شہر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ اس کے دوستوں سے اور ان کے گھر والوں سے پوچھا۔ دشمنوں سے باقاعدہ "تفتیش" کی گئی۔ دشمنوں میں بہت سی لڑکیوں کے باپ اور بھائی بھی تھے۔ اگر میں نے عقل سے کام لیتے ہوئے سلیمان خان کا اسپتال میں داخلہ ایک دن پہلے دکھانے کا بندوبست نہ کیا ہوتا تو شک کا پہلا شکار وہی ہوتا۔ اس کے ساتھ ہونے والی واردات بالکل نئی تھی جس کی خبر شیر علی کو فرید کے شریک جرم دوستوں سے ملی تھی۔ سلیمان خان کو ٹائیفائیڈ ہوا تھا اور خود شیر علی نے عیادت کے بہانے تصدیق کی۔ اس نے فرید خان کی تصویر کے ساتھ ہر اخبار میں اشتہار دیا۔ پوسٹر چھپوائے اور صرف شہر میں ہی نہیں شہر سے باہر جانے والی بسوں اور ٹرینوں میں بھی لگوادیے۔ مگر فرید خان نہیں ملا۔ یوم حشر سے پہلے اس کے ملنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ یہ میں جانتا تھا۔

سلیمان خان میرا بہت شکر گزار بلکہ احسان مند تھا۔ ہمارے درمیان ہمسائیگی کے سوا کوئی رشتہ تھا تو قمرالنسا کا جو اب باقاعدگی سے میری گاڑی میں کالج جاتی تھی۔ باوردی ڈرائیور ہمیشہ مسلح ہوتا تھا اور میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی بری نیت سے راستہ روکے تو وہ بے دریغ اسے شوٹ کردے۔ بعد کی ذمے داری میری۔

مجھے معلوم تھا کہ کچھ لوگ میرے اور قمرالنسا کے تعلق کو اپنی شیطان کی آنکھ سے دیکھتے تھے اور ایسی باتیں بھی کرتے تھے جو ہمارے لئے گالی سے کم نہ تھیں مگر ایسے لوگوں کو نہ میں نے زندگی میں کبھی اہمیت دی تھی اور نہ ان باتوں کو۔

ایک سال بعد سلیمان خان آفریدی مارا گیا تھا۔ وہ گھر اور محلے میں یا میرے سامنے جتنا شریف اور نیک نظر آتا تھا باہر اتنا ہی خبیث اور بدکردار تھا۔ اس کا انجام ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ شاید اس کی بیوی بھی یہ بات جانتی تھی کہ اس کا شوہر کس راستے پر چل رہا ہے مگر وہ اسے روک نہیں سکتی تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا، وہ برا آدمی نہیں تھا مگر اس نے ایک بار برائی کی دلدل میں قدم رکھ دیا تو پھر اس میں دھنستا چلا گیا۔ اسے دلدل میں اتارنے والے بھی وہی تھے جنہوں نے اسے قبر میں اتارا۔

میرا خیال تھا کہ زندگی اپنے معمول پر آچکی ہے۔ قمرالنسا اپنے باپ کو رو دھو کے خاموش ہو گئی تھی اور پوری تندہی سے ایف ایس سی سیکنڈ ایئر کی تیاری میں مصروف تھی۔ اس حادثے کے بعد ماں نے اس کو کالج جانے سے روک دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سلیمان آفریدی کے دشمن کہیں اس کی بیٹی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ قمرالنسا نے میرے سامنے آکے رونا شروع کیا..."بھائی! میں ڈاکٹر بنوں گی۔"

میں نے کہا "جاؤ بنو بابا۔ آخر قبرستان بھی تو بھرنے ہیں شہر کے۔"

وہ کہنے لگی "اماں منع کرتی ہے بھائی۔"

"ویسے تو اس کا منع کرنا خلق خدا کے مفاد میں ہے۔ کوئی اور وجہ ہے تو بتاؤ۔"

"وہ کہتی ہے کوئی مجھے بھی ماردے گا، کوئی دشمن۔"

"تجھے ماردے گا؟ قمرالنسا کو۔ میری پیاری سی بہن کو۔" میں طیش میں آگیا "اپنی اماں کو بتادینا کہ ایسا سورما ابھی اس شہر میں پیدا نہیں ہوا۔ کسی کے دل میں خیال بھی آیا نا تجھے مارنے کا، تو اسے میں پہلے ماردوں گا۔ کیا سمجھتی ہے آخر تو اپنے بھائی کو۔ ناصر عظیم ہے میرا نام۔"

اب ڈرائیور میرے حکم پر کلاشنکوف رکھنے لگا تھا قمرالنسا نے پھر کالج جانا شروع کردیا مگر نتیجہ آیا تو اس کے نمبر بہت کم تھے۔ فرسٹ ایئر میں سب سے زیادہ نمبر لینے والی سیکنڈ ایئر میں اے گریڈ بھی نہ لے سکی۔ غالباً اس کے ذہنی انتشار کے باعث ایسا ہوا۔ اس کا دل تعلیم سے اچاٹ ہوگیا کیونکہ اس کا ڈاکٹر بننے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔

میں نے اسے بہت ڈانٹا "سب بے وقوف لڑکیاں بس ایک ہی خواب دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر بن جائیں، جھک مار رہے ہیں بے روزگار ڈاکٹر اور تم خاک ڈاکٹر بنو گی۔ کاکروچ اور چھپکلی کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے والی لڑکی مُردوں کی چیر پھاڑ کر سکتی ہے بھلا۔"

"بھائی میں سب کچھ کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا "او کے، پھر پروفیسر بن کے دکھاؤ۔ ایم اے، ڈبل ایم اے، پی ایچ ڈی کرو۔ وقت ہی ضائع کرنا ہے نا۔ عقل تو وہی رہے گی جو نہ ہونے کے برابر ہے، ڈگری سے کیا ہوگا۔"

"نہ میں بے کار ڈگریاں جمع کروں گی اور نہ بے کار بیٹھوں گی۔"

"اچھا تو پھر کوئی کورس کرلو۔ ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟"

وہ سوچ میں پڑگئی "خیال تو اچھا ہے بھائی۔ اس کے ساتھ ہی اگر فیشن ڈیزائننگ بھی ہو۔"

"ہو تو کیا ہوگا؟"

"بھائی میں بوتیک کھول لوں گی۔ کیسا آئیڈیا ہے؟"

"ایک چاکلیٹ ٹن کے برابر" میں نے کہا۔

ابھی اس کے کورس شروع ہوئے ہی تھے کہ ایک نئی مصیبت آگئی۔ اس کی ماں عدت کا زمانہ اپنے گھر میں خاموشی سے گزار رہی تھی۔ ان کا کوئی عزیز، رشتے دار اس غم میں شریک ہونے نہیں آیا تھا۔ مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ عدت کے دن کب پورے ہوں گے۔ میری زندگی کے صبح و شام کا حساب الگ تھا۔

میرے لئے وہ بھی اچانک ہونے والا دھماکا ہی تھا۔ ایک دن میں گھر لوٹا تو مجھے سلیمان خان آفریدی کے گھر کا دروازہ مقفل نظر آیا۔ یہ میرے لئے خلاف معمول بات تھی۔ قمر نے ہارن کی آواز پر بھی کھڑکی سے کنڈی کھول کے نہیں کہا "سلام بھائی۔"

میں نے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے پوچھا "کہاں گئے یہ لوگ؟"

چوکیدار نے سلوٹ کے انداز میں سلام جھاڑا "چھوٹا بی بی لوگ اندر اے صاب۔"

میں اندر گیا تو قمرالنسا بت بنی صوفے پر بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے گھر میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ شاید کہیں اندر اس کی ماں بھی ہو مگر مجھے کوئی آہٹ تک سنائی نہ دی۔ ویسے بھی یہ تقریباً ناممکن تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کے میرے گھر میں آبیٹھے۔ اگر وہ خطرہ محسوس کرتی تب بھی ایسا نہ کرتی۔ وہ قمرالنسا کے ذریعے میرے گیٹ پر ہر وقت مسلح کھڑے رہنے والے چوکیدار کو بتادیتی۔ میں نے اسے پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ وہ سامنے والے گھر میں آنے جانے والوں پر بھی نظر رکھے۔

میں قمرالنسا کے پاس بیٹھ گیا "کیا بات ہے۔ کیوں رو رہی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہچکیوں میں رونے لگی۔

ایک اندیشے نے میرے ذہن میں سر اٹھایا۔ کہیں اس کی ماں گزر تو نہیں گئی۔ میں چار دن بعد گھر لوٹا تھا۔

"اماں کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے زور زور سے رونے لگی تو مجھے یقین آنے لگا کہ وہ واقعی چل بسی۔ اچھے بھلے آدمی کا بیٹھے بٹھائے ہارٹ فیل ہو جانا اب کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی۔ اس کے خودکشی کرنے یا قتل ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور وہ بیمار بھی نہیں تھی۔

"خدا کے لئے قمر، کچھ بولو، مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"ناصر بھائی۔ اماں چلی گئیں" اس نے روتے روتے کہا۔

"اناللہ و انا الیہ راجعون۔" میں نے کہا۔

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ایسا مت کہیں بھائی! وہ زندہ ہیں۔"

میرا دماغ چکرا گیا "زندہ ہیں؟ مگر تمہیں چھوڑ کر چلی گئیں؟ کہاں کس کے ساتھ؟ کب..... اور کیوں؟"

قمر کی ہچکیاں بڑی مشکل سے بند ہوئیں تو اس نے بتایا "اماں کل رات ہی کہیں چلی گئی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہاں، وہ اکیلی گئی ہیں۔"

میں اسے دیکھتا رہا "اور تم کل رات سے یہاں بیٹھی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھے تو صبح معلوم ہوا، جب وہ جاچکی تھیں۔"

"کس نے بتایا تمہیں؟"

اس نے ایک کاغذ کا پرزہ مجھے تھمادیا "یہ چھوڑ گئی تھیں وہ میرے لئے ناصر بھائی، اور یہ آپ کے لئے۔"

میری گردن اس کی انگلی کے اشارے پر گھوم گئی۔ کونے میں ایک منہ بند بوری رکھی ہوئی تھی اور اس کے اوپر قرآن پاک کا ایک پرانا نسخہ رکھا تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں معلوم بھائی۔ میں نے نہیں دیکھا۔ اماں نے منع کیا تھا۔"

"کب منع کیا تھا؟ تجھے تو ان کے جانے کا بھی پتا نہیں چلا تھا؟"

"خط میں لکھا ہے۔"

میں نے عام کاپی سے پھاڑا ہوا کاغذ کھول کے دیکھا جو قمرالنسا کی مٹھی میں اس کے ہاتھ کی یا آنسوؤں کی نمی سے گیلا ہو رہا تھا۔ اس میں انتہائی بدخط میں لکھا تھا "قمر۔ ابھی میں جاتی ہوں۔ میرے کو مجبوری نہ ہوتا تو پہلے جاتی۔ تیرے باپ کا بدلہ میں لیتی۔ ناصر عظیم میرا بیٹا نئیں اے۔ مگر تیرا بھائی اے۔ اللہ اس کو زندگی' صحت اور عزت دے۔ وہ تیرا بھائی نئیں باپ کا جگہ اے۔ اس کا ساتھ رہنا۔ جو وہ کہے کرنا۔ وہ جدھر بولے ادھر شادی کرنا۔ میں انشاء اللہ واپس آئے گی۔ غم مت کرنا۔ میں اپنے دشمنوں کو جانتی اے۔ ان سب کو ختم کرکے آئے گی۔ پتا نئیں کب آئے گی۔ یا نئیں آئے گی۔ اللہ تیرے کو خوش رکھے۔ میں نے کچھ ضروری کاغذ ایک بوری میں تیرے بھائی کو بھیجا اے۔ اس کو بولنا میرے کو ماف کردے۔ تو کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ اللہ تیرے کو خوش رکھے۔"

میری عقل خبط ہو رہی تھی۔ میں نے خط قمر کو دیا اور خود قرآن پاک کا نسخہ اٹھالیا۔ میرا ارادہ بوری کھول کے دیکھنے کا تھا مگر مجھے قرآن کے صفحات میں سے ایک کاغذ کا کونا نکلا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے کھینچ لیا۔ اس پر لکھا تھا۔

"قرآن پاک تمارے ہاتھ میں ہے۔ تم کو اس کا قسم یہ رکھو اور قمرالنسا کا خیال چھوٹی بہن کا طرح کرو۔ جیسا اب تک کیا۔"

میرا دماغ گھوم گیا۔ اللہ کی کتاب واقعی میرے ہاتھ میں تھی اور میں اس عورت کے دیئے ہوئے حلف کا پابند ہو گیا تھا۔ غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔ کیا اسے اعتبار نہیں تھا مجھ پر؟ کیا جو کچھ میں نے اس کے شوہر کے لئے کیا تھا... صرف قمرالنسا کی خاطر وہ کافی نہیں تھا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں قمرالنسا کو واقعی چھوٹی بہن سمجھتا ہوں۔ اس کی خاطر جان دے بھی سکتا ہوں اور لے بھی سکتا ہوں پھر یہ قرآن اٹھوا کے حلف دینا!

میں نے قرآن پاک کو چوم کے ایک طرف رکھ دیا اور بوری کا منہ کھولا جسے موٹے ٹانکے لگا کے بند کیا گیا تھا۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ سو کے اور پانچ سو کے۔ نئے پرانے' کچھ گڈی کی صورت میں' کچھ کھلے ہوئے۔ یہ تھے وہ ضروری کاغذات جن کو ہاتھ لگانے سے اس نے قمرالنسا کو منع کیا تھا۔ سلیمان خان آفریدی کی وہ دولت جو اس کی بیوی نے جمع کر رکھی تھی۔ اگر بینکوں میں تھی تو نکلوالی تھی یا گھر کے صحن میں دفن تھی تو کھود کے نکال لی تھی۔ جانے سے پہلے وہ سب کچھ قمرالنسا کے لئے چھوڑ گئی تھی اور مجھ سے حلف اٹھوا گئی تھی کہ یہ سب میں رکھوں۔

غصے نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں نے قمرالنسا کی ماں کو خوب بے نقط سنائیں "یہ چھوڑ گئی ہے وہ تمہارے لئے۔ قسم خدا کی۔ آگ لگادوں گا ان سب کاغذوں کو میں۔ کیا خیال تھا اس کا' کیا میں کنگال ہوں؟ مجھے ایک بہن بھاری ہو گی؟ اس کی پرورش کا بار نہیں اٹھا سکوں گا میں؟ اور وہ خود کو کیا سمجھتی ہے۔ نکل گئی دشمنوں سے بدلہ لینے؟ ایک عورت اپنے شوہر کے قاتلوں کو ختم کرے گی۔ مائی فٹ' ارے بابا ان کو پہچانتی تھی تو مجھے بتاتی' میں ایک ایک کو اٹھوا کے یہاں اس کے قدموں میں ڈال دیتا۔ خود گولی ماردیتی انہیں اپنے ہاتھ سے۔ ٹھیک ہے میں نے خود کو اس کا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر وہ تو بیٹی کی ذمے داری بھی نہیں اٹھا سکی۔ کیسی ماں تھی وہ.... چھوڑ کے بھاگ گئی اسے۔"

"ناصر بھائی' انہیں کچھ مت کہیں۔ آپ نے ان کو برا کہا تو میں چلی جاؤں گی کہیں۔ زہر کھالوں گی" وہ چلا چلا کے رونے لگی۔

میرا غصہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "تم۔ میری بہن' میری منی سی بہن' مت رو۔ میں غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیا کہہ گیا۔ مجھے معاف کردے' آئی ایم سوری۔ دیکھ کوئی اور نہیں ہے میرا بھی اس دنیا میں۔ تو مجھے چھوڑ گئی نا' یا تو مرگئی تو....؟"

اس نے میرے سینے پر سے سر اٹھا کے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "نہیں ناصر بھائی' آپ کو میرے لئے زندہ رہنا ہے اور اپنے لئے۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے زندہ رہیں گے" میں نے اس کی ماں کا چھوڑا ہوا قرآن بیچ میں رکھ لیا "اس پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کر۔ میری طرح۔"

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے ساتھ رکھ دیا "میں وعدہ کرتی ہوں۔"

میں نے اسے وہ کاغذ کا پرزہ دکھایا جو قرآن پاک کے درمیان میں اس کی ماں نے رکھا تھا۔ "میں تو پہلے ہی حلف اٹھا چکا ہوں۔ بڑی چالاکی سے تیری ماں نے کچھ کہے بغیر مجھے اتنی بڑی قسم دے دی۔"

یہ تقریباً سات سال پہلے کی بات تھی۔ اس عرصے میں ہر عید پر قمرالنسا کو ماں کا بھیجا ہوا کارڈ مل جاتا تھا۔ سالگرہ بھی وہ نہیں بھولتی تھی۔ قمرالنسا پہلے چھپ کے ہر روز روتی تھی پھر سال میں دوبار رونے لگی۔ اس نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں اور فیشن ڈیزائننگ میں ڈپلوما لے لیا۔ میں نے اس کی ماں کے پیسے سے ایک عالی شان بوتیک کھول دیا اور ایک بیوٹی پارلر۔ شادی سے وہ صاف انکار کرتی تھی۔ "اماں جب تک نہیں آجاتی ناصر بھائی' اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی میں۔"

"وہ خط ہے نا تیرے پاس۔ ماں کا اتنا خیال ہے تو دیکھ اس میں کیا لکھا تھا ماں نے۔ تیری مرضی نہیں چلے گی۔"

"یہ بلیک میلنگ ہے بھائی۔" وہ لاجواب ہو جاتی "اچھا جس سے آپ کہیں گے کرلوں گی مگر ابھی نہیں۔"

"پھر کب.... کیا عمر ہو گئی ہے تیری؟"

"آپ سے تو کم ہے بھائی۔ پہلے آپ کی.... پھر میری۔"

"یہ ناممکن ہے کہ بہن بیٹھی ہو اور بھائی شادی کرلے۔ مرد ویسے بھی دیر سے شادی کرتے ہیں۔"

"میں کون سی بوڑھی ہو رہی ہوں۔ وہ زمانہ گزر گیا جب لڑکیوں کی شادی بچپن میں کردی جاتی تھی۔"

"اب کیا بچپن میں کرے گی' بچپن کی بچی۔"

اب میرے سامنے وہ خط تھا جس میں قمرالنسا کی ماں نے اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ قمر کے خیال سے میں نے ضبط سے کام لیا ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ اس عورت کو پھر وہ گالیاں دوں جن کی وہ مستحق تھی۔ مگر میں اسے دے نہیں سکتا تھا۔

"ناصر بھائی۔ آپ نے اماں کا خط پڑھے بغیر پھاڑ دیا؟"

"ہاں" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیوں بھائی؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"اس لئے کہ..... نہ میں اس سے بات کرتا تھا اور نہ وہ مجھ سے بات کرتی تھی۔ خط میں اس نے مجھے ہی مخاطب کیا ہوگا نا۔ مجھے نہیں سننی اس کی کوئی بات۔ اس کا کیا بھروسا۔ پہلے بھی سخت غلط حرکت کی تھی اس نے مجھ سے حلف اٹھوا کے اور نوٹوں کی بوری کا قرض چھوڑ کے۔"

"وہ قرض کب تھا بھائی۔ آپ نے مجھ پر خرچ کردیا سب۔"

"یہی تو غلط حرکت تھی اس کی۔ اس نے مجھے ذلیل کیا تھا۔ ایک بہن بار تھی مجھ پر؟ وہ آگ لگا دیتی ان نوٹوں کو...." میں بھڑک اٹھا۔

"ناصر بھائی۔ ہر ماں بیٹی کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہے۔"

"ماں۔ ایسی ہوتی ہے ماں؟" میں نے وہ قمر کے نام لکھا خط اس کے سامنے پٹخ دیا "کون ہے یہ حاجی پیر محمد۔ تم جانتی ہو اسے؟"

قمرالنسا نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور اقرار میں سر ہلایا لیکن میرے اگلے سوال سے پہلے چند سیکنڈ حیرانی میں گزر گئے اور اس وقفے میں الو کا پٹھا نازل ہو گیا۔

اس نے دروازے میں نمودار ہوتے ہی کہا "تو یہاں بیٹھا ہے۔ سور کے بچے۔" پھر اس نے قمر کو دیکھا "اوہو۔ ایلیہ سین ہے۔"

○☆○

پورا ایک ہفتہ چیختی چلاتی سرخیوں سے بھرے اخبار ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے تھے اور نائی کی دکان سے ایوان اقتدار تک ہر جگہ یکساں حیرت اور تجسس' خوف و اضطراب' شکوک اور بے یقینی کے ساتھ پڑھے گئے تھے۔ لوگ جہاں بیٹھتے تھے یہ بات نکل آتی تھی۔ عین تقریب نکاح میں یا قبرستان میں کسی میت کی تدفین کے دوران۔ دفتروں' عدالتوں' بازاروں اور کھیل کے میدانوں میں۔ گھروں میں اور ہوٹلوں میں۔ جہاں بھی لوگ مل بیٹھتے تھے' کوئی سوال کر بیٹھتا تھا۔ "یار' یہ کیا عجیب مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔"

کوئی اور کتاب سیاست کا پرانا پڑھنے والا بڑے وثوق سے کہتا۔ "مجھے تو یہ صیہونی سازش لگتی ہے۔ انتشار و نفاق سے امت مسلمہ کی صفوں میں۔"

اخبارات میں دو طرح کے کالم لکھنے والوں کی اکثریت تھی۔ ایک اس الزام میں قیاس آرائی کو بہتان' جھوٹ اور الزام تراشی قرار دیتے تھے۔ ڈس انفارمیشن کی مہم بتاتے تھے اور ایسی باتیں پھیلانے والوں کو وطن دشمن غدار یا کافر تک قرار دیتے تھے۔ یہ سب میرے قاتلوں کے اجرتی لوگ تھے۔ دوسرے اس میں سچائی دیکھتے تھے۔ عدالتی تحقیق کا مطالبہ کرتے تھے۔ امکانات گنواتے تھے اور بہت دور کی کوڑی لاکے اپنی رائے کے صائب ہونے پر اصرار کرتے تھے۔ کالم نگاروں کی ایک تیسری قسم وہ تھی جن کا پورا کالم پڑھ کے بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ پریس اور پبلک کا دباؤ بڑھتا گیا۔ خود حکومت کے کچھ ذمے دار ارکان یہ کہہ کے پھنس گئے تھے کہ ضرورت محسوس ہوئی تو عدالت عالیہ کے

ایک جج کی نگرانی میں کمیشن قائم کیا جائے گا تاکہ عوام کو جھوٹ بولنے والوں کی نیت اور عزائم کا پتا چل سکے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

اوّل تو یہ محاورہ سائنسی بنیادوں پر ہی غلط ہے۔ جیسے خون کا خون اور پانی کا پانی کہنا۔ خون یا دودھ میں شاید نوّے فیصد سے زیادہ پانی ہی ہوتا ہے۔ شیر بکری کے ایک گھاٹ پانی پینے والا محاورہ یا چراغ تلے اندھیرا جیسی باتیں خارج از نصاب بلکہ ممنوع قرار دی جانی چاہئیں۔ کمپیوٹر اور خلائی مواصلات کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخلے کی بات کرنے والے بچوں کو ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہوگی۔

جب مظاہرے ہونے لگے اور میرے حامی اور مخالفین کے درمیان تصادم کی نوبت آئی۔ اکا دکا لوگ مارے جانے لگے، حکومت کا لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال، پکڑ دھکڑ اور "شرپسندوں سے آہنی ہاتھ سے نمٹنے" کی دھمکی اور کسی کو "امن وامان اور ملکی سلامتی کو داؤ پر لگانے کی اجازت" نہ دینے والی مضحکہ خیزیات بھی غیر مؤثر ہوگئی، جلسے جلوس بڑھتے گئے یہاں تک کہ دو جگہ توڑ پھوڑ کرنے والے ہجوم پر فائرنگ ہوئی تو حکومت عدالتی تحقیقات کے لئے کمیشن کا اعلان کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس میں عدالتِ عالیہ کا ایک جج نہیں، تین جج تھے۔

اس تمام ہنگامے میں نہ تیمور سامنے آیا اور نہ اُس کا پتا کاٹنے والے نظر آئے۔ پس پردہ وہ سب کچھ کر رہے تھے۔

تجسس میں چنگاری پھینکنے والی پی جمالو یعنی مس شبنم ایسے غائب ہوئی جیسے غالباً ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے مطابق گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوئے ہوں گے۔ اس کا کسی کو سراغ ہی نہیں ملا۔ کسی نے کہا وہ جان کے خوف سے غائب ہوگئی۔ کسی نے کہا اُسے غائب کرادیا گیا اور کسی نے یہ بھی سمجھ لیا کہ تماشا شروع کرکے مداری کیسے غائب ہوسکتا ہے۔ یہ بھی اس کا تماشا ہے اور اچانک وہ ایسے نظر آئے گی جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی اور سب کے سامنے تھی مگر لوگوں کی نظر اسے نہ دیکھ سکی تو اس کا کیا قصور۔

کمیشن نے عام خیال کے برعکس گواہوں کے بیانات سے آغاز نہیں کیا۔ عدالت کے حکم سے میری قبر کھود کے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے اور دوبارہ شناخت کے لئے تین دن بعد کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اس کے لئے زیادہ بڑا میڈیکل بورڈ تشکیل دیا گیا جس میں پولیس کے ایم ایل او، سول سرجن اور سرکاری اسپتال کے ایم ایس کے علاوہ دو میڈیکل کالجوں کے نامزد پروفیسر اور پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے دو نمائندے بھی شریک کیے گئے۔ غیر سرکاری ارکان کی شمولیت کے بعد لوگ مطمئن ہوگئے کہ اب حقیقت سامنے آجائے گی۔

مقررہ تاریخ پر میرے مزار کے گرد پہرا لگادیا گیا۔ ادھر عام پبلک کا داخلہ ممنوع ہوگیا۔ میڈیکل بورڈ اور کمیشن کے اراکین کے ساتھ ڈپٹی کمشنر، ایس ڈی ایم، سیکریٹری داخلہ اور ڈی آئی جی جیسے لوگ تھے یا پھر صحافی جو خاص اجازت ناموں کے ساتھ آئے تھے۔ یہ سب بہت سینئر صحافی تھے۔ ان کے ساتھ زبردست قسم کے کیمروں والے فوٹوگرافرز تھے اور شبنم تھی۔ فتنہ انگیز و محشر خیز اندازِ رعنائی و دلربائی کے ساتھ۔ اپنے اس ظاہری اندازِ تغافل میں اپنے حسن وشباب کی قوتِ تسخیر سے پوری طرح آگاہ۔ وہی کالی مردانہ شرٹ۔ اسی طرح اوپر والے ایک کھلے بٹن کے ساتھ۔ جینز اور شولڈر بیگ۔ زیرِ لب مسکراہٹ اور مسلسل چیونگم چباتی۔ وہ یقیناً پہلے جانتی تھی کہ سچ کیا ہے ورنہ اتنی خاموش، پُرسکون اور مطمئن نہیں رہ سکتی تھی۔ سچ اگر سچ ہوتا تو وہ یہاں نظر ہی نہ آتی۔

آخر میں چند گواہ ایک پولیس وین میں لائے گئے۔ ان کے آگے پیچھے مشین گن والی گاڑیاں تھیں۔ یہ سب میری تدفین کے وقت موجود تھے۔ چشم دید گواہان۔ ان میں وہ مولوی بھی تھا جس نے میری نمازِ جنازہ پڑھائی تھی اور غسال بھی۔ یہ تقریباً ایک درجن لوگ تھے۔ ان میں تیمور، شمس اور قریشی شامل تھے۔

اس وی آئی پی قسم کے اجتماع میں سب سے کم اہم ذات گورکن کی تھی جو ایک طرف اپنے آلاتِ گورکنی سنبھالے بیٹھا تھا۔ اشارہ ملتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لئے مُردے والی قبر کھودنا بھی ایک کام تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے مُردے کے لئے قبر کھودنا۔ اسے صرف معاوضے سے غرض تھی۔

ایک گھنٹے مٹی کھودنے کے بعد گورکن تابوت نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ لکڑی کا سیل بند تابوت تھا جس کا اوپر والا وہ حصہ شیشے کا تھا جس میں سے مُردے کی صورت نظر آتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا اور لمبا۔

قبر سے کچھ فاصلے پر ایک خیمے میں بڑی بڑی ڈگریوں والے، فارن کوالیفائڈ، لمبی چوڑی فیس لینے والے، اپنے اپنے شعبے کے ماہرترین ڈاکٹر، سخت بیزاری کے عالم میں بیٹھے تھے۔

تابوت کے برآمد ہوتے ہی جیسے سب میں بجلی کی رو دوڑ گئی۔ صحافی اور کیمرا مین ایک ساتھ آگے بڑھے۔ پولیس والوں نے انہیں روکا۔

"پہلے پوسٹ مارٹم ہوگا۔"

"ہم تابوت کے اندر بھی ایک تصویر بنائیں گے پہلے۔"

شبنم اس وقت بھی اندرونی ہیجان کو دبانے کے لئے چیونگم چبارہی تھی اور مسکرانے کی فضول سی کوشش میں مصروف تھی۔ فلیش چمکے اور کئی فوٹوگرافرز نے اوپر نیچے ہوکے اور لینز بدل بدل کے تصویریں اتارلیں۔

پھر تیمور آگے بڑھا۔ اس نے کہا "آپ آگے آئیں مس شبنم کیا سچ سے ڈر کے دور کھڑی ہیں؟"

تیمور کی طرف دیکھے بغیر وہ آگے بڑھی اور تابوت تک پہنچ کے جھکی پھر وہ جھکتی چلی گئی۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا تھا۔ وہ تابوت پر گری اور پھر فرشِ خاک پر لڑھک گئی۔

میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ مداری کی بچی..... ساری دنیا کو اُلّو بنانے چلی تھی۔ میرا کھیل کیسا رہا؟

آس پاس کھڑے ہوئے شبنم کے ساتھیوں میں افراتفری پھیل گئی۔

"یار، اسے کیا ہوا؟" ایک فوٹوگرافر نے فوراً اس کی تصویر بنالی۔

پھر دوسرے کیوں پیچھے رہتے۔ ان کے ہاتھ بڑی خوب صورت تصویر آئی تھی جس کے عنوان کہیں زیادہ خوب صورت، ذو معنی اور سنسنی خیز ہوسکتے تھے۔

"ارے آپا صفیہ!" کسی نے گھبرا کے زنانہ امداد طلب کی "ذرا آکے اسے سنبھالیں..... ورنہ یہ تو گئی واہیں..."

"کیا دل کا دورہ پڑگیا؟" کوئی بولا۔

"غالباً..... معاملہ بھی دل کا ہی تھا" کسی اور نے جواب دیا۔

ایک لیڈی ڈاکٹر نے جو میڈیکل بورڈ میں تھی آگے آئی اور آپا صفیہ نے شبنم کو اٹھانے کی کوشش کی پھر ایک ہیرو ٹائپ شخص نے جو خود بھی رپورٹر تھا جھنجلا کے کہا "چلیں، ہٹیں آپ لوگ" اور اس نے جھک کے شبنم کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھالیا "مخبوار" جو کسی نے تصویر بنائی۔"

پوز اچھا تھا، خاصا رومانٹک تھا مگر اس کی بات مان لی گئی۔ وہ انہی کا ساتھی تھا۔ جوان لڑکی سرِعام بے ہوش ہوجائے تو اسے اٹھانے کے لیے بھی عورت کا جائے واردات پر ہونا لازمی ہے۔ عورت بھی آپا صفیہ جیسی نہ ہو۔ یہ اخلاقی اور شرعی مسئلہ ہے کہ عورت کو گرفتار کرنے کے لیے بھی لیڈی پولیس لازمی۔ لیڈی سرچ نہ ہو تو پولیس کا کسی پردہ دار گھر میں گھسنا بھی جرم۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا "نتھنگ ٹو پرابلم، یہ شاک کی کنڈیشن ہے۔ کمزور دل لوگوں کو ایسی جگہ سے دور رہنا چاہیے۔"

کسی نے پُرتمسخر طنز سے کہا "کمزور دل... شبنم کا؟ اس بے چاری لیڈی ڈاکٹر کو بتاؤ یار! شبنم کے دل کے بارے میں۔"

"یہ کہ اتنے مضبوط دل والے تو مرد بھی کم ہوتے ہیں" دوسرا بولا۔

"مجھ سمیت اس نے بڑے بڑے سورماؤں کے پتھر دل پاش پاش کردیے۔"

"سوائے شاہ عالم کے۔"

"اچھا چلیں آپ لوگ باہر جائیں۔ ادھر بھیڑ مت لگائیں" میڈیکل بورڈ کے صدر نے کہا "ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا "شی از آل رائٹ۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے، یہ ابھی سوتی رہے گی۔"

"آپا صفیہ تو یہاں رُک جائیں" ایک رپورٹر نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔"

شبنم خیمے کے کنارے پر لگے ہوئے صوفے پر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس کے شانوں تک تراشے ہوئے ریشم جیسے بال پھسل کر نیچے آرہے تھے اور پیڈسٹل فین کی طوفانی ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ وہ واقعی حسین لگ رہی تھی۔ حسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے۔

تابوت اس سے کچھ فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ مٹی، کیچڑ سے خراب ہوجانے والے تابوت میں میری لاش خراب نہیں ہوئی تھی۔ عام حالات میں موت کے فوراً بعد ڈی کمپوزیشن کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ زندگی کو جاری رکھنے والا عمل رک جاتا ہے تو موت بڑی تیزی سے حملہ آور ہوتی ہے۔ تین منٹ کے اندر اندر آکسیجن کی فراہمی رُک جانے سے دماغ کے خلیے مرنے لگتے ہیں۔ پچاس ساٹھ یا سو سال تک روز وشب پورے جسم کی وریدوں اور شریانوں میں خون کو پمپ کرنے کے لیے لاکھوں کروڑوں بار دھڑکنے والا دل پھر اسٹارٹ نہ ہو تو جسم کے اعضا باری باری مرنے لگتے ہیں۔ دماغ، پھر آنکھیں، پھر کان، دیگر حواسِ خمسہ، اعصاب اور سارے جسم کا مشینی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتا ہے۔ CLINICAL موت کے بعد جسمانی موت کے ساتھ ہی آدمی سڑنے گلنے لگتا ہے۔

میرے ساتھ معاملہ قدرے مختلف تھا۔ اب تو خیر سائنس اتنی ترقی کرگئی ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ برضا و رغبت کیمیائی محلول میں منجمد پڑے ہیں۔ برسوں سے وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں۔ لاکھوں ڈالر کے خرچ سے ان کے جسم یوں محفوظ کرلیے گئے ہیں کہ پچاس یا سو سال بعد انہیں واپس زندگی کی طرف لوٹایا جاسکے گا حالانکہ ابھی وہ دیکھنے والے کے لیے مُردہ ہیں مگر ڈاکٹروں کے نزدیک ان کے سارے خلیے زندہ ہیں اور ان کی عمر رک گئی ہے یا ان کے لیے وقت رُک گیا ہے۔ اگلے پچاس یا سو برس تک انہیں اسی حالت میں رکھنے پر شاید کروڑوں ڈالر خرچ ہوں گے یا اربوں۔ مگر وہ سب دولت مند لوگ تھے جنہوں نے وصیت کی کہ ہماری دولت ہم پر ایسے ہی خرچ کی جائے۔ کچھ کینسر جیسے موذی مرض میں مرجاتے، انہوں نے میڈیکل سائنس کو ریسرچ کا موقع فراہم کیا اور سو سال بعد پھر اٹھ کھڑے ہونے کا چانس لیا۔ اس اُمید میں کہ تب تک کینسر یا ایڈز جیسے امراض کا علاج یقیناً دریافت ہوجائے گا اور وہ اکیسویں صدی میں عمر کا باقی حصہ گزار لیں گے۔

لیکن لاشوں کو ہزاروں سال پہلے مصری بھی محفوظ کرنا جانتے تھے غالباً لینن اور چو این لائی کی لاشیں شیشے کے تابوتوں میں محفوظ رکھی ہیں۔ آنے والی نسلیں انہیں اسی حالت میں دیکھتی رہیں گی۔ لینن کے دماغ کو اور فرائڈ کے دماغ کو ان کی کھوپڑی سے نکال لیا گیا ہے۔ اور نہ جانے کس کس کے دماغ کو روس کے ایک خفیہ مقام پر کسی لیبارٹری میں ریسرچ کے لیے رکھا گیا ہے۔ سائنس داں جاننا چاہتے ہیں کہ آدمی جینئس کیسے ہوتا ہے اور کیا ایک عام دماغ کو کسی جینئس کا دماغ بنایا جاسکتا ہے؟

آج عام آدمی بکرے یا گائے اور مرغی کے گوشت کو ہفتوں یا مہینوں اپنے فریزر میں رکھتا ہے مگر مرجانے والے آدمی کے لیے حکم ہے کہ اسے جلد از جلد اپنی آخری منزل تک پہنچادو۔ ورنہ آدمی کا گوشت بھی گوشت ہے۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر کسی کو مرنے کے بعد

کچھ دن دنیا میں گزارنے پڑیں تو اس کے لیے مُردہ خانوں کے سرد خانے ہیں۔ باہر سے لائی جانے والی لاشوں کو خصوصی کیمیائی عمل سے عارضی طور پر محفوظ کردیا جاتا ہے۔

ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ خاص کیمیائی عمل اور انجکشنز کے ذریعے میری لاش کو محفوظ کیا گیا تھا اور چند دن ڈیپ فریزر میں بھی رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تابوت کے اندر لاش خراب نہیں ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ میری موت چند گھنٹے قبل ہوئی ہے۔

یہ سب بتانے کا مقصد نہ آپ کی معلومات میں اضافہ ہے اور نہ آپ کو دہشت زدہ کرنا۔ اس دنیا میں بہت کچھ ہو رہا ہے اور بے سبب نہیں ہو رہا۔ کچھ جادو کو برحق تسلیم کرتے ہیں لیکن بیشتر صورتوں میں یہ مداری کے ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔ کوئی شعبدہ ہوتا ہے جو عام آدمی نہیں سمجھ پاتا۔

جن لوگوں نے تابوت میں میری صورت دیکھی تھی اور جن فوٹوگرافرز نے میری تصویر تابوت کے اندر اُتاری تھی وہ پیشہ ورانہ تجسس اور احساسِ ذمّے داری کے باوجود دہشت زدہ ہوکے کلمہ پڑھتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ان سب نے مجھے میری اصل صورت کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

شبنم آخر کیوں بے ہوش ہوئی تھی؟ یہ شاک کی بات نہیں تھی۔ وہ واقعی شاک پروف تھی۔ وہ مُردہ خانوں سے ہڈیاں چُرانے والی اور قبرستانوں کی خاک چھاننے والی۔ شکستہ قبروں میں چھپ کر بیٹھنے والی اور خطرناک جنگلوں میں اکیلی ڈاکوؤں کے ٹھکانے تک پہنچ جانے والی۔ کسی سانپ یا بھیڑیے کو خاطر میں لائے بغیر جنگل میں رات بھر بھٹکنے والی لڑکی حیرت انگیز بلکہ ناقابلِ یقین قوتِ ارادی اور ناقابلِ شکست حوصلے کی مالک تھی۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ بڑی نازک اور نخرے والی معشوق ٹائپ لگتی تھی۔

گھر میں دو سو بیس وولٹ کا کرنٹ لگ جائے تو اکثر کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی نہ کبھی پلگ لگاتے ہوئے یا غلطی سے شارٹ سرکٹ ہونے والے تار کو چھونے کا نتیجہ ایک جھٹکے اور جھنجھناہٹ کی صورت میں برآمد ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسی خبریں بھی آتی ہیں کہ کوئی پنکھا چلاتے ہوئے یا پانی کی موٹر آن کرتے ہوئے مرگیا۔

شبنم نے بہت صدمے برداشت کیے تھے۔ اس کا ذہن بدترین اور بھیانک ترین صورتِ حال سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہتا تھا مگر آج اچانک وہ میری صورت دیکھ کے آؤٹ ہوگئی۔ یہ میری موت کے صدمے کا اثر نہیں تھا۔ یہ اس کے یقین کی موت تھی۔ اچانک اور غیر متوقع۔ جیسے کوئی سو فیصد یقین کے ساتھ تار کو پکڑ لے کہ اس میں تو کرنٹ ہی نہیں۔ وہ ہفتے سے وہ ثبوت کی تلاش میں تھی۔ اسے یقین تھا اور معلوم تھا کہ میں زندہ ہوں۔ وہ آپا صفیہ سے قبروں کے ایکس رے کے مسئلے پر بات کرتی رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں کہاں ہوں؟ اس کے لیے یہ فرض کرنا بھی محال تھا کہ میں قبر کے اندر مُردہ پڑا ہوں۔ اسے ایک فیصد شک بھی نہیں تھا کہ میں واقعی ماردیا گیا ہوں۔ وہ میری تلاش میں تھی۔ میرا کھوج لگانے کے لیے دن و رات سرگرداں تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ بھی کوئی چکر ہے۔ وہ مجھے مداری کہتی تھی۔ جیسے اور بہت سے لوگوں کو مداری کہتی تھی۔ اس کا پکا خیال تھا کہ میں نے مداری کا کھیل دکھایا ہے۔ دنیا کو یقین دلا دیا ہے اپنی موت کا اور خود روپوش ہوگیا ہوں۔ سارے زمانے کو معلوم تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ دیوانگی کی حد تک۔ یہ بات میں بھی جانتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اس کی محبت کے اس جذبے کو کیسے EXPLOIT کیا جاسکتا ہے۔ اس سے کیا فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے اور کیسے؟

وہ ہمیشہ میرے ہاتھوں استحصال کا شکار ہونے اور غلط استعمال ہونے کے لیے تیار بھی رہتی تھی۔

ایسی پاگل لڑکی کے لیے میری موت کا یقین ناقابلِ برداشت صدمہ بن گیا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس کے سارے خوش آئند مفروضات اور احمقانہ خوش فہمیوں کے محل جن کو وہ ناقابلِ شکست سمجھتی تھی اچانک زمیں بوس ہوگئے تھے۔ اس پر ہنسنے والے بہت تھے۔ لوگ اس سے جلتے بھی تھے، اس پر رشک بھی کرتے تھے اور اس کے دشمن بھی تھے۔ دوست اور ہمدرد کم تھے جو اس پر ترس کھاتے۔ اسے سمجھ سکتے۔ اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔

ثابت تو ایک نظر میں ہی ہوگیا تھا کہ مرنے والا خود میں تھا۔ اس کے باوجود ڈاکٹروں کے بورڈ نے دوبارہ شناخت کے سارے طبی اور قانونی تقاضے پورے کیے۔ تیمور، شمس اور قریشی کی سٹی گم تھی۔ یہ خبر پھیل چکی تھی اور بہت جلد سب کو معلوم ہونے والی تھی کہ شاہ عالم شہید کی لاش پندرہ دن بعد کس حالت میں ملی؟ اس کا چہرہ بالکل تروتازہ تھا۔ اس پر سکون تھا اور اطمینان تھا۔ وہ واقعی شہید تھا۔ علامہ گل محمد پشاوری کو قائل کرنے کے لیے یہ دلیل کافی تھی۔ پارٹی کو بڑا مضبوط نعرہ مل گیا تھا۔ دنیا بھر کے بدخواہ آکے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ کیا اتنے دن بعد نکالی جانے والی لاش ایسی ہوسکتی ہے؟ پارٹی کا پروپیگنڈا سیل اس سے پورا فائدہ اُٹھائے گا۔

"اور تم انہیں مُردہ مت سمجھو۔ بے شک وہ زندہ ہیں" اس ارشادِ خداوندی کا جو ثبوت مانگے وہ کافر۔ یہ شاہ عالم شہید کا معجزہ تھا۔ اس کی شہادت پر قدرت کی گواہی تھی۔ اللہ اس قوم کو گمراہ کرنے والوں کو کیسے معاف کرے گا اور اس قوم کا انجام کیا ہوگا جو اتنی آسانی سے گمراہ ہوجائے۔

پوسٹ مارٹم ختم ہوتے ہی صحافی میڈیکل بورڈ کے ارکان پر ٹوٹ پڑے "اب کیا خیال ہے آپ کا؟" ایک رپورٹر نے پوچھا۔

"وہی جو پہلے تھا" پولیس سرجن بولا۔

"سوال میں نے میڈیکل بورڈ کے چیئرمین سے کیا تھا۔"

چیئرمین نے سوچ کے کہا "ابھی سے اپنی رائے دے کر میں مشکل میں نہیں پڑسکتا۔ جو ظاہر ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے۔ اگر نئی بات معلوم ہوگی تو رپورٹ میں آجائے گی۔"

"رپورٹ کب ملے گی؟" دوسرے صحافی نے پوچھا۔

بورڈ کے اراکین غالباً پہلے ہی طے کرچکے تھے کہ صحافیوں کا سامنا صرف چیئرمین کرے گا۔ وہ میڈیکل کالج کا پرنسپل اور تیز طرّار آدمی تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ سوالات کی کیا نوعیت ہوگی چنانچہ ذہنی طور پر وہ ہر جواب سوچ کے آیا تھا۔"

"رپورٹ عدالت کے مقرر کردہ کمیشن کو دی جائے گی۔ اب یہ ان کی مرضی کہ وہ آپ کو کیا بتاتے ہیں اور کب بتاتے ہیں۔ ہمارا کام ختم ہوا۔ برائے مہربانی مجھ سے یا میڈیکل بورڈ کے کسی رکن سے اس معاملے میں سوال نہ کریں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جو کیس عدالت میں ہو اس پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا جاسکتا" اس نے ایک ہی بار میں سب کو خاموش کردیا۔

"آپ یہ تو بتاسکتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کے علاوہ شناخت کے دیگر ذرائع کیا ہوں گے؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"اس کا جواب پولیس کے حکام دے سکتے ہیں۔"

"یہ میڈیکل پروفیشن سے تعلق رکھنے والا سوال ہے سر!" آپا صفیہ نے کہا "یہ پوسٹ مارٹم وجہ قتل معلوم کرنے کے لیے نہیں ہوا تھا۔ اس وقت آپ نے شناخت ثابت کرنے کا کیا طریقہ استعمال کیا؟"

اس نے دلچسپی سے صفیہ کو دیکھا "آپ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ آپ کو یقیناً تمام جدید طریقوں کا علم ہوگا۔"

"جو پاکستان میں ابھی تک رائج نہیں" ایک صحافی نے کہا "مثلاً ڈی این اے ٹیسٹ۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ کی سہولت ہر جگہ نہیں ہے مگر اس کیس میں ہم مروجہ طریقے اختیار کریں گے۔"

"یعنی وہی فنگر پرنٹس والا فرسودہ طریقہ؟" آپا صفیہ نے پوچھا۔

"جب کہ دانتوں کی ساخت یعنی DENTURE کے ایکس رے سے جو IDENTITY قائم کی جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے وہ ESTABLISH ہوتی ہے۔" کوئی اور بولا

ڈاکٹر نے اسے گھور کے دیکھا "بشرطیکہ سابقہ ریکارڈ موجود ہو کسی ڈینٹسٹ کے پاس۔ مکمل DENTURE کی ایکس رے فلم محفوظ ہو۔ ابھی ہم اتنے ماڈرن نہیں ہوئے کہ ہمارا کوئی فیملی ڈینٹسٹ بھی ہو جو ہر فیملی ممبر کے DENTURE کا ریکارڈ رکھتا ہو۔ اگر آپ کے علم میں ہو کہ مرحوم بھی کسی ڈینٹسٹ کے پاس گئے تھے تو آپ پولیس کو بتادیں۔ یا ڈینٹسٹ کو عدالت میں بُلوالیں۔ ناؤ پلیز! ہمیں جانے دیں۔"

"ایک آخری سوال سر! آخر یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی؟"

"آپ لوگ خوب ہیں" ڈاکٹر مسکرایا "جانتے بوجھتے انجان بن کے دوسرے شخص کے منہ سے کوئی ایسی بات نکلوانا چاہتے ہیں جس کی بنیاد پر کوئی سنسنی خیز سُرخی بنائی جاسکے۔ ہر روز اخباروں میں آپ لوگ ہی سب لکھ رہے ہیں کہ دوبارہ شناخت کی ضرورت کیوں اور کس کی وجہ سے پیش آئی۔ میں اس سیاسی چکر میں نہیں پڑ سکتا۔ میں اپنے پروفیشن سے HONEST ہوں اور FACTS کو ایک بار نہیں دس بار، ہزار بار PROVE کرنا پڑے تو میرا طریقِ کار... اور ہر ڈاکٹر کا طریقہ... ایک ہی ہوگا اور FINDING بھی ہمیشہ ایک ہوگی۔"

میڈیکل بورڈ کے اراکین اپنی اپنی کاروں میں روانہ ہوگئے۔ وہ دو کاروں میں آئے تھے۔ تیسری ایک ایمبولینس تھی جس میں اب شبنم کو لٹادیا گیا تھا۔ پولیس کی ایک ایک موبائل اس قافلے کے آگے پیچھے رہی۔

آپا صفیہ نے سب سے پیچھے والی گاڑی میں سوار ہونے والے ایس پی غلام محمّد سے کہا "شبنم تمہاری تحویل میں ہے۔ اس کی حفاظت کے ذمّے دار تم ہو!"

"بس اسپتال پہنچانے تک میڈم!" وہ بولا۔

"اسپتال کیوں؟ شبنم بیمار تو نہیں ہے۔ شاک سے ری کور کرے گی تو ٹھیک ہوگی۔ آپ اسے گھر پہنچادیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی سرکار!" اس نے طنزیہ تابعداری کا مظاہرہ کیا "کون ہوگا اس وقت ان کے فلیٹ پر؟"

"ہاں۔ بھائی تو ڈیوٹی پر ہوگا۔ بھابی کالج میں... خیر میں چلتی ہوں" آپا صفیہ نے کہا۔

میں اس کی سمجھ بوجھ کا قائل ہوگیا۔ وہ ایمبولینس میں سوار ہوگئی تو مجھے اطمینان ہوگیا۔ پولیس کی نام نہاد حفاظتی تحویل میں بھی سو فیصد یقین کے ساتھ تحفظ کی ضمانت بہرحال نہیں ہوتی۔

اب باقی کارروائی سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی۔ گورکن تابوت کو پھر قبر میں اُتار کے مٹی ڈال رہا تھا۔ اس کا مددگار ایک سوکھا سڑا نوجوان تھا جو شاید اس کا ولی عہد اور جانشین ہوگا۔ تیمور، شمس اور قریشی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ چمکتی دمکتی ڈیوٹی فری مرسیڈیز ماڈل 300 SE۔ تیمور نے چند ماہ قبل منگوائی تھی۔ شمس کے پاس پجیرو تھی جو ویسے تو دولت مندی کا STATUS سمبل تھی مگر تیمور کے نزدیک نو دولتیے ہونے کی علامت۔ مرسیڈیز خاندانی اور نجیب الطرفین لوگوں کی طرح ہے۔ وہ کہتا تھا... قریشی نے لینڈ کروزر امپورٹ کی تھی جو پجیرو کے مقابلے میں زیادہ مہنگی تھی مگر شمس اسے امریکن ایڈز کہہ کے اپنا دل خوش کرتا تھا۔ تینوں گاڑیوں پر جھنڈے سرنگوں تھے۔

تقریباً ایک کلومیٹر دور پارٹی کے جونیئر عہدے دار اور کارکن جمع تھے۔ وہ بہ آواز بلند نعرے لگا رہے تھے۔ زندہ باد کا ریکارڈ ختم ہوجاتا تو دوسرا ریکارڈ چل پڑتا تھا۔ ظالمو، جواب دو... خون کا حساب دو۔ ہائے ہائے... مُردہ باد۔ یہ سدا بہار نعرے ہر پارٹی استعمال کرسکتی تھی۔

صحافی خاصے مایوس تھے۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔

کسی نے کہا "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اسٹوری نہیں بنی۔"
انگریزی ہفت روزہ کی نمائندہ شمی نے کہا "یہ اس شاہ عالم کی...... نے شوشہ چھوڑا تھا" حسب عادت اس نے ایک ناقابلِ اشاعت لفظ بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا "مگر تم سب بھی تو...... ہو۔"
"ارے شمی! یہ تو بڑی زیادتی ہے' گالیاں کیوں دے رہی ہو؟"
"کام کی بات کسی نے پوچھی نہیں۔ تم سب ذہنی طور پر خصی ہوگئے ہو۔" شمی نے سنہرے سگریٹ کیس سے نازک سی سگریٹ نکال کے' پیچ کرتے ہوئے لائٹر سے جلائی اور دُھواں ایک ایسے رپورٹر کے منہ پر چھوڑا جو اس سے سخت چڑتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کینسر شمی کو نہیں' اسے ہوجائے گا۔
"کسی دن جھانپڑ ماردوں گا میں۔ تمہیں معلوم ہے نئی ریسرچ کیا ہے؟ اسموکر کے پاس بیٹھنے والے کو بھی دُھوئیں سے اتنا ہی نقصان پہنچتا ہے جتنا سگریٹ پینے والے کو۔"
"اتنا ہی نہیں۔" شمی نے پھر وہی حرکت کی "زیادہ۔ بہتر ہے تم سگریٹ پینا ہی شروع کردو۔"
"ابھی تم نے کیا بکواس کی تھی؟" ایک اور جنگلی قسم کے داڑھی والے رپورٹر نے شمی کے کندھے پر اپنا ریچھ جیسا بازو رکھ دیا۔
"لاش اتنی فریش کیوں تھی؟" شمی نے اسے سگریٹ پیش کی۔
اس نے سگریٹ لے لی "او مائی گاڈ۔ یہ تو بہت اہم سوال تھا۔"
"میں وجہ جانتی ہوں مگر لکھ نہیں سکتی" شمی نے کہا "لوگ مجھے ماریں گے۔ یہ مسئلہ جذبات کا ہے۔"
ایک اور رپورٹر نے افسوس سے سر ہلایا "اگر میڈیکل بورڈ کا کوئی ممبر اپنی رائے دیتا تو ہمارے پاس ثبوت ہوتا۔ ہم اس کی رائے شائع کردیتے۔ دو ہفتے بعد لاش اصل حالت میں۔"
"اب تو شہید کہلانے کی سند مل گئی اسے۔"
"کم آن۔ اب یہاں رُکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لیٹ اَس گو۔" شمی نے کہا اور جنگلی ریچھ کے سہارے پر چلنے لگی۔ وہ دونوں ایک ہی سگریٹ سے باری باری کش لگا رہے تھے۔ سگریٹ یقیناً ہیروئن والی تھی۔
"سُنا ہے تم HIV پازیٹو ہو" شمی نے کہا۔
"ہیں۔ میں کسی وقت بھی مر سکتا ہوں۔ بس وقت کا انتظار ہے۔ تم اسی لیے مجھ سے بھاگتی ہو۔ حالانکہ جس کی زندگی کے دن کم ہوں اسے سب کچھ دے دینا چاہیے۔"
"تمہارے لیے میں خودکشی ہرگز نہیں کرسکتی۔"
"میں خودکشی کرنے سنگاپور گیا تھا" اس نے بہادری سے کہا "کامیاب نہیں ہوا۔ گزشتہ بار سری لنکا میں کینڈی بیچ پر پہنچانے گیا تھا۔"
"چائلڈ پراسٹی ٹیوشن پر؟"
"ہاں۔ ساری دنیا سے گورے آتے ہیں۔ مجھے ایک لڑکی ملی بارہ سال کی......"
"ساری وبائیں اور عذاب گوروں سے ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ وہ ایڈز دیتے ہیں تو ایڈز کے ساتھ۔"
چند دن پہلے میں رات کے وقت مزار پر آیا تھا تو نقشہ کچھ اور تھا۔ اس وقت وہ سب لوگ غائب ہوگئے تھے۔ خود بھاگ گئے تھے یا بھگا دیے گئے تھے۔ مجاور اور مزار کے ٹھیکے دار۔ گل فروش اور کار پارکنگ والے۔ شامیانہ اپنی جگہ تھا لیکن لائٹس آف ہونے سے ویرانی کا تاثر بڑھ گیا تھا۔ آس پاس پھیلے ہوئے غیر آباد جنگل کی دوپہر میں سناٹے کا راج تھا۔ حسرت برس رہی تھی ہمارے مزار پر۔ اور نے چراغے نے گلے والی کیفیت تھی۔
پولیس اور سرکاری حکام کے جاتے ہی پارٹی کارکن نعرے لگانے آگے آئے تو نہ جانے کدھر سے مجاور بھی نمودار ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے قبر کو پھر پُرانی شکل دے دی۔ آس پاس پانی کا چھڑکاؤ ہوگیا۔ دو افراد چٹائی کا بہت بڑا ٹوکرا اٹھائے پہنچے اور انہوں نے قبر کو پھر پھولوں سے ڈھک دیا۔ مجاور نے اگربتی کے چار پیکٹ جلا کے دھوئیں سے ماتمی فضا کا VISUAL ایفیکٹ مکمل کیا۔
ایک گاڑی میں سے ایک جیسی کالی واسکٹ اور ٹوپیوں والے اترے' یہ سب قوال تھے۔ انہوں نے شامیانے کے آخری کونے میں قنات کے پاس دری بچھائی۔ ان کا لیڈر پچاس سال کا پہلوان ٹائپ شخص تھا۔ اب وہ ہارمونیم لے کر آگے بیٹھ گیا۔ دیگر شاگردوں نے اپنی اپنی پوزیشن ایک نصف دائرے میں اس کے پیچھے سنبھالی۔ اس طرح کہ چیف قوال کے دائیں ہاتھ پر طبلے والا آگیا اور بائیں جانب چھن چھن کا صوتی تاثر دینے والا دف ٹائپ چیز لے کر بیٹھ گیا۔ ایک ہارمونیم والا میں اس کے پیچھے ریں ریں کرنے لگا۔
"استاد کیا چلے گا؟" وہ منمنا کے بولا "ترے عشق نچایا......"
چیف قوال نے اپنی بیٹھی ہوئی اور پھنسی ہوئی آواز میں ڈکرا کے کہا "بے تیری اماں ناچے گی یہاں۔ چل بھئی طبلے باز' ٹھیکا لگا۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو......"
پارٹی کے سیکڑوں کارکن اور چھوٹے موٹے عہدے داران کے گرد جمع ہوگئے۔ میلہ پھر لگ گیا تھا۔ میں ابھی تک آزادانہ پھر رہا تھا۔ کسی نے بھی نہ میری موجودگی پر اعتراض کیا تھا اور نہ مجھ سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو۔ میں میلی سی چادر لپیٹے سب کو پانی پلا رہا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں جگ تھا اور دوسرے میں گلاس۔ کوئی مجھے اشارے سے یا چٹکی بجا کے متوجہ کرتا تھا تو کوئی ابے یا کچھ اور کہہ کر۔ بابو۔ اے مسٹر۔ شمی نے مجھے "ڈیڑوا ٹرمین" کہا تھا۔ اس کے جنگلی ساتھی نے ولن اسٹائل میں۔ اوئے۔ آپا صفیہ نے نرمی سے کہا "بھائی' مجھے بھی دینا پانی" اور لیڈی ڈاکٹر نے تھینکس بھی کہا تھا۔ صرف ایک لفظ' ایک جملے سے آدمی کیسے EXPOSE

ہوجاتا ہے۔ تمیز' تہذیب' تعلیم و تربیت' سوچ اور ذہنیت سب سامنے آجاتی ہے۔ ظاہری ٹھاٹ باٹ' سوٹ بوٹ۔ لمبی چوڑی ڈگری یا اپنے عہدے اور حیثیت پر غرور کے مصنوعی لبادوں کے باوجود ننگا ہوجاتا ہے۔
میں نے گلاس اور جگ قبر کے نزدیک رکھ دیا اور قوالوں کی طرف چلا گیا۔ چیف قوال اپنی مشک جیسی توند کے ساتھ بیٹھا ہوا زرت کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ دائیں بائیں' اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ اُچکتا تھا اور پھر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ گا کم رہا تھا' چیخ زیادہ رہا تھا اور بھینسے جیسی گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے جھوم رہا تھا۔ درمیان میں وہ ہارمونیم سے بھی پنگا لیتا تھا ورنہ ہارمونیم بجانے پر دوسرا شخص مامور تھا جو بین کرنے کے انداز میں سب کے ساتھ آواز ملاتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے پانچ سات مردانہ آوازوں میں ایک زنانہ آواز بھی شامل ہے۔ جسے طبلے باز کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا وہ طبلے کو بجا نہیں رہا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے بڑے انتقامی جذبے کے ساتھ طبلے کی ٹھکائی کر رہا تھا۔
اس کے باوجود مجمع فرطِ جذبات سے جھومنے لگا تھا۔ یہ پبلک پرفارمنس کا آرٹ تھا۔ الفاظ' ادائیگی' زرت اور تال۔ سب مل کے حال اور دھمال کا سماں اور ماحول پیدا کردیتے ہیں۔ قوال چیخ رہا تھا۔ "جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر۔"
اس کے پیچھے اونگھتے ہوئے چودہ سال کے زیرِ تربیت قوال نے دُہرایا "ہاں جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر۔"
قوال نے اپنی زبان نکال کے انگلی سے چھوا "زبانِ خنجر۔ اگر یہ چُپ رہے گی۔ اسے چپ کردیا جائے۔ یہ چپ ہوجانے پر مجبور ہوجائے' کوئی بے رحم قاتل اس کو چپ کردے۔" وہ سب کچھ گا رہا تھا۔ ایک ہی لے اور ایک ہی سانس میں۔ ذرا سی دیر رُک کے اس نے نعرہ لگایا "جو چپ رہے گی زبانِ خنجر۔"
پیچھے سے لڑکا منمنایا "زبانِ خنجر۔ ہاں ہاں زبانِ خنجر۔"
"تو کیا ہوگا......؟" قوال نے حاضرین سے سوال کیا اور پھر ایک دم نیپ کے بند پر آگیا "لہو پکارے گا آستیں کا۔ لہو پکارے گا آستیں کا" اس نے اور باقی سب نے چیخ چیخ کے تالیاں بجا بجا کے اور طبلے' ہارمونیم کی ایسی تیسی کرتے ہوئے اعلان کرنا شروع کردیا۔
یہ سننے والوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے والے الفاظ تھے جن سے وہ مداری کا تماشا دکھا رہا تھا۔ بے اختیار مجمع سے ایک واہ یا آہ نکلی اور بہت سے لوگ والہانہ جھومنے لگے۔ ایک لمبے لمبے بالوں والا دھوتی پوش درمیان میں آکودا اور رقص کرنے لگا۔
قوال مصرع دُہراتے رہے "جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر......"
"زبانِ خنجر۔ زبانِ خنجر۔"
چیف قوال نے خون آشام نظروں سے پلٹ کے دیکھا "خنجر۔ خنجر بول کنجر کی اولاد۔"
"جی ابا!" لڑکا چوکس ہوگیا اور پھر وہی گانے لگا۔
قوالوں پر نوٹ برس رہے تھے۔ میں نے چادر اُتاری اور اس طرف بڑھا جدھر اب چند ہی کاریں رہ گئی تھیں۔ ان میں ہری سفید عوامی کار بھی تھی جس کی ظاہری حالت بہت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن چلنے میں یہ کسی نئی گاڑی سے کم نہ تھی اور اس میں اے سی کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزیں فٹ تھیں جو کسی کار میں نہیں ہوتیں مثلاً اس میں ایک وائرلیس فون تھا جس کی رینج ڈیڑھ سو کلومیٹر تھی۔ اس کا رابطہ میرے آفس کے فون سے تھا اور اس طرح میں ڈیڑھ سو کلومیٹر کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنا فون اسی طرح استعمال کرسکتا تھا جیسے اپنے سامنے میز پر رکھے ہوئے فون کا ڈائل گھما کے۔ اس میں خفیہ ریکارڈنگ کا نظام تھا۔ ایک مائیکرو فون جیب میں ڈال کے میں تقریباً پانچ سو میٹر تک جاسکتا تھا اور کسی بھی آواز کو ٹیپ پر ریکارڈ کرسکتا تھا۔ گاڑی میں ایک ریوالور میری سیٹ کے نیچے رہتا تھا اور دوسرا پیچھے والی سیٹ کے پیچھے۔ غلط چابی دروازے کے لاک میں داخل ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ بفرضِ محال کوئی اس میں کامیاب ہوجاتا تو چابی نکال نہیں سکتا تھا اور چابی نکالے بغیر خود کار سائرن آف نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سائرن انجن کا بونٹ کھولنے سے بھی چلّانے لگتا تھا۔ ڈیش بورڈ کے نیچے ایک بٹن آن کرنے سے یہ الارم بھی آن ہوجاتا تھا۔ یہ سب حفاظتی انتظامات عام قسم کے تھے۔ ایسے برگلر الارم بہت سے لوگ گاڑی کو چوری ہونے سے بچانے کے لیے لگاتے ہیں جن کو چور بیٹھ گاڑی لے جانے سے پہلے ناکارہ کردیتے ہیں۔
میری کار کے پیچھے ایک عجیب و غریب مشین کھڑی ہوئی تھی۔



ظاہری حلیے اور چار پہیوں پر قائم کھڑکیوں والے ڈبے کو دیکھ کر میں نے تسلیم کیا کہ یہ میرے زمانہ قبل از ولادت کی قدیم اور معدوم ہو جانے والی نسل کی کار ہے۔ دنیا میں ڈائنوسار ہی نہیں گینڈے' چیتے جیسے جانور بھی تو دیکھتے دیکھتے ختم ہو رہے ہیں۔ ننھی منی کار غالباً فیٹ 600 تھی جسے لوگ صابن دانی بھی کہتے ہیں۔ اس تاریخی کار کے پاس انسانی تاریخ کا ایک اور شاہکار موجود تھا۔ پچاس ساٹھ سال کا ایک دبلا پتلا' دراز قد اور سُرخ و سفید رنگت والا شخص جس نے موٹے گول شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی شوخ پھولدار بشرٹ فٹ پاتھ کے "پانچ روپے مال" کا انتخاب تھی۔ خاکستری پتلون کو اگر دھویا جاتا تو شاید پتلون کا اصل سفید رنگ نمودار ہوتا۔ کثرتِ استعمال سے اس کے گھٹنے نکل آئے تھے۔ اس کے پیروں میں ہوائی چپل تھے۔ سر پر قراقلی ٹوپی اور ہاتھ میں بید کی وہ گول دستے والی چھڑی جو عام طور پر ضعیف لوگ سہارے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ کلین شیو تھا مگر مرحوم نواب آف کالا باغ ٹائپ کی مونچھیں اس کے چہرے پر ٹھیک سوا نو بجا رہی تھیں۔ مونچھیں گھنی نہیں تھیں' گھڑی کی سوئیوں جیسی نوک دار تھیں۔

مجھے تعجب ہوا کہ آخر وہ اس ڈبیا جیسی کار میں بیٹھتا کیسے ہوگا۔ یہ اٹلی کی مقبول ترین کار تھی اور ہے مگر پاکستان میں اب یہ ہر شہر میں ایک آدھ ہی رہ گئی ہے۔ ایسی ہی ایک گاڑی منی آسٹن تھی اور مورس مائنر تھی۔ جاپانی کاروں کی یلغار نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔

اس شخص نے مجھے دیکھتے ہی چھڑی گھمائی اور میری کار پر تین بار بجا کے کہا "اے لڑکے! تمہاری ہے یہ چیز؟"

میں رُک گیا "اور یہ چیز آپ کی ہے؟" میں نے طنزاً کہا اور اس کی کار کو لات ماری۔

اس نے چھڑی میری ٹانگوں پر ماری "بدتمیز پھر ایسی حرکت کی تو ٹانگیں توڑ دیں گے ہم۔ پہلے ہی بہت نقصان ہو گیا ہے ہمارا۔ تمہاری اس نامعقول گاڑی کی وجہ سے' دیکھو۔"

اب میں نے اپنی کار کو دیکھا تو مجھے اس کے پچھلے حصّے میں ڈینٹ نظر آیا۔ "یہ آپ نے ٹکر ماری ہے؟"

"یہ ہم سے پوچھ رہے ہو تم۔ سامنے لاکے کھڑی کر دی گاڑی۔ پڑھے لکھے ہوتے تو ایسی حرکت نہ کرتے۔"

میں نے لطف لینے کے لیے کہا "اگر گاڑی کی جگہ میں ہوتا تو کیا آپ اپنی گاڑی مجھ پر چڑھا دیتے؟"

"نامعقول' ہم کیوں چڑھاتے... گاڑی خود چڑھ جاتی تم پر۔"

"کیوں؟ بریک نہیں ہیں کیا گاڑی میں؟"

اس نے پھر آہستہ سے میرے چھڑی ماری "جاہل شخص۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟ پچیس سال سے ہم اس کار پر "ایل" لگا کے پھر رہے ہیں۔ مطلب نہیں سمجھتے اس کا؟"

"آپ پچیس سال سے لرنر ہیں۔ سیکھ رہے ہیں گاڑی چلانا۔ ابھی تک آیا نہیں؟"

"آدمی ساری عمر سیکھتا رہتا ہے۔ کیا سمجھے' مگر تم خاک سمجھو گے۔ سمجھنے والے ہوتے تو یہ بھی دیکھ لیتے۔"

میں نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے گرل کی جگہ ایک گتے پر "بریک خراب ہیں" لکھ کر لٹکا دیا گیا تھا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔

"یعنی تم ہنس رہے ہو؟ نامعقول..... تمہاری یہ گاڑی راہ میں حائل نہ ہوتی تو ہم سیدھے نکل جاتے۔ اس کی وجہ سے چلبلی رُکی' زخمی ہوئی۔"

"چلبلی.....! آپ کی صاحب زادی.....یا اہلیہ.....؟"

اس نے چھڑی زور سے زمین پر ماری "پھر بدتمیزی۔ کوئی اہل ہوتی تو اہلیہ بننے کا شرف حاصل کرتی' کیا سمجھے؟"

"مطلب یہ کہ شادی نہیں کی آپ نے...؟"

"زرض کرو ہم کر لیتے.... اور بیٹی ہوتی ہماری تو کیا وہ صاحب زادی ہوتی؟ بولو نامعقول آدمی' صاحب تو گیا واپس ولایت۔"

میں نے کہا "پھر یہ چلبلی کون ہے حضرت؟"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے پیچھے لے گیا۔ کار کے پچھلے حصّے میں انجن کے بونٹ کی جالی پر کار کا نام لکھا ہوا تھا..... "چلبلی"

"آئی سی۔ آپ نے گاڑی کا نام رکھا ہے چلبلی!"

"ہم نے..... لاحول ولا قوۃ۔ ہم بھلا کر سکتے ہیں ایسی..... بے ہودہ حرکت۔ یہ تو اس شخص نے لکھا تھا جس نے ہمیں گاڑی دی تھی۔ اس کی اب ہم کیا غیبت کریں۔ بھینس کی ہم رنگ' ہم شکل اور ہم وزن منکوحہ کا یہی نام تھا۔ اسے جہیز میں ملی تھی۔"

"جہیز میں ملی تھی!... کیا... منکوحہ یا بھینس؟"

اس نے پھر مجھے چھڑی ماری "شریر.... یہ گاڑی۔ اس نے فروخت کرتے ہوئے حلف لے لیا تھا ہم سے کہ اس کا نام نہیں بدلا جائے گا۔ اور قسم دے دی تھی ہمیں اپنی جوانی کی۔ بس ہم پابند ہو گئے' کیا سمجھے؟"

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں۔ اب یہ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"بھئی ہمیں واپس شہر جانا ہے۔ چلبلی کا مزاج کچھ برہم ہے۔ ہم اسے چھوڑ کے بھی نہیں جا سکتے اور معالج یہاں آ نہیں سکتا۔"

وہ آدمی دلچسپ تھا اور پُرانی وضع داری کا نمونہ۔ اسی لیے میں نے اس کی کسی بات کا بھی بُرا نہیں مانا "کیا میں دھکا لگاؤں؟"

"ماشاء اللہ کڑیل جوان ہو" وہ سیٹ پر بیٹھ گیا "شہر تک تو دھکا لگاؤ گے.... بسم اللہ کرو۔"

میں نے گڑبڑا کے کہا "شہر تک!... جی نہیں' چلبلی کے اسٹارٹ ہونے تک۔"

"چلبلی اسٹارٹ نہ ہو تو پھر دھکے سے بھی نہیں ہوتی' کیا سمجھے؟"

میں نے کہا "بہت کچھ سمجھ گیا' جو نہیں سمجھا وہ آپ سے سمجھ لوں گا۔ اگر یہ دھکے سے اسٹارٹ نہیں ہوتی تو پھر بتایئے میں کیا

کروں۔ میں چلتا ہوں۔"

"کہاں چلتا ہوں۔ خبردار!" انہوں نے اپنی چھڑی میرے راستے میں کسی بیریئر کی طرح حائل کر دی "یعنی تمہاری وجہ سے ہم یہاں رُکنے پر مجبور ہوئے۔"

"میری وجہ سے کیسے حضرت۔ گاڑی کیا میں نے خراب کی ہے؟"

"پھر وہی جہالت کی بات۔ اگر چلبلی کی راہ میں تمہاری یہ نازک پری حائل نہ ہوتی تو ایک بار روانہ ہو کے چلبلی شہر تک رُکنے کا نام نہ لیتی۔ صدمے سے اس کے اعضائے رئیسہ متاثر ہوئے ہیں غالباً..... راستہ صاف ملتا تو۔"

اس خبطی شخص سے بحث کرنا لاحاصل تھا "دیکھیے میں آپ کو شہر لے جا سکتا ہوں۔ وہاں سے آپ کوئی مکینک لے آئیں۔"

"اور چلبلی کو یہاں چھوڑ جائیں۔ اس ویران جنگل میں۔ جہاں اس پر نامعقول کُتّے بھونکتے رہیں... اور تم جیسے بدتمیز اس کا تمسخر اُڑاتے رہیں۔ دیکھ دیکھ کے ہنسیں۔ آخر اس کے بھی جذبات ہیں۔ تم اپنی شریکِ حیات کو چھوڑ کے جا سکتے ہو یہاں تنہا۔ فرض کرو کسی گھوڑے گدھے کی ٹکر سے اس کی ٹانگوں کے جوڑ ہل جائیں۔ ٹخنوں کے یا گھٹنوں کے بال بیرنگ خراب ہو جائیں۔"

میں ہنس پڑا "محترم۔ اوّل تو میری شریکِ حیات ہے نہیں۔ ہوئی تو وہ گاڑی نہیں عورت ہوگی۔ اور وہ اتنی قدیم چیز بھی نہیں ہوگی۔"

"واللہ از گولڈ" انہوں نے مجھے یاد دلایا۔

"آخری بات یہ کہ وہ کسی گدھے گھوڑے سے کیوں ٹکرانے گی۔ اس طرح کہ اس کے گوڈے گٹے خراب ہو جائیں۔"

"چلو مان لو کہ گدھا گھوڑا اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ دو کو تین سے ضرب دیں یا تین کو دو سے۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

"ایک اور آخری بات ایسی صورت میں۔" میں نے کہا "پھر میں واقعی اسے یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ کُتّے بھونکتے رہیں۔ ان کا کام ہے بھونکنا اور نامعقول لوگ اس کا تمسخر اُڑاتے رہیں۔ اس کے اور میرے جذبات آسانی سے مجروح نہیں ہوں گے۔ کیا سمجھے؟"

وہ یوں ہنسا کہ اس کا منہ کھل گیا اور وہ ایک دم آگے جھک گیا۔ مجھے ہلکی سی کھانسی اور چھینک سے ملتی جلتی آواز ضرور آئی تھی مگر پھر اس کے سیدھا ہونے تک کچھ سنائی نہیں دیا۔ "بھئی بڑے شریر ہو۔" اس نے سانس لے کر میرے شانے پر ہاتھ مارا "اور اتنے نامعقول بھی نہیں ہو۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

میں نے کہا "چوہدری رشید احمد چراغ کانپوری۔"

اس نے غور کرتے ہوئے یہ نام دُہرایا اور پھر "کھی" کر کے رکوع میں چلا گیا۔ یہ خاموش قہقہہ ختم ہوا تو اس نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارا "بھئی بہت خوب بنا اور بہت آسان بنا۔"

میں نے کہا "کیا بنا؟"

"تمہارا نام اور کیا..... اب اتنا لمبا نام تو آدمی چھٹی والے دن ہی لے سکتا ہے۔ مختصر کرو تو بنتا ہے کریک CRACK۔ یہی مناسب ہے۔ مسٹر کریک' کیا سمجھے؟"

میں نے جز بز ہو کے کہا "اب آپ بھی بتا دیں مجھے اپنا نام تاکہ میں کچھ بناؤں۔"

"ہاں۔ ضرور بناؤ۔ ہم ہیں وسیع' عمیق' لا انتہا دہلوی۔ لا انتہا تخلص اور وطن مالوف دہلی کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب۔ ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے۔ اب تم مخفف بنالو ہمارے نام کا بھی اور ہمیں اسی نام سے پکارو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ کیا سمجھے۔"

میں اتنی دیر میں سب سمجھ گیا تھا "وسیع عمیق لا انتہا دہلوی۔ مختصر کروں آپ کی طرح تو.... والد۔"

اس نے ایک اور قہقہے کا ایکشن دیا "بھئی اتفاق ہے۔"

میں نے کہا "جی نہیں' غلط بیانی کی ہے آپ نے۔"

اس نے عینک کے اوپر سے مجھے گھورا "اور جناب نے؟"

میں نے کہا "آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ کا نقصان پورا کروں؟ بولیے کیا پیش کروں۔ ہزار... دو ہزار... دس ہزار۔"

وہ متفکر رہا اور بولا "بس۔ میاں اتنی ہی اوقات تھی؟ صرف دس ہزار پر رُک گئے۔ خیر ہم نے معاف کیا۔ اب تم چلبلی کو اس بلبلی کے ساتھ باندھو اور ہمیں لے کے چلو ایسے..... بس جیسے... گدھے کے پیچھے گاڑی... کیا خیال ہے مسٹر کریک..."

میں نے کہا "بہت بہتر۔ ذرا ازار بند نکال دیجیے۔ والد صاحب۔"

اس نے پتلون کو پکڑ لیا "لاحول ولا قوۃ۔ یہاں اس ولایتی پجامے میں ازار بند۔"

میں نے ازار بند کے ایک لٹکتے حصّے کی طرف اشارہ کیا "پتلون کیوں پکڑلی پھر آپ نے' یہ کیا ہے؟"

"یہ... یہ تو ہم نے بیلٹ کی جگہ باندھا ہے۔ بیلٹ کہتے ہیں پٹے کو اور ہم کیا خود کو پٹا ڈال کے رکھیں۔ تم واقعی کریک ہو۔"

"گاڑی کس سے باندھیں گے آپ والد صاحب؟"

"ہم باندھیں گے؟ حد کرتے ہو تم بھی۔ ماشاء اللہ نوجوان ہو۔ بزرگوں کی خدمت کرو' محنت کرو۔"

"کوئی رسّی ہے آپ کے پاس؟" میں نے سر پکڑ کے کہا "یا تار...!"

وہ عجیب جھکّی آدمی تھا "تو... رسّی یا تار ہوتا تو ہم اب تک باندھ نہ چکے ہوتے۔ ایسے ہونقوں کی طرح کھڑے رہتے' جیسے تم کھڑے ہو۔ بھئی دنیا میں ترقی کرنی ہے برخوردار تو اپنے وسائل پیدا کرو' کیا سمجھے۔"

میں نے کہا "رسّی تو کہیں نظر نہیں آئی' یہ بجلی کا تار توڑ لاتا ہوں اس تار پر چڑھ کے۔ تھوڑی بہت بجلی ہوتی ہے اس میں۔ تقریباً تینتیس ہزار وولٹ۔ اس سے جھٹکا نہیں لگتا' آدمی کوئلہ ہو جاتا ہے۔"

انہوں نے چٹکی بجائی "تو میاں ہم نے ایک اور حل تلاش

کرلیا۔ اب تم گاڑی کے آگے نہیں پیچھے گدھا لگاؤ' ہاں.... بمپر سے بمپروں ملاؤ جیسے لب سے لب ملتے ہیں اور بس بقول شاعر تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔"

"یعنی پیچھے سے آپ کی گاڑی کو ٹکر ماروں۔ وہ تھوڑا سا آگے جائے تو پھر پیچھے سے ٹکراؤں۔ یہاں خالی سڑک پر لب سے لب ملاکے چلنا شاید آسان ہو۔ شہر کی ٹریفک میں مشکل ہوگا۔ چالان ہوجائے گا۔"

"سرعام بوس وکنار۔ چلبلی اور بلبل فحاشی کے الزام میں گرفتار۔" وہ پھر قہقہہ مار کے سیدھا ہوا مگر میرے شانے پر ہاتھ مارنے میں ناکام رہا۔ "کیا خوب سُرخی بنے گی۔ مگر خیر۔۔۔ جب تک ہم ہیں کس میں دم ہے کہ چالان کرے تمہارا۔ ایسا کالم لکھیں گے کہ بخیے اُدھیڑ دیں گے پولیس کے مسٹر کریک۔"

میں نے کہا "آپ.... بھی صحافی ہیں؟"

"بھی کا کیا سوال۔۔۔ ہم جدی پشتی' خاندانی پیدائشی' ازلی وابدی صحافی تھے اور ہیں۔ انگریز کی غلامی کا دور تھا تب بھی آزاد تھے۔ اب اس سے بدتر نظام جمہوریت ہے تب بھی آزاد ہیں۔ نام بھی آزاد ہے ہمارا مسٹر کریک۔ کچھ آیا خیال شریف میں۔"

"کون سے آزاد۔ مولانا ابوالکلام آزاد یا وہ فسانۂ آزاد والے۔"

"ہم کیا مرحوم اور آنجہانی قسم کی چیز ہیں؟ میاں ہم ہیں ابوبکر آزاد۔ مدیر اعلیٰ پرنٹر اور پبلشر روزنامہ "صدائے آزاد۔"

میں بھونچکا رہ گیا "آپ خود۔۔۔ آزاد صاحب ہیں!"

"خود کیا مطلب۔۔۔ دنیا میں ایک ہم ہی تو ابوبکر آزاد ہیں۔ ویسے مادر پدر آزاد بہتیرے پھر رہے ہیں۔" وہ خفگی سے بولے "ہم اصلی آزاد ہیں۔ نقلی سب بنتے ہیں۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ آپ کی شہرت تو بہت ہے مگر آپ نظر کبھی نہیں آتے۔"

"بھئی شیطان کی کتنی شہرت ہے' وہ نظر آتا ہے تمہیں مسٹر کریک؟" انہوں نے مجھے آنکھ ماری "اور یہاں تو حال یہ ہے کہ جو زیادہ نظر آئے وہی غائب ہوجاتا ہے' کیا سمجھے۔ اس لیے غائب رہنا ہی بہتر۔ بس آئینے میں خود کو نظر آتے رہیں کم ہے کم۔ اب انہی حضرت کو لو۔ کتنا نظر آتے تھے یہ ہر جگہ۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے لیکن میں اس موضوع پر ایک خطرناک اخبار کے خطرناک مدیر اعلیٰ سے بات کرتے ہوئے محتاط ہوگیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی تک وہ ڈراما کر رہا تھا اور اس کا مقصد مجھے باتوں میں اُلجھا کے میرے ظاہر سے باطن کا اندازہ کرنا تھا۔ وہ تصویر اُتارنے کے بہانے میرا ایکس رے ہی نہیں پوسٹ مارٹم تک کرلیتا۔ اس کی آنکھیں جو مسلسل حرکت میں رہتی تھیں۔ آدمی کے وجود میں اندر تک اُتر کے اس کے خیالات تک پڑھنے پر قادر محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے کہا "دیکھیے۔۔۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ حالانکہ یہاں کچھ ملنا مشکل ہے۔"

سڑک پر سے مسلسل کاریں گزر رہی تھیں۔ بسیں اور ٹرک گزر رہے تھے۔ میرے اشارے پر جو مدد کے لیے رُکے ان کے پاس رسّی نہیں تھی۔ بالآخر بھوسا لے جانے والی ایک بیل گاڑی والے نے میری مدد کی۔ وہ خالی گاڑی لیے واپس گاؤں جا رہا تھا۔ اس کی رسّی آزاد صاحب کو بہت مہنگی پڑی۔ اس نے پچاس روپے مانگے۔

"میاں' کیا زمانہ آگیا ہے۔ دیکھ لو دو ہاتھ کی رسّی بھی بلیک میں مل رہی ہے۔ پانچ روپے کی چیز ہے' غضب خدا کا۔"

"ارے بول لگی ہے کہ میں جاؤں؟" گاڑی والے نے بیل کو گیئر میں ڈالا۔

"بخدا انسانیت اُٹھ گئی انسانوں کی دنیا سے۔ کوئی مصیبت میں مدد کرے تو پیسہ مانگتا ہے۔ کل کو سلام کا جواب دینے والا بھی کہے گا کہ لاؤ دس روپے۔ تم پر سلامتی بھیجی ہے میں نے۔ مفت میں سلامتی مانگتے ہو؟ میاں' تمہارے پاس ہوں گے پچاس روپے؟ دراصل ہزار کا نوٹ ہے ہمارے پاس۔"

بیل گاڑی والے نے فوراً واسکٹ میں ہاتھ ڈالا "دے مجھے ہجار کا نوٹ۔ تیرے کو ساڑھے نو سو واپس کروں۔"

آزاد صاحب کی صورت دیدنی تھی۔ انہوں نے پتلون کی خفیہ جیب میں سے ہزار کا مڑا تڑا تعویذ بنا ہوا نوٹ نکالا۔ "ابے تو کیا سمجھا تھا ہم ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔ بھوسا فروش' تیرے سر میں' لباس میں اور کانوں میں ہی نہیں' دماغ میں بھی بھوسا بھر گیا ہے۔"

"تو بھی کھالے تھوڑا سا بھوسا۔ بہت بھوک لگی ہے۔ جبھی بول رہا ہے" بیل گاڑی والے نے ساڑھے نو سو واپس کرکے نوٹ کو غور سے دیکھا۔ "جعلی تو نہیں ہے نا؟"

"ابے چلا جا۔۔۔ غصہ مت دلا ہمیں۔ جعلی نوٹ چھاپنے کا دھندا کیا ہوتا ہم نے تو آج تیرے محتاج نہ ہوتے۔ کسی لینڈ کروزر میں اب تک نکل گئے ہوتے۔ بک بک کرے گا تو تیرے بیلوں کے خلاف خبر لگادیں گے کہ یہ جعلی ہیں۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ غالباً ہزار کا یہ نوٹ آزاد صاحب کے پاس کافی عرصے محفوظ رہا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ پان' سگریٹ' چائے یا کچھ بھی خریدتے ہوں گے تو عزت بھی محفوظ رہتی ہوگی اور ہزار کا نوٹ ہر بار بچ جاتا ہوگا۔ ان کی اپنی اور اخبار کی اچھی شہرت تھی مگر اپنے خصوصی کالموں اور خبروں کے دھماکوں سے ان کی مالی حالت ہمیشہ پتلی رہتی تھی۔ ان پر ازالۂ حیثیتِ عرفی' ہتکِ عزت اور توہین عدالت تک کے درجنوں مقدمات نہ جانے کہاں کہاں زیرِ سماعت تھے۔ حق گوئی و بے باکی کے باعث ان کے اخبار کو نوٹس ملتے رہتے تھے۔ ان کے خلاف سرکاری پابندیاں عائد ہوجاتی تھیں۔ کبھی اشتہارات بند ہوجاتے تھے تو کبھی اخباری کاغذ نہیں ملتا تھا۔ حکومت کے اشارے پر پریس ان کا اخبار شائع کرنے سے انکار کردیتے تھے۔ کئی بار انہیں ضمانت داخل کرنا پڑی۔ دو تین بار ان

کے اخبار کا ڈکلیریشن منسوخ ہوا جو انہوں نے عدالتِ عالیہ سے بحال کرالیا لیکن اس طرح مقدمے بازی میں ان کی سب آمدنی برابر ہوجاتی تھی۔ اخبار کی نیک نامی کے باعث وکیل انہیں بلامعاوضہ خدمات پیش کرتے تھے مگر قانون اور حکومت سے لڑنے کا خمیازہ آزاد صاحب کے ساتھ ان کے عملے' رپورٹر' کالم نگار' سب ہی کو بھگتنا پڑتا تھا لیکن آزاد صاحب اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ انہیں صحافت کو جہاد سمجھنے والے افراد کا تعاون حاصل رہتا تھا۔ آپا صفیہ انہی کے اخبار میں چیف رپورٹر تھیں اور بلامعاوضہ کام کرتی تھیں کیونکہ انہیں تنخواہ یا آمدنی کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ بڑے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی شادی بھی ایک بہت رئیس اور ذہین فلم ڈائریکٹر سے ہوئی تھی جو ایشیا اور ترقی پذیر ممالک کے مسائل پر ڈاکو مینٹری فلمیں بناتا تھا۔ شادی کے صرف ایک سال بعد وہ قتل ہوگیا۔ ان دنوں وہ پاکستان کے بوگس پیروں اور روحانی علاج کرنے والے جعلی فقیروں کے بارے میں کوئی فلم بنا رہا تھا۔ یہ کام وہ شوقیہ کرتا تھا۔ سارا سال وہ عام فلمیں بناتا تھا مگر دو چار سال میں ایک ایسی دستاویزی فلم کا مواد اکٹھا کرلیتا تھا جو متنازعہ بھی ہوتی تھی اور موضوع کے اعتبار سے خطرناک بھی۔ اس نے یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ تفرقہ پھیلانے والے دینی مدارس کے طلبا اور ان کی غیر نصابی سرگرمیوں پر مواد اکٹھا کرے گا۔ اسی زمانے میں صفیہ کے ہاتھ ایک خاندانی دشمنی کے مسئلے پر ہونے والے آٹھ افراد کے قتل کی اصل اسٹوری لگی تھی جس سے ثابت ہوسکتا تھا کہ یہ سیاسی قتل تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ قاتل کسے مارنا چاہتے تھے اور کون تھے۔ انہوں نے رات کو بیڈ روم میں گھس کے گولیاں برسائیں۔ یہ بدقسمتی کی انتہا تھی یا خوش قسمتی کہ سب ہی گولیاں اس کے شوہر کو لگیں۔ صفیہ کو لگنے والی گولیاں صرف اس کے جسم پر خراشیں ڈالتی گزر گئیں۔ ایک گولی اس کی پنڈلی کے گوشت میں سے گزری اور ایک بازو کے گوشت میں سے۔ صفیہ کے یہ زخم بھی اب مندمل ہوچکے تھے مگر دل کے گھاؤ باقی تھے۔ مشہور یہ تھا کہ شوہر نے مرتے مرتے صفیہ کو اپنی قسم دے دی تھی کہ بعد میں وہ کچھ نہیں کرے گی۔ اس نے کہا تھا کہ میرے بعد تم کو زندہ رہنا ہے۔ اس کی فلم اور صفیہ کی اسٹوری۔ دونوں ختم ہوگئی تھیں۔ صفیہ کو شوہر کی ساری دولت مل گئی تھی لیکن وہ فلمی دنیا سے بھی الگ ہوگئی حالانکہ اسے سب کا تعاون حاصل تھا۔ ڈائریکٹر اور ڈسٹری بیوٹر سے لے کر فلم اسٹارز تک۔ اس نے صحافت بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ صرف اپنے ہونے والے بچے کے لیے جینا چاہتی تھی مگر اس کے بعد وہ بچہ بھی ضائع ہوگیا تو صفیہ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ وہ ذہنی اور نفسیاتی مریضہ ہوگئی تھی۔ کئی سال بعد اسے گھر کی قید سے نکال کے پھر کوچۂ صحافت میں لانے کی ذمے دار شبنم تھی۔ شبنم کا وجود متحرک توانائی اور عزم و ہمت کا جوالا مکھی تھا۔ وہ ایک زبردست بیٹری چارجر یا جنریٹر تھی جس نے صفیہ کی مُردہ روح میں پھر جان ڈالی اور برسوں سے کھڑی ہوئی گاڑی کو پھر اسٹارٹ کردیا۔ اب صفیہ کو شبنم اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھتی تھی اور صفیہ کا گھر ہی شبنم کا اصل ٹھکانا تھا۔ "صدائے آزاد" کے لیے پہلے شبنم ہی رپورٹنگ کررہی تھی پھر اس نے اپنی جگہ صفیہ کو دلوادی اور خود فری لانسر بن گئی۔

آزاد صاحب کی گاڑی کو ان کے خاندانی میکنک کے اسپتال میں داخل کرانے کے بعد مجھے ان کو اخبار کے دفتر بھی لے جانا پڑا۔ نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ آزاد صاحب کی نظریں مجھ پر شک وشبے کے ساتھ پڑری ہیں۔ جب ان کے ذہن میں کوئی سوال اٹھتا تھا تو وہ میری طرف دیکھتے تھے اور ایسے دیکھتے تھے جیسے جواب انہوں نے میرے ذہن میں دیکھ لیا ہے۔

میں نے ظاہری لاتعلقی کے ساتھ ان سے سوال کیا "آزاد صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے اس معاملے میں؟"

انہوں نے سوچ کے کہا "میاں کل سے ہچکیاں آرہی تھیں۔ ہمیں نہیں' نامعقول چلبلی کو۔ غالباً پٹرول رک رہا ہے۔"

میں نے کہا "جناب۔ میں شاہ عالم کی بات کر رہا تھا۔"

"اچھا اچھا۔" انہوں نے سر ہلایا "کیا ہوا اسے؟"

"یہ جو اس کی موت کے بارے میں یا شہادت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں؟"

"ہاں۔ پتہ شکوک تو ہیں مگر کس نے پیدا کیے ہیں.... تمہیں نہیں معلوم؟"

"مجھے معلوم ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا" میں نے چڑ کے کہا۔

"ہنس دیے" وہ باہر دیکھتے ہوئے بولے "ہمیں بھی نہیں معلوم۔ دراصل ہم اب کسی چکر میں نہیں پڑتے۔ وہ دو ہے نا اپنی بزرجمہر.... صفیہ' اسے پتا ہوگا ضرور۔ تم اس سے پوچھنا۔ وہی جاتی ہے اب ہر جگہ۔ ہم تو میاں ہوگئے پُرانے وقتوں کے ڈگے' نئے زمانے کے چکر بازی سمجھ میں نہیں آتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ جواب گول کرگیا "پھر آج آپ کیسے تشریف لے آئے تھے؟"

انہوں نے ہلکی سی "ہکی" کے ساتھ کہا "بھئی تشریف ہے کہاں ہمارے پاس جو لاتے۔ کیا سمجھے' بس آگئے تھے۔ ہم نے کہا کہ یہ تماشا بقلم خود دیکھیں گے۔"

"پھر دیکھا آپ نے شاہ عالم کو؟"

"بالکل دیکھا۔ پہلے بھی دیکھا تھا' آج بھی دیکھا۔"

"کیا فرق محسوس ہوا آپ کو؟" میں نے کہا۔

"ہو میاں۔ کوئی معمولی فرق تھا' بہت واضح فرق تھا" انہوں نے کہا۔

"یعنی آپ کے خیال میں وہ شاہ عالم نہیں تھا؟"

"کیا؟" وہ تقریباً اچھل پڑے "شاہ عالم نہیں تھا وہ؟"

"آپ ہی تو فرما رہے ہیں کہ فرق بہت واضح تھا۔"
"وہ تو تھا۔ پہلے وہ زندہ تھا' آج اس کی لاش دیکھی۔ زندہ' مُردہ میں فرق تو بہت واضح نظر آتا ہے۔ تمہیں محسوس نہیں ہوا؟"
میں نے دل ہی دل میں اس عیار اور چالاک ایکٹر کو گالی بھی دی اور داد بھی "آپ کے خیال میں وہ لاش شاہ عالم کی تھی یا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے؟"
"میاں تھی تو ہمیں کیا اور نہیں تھی تو بھی کیا۔۔۔" وہ پہلو بدل کے بولے "ہم اس دنیا میں کل بھی خوش تھے' آج بھی خوش ہیں۔ اور باقی فیصلہ کرے گی عدالت۔ ہاں یہ آگیا ہمارا دفتر۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے؟ چائے یا کافی۔ کوک یا لسّی' چرس یا ہیروئن۔ تکلف کوئی نہیں۔ اگر اس کا شوق ہے۔۔۔ انگور کی بیٹی کا۔۔۔"
میں نے کہا "جی بہت شکریہ۔ ایسے شوق نہیں ہیں میرے۔ ہوتے تو کیا آپ سب فراہم کر دیتے؟"
"کیوں نہیں۔ بس ایک فون کرتے اور ہر چیز حاضر۔ اچھا کچھ کھاؤ گے؟ دال روٹی' بریانی قورمہ۔ ہمارا سر تو بہت کھا لیا۔"
میں نے کہا "وہ ساڑھے نو سو مجھے دے دیں۔ یہ ہزار کا نوٹ رکھ لیں۔ مجھے کھڑا چاہیے۔"
انہوں نے نیا نوٹ غور سے دیکھا اور تہ کر کے جیب میں رکھ لیا "جعلی تو نہیں ہے نا۔ ہے تو بتا دو' ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"
"اصلی نقلی سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ سنبھال کے رکھیں۔ چلے گا کافی عرصے" میں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔
"ارے میاں شا۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہ زادے۔ اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔"
مگر میں نے اس کی نہیں سُنی۔ میں وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ افسوس ناک حد تک بے وقوف نظر آنے والا مگر خطرناک حد تک ذہین اور فتین مخص قہقہہ مار کے کہے "میاں وہ تو ہم بس ایسے ہی پوچھ رہے تھے ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم کون ہو اور کون کون ہے؟ کیا سمجھے؟"

○☆○

میں چوروں کی طرح اندر پہنچا۔ ستار کے تاروں سے نکلنے والے سُر فضا میں یوں بکھر رہے تھے جیسے رات کی رانی کی خوشبو ہوا میں پھیلتی ہے یا چودھویں شب کے چاند کی کرنیں گہرے متلاطم سمندر کی سطح پر رقص کرتی ہیں۔
دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس سے چند فٹ کے فاصلے پر دوزانو ہو کے بیٹھ گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ اس نے سفید ریشمی قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ قمیص اس کے بے حد متناسب اور نسوانیت و نزاکت کے شاہکار بدن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ بے خودی میں اس کا جارجٹ کا دوپٹہ پھسل کے نیچے گر گیا تھا۔ ستار اس کے بائیں کندھے پر تھا اور اس کی پتلی نازک اور چمکدار انگلیاں اس کے تاروں پر رقص کناں تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے کالے بال اس کے چہرے کے گرد' شانوں پر اور کمر پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے میک اپ سے عاری تھا۔ اس کے باوجود لگتا تھا کہ اس نے عارض پر غازے کے ساتھ گلابی جھلک دینے والا بلش آن بھی استعمال کیا ہوگا۔ حیا کی سُرخی کا مصنوعی اندازِ حُسن۔ چندا کی جلد کے شفاف مرمریں رنگ میں یہ سُرخی صحت مند خون کا نتیجہ تھی۔
وہ الاپ سے آگے نکل کے بلمپت تک آگئی تھی۔ میں حُسن اور موسیقی کے سحر میں بے خود بیٹھا رہا۔ دس منٹ بعد اس نے "درپت" کی لے پکڑی تو میں نے آنکھیں بند کر کے مری اور کاغان کے سرسبز کوہساروں پر برستی پھوار کا اور وادیوں میں اٹھکیلیاں کرتے گنگناتے شفاف پانی کے چشموں کا اور بلند و بالا درختوں سے پھوٹتی خوشبو کا اور ہوا کے خنک' فرحت بخش جھونکوں کا تصور کیا۔ نشیب کی ڈھلوانوں پر کھلے پھولوں کے رنگ کا اور ہر سمت بچھے سبز فرش پر اُترتی شبنم کی ٹھنڈک کا تصور کیا جو ننگے پیروں کے مس سے پورے جسم میں سکون کا احساس بن کے پھیل جاتی ہے۔
پھر نغمہ ساز ختم ہوگیا۔ پہاڑوں پر بارش تھم گئی۔ گنگناتے پانی کے چشموں کی روانی تھم گئی۔
میں نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس نے دوپٹہ گلے میں ڈال لیا تھا۔
"ایکٹنگ اچھی کر لیتے ہو' بدذوق آدمی۔"
میں نے احتجاج کیا "تمہیں کیا معلوم۔ جب تم ستار بجاتی ہو تو میری روح کو کتنا قرار ملتا ہے۔ میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ اپنا غم' تیرا غم' جہاں کا غم۔۔۔۔ یہ تم کیا بجا رہی تھیں۔۔۔ سدا سہاگن بھیرویں؟"
"یہ ستار ماروں گی تمہارے سر پر۔ ابھی تک درباری اور بھیرویں کے سُروں کا فرق پتا نہیں۔"
میں نے سُر کھجا کے کہا "دراصل۔۔ تمہاری صورت سامنے ہو تو ساتوں سُر گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اگر میں طبلہ بجانا سیکھ لوں تو تمہارے ساتھ سنگت کرتے ہوئے میرا دھیان کسی اور طرف نہیں ہوگا۔"
"تم صرف دنگل میں ڈھول بجا سکتے ہو۔ جہاں موٹے ڈھول جیسے لٹکتے پیٹ والے پہلوان لڑ رہے ہوں۔"
"کیوں؟ طبلہ بجانا کیا بہت مشکل کام ہے؟"
"طبلے کو تم کیا سمجھتے ہو آخر؟ ایک ہاتھ اس پر مارا اور دوسرا اس پر۔ طبلہ نوازی ہے خالص MATHS۔"
"ناچیز کے آباؤ اجداد میں سات پشتوں تک اس کم بخت حساب نے ہمیشہ بیٹیوں کے سامنے رُسوا کیا۔ جمع تفریق سے آگے کوئی نہ گیا اور اس میں بھی گڑبڑ ہو جاتی تھی جب ہم سمجھتے تھے کہ دو اور دو چار۔ ساہوکار کہتے تھے ساڑھے چار اور عدالت میں تو پانچ ثابت کر دیتے تھے' جائیداد کی قرقی کے وقت۔ تم ٹھیک فرماتی ہو' میں

طبلہ نہیں بجا سکتا۔ میرا اپنا طبلہ بج جائے گا۔"
"مگر ایک چیز بجا سکتے ہو تم۔ دل چھوٹا مت کرو" اس نے چٹکی بجائی۔
"وہ کیا ہے؟"
"ٹیپ ریکارڈر۔" وہ ہنس کے اور بل کھا کے اٹھی "کل سے کہاں غائب تھے؟ خانِ اعظم کے سامنے ذرا تیاری سے جانا گھبرانا نہیں۔"
میں نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "اب اتنے ڈرپوک بھی نہیں ہیں ہم۔ وہ کیا ببر شیر ہیں' کھا جائیں گے ہمیں۔ بھئی زیادہ سے زیادہ ایک لیکچر پلائیں گے نا۔ وہ ہم پی لیں گے جیسے چائے پیتے ہیں تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی۔ دل پر جبر کرکے۔۔۔ اور صبر کرکے۔۔۔"
"یہ بات ہے" وہ پھر بیٹھ گئی "اب جاؤ' کسی ہوٹل سے چائے پی لو۔ میں تو اٹھی تھی تمہارے لیے چائے بنانے۔"
میں نے فوراً ہتھیار ڈال دینا مناسب سمجھا "اُفوہ۔ تم بھی حد کرتی ہو چندا۔ مذاق کا بُرا مان جاتی ہو۔ اب میں تم سے مذاق نہیں کروں گا تو کیا اپنی ساس سے کروں گا۔"
"ساس بھی ہے تمہاری۔۔۔ کسی دن ملواؤ نا۔"
میں نے سوچ کے کہا "ملوانا ذرا مشکل ہے۔ ویسے تو دیکھو نا اس شہر میں خوب صورت لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ ایسی کہ لگتا ہے کوہِ قاف سے کوئی اسپیشل چارٹرڈ فلائٹ آئی ہوگی جس نے یہاں لینڈ کیا۔ ان سب کی ماؤں کے درمیان بڑا سخت مقابلہ ہے۔"
"مقابلہ کیسا۔؟"
"بھئی سب میری ساس کے عہدے پر فائز ہونا چاہتی ہیں۔ یہ کوئی آسان کام ہے؟ ایسے سب کے نصیب کہاں۔ بقول شاعر۔ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔"
"مگر تم نے تو فیصلہ۔۔۔ کرلیا ہوگا؟"
"اللہ تمہارا بھلا کرے یعنی بیاہ کرے" میں نے کہا "آج کل تقرری ہوتی ہے سفارش پر۔ یہ مقابلے کے امتحان اور انٹرویو سب ایسے ہی مداری کے کھیل ہوتے ہیں۔ تو یہ ناچیز بھی ساس کا اپائنٹمنٹ بہت پہلے کرچکا۔"
"اچھا پھر کب ملوا رہے ہو؟"
میں نے سوچ کے کہا "یہ ذرا مشکل اور خطرناک عمل ہے۔ ابھی سیکھ رہا ہوں میں روحوں کو عالم بالا سے بلوانا۔ ایک بار غلطی ہوگئی تھی تو آگئی ایک پنجابی فلموں کے ولن کی ساس' گنڈاسا لہراتی۔ ایک بار تو حد ہی ہوگئی' میری ساس کی بھی ساس آگئی۔ توبہ توبہ۔۔۔ پنجے جھاڑ کے میرے پیچھے پڑگئی کہ تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے' بڑی خوفناک اور ظالم روح تھی۔ کہنے لگی کہ تمہارا تو خون پی جاؤں گی میں اگر تم نے ابھی اور اسی وقت جواب نہ دیا۔ سفارش بھی خود ہی کراتے ہو۔"
چندا ہنسنے لگی "پھر تم نے کہہ دیا ہوگا کہ نانی جی' میں تو آج ہی کرلوں اگر میرے اختیار میں ہو مگر مشکل یہ ہے کہ لڑکی نہیں مانتی۔"
"رائٹ۔ بالکل یہی کہا تھا میں نے۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"تم نے بتایا ہوگا کہ لڑکی کیا کہتی ہے۔۔۔ وہ کہتی ہے کہ کبھی اپنی منحوس شکل دیکھی ہے آئینے میں۔"
"نہیں۔ ایسا تو نہیں کہتی وہ۔"
"یہ کہتی ہے کہ پہلے یہ سب ہیرا پھیری' چکربازی اور بدمعاشی چھوڑ دو۔ انسان کے بچے بن جاؤ' پھر سوچوں گی۔"
میں نے سر کھجا کے کہا "ہاں۔ ایسا تو کہتی ہے کبھی کبھی۔ غالباً۔۔۔ اور میرے دل سے۔۔۔"
وہ کھڑی ہوگئی "اب میں یہ بات بابا کو بتاتی ہوں۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔"
میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ کوئی خانِ اعظم کو بتانے والی بات ہے چندا۔ تم پاگل ہوگئی ہو۔"
"بابا کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ہونہار شاگرد نے ایک اور کمال حاصل کرلیا ہے۔ عملِ حاضرات سیکھ لیا ہے۔ ویسے بھی وہ اپنی ساس کو بہت یاد کرتے ہیں۔ تم ملوا دوگے ان کی روح سے تو کتنے خوش ہوں گے۔"
چائے پینے کے بعد میں کرنل خان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ خفا ہوں گے۔ دو دن سے میں نے انھیں اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ حسبِ توقع وہ مجھے لائبریری میں ملے۔ ٹیبل پر ان کے سامنے بہت سی ڈراؤنی اور بھیانک موضوعات والی ضخیم کتابیں پڑی تھیں اور ایک کتاب کا وہ مطالعہ کررہے تھے جو کسی عمرانی علوم کے ابنِ بطوطہ نے بلاوجہ لکھی تھی مگر دنیا میں خانِ اعظم جیسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ زندگی اتنی مختصر ہے کہ اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جاسکتا چنانچہ وہ ہر لمحے کا استعمال کچھ سیکھنے میں کرتے تھے اور زندگی کی آخری سانس تک کچھ کرنے یا سیکھنے کے عمل کو یوں جاری رکھتے تھے جیسے ابھی انھیں دو چار سو سال تک تو دنیا کو صراطِ مستقیم پر اور فلاح کے راستے پر چلانا ہی ہے اور گھر' خاندان یا معاشرے اور ملک کے نظام کی ساری خرابیاں دور کرکے جنتِ ارضی کے خواب کو حقیقت میں ڈھالنا ان کا مقصدِ حیات تھا جس کو حاصل کیے بغیر ان کے کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نہ سیر تفریح کے لیے کاغان' نہ پیسہ کمانے کے لیے ہانگ کانگ' دبئی اور نہ سفرِ آخرت پر۔ فرشتۂ اجل خود ہی لوٹ جائے گا کہ بندہ مصروف ہے ابھی "کارِ جہاں دراز ہے۔۔۔"
خان جی نے چشمہ اتار کے رکھتے ہوئے کہا "آؤ جی' شاہ جی!"
اس اندازِ تخاطب سے میں خوب واقف تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ناخوش ہیں۔ میں نے کتاب اٹھا کے اس کا نام پڑھا اکیسویں صدی کے معاشی' معاشرتی وسائل کا معروضی

جائزہ' "اُف۔ آخر کیوں پڑھتے ہیں آپ ایسی کتابیں جن کے بارے میں خود مصنف بھی کنفیوژن میں مبتلا ہوتا ہے۔ سب مفروضات کی بات ہے۔ اگر ویسا نہ ہوا جیسا فاضل مصنف کا خیال ہے تو اس سے کون پوچھے گا کہ اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"
خان جی مسکرائے "تم پوچھ لینا۔"
میں نے مایوسی سے کہا "مجھے تو وہ قائل کرلے گا کہ غلطی نظریات کی نہیں' اس دنیا کی تھی۔ ایسی کتابوں سے لکھنے والے کو فائدہ ہوتا ہے' پڑھنے والوں کو نہیں۔"
"پھر میں کیا پڑھوں؟ قصۂ یوسف زلیخا؟"
"آپ جائیں' دنیا دیکھیں۔۔۔ لائف کو انجوائے کریں۔"
"لائف کو میں تم سے زیادہ انجوائے کررہا ہوں۔۔۔ اور دنیا کو بھی دیکھ رہا ہوں' تم کیا کررہے ہو؟"
میں نے سوچ کے کہا "میں جھک مار رہا ہوں۔"
"پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ؟ کسی مقصد کو سامنے رکھ کے؟"
"آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں۔۔۔"
"دنیا کا لغو ترین کام۔۔۔ جو دنیا کا فضول ترین شخص کرتا ہے' وہ بھی بے مقصد نہیں ہوتا۔"
"مثلاً ہیروئن استعمال کرنا' زہر یا زہروالی۔۔۔؟"
"اس کا مقصد ہوتا ہے حصولِ لذت و مسرت' خود فراموشی' خود فریبی۔۔۔ تو اب یہ بتاؤ شاہ جی کہ آج جھک مار کے کیا ملا؟"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تصدیق ہوگئی کہ میری ہلاکت یا شہادت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔"
"ابھی سے تصدیق کیسے ہوگئی؟ کیا ہے ان کے پاس جس سے وہ کچھ ثابت کریں' وہ فنگر پرنٹس پیش کرسکتے تھے؟"
"مگر فنگر پرنٹس تو ہیں نہیں" میں نے فکرمندی سے کہا۔
"وہ DENTURE یا D.N.A ٹیسٹ کا چکر چلائیں گے۔"
"یہ چکر کیسے چلا سکتے ہیں وہ؟" میں نے میز پر مُکا مارا "مجھے دنیا میں کبھی کسی دندان ساز کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔"
خان جی نے مجھے یاد دلایا "جب تمہارے سامنے والے دو دانت ہل گئے تھے اور گرنے والے تھے تو کیا تم کسی موچی کے پاس گئے تھے اور جب تمہاری عقل داڑھ میں CAVITY بن گئی تھی تو کیا راج مستری نے بھری تھی؟"
میں نے کہا "وہ۔۔۔ دراصل میرا مطلب تھا کہ ایکس رے کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ پوری بتیسی کا اور یہ سراسر غلط بیانی اور اشتعال انگیزی ہے کہ کیڑا میری عقل داڑھ میں لگا تھا۔"
"وہ ایک D.N.A رپورٹ حاصل کرلیں گے امریکا یا لندن سے۔ ویسی ہی دوسری رپورٹ تمہاری فائل میں پہلے سے موجود ہوگی۔"
"مگر میرا D.N.A ٹیسٹ کبھی نہیں ہوا۔"
"وہ ایک ہی رپورٹ کی دو کاپیاں ہوں گی۔ ایک پر سال دو سال پہلے کی تاریخ ڈالی جائے گی' دوسری رپورٹ اس سے مل جائے گی تو پھر تم خود ہی مانو گے کہ فوت ہونے والے تم تھے۔"
"خان جی۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"
"سرکاری اداروں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ عام لوگ جب ڈگریاں اور کرنسی نوٹ چھاپ لیتے ہوں اور جعلی پاسپورٹ' ویزا سب بنا لیتے ہوں تو پھر یہ کام کیا مشکل ہے۔ تین چار سال پہلے تم شکاگو میں تھے' وہاں سے ایک خبر آئی تھی۔"
مجھے سخت شرمندگی ہوئی "آپ جانتے ہیں خان جی۔ وہ جھوٹی خبر تھی' مجھے بدنام کرنے کی سازش تھی۔"
"ہاں۔ لیکن اس کیس میں تمہارا D.N.A ٹیسٹ ہوا تھا اور اس سیلز گرل کا بھی۔۔۔"
"یہ تو ٹھیک ہے۔"
"اب اسی کیس کے حوالے سے کوئی رپورٹ لائی جائے اور کہا جائے کہ یہ وہی رپورٹ ہے اور نئی رپورٹ بھی اس کے مطابق ہے۔۔۔ اسپتال کے ریکارڈ میں بھی اصل کی جگہ یہ نئی رپورٹ لگا دی جائے تو جھگڑا ختم ہوجائے گا۔ کون چیلنج کرسکے گا اسے؟"
"گویا مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ میں ہی اپنے مزار میں مدفون ہوں؟"
خان جی مسکرائے "اور پھر کون ہے وہ؟"
خانِ اعظم کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ چار سال پہلے شکاگو فیسٹیول میں مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا اور مجھے وہاں پاکستان کے غیر سرکاری مندوب کی حیثیت حاصل تھی۔ میں نے موقع کی مناسبت سے بڑی جذباتی تقریر لکھی تھی اور یاد کرلی تھی۔ شکاگو کے مزدوروں پر فائرنگ ہوئی تھی تو آج ساری دنیا مئی ڈے مناتی ہے۔ یکم مئی کو چھٹی ہوتی ہے اور ساری دنیا کے محنت کشوں کے اجتماعات ہوتے ہیں اور آجرانہ استبداد کے خلاف جلسے منعقد کیے جاتے ہیں مگر پاکستان میں مزدور کی زندگی میں نہ جانے کتنے مئی ڈے آتے ہیں۔ ان کے لہو کا ایندھن کارخانوں کی چمنی سے دُھواں بن کے ناانصافی کے آسمان پر پھیل جاتا ہے۔ ان کے خون سے توانائی پانے والی مشینوں کے منافع سے سرمایہ دار کے محلوں میں فانوس جگمگاتے ہیں مگر خود اس کے نصیب کی سیاہی سے مزدور کے خانۂ ویراں میں تاریکی رہتی ہے۔ اس کی حسرتوں کا قتلِ عام ہوتا ہے۔ ارمانوں کا خون ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔
میں ایک دن پہلے ہی شکاگو پہنچ گیا تھا۔ تیرہ گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ ائیرپورٹ میں نے سوکر گزاری کیونکہ طویل سفر نے مجھے بہت تھکا دیا تھا۔ میں فلائٹ کے دوران میں سونا چاہوں تب بھی نہیں سوسکتا۔ اپنے

ہوٹل کے کمرے کے دروازے پر میں نے "ڈونٹ ڈسٹرب" کا پلاسٹک سائن لٹکا دیا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو شام بھی رخصت ہو رہی تھی اور اندھیرا غالب آنے لگا تھا۔ ہوٹل کی سترہویں منزل سے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے میں نے بلند و بالا عمارتوں اور لاتعداد روشنیوں کا نظارہ کیا پھر غسل کر کے لباس بدلا اور روم سروس کو آرڈر دیا کہ کافی میرے کمرے میں پہنچادی جائے۔

کافی لانے والے ویٹر نے مجھے مطلع کیا "ایک لڑکی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

"کہاں؟" میں نے کہا "اور کب سے....؟"

"ایک گھنٹے سے۔ وہ باہر دروازے کے سامنے کھڑی ہے۔"

"باہر کھڑی ہے؟ وہ نیچے جا کے ویٹنگ لاؤنج میں بھی بیٹھ سکتی تھی" میں نے کہا۔

"لاؤنج تو یہاں بھی ہے۔ سترہویں فلور پر۔ لیکن اس نے خود ہی یہاں کھڑے رہنے کو ترجیح دی۔"

"کون ہے یہ لڑکی؟"

ویٹر نے نفی میں سر ہلایا "میں نہیں جانتا مگر ہے فضول سی شکل و صورت کی.... اور تمہاری ہم وطن انڈین لگتی ہے۔"

"یہ بات یاد رکھو کہ میں پاکستانی ہوں' انڈین میرے ہم وطن نہیں ہوتے۔ جاؤ اسے اندر بھیجو... ٹھہرو' میں خود بلاتا ہوں اسے۔"

میں نے دروازہ کھول کے دیکھا تو وہ ہاتھ میں بال پوائنٹ لیے نوٹ بک میں کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے کاریڈور میں مقابل کی دیوار کا یوں سہارا لیا تھا کہ اس کا ایک پاؤں دیوار پر تھا اور ایک فرش پر۔ ویٹر کی نظر میں فتور تھا۔ وہ خاصی حسین و جمیل لڑکی تھی اور اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟" میں نے کہا۔

"یس سر!" وہ سیدھی ہو گئی "اگر تھوڑا سا وقت ہو آپ کے پاس.... میرا نام کرن پرویز ہے۔"

"اندر آیئے مس کرن!" میں نے کہا "مجھے ابھی معلوم ہوا کہ آپ ایک گھنٹے سے یہاں کھڑی ہیں۔"

"جی۔" وہ اندر آ کے بولی "میرا آپ سے ملنا بہت ضروری تھا۔"

"مجھے ملنے سے انکار نہیں' آپ نے دستک کیوں نہیں دی؟"

"یہ بورڈ... جو باہر لٹکا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "پھر آپ کو بیٹھ جانا چاہیے تھا لاؤنج میں۔"

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ نکل نہ جائیں۔ لاؤنج میں اور لوگ بھی ہوں گے۔ میری توجہ ادھر ادھر ہو جاتی۔"

"اوکے۔ پلیز بیٹھیے اور بتایئے آپ کیا پئیں گی؟"

"جو آپ پی رہے ہیں یا پلادیں گے؟" اس نے بڑی ادا سے دلبری سے کہا۔

"اب اپنا مسئلہ بیان کیجیے" میں نے کہا "مختصراً... مجھے آٹھ بجے کسی کے ساتھ ڈنر کرنا ہے۔"

وہ بجھ سی گئی "پھر تو.... وقت ہی نہیں ہے۔"

"کچھ پتا تو چلے کہ بات کیا ہے؟"

وہ بولی "مجھے تھوڑی سی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ پاکستان کے لیبر پرابلم' محنت کشوں کو استحصال سے محفوظ رکھنے والے قوانین اور نظامِ انصاف پر مجھے کچھ مواد چاہیے۔ لیبر کورٹس' اپیلٹ کورٹ' ان کے اہم فیصلے جو صنعتی تعلقات میں تبدیلی کا سبب بنے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "مس کرن۔ آپ کوئی کتاب لکھ رہی ہیں اگر... تو یہ ارادہ چھوڑ دیں۔"

"میں تھیسس لکھ رہی ہوں' ڈگری کے لیے۔"

"پھر ٹھیک ہے" میں نے کہا "اس میں آپ جو چاہیں لکھیں ورنہ ہمارے ملک میں تمام قوانین صرف کتابی ہیں۔ لیبر یونین' مزدوروں کے حقوق' صنعتی تعلقات کا قومی کمیشن.... یہ سب ڈرامے ہیں۔ جب ملک کے پہلے وزیرِاعظم کا قتل وہاں کی سیاست پر اثرانداز نہیں ہوتا اور کوئی عدالت اس قتل کے کیس میں آج تک کسی کو قاتل قرار نہیں دے سکی تو پھر یہ لیبر کورٹس کے فیصلے مزدور' آجر کے تعلقات کو کیسے متاثر کرسکتے ہیں؟ مزدور کا حق ایک نعرہ ہے اور بس۔ لیکن میں آپ کو بنیادی معلومات فراہم کردوں گا۔ میں انڈسٹریل ریلیشنز پر ہمارے عدالتی نظام کو سمجھنے میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں لیکن آپ کو لیبر لاز کا مطالعہ بہرحال کرنا پڑے گا۔ اعداد و شمار اس وقت میرے پاس نہیں ہیں اور نہ اہم مقدمات کی تفصیلات۔ یہ میں آپ کو فراہم کرسکتا ہوں' پاکستان جانے کے بعد۔"

وہ بڑی مایوس ہوئی "چلیے جتنا آپ جانتے ہیں وہ بتادیں۔"

میں نے کہا "اس کے لیے آپ.... کل۔ مگر کل وقت کہاں ہے میرے پاس۔ آج رات بہت مصروفیت بھی ہے۔ گیارہ بارہ بجے فراغت ہوگی۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اگر میں بارہ بجے آجاؤں؟"

میں حیرانی سے بولا "آجایئے۔"

وہ رات بارہ بجے آئی تو میں اسے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ شام کو اس کا لباس شلوار قمیص اور دوپٹے پر مشتمل تھا۔ انتہائی شریفانہ اور پاکستانی۔ اس نے بال بھی ہیئر بینڈ سے پیچھے کر رکھے تھے اور اس کے چہرے پر واجبی سا میک اپ تھا۔ اب اس نے کھلے گریبان والے بلاؤز منی اسکرٹ اور شوخ میک اپ کے ساتھ اپنا ہیئر اسٹائل بھی اپنا رکھا تھا کہ وہ میرے اعصاب پر بجلی بن کے گری۔ وہ آئی بھی اسی ارادے سے تھی۔ نوٹ لینے کا محض بہانہ تھا۔

میری چھٹی حس مجھے کسی نامعلوم خطرے سے خبردار کرتی رہ گئی۔

صبح جب روم سروس کا ویٹر بیڈ ٹی لے کر آیا تو وہ مجھ پر چلّانے لگی "یو بروٹ۔ دیکھو یہ تم نے کیا حال کیا ہے میرا۔"

میں نے گھبرا کے ویٹر کو اور پھر اس کے جسم پر پڑی ہوئی خراشوں کو اور دیگر قابلِ اعتراض نشانات کو دیکھا "مس کرن پرویز۔ پلیز"

"کیا تم سمجھتے ہو میں تم کو چھوڑ دوں گی۔ تم بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیے ہو۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ میرے ساتھ زبردستی کی۔ ویٹر تم دیکھ رہے ہو نا۔ یہ سب۔ جاؤ منیجر کو بلاؤ۔ ہوٹل کے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ پولیس کو بلاؤ۔ جاؤ" اس نے چیخ کے کہا۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "تو کی بچی فاحشہ۔ میرے ساتھ یہ ڈراما نہیں چلے گا۔ تو مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔"

اس نے ایک دلخراش چیخ ماری "یو باسٹرڈ۔ تم سمجھتے ہو یہ تمہارا پاکستان ہے۔ جہاں تم عورت کو اپنی جاگیر سمجھتے ہو۔ اپنی ماں بہنوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ظالمانہ سلوک کرتے ہو۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "کرن...."

"کون ہے کرن۔ میرا نام شیاما ہے۔ شیاما رام داس.... میرا باپ بھی امریکن شہری تھا۔ میں پیدائشی طور پر امریکن ہوں۔"

مجھے باقاعدہ سازش کے تحت پھنسایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ سب ناگزیر تھا جو امریکی قانون کے تحت ہوتا ہے۔ گرفتاری۔ ضمانت سب میڈیکل ٹیسٹ۔ اہم اخبارات نے اسے اہمیت نہیں دی مگر سنسنی خیز خبریں شائع کرنے والے اور زرد صحافت کے علمبردار TABLOID نے اس کیس کو خوب اچھالا۔ اس کے لیے شیاما رام داس نے انہیں خاصی معقول رقم ادا کی تھی اور شیاما رام داس کو یہ پیسہ ایک ایسی لابی نے فراہم کیا تھا جس میں میرے دشمنوں کے ساتھ یہودی اور انڈین سب شامل تھے۔

اپنے ملک میں میرے سیاسی مخالفین کو میری کردار کشی کا اچھا موقع ملا۔ یہ خبر جس کی حیثیت ایک اسکینڈل سے زیادہ نہ تھی بڑے بڑے اخبارات میں شائع کرائی گئی۔ جہاں شرح خواندگی کو سرکاری سطح پر پچیس فیصد سے زیادہ بتایا جاتا ہو مگر عملاً دس فیصدی کو پڑھا لکھا تسلیم کیا جاسکتا ہو۔ ان دس فیصد میں سے بھی دس فیصد اخبار پڑھتے ہیں اور اخبار پڑھنے والوں کی کل تعداد کا دس فیصد یہ سمجھتا ہو کہ ہر خبر جو شائع ہوئی ہے واقعی خبر نہیں ہوتی۔ خبروں کی اگر سیاست ہے۔ خبریں بنانا۔ بگاڑنا۔ دبانا یا اچھالنا۔ خبروں کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا اور ان کا غلط مطلب نکال کے رائے عامہ کو گمراہ کرنا۔ خبر میں زیبِ داستان کے لیے کبھی دس فیصد تو کبھی پچاس فیصد مبالغہ آرائی سے کام لینا۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ بعض اوقات سو فیصد جھوٹ پر مبنی خبر کو "ایک اطلاع کے مطابق یا مبینہ طور پر" کہہ کے شائع کردیا جاتا ہے۔ ایسی خبروں کے پیچھے دباؤ ہوتا ہے۔ پیسے کا تعلقات کا یا اختیارات کا مگر جو چھپ گیا وہ مستند ہوگیا۔ عام آدمی تو کہتا ہے کہ جی میں نے خود اخبار میں پڑھا ہے اخبار والے جھوٹ تو نہیں لکھ سکتے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جھوٹ بولا جاسکتا ہے تو لکھا کیوں نہیں جاسکتا وہ بھی شک میں پڑ جاتے ہیں۔ یعنی دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ کچھ صداقت ہوگی کہ جھوٹی خبر کو جھوٹ ثابت کرنا ہی کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر ہتکِ عزت کے قوانین کے تحت مقدمے بازی اور ہرجانہ وصول کرنے کی کارروائی کے مقابلے میں تیشے سے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنا آسان تر کام ہے۔

شیاما رام داس کوئی نیک نام عورت نہیں تھی۔ بلحاظ پیشہ وہ سیلز گرل تھی مگر جو چیز وہ فروخت کرتی تھی وہ عموماً اس کا اپنا جسم ہوتا تھا لیکن امریکا میں جنسی جبر اور تشدد کے خلاف قوانین بہت سخت ہیں اور اس میں بدنامی یا نیک نامی کا کوئی سوال نہیں۔ باہمی رضامندی ہو تو ہر گناہ جائز اور معاف۔ کوئی انگلی اٹھا دے کہ میرے ساتھ زبردستی ہوئی تو قانون کی نظر میں جرم۔ جنسی طور پر ہراساں کرنے یعنی SEXUAL-HARASSMENT کا الزام ہی ایسا ہے کہ بڑے بڑے سیاستداں کانگریس اور سینیٹ کے ارکان۔ بزنس ایگزیکٹو سے لے کر عام آدمی تک ہر مرد اس سے ڈرتا ہے۔ خلوت میں جو کچھ ہوا اسے عدالت میں سب کے سامنے باہمی رضامندی کا نتیجہ کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ عورت کا تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ میری کوئی مرضی نہیں تھی۔ مجھ پر جبر ہوا۔ باسکٹ بال پلیئر او جے سمپسن قتل کے الزام سے بری ہوگیا مگر ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن مائک ٹائی سن کو جنسی تعلق میں جبر کے الزام میں جیل جانا پڑا۔ وہ چلّاتا رہ گیا کہ یہ اس عورت کی انتقامی کارروائی تھی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی کیونکہ عدالت میں اسے ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے بھی بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی۔ کچھ میرے سیاسی تعلقات کام آئے۔ ایک رکن کانگریس سے میرے کاروباری مراسم تھے اور وہ باقاعدہ سنڈیکیٹ کا رکن تھا۔ اس کے خاص آدمی شیاما رام داس کے پیچھے لگ گئے کہ صلح کرلو عدالت کے باہر ورنہ یہ بندہ جیل جائے گا یا واپس اپنے وطن لیکن تم بھی یہیں اور ہم بھی یہیں۔ دیکھتے ہیں قانون اور تمہارے "دوست" کیسے تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔

شیاما رام داس نے ایک ملین ڈالر مانگے اور ایک لاکھ ڈالر میں کیس واپس لے لیا۔ اس سے پہلے کہ کورٹ ریکارڈ پر کچھ آتا میں نے اس رکن کانگریس کی مدد سے کیس کی میڈیکل رپورٹ والی فائل خرید لی۔ دس ہزار ڈالر میں اسپتال کی ایک نرس نے فائل غائب کی اور میرے حوالے کردی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رشوت کا چلن صرف ہماری قومی روایت ہے وہ احمقوں کے جنّت میں رہتے

ہیں۔ رشوت لینا اور دینا ازل سے ایک انسانی مجبوری ہے اور اس قباحت کی تاریخ بھی اتنی ہی پُرانی سمجھی جا سکتی ہے۔ جتنی خرید و فروخت اور نفع نقصان کے تصور کی۔ جنس کچھ بھی ہو۔ غلہ یا کپڑا۔ عالسوتی یا زمین غلام یا کنیز۔ ضمیر یا ایمان۔ ہر دور میں اور ہر جگہ ہر قوم کے افراد نے اور اداروں نے کامیابی کے لیے محبت کے ساتھ کر رشوت کو بھی بطورِ ہتھیار استعمال کیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔

میں نے یہ سب سوچ کے کہا "خان جی۔ شکاگو میں میرا کوئی DNA ٹیسٹ نہیں ہوا تھا۔"

"لیکن ابھی تم نے تسلیم کیا تھا۔"

"میں اپنے ہوش میں نہیں تھا" میں نے کہا "یا شاید نیند میں بول رہا تھا۔"

خان جی نے متانت سے کہا "تم کسی شیاما رام داس کو بھی نہیں جانتے؟"

میں نے کہا "حافظے پر بہت زور دینے سے یا کسی کے بہت یاد دلانے سے مجھے یاد آسکتا ہے کہ ایک لڑکی تھی غالباً۔ اس نے شکاگو میں مجھ پر کیچڑ اُچھالنے کی ناکام کوشش کی تھی اور پھر کیس واپس لے لیا تھا۔"

"عدالت میں اس کا ریکارڈ ہوگا؟"

"ریکارڈ ہے تو جس کا جی چاہے گنے" میں نے کہا "پُرانے ریکارڈ تو آپ کے پاس بھی بہت ہیں۔ وہ کیا ہے۔ ایک بنگلا بنے نیارا رہے کنبہ جس میں سارا۔ اور وہ۔ میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ بلبل سوتی ہے۔ سوتا نہیں۔ اور ایک بنگلا بن جائے تو اس میں سارا کنبہ کیسے رہ سکتا ہے۔ دن رات جوتیوں میں دال بٹے گی۔"

"تم سنجیدہ نہیں ہو تو جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا "سر جی۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ عدالت کے ریکارڈ سے بس وہی ثابت ہوتا ہے جو میں نے عرض کیا۔ اسپتال میں کوئی ریکارڈ نہیں۔"

"کیوں؟ کہاں گیا اسپتال کا ریکارڈ؟"

"یہ تو اسپتال والے بھی نہیں بتا سکتے۔ غالباً میں نے توڑ دیا۔ میں ریکارڈ توڑتا رہتا ہوں۔ یہ ایک بیماری ہے۔"

تم نے دشمنوں کا کام آسان کر دیا۔"

"جہنم میں جائیں دشمن خان جی۔ وہ فائل میرے پاس محفوظ ہے جس میں میری DNA ٹیسٹ کی رپورٹ ہے۔"

"کیا اس سے تم دوبارہ زندہ ہو سکتے ہو؟"

"یہ دستاویزی دنیا ہے خان جی۔ آپ نے اس پنشنر کا لطیفہ سُنا ہوگا جو جنوری میں اپنی دو ماہ کی پنشن لینے گیا تھا۔ عملے نے اسے نئے سال کی مبارکباد دی مگر دسمبر کی پنشن کے لیے کہا کہ دستاویزی ثبوت ملا نہیں کہ آپ گزشتہ ماہ بھی زندہ تھے۔ کسی کلاس ون افسر کا سرٹیفکیٹ ہونا چاہیے تو ایسے ہی آج اس ناچیز کو لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹانے والے دستاویزی ثبوت لے آئیں گے۔ کل جب مجھے ضرورت پڑے گی تو میں بھی دستاویزی ثبوت کے ساتھ عدالت میں پیش ہو جاؤں گا کہ مائی لارڈ۔ میں سو فیصد زندہ ہوں۔ اور یہ ہے اس کا ناقابلِ تردید ثبوت۔ میری ایک DNA ٹیسٹ کی رپورٹ۔ امریکا کے اسپتال کی۔ وہاں سے پچھلی تاریخ میں ایسی رپورٹ لینا ناممکن ہے۔ اور آج میرا DNA ٹیسٹ دوبارہ ہو تو دونوں کے نتائج سو فیصد ایک ہوں گے۔ آزمائش شرط ہے۔"

"اور تم سے پوچھا جائے کہ آج اچانک تمہیں کیسے خیال آگیا اور کیا ضرورت پڑ گئی خود کو زندہ ثابت کرنے کی۔ اب تک تم کہاں تھے؟"

"اس بارے میں بہت سی فلمی کہانیوں کے حوالے ہیں۔ میری یادداشت کھو گئی تھی۔ میں دشمنوں کی قید میں تھا۔ میں خوف سے روپوش تھا کہ مجھے ایک بار مارنے والے دوبارہ نہ ماردیں۔ لوگ ایک بار مرتے ہیں۔ میں دربار کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ سکتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے ابھی اعتراف کیا تھا۔ مجھے ریکارڈ توڑنے کی بیماری ہے۔"

"شاہ جی کل کی نہیں۔ آج کی بات کرو۔"

"آج کی کیا بات کروں۔ بازار کے بھاؤ سناؤں یا موسم کا حال۔"

"چلو نکلو یہاں سے۔ میں سمجھا تھا تم کسی کام سے آئے ہو۔"

کہا "بولا بغیر کام کے بھی تو آپ سے مل سکتا ہوں میں۔"

"مگر یہاں نہیں اور اس وقت نہیں" انہوں نے انگلی سے دروازے.... کی طرف اشارہ کیا "گیٹ آؤٹ۔"

"مجھے آپ سے ایسی بے مروتی کی امید نہیں خان جی۔" میں نے رقت زدہ لہجے میں کہا اور ایک آہ بھری "آپ بھی غیر ہو گئے سارے زمانے کی طرح۔ خیر میں جا رہا ہوں۔ ناکام و نامراد۔ اور بقول فلمی شاعر۔ تیری دنیا سے بہت دور چلا۔ ہو کے مجبور چلا۔"

"جاتے وقت دروازہ بند کرنا مت بھولنا" خان جی نے دوبارہ عینک نکالی۔ میں اُٹھا اور پھر بیٹھ گیا

"سوری سر۔ اصل بات جو میں آپ سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو رہ گئی۔"

انہوں نے عینک کے اوپر سے آنکھیں نکال کے مجھے گھورا "وہ کیا بات تھی اور تم بھول کیسے گئے اگر وہی اصل بات تھی۔"

"انسان خطا کا پتلا ہے خانِ اعظم۔" میں نے کہا "اور عائب دماغ کوئی عام لوگ نہیں ہوتے جینئس ہوتے ہیں۔ سائنس داں اور فلاسفر ہوتے ہیں۔ عام لوگ انہیں پاگل سمجھتے ہیں۔"

"تم پھر بھول جاؤ گے اس بک بک میں۔"

"نہیں سر۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ میں نے بڑے سانپ کو پکڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اتنی جلدی مت کرو۔"

"جلدی کیوں نہ کروں۔ وہ مجھے ڈسنے کے بعد بھی پھن پھیلائے کھڑا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اژدھا ہن کے سب کو نگل لے گا۔ وہ پھنکار رہا ہے اور زہر اُگل رہا ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اچھی طرح سوچ لو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے خان بابا" میں نے کہا "بس مجھے آپ کی آشیرباد چاہیے۔ اور مدد۔"

"چندا کو بتایا ہے۔ اس سے مشورہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یعنی اب میں ایک ناقص العقل لڑکی سے مشورہ کروں گا؟ میری ذاتی عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے؟ کہ ایک قطعی غیر زنانہ مسئلے کو میں اس سے ڈسکس کروں۔ آپ لڑانا چاہتے ہیں ہمیں۔"

"جب تک اسے علم نہیں ہوگا کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو۔ وہ تمہاری مدد کیسے کرے گی" خان جی مسکرائے۔ "تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے۔ تم سانپ کو کیسے پکڑو گے آخر یہ بھی سوچا ہے۔"

"جی۔ سب سے پہلے تو میں کسی سپیرے کو تلاش کرتا ہوں۔ کسی ماہر سپیرے کو۔ میں اس سے کہوں کہ مجھے بین بجانا سکھا دے۔ جب میں اس فن میں مہارت حاصل کرلوں گا تو اگلا مرحلہ ہوگا بین بجانے کا ظاہر ہے یہ بھی آسان کام نہیں۔ ہر ساز ایک سفینہ ہے اور موسیقی ایک سمندر ہے جس میں سات سُروں کے دریا گرتے ہیں۔ آپ کی دعاؤں سے اور اپنی لگن سے میں ایک دن بین بجانے میں وہ مقام حاصل کرلوں گا جو روی شنکر نے ستار میں حاصل کیا یا مہدی حسن نے غزل میں۔ اس کے بعد میں ایک مضبوط فولادی پٹاری بنواؤں گا۔ آپ کی اس لائبریری کے برابر۔ پھر میں بین بجاؤں گا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سانپ تو بہرا ہوتا ہے اور بین نہیں سُنتا۔ ایسے لوگ مجبوراً بھینس کے آگے بین بجاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر سانپ کی پسند الگ ہوتی ہے۔ جیسے ایک دوا سے ہر مرض کا اور مریض کا علاج نہیں کیا جا سکتا ایسے ہی ایک راگ سُنانے سے ہر سانپ نہیں پکڑا جا سکتا۔ جیسا سانپ ویسا راگ۔ مزید یہ کہ سانپ کو صبح کے وقت پکڑنا ہو تو صبح کا راگ بجانا چاہیے۔ بے وقت کی راگنی سانپ نہیں سُنتا خیر جناب۔ میری بین کے سُر سانپ کو کھینچ لائیں گے اور وہ آدمی رات کو بھی اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آئے گا جھومتا ہوا۔ باہر آتے ہی اسے دکھائی دے گا ایک خرگوش۔ یہ نظر آئے گا بالکل اصل خرگوش کی طرح مگر ہوگا مقناطیس کا بنا ہوا۔ مقناطیسی خرگوش۔ سانپ اسے فوراً نگل جائے گا اور مارا جائے گا۔ اس کے جسم میں مقناطیسی کشش پیدا ہو جائے گی اور پٹاری ہوگی فولاد کی بنی ہوئی۔ جیسے ہی وہ قریب آیا تو لوہا کھینچے گا فولاد کو۔ مگر پٹاری بہت بڑی اور وزنی ہوگی چنانچہ سانپ خود جائے گا پٹاری میں۔ پٹاری کھینچے گی خرگوش کو مگر خرگوش ہوگا سانپ کے اندر۔ وہ بے اختیار ہو کے پٹاری کی طرف لپکے گا اور جیسا کہ مادم نورجہاں فرما چکی ہیں کہ آپنے تال لگ جا ٹھاہ کر کے۔ تو ایسے ہی سانپ بھی ٹھاہ کر کے پٹاری میں۔ کیسا آئیڈیا ہے خان جی۔"

مگر میری انتہائی پُرمغز تقریر رائگاں گئی۔ خان اعظم کب کے اس کتاب میں گم ہو چکے تھے جس کا عنوان ہی لرزہ خیز تھا۔ اکیسویں صدی کے معاشی اور معاشرتی وسائل کا معروضی تجزیہ۔ ان کی ساری توجہ کتاب پر تھی اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے میری بات بالکل نہیں سُنی ہوگی۔ انہیں اپنی قوتِ ارتکاز پر اتنا کنٹرول حاصل تھا کہ میں ان کے سامنے توپ داغ دیتا تب بھی ان کی محویت میں فرق نہ آتا۔ مجھے گیٹ آؤٹ کہنے کے بعد وہ خود ذہنی طور پر گیٹ آؤٹ ہو گئے تھے۔ وہ ذہنی طور پر اس حد تک غیر حاضر تھے کہ میرا ان سے باتیں کرنا دیوار سے باتیں کرنے کے مترادف تھا۔

باہر جاتے ہوئے میں نے چلّا کے کہا "میں جا رہا ہوں خان اعظم۔ پھر ملاقات ہوگی بشرط زندگی۔ فی امان اللہ۔ پہ ما خادے خا۔" مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

یہ آدمی بھی روبوٹ ہے۔ کان کا سوئچ آف کر دیا کیونکہ ابھی کچھ سُننا نہیں ہے۔ سوتے وقت آنکھوں کا سوئچ آف۔ دماغ کا سوئچ آف۔ ضرورت پڑنے پر سارے سوئچ آن۔ حواسِ خمسہ پوری طرح مستعد۔ دماغ کا کمپیوٹر آن۔ جسم کی مشنری کا ہر پُرزہ ریڈی فار ایکشن۔ میں نے دروازہ بند کر کے باہر آتے ہوئے سوچا۔ کاریڈور میں چندا بڑی شرافت سے موجود تھی۔ اس کی گود میں وہ نامعقول سیاہ بلی تھی جو اسے مجھ سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ مجھے اس سے الرجی تھی لیکن وہ اس کو پیار کر رہی تھی اور چمکار رہی تھی۔

اگلا قدم بڑھاتے ہی میں منہ کے بل گرا۔ مجھے وہ پتلی سی سیاہ ڈوری اتنی کم روشنی میں نظر ہی نہیں آئی جو میری راہ میں حائل تھی۔ ویسے بھی میری نظر نیچے نہیں بلکہ چندا کے چہرے پر تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے ورنہ میں سمجھ جاتا کہ اس کا یہ اندازِ معصومیت کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔

میں کراہتا ہوا اُٹھا تو وہ قہقہہ مار کے ہنسی "اندھے ہو گئے ہو کیا نیچے دیکھ کے چلا کرو۔ اونٹ کی طرح گردن اُٹھا کے چلتے ہو۔"

"میری دونوں کہنیوں کے جوڑ کھل گئے ہیں" میں نے دردناک لہجے میں کہا "گھٹنوں کے بال بیرنگ جام ہو گئے ہیں۔"

"تمہاری ناک بھی چپٹی ہو گئی ہے۔ اچھی لگ رہی ہے۔"

میں نے آگ بگولا ہو کے کہا "یہ رسّی تم نے باندھی تھی؟"

"ہاں" اس نے بلّی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اقرار میں سرہلایا۔

"چندا۔ جو پہلے ہی جی جان سے تم پر مرتا ہے اسے ایسے کیوں مارتی ہو۔ ابھی میرا سر ناریل کی طرح ٹوٹ جاتا.... پھر۔"

وہ بولی "سارا بھوسا قالین پر بکھر جاتا۔ مجھے صاف کرنا پڑتا۔"

aazzamm@yahoo.com

میں نے متانت سے کہا "تمہارے لاشعور میں یہ خواہش تھی کہ میں تمہارے سامنے فرش پر ناک رگڑوں۔ میں سات بار ناک رگڑنے کے لیے تیار ہوں اگر اس کے بعد تم اقرار کرلو۔"

اس نے بلی کو مجھ پر اُچھال دیا اور بھاگ گئی۔ بلی نے مجھ پر گرتے ہی چھلانگ ماری اور چندا کے پیچھے غائب ہوگئی۔ میرا چھینکوں سے بُرا حال ہوگیا۔ میں چندا کے بغیر نہیں جی سکتا تھا۔ میں نے وہ رسّی کھولی جو کاریڈور میں آرپار بندھی ہوئی تھی اور جیب سے پچاس پیسے کا سکہ نکال کے ٹاس کیا کہ اس رسّی سے میں کس کو پھانسی پر لٹکاؤں۔ اس منحوس بلی کو یا اپنے آپ کو؟ ایک بار پھر بلی جیت گئی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سکہ جیب میں رکھ لیا۔

کھانے کی میز پر خان اعظم کے آنے سے پہلے میں نے کہا "چندا۔ اس رسّی سے میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتیں۔"

"گھونٹ دوں گی۔ مگر کسی کو بتانا نہیں" وہ سرگوشی میں بولی "اور ذرا مضبوط سی رسّی لے کر آنا کل۔ آج تو ویسے بھی میں نے تمہاری پسند کی چیز بنائی ہے۔"

"کیا؟" میں نے ندیدوں کی طرح پُراشتیاق نظروں سے ڈونگے کو دیکھا۔

"کریلے" وہ ہنسی۔

"کیوں نہ میں فاقے سے مرجاؤں۔ میرے سوئم پر کریلے کا پلاؤ پکوانا۔ چہلم پر کریلے کا حلوا تقسیم کرنا۔ میری قبر پر کریلے کے پھول چڑھانا۔"

"بس ایک مہینہ رُک جاؤ۔ ذرا کریلے سستے ہوجائیں۔ ابھی تو موسم شروع ہوا ہے۔"

خان جی تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے آئے "معاف کرنا تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑا۔"

میں نے خوش اخلاقی سے کہا "کوئی بات نہیں خان جی۔ اگر اکیسویں صدی میں بائیسویں صدی کے مسائل پر کوئی کتاب رہ گئی ہو تو وہ بھی پڑھ آئیں۔ اگر ہم بیسویں صدی میں بھوک سے فوت ہوجائیں تو کیا ہے۔"

"بھئی چکر کیا ہے۔ آج تو بڑا اہتمام ہے" خان جی نے ایک ڈونگا کھول کے دیکھا "مرغ مسلم۔ اور یہ۔ چائنیز رائس۔ تلی ہوئی مچھلی مزے دار سوپ۔ پھر تو سوئٹ ڈش میں بھی آئس کریم ہوگی یا فروٹ کسٹرڈ وغیرہ۔"

"جی نہیں۔ کیک ہے" چندا نے منہ پھلا کے کہا "میں نے خود ہی بنایا ہے۔ کسی کو یاد رہتا ہے کہ آج کس کی سالگرہ ہے۔"

خان جی ہنسے "اوہو ہو۔ یہ بات ہے۔"

میں نے جیب میں سے ایک مخملی ڈبیا نکالی "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"

چندا نے جگمگاتے ہیرے والی انگوٹھی کو بے یقینی سے دیکھا۔ پھر اس کا چہرہ بھی خوشی سے دمکنے لگا "یہ۔ یہ تو بہت قیمتی ہے۔"

"تمہاری خوشی زیادہ انمول ہے" میں نے کہا۔

اس نے ہاتھ آگے بڑھادیا۔ میں نے انگوٹھی پہناتے پہناتے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "پہلے بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"کیا؟" چندا کی مسکراہٹ پل بھر کے لیے ماند پڑی۔

"وہ کریلے کی ڈش جو مجھے بہت پسند ہے" میں نے کہا اور انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ خان جی بڑی محبت اور شفقت سے سب دیکھتے رہے۔

"بھئی ہم تو بوڑھے ہوگئے ہیں نا۔ بھول جاتے ہیں۔ ہم کیا تحفہ دیں" انہوں نے اُداسی سے کہا۔

"آپ دعا دے سکتے ہیں بابا" چندا نے کہا "اس سے بڑھ کر کون سا تحفہ ہوسکتا ہے میرے لیے۔"

کرنل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "اللہ تجھے ہر دکھ سے محفوظ رکھے۔"

مجھے اچانک اندازہ ہوا کہ اگلا لمحہ آنکھوں کی نمی کو اور دل کی اُداسی کو اشکوں میں ڈھال دے گا۔ خان جی بات کریں گے اپنے بچھڑنے والوں کی۔

میں نے چلّا کے کہا "کرنل صاحب۔ چکن بٹالین پر حملہ کردیں۔ یہ لیں تلوار۔ نعرۂ تکبیر۔"

"اللہ اکبر" کرنل نے چھری پکڑلی اور کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

اس رات میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ شاہ پیلس کے اس زمین دوز کمرے میں میرے ساتھ صرف میری تنہائی تھی۔ میں بہت زیادہ کھا گیا تھا۔ نیند نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اصل وجہ کچھ اور تھی جس نے میرے دل میں سوئی ہوئی خلش کو جگادیا تھا۔ میں اندھیرے میں اُڑنے والے جگنو پکڑنے کی کوشش میں دیوانہ وار بھٹک رہا تھا۔ یہ جگنو نہیں۔ اعداد تھے۔ جو پل بھر کے لیے روشن ہوئے تھے اور بجھ جاتے تھے۔ ایک عدد سال کا تھا۔ دوسرا مہینے کا۔ تیسرا اس دن جب میں پیدا ہوا تھا۔

میں کب پیدا ہوا تھا؟ میری سالگرہ کا دن کیا تھا؟ چندا تو گلہ کرسکتی تھی۔ مگر میں کس سے گلہ کروں کہ یہ دن کسی کو یاد نہیں جیسا کہ خود مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ میں کب اور کہاں پیدا ہوا تھا۔ ایک سرکاری قاعدہ یہ تھا کہ کسی کو اپنی تاریخ پیدائش یاد نہ ہو تو عمر کا تعین میڈیکل رپورٹ کی روشنی میں کیا جاتا ہے اور سن مقرر ہوجاتا ہے۔ تاریخ یکم جولائی فرض کرلی جاتی ہے۔ کچھ اسی طرح مجھے یقین دلادیا گیا تھا کہ میری پیدائش اور یوم دفاع پاکستان کی تاریخ ایک ہی ہے یعنی میں چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ جب یہ تاریخ میری میٹرک کی سند میں آگئی تو گویا مستند تسلیم کرلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بات غلط ہے مگر اسے غلط ثابت کرنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اسے صحیح ثابت کرنا۔

آخر وہ کون تھا جس نے پہلی بار میری تاریخ پیدائش لکھی تھی۔ کسی فارم کے ایک خانے میں میرے نام اور میرے باپ کے

نام کے بعد اس نے اپنی لاعلمی کو چھپانے کے لیے ایک اچھی سی تاریخ فرض کرلی تھی۔ جسے یاد رکھنا بھی آسان تھا۔ وہ فارم کیا تھا اور اسے بھرنے والا کون تھا؟ وہ میرے باپ کا نام جانتا تھا تو میری ماں کو بھی جانتا ہوگا۔ کیا وہ میرا کوئی دور کا رشتے دار تھا یا میرے والدین کا کوئی محلے دار، شناسا یا دوست۔ کیا اس نے میرا گھر اور میرے والدین کا گھر دیکھا تھا؟

یہ بات اتنی پُرانی تھی کہ میرے حافظے میں اس شخص کی صورت کا بھی کوئی نقش باقی نہ تھا۔ میٹرک کے امتحان کا فارم میں نے خود ہی بھرا تھا اور اس کے بعد کالج کے ہر امتحان کا بھی۔ میٹرک کا امتحان دیتے وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ بعد میں چھ ستمبر انیس سو پینسٹھ ہی تمام عمر کے لیے میری قانونی اور سرکاری تاریخ مان لی جائے گی ورنہ شاید میں سوچتا۔ مگر سوچنا لاحاصل ہوتا۔ میرے ذہن میں یہی تاریخ بٹھادی گئی تھی اور میرے پاس اس یقین کا متبادل کوئی نہیں تھا۔

دس سال سے کرنل خان کے گھر میں میری سالگرہ منائی جاتی تھی ورنہ اس سے پہلے یہ دن میرے لیے بھی صرف یوم دفاع پاکستان تھا۔ میں اس دن خوش نظر آنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ جیسے کہ میری حقیقی سالگرہ ہو کیونکہ میں چندا کو اور خان جی کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ تاہم میرا یہ یقین اپنی جگہ مستحکم اور برقرار تھا کہ ایک نہ ایک دن میں اپنے وجود کی حیثیت کا سُراغ لگالوں گا اور جان لوں گا کہ میں کون ہوں۔

میوزیکل کلاک نے بارہ گھنٹے بجا کے اگلے دن کے آغاز کا اعلان شروع کیا تو میں نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ ساتویں گھنٹی پر اس نے ریسیور اٹھالیا اور خوف زدہ، پُرتجسس، کمزور اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "ایجنٹ۔ زیرو زیرو سیون۔"

"کون۔ کون ہو تم" اس نے ہسٹریائی کیفیت میں کہا "بولتے کیوں نہیں۔ ہیلو۔ ہیلو۔"

میں نے ریسیور آف کیا۔ پھر لائٹ آف کی اور سو گیا۔ رات کے آخری پہر میں پھر میں نے وہی خواب دیکھا۔ تاریخ اور سنسان گلی میں وہ کالی دیواروں والا گھر۔ میں نے اس کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ اندر کاجل سے کالا اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ اس دروازے پر بھی سیاہ پینٹ تھا۔ پھر نہ جانے کیسے میں نے اس کالی دیوار میں وہ دروازہ تلاش کرلیا تھا۔ میں اندر قدم رکھتے ہی ڈر کے رُک گیا۔ اس گھر کی دیواریں اندر سے بھی کالی تھیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے آہستہ سے آواز دی "ماں۔ تم کہاں ہو؟"

"اِدھر آجا میرے لال۔ یہاں ہوں میں" ماں کی مامتا کی امرت ٹپکاتی آواز نے جیسے میرے وجود میں سکون بھردیا۔

میں آواز کی سمت بڑھا اور دیوار سے ٹکرا گیا "ماں" میں چلّایا۔

"اُدھر نہیں۔ اِدھر آ بیٹا" وہی شہد اور دودھ میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

میں پلٹا اور ایک قدم آگے بڑھاتے ہی دوسری دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں پھر کرب سے چلّایا "ماں۔ تم کدھر ہو....؟"

اس مرتبہ وہ آواز تیسری سمت سے سُنائی دی۔ دُکھی اور غمزدہ "تو کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے میرے چاند۔ میری طرف کیوں نہیں آتا۔ میں بُلا رہی ہوں تجھے۔"

میں گھوم کے آواز کی طرف بڑھا تو پھر میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور میں نے کراہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے روتے ہوئے کہا "ماں.... میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔"

گھپ اندھیرے میں اس کی سسکیاں سُنائی دینے لگیں "آخر تیری نظر مجھے کیوں نہیں دیکھ سکتی؟ میں تیرے سامنے ہوں۔"

میں پھر گھوم کے آواز کی سمت میں لپکا اور پوری قوت کے ساتھ دیوار سے ٹکرا کے گر گیا۔ عورت نے ایک چیخ ماری۔ میں نے خون کی بُو کو اور خون کے نمکین ذائقے کو اپنے لبوں پر محسوس کیا۔ میرے چہرے پر دو نرم ہاتھوں کا لمس آگیا۔ گرم پانی کی دو بوندیں میرے گالوں پر گریں۔ کسی نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"ماں۔ تو رو رہی ہے۔ میرا سر پھٹ گیا ہے۔ اب میں مر جاؤں گا نا۔"

"نہیں...." وہ چلّائی اور اس کی چیخ نے ایک بازگشت کی شکل اختیار کرلی۔ "نہیں۔ نہیں۔" یہ آواز کئی بار سُنائی دی "تو نہیں مرے گا۔ میں تیرے باپ کو بُلاتی ہوں۔ وہ تیرے لیے دوا لائے گا۔"

میں نے چلّا کے کہا "ماں۔ مجھے چھوڑ کے مت جا۔"

اس نے دروازے میں پلٹ کر کہا "میں ابھی آتی ہوں۔ تیرے ابّا کو بُلا لاؤں تاکہ وہ تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔"

میں اس کے پیچھے لپکا "نہیں ماں۔ رک جاؤ۔"

"نہیں، تیرا ابّا ناراض ہوگا کہ مجھے کیوں نہیں بتایا" وہ تیر کی طرح باہر نکل گئی۔

میں اس کے تعاقب میں دوڑا۔ "ماں مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، دیکھو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ماں۔ ٹھہرو!"

مگر وہ اندھیرے میں سائے کی طرح بھاگتی جارہی تھی اور میں اسے روکنے میں ناکام تھا۔ "تم کہاں تلاش کروگی ابّا کو ماں۔"

"وہ یہیں ہوگا" اس نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

کئی بار میں نے اسے گرتے اور پھر اُٹھ کے بھاگتے دیکھا۔ میری سانس پھول گئی تھی اور خون اب بہہ کر میرے رخساروں سے قمیص کے گریبان تک پہنچ گیا تھا۔ اچانک سامنے ایک پہاڑ آگیا۔ سیاہ پتھر کا اونچا پہاڑ۔ وہ اوپر چڑھنے لگی۔ اپنی انتہائی کوشش کے

باوجود میں اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر وہ سنگِ اسود کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ "آگیا۔ میرا بیٹا آگیا۔ تم نے اچھا کیا کہ اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ آؤ۔ اب ہم ایک ساتھ چلیں گے" وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر اس نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ماں کا ہاتھ تھا۔ اس نے کہا "ریڈی' ون۔ ٹو۔ تھری۔" اور پھر پہاڑ کی بلندی سے چھلانگ لگادی۔ ہزاروں فٹ کی گہرائی تک پھیلا ہوا خلا کا اندھیرا سرد ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ ہمارے تیرتے جسموں کو چھوتا ہوا گزرنے لگا۔ نوکیلے پتھروں' چٹانوں۔ سوکھے درختوں اور کانٹے دار جھاڑیوں والی زمین بڑی تیزی سے ہماری طرف اُٹھی۔



میں نے درمیانی پردے سے جھانک کے دیکھا تو ویٹنگ روم خالی تھا "کوئن الزبتھ۔ موقع سے فائدہ اُٹھاؤ۔ فوراً دروازہ بند کردو۔"

"میں کہاں سے کوئن ہوگئی سر۔ وہ تو انگلینڈ پر حکومت کرتی ہے۔ میں ایک غریب عورت ہوں" وہ مسکرائی۔

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کے کہا "تمہاری سلطنت یہ ہے۔ تم میرے دل پر حکومت کرتی ہو۔"

"ایک ملک میں دو حکمراں نہیں ہوسکتے۔ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں۔"

میں نے کہا "تلوار کا تو پتا نہیں۔ لیکن میرے دل میں بہت جگہ ہے۔ اس کو تم ایک اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سمجھو۔ یہاں 'کوئن الزبتھ۔ الزبتھ ٹیلر' گزشتہ اور آئندہ کی مس یونیورس۔ تم اور دنیا کی سب حسین خواتین ایک ساتھ رہ سکتی ہیں۔ علاوہ چار بیویوں کے..."

وہ ہنسی "اس تعریف کے باوجود میں دروازہ بند نہیں کروں گی۔ ابھی... وقت نہیں ہوا۔ ایک گھنٹا باقی ہے۔"

"گھڑی آگے کرلو" میں نے کہا "یا باہر کوئی بورڈ لگادو۔"

"کیسا بورڈ...؟"

کچھ بھی لکھ کے لگادو۔ آپ کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر کمال فوت ہوگئے ہیں۔ آج دیر سے آنے والے مریضوں کو مبارکباد۔ اب وہ اپنے گھر پر طبعی موت مرنے کے لیے خوش و خرم اور صحت مند زندگی گزار سکتے ہیں۔"

اس نے اپنے سینے پر عادتاً صلیب بنائی "خداوند یسوع مسیح میری زندگی بھی ڈاکٹر کمال کو دے۔"

کمال آخری مریض کا تفصیلی معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ میں باہر ہی بیٹھ گیا "ڈیئر کوئن۔ تم واقعی اتنی محبت کرتی ہو اس اُلو کے پٹھے سے۔"

"کیا آپ نہیں کرتے سر" وہ بولی۔

"میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔"

"سب محبت کرتے ہیں ڈاکٹر کمال سے سر۔"

"بات کو مت ٹالو" میں نے اسے ڈانٹا "سچ بتاؤ اس نے ابھی تک پروپوز نہیں کیا تم کو۔ اس کی تو ایسی کی تیسی۔ آج دیکھنا تم میں کیسی خبر لیتا ہوں اس کی۔ ہر ایک کو پروپوز کرتا پھرتا ہے اور تم کو نہیں کیا۔"

وہ مسکرانے لگی "کمال صاحب میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں سر۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی ہوگی جو ان کی شریکِ حیات بنے گی۔ وہ تو فرشتہ ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے سخت حیرانی سے کہا "کیا تم نے خود دیکھا ہے اس کو فرشتوں کی طرح پرواز کرتے ہوئے یا اچانک غائب ہوتے۔ ایسی صورت میں دنیا کی کوئی لڑکی اس سے شادی نہیں کرسکتی۔ تم ہی بتاؤ۔ اگر تمہیں حضرت عزرائیل کہیں..."

فون کی گھنٹی پر اس کا ہاتھ خود بخود ریسیور کی طرف بڑھا "گڈ مارننگ سر۔ یس۔ ڈاکٹر کمال موجود ہیں۔ ایک منٹ سر" اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ "ڈاکٹر کمال۔ آپ نے ایک بجے کا ٹائم دیا تھا کسی کو۔ گھر پر دیکھنے کے لیے۔ وہاں سے کوئی خاتون چاہتی ہیں کہ آپ فوراً پہنچ جائیں۔ وہ سخت پریشان ہیں۔ کوئی سیریس بات معلوم ہوتی ہے۔ یس سر" اس نے ریسیور پر سے ہاتھ ہٹاکے کہا "ڈاکٹر کمال آرہے ہیں۔ آپ اللہ سے دعا کریں۔"

آخری مریض کے ساتھ ہی ڈاکٹر کمال باہر نکلا تھا مگر باہر سے دو مریض ایک ساتھ ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو وہ لوٹ گیا۔ ان میں ایک برقعہ پوش عورت تھی۔ مرد اسے سہارا دے کر اندر لے گیا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کوئن۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ نبض تو شاید بہت پہلے ہی بند ہوچکی ہے۔ اگر میں یہاں تمہارے سامنے دم توڑ دوں بھوک سے تو بُرا مت ماننا۔"

"ابھی تو ایک بجا ہے سر۔"

"کیا ایک بجے بھوک سے مرنے پر قانونی پابندی ہے؟" میں نے خفگی سے کہا "اور اگر تم نے مجھے سر کہنا نہ چھوڑا تو میں ٹاس کرکے ایک سر توڑ دوں گا۔ تمہارا یا اپنا۔"

"اور میں کیا کہوں آپ کو؟"

"میرا نام کیا اتنا بُرا ہے" میں نے رومانٹک لہجے میں کہا "اور نام کے ساتھ کچھ لگانا ضروری ہے تو ڈیئر۔ ڈارلنگ۔ سویٹ ہارٹ۔ ہنڈسم۔ وغیرہ لگاؤ۔ اردو میں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ فلمیں تو دیکھتی ہوتا تم؟"

"بالکل نہیں۔"

"کانے سُنتی ہو۔ دیسی یا ولایتی!"

"نو سر۔"

"کمال ہے۔ رومانی ناول افسانے تو پڑھتی ہوگی؟"

"جی نہیں۔"

"اُف۔ کچھ کرتی بھی ہو تم۔ شراب پیتی ہو۔ جُوا کھیلتی ہو۔ چرس' ہیروئن کا شوق ہے۔ فلرٹ کرتی ہو۔"

اس نے سینے پر صلیب بنائی "توبہ توبہ یہ سب بڑے گناہ ہیں۔"

"اچھا تو چھوٹے گناہ کرتی ہو۔"

"کوشش کرتی ہوں کہ نہ کروں۔"

"مس کوئن۔ تم غلط وقت پر غلط جگہ آگئیں۔ یہ دنیا تمہارے لائق نہیں تھی۔ تم تو فرشتہ ہو۔ تمہاری جگہ ہے آسمانوں پہ۔ یہاں تم اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کررہی ہو۔"

"دوسروں کا کیسے سر؟" وہ ہنسنے لگی۔

"جیسے اتنی دیر سے میرا وقت ضائع کیا۔ اتنی محنت کہیں اور کرتا تو اب تک ڈیٹ لے چکا ہوتا۔ نہ جانے کتنے تم پر مرتے ہوں گے۔ تم کو دیکھ کے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوں گے۔ تم کو خواب میں دیکھتے ہوں گے۔ سب اپنا وقت ہی تو ضائع کررہے ہیں۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آخر رابرٹ بھی تو محبت کرتا ہے مجھ سے۔"

"یہ رابرٹ کون ہے۔ کنگ رابرٹ بروس آف اسکاٹ لینڈ۔ ٹرائی ٹرائی اگین ورنہ۔"

"وہ میرا منگیتر ہے" وہ شرما کے بولی "ہی از اے جنٹلمین۔"

"ظاہر ہے۔ لیڈی تو ہو نہیں سکتی۔ وہ بھی تم جیسا فرشتہ ہی ہوگا مگر ڈیئر مس کوئن۔ ایسا کہنا بہت معیوب بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم جنٹلمین نہیں ہیں۔ بدمعاش ہیں۔ بڑی بے عزتی ہے ہماری۔"

"اوہ نو سر" ایسا ہرگز میرا مطلب نہیں تھا" وہ گھبرائی۔

"پھر وہی سر۔ آخر میں کیا کروں۔ سر کٹا دوں" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

کمال کے آخری دو مریض بھی رخصت ہوگئے تو اس نے باہر جھانکا "اور کوئی ہے؟ کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "میں ہوں۔ میرا دماغ تمہاری اس خوبصورت نرس نے خراب کردیا ہے۔ اس کا پہلے سے خراب تھا۔"

کمال نے اپنا بیگ اُٹھالیا "میں سب سُن رہا تھا اندر۔ سؤر کے بچے۔ تیری زبان کو بواسیر ہے۔ چل اُٹھ۔"

میں نے کہا "سوری میں نہیں اٹھ سکتا۔ نقاہت کے سبب۔ مجھے اسٹریچر پر ڈالو اور پھر ایمبولینس میں شفٹ کراؤ ڈاکٹر صاحب۔ اگر راستے میں دم نہ نکلے تو کہیں سے راہِ خدا میں دو روٹی کھلا دینا بھوکے کو بابا۔"

"یار دیر مت کر" اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی "ابھی آجائے گا کوئی مریض تو مجھے پھر رُکنا پڑ جائے گا۔ مجھے فوراً ایک مریض کو دیکھنا ہے۔"

"مس کوئن۔ کیا تم میرا سہارا بنو گی" میں نے جذباتی لہجے میں کہا "ویسے تم ہو بہت ڈھیٹ اور بے مروت۔ اتنی دیر میں چائے کے ایک کپ کو نہیں پوچھا۔"

"اس کی اجازت نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہیں۔"

"گلوکوز کا ایک انجکشن تو لگا سکتی تھیں" میں نے چلا کے کہا۔

کمال نے مجھے قمیص کا کالر پکڑ کے کھینچ لیا "کوئن۔ ابھی دروازہ مت بند کرنا۔ اگر کوئی مریض آجائے تو کہہ دینا۔ مجھے ایمرجنسی میں جانا پڑ گیا ہے۔ اگر کسی کو صرف دوا کی ضرورت ہو تو نسخہ دیکھ کے دے دینا ایک دن کے لیے۔"

"ویسے ماشاء اللہ سے خود بھی سیانی ہو۔ قاضی کے گھر کے چوہے کی طرح۔ آدھی ڈاکٹر بن چکی ہو۔ کوشش کرو تو پوری بن سکتی ہو۔ بیٹھ جاؤ اس کی کرسی پر اور دیکھو مریض۔"

اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی بھی اجازت نہیں ہے سر۔"

میں کمال کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ سوزوکی ہائی روف کے پچھلے حصے میں مریضوں کو لانے کے لیے اسٹریچر تھا جسے کھینچ کے باہر نکال لیا جاتا تھا اور پھر مریض سمیت اندر دھکیل دیا جاتا تھا۔ اس میں ایک طرف بنچ تھی جس پر مریض کے ساتھ آنے والے بیٹھ جاتے تھے۔ دوسری طرف آکسیجن کا سلنڈر۔ ہنگامی ضرورت میں کام آنے والی دواؤں کا شیلف اور ایک اسٹینڈ تھا جس سے خون یا گلوکوز کی بوتل لٹکائی جاسکتی تھی۔ کوئن کی ذاتی دلچسپی کے باعث یہ حصہ بالکل بے داغ اور صاف ستھرا نظر آتا تھا۔ کسی زخمی کا یا حادثے میں ہلاک ہوجانے والے کی لاش کا لہو اکثر سیٹوں پر اور فرش پر پھیل جاتا تھا' بعض اوقات مریضوں کے اُلٹیاں کرنے سے یا بول و براز سے ہر چیز گندی ہوجاتی تھی۔ کوئن اسے خود دھوتی تھی۔ پہلے پانی سے پھر صابن اور فینائل کے محلول سے اور ایک گھنٹے میں ہر چیز کو کپڑے سے خشک کرکے پہلے کی طرح چمکا دیتی تھی۔ ایئر کلینر کا اسپرے ہوجانے کے بعد کوئی بُو نہیں رہتی تھی۔ فرش۔ اسٹریچر۔ سیٹیں اور ضرورت کا سامان کسی اور ایمرجنسی کے لیے پھر اے ون کنڈیشن میں آجاتے تھے تو کوئن اپنی کارکردگی پر آخری پُر طمانیت نگاہ ڈال کے انگلی سے سینے پر صلیب بناتی تھی اور پھر کسی کام میں مصروف ہوجاتی تھی۔ ڈاکٹر کمال کی طرح ہر صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک کوئن کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ قدرت جب کسی سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے تو اس کے اسباب بھی فراہم کردیتی ہے۔ ڈاکٹر کمال کا ساتھ صرف کوئن جیسی نرس ہی دے سکتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے اور یہ گویا نوشتۂ تقدیر کی طرح اٹل تھا کہ جیسے ہی ڈاکٹر کمال دُکھی انسانیت کی خدمت پر کمربستہ ہو تو کوئن فوراً اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے۔ وہ دونوں لاہور ہی میں تھے۔ ادھر کمال نے اخبار میں اشتہار دیا کہ "ضرورت ہے ایک کوالیفائیڈ نرس کی جو خدمتِ خلق کا حقیقی جذبہ رکھتی ہو۔ کام کے اوقات صبح سے شام تک ہوں

گے" ادھر تیس چالیس لڑکیوں کے ساتھ کوئی بھی حاضر ہو گئی اور منتخب بھی ہو گئی۔ یہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔

ڈاکٹر کمال احمد فاروقی نے ڈاکٹری کا امتحان چار سال پہلے پاس کیا تھا اور اپنے اسکول کالج کے شاندار تعلیمی ریکارڈ کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے یہ کامیابی بھی نمایاں طور پر حاصل کی تھی۔ ہاؤس جاب کا کوئی فیصلہ نہیں تھا۔ مرحوم جمال فاروقی خود نامی گرامی سرجن تھے اور ان کی شہرت کا دائرہ ملک کی سطح سے بڑھ کر بین الاقوامی ہو گیا تھا۔ انہوں نے اوپن ہارٹ سرجری میں اسپیشلائز کیا تھا اور وہ امراضِ قلب کے سب سے بڑے اور مہنگے پرائیویٹ اسپتال سے وابستہ تھے۔ ایک آپریشن کی فیس ایک لاکھ ایڈوانس لیتے تھے۔ اس میں ایک پیسے کی رعایت یا ایک پیسے کے ادھار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غریب آدمی ان کے سامنے دم توڑ دے۔ مریض یا اس کے ساتھ آنے والوں کی جیب میں صرف ننانوے ہزار نو سو ننانوے روپے ہوں یا ان کے دیے ہوئے چیک کے ڈِس آنر ہونے کا ایک فیصد بھی امکان ہو وہ آپریشن تھیٹر سے دور اپنے کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے تھے۔ مشتعل لواحقین انہیں جتنی گالیاں چاہیں دیں۔ اخبار والے ان کو شقیق القلب۔ لالچی اور بے ضمیر کہیں۔ ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ بھائی جس کے پاس میری فیس دینے کے لیے ایک لاکھ نہیں ہیں وہ اپنی جیب دیکھتے ہوئے پچاس ہزار والے ڈاکٹر کے پاس چلا جائے۔ خالی جیب ہے تو سرکاری اسپتال جائے۔ یہ تو زندگی کا اصول ہے۔ لوگ گھر میں دال روٹی کھا لیتے ہیں اور پیٹ بھر جاتا ہے۔ لنڈے بازار سے پتلون کوٹ لے کر بابو بن جاتے ہیں۔ جو افورڈ کر سکتے ہیں وہ شیرٹن میں ڈنر کرتے ہیں اور لندن میں ہیرڈز سے سوٹ خریدتے ہیں۔ کیا وہاں رعایت ہوتی ہے یا اُدھار چلتا ہے! بزنس از بزنس۔ میں خدمتِ خلق نہیں کرتا تو اس میں بے ضمیری کی کون سی بات ہے۔ بڑے بڑے امپورٹر ایکسپورٹر تاجر صنعت کار بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

مرحوم ڈاکٹر جمال فاروقی غلط بہرحال نہیں کہتے تھے۔ ان جیسے اور بھی بہت سے ڈاکٹر تھے جنہوں نے آغاز تو سرکاری اسپتال کے او پی ڈی سے کیا ہوگا مگر اب وہ امرا کے ایک خاص طبقے کے لیے اپنی خدمات وقف کر چکے تھے اور نامور وکیلوں۔ انجینئرز۔ صحافیوں اور پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والوں کی طرح اپنی تمام عمر کے تجربے کی پوری قیمت وصول کرنا بالکل جائز سمجھتے تھے۔ وہ ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سروسز اور وزیرِ صحت بننے کا شوق بھی پورا کر چکے تھے۔ اپنے ملک میں اور دنیا کے ہر ملک میں متعدد بار ماہرین کے سیمیناروں میں شرکت کر چکے تھے اور اپنے تحقیقاتی مقالوں پر نہ جانے کتنی بار انہیں اعزازی فیلوشپ دی جا چکی تھی۔ سنا ہے عالمی ادارۂ صحت کے تحت جنیوا میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں ان کی شہرت سے متاثر ہو کے ڈاکٹر کرسچن برنارڈ نے انہیں تبدیلیِ قلب کے پہلے آپریشن میں اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی تھی جو یقیناً بہت بڑا اعزاز تھا اور ایک یادگار تجربہ ہوتا۔ لیکن ڈاکٹر فاروقی نے کہا کہ ایک لاکھ ڈالر ٹیکس فری۔ فرسٹ کلاس آنے جانے کا ٹکٹ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کا بندوبست ہو جائے تو مجھے اس تاریخی آپریشن میں شریک ہو کے خوشی ہوگی۔ ڈاکٹر کرسچن برنارڈ نے تحمل سے کہا "اب مجھے اس قسائی کو آپ کی جگہ دے کر خوشی ہوگی جو مجھ سے ایک ڈالر نہ مانگے اور انسانی فلاح کے لیے اپنے چھری چاقو لے کر کھانا کھائے بغیر سائیکل پر اسپتال پہنچ جائے" ڈاکٹر فاروقی نے بھی یہ بات تحمل سے سُنی۔

ڈاکٹر جمال نے پہلی شادی والدین کے اصرار پر کی تھی مگر اولاد نہ ہونے پر پانچ سال بعد اسے چھوڑ دیا تھا۔ ان کی دوسری بیوی بھی انہی کی طرح بڑی نامور گائناکولوجسٹ شمار ہوتی تھیں اور کسی معاملے میں ان سے کم نہ تھیں۔ ان کا رویّہ بھی اتنا ہی غیر جذباتی اور کاروباری تھا۔ وہ بھی لالچی اور بے ضمیر کہلا کے شرمندہ نہیں ہوتی تھیں۔ ایسا کہنے والے وہ لوگ تھے جن کے نصیب میں دوسروں کی کامیابیوں پر حسد کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ کہ میاں بیوی نے لاکھوں اور پھر کروڑوں کمائے۔ انہیں انوسٹ کرکے مزید کمایا۔ انہوں نے شیئرز مارکیٹ رینٹل اسٹیٹ اور کاروں کے شورومز میں بلیک منی کو اپنے انکم ٹیکس ایڈوائزر کی مدد سے اس طرح کیموفلاج کر دیا تھا کہ ان کے مجموعی اثاثوں کا اندازہ کرنا خود ان کے لیے ممکن نہ رہا۔

عبرت پکڑنے اور پکڑانے کے شوقین اور بہت سے لوگوں کے ساتھ مسٹر اور مسز جمال کی مثال دیتے تھے کہ خدا نے سب کچھ دیا۔ اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ اتنی شہرت اور عزت ہے۔ دولت کے انبار ہیں مگر اولاد پھر بھی نہیں۔ پہلی والی بیوی سیدھی سادی گریجویٹ گھریلو قسم کی عورت تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ قصور اس کا نہیں تھا۔ اس نے دوسری شادی ایک ٹیلر ماسٹر سے کی تو اولاد کی لائن لگ گئی۔ ٹیلر ماسٹر اب لاہور کے ٹاپ کلاس ٹیلرز میں شمار ہوتا تھا اور اپنی خوشحالی کو اپنی بیوی بچوں کے نصیب سے منسوب کرتا تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ اگر وہ ڈاکٹر جمال کے بچوں کی ماں بن سکتی تب بھی خوش نہ رہتی اور ڈاکٹر جمال کا بھی اس کے ساتھ گزارا نہ ہوتا۔ انہیں اپنی ہم رتبہ اور مزاج آشنا قسم کی سوشل وائف کی ضرورت تھی جو گھر سے باہر ان کے ساتھ پُرانی فاکس ویگن نہ لگے۔ نئے ماڈل کی مرسڈیز نظر آئے۔ ان کے شایانِ شان اور قابلِ فخر۔

دوسری بیوی گائنی اسپیشلسٹ تھیں اور نہ جانے کتنی بے اولاد ماؤں کی گود اپنے اعجازِ مسیحائی سے بھر چکی تھیں مگر ان کے ساتھ بھی قدرت نے مذاق ہی کیا کہ ان کے وجود کی مٹی ممتا کی نمو سے محروم رہ گئی۔ ان کے ساتھ بھی یہ "ظلم" والدین نے ہی کیا تھا کہ بنا پوچھے انہیں ایک بہت بڑی بزنس مین فیملی میں بیاہ دیا تھا۔ ان کا شوہر بلاشبہ تعلیم یافتہ مہذب اور اسمارٹ آدمی تھا۔ ان سے محبت بھی کرتا تھا اور اگر اس کے اختیار کی بات ہوتی تو شاید اس نوشتۂ تقدیر کو اللہ کی رضا سمجھ کے قبول کر لیتا مگر اس کے والدین

نے دو سال بعد معلوم کر لیا کہ قصور باغباں کا نہیں۔ یہ شاخ بے ثمر کبھی بار آور نہیں ہو سکتی۔ وہ پُرانے وقتوں کے اولاد کو اللہ کی رحمت سمجھنے والے لوگ تھے اور کم بچے خوشحال گھرانا کے فلسفے سے یوں بھی اتفاق نہیں کرتے تھے کہ خوشحالی تو ان کے گھر کی باندی تھی۔ انہوں نے اپنے پہلے بیٹے کی شادی فیملی پلاننگ کے محکمے کو کامیاب بنانے کے لیے نہیں کی تھی اور نہ ان میں حوصلہ تھا کہ وہ سارے زمانے کی صورت پر لکھے ہوئے سوالیہ نشان کا کوئی جواب دے سکیں۔ ان پر تو دُہرا الزام آتا تھا۔ ان کی اولاد کسی قابل نہیں یا پھر انہوں نے بیٹے کی زندگی خود برباد کی۔ بہو کا انتخاب سو فیصد ماں نے اپنی پسند سے کیا تھا۔ اس مشکل کا روایتی حل دوسری شادی تھا۔ پہلی بیوی کے اسٹیٹس کو چھینے کے حق میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پہلی بیوی کا ٹائٹل اپنے پاس رکھتے ہوئے "ہنسی خوشی" الگ گھر میں بھی رہ سکتی تھی لیکن عملاً یہ ممکن نہ تھا کہ اس گھر میں رہ کے وہ زمانے بھر کی بنجر زمینوں کو زرخیزی کے قابل بناتی رہے اور خود بنجر زمین ہونے کا پُرتمسخر طعنہ بن کے بھی برداشت کرے۔

باہمی رضا مندی اور حقیقت پسندانہ افہام و تفہیم کے ساتھ ڈاکٹر جمال نے انہیں اپنے سفرِ حیات میں شریک کر لیا۔ اولاد کی ضرورت اپنی جگہ مگر ازدواجی زندگی رفاقت کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ معاشرتی سوچ کا نتیجہ ہے یا عورت کی حقیقت کہ وہ مرد کے سہارے کے بغیر خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے اور شوہر کے گھر کے سوا کسی گھر کو اپنا گھر سمجھ کے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ مرد تو آدم کی طرح ازل سے حوّا کی بیٹی کے بغیر خود کو ادھورا سمجھتا ہے اس کی ذات' اس کے گھر' اس کی دنیا کی تکمیل وہ عورت کرتی ہے جو بیوی کہلاتی ہے۔

ڈاکٹر جمال نے اپنی بیوی کی مرضی اور خواہش کو ہمیشہ مقدم رکھا اور ہر لحاظ سے ایک مثالی شوہر کہلائے۔ خود انہیں بیوی نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور انہوں نے نظریۂ ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے تمام عمر بھرپور محبت کی۔ یہ ذہنی ADJUSTMENT تھی جو رفتہ رفتہ حقیقی جذباتی تعلق میں بدل گئی۔ دونوں صحرا میں راہ گم کردہ مسافروں کی طرح ملے تھے۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اتفاقِ رائے سے انہوں نے کوئی بچّہ گود لینے کا فیصلہ کیا اور خود ان کے خاندانوں میں بھانجوں بھتیجوں کی کمی نہ تھی جو کہیں نہ کہیں ہر سال ۔ ے تواتر کے ساتھ وارد ہو رہے تھے۔ انہوں نے بہتر سمجھا کہ نہ وہ کسی سے ہمدردی کرتے ہوئے ایک بچّے کی پرورش کا بار ہلکا کریں اور نہ کوئی ترس کھا کے انہیں ایک بچّہ دینے پر رضامند ہو تو وہ بارِ احسان سے تمام عمر دبے رہیں۔ کوئی لاکھ وعدے کرے قسمیں کھائے یا اسٹامپ پیپر لکھ دے کہ اب وہ کبھی اپنا بچّہ واپس نہیں مانگیں گے اور نہ کبھی اس سے تعلق کو ظاہر ہونے دیں گے مگر ماں باپ کی جگہ لینے والے خود کو جذباتی دباؤ سے آزاد نہیں کر سکتے اور اس خوف کے پُل صراط پر چلنا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں ہو تا کہ

کبھی حقیقت از خود آشکار ہو گئی تو کیا ہو گا۔ بیس سال بعد بیٹا انہیں ٹھکرا کے اصل والدین کی طرف لوٹ جائے گا یا وہ ساری زندگی مصنوعی رشتوں کی زنجیر میں بندھے رہیں گے۔ ماں کی محبت باپ کی شفقت اور بیٹے کی سعادت مندی کا ڈراما فلاپ ہو جانے کے بعد بھی چلتا رہے۔ تو۔ اس سے کہیں بہتر ہو گا کہ وہ کسی لاولد لاوارث بچے کو اپنا بیٹا بنا لیں۔ بچے جائز اور ناجائز نہیں ہوتے' صرف بچے ہوتے ہیں۔ جائز یا ناجائز ان کا تعلق ہو سکتا ہے جو انہیں وجود عطا کرتے ہیں۔

ایک بار وہ کراچی میں تھے کہ انہیں مولانا عبدالستار ایدھی کے اپنا گھر اور کاشانۂ اطفال کا پتا چلا۔ نادار فقر سے شانِ سکندری کو ٹھکرا دینے والے اس درویش خود آگاہ کے پیکر میں اقبال کا مردِ مومن مجسم ہو گیا تھا۔ ثواب کی پروا کیے بغیر وہ سارے زمانے کے عذاب سمیٹتا پھرتا تھا۔ اس کو نہ ستائش کی ضرورت تھی اور نہ کسی ہرزہ سرائی کا خوف۔ وہ لاوارث بچوں کو ورثا تک پہنچاتا تھا۔ جن کے گھر نہیں تھے انہیں عبدالستار ایدھی نے اپنا گھر فراہم کر رکھا تھا۔ وہاں ڈاکٹر جمال کو وہ پالنا نظر آیا جو بیک وقت بزدلی اور بے ضمیری کا بدنما آئینہ تھا تو شرفِ انسانیت کا عکاس بھی۔ یہ جبر کی صلیب تھی جس پر ماؤں کی ممتا اور بے گناہ بچوں کی معصومیت قربان کی جاتی تھی تو یہ مولانا عبدالستار ایدھی ہی تھے۔۔۔ جو انسان کے دکھ درد کو مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر اپناتے ہیں۔ اور یہ ثبوت تھا کہ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ بڑا ہے۔

یہاں ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ رسوائی یا رزق کے خوف سے معصوم بچوں کو ہلاک نہ کریں۔ اس پالنے میں ڈال جائیں۔ یہ عام پنگھوڑا یا پالنا تھا جس میں آج بھی شیر خوار بچے ماں کی لوری سن کے جھولتے ہوئے سو جاتے ہیں۔ مگر اس میں رات کو بن بیاہی۔ مجبور یا نامعلوم مائیں وہ بچے ڈال جاتی تھیں جن کو اپنانے کا حوصلہ کسی میں نہ تھا۔ وہ منہ سر چُھپا کے چادر میں لپٹی ہوئی یا برقعہ پہن کے خود آتی تھیں یا کسی کو بھیج دیتی تھیں اور یہ لوگ نوزائیدہ بچے کو ستار ایدھی کی آغوشِ شفقت میں پھینک کے فرار ہو جاتے تھے۔ پھر کبھی لوٹ نہ آنے کے لیے اور یہ بچے زندہ رہتے تھے۔ پرورش پاتے تھے اور دنیا میں انہیں بھی وہ سب کچھ مل جاتا تھا جو ماں باپ

سے نہیں ملا تھا۔ بعض اوقات توماں باپ بھی سب کچھ نہیں دے پاتے۔ مستقبل میں کس کے نصیب میں کیا ہوگا۔ یہ فیصلہ وقت کرتا ہے۔

سب کچھ دینے کا ایسا ہی ایک فیصلہ کاتبِ تقدیر نے کمال کے حق میں بھی کردیا تھا اور اس پر عمل درآمد کے لیے ڈاکٹر اور مسز جمال کا انتخاب یا تقرر بھی اسی لمحے ہوگیا تھا۔ جب وقت آیا تو کمال کے والدین فوراً وہاں پہنچ گئے جہاں تین سال کا بھولا بھالا کمال بہت سے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا۔ جب اسے ڈاکٹر کمال کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے روتے ہوئے کسی کی شکایت کی۔ اس کی توتلی زبان اور اندازِ معصومیت پر مسز جمال ہزار جان سے فریفتہ ہوگئیں۔ یقیناً اس کی ماں یا باپ میں سے کسی کا رنگ اتنا صاف ہوگا۔ بال ایسے ہی سنہرے مائل بھورے ہوں گے اور آنکھیں ایسی ہی پرکشش سبز ہوں گی۔ نہ جانے کیوں انہیں وہ بچہ بالکل اپنے شوہر ڈاکٹر فاروقی جیسا لگا۔ شاید یہ وہی۔ آرزو سے بے فریب آرزو مطلب مجھے۔ والی بات تھی۔ ریکارڈ میں اس کا نام کمال دیکھ کے انہوں نے اسے کمال فاروقی بنالیا۔

محبت کا رُکا ہوا دریا جب بہنے پر آیا تو جیسے سیلاب آگیا۔ کمال اچانک دنیا کا سب سے اہم بچہ بن گیا۔ اس کی آیا مقرر ہوئی۔ ایک گورنس رکھی گئی اور خود ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کا وہ سارا وقت جو پہلے سماجی مصروفیات کی نذر ہوجاتا تھا اب کمال کے لیے وقف ہوگیا۔ اس کے جوتے، کپڑے، کھلونے، کتابیں وغیرہ تو خیر ضروریات میں شامل تھے مگر اس کی ہر فرمائش پوری کرنے کے لیے ایک گاڑی معہ ڈرائیور ہروقت موجود رہتی تھی۔ اس کی سالگرہ۔ اسکول کی ہر کلاس میں کامیابی اور ترقی پر جشن کا اہتمام۔ اس کے دوستوں کی دعوتیں، پارٹیاں۔ سب ڈاکٹر اور مسز جمال کے لیے خوشیوں کے انمول خزانے تھے۔ یہ سنڈریلا جیسی کہانی تھی۔ طلسم ہوشربا کا ایک باب تھا۔ کل تک لاوارث اور ناجائز سمجھا جانے والا بچہ اچانک شاہزادہ ہوگیا تھا۔ شاہی محل میں پہنچ گیا تھا اور ولی عہد بن گیا تھا۔

تاہم نازبرداری کی انتہا اور لاڈ پیار کی افراط کے ساتھ دولت کی فراوانی نے کمال کو بگاڑا نہیں۔ کتابی فلسفہ اپنی جگہ۔ بچوں کو پرورش کے دوران پیش آنے والے نفسیاتی مسائل کی اہمیت اپنی جگہ مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں ان گنت مثالیں ایسے لوگوں کی ہیں جو بدترین معاشرتی حالات سے دوچار ہوئے۔ انتہائی ناسازگار اخلاق و کردار کو بگاڑ دینے والے اور شخصیت کو مسخ کردینے والے ماحول میں پلے بڑھے، نفرتوں کا زہر پی کے اور احساسِ محرومی کی ذلت کے کانٹوں پر چل کے عمر کی مسافت طے کی لیکن ان کے خون میں یا ضمیر میں یا فطرت میں کوئی ایسی بات تھی۔ (جسے اب سائنس DNA کی موروثی صفات تسلیم کرتی ہے)

جو ان کی محافظ تھی اور دنیا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ بُت گر کے گھر میں بُت شکن پیدا ہوا۔ کوئی ابنِ مریم ہوا۔ کسی کو سائنس کی ڈگری کے بغیر ایڈیسن کی طرح موجدِ اعظم بنادیا۔ کسی کو گونگا بہرا ہونے کے باوجود بیتھوون جیسا عظیم موسیقار اور آسٹریلیا کے ایک گلہ بان کو ڈان بریڈ مین جیسا کرکٹر۔ دنیا کی ساری مخالف قوتیں مل کر ان کا راستہ نہ بدل سکیں اور نہ روک سکیں۔

اسی DNA فیکٹر نے کمال کو وہ بنایا جو وہ آج تھا۔ ڈاکٹر کمال احمد فاروقی ایم بی بی ایس ایل ایل بی۔ وہ بے پناہ قوتِ خرید کا اور قوتِ تسخیر کا مالک تھا مگر اس نے عیاشی اور آوارہ مزاجی میں بدنامی کا سودا نہیں کیا اور برائی کی ساری کشش اس کو صراطِ مستقیم سے نہ ہٹا سکی۔ وہ ذہین حساس اور ذمے دار تھا۔ کم عمری میں ہی اس کا شعور قابلِ رشک حد تک مثبت پہلو رکھتا تھا۔ اس کی شرارت میں بھی شرافت ہوتی تھی۔ ظرافت میں متانت۔ اس کا بڑا اعتماد انداز۔ رکھ رکھاؤ۔ میانہ روی اور احتیاط پسندی دیکھ کے ڈاکٹر جمال بھی حیران ہوتے تھے۔ وہ بیوی سے کہتے تھے "بھئی ہم نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اسے بگاڑنے میں۔ لیکن یہ بگڑا نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"ایسا کیا غلط کام کیا تھا ہم نے؟" بیوی پوچھتی۔

"ارے بابا۔ اتنا پیسہ ہوتا میرے پاس۔ اور پوچھنے والا کوئی نہ ہوتا تو میں پڑھ کے نہ دیتا۔ اس عمر میں شراب اور شباب کی ساری خرمستی سوجھتی۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں کے پاس منگنی کی انگوٹھی ہوتی۔ نہ جانے کتنی اس چکر میں سب کچھ لٹا چکی ہوتیں اور پھر بچے ضائع کرتیں یا اپنی زندگی۔ سچ پوچھو تو ہم نے بڑی دشمنی کی تھی اس کے ساتھ؟"

"کیا فضول بات ہے!"

"یہ حقیقت ہے۔ اس کی تربیت ہم نے کب کی تھی۔ آیا اور گورنس تھیں۔ پیسے سے خریدی ہوئی۔ باقی سب کچھ بھی پیسے نے کیا۔ پیسہ ہی بگاڑتا ہے انسان کو اس عمر میں۔ خصوصاً اس وقت جب وہ بے حساب ہو اور ہروقت حاضر ہو۔"

کمال نے ایم بی بی ایس کرنے تک ہر کلاس میں اوّل پوزیشن تو نہیں لی مگر اپنا ریکارڈ شاندار رکھا۔ اسے ٹینس کھیلنے کا اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ لڑکیوں کا آئیڈیل تھا۔ بنا بنایا ہیرو۔ دولت مند۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ خوش شکل۔ خوش باش۔ خوش مزاج۔ مگر بدقسمتی سے وہ دل پھینک نہیں تھا اس لیے میڈیکل کالج میں ایک لڑکی پسند کرلی تھی اور ان کی محبت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ یہ طے تھا کہ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرتے ہی وہ شادی کرلیں گے۔ اس لڑکی کے والدین بھی اچھی حیثیت رکھنے والے کاروباری لوگ تھے۔ ڈاکٹر جمال نے اور ان کی بیوی نے بیٹے کا مستقبل پہلے ہی پلان کرلیا تھا۔ ڈاکٹر بننے کے بعد وہ اپنے اسپتال کا مالک ہوگا اور یہ کوئی معمولی اسپتال نہیں ہوگا۔ یہ شہر کا سب سے بڑا اسپتال ہوگا۔

درجنوں اسپیشلسٹ اس کے ایک کمرے میں بیٹھنا اپنے لیے اعزاز کی بات سمجھیں گے۔ اس میں تمام ماڈرن مشینری ہوگی۔ سی ٹی اسکینر سے لے کر ایم آر آئی۔ گاما کیمرا اور لیتھوٹرپسی تک۔ ایکس رے الٹرا ساؤنڈ اور ڈایالیسس مشین تو معمولی چیزیں ہیں، یہ بھی طے تھا کہ کمال کی شادی اسپتال کا انتظام سنبھالنے کے بعد کردی جائے گی اور میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہوں گے تو ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کے خواب کی تعبیر مل جائے گی۔ اس خواب میں ایک ہنستا بستا گھر بھی شامل تھا جس میں بیٹے بہو کے ساتھ پوتوں پوتیوں کی چیخ پکار تھی۔ رونے ہنسنے کی، توڑ پھوڑ کی اور دادا دادی کو اپنی توتلی آواز میں "بابا بلیک شیپ" سنانے کی سب آوازیں شامل تھیں۔

کمال جب فائنل ایئر میں پہنچا تو اسپتال کی پلاننگ شروع ہوگئی۔ کاغذی نقشے۔ تخمینے اور منصوبے کی تفصیلات پر عمل درآمد کے لئے ڈیزائنر اور ایڈوائزرز بلائے گئے۔ کون سی چیز کہاں سے آئے گی۔ کب آئے گی۔ عمارت کیسی ہوگی۔ کب تک مکمل ہوگی۔ اس میں توسیع کی کتنی گنجائش ہوگی۔ پہلے مرحلے میں کیا ہوگا۔ دوسرے میں کیا۔ اس کا افتتاح کب تک ممکن ہوگا۔

مگر تدبیر کند بندہ۔ تقدیر کند خندہ۔ لینے کا عادی یہ بھول جاتا ہے کہ دینے والا بہرحال واپس لینے پر بھی قادر ہے۔

وہ واحد لڑکی جس سے کمال محبت کرتا تھا فائنل ایئر کا امتحان دے کے مرگئی۔ کسی وجہ کے بغیر۔ اچانک۔ وہ ایک شادی میں اپنی فیملی کے ساتھ کراچی گئی اور وہاں کے کسی فساد زدہ علاقے سے گزرتے ہوئے کراس فائر کی زد میں آگئی۔ حالات بالکل معمول پر تھے کہ اچانک فائرنگ شروع ہوئی اور ایک گولی نہ جانے کدھر سے آئی اور کیوں آئی مگر پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی باہر کی رونق کا نظارہ کرنے والی آنکھیں چند منٹ میں بے نور ہوگئیں۔ گھر والے اسے کراچی میں ہی سپردِ خاک کرکے لوٹ آئے۔

کمال نے زبردست قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا مگر اس نے اپنا فرنٹ سلامت رکھا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ کمال کی اسپتال کے پراجیکٹ میں دلچسپی ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی نے دوراندیشی اور دانش مندی سے کام لیا۔ انہوں نے بھی اس پر کام روک دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ان حالات میں کمال اگر اسپتال چلانے پر راضی نہیں تو شادی پر کیسے راضی ہوگا مگر وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے۔ وہ ہر درد کا، ہر زخم کا درماں رکھتا ہے۔ کمال سب کچھ کرے گا۔ کسی اور لڑکی سے محبت بھی۔ شادی بھی۔ اور وہ اسپتال بھی بنائے گا اور چلائے گا۔ مگر ابھی نہیں ابھی صبر۔ انتظار۔ کوشش۔ دعا۔ یہی سب کیا جاسکتا ہے اور بہتری کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر بن جانے کے باوجود کمال کا ڈاکٹری کے پیشے سے دل اُچاٹ ہوگیا تھا۔ ایک جانے مانے سائیکاٹرسٹ نے ڈاکٹر جمال کو بتایا کہ یہ فطری بات ہے۔ ڈاکٹری کے ساتھ کمال کے کچھ خواب وابستہ تھے۔ ان کی تعبیر اُلٹی ہوگئی تو اب اسے اپنا خواب ہی جھوٹا لگتا ہے۔ کمال نے جیسے ماہرِ نفسیات کو غلط ثابت کرنے کے لیے میو اسپتال میں ہاؤس جاب کیا اور پھر شعبۂ حادثات میں ڈیوٹی لگوالی۔

ڈاکٹر جمال کے لیے یہ خاصی مایوس کن صورتِ حال تھی مگر اس ماہرِ نفسیات نے انہیں تسلی دی "یہ فطری بات ہے۔ ان کی محبت کا خون ہوا تھا۔ اب وہ ہر روز خون دیکھتا ہے۔ حادثات میں اور آپس کے لڑائی جھگڑوں میں خنجر یا گولی سے مرنے والوں کو دیکھتا ہے۔ وہ لاشعوری طور پر یقین کا سہارا تلاش کررہا ہے کہ دنیا میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ سب کے ساتھ ہوتا ہے اور ہر جگہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ اِٹ از اے گڈ سائن۔ ویری پازیٹو۔ وہ حقائق سے سمجھوتا کرے گا۔ پھر وہ محسوس کرے گا کہ اپنے جیسے زخم خوردہ لوگوں کے لیے سرکاری اسپتال میں نہیں۔ ذاتی توجہ کے ساتھ اپنے اسپتال میں کچھ کرنا چاہیے۔ عمران خان کی مثال لو۔ شوکت خانم میموریل اسپتال نتیجہ ہے ایک ذاتی صدمے کے ردِعمل کا۔"

کمال نے پھر ماہرِ نفسیات کو شرمندہ کیا۔ اس نے اپنے باپ سے کہا "میں پولیس سروس جوائن کرنا چاہتا ہوں۔"

"پولیس سروس؟" ڈاکٹر جمال کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی مگر وہ سنبھل گئے "ڈاکٹر بننے کے بعد!"

"لیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ پولیس میڈیکو لیگل کیس میں کیا کرتی ہے۔ قتل کو حادثہ۔ حادثے کو قتل۔ تشدد سے مرنے والے کو خودکشی۔ غلط رپورٹیں۔ سب قتل کی بھی اور پوسٹ مارٹم کی بھی۔"

"تو تم یہ سب ختم کردو گے اگر پولیس سروس میں چلے گئے اور کہیں اے ایس پی لگ گئے۔ مثلاً منڈی بہاؤ الدین میں یا گوجر خان میں۔" مسز جمال نے کہا "تم اپنی انرجی اور اپنا وقت ضائع کرو گے۔ کمال۔ یہاں سب کچھ ناقابلِ اصلاح ہے۔"

"میں میڈیکو لیگل افسر یا پولیس سرجن بن کے کچھ ضرور کرسکتا ہوں" کمال نے سوچ کے کہا۔

"کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ قانون میں اتنے سقم ہیں کہ قانون کے محافظ اور قانون داں۔ دونوں ان سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم قانون تو بدل نہیں سکتے۔ کوشش کرکے دیکھ لو۔"

"اچھا میں قانون پڑھ کے دیکھتا ہوں" کمال نے کہا۔

اس نے قانون کا امتحان ہی پاس نہیں کیا۔ فوجداری اور قانونِ شہادت وغیرہ پر عبور حاصل کرلیا۔ اس نے شعبۂ حادثات کے کیس دیکھے اور ان مقدمات پر پولیس رپورٹس کے ساتھ عدالتی کارروائی دیکھی تو وہ سخت مایوس ہوا۔ اصل مشکل ان کی تھی جن کا جینا مشکل تھا۔ ان کے لیے کچھ کرنا زیادہ مشکل ہوجاتا تھا۔ لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعا تک قبول نہیں ہوتی تھی۔ وہ مجرم یا مشکوک بنادیے جاتے تھے۔ تاریخ اور پیشیاں بھگتنے کے بعد

قانون کے شکنجے سے گلو خلاصی کی دعائیں مانگتے تھے کہ مرنے والا تو مرگیا۔ نقصان کی تلافی گئی بھاڑ میں۔ سزا کا مستحق جائے جہنم میں۔ ہم کس کھاتے میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ صرف ایک سال میں ڈاکٹر کمال نے زندگی کا وہ پہلو دیکھ لیا تھا جس پر کبھی اس کی نظر نہیں گئی تھی۔

ایم ایل او یا پولیس سرجن بننے کی راہ میں شاید کوئی رکاوٹ نہ ہوتی اور اس کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ ڈاکٹری کے علم کی صلاحیت کا سب سے بہتر استعمال وہ اسی طرح کرسکتا ہے۔ ایک بار پھر تقدیر نے اس کے ارادوں کو شکست دی۔

ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کسی بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کرکے امریکا سے وطن واپس آتے ہوئے لندن میں رُک گئے۔ وہ فیصلہ کرچکے تھے کہ اب اسپتال کے پراجیکٹ پر کام پھر شروع کروا دیا جائے۔ امریکا اور لندن کے بعد ان کو جرمنی جانا تھا اور اپنے اسپتال کے لیے مشینوں کے آرڈر کی تجدید کرنا تھی۔ انہوں نے لندن سے کمال کو فون پر اطلاع دی کہ... دو دن لندن میں اور ایک دن جرمنی میں گزار کے وہ لاہور پہنچ جائیں گے۔ جمعرات کی رات کو وہ فون پر فلائٹ نمبر بتادیں گے تاکہ انہیں لینے کے لیے ڈرائیور گاڑی کے ساتھ ائرپورٹ پہنچ جائے۔

جمعرات کی رات کو اسے متعدد سمتوں سے گھوم پھر کے آنے والی فون کال ملی۔ یہ لندن پولیس کا پیغام تھا جو پاکستانی ہائی کمیشن پہنچا۔ وہاں سے وزارتِ خارجہ۔ داخلہ اور صحت کے متعلقہ افسران تک پہنچا اور پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن لاہور کی معرفت کمال کو ملا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ دو دن قبل لندن کی انڈر گراؤنڈ ریلوے میں آئرش ری پبلک آرمی نے جس دھماکے کی ذمّے داری قبول کی تھی اس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں دو کا اضافہ ہوگیا ہے۔ ان دو کے بارے میں اندیشہ ہے کہ یہ پاکستان کے نامور، قلب کے سرجن ڈاکٹر جمال اور ان کی وائف تھے۔ اسے ان کی شناخت کے لیے فوراً لندن کے آکسفورڈ کراموبل اسپتال پہنچ جانا چاہیے۔"

کمال کو ایمرجنسی میں سیٹ فراہم کی گئی۔ لندن پہنچ کے اس نے لاشوں کو دیکھا۔ چہرے ناقابلِ شناخت تھے مگر اسباب سے کمال نے لاشوں کو پہچان لیا۔ ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کی تدفین لاہور میں ہوئی۔ اس سے سیکڑوں لوگوں نے تعزیت کی۔ مرحوم کے دوست احباب۔ رشتے دار۔ کمال کے جاننے والے۔ سرکاری حکّام۔ وہ سب سے یکساں سپاٹ چہرے کے ساتھ ملتا رہا اور ایک جیسی باتیں سُن سُن کے تنگ آگیا۔ اسے ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ وہ سوچنا چاہتا تھا اور اسے بہت سے اہم فیصلے کرنے تھے جن کا تعلق اس کی زندگی اور مستقبل سے تھا مگر اسے تنہائی میسر نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنے ہمدردوں اور غمگساروں کی اس یلغار سے زیادہ پریشان ہوگیا تھا کیونکہ وہ کھلے دوغلے پن اور منافقت کی باتوں کو بھی اخلاص نہ سمجھنے پر مجبور تھا اور جواب میں اتنے ہی دوغلے پن اور منافقانہ جذبات کے ساتھ ان کے خلوص کا پتہ دل سے شکریہ ادا کرنے پر بھی جب کہ اسے سب کی پہچان تھی۔ وہ غرض مند اور بے غرض تعلق کے رشتوں سے خوب آشنا تھا۔ دوسری طرف قانونی معاملات تھے۔ وراثت کے اور حقوقِ ملکیت کے۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر جمال کے اور ان کی بیوی کے اکاؤنٹ میں جتنا پیسہ ہے وہ اسے ہی ملے گا مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ایک وہ کوٹھی تھی جس میں وہ اب رہتا تھا۔ ایک وہ جس کو انہوں نے پانچ سال قبل چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ ذرا آؤٹ آف ڈیٹ ہوگئی تھی۔ پھر وہ جو اس سے بھی پانچ سال قبل کی متروکہ رہائش گاہ تھی۔ یہ دونوں کوٹھیاں کرائے داروں نے آباد کر رکھی تھیں۔ دس کنال کا وہ پلاٹ تھا جس پر ایک جدید ترین اسپتال بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا تھا۔ شیئرز مارکیٹ کے حصص تھے۔ کچھ شورومز میں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہاشمی صاحب مشیر انکم ٹیکس، پرانے وکیل اور ڈاکٹر جمال کے خاص دوست تھے چنانچہ کمال چاہتا تھا کہ وہ تمام معاملات کو اس طرح دیکھتا رہے جیسا کہ پہلے دیکھتا تھا لیکن وہ مصر تھے کہ کمال پہلے یہ سب دیکھ لے اور سمجھ لے۔ اب جو فیصلے ڈاکٹر جمال کرتے تھے وہ آئندہ ڈاکٹر کمال ہی کو کرنے ہوں گے۔

غم خواروں میں اکثریت ان کی تھی جو اپنی کسی نہ کسی بیٹی کو کمال کے سر منڈھنے کے خواہش مند تھے اور اس کے بزرگ یا سرپرست بننے کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کے حصّے لے رہے تھے۔ براہِ راست مقابلے میں شریک خواتین بھی کم نہ تھیں۔ ان میں سے کچھ والدین کی شہ پر آگے آئی تھیں اور باقی خود کو ذاتی معاملات میں خود مختار سمجھتی تھیں۔ چند لیڈی ڈاکٹرز جو مرحوم جمال صاحب کے پروجیکٹ کے بارے میں جانتی تھیں اب کمال کو آمادہ کررہی تھیں کہ وہ اس منصوبے کو مکمل کرے۔ ان کا پورا تعاون اسے ہروقت حاصل رہے گا۔

تنگ آکے کمال نے سب نوکروں کو ایک ہفتے کی چھٹی دی اور خود ہاشمی صاحب کے گھر منتقل ہوگیا۔ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ وہ گلبرگ کی کوٹھی میں اپنے دو بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ رہتے تھے۔ ہاشمی صاحب نے اس سے وکالت نامے پر دستخط کروائے تھے اور وراثت نامے کے اجرا کی قانونی کارروائی بھی شروع کردی تھی۔ بینک بیلنس کا حساب آسان تھا۔ اکاؤنٹ اسٹیٹ منٹ میں بالکل صحیح اعداد و شمار سامنے رکھ دیے گئے تھے۔ جائداد کی مالیت کا صرف اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ اس احساس نے کمال کو پریشان کردیا کہ اس کے مجموعی اثاثے پانچ کروڑ سے زائد تھے۔ جمال صاحب نے تقریباً نصف اثاثے اپنے اسپتال کے منصوبے کے لیے وقف کردیے تھے۔ اسپتال کے لیے مشینوں کے آرڈر دیے جاچکے تھے اور تعمیراتی ٹھیکے بھی منظوری کے منتظر تھے۔ ایک سال میں اسپتال

کی عمارت مکمل ہوجاتی اور اس کے بعد تین ماہ کے اندر مشینوں کی تنصیب کے ساتھ ہی اسپتال شروع ہوجاتا۔ یہ بہت بڑا کام تھا اور ایسا لگتا تھا کہ سوائے کمال کے باقی سب کے لیے یہ اسپتال ہی سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ کمال اتنے لمبے چوڑے کام میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مزید دولت کمانے کے خیال سے ہی اسے وحشت ہوتی تھی۔

"ہاشمی صاحب۔ میں اس بکھیڑے میں پڑ کے کیا کروں گا۔"

ہاشمی صاحب نے اسے ڈانٹا "لاحول ولا قوۃ۔ تم اسے بکھیڑا کہتے ہو۔ یہ تمہارے والد کا خواب تھا۔"

"ہوگا مگر میرا کوئی خواب نہیں۔"

"تم اپنے والد کے خواب کو تعبیر دینا نہیں چاہتے؟"

"ہاشمی صاحب۔ ان کی زندگی میں بھی مجھے کبھی اس منصوبے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ انہی کا منصوبہ تھا جو میری لاتعلقی کے باعث اب تک پورا نہیں ہوا تھا۔ اگر میں چاہتا تو آج یہ اسپتال کاغذی مرحلے میں نہ ہوتا۔ یہ ایک ٹھوس شکل اختیار کرچکا ہوتا۔ ڈیڈی نے اور ممی نے ساری عمر پیسہ کمایا تھا میرے لیے۔ یہ اسپتال بھی میرے لیے بنا رہے تھے۔ میں یہ کام کس کے لیے کروں۔ سب کچھ تو حاصل ہے مجھے اور کما کے میں کیا کروں گا۔ ساری زندگی بیٹھ کے کھاؤں تب بھی یہ پانچ چھ کروڑ ختم ہونے والے نہیں۔ اس کا منافع ہی اتنا ہوگا کہ شاید مجھ سے خرچ نہ ہو۔"

"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم۔ بھلا پیسہ بھی ایسی چیز ہے جو خرچ نہ ہو اور ختم نہ ہو۔"

"میرا مطلب تھا۔ جیسے میں اب رہتا ہوں۔ ویسے ہی رہوں تو بہت ہے۔ لاس ویگاس چلا جاؤں تو ایک ہفتے میں کیا ایک رات میں کسی جوئے خانے میں ہار سکتا ہوں۔ مجھے شوق نہیں ہیں ایسے۔ میں اب سکون اور قناعت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ اسپتال کا کارخانہ مجھ سے نہیں چلے گا۔ جہاں تک ڈیڈی ممی کے خواب کو تعبیر دینے کا سوال ہے تو بے شک یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے۔ اگر یہ منصوبہ ہوتا کارِ خیر کا۔ پھر تو اس کی تکمیل میرا فرض تھا مگر یہ خالص کمرشل پروجیکٹ تھا۔ میں تو ڈیڈی کو بتاچکا تھا کہ پہلے میرا ارادہ پولیس سروس میں جانے کا تھا۔ پھر انہوں نے اصرار کیا کہ میڈیکل کی ڈگری ضائع ہوگی تو میں نے ایم ایل او یا پولیس سرجن بننے کی خاطر ایل ایل بی کیا۔ حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ میں انہی کی طرح بہت بڑا اسپیشلسٹ بنوں۔ مگر مجھے عام آدمی کے علاج اور ان کی بیماریوں کے مسائل سے دلچسپی ہے جو کسی اسپیشلسٹ کے پاس جانا افورڈ نہیں کرپاتے۔ سرکاری اسپتالوں میں انہیں کوئی پوچھتا نہیں اور پوچھے تو نہ ڈھنگ کا مشورہ ملتا ہے اور نہ علاج معالجے کی سہولت۔"

ہاشمی صاحب اس کے جذبات اور خیالات سے متاثر ہوئے۔ کمال کی فطرت سے وہ پہلے ہی واقف تھے اور اپنے مرحوم دوست ڈاکٹر جمال کی مایوسی بھری باتیں بھی وہ سُنتے ہی تھے "یہ لڑکا ذرا بھی AMBITIOUS نہیں ہے لیکن اس کی وجہ بھی میں سمجھتا ہوں۔ وہ ہماری طرح احساسِ محرومی اور فرسٹریشن کا شکار نہیں ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ یہی اطمینان اسے سخت جدوجہد سے اور آگے جانے کی خواہش سے دور رکھتا ہے۔"

ہاشمی صاحب نے کمال کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسپتال کا منصوبہ سردخانے میں چلاگیا۔ اسپتال کے شعبۂ حادثات میں کام کرنا بھی اب اس کے لیے اعصاب شکن کام ثابت ہورہا تھا۔ ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کی مسخ شدہ لاشوں کو دیکھنے کے بعد زندگی کی بدصورتی اور کراہیت کا نظارہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ اس سارے بے سکونی اور بے قراری کے پُرآشوب دور میں اس کا واحد دوست میں تھا جس پر وہ بھروسا کرتا تھا۔ وہ میرے ساتھ بھٹکتا رہا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے مجھے اپنے ساتھ کھینچ لیا اور جہاں گیا اپنے ساتھ رکھا۔ دنیا کے کسی شہر میں اس کا دل نہیں لگا۔ نہ اسے روم کے نظارے لُبھاسکے، نہ پیرس کے شب خانے، نہ مونٹی کارلو کے جوئے خانے اور نہ ہانگ کانگ اور ٹوکیو کے قحبہ خانے۔ وہ فراریت پسند ہوگیا تھا۔ اس پر ایک وحشت سوار تھی جس میں اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ رونق اور ہنگامے جو زندگی کی علامت ہیں اسے بیزار کرتے تھے اور وہ کہتا تھا کہ چلو۔۔۔ اور کہیں چلو۔

تین مہینے بعد ہم لوٹ آئے۔ میں اس سے زیادہ کمال کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی بے مقصد اور بے سمت حرکت پذیری کا علاج صرف یہی ہوسکتا تھا کہ اس کی زندگی کی منزل کا تعین ہوجائے۔ ابھی وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ہر مقصد کو سامنے رکھ کے وہ سوچتا تھا کہ اس سے کیا ہوگا؟ مجھے کیا ملے گا؟ کسی اور کو کیا ملے گا؟ یہ مایوسی کی کیفیت کا ردِعمل تھا کہ وہ کچھ بھی کرنا نہیں چاہتا تھا مگر کچھ کیے بغیر جینا بھی ایک مشکل کام تھا۔

تین مہینے اس نے ایک چیری ٹیبل یا رفاہی ادارے میں مفت کام کرتے گزارے۔ وہ تھر کے علاقے میں موبائل ڈسپنسری کے ساتھ پھرتا رہا اور مریضوں میں دوائیں تقسیم کرتا رہا۔ وہیں اس کے ذہن میں غریبوں کو عام بیماریوں کے لیے مفت علاج معالجے کی سہولت فراہم کرنے کا خیال آیا۔ ہاشمی صاحب اسے پہلے ہی ایک ٹرسٹ قائم کرنے کی تجویز دے چکے تھے مگر وہ کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا۔ وہ تھر کے صحرائی ماحول کی سختی نہ جھیل سکا اور بیمار ہوا تو لوٹ کے لاہور آگیا۔

انہی دنوں تقدیر نے اس پر ایک اور وار کیا لیکن یہ وار اس الیکٹرک شاک کی طرح کام کرگیا جو ذہنی مریضوں کو دورے کی کیفیت میں دیے جاتے ہیں۔ اگر اس کا اثر الٹا ہوتا تو شاید مس شبنم کو دوسروں کے لیے درسِ عبرت بنادیتا۔

نہ جانے کیسے اور کہاں سے شبنم نے کمال کے ماضی کا سُراغ لگالیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈوری کا ایک سرا آگیا تو وہ اس کے سہارے چلتی ہوئی کراچی کے اس ادارے تک پہنچ گئی جہاں کمال کا نام لاوارث بچوں کے ریکارڈ میں موجود تھا۔ اس ادارے کی ساکھ بہت اچھی تھی اور وہاں بااصول اور باضمیر قسم کے ایماندار اور خدا ترس لوگ عبدالستار ایدھی کے مشن میں شریک تھے لیکن سو فیصد لوگ ایسے کہاں ملتے ہیں جن کو ورغلایا نہ جاسکے اور خریدا نہ جاسکے۔ شبنم چور دروازے تلاش کرنے اور ان سے محفوظ ترین حصاروں کے راز چُرانے کا فن جانتی تھی۔ اس نے معلوم کرلیا کہ کمال وہاں کب اور کیسے پہنچا تھا۔ اس نے سارے ثبوت اور سُراغ حاصل کرلیے اور ایک دن میرے پاس پہنچ گئی۔

"آخر تم مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہو؟" اس نے آدھے گھنٹے تک خاصی معقول دوستانہ گفتگو کے بعد کہا۔

"یہ تم نے کیسے فرض کرلیا؟ کسی دشمن نے کان بھرے ہیں تمہارے مس شبنم۔"

"میرے کانوں میں پہلے ہی بہت میل بھرا ہوا ہے' کوئی کچھ نہیں بھر سکتا۔ اگر تم نفرت نہیں کرتے تو پھر مان لو کہ محبت کرتے ہو۔"

میں ہنس پڑا "یعنی نفرت نہ کرنے کا مطلب تمہارے نزدیک اور کچھ نہیں ہوسکتا۔"

اس نے انگلیوں پر گنا "تم میری دعوت قبول نہیں کرتے۔"

"دعوت میں ابھی کھا سکتا ہوں۔"

"کھانے کی بات مت کرو۔ میں نے تمہیں دعوت دی کہ میرے ساتھ مری چلو۔ تم نے مسترد کردی' کاغان نہیں گئے۔ لاہور سے باہر کیا لاہور میں بھی ایک دن میرے ساتھ نہیں گزارا۔ تم مجھے AVOID کرتے ہو۔ اردو میں کیا کہیں گے..... کنی کتراتے ہو۔ سب کے سامنے زیادہ بے رُخی بلکہ بدتمیزی سے پیش آتے ہو۔ مذاق میں بھی دل لگی کی بات برداشت نہیں کرتے حالانکہ تمہارا نام لے کر سارا زمانہ مجھے چھیڑتا ہے۔"

"اس چھیڑخانی سے تمہیں خوشی ملتی ہے تو میں کیا کروں؟ تم نے خود ہی یہ موقع فراہم کیا تھا زمانے کو۔ تمہارے ساتھ بدنام ہونے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔"

"کیا میں واقعی اتنی بُری ہوں؟"

"یہ بھی غلط ہے۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ انتہائی ذہین اور قابلِ اعتماد۔ طبعاً نیک دل اور مثبت سوچ رکھنے والی۔ حسین تو سب ہی کہتے ہوں گے تمہیں اور تم کو خود بھی اندازہ ہوگا۔ تم واقعی قابلِ پرستش ہو۔"

اس کا چہرہ جوش سے دہکنے لگا "پھر تم سب کے سامنے یہ بات کیوں نہیں مانتے؟ دور دور کیوں رہتے ہو؟"

"تم میرے بہت نزدیک ہو۔ میری بہت اچھی دوست ہو۔"

"تم جانتے ہو' میں محبت کرتی ہوں تم سے۔"

"تم سب کو بتاتی پھرتی ہو' کیا یہ اچھی بات ہے؟"

"کیا سچ کا اظہار بُری بات ہے؟" اس نے کہا۔

"پھر میرا سچ بھی مانو۔ میں کسی اور کو چاہتا ہوں۔ وہ محبت تمہیں نہیں دے سکتا جو کسی اور کی امانت ہے۔"

"آخر کون ہے وہ؟ مجھے پتا چل جائے تو میں قتل کردوں اسے۔"

"حیرت کی بات ہے کہ تم اس کا پتا نہیں چلا سکیں اب تک۔ ویسے ایک بات کا خیال رکھنا' اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہ گزرے خود کو سب سے اونچا سمجھتا ہے۔ بفرضِ محال تم نے اس کا سُراغ پالیا اور اسے قتل کرنے کے ارادے سے پہنچ گئیں۔ سر سے کفن باندھے' تیر' تلوار' توپ خانے کے ساتھ..... تب بھی زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ تم خود قتل ہوجاؤ گی..... میں یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"اتنی خطرناک ہے وہ؟"

"پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں پہلے سے۔"

"اوکے۔ اب تم بھی سُن لو۔ میں تم کو بلیک میل کرنے آئی ہوں اس وقت۔ اور میں بھی سنجیدہ ہوں۔"

"میں تیار ہوں۔ تم کوشش کرو۔"

"یہ جو تمہارے دوست ہیں۔ ڈاکٹر کمال فاروقی۔ یہ آج کل کچھ پریشان ہیں۔ شترِ بے مہار کی طرح پھر رہے ہیں۔ صدمات کا اثر ہے۔"

"تم ان کو پاگل بھی کہہ سکتی ہو مگر ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میں ان کو پاگل کہوں گی تو مجھے پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں مگر ایک اور بات ہے جو تم سُنو گے تو یہی کہو گے کہ میں پاگل ہوں۔"

"یہ بات سُنے بغیر بھی میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہو تم اپنے اس دوست کے بارے میں۔ وہ ڈاکٹر جمال کا بیٹا تھا۔ مسز جمال اس کی ماں تھیں؟"

"تمہاری زرد صحافت کی سنسنی خیز سُرخی کیا کہتی ہے؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تمہارے دوست نے کبھی تمہیں کچھ بتایا؟ اس موضوع پر تم سے کوئی بات کی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "بغیر موضوع کے صرف تم بات کرسکتی ہو۔"

"اگر آج اسے حقیقت کا علم ہوجائے تو وہ کیا کرے گا۔ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

"وہ حقیقت اور افسانے میں فرق کرسکتا ہے۔ تم جانتی ہو اس کی زندگی میں دوبار ایسے طوفان آچکے ہیں جن سے خود زندگی کی بنیادیں تک تہس نہس ہوگئی تھیں لیکن وہ زندہ ہے اور اس کا

زندگی پر اعتماد بھی زندہ ہے۔"

"کیا واقعی اس نے اپنی محبت کو بھلا دیا ہے؟" شبنم نے پُرملامت اور افسوس ناک لہجے میں کہا۔

"بھائی یہ مرد ہوتے ہی بڑے کمینے ہیں۔ عورت ہوتی ہے وفا کی پتلی' کہو تو لکھ کے دے دوں۔"

"ڈاکٹر کمال فاروقی کو مرحوم ڈاکٹر جمال فاروقی اور ان کی بیگم نے گود لیا تھا۔" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولی "کراچی میں لاوارث بچوں کے ایک ادارے سے۔"

میں نے کہا "اس اطلاع کا بہت شکریہ۔"

"اس وقت وہ کراچی میں تھے۔ چار سال امراضِ قلب کے قومی ادارے سے وابستہ رہے تھے۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے۔ جب وہ لاہور واپس لوٹے تو ان کے ساتھ یہ تین سال کا بچہ تھا۔"

"جو ان کا نہیں تھا' یہی عرض کررہی ہو نا تم؟"

"ہاں۔ تمہیں معلوم ہے ان کی شادی کو کتنے سال ہوگئے۔ ان کی پہلی بیوی پانچ سال ان کے ساتھ رہی تھی۔ دوسری شادی انہوں نے ایک سال بعد کی تھی۔ آج ڈاکٹر کمال کی عمر ہے تیس سال۔"

"اٹھائیس سال..... بلکہ اس سے بھی کم۔"

"ڈنڈی مت مارو' عورتوں کی طرح۔ میں میٹرک کے سرٹیفکیٹ کی تاریخ کی بات نہیں کررہی ہوں۔"

"میں بھی اصل عمر بتارہا ہوں۔ میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے حساب سے تو ستائیس سال بنتی ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ سات سال ہوگئے اسے ڈاکٹر بنے۔"

"میں بتاتا ہوں یہ کیسے ہوا۔ تیرہ سال کی عمر میں اس نے میٹرک کیا سائنس کے ساتھ۔ پندرہ سال میں اس نے ایف ایس سی کیا۔ بیس سال کی عمر میں وہ ڈاکٹر تھا۔ کچھ فیل ہونے والے بھی بائیس سال میں ڈاکٹر بن ہی جاتے ہیں لیکن کمال تو عموماً پوزیشن لیتا رہا تھا۔"

"اوکے۔ اٹھائیس سال۔ ڈاکٹر جمال کی شادی کو اس حساب سے ہوچکے ہیں اُنتیس سال۔ سیانے لوگ ہیں۔ سارا کام حساب کتاب ذہن میں رکھ کے کیا تھا۔ کراچی سے دو سال میں لوٹ آتے اور ساتھ ہوتا تین سال کا بچہ تو گڑبڑ ہوجاتی۔ وہ چار سال بعد واپس لاہور آئے تو تین سال کا کمال ان کے ساتھ تھا۔ اس کا نام لاوارث بچوں کے اس ادارے میں بھی کمال لکھا ہوا ہے۔ فاروقی وغیرہ کا اضافہ انہوں نے خود اسے اپنی ولدیت دینے کے لیے کیا تھا۔"

"آپ بکواس فرماتی ہیں۔ کیا ثبوت ہے اس بات کا؟"

اس نے چند فوٹو اسٹیٹ کاغذات میرے سامنے رکھ دیے "یہ ملاحظہ فرمایئے۔ ایک اس رجسٹر کا صفحہ ہے جس پر کمال کا نام اور ولدیت کے خانے میں لکھا ہوا ہے۔ نامعلوم۔ عمر بھی اندازے سے تین سال لکھی گئی ہے۔ بس دو چار دن کا فرق ہوگا۔ تاریخ اندراج دیکھیے..... ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء۔ وہ آپ سے ایک سال ایک مہینہ چودہ دن بڑا ہے..... رائٹ! تو اب بتایئے اس کی کیا عمر ہوئی؟"

میں نے اس صفحے کے دیگر اندراجات پر غور کیا اور پھر کمال کے نام پر رُک گیا "کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی کمال ہے؟"

"مزید ثبوت ابھی پیش کرتی ہوں۔" وہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ولدیت نامعلوم سے کیا مراد ہے؟"

"میں کوئی بات ایسی نہیں کہوں گی جس کا ثبوت نہ ہو۔ ویسے عام آدمی کے ذہن میں وہی آئے گا جو تمہارے ذہن میں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ عبدالستار ایدھی کے پالنے میں کچھ بچے ایسے بھی ڈال دیے جاتے ہوں جن کی پرورش کا بار غریب والدین نہیں اٹھاسکتے۔ ان کے پہلے ہی بہت بچے ہوں اور ان کے لیے مزید کو دنیا میں آنے سے روکنا ممکن نہ ہو۔ آمدنی کم ہو' رہنے کو جگہ نہ ہو۔ تو اولاد رحمت نہیں زحمت بن جاتی ہے۔ بھوک کے آگے جذبات دم توڑ دیتے ہیں۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ خواہ حشرات الارض کی طرح پرورش پائیں مگر جو پیدا ہوتے ہیں وہ ماں باپ کے گھر میں پل بھی جاتے ہیں۔ گھر سے میری مراد ہے جھگی جھونپڑی۔"

"پلیز شٹ اَپ۔"

اس نے میرے سامنے دوسرا کاغذ رکھ دیا "یہ دیکھو' حلف نامہ۔"

میں نے وہ حلف نامہ پڑھا پھر اس کے نیچے دستخط دیکھے۔ گواہوں کے اور تصدیق کرنے والوں کے نام دیکھے تو میرا دماغ چکرا گیا۔

"اور یہ ADOPTION کی قانونی کارروائی کے دیگر کاغذات۔ سب میں تصدیق کرنے والے اور گواہ ڈاکٹر ہیں۔ وہ عام ڈاکٹر نہیں ہیں۔ آج بھی ملک کے نامور ماہرینِ امراضِ قلب میں شمار ہوتے ہیں مگر کراچی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ ابھی تک سب زندہ ہیں۔ ان کے فون نمبر میں نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ اگر تم چاہو....."

میں اس انکشاف کے اولین شاک سے سنبھل گیا تھا "مس شبنم! بلاشبہ تم نے بڑی محنت کی ہوگی یہ سب حاصل کرنے کے لیے اور تمہیں جس نے بھی یہ معلومات فراہم کردیں اس نے عہد شکنی کی۔ ایک غیر اخلاقی حرکت سے عبدالستار ایدھی جیسے نیک نام شخص کے ادارے کی ساکھ تو ایسے لوگ خراب نہیں کرسکتے۔ چاند پر تھوکو تو تھوک منہ پر آتا ہے۔ مگر تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

اس نے غرور سے کہا "آجی ہم اخبار والے ہیں۔ ہم سے کیا چھپا رہ سکتا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں نہیں مان سکتا کہ تم پر وحی نازل

ہوئی تھی؟ تمہیں الہام ہوا تھا اس معاملے میں۔ کسی نے سُراغ دیا ہو گا تمہیں۔ کوئی اشارہ ملا ہو گا کہیں سے۔ تمہارے شرپسند دماغ کو اس ٹریک پر کسی اور نے ڈالا ہو گا اور پھر تم نے صحافت چھوڑ کے سُراغ رساں کی حیثیت سے تفتیش پر کمر باندھ لی۔ مجھے بلیک میل کرنے کے لیے۔"

"ہاں۔ تمہیں بلیک میل کرنا ہی پڑے گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میں کیسی لگ رہی ہوں' اس لباس میں؟" اس نے کسی ماڈل کی طرح گھوم کے دکھایا۔

"عام طور پر تم ہر لباس میں اچھی لگتی ہو لیکن اس وقت تمہاری منحوس شکل سے نفرت ہو رہی ہے مجھے۔"

"جناب "لباس کے بارے میں کچھ بتائیے' کیسا سلا ہوا ہے؟"

میں نے بھنّا کے کہا "کون تھا وہ اُلّو کا پٹھا جس نے تمہیں یہ آئیڈیا دیا کہ مجھے یا ڈاکٹر کمال کو بلیک میل کیا جاسکتا ہے اس طرح؟"

"وہ درزی جس سے میں کپڑے سلواتی ہوں۔ آج سے نہیں کئی سال سے۔ باپ اندرون بھاٹی گیٹ ایک مشین لے کر بیٹھتا تھا۔ بیٹے نے انارکلی پہنچ کے دم لیا۔ اب درجنوں کاریگر ملازم ہیں۔ گلبرگ کی بیگمات اور فلم اسٹارز بھی اس کے گاہک ہیں۔ کیا خیال ہے' میں فلم اسٹار بن سکتی ہوں؟"

"شبنم! میں جھانپڑ ماردوں گا۔"

اس نے ایک آہ بھری "ایسی قسمت کہاں میری۔ تم تو قتل بھی کر ڈالو گے تو میری روح کو سکون ملے گا۔"

"بکواس بند کرو خدا کے لیے۔"

وہ ہنسی "خیر۔۔۔ وہ درزی کہتا ہے کہ بی بی' تم فلموں میں جاتیں تو۔۔۔ اچھا اچھا گھورو مت' اس نے ایک دن مجھے اپنے ڈاکٹر کمال احمد فاروقی کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے لفٹ دی اور عین ٹیلر ماسٹر کی دکان کے سامنے اُتار دیا۔ اب تم جانتے ہو کہ میرے پاس تو ایک چھوٹی سی گاڑی ہے' غریبانہ قسم کی۔ ورنہ عموماً بڑے بڑے صحافی بھی پیدل ہی ہوتے ہیں۔ کسی کسی کے پاس موٹر سائیکل بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کمال کی شاہی سواری وہ لینڈ کروزر تھی جو اس سے پہلے ڈاکٹر جمال کے پاس رہتی تھی۔ لوگ اسے پہچانتے بھی تھے۔ پہلے لاہور میں گنتی کی چند پجیرو ہوں گی اور چند ایسی لینڈ کروزر۔ اب تو عام ہیں مگر وہ خاص تھی۔ اس کا رنگ بھی خاص تھا۔ ٹیلر ماسٹر نے کہا کہ "آپ کس کے ساتھ آئی ہیں؟" میں نے کہا کہ یہ ڈاکٹر کمال تھے۔ وہ کہنے لگا کہ گاڑی تو ڈاکٹر جمال کی تھی۔ میں نے کہا' اب تو ڈاکٹر کمال کی ہے نا۔ ڈاکٹر جمال کا تو انتقال ہو گیا"۔ وہ کہنے لگا "ہاں جی۔ مجھے معلوم ہے۔ وہ اور ان کی بیوی جل کے مر گئے تھے لندن میں" میں نے کہا' بم کے دھماکے میں ہلاک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کمال انہی کا بیٹا ہے' اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور مسکرانے لگا "آپ کب سے جانتی ہو جی؟" میں نے کہا کہ کئی سال سے۔ اس نے کہا "پھر بھی آپ کچھ نہیں جانتیں؟ اخبار والے تو سب جانتے ہیں؟" میں نے کہا "ایسی کیا بات ہے ماسٹر صاحب؟" اس نے کہا کہ ڈاکٹر کمال کیسے ڈاکٹر جمال کا بیٹا ہو سکتا ہے' ناممکن!" اب میری حیران ہونے کی باری تھی۔ میں نے کہا "کیوں نہیں ہو سکتا؟" اس نے کہا کہ ہم جو بتا رہے ہیں تمہیں مِس شبنم' وہ پتھر پر لکیر ہے۔ اگر ان کی بیوی کا بیٹا ہو تو اور بات ہے۔ ڈاکٹر جمال کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔"

"یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے!"

"یہی میں نے بھی کہا تھا۔ اس ٹیلر ماسٹر سے" شبنم چٹکی بجا کے بولی "مگر جواب میں اس نے مجھے ایک اسٹوری سنائی' تم سنو گے؟"

میں جز بز ہو کے کہا "نہیں سنوں گا تو کیا کروں گا۔۔۔ اور کون سنے گا؟ اور یہ سوال کیا تم نے محض سسپنس پیدا کرنے کے لیے کیا ہے؟"

"اس ٹیلر ماسٹر کی بیوی پہلے ڈاکٹر جمال کی بیوی تھی۔"

میں اچھل پڑا "واٹ نان سنس!"

"دس از اے فیکٹ۔۔۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ ملنا چاہتے تو چلو' میں تمہیں ٹیلر ماسٹر سے ملواتی ہوں۔ وہ خود شاید میٹرک پاس ہو گا مگر اس کے مینرز' ایٹی کیٹس' سب ہائی کلاس سوسائٹی کے ہیں اور آدمی ہے بے حد مہذب اور شریف۔ دولت مند بھی ہے۔ ایک آئیڈیل شوہر۔"

"پھر تم بھی کر لو اس سے شادی۔"

اس نے ایک آہ بھری "کر لیتی۔۔۔ اگر تم سے محبت نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ ٹیلر ماسٹر انکار کر دے گا' اپنی بیوی پر لٹو ہے۔"

میں نے کہا "ہے نا بے وقوف آدمی۔ بھلا بیوی پر بھی کوئی لٹو ہوتا ہے؟"

"اس کی بیوی کو ڈاکٹر جمال نے طلاق دے دی تھی۔ اس جرم میں کہ اپنے پانچ سالہ زمانۂ زوجیت میں وہ ڈاکٹر صاحب کو باپ نہ بنا سکی۔ وہ سیدھی سادی عورت ہے مگر جاہل نہیں ہے۔ اس کی دوسری شادی ٹیلر ماسٹر سے تقریباً اسی زمانے میں ہو گئی تھی جب جمال صاحب کراچی میں تھے اور دوسری شادی کر چکے تھے۔ یہ تو معلوم ہو گا تمہیں کہ مسز جمال ایک مشہور و معروف گائنوکولوجسٹ تھیں۔ اُف۔۔۔ یہ نام تو پھنس جاتا ہے حلق میں۔ گائنی کہنا آسان ہے۔ تو جناب کسی گائنی سے یہ معاملات چھپے نہیں ہوتے۔ افزائش نسل کے۔۔۔ وہ ماہرین اولاد ہی تو ہوتی ہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ لنگڑے کو معلوم نہ ہو کہ اس کے کس پاؤں میں نقص ہے اور کانا یہ نہ جانتا ہو کہ اس کی کون سی آنکھ خراب ہے۔ یہ گائنی خاتون بھی مطلقہ تھیں اور ان کا جرم بھی یہی تھا۔۔۔ بے اولادی۔ آئی بات آپ کی سمجھ شریف میں۔۔۔؟ دو صفر جمع کیے جائیں تو صفر ہی رہتے ہیں۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "دونوں صفر! تمہیں کیسے معلوم؟"

"اس ٹیلر ماسٹر کے ماشاء اللہ سے چار بچے ہیں۔ سب سے بڑا چوبیس سال کا اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا ہے۔ کٹنگ ماسٹر ہے۔ دوسری بیٹی کی شادی ہو گئی ہے۔ تیسرا پھر بیٹا ہے کچھ نہیں کرتا' بی اے میں پڑھتا رہتا ہے مگر بی اے نہیں کرتا۔ کیا ثابت ہوا اس سے؟ اب دوسری طرف چلتے ہیں۔۔۔ لاہور کی ایک فیملی ہے۔ ان کا نام بتانا ضروری نہیں۔ مسز جمال سب سے پہلے رخصت ہو کے اسی گھر میں گئی تھیں مگر دو سال بعد وہاں سے بھی رخصت کی گئیں۔ ان کے شوہر نمبر ون نے دوسری شادی کی تو وہی ہوا جو ہونا چاہیے' جو ٹیلر ماسٹر کے گھر میں ہوا۔ اس کے بھی سات بچے ہیں۔ تین بیٹے اور چار بیٹیاں۔ پس تحقیق کہ زیرو جمع زیرو مساوی ہے زیرو۔ فہوا لمطلوب۔"

میں پریشانی میں سر پکڑے بیٹھا رہا۔ شبنم نے زبردست ریسرچ کی تھی اور اس کے حاصل کردہ نتائج کی صحت کو چیلنج کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے ٹیلر ماسٹر سے ٹپ ملی تھی اور باقی کام اس نے خود کیا تھا جیسے شاخ سے شاخ پکڑتا ہوا کوئی درخت پر چڑھتا جاتا ہے ایسے ہی ایک سراغ سے دوسرا سراغ ملتا گیا تھا اور اب شبنم کے پاس خطرناک معلومات کا وہ ایٹم بم تھا جو بڑی تباہی پھیلا سکتا تھا۔

میں نے بہت دیر بعد۔۔۔ جب وہ اپنے اور میرے لیے کچن سے کافی بنا کے لا چکی تھی' بات پھر شروع کی "مِس شبنم۔ تمہاری اسٹوری واقعی زبردست ہے۔ ایک دم دھانسو (EXCLUSIVE) اور دھڑن تختہ کرنے والی۔ تم بارگین کرنے کی پوزیشن میں ہو' بولو کیا چاہتی ہو؟"

"تو ظالم!" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولی "یہ مجھ سے پوچھتے ہو؟ ارے ہم سے پوچھو کہ کیا نہیں۔۔۔ کسے چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "تم مجھے بلیک میل کرنے کے ارادے پر قائم ہو؟"

"بالکل۔ گھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ٹیڑھی انگلیاں کرنی پڑتی ہیں۔"

"اور اگر میں انگلیاں ہی توڑ دوں' پورا ہاتھ مع کلائی کے کاٹ دوں تو پھر گھی بچ جائے گا" میں نے کہا۔

"تم کیا میری زبان کاٹ دو گے؟"

"نہیں' میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا یا گھونٹ دوں گا۔"

"پھر انتظار کس کا ہے؟" وہ میرے قریب آگئی۔

میں اُٹھ کے دور جا کھڑا ہوا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا "کیا واقعی تم اتنی کمینی ہو شبنم! اسے محبت سمجھتی ہو تم؟"

"جنگ یا محبت میں کمینہ پن بھی جائز ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ جب آدمی واقعی کسی کو چاہتا ہے تو اسے عذاب میں نہیں دیکھ سکتا۔ چہ جائیکہ خود اسے عذاب دے۔ تم خود اپنی محبت کی تشہیر بھی کرتی ہو اور تذلیل بھی۔ سوچو ذرا کہ کیا یہ بات ڈاکٹر کمال کو بتانے کی دھمکی دے کر تم مجھے حاصل کر سکتی ہو۔ میرا دل جیت سکتی ہو؟ آج تک میں تم کو اچھا سمجھتا تھا۔ تمہیں پسند کرتا تھا لیکن اس کے بعد تم سے میری نفرت ایک فطری بات ہو گی۔ تم ایک زخم خوردہ' شکستہ آدمی کو خود اپنی نظر سے گرانا چاہتی ہو۔"

"تمہیں اتنا خیال ہے ڈاکٹر کمال کا۔ اتنی ہمدردی ہے اس کے لیے تمہارے دل میں تو مجھے روک لو۔"

"کیسے روک لوں؟"

"بس اتنا کہہ دو کہ رُک جاؤ شبنم! اور میں رُک جاؤں گی یہاں' ہمیشہ کے لیے۔"

"سوری! یو کین گو ٹو ہیل۔"

وہ ہنسی "تم بھی ساتھ چلو گے۔"

"تمہارے ساتھ میں جنت قبول نہ کروں" میں نے دہاڑ کے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

شبنم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کاغذات کا لفافہ میری طرف بڑھا دیا "خوش رہو جانِ من! شبنم کی طرف سے دل صاف رکھو۔ یہ بات قیامت تک کسی کو معلوم نہیں ہو گی۔"

اس کے جانے کے بعد میں سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گیا اور ساری رات سو نہ سکا۔ نہ جانے کیوں مجھے احساسِ شکست ہو رہا تھا۔ شبنم نے ایک پوائنٹ اسکور کر کے مجھ پر برتری حاصل کر لی تھی۔ اس نے مجھے زیرِ بار کر دیا تھا۔ بالواسطہ طور پر ایک نفسیاتی فتح حاصل کر لی تھی کہ دیکھو' تمہاری خاطر ہی میں نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں۔۔۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی۔ اس کے بعد بھی تم کو میرا خیال نہیں تو قصور کس کا۔۔۔ میرا یا تمہارا؟

میں نے اس معاملے پر دوسرے زاویے سے بھی غور کیا۔ ڈاکٹر کمال کے بارے میں ایک بات آج انارکلی کا ایک درزی جانتا تھا اور اس کی بیوی کو معلوم تھی۔ ممکن ہے اس کے بالغ بچے بھی ماں کے ساتھ ہونے والے اس ظلم کی داستان سے واقف ہوں کہ اس کو جرمِ بے گناہی پر خود مجرم ڈاکٹر جمال نے کیا سزا دی تھی۔ ٹیلر ماسٹر کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ پردہ پوشی کرتا۔ ایک خطرناک قسم کی جرنلسٹ کو وہ بات ہرگز نہ بتاتا جس سے کسی کی نیک نامی پر حرف آئے۔ غالباً وہ بھی ڈاکٹر جمال سے ایک غائبانہ رقابت کے انتقامی جذبات رکھتا تھا۔ اب یہ بات وہ اور بھی بہت سے لوگوں کو بتائے گا۔ خاص بات خاص لوگوں تک پہنچ جائے گی اور یہ بات اندر ہی اندر پھیلتی جائے گی۔ ایک زبان سے دوسری زبان تک۔۔۔ ایک مرد سے دوسری عورت۔ دوسری عورت سے تیسرے مرد۔ تم نے کچھ سُنا۔۔۔ وہ ڈاکٹر جمال۔۔۔ (زیرِ لب پُرتحقیر ہنسی)۔۔۔ ہی واز۔۔۔ امپوٹینٹ۔۔۔ اوہ نو۔۔۔ ڈاکٹر کمال

اس کا بیٹا نہیں ہے۔ تمہیں کیسے معلوم؟ بھئی کون سی بات چھپی رہتی ہے اس زمانے میں۔ کمیونی کیشن بہت فاسٹ ہے۔ کراچی کی خبر ہے۔

صبح تک میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ خبر غلط طریقے اور ذرائع سے کمال تک پہنچے۔ اس سے پہلے کہ شبنم کسی کو پاس دے یا ٹیلر ماسٹر پینلٹی اسٹروک لگائے۔ میں خود گول کیپر کی جگہ کھڑا ہو جاؤں اور کمال کو موقع دوں کہ وہ جوابی گول کر دے۔

مجھے سابق مسز جمال کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہو رہا تھا کہ وہ زخم خوردہ ناگن بن کے کمال کو ڈسنے کی کوشش نہ کرے۔ اب ایک بات ٹیلر ماسٹر کو معلوم ہو چکی تھی تو اس نے بیوی سے یقیناً تذکرہ کیا ہوگا کہ لو بھئی لطیفہ سُنو' وہ جو تمہارے جمال صاحب تھے نا' ان کا ایک بیٹا پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ کی قدرت نہ باپ اس قابل نہ ماں' ڈاکٹر کمال کو پھر بھی حرامی کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اور بیوی کہے گی کہ میں کہہ سکتی ہوں' میں کہوں گی۔ جیسے اس نے مجھے ذلیل کیا تھا' ایسے ہی میں مرنے کے بعد اس کو ذلیل کروں گی۔ پس از مرگ تمغۂ ذلالت۔ فار ڈاکٹر جمال' ایم بی بی ایس۔ ایف آر سی ایس (ڈبلن)۔ ایف آر سی ایس (ایڈنبرا)۔ سابق ڈی جی ہیلتھ سروسز۔ ایڈوائزر اور پراونشل ہیلتھ منسٹر مرحوم و مغفور۔ وغیرہ وغیرہ۔ اینڈ تمغۂ خجالت فار ڈاکٹر کمال۔ ایم بی بی ایس۔ ایل ایل بی۔ ولدیت نامعلوم۔

میں بڑے ارادے سے ڈاکٹر کمال کے پاس گیا اور اس کا موڈ دیکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی تمہید باندھی۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا "کیا بات ہے سؤر کے بچے! اگر تُو کچھ کہنا چاہتا ہے تو پھر بات کی جلیبی کیوں بنا رہا ہے؟"

میں نے کہا "وہ۔۔۔ بات ہی ایسی ہے۔"

"ویری گڈ! بات ایسی ہوتی ہے۔۔۔ بات ویسی ہوتی ہے۔ جیسی ہوتی ہے اور کیسی ہوتی ہے۔"

"تو صبر سے اور حوصلے سے سُنے گا' بعد میں میرے یا اپنے کپڑے نہیں پھاڑے گا۔ سر نہیں پھاڑے گا۔"

"کیا میں پاگل ہوں تمہاری نظر میں بھی؟"

"تو پاگل ہو سکتا ہے۔"

"وہ تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کسی وجہ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات مجھے بتانے کی ضرورت نہیں' میں ڈاکٹر ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب! فرض کیجئے' آپ کو اچانک پتا چلے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو آپ خود کو سمجھتے ہیں' کوئی آپ سے مذاق میں یا شرارت میں۔۔۔ فتنہ انگیزی کرتے ہوئے یا ایسے ہی آ کے کہہ کر اس کرے۔"

"کہ ڈاکٹر جمال تمہارے والد نہیں تھے اور مسز جمال تمہاری ماں نہیں تھیں" وہ سکون سے بولا۔

میں اُچھل پڑا "یہ۔۔۔ کیا تو۔۔۔ تجھے معلوم تھا؟"

"جب تجھے معلوم ہے تو پھر مجھے کیسے معلوم نہ ہو گا؟"

میں نے حیرت سے کہا "اچھا؟۔۔۔ کس نے بتایا تھا تجھے۔۔۔ کب۔۔۔؟"

"ابھی کچھ دن پہلے پتا چلا مجھے" وہ بولا "کسی عورت نے مجھے فون کیا تھا۔"

میرا خون اُبل کر دماغ میں آگیا "عورت نے۔۔۔! صاف کیوں نہیں بتاتا اس۔۔۔ شبنم نے فون کیا تھا۔ صحافی کا نطفۂ ناتحقیق۔"

"کیوں گالیاں دے رہا ہے اسے' پاگل ہو گیا ہے۔"

"یہ بات کل اس نے مجھے بتائی تھی۔۔۔ مجھے بلیک میل کرنے آئی تھی۔"

وہ ہنس پڑا "مذاق میں چھیڑ رہی ہو گی تجھے۔ تیرا کیا تعلق اس معاملے سے' تو کیسے بلیک میل ہو سکتا ہے۔"

"میں ہوا بھی نہیں۔ میں نے کہا دفع ہو جاؤ۔ جو کرنا ہے کرلو۔" میں نے کہا "میں خود تجھے بتانے آگیا۔"

"اچھا پھر بتا کہ اس نے کیا بتایا؟"

"میں بعد میں بتاؤں گا" میں نے کہا "تجھے فون کرنے والی عورت کون تھی؟"

"میری بڑی ماں۔ اس نے یہی کہا تھا بڑے طنز سے۔"

میں نے گہری سانس لی "اسی کا ڈر تھا مجھے۔۔۔ وہ درزی کی بیوی۔۔۔"

"ہاں۔ سابق مسز جمال! اس کا مقصد تو میری تذلیل تھا مگر میں نے اس سے کہا کہ "ایسی صورت میں آپ میرے لیے قابلِ تعظیم ہیں۔ میں کسی گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے بھی اپنا بیٹا ہی سمجھیں" اس پر وہ گالیاں دینے لگی کہ "تیری ماں نے کسی حرامی کو بیٹا بنالیا ہو گا۔ خبردار جو مجھ سے رشتہ جوڑا" میں نے کہا کہ خاتون! رشتہ تھا ہی نہیں۔ آپ نے جوڑا ہے فون کر کے۔ کیا مقصد تھا آخر مجھے یہ بتانے کا کہ آپ میرے ڈیڈی کی پہلی بیوی تھیں؟ وہ جاہل عورت ہے۔"

"وہ گریجویٹ تھی۔"

"کیا ایم اے اور ڈبل ایم اے جاہل نہیں ہوتے اور جذبات کے معاملے میں عورت کیا' مرد کیا۔۔۔ تُو خود ابھی شبنم کو بلاوجہ گالیاں دے رہا تھا۔ اس عورت نے کہا کہ ڈیڈی کے بچے۔ جا کے پتا کر تو کس کی اولاد ہے۔ کون تھی تیری ماں جو تجھے کوڑے دان میں پھینک گئی تھی۔"

"تجھے غصہ نہیں آیا ایسی باتیں سُن کے؟"

"اس عورت نے محض دل کا غبار نکالا تھا۔ وہ زہر اُگلا تھا جو اس کے وجود میں نفرت کے ناسور میں پک رہا تھا۔ مجھے غصہ بھی آیا' صدمہ بھی ہوا مگر پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے عورت جھوٹ بک رہی ہو۔ اس نے ڈاکٹر جمال کو بہت بُرا بھلا کہا تھا کہ اس سے تو یہ درزی لاکھ درجہ اچھا ہے۔ پتا نہیں اتنا

عرصہ وہ کیوں خاموش رہی۔ اب اچانک اسے کیوں خیال آگیا یہ سب مجھے بتانے کا؟"

"اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ تم ڈاکٹر جمال کے ــــ بیٹے ہو۔"

"پھر اسے کس نے بتایا؟"

"خود اس کے شوہر نے" میں نے کہا اور اسے وہ سب بتادیا جو مجھے شبنم نے بتایا تھا۔ میں نے لفافہ بھی اسے دے دیا۔

اس نے کاغذات پر ایک نظر ڈال کے سرہلایا "یہ سب میں دیکھ چکا ہوں پہلے ہی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کہاں ــ کراچی جاکے؟"

"نہیں۔ میں نے ہاشمی صاحب سے بات کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایسی کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ٹھیک تھا۔ ان کے پاس ایک فائل میں سارا ریکارڈ تھا۔ میری ADOPTION کا۔ وہ خود پریشان تھے کہ جب وراثت نامے کے لیے کیس فائل ہو گا تو یہ سب عدالت میں پیش کرنا پڑے گا۔ ڈیڈی نے اپنی زندگی میں انہیں پابند کردیا تھا کہ کسی کو کچھ پتا نہ چلے مگر ان کے بعد یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاشمی صاحب نے اوّل تا آخر' ساری کہانی سُنادی۔ شبنم اپنی تحقیق و تفتیش میں لگی رہی' اس لیے ذرا لیٹ ہوگئی۔ ہاشمی صاحب نے کہا کہ وہ عورت تو پاگل ہے ورنہ اسے کیا ضرورت تھی فون کرکے یہ سب کہنے کی۔ تم بھول جاؤ اس کی بات اور اپنے کام سے کام رکھو۔ بدخواہ کتوں کو بھونکنے دو۔ تم جانتے ہو ڈاکٹر جمال نے اور ان کی بیوی نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ نہ کوئی جرم کیا تھا اور نہ یہ غلطی تھی۔ انہوں نے تمہاری پرورش کیسے کی' یہ تم جانتے ہو۔ تم کو ان سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ آج میں جو کچھ ہوں' کس کی محبت سے ہوں۔ میرے اصلی والدین مجبور تھے یا بزدل تھے مگر میں ان کو معاف نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر جمال کا ان سے کیا مقابلہ۔ وہ جنہوں نے مجھے پالا' بڑے عظیم اور فرشتہ سیرت لوگ تھے جنہوں نے میرے وجود کو اس کی بے گناہی کے یقین اور معصومیت کی سند کے ساتھ سینے سے لگایا اور بھرپور پیار دیا۔ اصلی ماں باپ نے تو مجھے واقعی کوڑے دان میں ڈالا تھا مگر وہ کوڑے دان نہیں' انسانیت کی آغوش تھی۔ میں کسی مجبوری کے عذر کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اگر میں شادی کے بغیر پیدا ہوا تھا تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے یہی کہ میرا باپ ذلیل اور ہوس پرست کمینہ شخص تھا جس نے میری ماں کا جسمانی استحصال کیا ہوگا۔ مگر اس نے شادی نہیں کی' صرف محبت کا ناٹک رچایا اور میری ماں ــ وہ بزدل تھی اور بے غیرت تھی۔ اگر اسے شادی پر مجبور نہیں کر سکتی تھی تو جان سے مار سکتی تھی۔ اس کی ہمت نہیں تھی تو خود اپنی جان دے سکتی تھی۔ مجھے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا پتا وہ آج کہاں زندہ ہوں گے۔ دونوں نے شادیاں کرلی ہوں گی اور جوانی کی اس لغزش کو بھول چکے ہوں گے۔ انہیں وہ بچہ یاد بھی نہیں آتا ہوگا جس کو وہ اس لیے پھینک آئے تھے کہ اسے اپنا نہیں سکتے تھے۔ اگر انہوں نے مجھے اس لیے وہاں چھوڑا تھا کہ ان کے پاس خود کھانے کو نہیں تھا یا رہنے کو نہیں تھا تو ایسی صورت میں ان کا جرم زیادہ سنگین ہوجاتا ہے۔ جگہ ہونی چاہیے دل میں۔ رزق دینے والا تو خدا ہے۔ وہ کیسی ماں تھی جس کے پاس اپنے بچے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ بھیک مانگ کے' چوری کرکے مجھے کھلا سکتی تھی۔ میں نے برتن مانجھنے والی عورتوں کو دیکھا ہے جو دس بچوں کی پرورش کے لیے دس گھروں میں صبح سے شام تک کام کرتی ہیں۔"

وہ فرطِ جذبات میں چلّانے لگا تھا اور اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے غصّے کو خارج کیا اور خاموش ہوگیا۔

"تو بھائی" اس نے پُرسکون ہوکے کہا "اپنے ممّی ڈیڈی کی عزت میرے دل میں آج پہلے سے زیادہ ہے۔ یار' اپنے بچّے کے لیے تو سب ہی کرتے ہیں۔ کس کا دل ہے اتنا بڑا کہ میرے جیسے بچے کو اٹھالائے اور پھر اپنا سب کچھ دے دے۔ اس شاک نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا' مجھے ایک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی۔"

میرے کان کھڑے ہوئے "کیسا فیصلہ؟"

"میں اب ان کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کروں گا۔ اس کی آمدنی سے ایک کلینک چلاؤں گا۔ کسی غریب آبادی میں۔ وہاں عام بیماریوں کا علاج بالکل مفت کیا جائے گا۔ دوائیں بھی مفت ملیں گی۔ میں عمران خان کی طرح بہت بڑا اسپتال نہیں بنا سکتا۔ میرے پاس اس جیسا عزم اور حوصلہ نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر جمال کی خواہش کے مطابق بہت عظیم الشان اسپشلسٹ میڈیکل سینٹر قائم کرنے کے پہلے بھی خلاف تھا' میں ایک چھوٹا کلینک خود چلاؤں گا "اکیلا ــ کسی کی مدد کے بغیر۔ تمام عمر یہی کام کروں گا اور مرتے وقت یہ کام کسی اور کے سپرد کرجاؤں گا۔ بہت محدود پیمانے پر سہی مگر یہ کام نیک نیتی سے جاری رہے گا۔ میں تو کہتا ہوں یار' یہ بھی میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ خدا نے مجھے ایسا سوچنے اور کرنے کی توفیق دی ورنہ پیسہ وہ بھی مفت ہاتھ آنے والا۔ یوں آتا ہے اور یوں جاتا ہے۔ اگر اس طرح ہر روز صرف ایک زندگی بچائی جاسکے' دو کو شفا مل جائے تو یہ کتنا بڑا کام ہے۔ کتنی بڑی سعادت ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر ایسے ہی کمانے خرچ کرنے میں گنوادیتے ہیں۔ انہیں خیال نہیں آتا یا توفیق عطا نہیں ہوتی کہ یہ خوشی سمیٹ لیں جو کسی کی دعا لے کر ملتی ہے۔ جب کوئی عورت بیوہ نہیں ہوتی کیونکہ اس کے شوہر کو وقت پر دوا علاج میسر آجاتا ہے جس کی اسے استطاعت نہ ہو۔ کوئی ماں اپنے لختِ جگر سے محروم نہیں ہوتی یا کوئی بچی یتیم نہیں ہوتی۔ چند روپے نہیں ہوتے لوگوں کے پاس جان بچانے کے لیے۔ جو ہزار ہزار روپے کسی اسپشلسٹ کی فیس اور دو ہزار روپیہ کمرے کا کرایہ دے سکتے ہوں ان کی فکر کرنے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔"

کمال کی ہدایات کے مطابق ہاشمی ایڈووکیٹ نے سب کچھ بیچ

دیا۔ ساری کوٹھیاں' عالی شان گاڑیاں' اسپتال کی زمین۔ اس سے ٹرسٹ قائم ہوا۔ کمال نے ایک غریبانہ بستی میں دس مرلے پر "جمال کلینک" بنایا۔ اس کے نصف حصّے میں خود اس کی رہائش تھی۔ نصف میں وہ صبح نو سے دوپہر ایک بجے تک اور پھر شام کو پانچ بجے سے آٹھ بجے تک مریضوں کو دیکھتا تھا اور انہیں وہیں سے مفت دوا بھی دی جاتی تھی۔ اس کے پاس وہی سوزوکی ہائی روف تھی جس کو وہ بطور ایمبولینس بھی استعمال کرتا تھا اور ہر جگہ آنے جانے کے لیے بھی۔ بیشتر لوگ یہ جانتے بھی نہیں تھے کہ جمال کلینک کہاں ہے اور ڈاکٹر کمال کون ہے؟ ہاں اس کے مریض اسے اور اس کے اعجازِ مسیحائی کو عقیدت کا خراجِ تحسین دیتے تھے اور اس کے لیے ہر دعا کو وقف رکھتے تھے۔

قمر کے لیے ڈاکٹر کمال کے دل میں پسندیدگی کے جذبات ایک دن یا ایک مہینے میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہ اکثر میرے پاس آتا تھا اور میں بعض اوقات اسے قمر کے آفس میں ملتا تھا یا ہم باتیں کررہے ہوتے تھے تو قمر آجاتی تھی اور چُپ چاپ سرجھکائے اس وقت تک بیٹھی رہتی تھی جب تک کمال رخصت نہ ہوجاتا۔ میں اس سے پوچھتا تھا کہ کوئی کام ہے یا کوئی بات کرنی ہے تو وہ نفی میں سرہلادیتی تھی کہ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بعد میں پتا چلتا تھا کہ وہ جس کام سے آئی تھی وہ بہت ضروری تھا۔ کمال اس سے چڑتا تھا۔ یہ لڑکی ہے یا برف کی گڑیا۔ نہ ہنستی ہے نہ مسکراتی ہے۔ نہ شوخی نہ شرارت۔ بے وقوفوں کی طرح ہاں جی اور نہیں جی کرتی رہتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ قمر بے وقوف بہرحال نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا بھی خیال تھا کہ وہ ایکٹنگ کرتی ہے بلکہ اوور ایکٹنگ کرتی ہے۔ بھئی کس بات کا ڈر ہے؟ کیا جھجک ہے؟ یہ کیسی شرم و حیا ہے کہ نظر نہیں اٹھتی۔ نہ کپڑے پہننے کا شوق' نہ بننے سنورنے کا۔ بس ایک خواہ مخواہ کی مظلومیت کا تاثر چہرے پر طاری ہے۔ سادگی' شرافت اور معصومیت کا ڈراما چل رہا ہے۔ لیکن یہ ڈراما نہیں تھا۔ قمر کا مزاج اور فطرت یا عادت ایسی ہی تھی کہ وہ کسی سے بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ سوائے میرے۔ میرے سامنے وہ چھوٹی سی لڑکی تھی' پھر بڑی ہوگئی اور اس تعلق نے ہمارے درمیان بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کا رشتہ تو پہلے ہی قائم کردیا تھا۔ بعد میں حالات نے اسے میری ذمّے داری بنادیا تو جذبات کی بنیادیں مزید استوار ہوگئیں۔ وہ سمجھتی کہ دنیا میں اس کا اب کوئی سہارا نہیں اور کوئی رشتہ باقی نہیں جسے وہ اپنا سکے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے جذبات کی تھی۔ یہ ذمّے داری کا احساس ایک نیا تجربہ تھا اور اب صورتِ حال یہ تھی کہ میں قمر کو اُداس دیکھتا تھا تو پریشان ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو مجھے بے چین کردیتے تھے۔ بڑے بھائی سے زیادہ یہ جذبات باپ کی طرح تھے جس کی متاعِ حیات ایک ہی بچی ہو۔

رفتہ رفتہ کمال کو یقین آنے لگا کہ قمر درحقیقت ویسی ہی ہے جیسی نظر آتی ہے۔ اس کے دل میں کوئی ریاکاری نہیں تھی۔ وہ حد درجہ حسّاس تھی اور بہت نازک مزاج بھی۔ میرا خیال تھا کہ کمال کو حادثاتِ زمانہ نے بے حس بنادیا ہے۔ اس کا دل پتھر کردیا ہے۔ پہلا المیہ ذاتی تھا جس نے اسے کسی حد تک قنوطی بنادیا تھا یا اس کی سوچ میں ایک نفسیاتی گرہ ڈال دی تھی۔ وہ محبت کرنے سے ڈرنے لگا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ساری توانائی صرف کرکے لگن' محنت اور شوق کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی سر کرنا چاہے مگر انتہائی بلندی پر جب اگلا قدم کامیابی کا ہو تو آدمی کا پیر پھسل جائے اور وہ بھیانک گہرائیوں میں گم ہوجائے۔ اس کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ محبت کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں پھر پہاڑ سے گرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

قمر نے اس پہاڑ کو سر کرلیا۔ خود اس نے جانتے بوجھتے کچھ بھی نہیں کیا۔ بس اس کے انداز و اطوار میں' عادات میں اور ادائے حُسن میں کوئی جادوگری تھی۔ کوئی ساحرانہ قوت تھی جو خاموشی سے محسوس ہوئے بغیر اثر کرتی رہتی تھی۔ جیسے بوند بوند ٹپکنے والا پانی پتھر میں شگاف ڈال دیتا ہے۔ پھول کی پتی سے کٹ جاتا ہے ہیرے کا جگر۔ کمال کا چڑنا اور جھنجلانا ایک بے نام سی دلچسپی میں بدل گیا۔ وہ قمر سے لڑنے لگا۔ "کیا مصیبت ہے' اتنی دیر سے میں اکیلا بول رہا ہوں۔ تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟"

"میں کیا بولوں جی؟"

"پھر بیٹھی کیوں ہو یہاں؟ جاکے کوئی کام کرو۔ باتیں کرنا اگر نہیں آتا تو کیا میں سکھاؤں؟ اور یہ صورت کیسی بنا رکھی ہے' منہ دھویا تھا صبح؟"

وہ مسکرا کے خاموش ہوجاتی۔ "کیوں بُری لگ رہی ہے میری صورت؟"

"نہیں ــ طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ نبض دکھاؤ ــ؟" وہ ہاتھ پکڑ کے چیک کرتا "نبض تو چل رہی ہے۔ ویری گڈ ــ زبان نکالو۔ آ۔ آ کرو ــ بی پی کتنا ہے تمہارا؟ بلڈ شوگر کب دیکھا تھا ــ سیریس مسئلہ ہے کوئی؟"

وہ خفا ہونے لگتی "مسئلہ آپ بنا رہے ہیں۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"

"آخر تم ایسے واہیات ــ دیہاتوں والے کپڑے کیوں پہنتی ہو؟ کیا سوچتے ہوں گے تمہارے معزز گاہک کہ بوتیک چلانے والی خاتون کی چوائس کتنی افسوس ناک ہے۔ کتنے خوب صورت کپڑے بھرے پڑے ہیں وہاں۔"

"مگر مجھے وہ پسند نہیں۔"

"پھر دوسروں کو کیوں پہناتی ہو۔ اُلّو بناتی ہو کہ نیا فیشن ہے اور یہ ڈیزائن نیا ہے۔ یہ کلر اسکیم۔ یہ اسٹائل ــ اور شخصیت سے موسم سے اور موڈ سے میچ کرنے والے ڈریس۔ کیا ہے یہ سب ــ ڈراما؟"

"جی نہیں۔ یہ بزنس ہے اور بزنس میں دوسروں کی پسند چلتی

ہے' اپنی نہیں۔"
"کبھی میک اپ بھی کرالیا کرو یا کرلیا کرو۔ بیوٹی پارلر تمہارا اپنا ہے۔"
"حلوائی خود اپنی دُکان پر بیٹھ کے مٹھائی نہیں کھاتا۔"
وہ چڑ کے کہتا "شعر پڑھ دوں تاکہ۔ نہیں محتاج میک اپ کا جسے خوبیٔ خدا نے دی۔ تم پہلے ہی اتنی حسین ہو۔۔۔ تم کو کیا ضرورت ہے؟"
"آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے ضرورت ہے؟" وہ سوالیہ نظریں اٹھاتی۔
کمال سر کھجانے لگتا "ضرورت تو خیر نہیں ہے۔۔۔ مگر۔۔۔"
بس ایسے ہی آتے جاتے' لڑتے جھگڑتے اور دیکھتے دیکھتے انہیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئی۔ اس طرح کہ خود انہیں پتا نہیں چلا۔
اچانک ایک دن مجھے پتا چلا کہ ایسا ہوگیا ہے اور میں نے سوچا کہ یہ تو خیر ہونا چاہیے تھا اور ٹھیک ہی ہوا۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ جذبے کبھی الفاظ کے محتاج تو نہیں ہوتے۔ اور عشق کا وائرس نظر کہاں آتا ہے۔
کمال نے ایک دن کہا "یار' میں اب شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
میں نے کہا "کرلو بھائی' ہمیں کیا؟"
اس نے کہا "میں قمر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
میں بھونچکا رہ گیا "قمر سے۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے' اُلّو کے پٹھے!"
"کیوں؟" جواب میں اس نے کہا "یہ کیوں نہیں ہو سکتا' سُور کے بچّے!"
میں نے سوچ کے کہا "میرا خیال تھا۔۔۔ غالباً غلط تھا۔ قمر کیا کہتی ہے؟"
"یار' قمر کیا کہے گی" اس نے بیزاری سے کہا۔
میں نے کہا "کیا مطلب۔ تو یہ چاہتا ہے میں اس سے پوچھے بغیر ہاں کہہ دوں اور زبردستی شادی کردوں' فلموں کے ظالم باپ کی طرح؟ وہ آخر میری بہن ہے' بھیڑ بکری نہیں ہے کہ جسے چاہوں بیچ دوں۔"
"وہ اللہ میاں کی گائے ہے' وہ کچھ نہیں کہے گی۔"
"کیوں نہیں کہے گی؟ اس کے منہ میں زبان ہے' وہ اپنی مرضی رکھتی ہے' خود مختار ہے۔"
"اُف!" اس نے جھنجلا کے کہا "کیسا احمق بڑا بھائی ہے۔ ابے' کیا وہ اپنی زبان سے وہ بات کہہ سکتی ہے جو میں نے کہہ دی۔ جب میں بتا رہا ہوں کہ اس کی بھی تو یہی مرضی ہے اور وہ انکار نہیں کرسکتی۔ سو بار اقرار کرچکی ہے وہ مجھ سے۔"
"اوہ۔ یہ بتایا تھا آپ نے؟ سوری۔۔۔ میں نے سُنا نہیں تھا لیکن ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اس وقت تین بجے ہیں' ساڑھے تین بجے تک آپ بارات لے آئیں۔ قاضی پکڑلیں کہیں سے۔۔۔ مگر قمر تو شام کو فارغ ہوگی۔"
یہ سال بھر پہلے کی بات تھی۔ اس کے بعد سے حالات نارمل تھے۔ سب کچھ وہی تھا ویسا ہی تھا۔ قمر البتہ کچھ زیادہ خوش رہنے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا لباس مائل بہ تبدیلی تھا اور اس نے واجبی سا میک اپ بھی شروع کردیا تھا۔ ہم اکٹھے پھرتے تھے۔ گھر میں یا باہر کھانا ساتھ کھاتے تھے اور بلاوجہ لڑتے تھے یا ہنستے تھے۔ کمال نے دوبارہ شادی کی بات نہیں کی تھی۔ میں بھی مطمئن تھا۔ وقت آئے گا اور وہ ضرورت محسوس کریں گے تو شادی بھی ہوجائے گی۔
لیکن اب میں چاہتا تھا کہ یہ کام ہوجائے اور میں یہی بات کرنے کے لیے اس کے کلینک پہنچا تھا مگر وہ مجھے ایمبولینس میں بٹھاکے چل پڑا۔ جہاں اسے ایمرجنسی میں پہنچنا تھا وہاں ہم اس وقت پہنچے جب ایمرجنسی ختم ہوگئی تھی۔ ہم سے پہلے فرشتۂ اجل اپنا کام کرکے جاچکا تھا۔ اس سے کمال کا موڈ آف ہوگیا۔ میں اسے کھانا کھلانے کے لیے لے گیا۔
کچھ دیر بعد اس کا موڈ ٹھیک ہوگیا تو میں نے کہا "میں تجھے ایک افسوس ناک خبر سناؤں؟ ویسے تو شادی کی بات ہے۔"
"شادی کی خبر افسوسناک کیسے ہوسکتی ہے؟"
میں نے کہا "تیری ساس نے دوسری شادی کرلی۔ کیا یہ خوشی کی بات ہے؟"
اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "یہ کیا مذاق ہے؟"
"یہ مذاق نہیں ہے" میں نے کہا "اس کا خط آیا ہے قمر کے پاس۔ کوئی حاجی پیر محمد ہے۔ اس کی ایک بیوی پہلے سے موجود تھی۔"
"پھر۔۔۔ قمر کی ماں کو کیا ضرورت پیش آگئی۔ کیا لکھا ہے اس نے؟"
"اس نے لکھا ہے کہ کچھ دشمنوں کو اس نے ٹھکانے لگادیا ہے لیکن باقی سے نمٹنے کے لیے اسے تحفظ اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اکیلی عورت وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے شادی کرلی۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔"
"کیا پاگل پن ہے؟"
"مجھے کچھ اندازہ ہوا ہے قمر کی باتوں سے۔۔۔ کہ پہلے یہ حاجی صاحب ہی اس کی ماں سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر شادی ہوگئی قمر کے باپ سلیمان آفریدی سے۔ اب اتنے عرصے بعد دیکھا کہ وہ اکیلی انتقام لینے نکل آئی ہے تو اس نے کہا کہ یہ کام ہیں مردوں کے۔ تم سب مجھ پر چھوڑ دو۔"
"یار یہ انتقام وغیرہ کا چکر پاگل پن ہے۔ آرام سے گھر میں بیٹھتی۔ بیٹی تمہارے سپرد کی اور خود سر سے کفن باندھ کے چل پڑی۔ انتقام ادھورا رہ گیا اور بیچ میں آگئی شادی۔ اب وہ کیا لوٹ

کے آئے گی" اس نے افسوس سے سر ہلایا "کیا یہ قمر بھی ایسی ہی ہوگی۔"
"یقیناً۔۔۔ خون کا کچھ اثر تو آئے گا" میں نے کہا "اگر کسی نے تجھے قتل کردیا تو وہ بھی شمشیر بکف نکل کھڑی ہوگی لیکن میں نے یہ بات تجھے اس لیے سُنائی ہے کہ تو عبرت پکڑے۔"
"میں کیوں عبرت پکڑوں" اس نے مرغی کی ٹانگ پکڑ کے کہا۔
"تیرے لیے شرم کی بات ہے۔ بیٹی کی شادی سے پہلے ماں نے شادی کرلی۔ قمر سخت ڈیپریشن کا شکار ہے۔"
"اسے ڈیپریشن نہ ہو تو مجھے ہونے لگتا ہے کہ خدا خیر کرے۔"
میں نے کہا "دیکھ اب میں سیریس ہوں اور بہت جذباتی ہوکے سوچ رہا ہوں کہ یہ فرض بھی ادا کردوں۔ اس کے ہاتھ پیلے ہوجائیں تو مجھے فراغت ہو۔"
"آپ خود کو فارغ سمجھیں۔ ہم کرلیں گے شادی۔ جب ہمیں فراغت ہوگی" وہ کھانے میں مصروف رہا۔
"یار' کل میں نے پھر وہ خواب دیکھا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیوں نظر آتا ہے ایک ہی خواب بار بار مجھے۔"
"اصلی خواب نامۂ یوسف انارکلی کے فٹ پاتھ پر مل جائے گا۔ اس میں تعبیر دیکھ لے۔"
میں نے کہا "یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کے کسی حادثے سے معلوم ہوتا ہے۔"
اس نے کہا "ہوش کب سنبھالا آپ نے۔ وقت اور تاریخ یاد ہے؟"
میں نے کہا "مذاق مت کر۔ خواب لاشعور اور تحت الشعور کے نہاں خانوں کے آسیب ہوتے ہیں جو اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب شعور کا پہرا نہ رہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس خواب کا تعلق میری شناخت سے ہے۔"
"تو کسی تحلیلِ نفسی کے ماہر سے رجوع کر۔"
"بہت پہلے گیا تھا' امریکا میں۔ وہ خود پاگل تھا پھر یہاں پاکستان کے سب سے بڑے ماہرِ نفسیات کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ تمہارا مرض لاعلاج ہے۔ تم نے اپنے گرد بہت مضبوط حصار بنا رکھا ہے اور اس حصار میں پناہ لے کے تم تسکین حاصل کرتے ہو۔ تم EXPOSE ہونا نہیں چاہتے۔ تم حقیقت کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہو چنانچہ قوتِ ارادی سے تم نے ایک ایسا فول پروف سیکیورٹی سسٹم بنالیا ہے کہ سوتے وقت صرف تم اپنے لاشعور اور تحت الشعور کے اندھیرے تہ خانے میں اُتر سکتے ہو۔ کوئی اور یہ کام نہیں کرسکتا۔ نہ تمہیں سُلا کے نہ ہپناٹائز کرکے اور نہ تحلیلِ نفسی سے۔ جب تک تم ہم سے تعاون نہ کرو ہم کیا مدد کرسکتے ہیں تمہاری۔۔۔ سوری۔"
"یہ تو خطرناک بات ہے" کمال نے سوچ کے کہا۔
"ہاں۔ یہی اس ماہرِ نفسیات نے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تمہارا کیس ہے دُہری شخصیت کا۔ ڈبل یا (SPLIT PERSONALITY) کا۔ ابھی تم آنکھ مچولی کھیل رہے ہو۔ اگر تم نے اس کو چیک نہ کیا تو ساری دنیا کے سامنے تمہاری دُہری شخصیت آجائے گی۔ جس کا تمہیں احساس نہیں ہوگا۔ یہ ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائڈ والی کہانی ہے مگر اس کو حقیقت نہ سمجھنا نادانی ہوگی۔ تم اپنی شناخت کے چکر میں کہیں کے بھی نہیں رہوگے۔"
"یہ تو بالکل ٹھیک کہا اس نے۔ تیرا یہ پاگل پن بڑھتا جارہا ہے دوست" ڈاکٹر کمال نے کہا "پہلے یہ ایک خیال تھا۔ پھر کھیل بن گیا۔ اس کے بعد پریشانی میں ڈھل گیا۔ اب یہ تیرا OBSESSION ہے۔ اس کے بعد جنون اور سودا۔۔۔"
"یار میں کیا کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں ناصر عظیم ہوں اور میرا باپ محمد عظیم تھا یا عظیم خان۔ عظیم احمد' عظیم الدین۔۔۔ میرے نام کا آخری حصّہ یعنی SURNAME یہی ظاہر کرتا ہے۔ کون تھا وہ شخص جس کے نام میں عظیم آتا تھا۔ جو اب میرے نام میں شامل ہے۔ اگر یہ معلوم ہوجائے تو پھر مجھے باپ کے ساتھ ہی ماں کا بھی پتا چل جائے گا۔"
"یار' اب یہ ناممکن ہے۔ اس شہر میں سیکڑوں عظیم ہوں گے۔ ایسے کتنے شہر ہیں پاکستان میں' ہر قصبے اور گاؤں میں کوئی عظیم ہوگا۔ بیرونِ ملک عظیم نام کے لوگ مل جائیں گے۔ ان سب کے نام' پتے تلاش کرنا اور ان سے ملنا' ان سے معلوم کرنا۔۔۔" کمال نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا "تو پاگل ہوجائے گا اس چکر میں۔۔۔ اور پاگل ہوکے بھی کیا ملے گا۔"
میں نے کہا "یار' میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے ماں باپ کون تھے' کیا یہ کوئی غلط بات ہے؟ دیکھ یہی مسئلہ تیرا تھا مگر تیری تلاش شروع ہونے کا مسئلہ پیدا۔۔۔ ہوتے ہی ختم ہوگیا۔ ایک بند گلی آگئی۔ تجھے پتا چل گیا کہ ڈاکٹر جمال تجھے کہاں سے لائے تھے۔ تیرا نام صرف کمال تھا۔ آگے پیچھے کچھ نہیں تھا۔ نہ باپ کا نام نہ کچھ اور۔ کمال بھی شاید خانہ پُری کے لیے لکھا گیا ہوگا۔ کمال احمد فاروقی' یہ نام ڈاکٹر جمال احمد فاروقی نے لکھا اور وہ قانونی طور پر تیرے والد ہوگئے۔"
وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "آپ بکواس نہ کریں فضول۔ یہ میرا اپنا رویّہ تھا۔ میری PRACTICAL قسم کی پازیٹو APROACH تھی۔ میں اس فضول چکر میں نہیں پڑا کہ اپنی شناخت اور اپنے ORIGIN کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ ورنہ میں بھی جاتا کراچی اور لاوارث بچّوں کے اس ادارے سے اپنے ماضی کا سفر شروع کرتا۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ ممکن نہیں تھا دوست۔ کوئی بھی تجھے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔"
"اور تجھے بتانے والے بیٹھے ہیں کیا؟" وہ ہنس کے بولا "کس سے پوچھے گا تو۔ اب تک کہاں کہاں خوار ہوچکا ہے۔ میرے پاس

تو ایک نقطۂ آغاز ہوتا۔ تیرے پاس کیا ہے؟ میں بائیس سال پہلے کی باتیں بھی تو ہی ادھوری ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے کمال۔ مجھے کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ اس کا مجھے یقیناً علم ہے" میں نے کہا "ابھی تک مجھے فرصت نہیں ملی تھی۔ میں دنیا کے کاموں میں بُری طرح الجھا ہوا تھا اور وہ میرے نزدیک زیادہ اہم ہو گئے تھے۔"

"اب اچانک یہ اہم ہو گیا ہے کہ آپ آگے جانے کے بجائے لوٹ کر پیچھے جائیں۔ وقت کے پُرانے راستوں پر یادوں کے نقشِ قدم تلاش کریں جو کب کے مٹ چکے ہیں یا پُرانے راستے' پرانی نشانیاں' پرانے لوگ' سب ختم ہو گئے ہیں۔ کیا فائدہ اس لاحاصل جدوجہد سے۔ دیکھو میں آج کتنا پُرسکون اور مطمئن ہوں۔ کیونکہ میں پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے اس کی خواہش ہی نہیں محسوس ہوتی۔"

"یہی فرق ہے تجھ میں اور مجھ میں۔ کاش میں تیری طرح ہوتا' میں اس خلش کو اتنی آسانی سے بُھلا سکتا۔ دس سال سے میں کرنل خان کے پاس ہوں۔ اس سے پہلے اور اس سے بھی پہلے میں کہاں تھا۔ یہ سب مجھے یاد ہے مگر پیچھے چلتے چلتے اچانک سڑک ختم ہو جاتی ہے ایک جگہ۔ اور وہاں سے ہر طرف راستے نکلتے ہیں۔ وہاں راہ نما کوئی نہیں۔ راستہ بتانے والا کوئی نہیں اور جتنے راستے وہاں سے نکلتے ہیں وہ آگے جا کے سپاٹ میدان میں ختم ہو جاتے ہیں ورنہ میں ہر راستے پر چل کے دیکھ سکتا تھا۔"

"یار کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تو ناصر عظیم ہے۔"

"میں تو شاہ عالم بھی تھا۔۔۔ اور ہوں۔"

"وہ مر گیا' ختم ہو گئی اس کی داستانِ حیات۔ وہ تیرے وجود کا ایک منحرف ہو جانے والا حصہ تھا۔ تیرا ہمزاد تیرا بچھڑ جانے والا جڑواں بھائی تھا جو ملا اور مر گیا۔ اب صرف ناصر عظیم ہے۔ شاہ عالم بننے سے پہلے بھی تو ناصر عظیم تھا۔ درمیان میں تو نے دُہری زندگی گزاری۔ تو دنیا کے سامنے شاہ عالم کی حیثیت سے آیا مگر خود اپنے لیے ناصر عظیم رہا۔ تیری عمر کا بہت مختصر حصہ تھا وہ جو شاہ عالم نے جیا۔ اب بھول جا اسے۔"

"کتنے لوگ ہیں ایسے جن کے لیے میں صرف ناصر عظیم تھا۔۔۔ اور ہوں۔ تیرے علاوہ قمر۔ کرنل خان اور چندا۔ صرف چار آدمی یہ بات جانتے ہیں کہ میں ہی شاہ عالم بھی تھا۔ باقی دنیا ناصر عظیم کو شاہ عالم سے الگ سمجھتی ہے۔ وہ ناصر عظیم کو نہیں جانتے۔ شاہ عالم کو جانتے ہیں۔"

"ان سب کے لیے شاہ عالم مر گیا۔"

"مگر میں اب ناصر عظیم بن کے جینا نہیں چاہتا۔ میں دوبارہ شاہ عالم بن کے ہی جیوں گا۔ مجھے دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ یہ ثابت کرنا ہے کہ مرنے والا کوئی اور تھا۔ شاہ عالم زندہ ہے۔ مجھے اپنے خواب کی تعبیر چاہیے۔"

"یار' خدا کے لیے۔ ناصر عظیم کو مت مار۔ شاہ عالم کو مر جانے دے۔ گڑے مُردے مت اکھاڑ۔ شاہ عالم شہید کو شہید ہی رہنے دے۔ اس کا آسیب بن کے جینے کی حماقت قبول کر۔"

"میں مجبور ہوں یار۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیا نہیں کر سکتا۔۔۔۔؟" وہ برہمی سے بولا۔

"میں ناصر عظیم بن کے زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"آخر کیوں؟" کمال نے چلّا کے کہا "کیوں زندہ نہیں رہ سکتا؟"

"وہ۔۔۔ پھر ماردیں گے مجھے" میں نے کہا "میری زندگی ان کے پاس گروی ہے۔ وہ بہت طاقتور لوگ ہیں۔ ان سے بچنا' چھُپ کے رہنا' بھاگ کے کہیں جانا' جھوٹ بولنا' سب ناممکن ہے۔ وعدہ خلافی ناممکن ہے میرے لیے۔ ناصر عظیم کو کچھ دن ملے ہیں زندگی کے۔ اس کے بعد وہ زندہ رہنا چاہے تو شاہ عالم کے قالب میں رہ سکتا ہے' ورنہ نہیں۔"

"ہم سب تیرے ساتھ ہیں۔"

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم بھی مارے جاؤ گے اگر میں نے انکار کیا۔ شاہ عالم زندہ رہے گا تو ہم سب ساتھ رہیں گے۔ جب تک ممکن ہوا۔"

"تو پھر شاہ عالم کا کھیل کھیلنا چاہتا ہے نا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا انجام دوبارہ یہی ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔"

میں نے بے بسی سے کہا "میں جانتا ہوں۔ مگر میں کیا کروں' ایک غلطی کو نبھانے کے لیے دوسری غلطی کیے بنا چارہ نہیں۔ انکار کی صورت میں مجھے بالکل مہلت نہیں ملے گی۔ شاہ عالم بن کے مجھے وقت مل جائے گا سوچنے کا اور کوئی طریقہ نکالنے کا۔ شاید میں موقع ملتے ہی ناصر عظیم بن کے بھاگ جاؤں۔ پکا بندوبست ضروری ہے ورنہ وہ مجھے پھر ڈھونڈ نکالیں گے۔ پکڑ کے واپس لے آئیں گے۔ بے شک میں آزاد پھر رہا ہوں۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ میں فرار ہو کے کہیں جا ہی نہیں سکتا۔"

"وہ کون۔ سُور کے بچے؟"

"جانتے بوجھتے انجان مت بن۔ اُلّو کے پٹھے" میں نے کہا "میں ان کا قیدی ہوں۔ ان کے حکم کا غلام ہوں۔ ان کی نگاہیں ہر جگہ مجھے دیکھتی ہیں۔ میرے پیروں میں نظر نہ آنے والی بیڑیاں ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ قمر سے شادی کر لے۔ کچھ وقت ہے میرے پاس۔"

"او کے۔ میں قمر سے شادی کر لیتا ہوں۔ تو چندا سے کر لے۔"

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "چندا سے؟ وہ صرف ناصر عظیم کی ہو سکتی ہے۔ شاہ عالم کی نہیں۔۔۔ اور شاہ عالم کو شبنم چھوڑنے والی نہیں۔"

کمال نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا "وہ بڈھا کرنل کیا کہتا ہے؟"

"وہ کہتا ہے کہ مقابلہ کرو۔ اگر تم ناصر عظیم بن کے جینا چاہتے ہو تو پھر شاہ عالم سے مقابلہ کرو' ہتھیار مت ڈالو' ہتھیار اُٹھا لو۔"

"یار' ایمانداری سے ایک بات بتا۔ کس کی زندگی اچھی لگی تجھے۔ ناصر عظیم کی یا شاہ عالم کی۔"

میں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا "گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

"مگر تو چڑیا گھر کا شیر تھا۔ پنجرے میں بند اور لوگ تیرا تماشا دیکھتے تھے۔ مذاق اُڑاتے تھے کہ جنگل کے بادشاہ' تم سے تو گیدڑ اچھا ہے کہ آزاد ہے۔ اپنی زندگی جیتا ہے اور کیا چڑیا گھر کا شیر واقعی شیر ہوتا ہے۔ خوش ہو سکتا ہے اس خیال سے کہ میں شیر ہوں۔ اس ملک میں وزیراعظم کیا واقعی عوام کا نمائندہ ہوتا ہے یا بااختیار ہوتا ہے۔"

میں نے اس سے نظر ملائے بغیر کہا "ہاں۔ جب وہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کے آتا ہے۔"

اس نے طنز سے کہا "ایک غیر جانبدارانہ منصفانہ اور آزادانہ انتخاب کے نتیجے میں۔"

میں نے پھر مجبوراً اقرار میں سر ہلایا "ساری دنیا جانتی ہے۔"

"جو ساری دنیا جانتی ہے وہ تو بھی جانتا ہے۔ آئین کے مطابق وزیراعظم انتظامیہ کا سربراہ ہے۔"

"پھر کیا ہے وہ؟"

"بچہ جمورا۔۔۔ انتظامیہ مداری ہے۔ وہ ڈگڈگی بجا کے مجمع لگاتے ہیں کہ آؤ۔۔۔ آؤ' تماشا شروع ہونے والا ہے۔ وہ اسے انتخاب کہتے ہیں۔۔۔ اور بظاہر مجمع میں سے کسی کو کہتے ہیں۔ "تم آگے آؤ بچہ!" وہ مداری کا ہی بچہ جمورا ہوتا ہے لیکن سب کے سامنے وہ اپنی زبان سے جو کچھ کہتا ہے اس سے مجمع حیران ہو جاتا ہے۔ تالیاں بجاتا ہے اور مداری پیسے اکٹھے کرنے لگتا ہے۔ پیسہ ہضم' کھیل ختم۔"

"سچ فرمایا آپ نے۔ ایک سو ایک فیصد۔۔۔ مگر۔"

"مگر اس کے باوجود میں وزیراعظم بننا چاہتا ہوں۔ شیر بن کے رہنا چاہتا ہوں خواہ چڑیا گھر کے پنجرے میں رہنا پڑے۔"

"آج جو بھی تھوڑی سی کامیابی حاصل کر لیتا ہے وہ انٹرویو میں کیا جواب دیتا ہے۔ جی مجھے بچپن سے شوق تھا اداکاری کا۔ میں نے پہلا شعر چار سال کی عمر میں کہا تھا۔ سات سال میں خیال درباری' بلمپت اور دورت لے میں گایا تھا۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ مجھے جنرل بننے کا شوق تھا۔ ہر بچہ کسی نہ کسی خواہش سے مغلوب ہوتا ہے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ میں اگر وزیراعظم بننا چاہتا تھا تو میری خواہش کو پہلے بھی سب پاگل پن کہتے تھے۔ آج بھی کہتے ہیں حالانکہ میں اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا۔"

"پھر تقریباً کامیابی یقینی ناکامی میں بدل گئی۔"

"ہار جیت ہر کھیل میں ہوتی ہے۔ میدان میں گھوڑا ہو یا عمران خان۔ سٹہ چلتا ہے اور اسی بے یقینی میں سنسنی خیزی ہے۔ اکثر جو سب سے کم فیورٹ ہو وہی جیت جاتا ہے۔"

"شاہ عالم بھی سب سے فیورٹ نہیں تھا۔"

"آج نہیں تھا مگر ہو سکتا تھا۔ اگر زندہ رہتا۔"

"دوسری زندگی میں وہ پھر وہیں سے شروع کرے گا جہاں سے بازی ختم ہوئی تھی۔" وہ بولا۔

"ختم کی گئی تھی" میں نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ زہر دے دیا جائے یا کسی کو پھانسی ہو یا کوئی ہوائی جہاز کے حادثے میں مارا جائے' کسی کو فائرنگ اسکواڈ اُڑا دے یا دہشت گرد ہلاک کر دیں۔ جو شرافت سے سرِ تسلیم خم نہ کرے اسے طاقت سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ بچہ جمورا اگر مداری بننا چاہے تو مارا جاتا ہے۔ ذاتی تجربہ رکھنے کے بعد بھی تو یہ کھیل پھر شروع کرنے کے حق میں ہے؟"

میں نے کہا "مجبوری کی بات الگ ہے۔ خود میرے لیے ایک ناکامی کے بعد اپنی زندگی کے مقصد سے دستبرداری کا خیال باعثِ شرم ہو گا۔ ہر آدمی کے کچھ خواب ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر جینے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"آپ کے کتنے خواب ہیں ایسے؟"

"ڈھائی!" میں نے سوچ کے کہا "ایک اس ملک کا وزیراعظم بننا' دوسرا اپنی شناخت کا ثبوت حاصل کرنا۔ اور چندا سے شادی۔"

"یہ آدھا خواب ہے؟" کمال نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ باقی آدھا تو چندا کا ہے" میں نے کہا "اس پر میرا اختیار نہیں۔"

"وہ شاہ عالم سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔ وہ وزیراعظم بن جائے یا صدر۔ یہ بات آپ جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ ناصر عظیم سے محبت کرتی ہے' شاہ عالم سے نفرت۔ مشکل تو میری ہے نا' کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے۔"

"تیری زندگی اچھی خاصی پھولوں کی سیج تھی' تُو نے اسے کانٹوں کا بستر بنا کے کیا پایا؟"

میں نے کہا "خود تُو نے جو کچھ کیا۔۔۔ اور کر رہا ہے' اس کے بارے میں بہت سے لوگ یہی کہیں گے۔"

"مگر میں ذاتی مفاد کے لیے کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ میرے مقصد میں خود غرضانہ سوچ کو دخل نہیں۔ اس سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا' کسی کو دکھ نہیں ہوتا۔ میں نہ عزت شہرت کا بھوکا ہوں' نہ مجھے کسی سے ستائش کی سند چاہیے سوائے دعا کے میں ان سے کچھ نہیں مانگتا جن کو میری کوشش' شوق یا دیوانگی سے فائدہ ہوتا ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ اپنا مقابلہ مجھ سے کیوں کرتا ہے سُور کے بچے!" وہ چلّانے لگا۔

میں نے کہا "میری دیوانگی کا بھی علاج نہیں۔ کرنل خان یہ بات سمجھتا ہے اس لیے مجھے روکتا نہیں۔ وہ پہلے بھی کہتا تھا کہ حصولِ مقصد کی قیمت بعض اوقات جان دے کر ادا کرنی پڑتی ہے اور مقصدِ حیات ہر شخص کا اپنا ہوتا ہے۔ وہ پہلے بھی میرا مددگار اور راہنما تھا' آج بھی ہے۔"

"وہ تو میں بھی ہوں' چندا بھی ہے۔ اسی بات کا تو افسوس ہے' کاش ہم سب تجھ پر لعنت بھیج کے سکون سے رہ سکتے۔ اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ خدا کے لیے خود کو ہلاکت میں مت ڈال' ایک بار تو شہادت کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔ اگلی مرتبہ حرام موت سے بچ۔ آخر تو صرف اپنے لیے تو زندہ نہیں ہے یار!۔۔۔ قمر۔۔۔ چندا' میں اور خانِ اعظم۔"

"تم سب میری کابینہ میں شامل ہوتے۔ خیر کوئی بات نہیں' پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔"

وہ میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگا "محترم وزیرِاعظم صاحب' مجھے تو آپ بخش دیں۔ میں ڈاکٹر کمال صرف ناصر عظیم کا دوست ہوں۔"

"بات شروع ہوئی تھی قمر کی شادی سے۔۔۔"

"میں نے عرض کیا نا۔۔۔ جس دن چندا اور ناصر کی شادی ہوگی۔ اسی دن میری بھی قمر سے شادی ہو جائے گی۔"

"تو نے مشروط بات نہیں کی تھی۔"

"اب کر رہا ہوں۔ چل اُٹھ' میری ڈسپنسری کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

"مہربانی کر کے بل ادا کر دیں۔"

"سوری۔ میں ٹرسٹ سے صرف دس ہزار ماہانہ تنخواہ لیتا ہوں۔ اس میں یہ عیاشی افورڈ نہیں کر سکتا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ پانچ کروڑ کے ٹرسٹ کی ماہانہ آمدنی ہی چھ سات لاکھ تھی۔ یہ سب اس کا تھا مگر ساری بات نصیب کی ہے۔ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم۔

شبنم پر مجھے یاد آیا کہ ایجنٹ زیرو زیرو سیون کی خیر لینا میرا اخلاقی فرض تھا۔ صدمے سے اس کا ہارٹ فیل تو نہیں ہوا تھا مگر وہ سخت دل شکستہ اور مایوس تھی۔

○☆○

سال بھر پہلے ناصر عظیم کے بارے میں کچھ سنسنی خیز خبریں اس شہر کے سب اخباروں میں شائع ہوئی تھیں۔ کسی شہر کے بہت بڑے' کروڑ پتی ارب پتی تاجر' بزنس ٹائیکون اور صنعت کار جو اچھی بُری کسی قسم کی شہرت نہ رکھتا ہو' کا اچانک غائب ہو جانا ایسی خبر بہرحال نہیں تھی کہ صفحۂ اوّل کی سُرخی ہوتی مگر اندرِ شہر کی خبروں میں یہ تین کالم کی سرخی بن گئی تھی۔ انگریزی کے اخباروں نے اسے ایک باکس میں جگہ دے کر نمایاں کر دیا تھا۔

خبر میں صرف یہ تھا کہ ناصر عظیم اپنی گلبرگ والی کوٹھی سے صبح چھ بجے معمول کے مطابق باغِ جناح گئے تھے جہاں وہ جوگنگ کرتے تھے اور خود کو فٹ رکھنے کے لیے ایکسرسائز کر کے ایک گھنٹے میں لوٹ آتے تھے۔ وہ ٹریک سوٹ میں چھ بجے اپنی گولڈن مرسیڈیز میں روانہ ہوئے تھے تو ان کے پُرانے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور بند کیا تھا۔ ان کو باغِ جناح میں باقاعدگی سے ورزش کے لیے آنے والوں نے بھی دیکھا تھا۔ ان کی کار جِمخانہ یا گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور دوپہر کو بارہ بجے پولیس نے وہیں سے اُٹھائی۔ کار لاک نہیں تھی۔ چابیاں سوئچ میں لٹک رہی تھیں اور اگنیشن آن تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کار میں بیٹھ کے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ کسی وجہ سے باہر نکلے اور اس کے بعد غالباً انہیں اغوا کر لیا گیا۔

پولیس نے اس نظریے کو ابتدا میں ہی مسترد کر دیا تھا کہ وہ گاڑی کسی خرابی کے باعث اسٹارٹ نہیں کر سکے تو نیچے اُتر کے دیکھنا چاہتے تھے کہ ٹائر فلیٹ ہے یا انجن میں کوئی تار نکل گیا ہے یا کوئی معمولی خرابی ہے۔۔۔ گاڑی اے ون رننگ کنڈیشن میں تھی۔

چابیاں موجود ہونے اور اگنیشن آن دیکھ کر یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ ناصر عظیم کو ذرا بھی مہلت نہیں ملی۔ اگر وہ دوستوں کے ساتھ جاتا یا اسے جانے پہچانے چہرے دیکھ کے کسی مجبوری کے باعث اُترنا پڑتا تو وہ سوئچ ضرور آف کرتا' چابیاں بھی لوگ گاڑی سے اُترتے وقت عادتاً نکال لیتے ہیں مگر بعض اوقات وہیں کھڑے ہوں تو گی چھوڑنے میں بھی حرج نہیں سمجھتے۔ پولیس نے بعد میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اغوا کرنے والے گھات میں تھے اور ناصر عظیم کے گاڑی میں بیٹھتے ہی پہنچ گئے۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ کون تھے؟ دوست' آشنا یا اجنبی دشمن۔ پولیس کا خیال تھا کہ ناصر عظیم انہیں جانتا تھا ورنہ وہ فرار بھی ہو سکتا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے گیئر میں ڈالنے کے لیے اسے چند ہی سیکنڈ درکار تھے۔ اس کے بعد دوسرا سوال سامنے آتا تھا کہ وہ صورت آشنا تھے تو ناصر اتنی افراتفری میں کیوں اُترا تھا کہ سوئچ تک آف نہیں کیا۔ وہ دشمن تھے تو انہوں نے ناصر کو گاڑی میں بیٹھنے کی مہلت بھی کیوں دی۔ اس سے پہلے بھی وہ اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے؟ وہ اس کو بہانے سے لے گئے' گن پوائنٹ پر زبردستی یا ناک آؤٹ کر کے؟ وہ پہلے سے کار میں موجود تھے یا باہر انتظار کر رہے تھے؟ کسی دوسری کار میں بیٹھے تھے۔ ناصر نے مزاحمت کی یا نہیں؟ ایسے سوالات بعد میں بہت اُٹھے۔ پولیس نے سب کا جواب اپنی ذہانت کی شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے یوں دیا کہ جس کا جو مطلب چاہے نکالے اور جو چاہے سمجھے۔

ناصر عظیم کے بہت سے کاروبار تھے۔ این اے انٹرپرائزز کے نام سے کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ اس کی کامیابی اور دولت مندی کا نقطۂ آغاز یہی کمپنی تھی۔ اس نے چھوٹے ٹھیکے لیے' پھر بڑے ٹھیکے لیے اور سرکاری حکام سے مل کے خوب کمایا کھایا اور کھلایا۔ ریت

میں اتنا سیمنٹ استعمال کیا جتنا آٹے میں نمک اور دیواریں کھڑی کر دیں۔ غیر موجود ندی نالوں پر فرضی پُل بنا دیے جن کا وجود صرف کاغذی نقشوں تک محدود تھا۔ دیہات اور قصبوں میں سیکڑوں میل لمبی سڑکیں بنا دیں جن کا سراغ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ جب پکڑے جانے کا وقت آیا تو کمپنی دیوالیا ہو کے بند ہو گئی اور عدالت میں صرف کیس رہ گیا۔ این اے انٹرپرائزز والوں نے امپورٹ ایکسپورٹ کے شعبے کو پھیلایا اور اسمگلنگ کی دنیا کو سکندرِ اعظم کی طرح فتح کر لیا۔ ناصر عظیم کا اصول تھا کہ بے ایمانی اور بدمعاشی کبھی حد میں رہ کے نہیں کرنی چاہیے۔ ہاتھ جب مارو' بڑا مارو۔ قسمت چور کا بھی ساتھ دیتی ہے اور ڈاکو کا بھی۔ نہ پکڑا جائے تو فائدے میں ڈاکو رہتا ہے۔ پکڑا جائے تو دونوں برابر۔ وہ بلڈوز کر کے راستہ بناتا تھا۔ جہاں دوسرے ہزار روپے کی رشوت دیتے تھے وہ ایک لاکھ خرچ کرتا تھا چنانچہ دوسرے ایک لاکھ منافع کھاتے تھے تو وہ ایک کروڑ کھاتا تھا۔

لیکن یہ پُرانی باتیں تھیں۔ بعد میں این اے انٹرپرائزز نے ملک کے اندر ہی کاروبار کی منصوبہ بندی کی۔ تین بڑے شہروں میں ان کے سُپر اسٹور قائم ہوئے۔ بعد میں ان کی تعداد پانچ ہو گئی۔ ان کے متوازی ملک کے شمالی پہاڑی علاقوں میں ٹورسٹ ان اور ہوٹل بنائے۔ اگلا مرحلہ صنعت میں قدم رکھنے کا تھا۔ فیصل آباد میں ایک ٹیکسٹائل مل اور بہاولپور کے قریب شوگر مل۔ کراچی میں نائلون فائبر اور کارگو کنٹینر سروس۔ ان سب کا مالک ناصر عظیم تھا مگر پسِ پردہ بہت سے فرضی نام تھے۔ ان کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ناصر عظیم کی بیوی' اس کے ماں باپ' بھائی بہن اور سالے' ساس سسر تک شامل تھے۔

ناصر عظیم خود بڑی خاموش زندگی گزارتا تھا۔ اسے پبلک لائف میں آنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اس کا حلقۂ احباب محدود تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بارے میں عام لوگ کیا کاروباری حلقے اور صحافی حضرات بھی بہت کم جانتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے کام سے کام رکھنے والا گمنام رہ کے بزنس اور پرائیویٹ لائف کی مصروفیات میں وقت گزارنے والا شخص تھا۔

پولیس کو گمشدگی کی رپورٹ دینے والی ناصر کی بہن تھی مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکی کہ ناصر بھائی کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ اس کی بہن قمرالنسا خود بھی ایک فیشن بوتیک اور ایک بیوٹی پارلر کی مالک تھی۔ پولیس نے ناصر کے واحد قریبی دوست ڈاکٹر کمال کا بیان بھی لیا۔ انہیں ناصر کی کوٹھی میں ایک ریٹائرڈ کرنل بھی ملا جس نے کہا کہ وہ ناصر عظیم کا سسر ہے مگر اس کے بیان سے بھی تفتیش میں کوئی مدد نہ ملی۔ پولیس نے کوٹھی کے ملازمین سے بھی پوچھ گچھ کی۔ یہ سب معمول کی کارروائی تھی۔ اگر ان پر دباؤ ہوتا تو شاید وہ زیادہ دوڑ دھوپ کرتے مگر اغوا ہونے والے کے وارث بالکل ڈھیلے لوگ تھے۔ پولیس کی اصطلاح میں وہ لوگ جو خود پولیس کے لیے کچھ نہ کریں اور پولیس سے توقع رکھیں کہ ان کے لیے سب کچھ کرے۔ کسی نے ڈی آئی جی یا آئی جی سے اپیل نہیں کی۔ تاجروں کی کسی انجمن نے بیان نہیں دیا۔ کسی سیاسی جماعت کے ایم پی اے یا ایم این اے نے دلچسپی نہیں لی۔ اس کیس کی تفتیش سے کیا ملتا؟ پولیس کے ریکارڈ میں بیس تیس سال پُرانے قتل' اغوا' ڈکیتی کے کیس۔۔۔ "نامعلوم ملزمان" سے منسوب ہیں جو کبھی پکڑے نہیں گئے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی کیس تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ اس کیس کو دبانا مقصود تھا۔ جرم کا سُراغ لگانے کے لیے شور' ہنگامہ' دوڑ دھوپ سب کرنا پڑتا ہے۔ کیس دبانے کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ خصوصاً ایسے کیس میں جہاں شک میں بھی کسی کو پکڑنا ممکن نہ ہو ورنہ تفتیش کے نام پر کچھ دن تو تھانے میں رونق رہتی ہے۔

اس واقعے سے جو بہت زیادہ سنسنی خیز بھی ثابت نہیں ہوا' چند ماہ قبل ایک اور واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کا علم کسی کو بھی نہیں مگر وہ میرے لیے واقعی سنسنی خیز تھا۔

میں ایک کاروباری مسئلے پر کسی پارٹی سے فائنل بات کرنے کے لیے لندن گیا تھا۔ کرنل خان کی سرپرستی میں آنے کے بعد میں نے بڑی خاموش' پُرسکون اور متوازن زندگی گزاری تھی۔ میں نے کامل یکسوئی کے ساتھ بہت سے کام کیے تھے۔ میں نے اپنے سارے ناجائز کام جو پہلے میں دوسروں کے لیے کرتا تھا اور پھر خود کرنے لگا تھا۔ ختم کر دیے تھے اور اپنا سرمایہ منافع بخش کاروبار میں لگا دیا تھا۔ یہ میری محنت تھی۔ خان جی کی راہنمائی اور خدا کی مہربانی کہ میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا مٹی سے سونا بنانے لگا۔ میں نے کرنل خان سے مارشل آرٹ سیکھا تھا اور کچھ وقت روحانیات کے لیے بھی وقف کیا تھا۔ اس سے مجھے ذہنی یکسوئی' اطمینانِ قلب اور خود اعتمادی کا نیا تجربہ حاصل ہوا تھا۔۔۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب میرے جیسا خانہ بدوش اور شترِ بے مہار' آوارہ مزاج اور جہاں گرد' ہر ایک سے محبت جتانے اور محبت مانگنے کے بعد بھی محبت کے نام سے نا آشنا' محبت کی تقدیس کو نہ سمجھنے والا' جنس اور ہوس کی طلب کو محبت کا نام دے کر بدنام کرنے والا' پہلی بار اس محبت میں گرفتار ہوا جس کا وہ خود مذاق اُڑاتا تھا۔ پاکیزہ محبت۔ مائی فٹ! افلاطونی محبت' بکواس۔۔۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق۔ سب قصے کہانیاں۔ مرد اور عورت کا ازل سے وہی ایک تعلق' وہی ایک رشتہ ہے۔ شاعروں' افسانہ نگاروں نے اس کو ڈراما بنا دیا ہے ورنہ حقیقت وہی ایک ہے کہ حیوانی جذبے انسان کی جبلت میں شامل ہیں۔ بھوک کی ایک قسم ہے عشق۔ جب بھوک مٹانے کا موقع مل جاتا ہے تو پھر۔ وفا کیسی' کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا۔ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

مجنوں کی لیلیٰ سے اور فرہاد کی شیریں سے شادی ہو جاتی تو بچے ہوتے افسانے نہ ہوتے۔

لیکن جب چندا کو دیکھا تو چاند پر نظر گئی اور احساس ہوا کہ چاند تارے توڑ کر لانے کا دعویٰ کرنا آسان ہے مگر چاند آج بھی بہت دور ہے۔ ایک تشبیہ ہے' ایک استعارہ ہے۔ نیل آرم اسٹرانگ نے چاند کو دیکھا اور پھر دنیا نے دیکھا تو اس سے چاند کی کشش اور چاندنی کا حُسن کم نہیں ہوا۔ میں بھی چندا کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے حُسن سے مسحور تھا مگر چاند میری دسترس میں نہ تھا۔ بالآخر مجھے وہی محبت ہوگئی تھی جس کے بارے میں غالب نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ ایسا نہ ہوتا تو بیسویں صدی میں اتنا بڑا واقعہ کیوں پیش آتا کہ ایک عورت۔۔۔ معذرت کے ساتھ 'سیکنڈ ہینڈ عورت مسز سمپسن کے لیے ایڈورڈ ہشتم برطانیہ کے تاج و تخت کو نہ ٹھکراتا۔ وہ ایک بیوہ تھی اور مس یونیورس تو کیا حسین تک نہ تھی۔ اور تاجِ برطانیہ پر اس وقت سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ آدھی دنیا پر ایڈورڈ ہشتم کی حکومت ہوتی تو اسے ساری دنیا کی حسین عورتوں میں سے انتخاب کرنا کیا مشکل تھا۔ مگر اس نے عشق سے زیادہ مشکل کام کیا۔ جیسے فرہاد نے تیشے سے نہر نکالی تھی۔ یہ اتنا ہی مشکل اور بظاہر ناممکن نظر آنے والا کام تھا مگر۔۔۔ جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی۔ تو پھر یہی ہوتا ہے' خود مجھے اندازہ ہوا کہ منزلِ عشق کی مسافت تو میں پہلی بار طے کر رہا ہوں۔

کئی بار میں پہلے بھی لندن آیا تھا۔ اور ہر بار یہاں کی رزم گاہِ حُسن و عشق سے نئی فتوحات کے غرور میں سرمست لوٹا تھا لیکن یہ پہلی بار تھا کہ میں نے پُرانے رشتے فراموش کردیے اور کسی کی نظرِ التفات کا اشارہ ملا تو نظر انداز کردیا۔ اب میرے لیے ہر طرف چندا تھی۔ لندن کے کوچہ و بازار کی صبحوں میں چندا تھی اور پیرس کے شبستانوں میں چندا تھی۔ میں چندا کا اسیر تھا اور چندا کے لیے پاگل تھا جسے صحیح معنوں میں LUNATIC کہا جاسکتا تھا۔

میں ہوٹل سے نکلا تھا تو سارا دن کاروباری مصروفیات میں گزارتا تھا۔ بزنس ڈیل کرنے والے عیار طبع خریدار دیکھنے کے فن کو سیلز مین شپ کہتے تھے اور مقابلے کی فضا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے سارے وسیلے جائز شمار ہوتے تھے۔ معیار اور قیمت کے ظاہری مقابلے کے پیچھے گاہک کو پھانسنے کے لیے رشوت کا جال بھی بڑے سلیقے سے پھیلایا جاتا تھا۔ بعض اوقات "انڈر ہینڈ ڈیل" میں کمیشن کا معاملہ براہِ راست طے ہوجاتا تھا۔ کتنے فیصد' کس کرنسی میں اور کہاں جمع کرادیا جائے گا۔ اس طرح کہ اصل قیمت کاغذات میں وہی رہے گی۔ ایسا عموماً سرکاری سودے میں ہوتا تھا یا ٹھیکے میں۔ جہاں مالک خود سودا طے کرتے تھے' وہاں ان کو ریڈ کارپٹ استقبال اور وی آئی پی ٹریٹمنٹ دینے اور خاطر مدارات میں دن و رات ایک کردینے کا ہنر کام آتا تھا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں وہ سب فراہم کردیا جاتا تھا جس کی تمنا کرے کوئی۔

ایک رات میں ڈنر سے لوٹا تو مجھے ایک پیغام ملا۔ "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ امیر تیمور" ہوٹل کی اسٹیشنری پر کمرے کا نمبر اور فون نمبر سب کچھ تھا مگر میں کسی امیر تیمور سے واقف نہ تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا کہ پاکستان میں یا لندن میں اس نام کے کسی شخص سے میری ملاقات کہاں ہوئی تھی مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔

اپنے کمرے سے میں نے اسے فون کیا تو رات کے بارہ بجنے والے تھے مگر میرا خیال تھا کہ لندن جیسے شہر میں اور اس قسم کے ہوٹل میں کاروبار سے فراغت کے بعد ذاتی مصروفیات کے لیے شام کا آغاز بھی ڈنر سے ہوتا ہے اور بارہ بجے رات شروع ہوتی ہے۔ ریسیور کسی لڑکی نے اُٹھایا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "ہیلو!" پھر کسی کو ڈانٹ کے کہا "بات تو کرنے دو۔"

میں نے کہا "میں امیر تیمور صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا۔"

اس نے کسی سے مخاطب ہو کے کہا "اُف۔ کیا مصیبت ہے" اور پھر ہنسی "لو بات کرو' تمہارا فون ہے۔"

"یار' اس وقت کس کا فون آگیا؟" پس منظر سے کسی مرد نے کہا۔

لڑکی پھر ہنسی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے اور اس کی ہنسی میں نوجوانی کی شوخی اور شباب کی کھنک تھی مگر آواز میں جو سرور تھا وہ آپ اپنی کہانی کہتا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ شاید میں نے غلط وقت پر فون کیا۔ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس اجنبی سے صبح بھی بات کی جاسکتی تھی۔

تیمور نے "ہیلو" کہا تو مجھے اس کی آواز سے بھی بہت کچھ معلوم ہوگیا۔

میں نے کہا "سوری تیمور صاحب۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"وہ تو کیا۔۔۔ مگر اب کم سے کم الفاظ میں بتاؤ کہ کیوں کیا؟"

میں نے کہا "آپ نے میرے لیے ایک پیغام نہ چھوڑا ہوتا تو ہرگز نہ کرتا۔"

وہ سنبھل گیا "مسٹر ناصر عظیم!"

میں نے کہا "جی۔۔۔ میں ابھی ایک ڈنر سے واپس آیا تھا۔ مجھے آج کا کام کل پر چھوڑنے کی عادت نہیں ہے اس لیے۔۔۔"

"وضاحت کی ضرورت نہیں ناصر صاحب۔ اچھا کیا آپ نے۔ کل آپ کس وقت فارغ ہیں؟"

"کل شام میرا واپسی کا ارادہ تھا؟"

"اس ارادے کو ملتوی کرسکتے ہیں آپ۔ کم سے کم ایک دن کے لیے۔"

"اور زیادہ سے زیادہ؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

"بی مائی گیسٹ" وہ بولا "جب تک آپ چاہیں۔۔۔"

میں نے کہا "ویری سوری۔ میرے پاس بھی وقت کم ہوتا ہے لیکن میں ایک دن تو نکال ہی سکتا ہوں۔"

"پھر آپ کل لنچ۔"

میں نے کہا "لنچ کے لیے میں بُک ہوں۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "پھر ڈنر کے لیے میری بکنگ۔۔۔ میرے ہوٹل میں۔"

میں نے کہا "تیمور صاحب۔ آپ نے میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی بکنگ کرلی۔ ایک دن میں اس صورت میں نکالوں گا جب کام کا پتا چلے گا۔"

"کام آپ کے فائدے کا ہے۔"

میں نے کہا "بعض اوقات نقصان کا سودا کرنے کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے لیکن تیمور صاحب' آپ کو میرے فائدے میں کیا فائدہ نظر آتا ہے؟ اس ڈائریکٹ سوال کا بُرا مت مانئے۔ میں گی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں۔ کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟"

اس نے کہا "آپ مجھے نہیں جانتے؟"

"میں اپنی یادداشت پر شرمندہ ہوں۔۔۔"

"آپ اخبار تو پڑھتے ہوں گے!" اس نے کہا۔

"اخبار تو پڑھنا پڑتا ہے۔"

"پھر تو سیاست سے بھی دلچسپی ہوگی آپ کو؟"

"یہ ضروری تو نہیں" میں نے کہا "میں کاروباری آدمی ہوں۔"

"کاروبار آج کل سیاست سے الگ نہیں رہا اور سیاست کاروبار سے الگ نہیں۔"

"وہ میں سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے سیاست میں میری دلچسپی بھی محدود ہے۔ میں مجموعی سیاسی فضا پر نظر رکھتا ہوں اور میرا کاروبار ابھی تک سیاسی فضا سے متاثر نہیں ہوا۔ کیا آپ سیاست داں ہیں؟"

"میں اچھا خاصا مشہور سیاست داں ہوں۔" اس نے قدرے طنزیہ ناگواری سے کہا "میری بدقسمتی کہ آپ مجھے نام سے بھی نہیں جانتے' خیر یہ بتایئے کل کس وقت۔۔۔؟"

میں نے کہا "تیمور صاحب! آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میرا آپ سے ملنا کیوں ضروری ہے؟"

وہ ہنسنے لگا "بھئی میں ایک بزنس مین بھی ہوں۔"

میں نے کہا "کیا بزنس ہے آپ کا؟"

"ناصر صاحب! کچھ ملاقات پر بھی چھوڑیے۔ ساری باتیں اس وقت ٹیلی فون پر ممکن نہیں۔"

میں نے کہا "آپ کے پاس میرے لیے کوئی بزنس پروپوزل ہے؟"

"ایسا ہی سمجھئے۔ کاروبار کا مطلب صرف خرید و فروخت ہی تو نہیں ہوتا۔ باہمی اشتراک سے کوئی کام کیا جائے جس میں آپ کو بھی فائدہ ہو اور مجھے بھی' وہ بزنس ہے۔"

میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا "لیکن مسٹر تیمور! آپ میرے پاس بینک آف انگلینڈ میں ڈکیتی کا کوئی فول پروف منصوبہ لے کر آئیں اور یہ کہیں کہ میں آپ سے اشتراک کروں کیونکہ یہ بزنس ہے جس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے تو میں ایسے بزنس میں شریک نہیں ہوسکتا۔"

درمیان میں شاید اس نے کچھ پیا تھا اور ایک بار کوئی ایسی حرکت کی تھی جس پر لڑکی نے ہنستے ہوئے مگر مصنوعی غصے سے اس کو "بے شرم" بھی کہا تھا۔ اور تیمور بلاشبہ ایسا ہی تھا چنانچہ زندگی کی رنگینی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ بزنس میں فریقِ ثانی کے ذاتی اخلاق و کردار کی خوبی یا خامی کو بنیاد بنا کے کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کاروبار صرف اعداد و شمار پر چلتا ہے۔

تیمور نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ بینک آف انگلینڈ میں ڈکیتی سے زیادہ منافع بخش پروپوزل آپ دیں اور مجھے قائل کریں۔ سی یو تومارو۔ ایٹ او کلاک؟"

"ایٹ او کلاک ول بی فائن" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میرے پاس اگلا پورا دن تھا۔ دوپہر تک میری ملاقات بہت سے پاکستانی اور بھارتی تاجروں سے ہوئی جو گزشتہ نصف صدی میں وہاں اپنے قدم جما چکے تھے اور سفید فام حریفوں کے متعصبانہ رویّے کے باوجود اپنا حلقۂ اثر پیدا کرنے میں کامیاب تھے۔ حیرت انگیز طور پر گوروں کے خلاف اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستانی اور بھارتی اپنے سیاسی اور مذہبی اختلافات کو بالکل بُھلا دیتے تھے اور وہاں صرف ایشیائی بن کے ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے۔ سوائے چند دنوں کے مثلاً چودہ اگست یا تیئس مارچ اور تیس جنوری کو جب سفارت خانوں کی یا کسی قومی تنظیم کی طرف سے نیم سرکاری اجتماعات ہوتے تھے۔ ملی نغمے گائے جاتے تھے یا جذباتی تقریریں کرنے والے دونوں کو ان کے قومی اختلافات یاد دلاتے تھے۔ سارا سال وہ ایک رہتے تھے۔ سماجی تقریبات' تہوار اور خوشی غمی میں وہ ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے تاہم دونوں اپنے اپنے وطن میں عزیز و اقارب سے پورا رابطہ رکھتے تھے۔ ملکی اخبارات پڑھ کے اور ملکی ریڈیو کی نشریات کے ذریعے ملکی حالات و مسائل سے پوری طرح باخبر رہنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

جب میں نے ان سے امیر تیمور کے بارے میں پوچھا تو میری کم علمی پر کچھ پاکستانی حیران ہوئے "کمال ہے۔ تم پاکستان میں رہتے ہو اور امیر تیمور کو نہیں جانتے؟"

"میں صرف اس امیر تیمور کو جانتا ہوں جس کو تاریخ میں تیمور لنگ کہا جاتا ہے" میں نے کہا۔

"پی ایل ایف پارٹی کا نام تو سُنا ہوگا؟"

میں نے کہا "اب اتنا بھی بے خبر نہیں میں۔ دراصل عملی سیاست' سیاسی تبصرے اور جائزے' کالم اور بیان۔ یہ سب پڑھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے اور پھر یہ میری فیلڈ بھی نہیں

ہے۔"

ایک جلاوطن سیاست داں بیس سال پہلے لندن آئے تھے تو ملکی خزانے سے لوٹا ہوا سارا مال بھی ساتھ لے آئے تھے اور اب گوروں کے دیس میں اس مالِ غنیمت سے کاروبار سیٹ کرکے خود بھی سیٹل ہو چکے تھے۔ زندگی خوش حال اور عیاشی میں گزر رہی تھی مگر سیاست کا چسکا ایسا منہ کو لگا تھا کہ لندن سے بیان بازی کرتے رہتے تھے۔ ایک سیاسی جماعت کے لندن آفس میں ان کی بیٹھک تھی مگر انہوں نے لیٹر ہیڈ پر بھی کچھ وطن پرست' مذہبی اور سماجی تنظیمیں قائم کر رکھی تھیں۔ چنانچہ وہ ہر قسم کے مذہبی بیان بڑے ذوق وشوق سے دیتے تھے۔ ٹی وی پر بے حیائی کی مذمت (جس کا کوئی پروگرام وہ نہیں دیکھتے تھے) نظام تعلیم کی مذمت (جس سے ان کا کبھی واسطہ نہیں رہا تھا اور نہ ان کی موجودہ نسل کا تھا) غیر شرعی قوانین کے نفاذ کی مذمت۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ بے شک ہم سیاست سے دور ہو گئے مگر سیاست تو ہم سے دور نہیں ہوئی۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ آدمی کو خبروں میں "اِن" رہنا چاہیے۔ کیا پتا کل پھر حالات موافق ہوں تو میدان سیاست میں اُترنا یا کودنا پڑے۔

انہوں نے فرمایا "شاہ عالم اس پارٹی کا چیئرمین ہے۔"

"کون سی پارٹی کا؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

"او یار! پی ایل ایف' پیس لو فریڈم پارٹی۔ کیا چُن کے نام رکھا ہے جی" انہوں نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "جیسے وہ تھا کوئی نیگرو جس کا نام کسی نے کافور رکھ دیا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے اس پارٹی میں پیس لو فریڈم نام کی چیز کا کوئی وجود نہیں؟"

"او جی بھولے بادشاہو۔ ایسی چیز دنیا میں کہاں ہے۔ ہے تو ہم کو بھی بتاؤ' امن کدھر ہے۔ گھر میں امن نہیں' باہر امن نہیں۔ خاندان محلے میں امن نہیں' ملک میں' دنیا میں۔ کدھر ہے لَو۔ بس فلموں میں واہ واہ لَو ہے جی! بڑے سوہنے سوہنے گانے ہیں۔ وہ اپنا دلیپ کمار! اس کو دیکھا میں نے۔۔۔ ہاہا۔ تو جناب عالی' اب رہ گئی فریڈم تو بندہ کوئی دنیا میں آزاد ہے؟ پیدا ہوتے ہی غلامی شروع ہو جاتی ہے۔ بڑا بھائی' ابا' چاچا' ماما۔ سب کی غلامی۔۔۔ خیر جی گھر والی کی غلامی۔ سڑک پر قانون کی غلامی' ملازمت غلامی' کاروبار غلامی۔ مالک تو ہوا جی گاہک۔۔۔ اور ملک' ملک کا غلام ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ غلامی کی مزید مثالوں سے وضاحت کرتے' میں نے کہا "شاہ عالم کی بات کر رہے تھے آپ؟"

"او چھا!" انہوں نے بے حد حیرانی سے سوال کیا "ہاں۔۔۔ وہ بندہ تو خیر اچھا تھا۔ فوت نہیں ہوا ہے خدانخواستہ۔ جب اس نے پارٹی بنائی تو واہ واہ تقریریں کرتا تھا۔ تقریر تو اپنے ملک میں سب اچھی کر لیتے ہیں جناب عالی۔ اور کیا کیا پچاس سال تک۔۔۔ بڑی پریکٹس ہو گئی ہے اب تو۔ خیر سے مولوی بھی ایسی دُھواں دھار تقریر کرتے ہیں کہ آگ لگا دیتے ہیں۔ پھر ہو جاتا ہے ٹھائیں ٹھائیں۔ فلاں کافر' فلاں کو کافر قرار دو۔ دیواروں کا ستیاناس۔ اس کو پھانسی دو۔ اس کو رہا کرو' چلو چلو ملتان چلو "کانا کاچھا چلو' جیسے تانگے والے آواز لگاتے ہیں "چل بھئی' بھاٹی لوہاری۔"

میں نے پھر ان کو یاد دلایا "چیئرمین شاہ عالم بھی اچھا مقرر تھا؟"

"نہیں۔ مقرر تو کسی نے نہیں کیا اس کو۔ پارٹی اس کی تھی۔ وہ خود بن گیا چیئرمین۔" انہوں نے زیر وزبر کے فرق کو ملیا میٹ کر دیا "اس کی تقریریں سننے کے لیے بڑی خلقت آتی تھی۔ بڑے نعرے اور جناب بڑی واہ واہ۔ سارا قصور تو ہماری بے وقوف پبلک کا ہے۔ چلے جاتے ہیں تماشا دیکھنے مداری کا۔ جانتے ہیں کہ وہی باتیں ہوں گی۔ مُن مُن کے منڈے جوان تے جوان بڈھے ہو گئے۔ بڈھے خیر سے فوت ہو گئے مگر باتیں وہی پُرانا ریکارڈ۔ تو جناب پبلک نہ جائے' گھر بیٹھے آرام سے۔ اگلے دن اخبار میں پڑھ لے اگر بہت تکلیف ہے تو مگر جب جلسے میں جاتے ہیں ناجی کھل میلے کے لیے تو خبر آجاتی ہے "عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" اس میں سارے ہوتے ہیں۔ اپنے مسلم لیگ اور پی پی اور جماعت اسلامی اور کون کون۔ مگر تقریر کرنے والے کی تو واہ واہ ہو جاتی ہے نا۔ سینے پر ہاتھ مار مار کے کہتا ہے۔ اوئے' آکے دیکھ لو' فیصلہ ہو گیا۔۔۔ آپ بتاؤ کیا یہ غلط ہے؟ اگر پبلک نہ جائے' تصویر میں سامعین ہی نظر نہ آئیں تو سب کی قلعی کھل جائے کہ ڈھائی بوٹے تے فتو باغبان۔ خیر سے جو حکومت کی گدی پر بیٹھ جاتا ہے اس کو سارے سلام کرنے لگتے ہیں اور وہ بھول جاتا ہے ساری تقریریں۔ اس کو دو سال گزرتے ہیں تو پھر کسی کو کھجلی ہوتی ہے کہ یار بڑے دن ہو گئے۔ کچھ ہلا گلا رولا شولا ہونا چاہیے۔ بڑی گڑبڑ ہے۔ بڑی بدعنوانی ہے۔ اقرباپروری ہے۔ ہٹاؤ' ہٹاؤ۔ اس حکومت کو ہٹاؤ۔ آخر ہمارے بھی تو اقربا ہیں۔ اب ہماری واری آنی چاہیے۔ آجاتا ہے کوئی میدان میں شور ڈالنے کے لیے۔ شاہ عالم بھی ایسے ہی آیا تھا۔ ٹائم پر جب لوگ بھی شور شرابا چاہتے تھے۔ لوجی وہ سُپرہٹ ہو گیا۔ اب یہ ذرا اندر کی بات ہے کہ بندے کو آگے لاتے ہیں اور ہٹ کراتے ہیں وہ کون ہیں۔۔۔ وہ میدان میں ایک گھوڑا نہیں رکھتے۔ ایک کو دوڑاتے ہیں تو دوسرا تیار رہتا ہے۔ جب ٹائم ہوا تو تھاپی دی کہ چل پتر' شروع ہو جا۔ ڈٹ جا مقابلے پر۔ پہلے والے کو ایسی اڑنگی مار کے گرائیں گے ہم کہ پھر اُٹھ ہی نہیں سکے گا۔ میدان تیرے ہاتھ۔۔۔ تو جناب عالی' یہ شاہ عالم بھی اچھا گھوڑا تھا۔ اس کو چلانے والے سامنے لے آئے۔ آج کل اچھا دوڑ رہا ہے۔ ریس بھی جیت ہی لے گا کبھی نہ کبھی۔ ٹائم کی بات ہے۔"

صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں سیاسی معاملات سے قطعی بے خبر ہوں میں ان کی بات بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ انکشافات پر حیران بھی نظر آتا رہا اور ان کی نگاہِ نکتہ رس کی بصیرت پر اش اش

بھی کرتا رہا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں ملک کی سیاست کے ہر گھوڑے پر شرط لگا سکتا تھا کہ اگلی ریس میں وہ ہارے گا یا جیتے گا اور کس کی طرف سے دوڑے گا۔ اس کا جوکی کون ہوگا اور اس پر رقم لگانے والے فائدے میں رہیں گے یا نقصان میں۔ اصیل نسل کے گھوڑے کسی بھی نام سے ریس میں حصہ لیں' جیت جاتے تھے اور میدان سیاست کی ساری گہماگہمی انہی کے دم سے تھی۔ پھر دوغلے گھوڑے تھے جن کو خچر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ناقابلِ اعتبار تھے اور ان کا پتا نہیں ہوتا تھا کہ یہ کس کی طرف سے دوڑیں گے اور کس نام سے۔ ان کی ہار جیت کا انحصار حالات پر اور اس قیمت سے تھا جو ان کو ہارنے میں جیتنے کے لیے ملتی تھی۔ ہارنے کا صلہ زیادہ ملے تو یہ بڑی بے غیرتی سے ہار جاتے تھے اور جوکی مالک شرط لگانے والے سب کا بیڑا غرق کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے تھے۔ آخری قسم ان کی تھی جو درحقیقت گدھے تھے اور ان کو کسی بھی سمت میں ہانکا جا سکتا تھا۔ یہ حکم کے غلام تھے۔ سب گھوڑے گدھے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا تھا تو یہ گھوڑوں اور خچروں میں شامل ہو جاتے تھے۔

شاہ عالم میرے نزدیک خچر تھا لیکن خود کو اصیل گھوڑا سمجھتا تھا۔ تاہم ماضی میں وہ گدھا سمجھا جاتا تھا اور شاہ عالم کی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ اب وہ قدرے معتبر ہو کے خچر بن گیا تھا۔ اس نے اپنی شناخت بنائی تھی اور اس کی آواز سُنی جاتی تھی کیونکہ وہ اصیل گھوڑے کی طرح ہنہناتا تھا اور جن کو حسب نسب کی پہچان نہیں تھی یا جو نہ بصارت رکھتے تھے اور نہ بصیرت وہ اس کو گھوڑا تسلیم کرنے لگے تھے۔ اس نے یقیناً ترقی کی تھی۔

سابق سیاست داں نے مجھے شاہ عالم کے بارے میں جتنا بتایا میں اس سے کچھ زیادہ ہی جانتا تھا۔ تیمور کو میں نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ میرے نزدیک وہ نمایاں حیثیت رکھنے والا پارٹی کارکن تھا اور شاہ عالم کا معتمدِ خاص۔ شاہ عالم نے میدانِ سیاست میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے سماجی کارکن کی حیثیت سے پبلٹی حاصل کی تھی۔ اس نے نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی تھی۔ کبھی وہ کسی لاوارث آبادی کے گلی کوچوں میں صفائی کرتے ہوئے تصویر بنواتے تھے۔ کبھی اپنی مدد آپ کے تحت کسی اسکول کے ایک کمرے کی دیواروں کی چُنائی کرتے' کچی بستیوں میں وہ غریبوں میں آٹے کے تھیلے یا کمبل تقسیم کرتا تھا تو کبھی کوڑھیوں کے اسپتال میں مریضوں کے ساتھ بیٹھ کے ان میں پھل تقسیم کرتا نظر آتا تھا۔ وہ ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے دو چار اخباروں کے رپورٹر اور فوٹو گرافر پھانس رکھے تھے جن کو وہ کھلانے پلانے کے علاوہ نقد ادائیگی بھی کرتا تھا۔ اپنی فلاحی تنظیم کے لیے وہ کسی سے بھی نقد رقم کی صورت میں چندہ نہیں مانگتا تھا۔ وہ کسی تاجر اسمگلر یا صنعت کار کے پاس جاتا تھا تو یہی درخواست کرتا تھا کہ "ہمیں امداد فراہم کردیں۔ سردیاں آرہی ہیں اور فلاں علاقے سے بے دخل کیے جانے والے یا سیلاب کے متاثرین کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہیں"

کبھی وہ کسی سے پچاس چارپائیاں حاصل کر لیتا تھا۔ کہیں سے اسے سو پچاس کمبل یا رضائیاں مل جاتی تھیں۔ پھر وہ ایک چوتھائی تقسیم کرتا تھا اور اس کی تصویریں اخبار میں چھپ جاتی تھیں۔ تین چوتھائی چارپائیاں' کمبل اور رضائیاں یہاں تک کہ دوائیں تک وہ بازار میں فروخت کرا دیتا تھا۔ ایسے فلاحی کاموں سے اس کو بڑی شہرت ملی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ' چرب زبان اور اچھا ایکٹر تھا۔ اس کی شخصیت بھی متاثر کرنے والی تھی اور اس کا اعتماد بھی۔

ایک بار وہ میرے پاس بھی پہنچ گیا۔ میں اس وقت قمر کے ساتھ اس کے آفس میں موجود تھا کہ چپراسی نے شاہ عالم کا کارڈ لا کے دیا۔ قمر کارڈ کو دیکھ کے مسکرائی "یہ کون ذات شریف ہیں؟"

میں نے کارڈ لے کر دیکھا' اس پر جو کچھ لکھا ہوا تھا۔

اس کا مطلب کچھ یوں نکلتا تھا کہ وہ ایک عالمی تنظیم کا صدر ہے جو غریب اور مصیبت زدہ کی دوست اور مددگار ہے۔

"وری گڈ" میں نے کہا "سنا تو بہت کچھ تھا ان کے بارے میں۔ آج دیکھ بھی لیتے ہیں کہ آخر یہ کون مداری کی اولاد ہے اور کیا تماشا ہے اس کا۔"

شاہ عالم اندر آیا تو اس کی صورت پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے بہترین سلا ہوا سوٹ پہن رکھا تھا اور خاصی قیمتی میچ کرتی ہوئی ٹائی لگا رکھی تھی۔ جو خوشبو اس نے لگا رکھی تھی وہ اس کے حُسنِ ذوق کی آئینہ دار تھی۔ اس کی شخصیت بھی دلکش تھی۔ بائیں ہاتھ میں بریف کیس اُٹھائے وہ سیدھا میری طرف آیا اور مصافحے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے کر دیا "کیا حال ہے آپ کا ناصر عظیم صاحب۔ ہاؤ ڈو یو ڈو مس قمر النسا۔"

میں نے کہا "تشریف رکھیے مسٹر شاہ عالم! آپ تو ہمیں پہلے سے جانتے ہیں۔"

وہ مسکرایا "ظاہر ہے' آپ لوگ اتنے گمنام بہرحال نہیں ہیں۔"

"شہرت تو آپ کی بھی بہت ہے" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے بُرا مانے بغیر کہا "جی ہاں۔ میں شیطان کی طرح بدنام ہوں۔"

میں نے کہا "شیطان کی کبھی تعریف نہیں ہوتی۔ خیر' آپ کی اس تنظیم کے اغراض ومقاصد تو آپ کے کارڈ سے ہی واضح ہو گئے لیکن آپ نے اسے بین الاقوامی تنظیم بتایا ہے' اس کا صدر مقام کہاں ہے؟"

"لندن میں" اس نے کہا۔

میں نے کہا "لندن میں کہاں؟"

اس نے کہا "آپ لندن سے واقف ہیں؟"

"بہت اچھی طرح" میں نے کہا۔

"اگر آپ آکسفورڈ اسٹریٹ سے سوہو کی طرف جائیں تو اُلٹے ہاتھ پر ویلز اسٹریٹ ہے۔ اسے ایک ذیلی سڑک نیومین اسٹریٹ سے ملاتی ہے۔ اسی پر ہے ایک عمارت کے گراؤنڈ فلور کا پورشن۔"

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں بالکل ٹھیک جگہ پہنچ گیا ہوں

حالانکہ اتنی تفصیل کے ساتھ تو شاید میں لاہور کے گلی کوچوں کو نہ سمجھتا "اس کے علاوہ؟"

"یہاں لاہور میں..... اور کراچی میں۔"

میں نے کہا "باہر صرف لندن میں ایک جگہ بیٹھ کے آپ اسے انٹرنیشنل آرگنائزیشن کہتے ہیں؟"

اس نے کہا "مسٹر ناصر۔ ویسے تو ہم یورپ کے ہر بڑے ملک کے ہر بڑے شہر میں ایک دفتر قائم کرسکتے تھے مگر آپ جانتے ہیں اس سے ہمارے انتظامی اخراجات کتنے بڑھ جاتے۔ جو پیسہ غریبوں کے کام آسکتا ہے وہ دفتر کے کرائے' عملے کی تنخواہ' فرنیچر اور بلوں پر خرچ ہوتا۔ ہمارے نمائندے رضاکارانہ طور پر ہر جگہ کام کررہے ہیں۔ لندن کا پتا رابطے کے لیے ضروری تھا ورنہ شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔"

میں نے اس سے چند سوال اور کیے جن کا جواب اس نے سکون اور اعتماد کے ساتھ دیا۔

پھر میں نے کہا "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟"

وہ مسکرایا "خدا کا احسان ہے مجھ پر۔ مجھے کسی خدمت کی ضرورت نہیں' میں تو خادم ہوں۔"

"دنیا بھر کے غریب اور مصیبت زدہ لوگوں کا؟"

"نہیں سر۔ ان کی ایک بہت حقیر' نظرانداز کیے جانے کے قابل اور انتہائی معمولی تعداد کا۔ جن کا شمار کرکے ہی مجھے اپنی کوششوں کی بے وقعتی کا احساس ہوتا ہے۔ کروڑوں' اربوں افراد میں سے آپ نے دو چار سو کے لیے کچھ کیا تو وہ کچھ بھی نہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔ ویسے آپ دیکھیں تو اقوام متحدہ کے ادارے بھی کچھ کرتے نظر نہیں آتے۔ عالمی ادارۂ صحت اور بچوں کا عالمی ادارہ۔ میں ایک ملک کیا ایک شہر کے غریب اور مصیبت زدہ افراد کے ایک فیصد کے مسائل حل کرلوں تو یہ بہرحال میرے لیے ایک قابلِ ذکر کامیابی ہوگی۔"

قمر اس کی باتوں سے زیادہ متاثر نظر آرہی تھی "شاہ عالم صاحب۔ آپ یقیناً بہت بڑا کام کررہے ہیں لیکن ہمارے پاس آپ کس سلسلے میں آئے ہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی "میں آپ جیسے سب ہی صاحبِ ثروت لوگوں کے پاس جاتا ہوں' باری باری۔"

"چندہ مانگنے؟" میں نے کہا۔

"بھیک مانگنے" اس نے کہا "آپ مجھے فقیر سمجھ لیں یا کوئی فراڈ۔ میں تذلیل محسوس نہیں کروں گا۔ مجھے بہرحال اپنا کام کرنا ہے۔ تمام الزامات کو قبول کرتے ہوئے اور گالیاں کھاکے بے مزہ ہوئے بغیر۔"

میں نے بات کو مختصر کرنے کے لیے کہا "قمر۔ ذرا وہ چیک بک دو مجھے۔ چندے والی۔"

اس نے کہا "سوری سر۔ نہ میں چیک لیتا ہوں اور نہ کیش۔"

"وہ کیوں؟" قمر نے کہا۔

"مس قمرالنسا۔ کیش کا حساب رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ میں نے بے ایمانی نہیں کی۔ ایک پیسہ اِدھر اُدھر اپنی مرضی سے خرچ نہیں کیا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا "آپ کوئی ایک چیز دے دیں۔ کمبل' رضائیاں' دوائیں' کپڑے جوتے۔ ایک عام غریب اور مصیبت زدہ شخص کو کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ آپ بھی کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "غریب اور مصیبت زدہ تو لاکھوں ہوں گے۔"

"ظاہر ہے آپ ان سب کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ اکیلا آدمی کتنے لوگوں کے تن ڈھانپ سکتا ہے۔ کتنے بچوں کو سردی سے بچاسکتا ہے اور کتنے بیماروں کو بیماری سے بچاسکتا ہے مگر سب مل کے....."

"شاہ عالم صاحب! ابھی آپ کس کے لیے پریشان ہیں؟"

اس نے کہا "راوی کے اُس کنارے پر' شاہدرہ کی طرف۔ ایک کچے مکانوں والی آبادی تھی۔ سیلاب آنے سے پہلے ان کو وہاں سے ہٹادیا گیا تھا۔ محفوظ مقام پر منتقلی کے بہانے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ دریا کے پشتے کو مضبوط بنانا ضروری ہے۔ یہ کام ختم ہوجائے تو وہ واپس آسکتے ہیں لیکن پشتہ بن گیا تو وہ محفوظ ہوجانے والی جگہ ایک فیکٹری سائٹ بن گئی اور سارے مکان بلڈوز کرکے جگہ صاف کردی گئی۔ کوئی سوا سو گھرانے بے گھر ہوگئے۔ ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "جہاں تک دوا اور علاج کا مسئلہ ہے تو میرے دوست ڈاکٹر کمال کا کلینک فری ہے۔"

"وہ میں جانتا ہوں۔ کمال کا کام کررہے ہیں ڈاکٹر کمال۔ لیکن علاج کے لیے وہ اتنی دور کہاں آسکتے ہیں۔ اس کا بندوبست وہیں ہوجائے گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟ کمبل دے دوں.... کتنے۔ ایک سو؟"

"اگر آپ کرسکتے ہیں تو..... تھینک یو۔"

میں نے کہا "تقریباً پچاس ہزار کے کمبل ہوں گے۔ اگر ایک کمبل پانچ سو کا ہو۔"

اس نے کہا "بُرا مت مانئے گا ناصر صاحب۔ وہ غریب لوگ ہیں۔ پانچ سو کا کمبل آپ اوڑھ سکتے ہیں۔ انہیں تو سو روپے والا ہی کافی ہوگا۔ کمبل کا خوب صورت ہونا یا امپورٹڈ ہونا ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی رقم سے آپ پانچ سو کمبل فراہم کرسکتے ہیں۔"

"سوا افراد کے لیے پانچ سو کمبل!"

میں نے سو گھرانے کہا تھا۔ ہر فیملی میں کم سے کم پانچ افراد ہوتے ہیں۔ اگر میاں بیوی کے صرف تین بچے ہوں۔ ہوتے ہیں عموماً چھ سات۔ پھر ماں باپ ہیں یا بھائی بہن بھی ساتھ رہتے ہیں۔"

"اوکے۔ پھر آپ یوں کریں کہ پچاس ہزار میں جتنے کمبل چاہیں خرید لیں۔ پانچ سو لیں یا چار سو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "آپ کمبل منگوادیں۔"

"دیکھیے' مجھے وقت نہیں ملتا۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "سچ کہا آپ نے۔ ہمارے لیے وقت ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ میں آپ پر طنز نہیں کررہا ہوں۔ ہم سب کا یہی المیہ ہے۔ ہم بزنس کے لیے باہر جاتے ہیں۔ سیر و تفریح کے لیے مری کاغان ہو آتے ہیں۔۔ اگر اس وقت اچانک آپ کو فون آجائے لندن سے کہ کوئی بزنس مین پہنچ رہا ہے تو آپ وقت نکال لیں گے' اسے ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ جانے کا اور پھر اس کے ساتھ ڈنر کا۔ یہ تو بہت چھوٹا سا کام ہے۔ اپنے کسی سیکریٹری یا ملازم کو بھیج دیں۔ ورنہ میں آپ کو فون نمبر دیتا ہوں۔ آپ کمبل' رضائیاں کچھ بھی منگوالیں۔ قیمت خود ادا کریں۔ وہ سب کچھ یہاں پہنچادیں گے اور قیمت لے جائیں گے۔ پھر آپ مجھے بتادیں تو میں کمبل لے جاؤں گا۔"

میں نے وہ کارڈ دیکھا جو اس نے مجھے دیا تھا "کیا یہ ضروری ہے کہ میں یہیں سے کمبل منگواؤں؟"

"قطعی نہیں۔ آپ کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ اس میں میرا کمیشن تو نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں' ایسا ہوتا ہے۔ آپ جہاں سے چاہیں کمبل منگوالیں۔"

قمر بہت دیر سے ناخوش تھی۔ اسے میری جرح' میرا شکی انداز اور میرا طنزیہ لہجہ گراں گزر رہا تھا۔ "ٹھیک ہے شاہ عالم صاحب۔ کل پرسوں تک آپ کو کمبل بھی مل جائیں گے اور میری طرف سے کپڑے جوتے بھی۔ بس مجھے کسی وقت یہ بتادیں کہ جوتے کپڑے کس سائز کے ہوں؟"

وہ مسکرایا اور اُٹھ کھڑا ہوا "تھینک یو مس قمرالنسا۔ معمولی قیمت کے سوتی کپڑے' سوئیٹر اور کینوس کے سستے جوتے۔ سردیوں میں فلالین کے کپڑے بھی اچھے رہتے ہیں غریبوں کو۔ آپ فلالین کے تھان فراہم کردیں تو ہر خاندان اپنی ضرورت کے مطابق سلوا بھی سکتا ہے یا خود سی سکتا ہے۔"

"یہ سب سے بہتر ہے۔ میں لٹھے' فلالین اور ملیشیا کے تھان دے دوں گی اور اون جس سے عورتیں خود سوئیٹر بن لیں۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے قمرالنسا سے کہا "آپ اتنی جذباتی کیوں ہورہی تھیں خاتون!"

"آپ بھی حد کرتے ہیں بھائی' ہر شخص پر شک۔"

"بے وقوف اور گدھے ہوتے ہیں' جو ہر شخص پر اعتبار کرنے کے بعد پچھتاتے ہیں۔ پہلے اپنا اطمینان کرلینا چاہیے۔"

"مجھے یہ شخص ایسا نظر نہیں آتا۔"

"ایسا ویسا شخص کیا صورت سے پہچانا جاتا ہے۔ بڑا مان ہے تمہیں اپنی نگاہ پر۔ خط کا مضمون بھانپ لیتی ہو لفافہ دیکھ کر۔ لیکن مس قمرالنسا آفریدی۔ یہی دلیل ہے تمہارے ناقص العقل ہونے کی۔ بھولے بھالے معصوم چہرے بنا کے کوئی معتبر نہیں ہوجاتا۔"

"چلیں مجھ سے شرط لگالیں آپ۔ یہ آدمی فراڈ نہیں تھا۔ فراڈ ہوتا تو پیسہ لے جاتا خوشی خوشی۔"

میں نے کہا "چلو ہوگئی شرط۔ میں اس کو جانتا ہوں۔ اس کی تصویریں اخبار میں آتی رہتی ہیں۔ یہ دوسروں کے خرچ پر اپنی پبلسٹی کررہا ہے اور ثواب کے ساتھ نیک نامی کمارہا ہے۔ اس کے اصل مقاصد بعد میں سامنے آئیں گے جب یہ اس نیک نامی کو کیش کرائے گا۔"

"اپنی پبلسٹی کون نہیں چاہتا۔"

"یہ پوچھو کہ پبلسٹی کون چاہتا ہے۔ وہی جو ووٹ چاہتا ہے۔ کل اگر یہ سیاست میں آئے تو اس کے پاس اپنی نیک نامی کی سند ہو۔ شہرت کا ریکارڈ ہو اور لوگ اسے بے لوث سماجی کارکن اور بے غرض خدمتِ خلق کرنے والے نیک اور غریبوں کے ہمدرد کی حیثیت سے پہچانتے ہوں۔ یہ جانتے ہوں کہ وہ باتیں ہی نہیں کرتا کام بھی کرتا ہے۔"

"اگر ایسے لوگ سیاست میں ہوں تو اچھا ہے نا۔"

"میری بھولی بہن۔ سیاست دوسرا کاروبار ہے۔ ابھی جو کچھ یہ کررہا ہے وہ آغاز ہے۔ اس نے اپنے کیریئر کی بنیاد رکھ دی ہے اور اب ایک سیڑھی بنارہا ہے جس پر یہ زینہ زینہ اوپر چڑھتا جائے گا یہاں تک کہ سیاست داں کے بلند منصب پر فائز ہوجائے گا۔ پھر یہ ایک روایتی لیڈر ثابت ہوگا۔ وہ لوگوں کو سبز باغ دکھانے کے بعد اپنے باغ اور محل بنائے گا اور اپنے سنہرے خوابوں کو کم سے کم وقت میں تعبیر دینے میں مصروف ہوجائے گا۔ جیسے سکھوں کے پانچ کاف ہوتے ہیں .... کنگھی' کیس' کڑا' کرپان اور کاچھا۔ ایسے ہی اس کے ہوں گے کار' کوٹھی' کیش' کاروبار اور کرسی۔ کرسی مشیر کی' وزیر کی' سفیر کی۔

قمر خفا ہوگئی "بس پھر آپ کچھ مت دیں اسے۔ آدمی خود جیسا ہو ویسا ہی دوسروں کو سمجھتا ہے بھائی..."

میں ہنس پڑا "پھر تو تم ساری دنیا کو بے وقوف سمجھتی ہوگی۔"

شاہ عالم تیسرے دن ٹرک لے کر آیا تو میں نے اس سے پوچھا "یہ سامان جو آپ تقسیم کرتے ہیں لوگوں میں۔ اس کا کوئی ریکارڈ بھی رکھتے ہیں؟"

اس نے نفی میں سرہلادیا "یہ ممکن نہیں۔"

"ممکن کیوں نہیں۔ ایک رجسٹر میں سب کے نام' پتے لکھ کے ان سے دستخط لیے جاسکتے ہیں۔ انگوٹھے لگوائے جاسکتے ہیں۔"

اس نے کہا "ناصر صاحب۔ نام تو ان کے پاس ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے دیے ہوئے۔ پتے عموماً نہیں ہوتے۔ آپ میرے ساتھ چلیں رجسٹر لے کر اور خود لکھ لیں۔ سب کا ایک ہی پتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے پیچھے کھلا میدان لیکن آپ کا خود جانا ویسے بھی

اچھا ہے۔ آپ مطمئن ہو جائیں گے اور میں شک کے بارے بچ جاؤں گا۔ ویسے بھی امداد دینے والے کو خود اپنے ہاتھ سے امداد دے کر جو خوشی ملتی ہے' وہ مجھے تو نہیں مل سکتی' کل آپ کی تصویر بھی چھپ جائے گی خبر کے ساتھ۔"

"مجھے اس کا کوئی شوق نہیں۔"

"مگر ایسا ہونا چاہیے۔ اس سے ترغیب ملتی ہے۔ جب لوگ نیکی کرنے والوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں بھی نیکی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ہمارا مذہب تو یہ کہتا ہے کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہیں ہونی چاہیے لیکن کچھ لوگ خود نمائی کے شوقین ہوتے ہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "مثلاً آپ.... کل آپ کی تصویر چھپے گی۔"

"اور نیچے لکھا ہو گا کہ شاہ عالم نے ناصر عظیم صاحب کے دیئے ہوئے کمبل تقسیم کیے۔ میرا اپنا تو کچھ بھی نہیں۔ خدا نے مجھے اتنی توفیق ہی نہیں دی۔ میں تو وسیلہ ہوں۔"

میں نے کہا "دیکھیں میرا نام بالکل نہیں آنا چاہیے کسی خبر میں۔ اور نہ میری بہن قمرالنسا کا۔ اخبار والوں کو سختی سے منع کردیں۔ آپ نہیں بتائیں گے تو ان کو معلوم بھی نہیں ہو گا۔"

جب وہ چلا گیا تو قمر پھر خفا ہوئی "اس سے تو اچھا تھا کہ آپ ساتھ چلے جاتے بھائی۔ کہیں وہ ٹرک لے کر اپنے گھر نہ چلا جائے۔"

"میرے پاس وقت ہوتا تو میں ضرور جاتا۔ مگر خیر' میں نے تم سے شرط لگائی ہے۔ میں تم پر ثابت کردوں گا کہ یہ آدمی عبدالستار ایدھی نہیں ہے۔ بے شک اس کو قائل کرنا اور متاثر کرنا آتا ہے۔"

شاہ عالم کی تصویر اور تفصیلی خبر تیسرے دن اخباروں میں نظر آئی۔ اس نے کپڑے اور کمبل انہی لوگوں میں تقسیم کیے تھے جن کا اس نے ذکر کیا تھا۔ تصویر میں عورتوں' مردوں اور بچوں کی لائن الگ الگ نظر آرہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کمبل کپڑے' جوتے تھے اور چہروں پر بے بسی کی مظلوم مسکراہٹ۔ اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ سب کے سامنے ایسی تصویر بنوانا پسند نہ کرتے۔ وہ شکریہ ادا کرتے اور دعائیں دے کر خاموشی سے چلے جاتے مگر کیمرے کے سامنے یہ سب دکھانا بھی ضروری تھا۔

قمر نے مجھے خبر کے حوالے سے شرمندہ کرنے کی فضول سی کوشش کی مگر میں نے جواب دینے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ شاہ عالم مداری ہے۔ وہ جادو کا کھیل دکھاتا ہے مگر وہ جادو نہیں ہوتا' ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔

میں نے اپنی گاڑی بہت دور روک دی اور قمر کے ساتھ پیدل چل کے اس میدان تک پہنچا جہاں واقعی سیکڑوں جھونپڑیاں اور کچے مکان نظر آرہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد سوا سوا سو سے کہیں زیادہ تھی۔ قمر نے احتجاج بھی کیا تھا مگر میں نے اس کی ایک نہیں سُنی تھی۔ اب وہ اس غلیظ بستی کے فقیرانہ ماحول میں آکے پریشان ہو رہی تھی۔ بچے بوڑھے ہمیں یکساں حیرت' رشک اور امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

میں نے ایک باریش شخص سے جو اپنی خالی ریڑھی کے پاس اُداس بیٹھا تھا' سوال کیا "پرسوں یہاں کوئی کمبل اور کپڑے تقسیم کرنے آیا تھا؟"

"آیا ہو گا" اس نے بیزاری سے کہا "مولوی صاحب سے پوچھ لو۔"

قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ مولوی صاحب اندر ہی دستیاب تھے۔ میرے سوال پر وہ چونکے "بالکل حضرت۔ ایک صاحب آئے تھے۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ مگر آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"میں جاننا چاہتا تھا.... کہ وہ کپڑے اور کمبل کتنے لوگوں کو ملے تھے دراصل۔ وہ میں نے ہی بھیجے تھے۔"

"اچھا اچھا۔ پھر آپ تشریف رکھیں۔ میں ان سب کو بُلاتا ہوں۔ وہ خود بتادیں گے آپ کو۔"

قمر نے گھبرا کے کہا "نہیں جی' سب کو مت بُلائیں۔ آپ ہی بتادیں۔ اگر آپ کو معلوم ہے۔"

"معلوم ہے بی بی۔ سب کو جوتے' کپڑے کمبل ملے... سب کو" اس نے اتنے اصرار کے ساتھ کہا کہ مجھے اس کے سچ میں مصلحت یا لاعلمی کے جھوٹ کا شبہ ہونے لگا۔

میں نے کہا "سب سے کچھ واضح نہیں ہوتا۔ آخر کتنے لوگوں کو سامان ملا تھا' ان کی تعداد...؟"

"تعداد... وہ تو میں نے شمار نہیں کی۔ شاید کسی نے نہ کی ہو۔ سب اپنی اپنی باری پر آتے رہے یہاں۔"

"یہاں مسجد میں؟ گویا آپ کی نگرانی میں سب کام ہوا تھا؟"

انہوں نے فوراً تردید کی "شاہ عالم صاحب۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے... کسی کی نگرانی کے محتاج نہیں ہیں' اللہ سب دیکھتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر بھی۔ آپ نے دیکھا تو ہو گا۔ آنے والوں کی تعداد کیا رہی ہو گی۔ آپ کے اندازے کے مطابق۔ دس بیس' سو پچاس یا زائد۔"

"میں کیا عرض کروں' میں موجود نہیں تھا یہاں۔ یہ مرکزی جگہ ہے اس لیے سب کو اطلاع کردی گئی تھی۔ شاہ جی گھر گھر جا کے دستک دیتے یا نام لے کر پکارتے۔ ہر ایک سے سوال کرتے کہ گھر میں کتنے افراد ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں کے لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے۔ آخر سب ایک ہی جگہ رہتے تھے پہلے۔"

"پہلے کب۔ یہاں سب برسوں سے آباد ہیں۔ بہت سے لوگ اس جگہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں؟ صنعت کار' زمین پر نظریں لگائے

بیٹھے ہیں مگر شاہ جی نے کہا ہے کہ خبردار جو کسی نے جگہ چھوڑی۔ کوئی تمہیں بے دخل نہیں کرسکتا اور کرے گا تو متبادل جگہ فراہم کرے گا۔ کروڑوں کی زمین ہے۔ ایل ڈی اے کے ساتھ مل کے مفت میں ہتھیانا چاہتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے آخر کہاں جائیں گے۔"

میں نے قمر کی طرف دیکھا اور کہا "شاہ جی بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر کوئی ہٹائے تمہیں تو تم کیس کرسکتے ہو۔"

"جی' شاہ جی نے وعدہ کیا ہے۔ وہ خود وکیل ہیں اور ہمارا کیس وہ خود لڑیں گے۔ بالکل مفت۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ نئی آبادی میں مسجد کے لیے زیادہ بڑی جگہ ہو گی" باتیں کرتے کرتے انہوں نے اچانک ہانک لگائی "او وئے نیکے' ادھر آ پتر۔"

نیکا ایک مزدور ٹائپ جوان آدمی تھا۔ ہمیں مسجد میں دیکھ کے وہ ٹھٹکا۔

"کیا بات ہے جی مولوی صاحب!"

"نیکے۔ یہ ہیں وہ سخی داتا جنہوں نے کمبل' جوتے' کپڑے بھیجے تھے۔ پرسوں شاہ جی نے تقسیم کیے تھے نا۔ یہ اسی کا پوچھ رہے ہیں۔"

نیکے نے گھڑے جیسا سر ہلایا "مجھے ملا تھا جی ایک کمبل..." اس نے کہا اور پھر خوف زدہ ہو کے رُک گیا۔ یوں جیسے اس کے منہ سے وہ بات نکل گئی ہو جو اس کو نہیں کہنی چاہیے تھی لیکن اس نے فوراً اپنا بیان بدل دیا "ایک نہیں جی' مجھے پانچ کمبل ملے تھے۔ میرا' بیوی کا اور دو بچوں کا... ایک ماں کا..."

اب مولوی صاحب اسے پرملامت نظروں سے گھور رہے تھے اور میں اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ بے خیالی میں وہ سچ بول کے پشیمان تھا۔ اس کے کھوکھلے لہجے اور جھوٹ کے مجرمانہ اناڑی پن کو قمر نے بھی محسوس کرلیا تھا۔

"لعنتی آدمی! جا دوسرا گواہ بھیج دے" مولوی صاحب نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "جھلا ہے جی' دھیان کہیں ہوتا ہے' بات کچھ اور کرتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے مزید گواہ نہیں چاہئیں۔"

لیکن اس وقت تک دوسرا گواہ حاضر ہو چکا تھا۔ اس نے زیادہ سکون اور اعتماد کے ساتھ بتایا کہ اسے سات کمبل ملے تھے۔ اسی حساب سے جوتے اور کپڑے۔ میاں بیوی' چار بچے' ایک باپ' ایسا لگتا تھا کہ وہ پہلے سے حساب دینے کے لیے تیار تھا۔

ایک گھنٹے میں دس افراد میرے سامنے آئے اور انہوں نے فرفر وہ جوابات سُنادیے جو ان کو رٹائے گئے تھے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا تو شام ہو جاتی اور مجھے پھر بھی کچھ معلوم نہ ہوتا۔ بعد میں انہی کی بیویاں' مائیں اور بہنیں برقع پہن کے آجاتیں۔ بھائی یا باپ آجاتے۔ سب ایک ہی بات کہتے۔ میرے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ایک گھر کا صرف ایک فرد حساب دے رہا تھا یا وہی حساب دینے کے لیے گھر کا ہر فرد آرہا ہے۔ قمر پریشان ہو رہی تھی اور خود میرے لیے یہ صورت حال انتہائی ناپسندیدہ تھی مگر مولوی صاحب مجھے بخشنے پر آمادہ نہ تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا شک کرنا انہیں بُرا لگا تھا اور ان کے نزدیک امداد دینے کے بعد اس کا حساب طلب کرنا گناہِ کبیرہ سے کم نہ تھا۔

بالآخر میں نے یہ سلسلہ سختی سے روک دیا "اس کا کوئی فائدہ نہیں' ایسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ کتنی امداد تقسیم کی گئی تھی۔"

"آپ لکھتے جائیں نا حضرت۔ ہر شخص کا نام۔ اس کو دی جانے والی امداد کی تفصیل۔ پتے تو نامکمل ہیں۔ نہ گھروں پر نمبر ہیں اور نہ گلیوں کے۔"

میں نے کہا "چھوڑیے یہ سب۔ مجھے یہ بتائیے کہ اس آبادی میں کتنے گھر ہیں۔ اگر میں کچھ اور سامان بھیجنا چاہوں۔"

اس نے کہا "گھر ہوں گے ڈھائی سو کے لگ بھگ۔"

میں نے کہا "مجھے کہیں کہیں بجلی کے کنکشن بھی نظر آرہے ہیں' پانی ہے یہاں؟"

"آٹھ دس نلکے ہیں حضرت۔ کمیٹی نے لگائے تھے۔ سب وہیں سے پانی بھر لیتے ہیں۔"

"کب لگائے تھے؟"

"تین سال پہلے۔ بجلی غلام رسول دیتا ہے۔ اس نے سات سال پہلے پکا کنکشن لیا تھا۔ اب جسے ضرورت ہو اس کے تار لگا دیتا ہے۔ ہر گھر سے پچاس روپے ماہانہ لیتا ہے۔ آدھے بجلی کے محکمے کو چلے جاتے ہیں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ مسجد کب تعمیر ہوئی تھی؟"

"سات سال قبل حضرت۔ جب یہاں چند گھر تھے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم غلط جگہ آگئے۔ شاہ جی نے ہم سے کہا تھا کہ سو سوا سو گھرانے ہیں جن کو راوی سے ملحق زمین خالی کرانے کے لیے بے دخل کردیا گیا ہے۔ یہ نیکا کون ہے' رفیق نام ہو گا اس کا؟"

"ہاں جی۔ محمد رفیق۔ گیس کے چولہے ٹھیک کرتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا ہم چلتے ہیں مولوی صاحب۔ آپ کو زحمت ہوئی۔"

انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا "کوئی زحمت کی بات نہیں۔ آپ تو فرشتۂ رحمت ہیں۔ سب کے دل میں انسانیت کا اتنا ہی درد ہو تو یہ دنیا جنت بن جائے حضرت۔"

کمبلوں کی تقسیم میں یقیناً گھپلا ہوا تھا مگر اسے ثابت کرنا مشکل تھا۔ شاہ عالم کی پہلی بات ہی جھوٹ ثابت ہو گئی تھی کہ یہ حال ہی میں بے گھر کیے جانے والے لوگ ہیں جن کو جھوٹ بول کے بے دخل کیا گیا تھا۔ اب قمر کو بھی یقین آنے لگا تھا کہ شاہ عالم اونچے

درجے کا فنکار ہے۔ میں نے اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت محض ضد میں نکالا تھا۔ قمر کو قائل کرنے کے لیے۔ اب وہ قائل ہو چکی تھی تو مجھے طیش آرہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ شاہ جی کی ایسی تیسی کردوں۔ اسے جھوٹا اور دھوکے باز ثابت کردوں اور ممکن ہو تو اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھواؤں لیکن یہ کام وقت مانگتا تھا اور فراڈ کو فراڈ ثابت کرنا بھی آسان نہ تھا۔ میں نے اپنے ایک ماتحت کو اس کام پر لگایا تو بہت سے افسوس ناک انکشافات ہوئے۔

شاہ عالم نے ہر خاندان کو ایک کمبل دیا تھا اور اسی حساب سے کپڑے' جوتے بھی تقسیم کیے تھے اور اسی طرح سے ڈھائی سو گھرانے مستفید ہوئے تھے مگر ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہاں ایسے بہت سے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ انہیں چار پانچ یا آٹھ دس کمبل ملے ہیں۔ ایسے کچھ لوگ میرے سامنے بھی آئے تھے یا لائے گئے تھے۔ دوسری زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ان غریبوں کو پُرانے کمبل اور پُرانے جوتے' کپڑے دیے گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ پھر نئے کمبل اور جوتے کپڑے کہاں گئے۔

سخت مشتعل ہو کے میں نے شاہ عالم کو فون کیا مگر ایک ہفتہ تو اس سے بات ہی نہ ہو سکی۔ کبھی وہ نہیں ملتا تھا تو کبھی اس کا فون میری عدم موجودگی میں آتا تھا اور قمر اس سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے تو مجھے بھی مشورہ دیا تھا کہ "لعنت بھیج دیں ایسے شخص پر بھائی۔ بے غیرت آدمی کا آپ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پھر اپنا خون کیوں جلاتے ہیں" مگر میں ایک بار جھوٹے کو اس کے منہ پر جھوٹا کہہ کے اپنے دل کی بھڑاس ضرور نکالنا چاہتا تھا۔

بالآخر ایک دن اس کا مجھ سے رابطہ ہوا تو میں نے کہا "شاہ جی۔ آپ نے دوبارہ شکل ہی نہیں دکھائی۔"

"بس میں بھی مصروف رہا۔"

میں نے کہا "وہ کمبل تقسیم کردیے تھے۔۔۔ اور جوتے کپڑے؟"

"ظاہر ہے۔"

میں نے چلاّ کے کہا "ظاہر کے بچّے۔۔۔ دھوکے باز' بدمعاش۔ کہاں ہے وہ آبادی۔ بے دخل کیے جانے والے لوگوں کی۔"

اس نے بُرا مانے بغیر کہا "آپ چلیں گے میرے ساتھ؟"

"بکواس مت کرو۔ میرا وقت اتنا فالتو نہیں ہے۔ میں گیا تھا وہاں۔"

"بہت اچھی بات ہے' اب غصّہ کس بات کا ہے؟"

میں نے کہا "کتنے کمبل تقسیم کیے تھے تم نے؟"

وہ بولا "جتنے آپ نے دیے تھے۔ میں نے تو شمار بھی نہیں کیے تھے۔ ٹرک میں ڈال کے لے گیا تھا۔"

میں نے اسے بہتر قسم کی گالیوں سے نوازا۔ "تم نے وہاں لنڈے بازار سے خریدے ہوئے کمبل تقسیم کیے۔ جوتے' کپڑے سب پُرانے تھے۔"

"میں نے وہی تقسیم کیا جو آپ نے دیا تھا۔ کیا آپ نے لنڈے کا مال اٹھایا تھا۔"

"میں نے تم کو ہر چیز نئی دی تھی۔" میں نے چلاّ کے اسے وہ گالیاں دیں جو عام حالات میں قمر کے سامنے میں کبھی نہ دیتا "پانچ سو کمبل' پانچ سو جوتوں کے جوڑے اور پانچ سو کپڑوں کے لیے فلالین کے تھان۔ سب بیچ کھائے تم نے۔"

"الزام لگاتے وقت آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔ مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

میں نے چیخ کے کہا "میں پولیس میں رپورٹ لکھواؤں گا تمہارے خلاف۔ اخبار والوں کو بتاؤں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ میرا نام اخبار میں نہیں آنا چاہیے۔ اب آجائے گا۔ ایک بیان میں بھی دوں گا کہ آپ جیسے غریبوں کا خون چوس کر امیر بن جانے والے کتنے چھوٹے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ خیرات بھی نکالتے ہیں تو اترکی خیرات میں سے۔ ایک پوری آبادی آپ کے خلاف گواہی دینے کے لیے موجود ہوگی۔ میں ان سب کو پریس کلب کے سامنے کھڑا کردوں گا۔"

غصّے سے میرا بُرا حال ہوگیا "تم مجھے بلیک میل کررہے ہو۔"

"میں یہ بتا رہا ہوں کہ کیچڑ میں پتھر پھینکنے سے پہلے اپنے بے داغ دامن کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ میری گُڈول بہت ہے مجھے بچانے کے لیے۔"

"تمہاری گُڈول۔۔۔۔ اچھی طرح جانتا ہوں میں سب۔"

"اُلٹا سیدھا بیان دیں گے تو آپ کو ہتکِ عزت کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پولیس کے پاس آپ کیا لے کر جائیں گے؟ کاغذ کے وہ پُرزے جو رسید کہلاتے ہیں؟ یہ ثبوت کہاں سے لائیں گے کہ وہ سب سامان آپ نے مجھے ہی دیا تھا؟ کوئی رسید لی تھی مجھ سے جب سامان میرے حوالے کیا تھا۔ میری تو آپ سے ملاقات تک نہیں ہوئی تھی۔ میں نے فون کیا تھا اور آپ نے وہ پُرانا سامان میرے گھر بھیج دیا تھا۔ شرم آنی چاہیے آپ کو۔"

میں نے ٹیلی فون کو اُٹھا کے زمین پر دے مارا۔ غصّے نے مجھے پاگل کردیا تھا اور قمر بہت ڈر گئی تھی۔ دوسری طرف وہ خبیث بڑے سکون سے تھا اور مجھ سے ایسے بات کررہا تھا جیسے میں پرلے درجے کا احمق ہوں اور اس کے مقابلے میں بہت گھٹیا آدمی ہوں۔ وہ اُلٹا مجھے شرمندہ اور ذلیل کررہا تھا اور مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ریوالور لے کر جاؤں اور اسے قتل کردوں۔

کچھ دیر بعد میرا غصہ اُتر گیا۔ قمر نے مجھے کبھی اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا کہ میں اس کا لحاظ کیے بغیر گندی گالیاں دینے لگوں اور غصّے میں چیزیں توڑنے لگوں۔ وہ بری طرح سہم گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

میں نے اسے منانے کے لیے کہا "سوری قمر۔ اس شخص نے میرا دماغ خراب کردیا تھا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

قمر نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور پھُوٹ پھُوٹ کے رونے لگی "نہیں بھائی۔ خدا کے لیے۔۔۔ ختم کردیں اس معاملے کو۔۔۔ بھول جائیں شاہ عالم کو۔ اپنا نہیں تو میرا خیال کریں۔ ایسے لوگ خطرناک بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ کرائے کے غنڈے بدمعاش بھی لا سکتے ہیں۔ آخر کتنا نقصان ہوا ہمارا۔ سب ملا کے ساٹھ ستّر ہزار۔ کیا میری یا آپ کی زندگی کی اتنی ہی قیمت ہے بھائی؟ آخر چور ڈاکو بھی تو لوٹ کرلے جاتے ہیں۔ مگر کوئی ہمارا نصیب تو نہیں لے جاسکتا۔ اپنی نیکی کا ثواب آپ کے حساب میں لکھا گیا۔ بُرائی اس کے کھاتے میں گئی۔ اب اس کے ساتھ بُرائی کرکے کیا ملے گا آپ کو؟ غلطی میری تھی کہ میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔ وہ واقعی فراڈ تھا۔ میں مان لیتی تو یہ سب کیوں ہوتا؟"

میں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کے چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا "میری گڑیا۔ میری جان' تو کیوں روتی ہے۔ روئیں تیرے دشمن۔ چل میں کچھ نہیں کروں گا' تیری قسم۔"

شاہ عالم کا دھندا اسی طرح چلتا رہا۔ اگر وہ سو افراد سے امدادی سامان لیتا تھا تو ان میں سے دس ایسے ہوں گے جو پہلے تصدیق کرنا چاہتے ہوں گے۔ دس فیصد یہ کام خود کرتے ہوں گے یا اپنا آدمی ساتھ بھیج دیتے ہوں گے۔ ممکن ہے دس فیصد ذاتی پبلسٹی کا شوق بھی پورا کرتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو وہ پوری طرح مطمئن کردیتا ہوگا۔ لیکن ستّر فیصد معاملات میں لوگ اس کی نیک نامی پر بھروسا کرتے ہوئے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیتے ہوں گے۔ میری طرح کوئی بعد میں تصدیق کے لیے گیا ہوگا تو اس کے ساتھ وہی ہوا ہوگا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں بھی شاہ عالم کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور شاہ عالم دوسروں کے مال سے دُہرا فائدہ حاصل کرتا رہا۔ وہ نیک نامی اور شہرت حاصل کرتا رہا اور خباثت سے رچے ہوئے اپنے مستقبل کی کامیابی کے لیے راہ بھی ہموار کرتا رہا۔

بعد میں وہی ہوا جو میں نے قمر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

اس نے اپنی سماجی تنظیم کو سیاسی منشور دے دیا۔ اس نے غریبوں کے لیے جلسے جلوس کیے۔ امیروں کو اور اس عدم مساوات کی بنیادوں پر قائم معاشرے کو۔ استحصال کرنے والوں کو خوب بُرا بھلا کہا۔ وہ جیل گیا۔ اس نے پولیس کے ڈنڈے کھائے لیکن غریبوں کی حمایت نہیں چھوڑی۔ جب انتخابات ہوئے تو اس کے پانچ امیدوار اسمبلی میں پہنچ گئے۔ خود شاہ عالم نے چار جگہ سے مقابلہ کیا تھا۔ ضمنی انتخابات میں اسے مزید تین سیٹیں بھی ملیں۔ آٹھ ممبروں کے ساتھ نہ وہ ملک میں کوئی انقلابی تبدیلی لا سکتا تھا اور نہ سیاسی نظام کو بدل سکتا تھا لیکن اس کے آٹھ ووٹ اس وقت اہمیت اختیار کرگئے جب حکومت سازی کے لیے دو بڑے حریفوں کے درمیان اکثریت ثابت کرنے کا وقت آیا۔ آزاد امیدوار اور چھوٹی جماعتوں کے یہ ممبر کسی کی حمایت کی پوری قیمت وصول کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ ان کے ساتھ شامل ہونے سے کوئی گروپ حکومت تشکیل دے سکتا تھا اور ان کے الگ ہوجانے سے اسمبلی میں اس گروپ کی اکثریت ختم ہوجاتی تھی۔

حکومت بنانے والی جماعت نے شاہ عالم کی پارٹی سے دو وزیر لینے کا وعدہ کیا۔ شاہ عالم کو اس کی پسند کی وزارت ملی یعنی دیہی ترقی اور کچی آبادیوں کی منصوبہ بندی۔ اس کے نائب تیمور کو وزارتِ مذہبی امور میں مشیر رکھا گیا۔ اس طرح مزارات' درگاہیں' خانقاہیں اور مساجد کے معاملات براہ راست اس کے کنٹرول میں آگئے۔ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے کہ کس طرح شاہ عالم نے اپنا پُرانا امیج برقرار رکھنے کے لیے غریب آبادیوں میں کام ایک روپے کا کیا تو ڈھول سو روپے کا پیٹا۔ وسائل پیدا کرنے میں وہ پہلے بھی طاق تھا۔ اب وزارت کا اختیار ملا تو اس نے ہر طرف ہاتھ مارے۔ ایک پنجابی محاورے کے مطابق اس نے "کٹّا چوہ" کے دکھا دیا یعنی ان تلوں میں سے تیل نکال لیا جن کے بارے میں عام خیال تھا کہ ان میں تیل نہیں۔ اس نے دھاندلی اور دھونس سے حاصل ہونے والی کمائی کا نصف خود رکھا اور نصف اپنے ووٹرز پر خرچ کیا۔ سرکاری طور پر ملنے والی گرانٹ تو اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھی۔ اس نے حسب سابق ذاتی رابطہ رکھا اور اپنے ووٹ بینک کو پہلے سے کہیں زیادہ کرلیا۔ اس کا بنیادی اصول تھا کہ کام کم پروپیگنڈا زیادہ۔ یہ حکمتِ عملی بے حد مؤثر تھی کیونکہ وہ خود پروپیگنڈے کی نفسیات کو سمجھتا تھا۔

امیر تیمور نے درگاہوں مزاروں اور خانقاہوں کی آمدنی میں حصہ بنانے کے ساتھ ساتھ عقیدت مندوں کے دل میں جگہ بھی بنائی۔ ہر عرس میں شریک ہوا۔ ان کے ساتھ لنگر کھاتا رہا اور شاہ عالم کی ہدایات کے مطابق' اپنے حصّے کے آدھے میں سے آدھا ایسے کاموں پر خرچ کرتا رہا جن سے رائے عامہ متاثر ہو اور پارٹی کا غریب دوست امیج بہتر بنے۔ ان کو آئندہ انتخابات میں اپنی پوزیشن مزید بہتر بنانی تھی۔ شاہ عالم عجلت کا قائل نہیں تھا۔

خرگوش کی طرح چھلانگ مت لگاؤ۔ کچھوے کی طرح چلو مگر مستقل مزاجی سے۔ اس بار آٹھ سیٹیں تھیں' اگلی بار پچیس ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد والے انتخابات میں کم سے کم اسّی ورنہ سو۔۔۔۔ پھر حکومت ہماری۔ ایک ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے دس سال کی تیاری تو کچھ بھی نہیں۔ ابھی ہم سب جوان ہیں' بہت وقت ہے ہمارے پاس۔ ان کی پارٹی کا نعرہ جھنڈا۔۔۔ منشور سب رفتہ رفتہ مقبول ہو رہے تھے۔ غریب آدمی جاہل تھا۔ اس کے مسائل زیادہ تھے۔ ان کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ شاہ عالم نے اسی کو پروپیگنڈے کی بنیاد بنالیا اور غریب واقعی سمجھنے لگے کہ ان کا نجات دہندہ۔ عملاً ان کے لیے کچھ کرنے والا اور ان کے مسائل کو سمجھنے والا کوئی

ہو سکتا ہے تو صرف پی ایل ایف کا امیدوار۔

شاہ عالم نے بڑی مضبوط پروپیگنڈہ ٹیم رکھی تھی اور یہ اس کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنے مطلب کے لوگ مل گئے۔ سائنس فکشن کی اس خلائی مخلوق کی طرح جو اکثر ہماری زمین پر قبضہ کرنے آتی ہے۔ شاہ عالم اور اس کے ساتھیوں نے اس ملک کی حکومت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ۔ ان سب کے درمیان اتفاق رائے تھا کہ اس کام کے لیے دس سال تک انہیں خاموشی اور لگن کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ پندرہ سال بعد اگر وہ اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر اگلے پندرہ سال تک ان سے حکومت کوئی نہیں چھین سکتا ہے۔ جب یہ ملک اور اس کے سارے وسائل ہماری دسترس میں ہوں گے تو پھر پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ساری کسر پوری ہوجائے گی۔

دوسرے انتخابات میں انہوں نے زیادہ عقل مندی دکھائی۔ جہاں ان کی کامیابی یقینی تھی وہاں "پی ایل ایف" کے ٹکٹ پر مقابلہ کیا۔ جہاں ہار کا ڈر تھا' وہاں آزاد امیدوار کھڑے کیے۔ یہ اسکیم کامیاب رہی۔ پارٹی کے ٹکٹ پر تو اٹھارہ ہی امیدوار کامیاب ہوئے تھے مگر آزاد امیدواروں میں ان کے چھ آدمی تھے۔ بعد میں چار امیدوار دوسری جماعتوں سے اختلافات کے باعث پی ایل ایف میں شامل ہوگئے۔ اٹھائیس سیٹوں کے ساتھ شاہ عالم نے ریس کا دوسرا مرحلہ بھی جیت لیا۔

اب تیسرا فیصلہ کن مرحلہ آرہا تھا۔ صرف ایک سال بعد شاہ عالم کو اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے کے لیے اسّی اور سو کے درمیان سیٹوں کا حصول یقینی نظر آرہا تھا۔ جو ایوان میں اسّی سیٹیں رکھتا ہو اسے خود بخود چھوٹی جماعتوں کا اور آزاد امیدواروں کا تعاون حاصل ہوجاتا ہے۔ شاہ عالم صرف ایک سال بعد وزیر اعظم بننے والا تھا۔

اس کے بعد میرا نمبر تھا۔ اس کا فیصلہ میں نے سات سال پہلے ہی کرلیا تھا۔ شاید اس سے بھی پہلے یہ خیال میرے ذہن میں موجود تھا۔ میں نے اپنے خواب کو اپنی منزل بنالیا تھا لیکن میں نے اس خواب کو بھی سات پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ چُرانے والے دل چُرا لیتے تھے۔ سونے والے کی آنکھوں سے کاجل بھی چرا لیتے تھے' مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ میرا خواب بھی نہ چُرالیں۔

میں نے اس ملک کی سیاست' سیاست دانوں کے طریقہ واردات اور ووٹرز کی نفسیات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ میرے سامنے شاہ عالم کی مثال تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دیوانے کا خواب نہیں' ایسا ہونا ناممکن نہیں۔

میرا کوئی سیاسی جماعت بنانے کا ارادہ نہیں تھا۔ یہ راستہ بہت لمبا تھا اور غیر یقینی۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ عوام کا سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین پر سے اعتماد اُٹھتا جارہا تھا۔ یہ بہت محنت طلب کام تھا اور تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں طویل میعاد کی پلاننگ لاحاصل تھی۔ آج کوئی اینٹ اینٹ خود جوڑ کے محل کھڑا کرنے کی سوچے تو اس کے عزم اور مستقل مزاجی کو پاگل پن کا نام دیا جائے گا۔ یہ اتنا ہی ناممکن ہوگا جتنا حق حلال کی کمائی سے روپیہ روپیہ بچا کے کروڑ پتی بن جانے کا خواب۔ ہاں فی زمانہ ایسا ممکن تھا کہ محل کوئی اور بنائے اور میں اس پر قبضہ کرلوں۔ آخر کرائے دار بھی تو مکانوں پر قابض ہو ہی جاتے ہیں۔ انگریز اسی لیے کہتے آئے ہیں کہ بے وقوف مکان بناتے ہیں اور عقلمند ان میں رہتے ہیں۔ کروڑ پتی بننے کے آسان نسخے ساری دنیا میں مستعمل ہیں۔ کلاشنکوف اور دستی بم پاس ہونے چاہئیں۔ ان کا استعمال ضروری نہیں۔ ایک ذہین اور جرأت مند ٹیم ہو اور صحیح پلاننگ۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ سارے ملک کے بینک ہیں۔ ہیرے جواہرات اور سونے کے ڈھیر ہیں۔ تجوریوں میں بند بلیک منی ہے۔ بلیک میل ہونے والے ہیں۔ قسمت ساتھ دے تو یہ چند ہفتوں یا مہینوں کا کھیل ہے۔

سیاست پیسے کا کھیل ہے۔ وہ کھیل جو صرف کروڑ پتی کھیل سکتے ہیں۔ میرا پروگرام بہت واضح تھا۔ پہلے میں کروڑوں اکٹھے کروں گا۔ اس کے لیے میں بزنس کررہا تھا اور بزنس بھی وہ جس میں جائز اور ناجائز کا اخلاقی تصور سرے سے نہیں ہوتا۔ جب میرے پاس کروڑوں ہوں گے تو میں کسی بھی سیاسی جماعت میں شامل ہوجاؤں گا اور اس کے بعد جوڑ توڑ۔ خرید و فروخت' سودے بازی' بلیک میلنگ' بدمعاشی کے سارے حربے جائز۔ میں پارٹی کے ممبر خرید لوں گا۔ فارورڈ گروپ بناؤں گا اور بالآخر پارٹی کو ہائی جیک کرلوں گا۔ نئی پارٹی بنانے سے بنی بنائی پارٹی پر قبضہ کرنا بہت آسان اور بہتر تھا۔ عرب کے اونٹ کی کہانی نئے انداز میں دُہرائی جاسکتی تھی۔

میں اپنے پروگرام پر عمل درآمد کرنے کی تیاری کرچکا تھا کہ مجھے اچانک امیر تیمور نے بُلالیا۔ لندن ہمیشہ سے سیاسی سازشوں کی نرسری رہا ہے۔ ہر دور میں لندن پلان کو اخبار والوں نے خوب پبلسٹی دی۔ خفیہ ملاقاتوں کے لیے محلاتی سازشوں کے ماہرین مختلف راستے اختیار کرتے تھے۔ وہ عمرے کے لیے روانہ ہوتے تھے' علاج کے لیے امریکا جاتے نظر آتے تھے مگر پھر بحکم خداوندی لندن میں دیکھے جاتے تھے۔

شاہ عالم کی پارٹی اور خود اس کے بارے میں مجھے جتنا معلوم تھا اتنا امیر تیمور کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شاہ عالم ہمیشہ اور ہر معاملے میں خود آگے رہتا تھا۔ اس کے دستِ راست اور دوسرے معتمد پس منظر میں رہنے کے باعث کوئی پبلک امیج نہیں بنا پائے تھے۔ لوگ تیمور کے بارے میں یہ ضرور جانتے تھے کہ وہ پارٹی کا جنرل سیکریٹری بلحاظ پوزیشن نمبر دو آدمی ہے۔ کسی کو اس کے کاروبار کی نوعیت کا اندازہ بھی نہیں تھا۔

میں ٹھیک آٹھ بجے اس کے ہوٹل پہنچا تو اس نے لابی میں مجھے ریسیو کیا۔ وہ بہت سے دوسرے انتظار کرنے والوں کے ساتھ صوفے پر بیٹھا رسالوں کی ورق گردانی کررہا تھا۔ وہ چھ فٹ قد کا قدرے فربہ' سیاہی مائل سانولی رنگت کا مکرانی یا بلوچ نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کے بال سخت اور گھنگریالے تھے۔ ناک پھیلی ہوئی اور چہرے کی مناسبت سے ہونٹ موٹے تھے۔ وہ ڈارک براؤن سوٹ میں تھا۔

"آپ تو وقت کی پابندی کے معاملے میں انگریز سے بھی زیادہ انگریز ثابت ہوئے" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "ہونا پڑتا ہے تیمور صاحب۔ ورنہ وقت کہاں کسی کا انتظار کرتا ہے" میں نے کہا۔

"آیئے ادھر بیٹھتے ہیں" وہ مجھے ڈائننگ روم کے آخری گوشے میں لے گیا "یہاں کسی کی دخل اندازی کا امکان کم ہے۔"

"کوئی بہت پرائیویٹ بات ہوگی جس کے لیے رازداری اتنی اہم ہے" میں نے کہا۔

اس نے کہا "بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مجھے جاننے والے بہت ہیں اور آپ کے واقف بھی کم بہرحال نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا "آپ پبلک فگر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے رابطہ رکھنا آپ کی ضرورت ہے۔ اس میں بدقسمتی کا تو سوال ہی نہیں۔ ہاں مجھے صرف وہی پہچانتے ہیں جن سے میرا کاروباری معاملہ ہو۔"

وہ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ لندن کا موسم' پاکستانی کمیونٹی کے ساتھ گوروں کا متعصبانہ رویّہ۔ کرکٹ۔

پھر اس نے پوچھا "ڈنر سے پہلے آپ کیا پئیں گے؟"

میں نے کہا "صرف سادہ پانی۔ لیکن آپ میری وجہ سے تکلف میں نہ پڑیں۔ آپ انگریزوں کے ساتھ رہ کے یقیناً ایک ڈرنک کے عادی ہوں گے۔"

"اوہ یس۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ بس نام کے ہی مسلمان رہ گئے ہیں۔" اس نے اپنے لیے ایک ڈرنک منگوا کے کھانے کا آرڈر دیا۔

میں نے کہا "تیمور صاحب۔ آپ کا کیا بزنس ہے؟"

"دیکھا جائے تو میرا اصل بزنس ہے سیاست۔ لیکن آپ کی مراد یقیناً اس بزنس سے ہے جس کو ذریعۂ معاش کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ معاشی مجبوری کے باعث میں کوئی کام نہیں کررہا ہوں۔ ابھی تو اللہ کا فضل ہے" اس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنسا "لیکن سوچنا پڑتا ہے مستقبل کے لیے بھی۔ کل کو اگر ہم سیاست میں نہ رہے۔ سیاست ہم میں نہ رہے۔ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اپنے وطن میں ہی دیکھ لیں۔ ایک عمر گزار دی لوگوں نے دھکے کھاتے اور قسمت آزماتے۔ بال جھڑ گئے یا سفید ہوگئے مگر ابھی تک ایک محدود دائرے سے نہیں نکل پائے۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ جن میں صلاحیت ہوتی ہے وہ پینتیس چالیس سال میں ہی اپنی قائدانہ صلاحیت کو تسلیم کرالیتے ہیں۔"

"قائدانہ صلاحیتیں۔" اس نے ایک گھونٹ لے کر کہا "بڑی صحیح اصطلاح استعمال کی آپ نے۔ نواز شریف' بے نظیر' عمران خان جیسے لوگوں کے مقابلے میں دیکھا جائے تو ولی خان صاحب' جتوئی صاحب یا نصراللہ صاحب کی کامیابی کو میں اخلاقاً کامیابی تسلیم کرسکتا ہوں۔ ورنہ ساری زندگی گنوا کے نہ انہوں نے قوم کو کچھ دیا اور نہ قوم نے انہیں۔ شاہ عالم کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

سوال اچانک کیا گیا تھا اور اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ جواب دینے کے لیے مجھے سوچنے کی مہلت نہ ملے لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ "اس میں یہ قائدانہ صلاحیت ہے۔"

وہ خوش ہوا "اور مجھ میں؟"

میں نے کہا "آپ کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہماری پارٹی کے بارے میں آپ زیادہ نہیں جانتے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ سیاست میرا شوق تک نہیں۔"

وہ ہنسا "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ پاکستان میں عام آدمی کا بھی یہ سب سے بڑا شوق ہے۔ ایک لطیفہ اس صورتِ حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ کوئی امریکی یا برطانوی پاکستان گیا۔ خوب گھوما پھرا۔ ہر جگہ لوگوں سے ملا۔ کسی نے اس سے سوال کیا کہ پاکستان کی سیاست کیسی ہے؟ اس نے سوچ کے کہا کہ ویسے تو یہاں رکشا چلانے والے سے وزیر اعظم تک سب سیاست داں ہیں مگر سیاست نہیں ہے۔ ایسی ویسی کا کیا سوال۔ ملکی حالات سے آپ بھی باخبر ضرور رہتے ہوں گے۔"

میں پُرانے لطیفے پر اخلاقاً مسکرایا تھا "کسی حد تک۔"

"آپ ابھی صرف پیسہ کمارہے ہیں۔ دن رات ایک ہی کام کررہے ہیں۔"

"یہ آپ نے کیسے فرض کرلیا۔"

"بھئی شادی آپ نے نہیں کی ابھی تک۔ نہ آپ سگریٹ پیتے ہیں نہ شراب اس کا مطلب ہے کہ شوقین مزاج بھی نہیں۔ بزنس ہر طرف پھیلا ہوا ہے آپ کا اور رشتے داری کوئی نہیں۔ کیا کریں گے آخر آپ اتنی دولت اکٹھی کرکے؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "آپ خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں انکم ٹیکس والوں نے تو میرے پیچھے نہیں لگایا ہے آپ کو؟"

اس نے کہا "مسٹر ناصر۔ یہ ٹھیک ہے کہ دولت مندی بھی ایک شوق کی طرح ہے۔ لیکن اس میں ایک حد آتی ہے جب

دولت بے مصرف اور بے مقصد چیز بن جاتی ہے۔"
"آپ کو کیا معلوم کہ میرے سامنے کیا مقصد ہے؟"
"مقصد پوشیدہ نہیں رہ سکتا" وہ بولا "عمران خان کا مقصد کتنی جلدی سامنے آگیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے شوق کا میدان سیاست ہونا چاہیے۔ یہ بڑا کھیل ہے۔ جن کے پاس عقل عزم اور عروج کی خواہش نہ ہو وہ جُوا کھیلتے ہیں۔ اور سیاست کو بھی جُوا سمجھتے ہیں مگر آپ جیسے شخص کے لیے یہ جُوا نہیں۔"
میں نے کہا "میں آپ سے متفق ہوں۔ سیاست جُوا نہیں ہوتی مگر صرف ان کے لیے جو اسے سنجیدگی سے لیں۔ ایک ذمے داری سمجھ کے بلکہ چیلنج سمجھ کے قبول کریں۔ آپ کے چیئرمین شاہ عالم کی طرح۔"
وہ کھل اُٹھا "بہترین مثال دی اس وقت آپ نے۔ میرے منہ کی بات چھین لی۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ خود آپ شاہ عالم ہیں۔"
"میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔"
"میں عادت' فطرت اور مزاج کے حوالے سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ جن صفات نے اس کو کامیابی عطا کی وہ آپ کی ذات میں بھی ہیں لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو شاہ عالم سے بہتر قائدانہ صلاحیت کے مالک ہیں مگر وہ کچھ اور کر رہے ہیں۔ آپ کو ان سب پر جس وجہ سے فوقیت حاصل ہے وہ ہے آپ کی۔۔۔ صورت۔"
"میری صورت۔۔۔؟" میں نے چونکے بغیر کہا۔
اس نے جام خالی کیا "یس مسٹر ناصر عظیم۔ آپ کی صورت۔۔۔ آئینہ دیکھ کے کبھی آپ کو خیال نہیں آیا۔۔۔ کمال ہے! آپ کی قوتِ مشاہدہ یقیناً بہت اچھی ہوگی۔ پھر یہ احساس کیوں نہیں ہوا آپ کو۔"
میں نے کہا "یہ بڑی عجیب بات ہے۔"
"صرف عجیب۔۔۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔ آپ میں اور شاہ عالم میں اگر کوئی فرق ہے تو بالوں کے رنگ کا یا آنکھوں کے رنگ کا۔ اگر آپ براؤن کنٹیکٹ لینز لگالیں۔ بالوں کو ہلکا سا براؤن شیڈ دے کر پیچھے کی طرف بنالیں۔۔۔ اور ہاں' چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی سجالیں۔۔۔ تو آپ سو فیصد شاہ عالم ہوں گے۔"
میں نے کہا "اتنا ڈینٹ پینٹ کرنے کے بعد تو مجھے محمد علی بھی بنایا جاسکتا ہے۔"
وہ ہنسا "کون سا۔۔۔ باکسر یا فلمسٹار۔۔۔؟"
"دونوں۔۔۔ میک اَپ مین عورت کو مرد اور آدمی کو بھوت بنا کے دکھا دیتے ہیں۔"
"مگر آپ کو میک اپ کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کی صورت کے نقوش۔ خدوخال' جسمانی ساخت یہاں تک کہ چال ڈھال اور آواز تک وہی ہے جو شاہ عالم کی ہے۔ میں حیران ہوں کہ آج تک کسی نے آپ کو یہ بات کیوں نہیں بتائی یا خود آپ کو اس کا احساس کیوں نہیں ہوا۔"
میں نے کہا "اور میں حیران ہوں کہ آپ کی نظر نے یہ سب کیسے دیکھ لیا جو کسی کو بھی نظر نہیں آیا۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ یہ میری نظر کا دھوکا ہے؟ فریب نگاہ ہے؟" وہ آپ سے تم پر آگیا۔
"ایسا ہوتا ہے۔" میں نے کہا "بچوں کو بادلوں میں' دیوار کی سفیدی پر کسی دھبے میں یا اکھڑے ہوئے پلاسٹر میں کوئی شبیہ نظر آنے لگتی ہے۔ ان کا تصور انہیں ہاتھی یا گھوڑے پر سوار آدمی یا چھلانگ مارتا ہوا کتا' کچھ بھی دکھا دیتا ہے۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا "نو سر۔۔۔ یہ میرے تصور یا میرے تخیل کا کرشمہ نہیں ہے۔ میری IMAGINATION نہیں ہے۔ جاؤ واش روم میں آئینہ دیکھ کے آؤ اور پھر مجھے بتاؤ۔"
میں نے ہنس کے کہا "اب تو مجھے ایسا ہی نظر آئے گا۔ تم نے مداری کی طرح میرے خیال کو کنٹرول کرلیا ہے۔"
"مسٹر ناصر۔ یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔ اگر آپ اس کی گہرائی میں جائیں" اس نے کہا "دنیا میں کتنی فلمیں بنی ہیں ہمزاد بھائیوں پر جن کی شکلیں بھی ایک دوسرے کا عکس ہوتی ہیں؟ سیکڑوں نہ سہی درجنوں فلمیں ہوں گی۔ کچھ مزاحیہ کچھ سنجیدہ۔ انگلش اردو ہر زبان میں۔ ایک ناول بھی کئی سال انٹر کی انگلش کے نصاب میں شامل رہا۔ نام کچھ یاد نہیں آرہا ہے مجھے۔ اس پر فلم بھی بن چکی ہے۔ اس میں ہوتا کچھ یوں ہے کہ بادشاہ کو بدخواہ قید خانے میں ڈال دیتے ہیں اور اس کے کسی ہم شکل کو تخت پر بٹھا کے اپنی مرضی کے مطابق حکومت چلانے لگتے ہیں۔ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ یہ اصلی بادشاہ نہیں ہے۔"
میں نے کہا "لیکن نقلی بادشاہ کو جب یہ بات معلوم ہوتی ہے تو وہ خود کوشش کر کے اصل بادشاہ کو رہائی دلواتا ہے اور تاج و تخت اس کے سپرد کر کے کہتا ہے فی امان اللہ۔ ناول اور فلم کا نام تھا "PRISNOR OF ZENDA"۔
"رائٹ! بالکل صحیح یاد آیا تمہیں۔"
"انٹر پاس تو میں بھی ہوں۔ مگر مسٹر تیمور! اس وقت اچانک میری اور شاہ کی مشابہت اتنی اہمیت کیوں اختیار کر گئی ہے' آپ کے لیے۔"
اس نے ایک ڈش میری طرف بڑھائی "یہ لابسٹر یہاں کی خاص چیز ہے۔"
میں نے کہا "جس میں غالباً وائٹ وائن کا تڑکا لگایا جاتا ہے۔ تھینکس' میں عام ڈش پر اکتفا کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔"
وہ کچھ خفیف ہوا "اس حد تک مُلّا ہو تم؟"
"اس حد تک مسلمان ہوں میں" میں نے تصحیح کی "ملک سے باہر میں کھانے پینے میں محتاط رہنا پسند کرتا ہوں۔ ابھی تک غلطی سے بھی لحمِ خنزیر اور اُم الخبائث کو ہاتھ نہیں لگایا۔ منہ لگانا تو دور کی بات ہے۔ میں کچھ کھالوں گا۔ اتنی ساری چیزیں ہیں۔ اس کے علاوہ' میں یہاں کھانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس بزنس کے موضوع پر ہم نے ابھی تک بات نہیں کی جو بقول آپ کے' ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔"
"مجھے یاد ہے۔ ہاتھ مت روکو۔ پہلے طعام پھر کلام" اس نے کہا "ویسے ہم اتنی دیر سے جو باتیں کر رہے ہیں' وہ بھی بزنس ٹاک ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہٹلر کا ایک ڈبل تھا۔ ایک شخص جو سو فیصد اس کا ہم شکل تھا۔ جہاں پبلک میں آنے سے جان کو خطرہ ہو یا کوئی رسمی تقریب ہو' وہاں ہٹلر اسے بھیج دیتا تھا۔"
میں نے کہا "ہاں۔ ایسا بہت سے لوگوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنا ڈپلی کیٹ رکھتے ہیں۔ مروانے کے لیے اسے آگے کردیتے ہیں۔"
وہ ہنسا "اس کے کام کی حساسیت اور اہم نوعیت کے باعث اسے خدمات کا معاوضہ بھی اسی حساب سے ملتا ہے۔"
"وہ بھی ہوتا تو (PRISONER OF ZENDA) ہی ہے۔ ایک کٹھ پتلی جس کی جان دوسروں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ قیمت اسے مل جاتی ہے۔"
"اگر کبھی یہ رول آپ کو کرنا پڑے مسٹر ناصر!"
"شاہ عالم کے ڈپلی کیٹ کا؟"
"ہاں۔ فرض کریں شاہ عالم وزیرِ اعظم یا صدر ہو۔۔۔ اور اسے ملک و قوم کے اعلیٰ تر مفاد میں آپ کی خدمات کی ضرورت پڑ جائے۔"
"ملک و قوم کے اعلیٰ تر مفاد میں شاہ عالم کو اپنی جان اس وطن پر قربان کردینی چاہیے۔ اکثر لیڈر اپنی تقریروں میں چلا چلا کے اعلان کرتے ہیں کہ وہ خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔"
"عوام کے خون کا مسٹر ناصر۔ اپنے خون کا نہیں۔"
"مجھے کوئی (PRISONER OF ZENDA) نہیں بنا سکتا۔ مسٹر امیر تیمور! مجھے اپنی جان ہر وزیرِ اعظم اور صدر کی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ خواہ وزیرِ اعظم برطانیہ کا ہو اور صدر امریکا کا۔"
"میرا بھی یہی خیال تھا۔ آپ کبھی شاہ عالم کے ڈپلی کیٹ کا رول نہیں کریں گے۔ خواہ اس کا معاوضہ کچھ بھی ہو۔ جتنا اب آپ کے پاس ہے اس کا ڈگنا یا دس گنا لے کر بھی نہیں۔"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بے کار موضوع پر وقت ضائع مت کریں مسٹر تیمور۔"
اس نے میری اَن سُنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "لیکن ایک بالکل نئی صورتِ حال پر غور کریں۔ اگر آپ ڈپلی کیٹ نہ ہوں۔ آپ کو اوریجنل بنادیا جائے۔ اصل آپ ہی ہوں؟"
میں بھونچکا رہ گیا "تمہارا مطلب ہے۔ میں شاہ عالم بن جاؤں۔ شاہ عالم کیے ہوتے ہوئے۔ یہ تو وہی۔۔۔"
"نہیں۔ یہ زینڈا کے قیدی والی سچویشن نہیں ہے۔ وہ ایک کہانی تھی اور FICTION کے تقاضے نے مصنف اور فلم ساز کو مجبور کیا کہ وہ اصل بادشاہ کو زندہ رکھیں قید خانے میں۔ اس کا ہم شکل بادشاہ بڑا ضمیر پرست ہو اور اس میں ذرا بھی ہوسِ اقتدار نہ ہو۔ پھر کچھ ایکشن اور سسپنس کے ساتھ اختتام یوں کیا جائے کہ حق کا بول بالا' جھوٹے کا منہ کالا۔ حقیقت کا افسانے سے کیا تعلق۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "حقیقت!"

"ہاں۔ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک مملکت میں دو بادشاہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ بادشاہ نمبر ایک کو بھیج دیا جائے دوسری دنیا میں تو بادشاہ نمبر دو ہی باقی رہ جائے گا اس دنیا میں۔ پھر اصلی اور حقیقی بادشاہ وہی ہوگا۔ بادشاہ کسی کا قیدی نہیں ہوتا۔"

"امیر تیمور!" نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا "کیا..... تم نے..... شاہ عالم کو قتل کردیا ہے؟ صاف بات کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے مسکرا کے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

"آپ اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہیں مسٹر ناصر۔ شاہ عالم جیسے لوگ ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔" اس نے بل کی رقم فولڈر میں رکھ دی "لیکن تاریخ اپنے آپ کو خود لکھتی ہے۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور جب بڑی مشکل سے چمن میں دیدہ ور پیدا ہوتا ہے تو اہلِ چمن کیا کرتے ہیں؟ اسے مار کے اس کا مزار بنادیتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ اپنے وقت کی تاریخ کو دیکھ لیں۔ گاندھی اور لیاقت علی خان۔ مصر کے صدر انورالسادات اور امریکی صدر کینیڈی۔ کیا یہ عام لوگ تھے؟ ان کو قتل کس نے کیا؟ خود ان کی قوم کے کسی فرد نے' ہے نا بدبختی۔"

"مسٹر تیمور! یہ کیا بکواس ہے؟"

"ناصر صاحب! یہ حقیقت ہے۔ شاہ عالم جیسے لوگوں کو بھی ہزار سال زندہ رہنا چاہیے۔ میں تو کہوں گا کہ میری عمر بھی اسے لگ جائے مگر یہ ایک فضول جذباتی ڈائیلاگ کے سوا کچھ نہیں۔ عمر کے بینک اکاؤنٹ میں ایک کی زندگی کے کراس چیک کو دوسرے کی زندگی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر نہیں کیا جاسکتا۔ میں بھی قتل ہوسکتا ہوں۔ آپ بھی قتل ہوسکتے ہیں۔ شاہ عالم کو بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔"

"اور تم یہی کہنا چاہتے ہو؟" میں نے برہمی سے کہا "یہ بتانے کے لیے بلایا تھا تم نے مجھے؟"

اس نے مجھے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا "ٹیک اِٹ ایزی مسٹر ناصر۔ نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے اور نہ خواہش۔ شاہ عالم از ویری مچ الائیو۔ آپ بات کریں گے اس سے؟" اس نے جیب میں سے سیلولر فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ڈراما مت کرو میرے سامنے۔ مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس شاہ عالم سے بات کرنے کی۔ وہ زندہ ہے تو مجھے کیا اور مرجائے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ وہ طبعی موت مرے یا مارا جائے' مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

امیر تیمور نے فون بند کرکے فولڈ کیا اور جیب میں رکھ لیا "لائن بزی جارہی تھی مگر اس کا نمبر ہے۔"

"مجھے نہیں چاہیے کسی کا نمبر' آپ مجھے اجازت دیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کا وقت برباد کیا۔"

"مسٹر ناصر۔ پلیز۔ جذباتی اور مشتعل نہ ہوں۔ اگر کوئی ناگزیر معروفیت نہیں ہے تو مجھے کچھ وقت اور دیں۔ میں مانتا ہوں کہ وقت بڑی قیمتی چیز ہے۔ ایک ایک سیکنڈ کو ہم اور آپ کیش کراتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہی غلطی ہے۔ آدمی کو پیسہ بنانے کی مشین نہیں بننا چاہیے۔ کچھ وقت ضائع کرنے کے لیے بھی نکالنا چاہیے۔ جیسے مال کی زکواۃ نکالی جاتی ہے ایسے ہی زندگی کے وقت کی زکواۃ نکالنے سے زندگی بڑھتی ہے۔ برکت ہوتی ہے' رزق میں اور زندگی میں۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "تیمور! میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ تم بات کو کیوں گھُمارہے ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ناصر! یہ میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہے۔ یہ آخری بھی ثابت ہوسکتی ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم پھر ملیں گے اور ملتے رہیں گے۔ کیا حرج ہے اگر باقی بات ہم یہاں نہ کریں۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"اگر یہاں بات کرتے ہوئے ڈرتے ہو تم' تو ایسی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے ناصر! میرے کمرے میں چلو۔"

"کیا وہاں دیواروں کے کان نہیں ہیں؟"

"اوکے' ہم سوئمنگ پول سائیڈ پر چلتے ہیں۔ اس وقت وہاں بہت کم لوگ ہوں گے۔ کھلی جگہ ہے' ہم وہاں کافی پئیں گے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ تیمور نے میرے تجسس کو اس حد تک بیدار کردیا تھا کہ اب میں اس کی گفتگو کے پردے میں نہاں اصل مقصد کو سمجھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے کوئی ناگزیر معروفیت واقعی نہیں تھی چنانچہ میں نے سوچا کہ جب اتنا وقت برباد کیا ہے تو کچھ اور سہی۔ شاید مجھے ضائع ہونے والے وقت کا صلہ مل جائے۔

ہم ایک سرسبز وشاداب گوشے میں لگی ہوئی گارڈن چیئرز پر جابیٹھے۔ سوئمنگ پول میں چند حضرات وخواتین اس وقت بھی نہانے کے بہانے خرمستی میں مصروف تھے۔ کچھ تقریباً ننگ دھڑنگ ایزی چیئرز پر لیٹے ہوئے ایک دوسرے کو یا آسمان کو تک رہے تھے۔ کافی پینے والے صرف ہم تھے۔ باقی نشۂ مے یا نشۂ عشق سے سرشار تھے۔

"ناصر۔ اب ہم جو بات کریں گے وہ بالکل فرینک اور HONEST ہوگی۔ اچھی لگے یا بُری لیکن نہ تم کچھ لگی لپٹی رکھو گے نہ میں تم سے کچھ چھپاؤں گا۔ آج کی بات یہیں ختم ہوجائے گی' عدم اتفاق کی صورت میں۔ نہ اس کا کوئی گواہ ہے اور نہ ہم پھر کبھی اس کا حوالہ دیں گے اور ہم یہ فرض کرلیں گے کہ ہماری یہاں کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی یا ہوئی تو ہم بس گپ شپ کرتے رہے۔"

میں نے کہا "تمہاری اس پُراسرار بات کا سسپنس اب ختم ہوجانا چاہیے۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا کہ تم جو بات کرو گے' اس کا کسی قسم کے بزنس سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہوگا۔"

"تمہارا کیا اندازہ ہے؟" وہ بولا "میں کیا کہنے جارہا ہوں؟"

میں نے کہا "کاغذ کا کوئی ٹکڑا ہے تو مجھے دو۔"

اس نے اپنے بریف کیس میں سے ایک نوٹ پیڈ نکالا جس کے ساتھ بال پوائنٹ بھی تھا اور میری طرف بڑھادیا۔

میں نے اس پر لکھا "تم مجھے سیاست میں گھسیٹنا چاہتے ہو۔ شاہ عالم کی جگہ۔"

میں نے پیڈ کو میز پر رکھ دیا "اسے تم بعد میں دیکھنا۔"

اس نے سرہلایا "ناصر عظیم! اتفاقات حقیقی زندگی میں بھی ہوتے ہیں۔ فلمیں اس لیے بدنام ہیں کہ ان کی کہانی میں اتفاقات کی بھرمار ہوتی ہے۔ اتنی کہ اتفاقات بالکل معمولات کی طرح لگتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ایسا ہی حقیقی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے مگر وہ ہوتا ہے۔ اب تم ذرا اس اتفاق پر غور کرو کہ قدرت نے ایک ہی سانچے میں ڈھال کے دو آدمی بنادیے۔ دو الگ الگ گھروں میں' الگ الگ وقت پر' الگ الگ والدین اور الگ الگ ناموں کے ساتھ اس دنیا میں آئے۔ ان کی زندگی کے پچیس تیس سال ایک ہی شہر میں اور ملک میں گھومتے پھرتے گزر گئے مگر کہیں بھی ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔"

"یہ بھی ایک اتفاق ہے" میں نے کہا۔

"بہت سے لوگوں نے دونوں کو دیکھا لیکن ایک جگہ ایک ساتھ نہیں دیکھا۔ کسی نے ایک کو پہلے دیکھا تو دوسرے کو بعد میں لیکن اسے کبھی مشابہت کا خیال نہیں آیا۔ دراصل دونوں کا حلقۂ شناسائی الگ تھا۔ بزنس مین کو صرف بزنس کرنے والے ملے اور اپنے کام کی بات کرنے کے سوا انہوں نے کچھ اور سوچا ہی نہیں۔ مزید یہ کہ دماغ ایک وقت میں ایک حقیقت کو قبول کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ جو تمہیں شروع سے جانتے ہیں ان کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ تم کس حد تک شاہ عالم ہو اور اگر فرق ہے تو کیا؟ اس فرق کو ہٹاکے میری نظر نے دیکھا تو۔"

"جو دوسرا اتفاق ہے" میں نے کہا۔

"تو میں دنگ رہ گیا۔ تم ریڈی میڈ شاہ عالم ہو" تیمور نے اپنی بات جاری رکھی "جتنا میں نے اس پر غور کیا میرے ذہن میں امکانات کے لامحدود افق پھیلتے گئے۔ میں نے بہت سوچا۔ چھ مہینے تک میں نے تمہارا پیچھا کیا اور تمہارے معمولات پر نظر رکھی۔ بالآخر آج یہاں میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جُوا نہیں کھیلتے۔"

میں نے کہا "میں اپنی تقدیر کو اپنی محنت کے تابع رکھنا پسند کرتا ہوں۔"

"اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے۔" وہ بولا "مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں سیاست کے میدان کا شہسوار بننے کا کوئی شوق نہیں؟"

میں نے محتاط ہوکے کہا "شہسوار بننے کے لیے گھوڑے پر سوار ہونا پڑتا ہے۔ مجھے تو گھوڑے سے ہی الرجی ہے۔ ممکن ہے گھوڑے کو بھی مجھ سے ہو۔"

"ناصر! ذرا سوچو' پیسہ تم نے بہت کمالیا۔ اتنا کہ اب اس میں ہر روز' ہر گھنٹے اور ہر منٹ کے حساب سے اضافہ ہورہا ہے۔ تم نے ایک ٹیوب ویل کھود کے مشین چلادی ہے اور پیسہ پانی کی طرح بہہ کر تمہارے اثاثوں کی پیداواری صلاحیت کو' ان کی زرخیزی کو بڑھا رہا ہے۔ وہ جو بات ہے کہ پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے' تو تم نے بہت سارے پیسوں کی طاقت اس کام میں لگادی ہے کہ وہ پیسہ کھینچے اور پیسہ کھنچا چلا آرہا ہے خود بخود۔ تمہیں نہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے' نہ کچھ سوچنے کی۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔"

"اپنی ذہنی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے تم نے ایک کام پایۂ تکمیل کو پہنچادیا۔ تم نے دولت منڈی کا کارخانہ چالو کردیا۔ تمہاری ذہنی صلاحیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بہت کم وقت میں یہ کام ختم کرلیا تم نے۔ تمہارے پاس اب بھی وقت بہت ہے' اب کیا کرو گے؟"

"ابھی تک میں نے سوچا نہیں۔ مگر سوچنا پڑے گا۔"

"مجھے اسی جواب کی اُمید تھی تم سے" وہ خوش ہوا "اگر تم کہتے کہ یار! بس اب عیش کریں گے یا تم کہتے کہ اب شادی کریں گے گھر بسائیں گے۔ تو یہ عام آدمی کا جواب ہوتا لیکن تم عام آدمی نہیں ہو۔"

"میں بالکل عام آدمی ہوں' دو کانوں' دو ٹانگوں والا۔"

"حیوانِ ناطق۔ آدمی اور انسان میں بڑا فرق ہے۔" اس نے کہا "یہ سب جو پیدا ہوتے ہیں' واجبی سا لکھ پڑھ کے بابو بنتے ہیں یا اَن پڑھ رہتے ہوئے پیٹ پالنے کا کوئی وسیلہ تلاش کرلیتے ہیں پھر شادی کرکے اپنے جیسے اور نمونے پیدا کرتے ہیں' انہیں پالتے ہیں اور ان کی شادیاں کرتے ہیں اور پھر مرجاتے ہیں۔ بس یہ ایک دائرہ ہے جس کے اندر نوّے فیصد یا شاید اس سے بھی زیادہ ایسے لوگ قیدِ حیات کاٹتے ہیں جن کو عام جانور سے تھوڑا سا ممتاز کرنے کے لیے حیوانِ ناطق سمجھا جاسکتا ہے۔ تمام جانوروں کی زندگی سے موت تک کے یہی مرحلے ہوتے ہیں۔ پیدائش' نشوونما' تولید اور موت۔ تمہیں یہ فلسفہ بور تو نہیں کررہا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں' میں اپنی زندگی کو تمہارے نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہوں۔"

"دس فیصد یا اس سے بھی کم افراد نے دنیا کا نظام سنبھال رکھا ہے۔ یہی ہیں جو دنیا میں کارخانے چلا رہے ہیں۔ سُوئی سے لے کر خلائی جہاز تک بنارہے ہیں۔ زمین پر گاڑیاں' سمندروں میں بحری جہاز' ہوا میں طیارے اور خلا میں سیارے اُڑا رہے ہیں۔ تعلیم' تہذیب' دنیا کی تعمیر و تشکیل سب انہی کے دم سے ہے۔ تم کو انہی میں شامل ہونا چاہیے۔"

"کیا ابھی میں فارغ ہوں؟"

"ہاں۔ تم بالکل فارغ ہو۔ تم نے ایک کام بڑی آسانی سے دس منٹ میں کرلیا۔ ابھی پورا دن باقی ہے کچھ اور کرو' کوئی زیادہ بڑا کام کرو۔ ایسا کام جس میں فائدہ روپے' پاؤنڈ یا ڈالر تک محدود نہ ہو۔ مادی فائدے کے چکر سے نکل جاؤ۔"

میں نے کہا "فکرِ آخرت کروں؟"

"تم شراب نہیں پیتے۔ اچھا کرتے ہو" اس نے کہا "دنیا بھی خراب اور عاقبت بھی۔ لیکن اور بھی چیزوں کا نشہ ہے جو شرع میں حرام نہیں۔ لطف اس کا جدا اور سب سے بڑھ کر۔ مثلاً دولت کا نشہ' بڑی سرور آفریں راحت ملتی ہے اس احساس سے کہ یہ دنیا آپ کی قوتِ خرید میں ہے۔ حسن کا نشہ جس کی قوتِ تسخیر کے سامنے ہٹلر جیسے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں' بڑے بڑے شہ زور چت ہو جاتے ہیں۔ عزت اور شہرت کا نشہ لیکن ان سب سے بڑھ کر ہے طاقت کا نشہ۔ اقتدار اور اختیار کا نشہ۔ کیا نہیں ہوا دنیا میں اس کے لیے۔ بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو قتل کردیا۔ دو ملکوں کی فوجیں آپس میں ٹکراتی رہیں۔ چنگیز خان اور ہلاکو نے سروں کے مینار تعمیر کرادیے۔ سکندرِ اعظم نے ساری دنیا فتح کرنے کا ارادہ کیا۔"

"مگر اس کو ملیریا کے مچھر نے کاٹ لیا۔ فاتحِ اعظم کو ایک مچھر نے شکست دی۔"

"مگر اس سے پہلے وہ سکندرِ اعظم بن گیا تھا۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر کتنے حملے کیے پھر مغل آئے' انگریز آئے' اب جمہوریت کا دور ہے۔ مگر اس میں بھی ہم نے وہی بادشاہت کا انداز اپنالیا ہے۔ سیاست موروثی ہوگئی ہے۔ روایت کا یہ بت شاہ عالم جیسے اور تم جیسے لوگ پاش پاش کرسکتے ہیں۔ وقت بدل رہا ہے ناصر! حکومت زمین پر طاقت سے اقتدار حاصل کرنے اور اختیار قائم کرنے کا نام نہیں۔ جو دلوں کو جیت کر حاکم ہوتے ہیں وہی حکومت کرسکتے ہیں۔"

میں اس کی بکواس سے اکتا چکا تھا اور ابھی تک اخلاقاً اس کا یہ بصیرت افروز سیاسی لیکچر سن رہا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ ساری تمہید وہ کس لیے باندھ رہا ہے مگر میں چاہتا تھا کہ مطلب کی بات وہ خود اپنی زبان سے اور اپنے الفاظ میں کہے۔ وہ بلاشبہ بہت ذہین تھا اور اس کا مطالعہ وسیع تھا' تاریخِ عالم اور سیاسی امور پر اس کے نقطۂ نظر سے اختلاف ممکن نہ تھا۔ وہ بڑی پرسکون جگہ تھی اور ایسا لگتا تھا کہ تیمور وہاں ساری رات بیٹھ کر سوئمنگ پول میں نہانے والوں۔۔۔ والیوں کے مقابلۂ حسن کے جج کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کی زبان مجھ سے مخاطب تھی مگر نگاہ بار بار بہک کے اُدھر چلی جاتی تھی جہاں روشنیوں میں چاندی جیسے بدن جھلمل دجھلمل کر رہے تھے۔

جب میں نے دوسری بار جماہی لے کر تیسری بار گھڑی دیکھی تو تیمور نے اچانک کہا "تم اس ملک کے وزیراعظم بھی بن سکتے ہو ناصر!"

میں نے مسکرا کے کہا "تم بنوا سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میں بنوا سکتا ہوں۔" اس نے اتنے پُرسکون انداز میں' اتنے اعتماد کے ساتھ کہا جیسے کوئی بہت بڑا بیوروکریٹ کسی حیرانی' پریشانی یا غرور اور تکبر کے بغیر کہے کہ چپراسی کی نوکری؟ ہاں۔۔۔ میں دلوا سکتا ہوں' صبح آجانا۔

میں نے کہا "پھر کیا میں صبح درخواست لکھ دوں سر؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "درخواست۔۔۔ میں کر رہا ہوں تم سے ناصر عظیم! یہ چانس قدرت نے صرف تمہیں دیا ہے کہ تم کچھ کیے بغیر مسندِ اقتدار پر قبضہ کرلو۔ وزارتِ عظمٰی یا صدارت کے منصب تک پہنچنے کے لیے بڑی طویل جدوجہد کرنی پڑتی ہے شاہ عالم کی طرح۔ وہ کئی بار مظاہروں میں زخمی ہوا۔ کئی بار جیل گیا۔ اس پر درجنوں مقدمات قائم ہوئے جن میں بغاوت اور غداری جیسے سنگین الزامات عائد کیے گئے تھے۔"

"یہ مذاق تو ہمارے ملک میں ہوتا رہتا ہے۔ شیرِ بنگال مولوی فضل حق تک کو غدار قرار دے دیا گیا تھا جس نے قراردادِ پاکستان پیش کی تھی' ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس میں۔" میں نے کہا۔

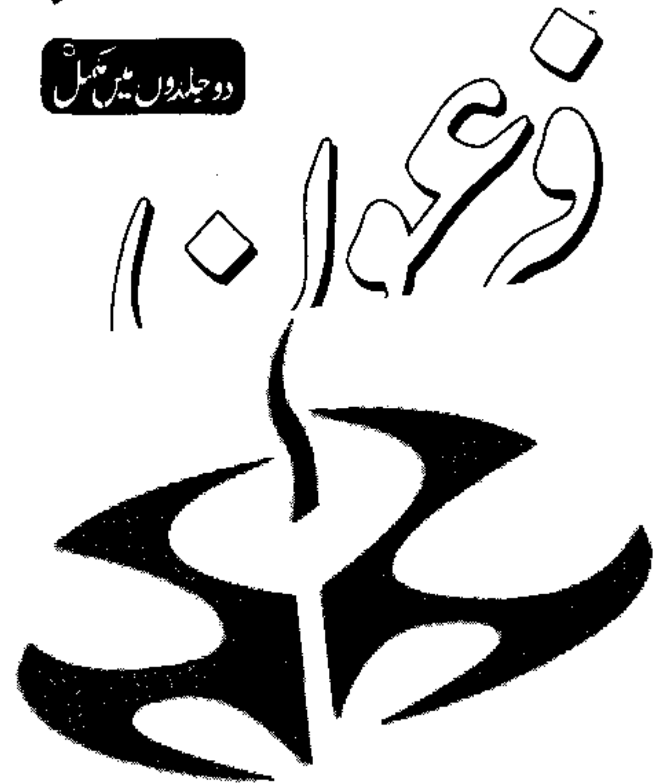
"شاہ عالم نے بدترین تشدد برداشت کیا۔ وہ لاہور کے شاہی قلعے کی بدنامِ زمانہ عقوبت گاہ میں رہا۔ وہاں وہ مر بھی سکتا تھا۔ اس وقت وہ اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کی موت پر انصاف اور انسانی حقوق اور جمہوریت کے علمبردار نعرے لگاتے سڑکوں پر نکل آتے۔ اس نے خیرات کی طرح ملنے والی وزارت قبول نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اپنے مستقبل کو داؤ پر لگاتا اور یہ بازی ہار جاتا۔ اس نے یہ حق لڑ کر اور ظلم کا مقابلہ کرکے حاصل کیا۔ اس نے مارشل لا کے دور میں کوڑے تک کھائے تھے۔"

"کیا الزام تھا اس پر؟ بھینس کی چوری کا یا ٹوپی چُرانے کا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اس سے بھی لغو الزام تھا" وہ بولا "الزامات کی طویل فہرست کا سب سے کمزور جرم۔ اصل مقصد تھا اس کی تذلیل۔ آج وہ تذلیل اس کے لیے سندِ امتیاز ہے۔ وہ فخر سے کہتا ہے کہ میں بھی کوڑے کھانے والوں میں شامل تھا' میں بھی شاہی قلعے میں رہا اور زندہ بچ گیا۔ اس کے ماں باپ' گھر کے دوسرے افراد' سب نے سیاسی جبر و تشدد جھیلا لیکن تم کو تو کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ سب تمہارے کریڈٹ پر ہوگا اور تم اتنی آسانی سے ملک کے اقتدارِ اعلیٰ کی منزل تک پہنچ جاؤ گے جیسے دورِ آمریت میں لوگ ایک ٹیلی فون موصول ہونے پر اطمینان سے لنچ کرکے کسی فائیو اسٹار ہوٹل یا اپنے قصرِ شاہانہ سے اپنی چم چم کرتی ذاتی کار میں ایوانِ صدر پہنچ کے حلف اُٹھاتے تھے اور زیادہ شاندار سرکاری گاڑی میں جھنڈا

مصر کی قدیم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ اور حیرتناک داستان

ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا اور اچھوتا شاہکار



اشاعت

لگا کے لوٹنے تھے۔ تمہارے لیے حکومت حاصل کرنا بھی اتنا ہی آسان کام ہوگا جتنا برطانوی ولی عہد کے لیے ہوتا ہے۔ اسے تو پھر بھی یہ حق وراثت میں ملتا ہے' تم کسی دعوے اور استحقاق کے بغیر.... جدوجہد کی سختی اٹھائے بغیر اقتدار حاصل کرسکتے ہو؟"

میں نے کہا "سوری! جو تم سوچ رہے ہو' وہ میرے بس کی بات نہیں۔"

اس نے ویٹر کو پھر کافی لانے کو کہا مگر صرف میرے لیے۔ اپنے لیے اس نے وہسکی طلب کی "تم اتنے ماہر ہو سوچ پڑھنے کے تو ذرا مجھے بھی دکھاؤ اپنا یہ کمال۔ کیا سوچ رہا تھا میں؟"

"تم چاہتے ہو کہ ایک رات میں اور تم شاہ عالم کو قتل کردیں۔ جب اس کے پاس اور کوئی بھی نہ ہو تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور قتل کرکے اس کی لاش کو کہیں غائب کردیں۔ صبح میں شاہ عالم کی جگہ لے لوں۔ کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہیں۔ جب شاہ عالم کے غائب ہونے کا ہی کسی کو پتا نہیں چلے گا تو قتل کا الزام کیسے آسکتا ہے؟ نہ مقدمہ درج ہوگا نہ تلاش ہوگی تو یوم حشر سے پہلے شاہ عالم کا سُراغ کیسے ملے گا؟ میں شاہ عالم بن جاؤں گا۔"

اس نے سنجیدگی سے میری بات سُنتے سُنتے اچانک قہقہہ مارا۔ ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہوگیا۔ اس نے ایک بار بڑی بے تکلفی سے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور بولا "معاف کرنا دوست! اچھی خاصی سنجیدہ گفتگو میں تم نے ایسا لطیفہ...."

میں نے خفت آمیز خفگی سے کہا "لطیفے والی تو کوئی بات نہیں کی میں نے۔"

"مجھے تو لطیفہ ہی لگی" وہ بولا "لطیفہ نہ سہی بچوں جیسی بات سمجھ لو۔ یہ تو کسی تھرڈ ریٹ بھارتی یا پاکستانی فلم کی سچویشن ہوگی یا کسی جاسوسی ناول کی جس میں ہیرو کا ہوتا ہے ڈبل رول۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے ناصر عظیم صاحب! اگر بجلی کا ایک کھمبا ہٹا کے اس کی جگہ ویسا ہی دوسرا کھمبا لگانا ہو تو سوچو کہ کیا کرنا پڑتا ہے؟ اور اگر وہ کھمبا لگا ہوا ہو چوک میں اور اس پر کوئی پی ایم ٹی بھی نصب ہو تو کام مزید مشکل ہوجاتا ہے۔"

میں نے کہا "مثال اچھی دی تم نے۔"

"ہاں۔ جو کھمبا چوک میں نصب ہو اس پر سب کی نظر ہوتی ہے۔ اس سے چاروں طرف تار منسلک ہوتے ہیں۔ ہر سمت میں کم سے کم بھی پانچ تار ہوں گے ورنہ آٹھ دس۔ ایک تار بھی ٹوٹ جائے تو سیکڑوں گھروں کی ہزاروں لائٹس آف ہوجاتی ہیں۔ چاروں طرف کے سارے تار کاٹ دیے جائیں تو شاید آدھا شہر تاریک ہوجائے گا۔ آدھا نہ سہی شہر کا ایک حصّہ سمجھ لو۔ جب لوڈ ٹرانسفر ہوگا تو دوسرے فیڈر یا گرڈ اسٹیشن خود بخود ٹرپ ہوں گے اور نتیجہ مکمل بریک ڈاؤن۔ دوسرا کھمبا نصب کرنا اور اس سے پھر سب تاروں کو جوڑنا لمبا کام ہے۔ سارا شہر ہنگامہ کرے گا کہ آخر کیا ضرورت تھی کھمبا بدلنے کی۔ پُرانے کھمبے میں کیا خرابی تھی۔ بریک ڈاؤن سے کتنی خرابی ہوئی' کتنا نقصان ہوا' اتنے مریض اسپتالوں میں مرگئے کیونکہ آپریشن کے دوران میں بجلی بند ہوگئی تھی' پانی کی فراہمی متاثر ہوئی' کارخانے بند ہوگئے۔ کولڈ اسٹوریج کی اشیائے صرف ضائع ہوگئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی باتیں۔ یہ تھی تمہاری بات جس پر مجھے ہنسی آئی تھی۔"

میں نے کہا "اور تمہارے اعلیٰ وارفع دماغ میں کیا بات تھی؟"

"شاہ عالم بھی چوک میں لگا ہوا کھمبا ہے اور اس سے منسلک تار اس کے رشتے اور تعلقات ہیں۔ اس پر نصب پی ایم ٹی شاہ عالم کی سیاسی طاقت ہے۔ جو لائٹس اس کھمبے پر نصب ہیں اس کی روشنی جہاں تک پہنچتی ہے وہ شاہ عالم کی شخصیت کا حلقہ اثر ہے جسے CHARISMA بھی کہا جاتا ہے۔ اسے بدلنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے کہ کسی کو پتا نہ چلے اور کسی کو نقصان کا احساس ہو نہ پریشانی ہو۔ پہلے اس سے ملا کر ایک نیا کھمبا کھڑا کردو۔ اس پر نیا اور بڑا پی ایم ٹی بھی سب کو نظر آتا ہو۔ پھر ایک وقت میں ایک تار کو پُرانے کھمبے سے الگ کرو اور فوراً دوسرے کھمبے سے ملادو۔ ذرا سی دیر کے لیے کچھ گھروں کی یا ایک علاقے کی لائٹ جائے تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا۔ باری باری ایک طرف کے سارے تار کاٹ کے منتقل کرتے جاؤ۔ پھر دوسری طرف کے۔ نئے کھمبے پر جدید وضع کی خوب صورت اور زیادہ روشن لائٹس لگادو۔ سب خوش ہوجائیں گے کہ بھئی واہ۔ اچھا کام ہورہا ہے۔ اس کے بعد وہ پُرانا کھمبا بے مصرف ہوجائے گا۔ اس کا وجود رہے نہ رہے' کسی کو فرق نہیں پڑتا پھر اسے اکھاڑ کے پھینک دو۔ کباڑخانے میں ڈال دو یا گلادو۔ آئی بات کچھ شریف میں؟"

میں نے کہا "کچھ کچھ۔ تم مجھے دوسرے کھمبے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ مگر تم کھمبے نہیں' ناصر عظیم ہو۔ پہلے تمہارا رضامند ہونا ضروری ہے۔ کیا تم ایسا چاہو گے؟ اگر تمہارا جواب اثبات میں ہے تو پھر باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں واقعی تمہیں ایوانِ اقتدار تک پہنچادوں گا۔"

میں نے کہا "اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے تیمور؟"

وہ اس سوال کے لیے تیار تھا۔ "اگر آج میں تمہیں سونے کی ایک کان کا پتا بتاؤں' میرے پاس اس کا سُراغ ہو اور نقشہ ہو مگر وہاں تک پہنچنے کے وسائل نہ ہوں اور میں سب کچھ تمہارے حوالے کردوں۔ تو سونے کی کان کے مالک ہوجانے کے بعد تم میرے لیے کچھ نہیں کروگے؟"

"سونے کی کان شاہ عالم کی ہوگی تو وہ بھی تمہارے لیے بہت کچھ کرے گا۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "یہی فرق ہے ناصر! جس کے لیے

میں نے تم کو ایک ایسی پیش کش کی ہے جو میں کسی اور کو نہیں کرسکتا۔ شاہ عالم۔ جو سمجھتا ہے کہ سونے کی کان تک وہ اپنی محنت لگن اور قسمت سے پہنچا ہے۔ باقی سب اس کے پیچھے پیچھے کتے کی طرح دُم ہلاتے آرہے ہیں۔ انہیں کچھ دینا نہ دینا اس کی مرضی اور اختیار کی بات ہے۔ جو کچھ وہ دے اس کی عنایت اور اس کا احسان۔ وہ عزت کے ساتھ دے یا ذلت کے ساتھ۔ اس کی مرضی۔ کسی کو زیادہ دے' کسی کو کم' کسی کو کچھ بھی نہ دے تو یہ بھی اس کی مرضی اور ناصر عظیم! مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہونے والا ہے۔ شاہ عالم آئندہ انتخابات میں خاصی اکثریت حاصل کرنے کے بعد وزیراعظم کے عہدے کا سب سے طاقتور امیدوار ہوگا۔ قطعی اکثریت شاید وہ حاصل نہ کرسکے مگر پانی تو نشیب کی جانب خود بخود جاتا ہے۔ چھوٹے گروپ اور آزاد امیدوار اسے واضح اکثریت فراہم کردیں گے۔ ظاہر ہے وہ ان میں وزارتیں تقسیم کرے گا۔ پارٹی کے پاس دو تہائی وزارتیں ہوں گی۔ ان کے لیے بھی رسّا کشی شروع ہوگئی ہے۔ سیاست میں اقتدار کی اس منزل تک شاہ عالم ایک دن میں نہیں پہنچا اور نہ اس نے یہ مسافت تن تنہا کسی سہارے کے بغیر طے کی۔ شاید رفاقت کا لفظ بہتر ہے مگر رفیقِ سفر کا بھی سہارا تو ہوتا ہے۔ پہلے دن سے ہی وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کچھ دوست تھے۔"

میں نے کہا "ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے۔ اس کا سارا کیریئر میرے سامنے ہے۔ وہ دوسروں کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلاتا تھا۔"

تیمور ہنسا "کیا تم بھی ان میں شامل ہو؟"

"ہاں۔ وہ مجھ سے پچاس ساٹھ ہزار کی امدادی اشیا لے گیا تھا۔ جب میں نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ آدھی سے زیادہ رقم خرد برد ہوکے اس کی جیب میں گئی۔ باقی آدھی رقم سے نیک نامی اور شہرت اس نے کمائی لیکن میں اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرسکا۔ الٹا اس سے شکایت کرکے میں نے اپنا خون جلایا۔"

"اس وقت بھی شاہ عالم کا ساتھ دینے والے اس کے آلۂ کار سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ وہ بے ایمانی کے دھندوں میں شاہ عالم کا ساتھ دیتے گئے۔ شاہ عالم انہی کو آگے رکھتا تھا۔ وہ شاہ عالم کو تحفظ بھی فراہم کرتے تھے۔ اس کی پبلسٹی کرتے تھے اور بڑے مخلص کارکن تھے لیکن شاہ عالم کے مقابلے میں ان کو ہمیشہ ثانوی حیثیت حاصل رہی۔ وہ ہمیشہ پس منظر میں رہتے تھے۔ شاہ عالم بالکل پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کے ساتھ کسی اور کا نام بھی آئے۔ شہرت اور نیک نامی پر وہ اپنی اجارہ داری رکھتا تھا۔ ہاں مال میں سے تھوڑا بہت ان میں بھی تقسیم کردیتا تھا۔ اس کا فارمولا کوئی نہیں تھا۔ انگریزی میں جسے کہتے ہیں شیر کا حصّہ۔ آدھا اکیلے شاہ عالم کا۔ باقی آدھے میں تین۔ مگر ان سب کے لیے یہ بھی کم نہ تھا چنانچہ وہ شاہ عالم کا ساتھ دیتے تھے۔ پھر ان میں سے ایک باہر چلا گیا' دوسرا مرگیا۔ ان کی جگہ نئے لوگ آگئے۔ پُرانے خاموش رہے کیونکہ شاہ عالم کے پاس ان کے خلاف دستاویزی ثبوت تھے۔ وہ غبن اور خیانتِ مجرمانہ کے مرتکب سمجھے جاسکتے تھے۔ شاہ عالم کے نزدیک وفاداری کی کوئی قدروقیمت نہیں تھی۔ جو پُرانا ساتھی ہونے کے بعد اہمیت حاصل کرنے لگتا تھا۔ اسے شاہ عالم کسی نہ کسی بہانے الگ کردیتا تھا یا اس کے لیے ایسے حالات پیدا کردیتا تھا کہ وہ شاہ عالم کا ساتھ چھوڑ جائے۔ جب شاہ عالم سیاست میں آیا تب بھی اس کا یہی انداز رہا۔ پُرانے ساتھی زیادہ عرصہ اس کے ساتھ نہیں چل پاتے تھے۔ ان کو کبھی پُرانی وابستگی کی بنا پر عزت اور اہمیت حاصل نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ پیچھے رہنے والے ادنیٰ کارکن سمجھے جاتے تھے۔ ان کے خلوص اور ان کی قربانی کو نظرانداز کیا جاتا تھا۔ ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچانے کے لیے جانتے بوجھتے نئے آنے والوں کی زیادہ آؤ بھگت ہوتی تھی۔ گو یہ بھی چند روزہ ہی چلتی تھی۔ مگر اس سے پُرانے کارکن بددل ہوتے تھے۔ اگر وہ شاہ عالم سے گلہ کرتے تھے تو الٹا شرمندہ ہوتے تھے کہ وہ کم ظرف ہیں اور اپنی پارٹی کے لیے خدمت کو احسان شمار کرتے ہیں۔ شاہ عالم صاف کہتا ہے کہ میری وجہ سے تم ہو۔ تمہاری وجہ سے میں نہیں۔ اس کا یہ رویّہ برقرار ہے۔ آج پرانے کارکنوں میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں۔ وہ جیسے جیسے طاقت حاصل کررہا ہے اس کے گرد مفاد پرست خوشامدی اکٹھے ہورہے ہیں جو اس کے ساتھ ذرا بھی مخلص نہیں ہیں۔ شاہ عالم کسی کی نہیں سُنتا۔ وہ ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر ہے۔ اب تو سب ہی اس سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس کے مراسم انڈر ورلڈ کے لوگوں سے ہیں اور خود پولیس کے بدنام عناصر اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ پارٹی کے سینئر عہدے دار بھی اس کے حکم کے غلام ہیں جو اس کے خلاف بات کرے یا بغاوت پر آمادہ ہو اسے بلیک میل کیا جاتا ہے۔ وہ کسی پولیس کیس میں ملوث ہوجاتا ہے یا اس کے گھر والے مشکل میں پڑجاتے ہیں لیکن یہ سب باتیں عام لوگوں کے علم میں نہیں۔ پبلک میں شاہ عالم کا امیج اس کے برعکس ہے۔ تم خود سوچو کہ اگر ایسے شخص کے ہاتھ میں اس ملک کی باگ ڈور آگئی اور اسے اقتدار کی طاقت مل گئی تو کیا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہی ہوگا جو اس ملک میں عوام کے ساتھ آج تک ہوتا آیا ہے۔ ہر لیڈر حکمراں ٹولے کو چور کہتا ہے اور احتساب کے نعرے لگاتا ہے مگر برسرِاقتدار آکے خود ڈاکو ثابت ہوتا ہے۔ احتساب سے اجتناب کرتا ہے بلکہ جو اس کی بات بھی کرے اس کا خانہ خراب کردیتا ہے۔"

"آخر ایسا کب تک ہوگا؟"

"یہ مکافاتِ عمل ہے۔ خدا نے بہت پہلے خبردار کردیا تھا کہ جب کسی قوم کے اعمال بگڑتے ہیں تو ہم اس پر ظالم حکمران مسلط کردیتے ہیں۔"

وہ مایوس نظر آنے لگا۔ "کیا اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ

تم انکار کر رہے ہو۔"

"اس کا دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے دوسرے مہرے کی جگہ استعمال کرنا چاہتے ہو۔ تم نے شاہ عالم سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آرہی ہیں تو تم میرا سہارا لینا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ فعل انتقامی ہے۔ جو کام نیک نیتی سے نہ کیا جائے اس کے نتائج اچھے نہیں ہو سکتے۔"

اس نے احتجاج کیا "تم نے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے۔ میں ہرگز تمہارا سہارا نہیں لے رہا ہوں۔ میں تم کو ایک موقع فراہم کر رہا ہوں۔ یہ احساس دلا رہا ہوں کہ تم اگر چاہو تو شاہ عالم بن سکتے ہو۔ اس لیے کہ صرف تم ہی اس کے اہل ہو۔ کروڑوں کی آبادی میں خوش قسمتی کی یہ لاٹری تمہارے نام نکلی ہے۔ مگر اس میں فائدہ صرف تمہارا ہی نہیں' سب کا ہے' پوری قوم کا سارے ملک کا ہے۔ کیونکہ ایک سا ظاہر رکھنے کے باوجود تم میں اور شاہ عالم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باطنی صفات کے اعتبار سے وہ شیطان ہے تو تم فرشتہ ہو۔"

میں نے بدمزگی سے کہا "کوئی انسان فرشتہ نہیں ہوتا مسٹر تیمور! یہ خوشامد اور چاپلوسی لاحاصل ہے۔ تم لفاظی سے کام لے رہے ہو۔ مجھے تو شک ہے کہ شاہ عالم کے معاملے میں بھی تمہاری رائے مبالغہ آمیز اور مخالف جذبات کی عکاسی کرتی ہے کیونکہ میرے بارے میں کچھ جانے بغیر ہی تم نے انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں اندر سے کیا ہوں۔ تم مجھے کتنا جانتے ہو؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "بہت اچھی طرح۔ اتنی اچھی طرح کہ تمہارے انکار کے باوجود میں اپنی رائے نہیں بدلوں گا۔ کم سے کم چھ مہینے سے میں تم کو بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ خود سامنے آئے بغیر تمہارے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "تمہاری حاصل کردہ معلومات نامکمل اور غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ اپنے بارے میں خود مجھے ابھی تک ہر بات معلوم نہیں۔"

"ہاں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تم اپنی شناخت کے مسئلے میں اُلجھے ہوئے ہو۔ تمہیں علم نہیں کہ تمہارے والدین کون تھے؟ ماں کون تھی اور باپ کا نام کیا تھا؟ تم کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟ تمہارے ساتھ خون کا رشتہ رکھنے والے دوسرے لوگ کون تھے؟ دادا دادی' چچا اور ماموں' بہن بھائی۔ تم کسی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ تمہارا ماضی ایک بے نام خلا ہے جس میں تم اکیلے بھٹک رہے ہو۔ آخر کیوں؟ کیا حاصل ہوگا تمہیں اس سے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ناصر عظیم! یہ رشتے ناتے' سب لاحاصل جذبات کا کھیل ہیں۔ آدمی دنیا میں اکیلا آتا ہے۔ اکیلا جیتا ہے یہاں اور پھر وہاں اکیلا ہی جاتا ہے" اس نے اوپر انگلی اُٹھائی۔

"رشتوں سے ہی انسان کی پہچان ہے۔"

وہ ہنس پڑا "شجرۂ نسب چاہیے نا تمہیں۔ ناز کرنے کے لیے؟ پدرم سلطان بود۔ میرے پرنانا حضور' خان بہادر فلاں فلاں.... جدی پشتی رئیس اور نواب ابنِ نواب۔ چوتھی پشت میں ان کے مورثِ اعلیٰ مغل تاجدارِ ہند بہادر شاہ ظفر۔ نانا مرحوم انگریز کے تعلقہ دار۔ پر دادا جان خان صاحب فلاں فلاں۔ دہلی دربار کے جاگیرو خلعت یافتہ۔ والد ڈپٹی کلکٹر۔ خالی جگہ پر نام اور مقامات بھر لوں تو میں امیر تیمور.. کیا بہت معزز اور معتبر ہو جاؤں گا یا میں جسے چاہوں بڑی متاثر کرنے والی خاندانی تاریخ سُنا سکتا ہوں۔ مگر اس سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ مر کھپ گئے وہ لوگ اور ان کے نام بھی آج کوئی نہیں جانتا۔ نہ جاننا چاہتا ہے۔ اصل اور اہم وہ ہے جو آج میں ہوں۔ میرا باپ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں اپنا مذہب بدل کے عیسائی ہو گیا تھا۔ ماں دو بچے چھوڑ کے لاہور بھاگ گئی تھی' ہیروئن بننے کے لیے۔ میرے بھائی شاید آج بھی وزیر آباد کی سڑکوں پر جھاڑو دیتے ہوں گے اور میری کوئی بہن ہوگی تو لاہور کے شاہی محلّے میں یا کہیں بھیک مانگ رہی ہوگی' میرے چاچے مامے' جہنم میں گئے سب۔ کیونکہ آج میں امیر تیمور ہوں۔ میرے بیک گراؤنڈ سے کسی کو سروکار نہیں۔ کوئی پوچھے تو میں خود کو پوچھنے والے کے مقابلے میں بڑا عالی نسب ثابت کر دیتا ہوں۔ کرے تحقیق جس کا جی چاہے۔ میرے حوالوں کی سند ہے میری کار اور میری کوٹھی۔"

میں نے کہا "تم پر نشہ غالب آرہا ہے۔"

"نشہ کیا ہوتا ہے" وہ ہنسا "میں تم کو بتا چکا ہوں۔ شراب کے نشے سے کون مغلوب ہوتا ہے۔ اور ہوتا ہے تو کچھ دیر کے لیے۔ مگر جس نشے کی میں بات کر رہا تھا ناصر عظیم' وہ کبھی نہیں اترتا۔ اقتدار تمہاری خواہش ہے اور زندگی کی سب سے بڑی تمنا۔ آج سے نہیں' بہت پہلے سے۔ یہ تمہارا خواب تھا اور ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس لیے کہ اقتدار اور اختیار کی آرزو ایک فطری سی بات ہے۔ یہ ہر شخص کے دل میں رہتی ہے۔ جو اس خواہش کو زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوس میں اور ہوس کی بے چینی سودائے سر میں اور جنون میں ڈھل جاتی ہے۔ جو خواب کی تعبیر کے لیے سب کچھ لُٹا دینے کے لیے تیار رہوں' انہیں تعبیر مل جاتی ہے۔ کیا تم اپنے خواب سے دستبردار ہو گئے ہو؟ اگر نہیں تو پھر تعبیر سے کیسے انکار کر سکتے ہو ناصر عظیم!"

میں نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ میرے وجود میں جلنے والی خواہش کی آگ محض ایک چنگاری ہو جو کبھی شعلہ نہ بنے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم ایک ضدی اور مستقل مزاج'

کبھی اپنی شکست تسلیم نہ کرنے والے آدمی ہو۔ تم نے صفر سے شروع کیا لیکن آج تمہیں اپنے سامنے ہر شخص اور ہر چیلنج صفر محسوس ہوتا ہے۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو' تم یہ ثابت کر چکے ہو۔"

میں نے کہا "مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ جب آدمی یہ سمجھنے لگے کہ میں ہر کام کر سکتا ہوں تو پھر اس کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے کیونکہ سب کچھ تو صرف خدا کر سکتا ہے۔ تمہیں مایوسی ہوگی۔"

"پھر بھی میں یہ چاہوں گا کہ تم میرا ساتھ دو۔ تم اور میں... ہم مل کے حکومت کا سارا اختیار اپنے قبضے میں کر سکتے ہیں۔ اکیلے تم بھی کچھ نہیں' میں بھی صفر۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ تم شاہ عالم بن سکتے ہو کیونکہ تم.... شاہ عالم ہو۔"

میں نے کہا "اور اگر میں بھی بعد میں ویسا ہی شاہ عالم بن گیا... جیسا کہ شاہ عالم ہے....؟"

"نہیں۔ گدھا کبھی گھوڑا نہیں بن سکتا اور گھوڑا کبھی گدھا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو۔ سیاست کی کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی۔ انقلاب کا شکار سب سے پہلے وہ ہوتے ہیں جو انقلاب لاتے ہیں۔ اسکندر مرزا صدر تھا۔ اس نے ایوب خان کو مارشل لا لگانے کا اختیار دیا۔ چند روز دن ایوب خان وزیر اعظم رہا پھر اس نے صاحبِ صدر کی چھٹی کر دی۔ خود صدر بن گیا۔ پھر اس نے اپنا ساتھ دینے والے تین جرنلوں کی چھٹی کی۔"

"اگر تم بھی محسن کش ثابت ہوئے تو میں اس بدقسمتی کا گلہ نہ تم سے کروں گا نہ اپنی تقدیر سے۔ میری طرح اپنا ایک شاندار ماضی بنالو۔ آزادی کے لیے تم نے کتنی قربانی دی تھی۔ سارا خاندان قربان کر دیا تھا۔ تم بچپن.... نہیں' تمہارے والد بچپن میں سائیکل پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگا کے پھرتے تھے۔ سو میل سائیکل چلا کے لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے گئے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی قائداعظم کے حوالے کر دی تھی۔ اپنی خاندانی حویلی رہن رکھ کے۔ زرعی اراضی بیچ کے مسلم لیگ کے فنڈ میں یہ ساری رقم جمع کرا دی تھی۔ اب کون گواہ ہے اور کون تردید کر سکتا ہے۔ بیک گراؤنڈ کی مرمت کرو ناصر عظیم۔ میں تم کو ایک معتبر' قابلِ تعظیم اور قابلِ فخر ماضی کا مالک بنا دوں گا۔ سارے رشتوں اور حوالوں سے تم معتبر ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "اس جھوٹ سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔"

اس نے کہا "سب کچھ' سب کچھ حاصل ہو جائے گا تمہیں ناصر عظیم!"

"میں اپنے آپ کو دھوکا کیسے دے سکتا ہوں.... میرا باپ تو یقیناً کوئی غریب آدمی ہوگا۔ میری ماں کوئی معمولی عورت' میں کسی نواب یا جاگیردار خاندان سے ہوتا تو کسی حویلی میں یا کسی کانونٹ کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا۔ میں نے تو ایک یتیم خانے میں ہوش سنبھالا تھا۔"

اس نے کہا "پھر کیا ہوا۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ نواب زادے اور پیرزادے۔ جاگیردار اور سرمایہ دار سخت قابلِ نفرت ہو گئے ہیں۔ اللہ بھلا کرے افسانہ بنانے والوں کا۔ ٹی وی کے ڈراموں اور سیاسی لیڈروں نے انہیں شیطان بنا دیا ہے جو کاشتکار اور مزدور کا خون چوستے ہیں۔ اس کی بیٹی اور بیوی کو اُٹھانا اپنا موروثی حق سمجھتے ہیں۔ فریاد کرنے والے کی کھال اتار کے اس کے جوتے بنوا لیتے ہیں اور اپنی رعایا کے منہ پر مارتے ہیں۔ وہ شرابی عیاش اور بدکردار ہوتے ہیں۔ اس لیے بڑی اچھی بات ہے کہ تم ان میں سے نہیں ہو۔ تم سینہ تان کے کہہ سکتے ہو کہ تم عام آدمی ہو جو غربت اور افلاس کی چکی میں دن رات پستے ہیں۔ غریب کے دکھ درد کو تم ہی سمجھ سکتے ہو۔ یہ باتیں وہی ہیں جو شاہ عالم اپنی تقریروں میں دُہراتا رہا ہے۔ اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے کہ صرف صورت شکل کے اعتبار سے ہی نہیں' تجربات کے حوالے سے بھی تم شاہ عالم ہو۔"

میں نے چلّا کے کہا "شٹ اپ امیر تیمور! میں ناصر عظیم ہوں... اور ناصر عظیم ہی رہوں گا۔ نہیں بننا مجھے جعلی شاہ عالم..."

"پھر وہی بات۔ میں بتا چکا ہوں کہ جب اصلی شاہ عالم نہیں ہوگا تو پھر تم ہی اصلی بن جاؤ گے اور تسلیم کیے جاؤ گے سال بھر بعد۔"

"تم پاگل ہو یا مجھے پاگل سمجھتے ہو۔ کیا شاہ عالم کو ایک سال تک پتا نہیں چلے گا' اسے معلوم نہیں ہوگا میرے بارے میں..." میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اسے تو معلوم ہوگا۔ یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ اسے معلوم نہیں ہوگا۔ یار' اسی نے تو بلوایا ہے تمہیں۔"

میں ایک دم بیٹھ گیا اور تیمور کو گھورنے لگا "مجھے شاہ عالم نے بُلایا ہے۔ اس لیے کہ میں اس کی جگہ لے لوں؟"

تیمور نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم اس کے ڈبل کا رول کر سکتے ہو۔ یہ ایک بہت بڑی قومی خدمت ہوگی لیکن شاہ عالم پر اس سے بڑا احسان ہوگا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں تم کو قائل کروں اور آمادہ کروں کہ تم اس سے ملو۔ وہ تم سے بہت بڑا کام لینا چاہتا ہے اور اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ منہ مانگی قیمت جو تمہارے تصور سے بھی کہیں بڑھ کے..."

غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا "دوسرے وہ مجھے خریدنا چاہتا ہے۔ میری زندگی چاہیے اسے... اپنا ڈپلی کیٹ بنا کے رکھنے کے لیے۔ تاکہ کبھی بُرا وقت آئے تو گولی میرے دل میں اُترے۔ دہشت گرد قاتل کا خنجر میرے سینے میں پیوست ہو۔ اس کی موت مجھے ملے اور میری زندگی اسے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں مان جاؤں گا؟"

"ہاں" تیمور نے سادگی سے کہا "شاہ عالم کو انکار کون کر سکتا

ہے۔ تم بھی انکار نہیں کرو گے۔"

میں نے سکون سے کہا "اس کو بتا دینا امیر تیمور! کہ میں نے انکار کر دیا ہے۔ دو ٹوک اور واضح الفاظ میں میرا یہی جواب ہے۔ اسے بھی اور تمہیں بھی۔ ڈنر کے لیے شکریہ۔ مجھے اُمید ہے کہ تم دوبارہ مجھ سے رابطے کی حماقت یا جسارت نہیں کرو گے۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "اب تم سے پاکستان میں ملاقات ہوگی ناصر عظیم بہت جلد... وہ تمہیں بُلائے گا۔"

میں نے پُرعزم جارحانہ لہجے میں کہا "کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں... میں نہیں آؤں گا۔ وہ لاکھ بار کہے۔"

"وہ ایک ہی بار کہے گا۔ تم آؤ گے' نہیں تو... خیر جانے دو۔ تمہارا غصہ اُترے گا تو تم خود ہی سمجھ لو گے۔ آخر تم بزنس مین ہو۔ ضد میں گھاٹے کا سودا نہیں کر سکتے۔"

اس کے لہجے اور الفاظ میں میرے لیے کُھلی دھمکی تھی' چیلنج نہیں تھا۔ چیلنج میں جبر کا پہلو نہیں ہوتا' اختیار کی بات ہوتی ہے۔ دھمکی تیمور کا آخری حربہ تھی۔ اس سے پہلے تیمور نے عقل کے دلائل سے میرے جذبات سے کھیل کر لالچ سے' خوشامد سے اور حیلوں حوالوں سے مجھے قائل کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ ناکام رہا تھا مگر نااُمید نہیں تھا۔ شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنا خوف زدہ کرنے والا اور مشکل ہے۔ کسی کو میٹرک کے امتحان میں دوسرے کی جگہ امتحان دینے پر رضامند کرنا ہی ناممکن لگتا ہے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ بڑا اور خطرناک کام تھا۔ قصے کہانیوں کی بات اور ہے کہ لاولد بادشاہ مرگیا تو صبح شہر پناہ کی فصیل کے کسی دروازے سے داخل ہونے والے پہلے شخص کو پکڑ کے تخت پر بٹھا دیا کہ آج سے تم فقیر نہیں شاہ ہو اور فقیر بھی مجبوراً تخت پر بیٹھ گیا کہ چلو سب کہہ رہے ہیں تو مان لیتے ہیں۔ آخر کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بھیک مانگنے سے تو آسان کام ہے بادشاہت کرنا مگر امیر تیمور کے سازشی منصوبے کے مضمرات اور اس کھیل میں شامل ہونے کے خطرات کا تصور کر کے ہی میرا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر میری شکل وصورت' انداز وعادات اور آواز یا لہجہ پرنس چارلس سے مل جاتا اور خود برطانوی سیکرٹ سروس کا چیف مجھے آ کر کہتا کہ چلو تمہیں برطانیہ کا ولی عہد بنا دیتے ہیں اور پہنچا دیتے ہیں پرنسس ڈائنا کے بیڈ روم میں۔ تو کیا میں مرنے چلا جاتا۔ ڈیانا لاکھ حسین مہ جبین سہی... اگر کوئی بے روزگار خودکشی کر کے جان دینے پر آمادہ ہو اور اسے کوئی کہے کہ یار' مرتے کیوں ہو۔ تمہاری صورت شکل' آواز سب فلاں تاجر یا صنعت کار سے ملتی ہے جو اغوا ہونے کے بعد سال بھر سے غائب ہے۔ تم چلو اس کی جگہ۔ تو وہ ہاتھ جوڑ کے کہے گا کہ تھینک یو' میں اللہ میاں کے پاس جانا چاہتا ہوں' جیل نہیں۔

رات بھر میں امیر تیمور کی بات پر غور کرتا رہا۔ اس صورت حال کے ناممکن اور ناقابلِ عمل ہونے کے حق میں ہزاروں نہیں لاکھوں دلائل تھے۔

صرف ایک دلیل ان سب پر بھاری تھی۔ میں واقعی اس ملک کا وزیر اعظم یا صدر بننا چاہتا تھا۔

قسمت نے یا ایک اَن دیکھے ہاتھ نے میرے سامنے پرائم منسٹر ہاؤس یا ایوانِ صدارت میں داخل ہونے کا چور دروازہ کھول دیا تھا۔ تمام خدشات اور خطرات کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دیوانے کا خواب ہے یا خواب کی دیوانگی۔ یہ زندگی اور موت کا جُوا ہے جس میں ہار کے امکانات واضح اور جیت کے انتہائی مبہم ہیں۔

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ میرے لیے ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کا اور اپنے بچپن کے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ یا طریقہ ہی نہیں۔ سیدھے راستے سے اقتدار کی منزل تک میں کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے مجھے شاید ایک اور عمر بھی ناکافی ہو۔ لاکھوں نہیں کروڑوں میں سے ایک اس راستے پر چل کے منزل تک پہنچتا ہے اور اس کامیابی میں بھی صلاحیت کے ساتھ قسمت کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ مجھ میں نہ یہ صلاحیت تھی اور نہ مجھے اپنی قسمت پر اتنا ناز ہو سکتا تھا۔ یہ تو علی بابا اور چالیس چوروں کی کہانی میں خزانے والے غار میں داخل ہونے کا راستہ ہے جو اتفاق سے مجھے معلوم ہو گیا ہے۔

پھر میں کیا کروں؟ دروازے سے کہوں۔ کُھل جا سم سم۔ اور نتائج کی پروا کیے بغیر اندر داخل ہو جاؤں۔ نو رسک نو گیم۔ تخت یا تختہ۔ انتخاب کا حق اگر مجھے دیا گیا ہے تو...!

اس رات میں جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ تیمور نے یہ بات کسی اور سے کی ہوتی تو وہ ذرا بھی ذہنی انتشار میں مبتلا نہ ہوتا۔ وہ سمجھتا کہ تیمور نشے میں بول رہا تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ چلو میں تم کو صدر امریکا بنوا دیتا ہوں۔ مجھ سے بکنگھم پیلس خریدنا چاہتے ہو تو لاؤ بیعانہ دو۔ جہانگیر کا مقبرہ کرائے پر رہائش کے لیے چاہیے تو دستخط کرو کرایہ نامہ پر۔ کسی مضحکہ خیز احمقانہ اور بے سروپا بات پر ہنس کے خاموش ہو جانے کے بعد اسے بھول جانے کے سوا کچھ کرنا بھی نہیں چاہیے۔

لیکن میرا معاملہ مختلف تھا۔ سب سے اہم اور قابلِ غور میری شخصیت تھی۔ میرا ایک ہم شکل ایوانِ اقتدار تک پہنچنے والی سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا ہوا مجھے بُلا رہا تھا۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ اوپر اس کے پاس جا کے اسے نیچے گرا دوں۔ موت کے اندھے تاریک اور بے نشان غار میں۔ کسی رات کے اندھیرے میں محلاتی سازش کا ایک اور خونی باب لکھا جائے لیکن تاریخ کا دھارا بدستور بہتا رہے۔ ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ صبح کے اُجالے کے ساتھ میں اگلا قدم بڑھا کے اقتدار کی مسند پر ایسے رونق افروز نظر آؤں جیسے یہ میرا موروثی حق تھا اور اس اقتدار کو تسلیم کرنے والے سر

بھی روایتی انداز میں جھک جائیں۔ کسی شک وشبے کے بغیر۔ ہاتھ سلام کے لیے اُٹھ جائیں۔ پھر کس کی مجال ہے جو نظر اٹھا کے کہ یہ جعلساز ہے۔ یہ شاہ عالم نہیں ہے۔ یہ ناصر عظیم ہے۔ اس گستاخ کی زبان بند کرنے اور اس کی دھوکا دینے والی آنکھیں نکالنے کا فرمان بھی میرے اشارے پر جاری ہوگا اور اس پر عمل درآمد بھی ہوگا۔ امیر تیمور یا کوئی اور لاکھ چیخے چلّائے۔ دنیا کو جھوٹ اور سچ کا فرق بتانے کی کوشش کرے۔ پریس کانفرنس کرے یا سپریم کورٹ میں رٹ دائر کرے۔ وہ کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں جب کہ ساری دنیا اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہو۔ اگر سورج کو چاند یا چاند کو سورج ثابت کرنے کی کوشش کرے تو پینچے کا سیدھا پاگل خانے۔

امیر تیمور یہ پیش کش کسی اور کو نہیں کر سکتا۔ میں نے اس خیال میں بڑی عجیب سی کشش محسوس کی۔ میں اور صرف میں ہوں پورے پاکستان میں یا شاید پوری دنیا میں جو شاہ عالم بن سکتا ہوں۔ کسی میک اَپ کے بغیر۔ اس کا ہم زاد یا جڑواں بھائی نہ ہونے کے باوجود۔ یہ اتفاق پہلی بار نہیں ہوا۔ ایسی مثالیں دنیا میں بارہا سامنے آئیں جب دو اجنبی آمنے سامنے ہوئے تو دونوں کو ایسا لگا کہ مقابل ہے آئینہ۔

آہستہ آہستہ میرا دل اس خطرناک مگر دلچسپ اور سنسنی خیز کھیل کی دعوت کو قبول کرنے کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ انکار کی اور مزاحمت کی قوت کمزور پڑنے لگی تھی۔ ناممکن نظر آنے کے باوجود یہ ممکن ہے۔ میں نے سوچا' ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنا بھی ناممکن نظر آتا تھا مگر ایک شخص کی نظر نے اسے دیکھا اور تسخیر کر لیا۔ چاند پر پہنچنا بھی ناممکن تھا مگر نیل آرمسٹرانگ اس دنیا سے گیا اور چاند کی مٹی لے کر واپس اپنی زمین پر آ گیا۔ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کس نے کہا تھا۔ کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ ناممکن کا لفظ میری ڈکشنری سے نکال دو۔

میں نے ہوٹل کے ڈاکٹر کو فون کیا "مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"کیا بات ہے۔ زیادہ کھا گئے تھے ڈنر میں یا طبیعت خراب ہے؟"

"دونوں میں سے کوئی بات نہیں' میرے خیالات مجھے سونے نہیں دیتے۔"

ڈاکٹر ہنسا "کیا آج کسی سے اچانک عشق ہو گیا ہے؟"

"نہیں۔ یہ کاروباری یا جذباتی پریشانی نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی۔ پاکستان میں مجھے آسانی سے سکون آور گولی مل جاتی تھی۔ یہاں نہیں ملتی اس لیے تم سے درخواست کرنی پڑ رہی ہے۔"

"آئی سی۔ وہاں تم کیا کھاتے تھے۔ جس کے تم عادی ہو؟"

"LEXOTANIL"

"میں تمہیں ایک گولی بھیج رہا ہوں۔"

"وہ بھیج دو۔ اس میں کوئی رسک نہیں ہے" میں نے کہا۔

"او کے' او کے" اس نے ناگواری سے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا تھا اور اپنے ADDICT ہونے کا الزام بھی قبول کر لیا تھا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ باہر کسی ملک میں کوئی سکون آور دوا یا اینٹی بایوٹک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسپرین کی گولی تک کاؤنٹر سیل کے لیے دستیاب نہیں۔ اس کے لیے ڈاکٹر کا نسخہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر کی سستی یا مہربانی تھی کہ اس نے آدھی رات کے وقت میرا معائنہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اور مان لیا کہ ایسے دو دو گولیاں اکٹھی کھا کے میں نہ خودکشی کے کسی منصوبے پر عمل کر رہا ہوں اور نہ قتل کے۔

میں نے ایک گولی کھائی اور آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔ نیند لانے کے تمام پُرانے طریقے فیل ہو گئے تھے۔ شیطانی خیالات سے نجات پانے کے لیے میں لاحول کا ورد کر چکا تھا۔ آیت الکرسی پڑھ کے خود پر تین بار پھونک چکا تھا۔ پھر میں نے انگریزوں کے طریقے کو آزمایا۔ اندھیرے میں فرض کیا کہ بہت سی بھیڑیں ہیں۔ ایک بھیڑ آتی ہے اور چھلانگ لگا کے چھوٹی سی رکاوٹ عبور کر جاتی ہے۔ پھر دوسری بھیڑ' تیسری بھیڑ' چار بھیڑیں' پانچ... کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ بھیڑیں نہ جانے کہاں ہیں۔ میں امیر تیمور کی آواز سُن رہا ہوں۔ "تم بھی انکار نہیں کرو گے' تم آؤ گے نہیں تو... خیر جانے دو۔ تم بزنس مین ہو' گھاٹے کا سودا نہیں کر سکتے۔"

رات کے آخری پہر میری آنکھ لگی۔ سوتے جاگتے کی کیفیت میں مجھے ایک پُرانا خواب نظر آیا۔ وہی خواب جس میں میرا باپ ایک پہاڑ کی چوٹی پر سنگِ اسود کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ تھاما اور دوسرے سے میری ماں کا۔ پھر ہم تینوں خلا میں پرواز کرنے لگے' زمین کی طرف۔ آدم اور حوّا کو آسمان سے زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔

گناہِ آدم کی پاداش میں اسے عرش کی بلندی سے فرش کی پستی عطا ہوئی۔ مگر میں... اولادِ آدم' اس خواب سے کیوں ڈرایا جاتا ہوں؟

دوسری گولی میں نے تین بجے کھائی اور پھر سو گیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی خواب آور یا سکون بخش گولی کھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نیند کا نہ آنا کبھی مجھے پریشان نہیں کرتا تھا۔ میں جاگتے ہوئے کتاب پڑھتا تھا یا کوئی فلم لگا لیتا تھا۔ گھومنے نکل جاتا تھا لیکن آج میں رات سے اور تنہائی میں ذہن پر یلغار کرنے والے خیالوں سے خائف تھا۔

دوسری گولی نے اچھا اثر دکھایا۔ میں نو بجے تک سکون سے سوتا رہا۔ یہ نیند بھی بے خواب نہیں تھی۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنا خواب یاد آیا اور مجھے ایسا لگا جیسے جاگنے سے پہلے میں خواب ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ہال تھا' بوسیدہ دیواروں اور نیچی چھت والا۔ اس کے کونوں میں مکڑی کے میلے جالے جھولتے تھے۔

دیواروں پر رنگ اوپر ہی نظر آتا تھا۔ نیچے جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ قلیٹ بدبودار بستر بچھے ہوئے تھے۔ برسوں پرانا پیلا درزرد رنگ بدنما داغوں سے بھر گیا تھا۔ میل کے اور تیل کے داغ۔ مسور کی دال اور آلو گوشت کے شوربے میں لتھڑی انگلیوں کے داغ۔ روشنائی کے داغ اور مرہم کے داغ۔ برنال کا پیلا رنگ جو کسی کے جل جانے والے یا جلائے جانے والے ہاتھ پر لگائی جاتی تھی۔ ٹنکچر آیوڈین کا سرخ رنگ جو کسی زخم پر لگائی جاتی تھی۔ اور لہو کا رنگ جو کسی زخم سے رس کر دیوار پر لکیر سی چھوڑ جاتا تھا۔ پیپ کا رنگ جو کسی پھوڑے کے پھوٹنے سے بہتی تھی۔

بستروں کے عین اوپر سرہانے کی طرف ایک قطار میں کھڑکیاں تھیں۔ بے رنگ' بدصورت کھڑکیاں جن کے ٹوٹے شیشوں کی جگہ کچھ بھی لگا دیا جاتا تھا۔ اخبار' گتہ' ٹین۔ یا کچھ بھی نہیں لگایا جاتا تھا تو اس میں رات کا تاریک شگاف ہوجاتا تھا۔ ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی تک آٹھ بستروں کا فاصلہ مقرر تھا۔ آخری کھڑکی کے بالکل نیچے میں تھا اور وہ۔ فرید یا رشید' جس کو شفقت سے یزید پلید کہہ کے بلایا جاتا ہوگا۔ پھر دائیں طرف رئیس تھا۔ خبیث' فقیر کی اولاد' اور بائیں جانب بھی ایسے ہی القاب والا جلیل عرف ذلیل۔ اصل ناموں سے زیادہ ان سب کے خطابات استعمال ہوتے تھے۔

خبیث رو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں درد تھا جس کی وجہ سے وہ سو نہیں سکتا تھا۔ اس نے کرائے کی سائیکل ہاتھ چھوڑ کے چلائی تھی اور سب کو حیران کردیا تھا۔ پھر اس نے دونوں ٹانگیں اوپر اُٹھا کر سائیکل کے ہینڈل پر رکھ لی تھیں اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح یک چشم صوفی غلام علی میں گھس گیا تھا۔ صوفی غلام علی کے بہت سے نام تھے۔ رنجیت سنگھ' کانا دجال' ایک آنکھ والا جن۔ اس کی بید ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک بید ٹوٹ جاتی تھی تو وہ دوسری زیادہ اہتمام سے خرید کر لاتا تھا اور پھر سب کے سامنے اس کی وہ صفات بیان کرتا تھا جن کی بنا پر وہ سابقہ بید سے بہتر تھی۔ اسے وہ تیل پلاتا تھا اور مولا بخش کی گھروالی کہتا تھا۔ "بھئی بڑی کڑک اور ظالم چیز ہے یہ مولا بخش کی گھروالی۔ اس کے سامنے مولا بخش کیا ہے۔" وہ بید کو شائیں شائیں لہراتا "میں خود تو بڑا رحم دل ہوں لیکن یہ بڑی ظالم ہے۔"

مولا بخش کی گھروالی نے خبیث کی ٹانگوں پر کالے کالے نشان ڈال دیے۔ یہ گہرے زخم تھے جو خون جم جانے سے کالے نظر آتے تھے۔ خبیث کی ٹانگوں پر سے کھال اُترگئی تھی۔ ان ٹانگوں سے وہ سائیکل چلا رہا تھا اور کمال کے کرتب دکھا رہا تھا مگر وقت آیا تو وہ انہی ٹانگوں پر بھاگ بھی نہ سکا۔ یک چشم صوفی کرتے ہی اُٹھا اور اس نے دو تنومند' طاقتور بدمعاش قسم کے لڑکوں کو حکم دیا کہ خبیث کو پکڑلو۔ پھر وہ بید لے کر خبیث کی ٹانگوں پر پل پڑا۔ "رئیس زادے۔۔۔ فقیر کی حرامی اولاد۔ خبیث الدہر۔ اندھے کے۔۔۔ ٹانگیں چلاتا ہے' زبان چلاتا ہے۔۔۔ سائیکل چلاتا ہے۔ کہاں سے لایا کرائے۔۔۔ کی۔۔۔ سائیکل۔۔۔۔ پیسے۔۔۔۔ کہاں۔۔۔ سے۔۔۔۔

چُرائے۔۔۔ بول۔۔۔ بول۔۔۔ بول۔۔۔"

خبیث اچھلتا رہا' چیختا رہا اور ٹانگیں چلاتا رہا مگر مولا بخش کی گھروالی بڑی ظالم اور سخت چیز تھی۔

خبیث اونچی آواز میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ یزید پلید اسے سمجھا رہا تھا۔ تسلی دے رہا تھا۔ کل تک ٹھیک ہوجائے گا تو۔

میں نے کہا "بند کر اپنا رونا۔ مجھے سونا ہے۔"

"اس کی جگہ تو ہوتا۔۔۔ پھر!" ذلیل نے مجھے ملامت کی۔

"میں بھاگ جاتا۔ اس کھڑکی کے راستے" میں نے کہا۔

"ان ٹانگوں پر رئیس کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔"

میں نے کہا "میں کانے دجال کی دوسری آنکھ پھوڑ دیتا۔ اسی بید سے جو ٹوٹ گئی تھی۔"

خبیث نے روتے ہوئے کہا "خُدا اسے قتل کردے۔ چُھری سے اس کا گلا کاٹ دے۔ تُو نے کہا تھا۔"

میں نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا "کاٹ دوں گا۔ جلدی کیا ہے؟ تُو نے بھی کہا تھا کہ میں بھاگ جاؤں گا اور کسی سرکس میں کام کروں گا۔"

ذلیل اپنے آپ سے بولا "کہا تو میں نے بھی تھا۔۔۔ میں ماسٹر بنوں گا لیکن میں مولا بخش کو ساتھ نہیں رکھوں گا۔ نہ مولا بخش کی گھروالی کو۔ میں بچوں کو پیار سے بُلاؤں گا۔ جلیل بیٹا' ذرا مجھے یہ پڑھ کر سُنا دیجئے۔ اور آپ کیا کر رہے ہیں بیٹا رئیس۔۔۔ اچھے بچے بنئے' آرام سے بیٹھئے۔"

رئیس تکلیف بھول گیا "ایسے ماسٹر کہاں ہوتے ہیں؟"

یزید پلید نے کہا "میں تو ڈاکٹر بنوں گا۔ ویسا ہی جیسا اس مہینے آیا تھا۔ عینک والا۔ گورا چٹا۔"

"مگر تُو کالا ہے۔"

"میں گورا ہوجاؤں گا۔ میں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تھا۔ رنگ گورا کرنے والی کریم کا۔"

"تُو کیوں مرا پڑا ہے۔ تُو کیا بنے گا۔" یزید نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے بے نیازی سے کہا "وزیراعظم۔۔۔ تم جانتے ہو' پھر کیوں پوچھتے ہو۔"

وہ سب ہنسنے لگے۔ خبیث کے سوا سب "وزیراعظم کیا ہوتا ہے؟" خبیث نے کراہ کے کہا۔

"پاکستان کا سب سے بڑا افسر۔ وہ خزانے کا مالک ہوتا ہے۔ بندوق رکھتا ہے اور سب کچھ کرسکتا ہے۔ پولیس والا بھی اسے سلام کرتا ہے۔ جب وہ سڑک پر سے گاڑی میں گزرتا ہے تو اور کوئی نہیں گزر سکتا۔ وہ محل میں رہتا ہے۔ دس کاریں ہوتی ہیں اس کے پاس۔"

"دس کاریں!" ذلیل ہنس پڑا "وہ سب میں کیسے بیٹھتا ہوگا؟"

خبیث نے کہا "کیا میں۔۔۔ وزیراعظم نہیں بن سکتا۔"

"تُو کیا کرے گا وزیراعظم بن کے؟" یزید پلید بولا۔

"میں۔۔۔ کانے دجال پر گاڑی چڑھا دوں گا۔ جیسے آج سائیکل چڑھائی تھی" خبیث بولا۔

میں نے متانت سے کہا "سرکس میں کام کرنے والا وزیراعظم نہیں بن سکتا۔ نہ ماسٹر اور نہ ڈاکٹر۔ وزیراعظم تو صرف میں بن سکتا ہوں۔"

وہ پھر ہنسنے لگے۔ پھر ایک کڑک سنائی دی "حرام زادو۔ سؤر کے بچو۔۔۔ تم کو جننے والی ماں کی۔۔۔ تمہاری۔۔۔"

خاموشی۔ سناٹا۔۔۔ خوف سے دھک دھک کرنے والی' کھڑکی میں منجمد رات۔ ویران سڑکوں پر گشت کرتے سپاہی' چوکیدار کی سیٹی۔ کسی ایمبولینس کا سائرن۔

ایک دن ہم اس کھڑکی کے راستے بھاگ جائیں گے۔ سرکس میں سائیکل چلانے کے لیے۔ ماسٹر اور ڈاکٹر اور وزیراعظم بننے کے لیے۔ لیکن کب؟ کب آئے گا وہ دن؟

میں نے پھر آنکھیں کھول کے گھڑی دیکھی تو سوا نو بجنے کو تھے۔ مجھ پر غنودگی کا غلبہ تھا۔ اگر میں شام تک سوتا رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اب مجھے اُٹھنا ہی ہوگا۔ خیر' اُٹھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اُٹھنے سے پہلے میں روم سروس کو آرڈر دے کر کافی منگوا سکتا ہوں۔ کافی آنے سے پہلے میں غسل کرسکتا ہوں۔ مگر غسل بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ جلدی کیا ہے۔

میں نے ریسیور اُٹھا کے کہا "کافی پلیز۔۔۔ بلیک۔۔۔ ویری ہاٹ اینڈ ویری اسٹرانگ۔"

"یس سر!" میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو!" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ رات بھر جاگتے رہے؟ نیند نہیں آئی؟" میرے کانوں میں امیر تیمور کی آواز آئی۔

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ایک دم مجھے وہ ساری باتیں یاد آگئیں جو میں ابھی تک بھولا ہوا تھا۔ "گولی کھا کے نیند آگئی تھی" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم سوچتے رہے۔ غور کرتے رہے میری باتوں پر۔۔۔ ویری گُڈ" وہ بولا۔

"کیا ویری گُڈ!۔۔۔ تم نے غلط سمجھا۔"

"تم نے میری باتوں کو اہمیت نہ دی ہوتی تو تمہیں کسی گولی کی ضرورت نہ پڑتی۔ فضول بات سے کون پریشان ہوتا ہے۔ لطیفہ سُنا کے نیند نہیں آتی۔"

میں نے کہا "آج میں واپس جارہا ہوں۔"

"آج میں بھی واپس جارہا ہوں۔ پاکستان میں ملاقات ہوگی۔"

میں نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان لوگوں نے میری نگرانی شروع کردی ہو۔ مجھے خیال آیا۔ امیر تیمور نے دوبار کہا تھا کہ چھ مہینے سے وہ میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ایسے پیچھے لگنے کا مقصد صرف میری صورت' آواز اور اطوار کا مشاہدہ کرنا نہیں ہوسکتا۔ اس نے بہت پہلے دیکھ لیا ہوگا کہ میں تو بنا بنایا شاہ عالم ہوں۔ پھر اس کے ذہن میں دیگر امکانات نے جنم لیا ہوگا کہ اس اتفاق کو اپنے حق میں حُسنِ اتفاق کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ اس نے میری ذاتی صلاحیت کا جائزہ لیا ہوگا۔ میری کامیابیوں کو پرکھا ہوگا اور شاید میری مالی حیثیت کو دیکھا ہوگا۔ ہر طرح سے میں ایک منفرد نوعیت کے انقلابی منصوبے کے لیے موزوں ترین امیدوار ثابت ہوا تھا۔ اب تک وہ مناسب وقت اور موقع کی تاک میں تھا۔

کافی پیتے ہوئے مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اسے میرے لاشعور سے بہت نیچے تحت الشعور کے اندھے کنوئیں میں غائب ہوجانے والی اس خواہش کا پتا چل گیا ہو جو پیدائشی طور پر میرے ذہن کا حصہ تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی جب میں نے کہا تھا کہ میں وزیراعظم بنوں گا تو سرکس میں سائیکل چلانے' ماسٹر بننے یا ڈاکٹر کہلانے کا خواب دیکھنے والے مجھ پر ہنسے تھے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں مجھ پر ہنسنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جس کا جو دل چاہے بنے۔ اس وقت مجھے سیاست کی الف بے کا بھی علم نہیں تھا اور وزیراعظم میرے لیے ایک خواب جیسا ہی لفظ تھا جس کے ساتھ گھمبیر' شان و شوکت' بے پناہ عزت اور دولت کی تعبیر وابستہ تھی مگر وقت کے ساتھ شعور آیا تو وزیراعظم بننے کی بچگانہ خواہش کو وقت کے بے رحم ہاتھوں نے تلخی حالات اور تلخی ایام کے پتھروں سے سنگسار کردیا۔ نہ جانے کب میں نے اس پر فاتحہ پڑھ لی تھی مگر اب یوں لگتا تھا جیسے وہ خواہش مجھ سے بھی زیادہ سخت جان تھی کہ حقائق کی سنگین دیوار تلے دب کے بھی مری نہیں تھی۔ سسکتی رہی اور سانس لیتی رہی۔

تاہم یہ بات امیر تیمور کو نہیں معلوم ہوسکتی تھی۔ برسوں سے خود میں نے بھی اس خواہش کے مزار پر لگے ہوئے کتبے کو خواب میں بھی نہیں پڑھا تھا۔ یادوں کے قبرستان میں عمرِ گزشتہ کے بہت سے دل دار تھے دفن تھے مگر مجھے کبھی عہدِ طفولیت کی اس معصوم خواہش کا مدفن نظر نہیں آیا تھا۔ امیر تیمور چھ مہینے سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا مگر وہ صرف اتنا ہی معلوم کرسکتا تھا کہ میں کیا کرتا ہوں اور کہاں کس کے ساتھ رہتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

دوپہر تک میں نے ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا۔ تیسرے پہر کی فلائٹ سے میری واپسی کی سیٹ کنفرم تھی۔ امیر تیمور نے میرے خیالات کی پُرسکون جھیل میں ایک بہت بڑا پتھر پھینک دیا تھا۔ اس نے ساکت سطح میں تموج پیدا کیا تھا اور لہروں کے بھنور پھیلائے تھے' اب بظاہر سب کچھ پہلے جیسا تھا مگر وہ پتھر جھیل کی تہ میں موجود تھا۔ میں اس کے خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں اتنا ہی ناکام تھا جیسے کوئی چہرے کی خراش کو نظرانداز کرنا چاہے مگر آئینہ دیکھے بغیر بھی ہاتھ وہیں جاتا ہو۔

مشکل یہ تھی کہ میں امیر تیمور کی بات کو مذاق یا دیوانگی قرار دے کے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ سیرلیس تھا اور اس نے اندھیرے میں تیر نہیں چلایا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ تیر نشانے پر لگے

گا۔ حالات اس کی گواہی دے رہے تھے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے ہدف کا انتخاب کیا تھا اور غلط نہیں کیا تھا۔

سہ پہر تک میں فارغ تھا۔ میں نے ہلکا سا لنچ کیا اور شاپنگ کرنے چلا گیا۔ نہ جانے کیوں میں نے اپنے کسی کاروباری رفیق سے ٹیلی فون پر بات تک نہیں کی۔ میں نے معمول کے مطابق لاہور میں خان جی کو کال نہیں کیا اور نہ قمر سے اس کی خیریت معلوم کی۔ پروگرام کے مطابق مجھے ایک دن پہلے واپس پہنچنا تھا۔ میں نے کسی کو بھی اطلاع نہیں دی تھی کہ میں نے لندن میں اپنے قیام کی مدت میں ایک دن کی توسیع کر لی ہے۔ مجھے ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ جانے والوں کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ شاید انہوں نے معلوم کر لیا ہوگا کہ مسٹر ناصر عظیم اب چوبیس گھنٹے بعد اسی فلائٹ سے آئیں گے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی نے مجھے میرے ہوٹل فون کرکے اس التوا کا سبب معلوم نہیں کیا۔ نہ قمر نے نہ اس الّو کے پٹھے نے۔ کسی کو خیال نہیں آیا کہ ناصر نے پروگرام ایک دن لیٹ کیا ہے تو اس کی وجہ صرف کاروباری ہونا ضروری نہیں۔ وہ بیمار بھی تو ہو سکتا ہے۔ کسی کو ایک کال کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

ہوٹل سے میں نے جو کار پہلے دن لی تھی وہ ابھی تک میرے پاس تھی۔ اس کا ڈرائیور ایک خوش مزاج اور ہیرو ٹائپ پاکستانی تھا جو پہلے تین سال تک لندن کی بس سروس میں ڈرائیور رہا پھر ٹیکسی چلاتا رہا اور اب پانچ سال بعد ایک لیموزین کا مالک تھا۔ اس ہوٹل میں آنے والے پاکستانی اس کو ترجیح دیتے تھے اور اس نے رفتہ رفتہ اعتماد حاصل کرکے اپنے حلقۂ شناسائی کو اس حد تک وسیع کر لیا تھا کہ اب تقریباً ہر روز ہی وہ بک رہتا تھا۔ اس کام میں محنت کم تھی اور کمائی کے ساتھ عزت بھی زیادہ تھی۔ وہ قیافہ شناس اور مزاج آشنا شخص تھا۔ لندن کے گلی کوچوں سے اس طرح واقف ہونا تھا جیسے وہ یہیں پلا بڑھا ہو۔ ناواقف لوگ اس کی گاڑی لیتے تھے تو انہیں ایک مخلص گائیڈ کی خدمات بھی حاصل ہو جاتی تھیں جو ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق انہیں بالکل صحیح جگہ پر پہنچا سکتا تھا۔ دھوکا کھانے، لٹنے اور پٹنے سے بچا سکتا تھا اور ان کے راز کو راز ہی رکھ سکتا تھا چنانچہ وہ ضرورت مند کو سوہو کے بدنام علاقے میں لے جا کے بتا سکتا تھا کہ یہاں انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ بھارت، پاکستان، ملائشیا اور سری لنکا کے علاوہ ایشیا کے ہر ملک کی کال گرل کیا چارج کرتی ہے اور کس وقت کہاں دستیاب ہوگی۔ کس سینما پر کیسی فلم چل رہی ہے۔ کس اوپیرا کے ٹکٹ مل سکتے ہیں۔ یہ سب اسے معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ائرپورٹ جانے سے پہلے چاکلیٹ خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ مجھے ایک سپر اسٹور میں لے گیا۔ اس نے مجھے "ہیرڈز" میں جانے سے روکا اور کہا "آپ کو اچھی چاکلیٹ چاہیے یا نام کے پیسے زیادہ دینے ہیں" وہ بولا۔

میں نے اس کی بات مان لی "میں ابھی دس منٹ میں آتا ہوں۔"

جب میں کار سے نکلا تو مجھے ایسا لگا کہ ایک کار میرے ساتھ ہی کچھ پیچھے رُک گئی ہے۔ اس کار کو میں نے آج دوسری یا تیسری بار دیکھا تھا۔ کار میں کوئی نہیں تھا، سوائے ڈرائیور کے۔ وہ بھی صورت شکل سے ایشیائی ہی نظر آتا تھا۔ میں نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا۔ ایسا میں نے کئی بار محسوس کیا تھا۔ گزشتہ ایک مہینے میں مختلف مقامات پر تین چار بار مجھے ایسا لگتا تھا کہ کوئی شخص مجھے غور سے دیکھ رہا ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے بھی نظر آیا تھا۔ میں نے اسے اتفاق سمجھ کے نظرانداز کر دیا تھا۔ بعض اوقات غلط فہمی کے باعث بھی ایسا ہو جاتا ہے اور لندن جیسے شہر میں ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے والی کیفیت ہوتی ہے۔ گھر خاندان، دوست احباب اور وطن سے بچھڑے ہوئے لوگ بھی صحرا کے مسافر کی طرح آرزو کے سراب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بھیڑ میں کوئی چہرہ دکھائی دے تو گمان گزرتا ہے کہ یہ فلاں تو نہیں۔ ایک لمحے کے لیے دل خوشی کی قلابازیاں کھاتا ہے۔ یار یہ تو فلاں ہے، اپنے محلے کا۔ یا وہ جو اپنے ساتھ دفتر میں تھا۔ ہم ایک بس میں جاتے تھے۔ ایک ہی لڑکی کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ پھر غور سے دیکھنے پر آشنائی کا وہ احساس ختم ہو جاتا ہے اور دل میں صرف حسرت رہ جاتی ہے یا اُداسی۔ وطن سے دور ایسا بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے تو دیکھا تھا کہ کسی نے دوڑ کے کسی کو پکڑ لیا۔ آواز دے کے بلایا اور بے تکلفی سے گُدی پر ہاتھ تک مار دیا پھر احساس ہوا کہ یہ تو کوئی اور تھا۔ اس کے بعد سوری۔۔۔ اور معافی۔ شرمندگی آمیز ہنسی۔ چلو جی کوئی بات نہیں۔ ہوتا ہے ایسا بھی۔ پھر یہ نہایت بدتمیزانہ اتفاق بھی شناسائی کا بہانہ بن جاتا ہے۔ وہ جی میرا کزن ہے بالکل آپ کا ہم شکل۔ ایک ٹھنڈی سانس۔ ہاں جی گھر سے دور ہو بندہ تو سب ہی یاد آتے ہیں۔ ویسے آپ کہاں رہتے ہیں۔ کب آئے پاکستان سے؟

میں چاکلیٹ خرید کے واپس آیا تو وہ شخص واپس اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میری گاڑی کے ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا اور مجھے آتے دیکھا تو بڑی عجلت میں روانہ ہو گیا۔ اس سے میرا شک بڑھ گیا۔ اگر ایک گاڑی کا ڈرائیور دوسری گاڑی کے ڈرائیور سے باتیں کرنے لگے تو اس میں کوئی انوکھی یا غلط بات نہیں مگر وہ چوری چھپے ملے اور تعلق کو چھپائے تو شک ہونا لازمی ہے۔

"قاسم!" میں نے اپنے ڈرائیور سے کہا "ابھی تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

خلافِ توقع اس نے کہا "میں جی۔۔۔ نہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے پیچھے ایک گاڑی آئی تھی۔ اس کا ڈرائیور تم سے باتیں نہیں کر رہا تھا؟"

"کون سی گاڑی جناب!" اس نے پیچھے دیکھا "پیچھے تو بہت سی گاڑیاں ہیں۔"

میں نے گاڑی میں بیٹھ کے کہا "ہاں۔۔۔ لیکن ایک ریناٹ تھی۔ گرے کلر کی۔ یہ نمبر تھا اس کا قاسم۔"

اس نے کاغذ کی سلپ کو دیکھا لیکن بولا نہیں۔ اس کا رویّہ واضح طور پر شبہ پیدا کرنے والا تھا۔ یہ بالکل صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا معاملہ تھا۔ وہ کہہ دیتا کہ ہاں، ایک واقف تھا تو میں خاموش ہو جاتا یا ایک سوال اور کر لیتا کہ کیا پوچھ رہا تھا۔ پھر وہ کہہ سکتا تھا کہ کچھ نہیں۔ بس اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، جنرل گپ شپ۔ لیکن اس کے انکار میں ایک پُراسراریت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اصرار کروں یا پھر وہ تذبذب میں مبتلا تھا۔ "قاسم!" کچھ دور آ کے میں نے کہا "آخر تمہارے اور اس کے درمیان ایسی کیا بات ہوئی تھی جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔۔۔"

وہ چونکا "جی۔۔۔!"

میں نے کہا "کیا وہ میرے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا؟"

"کون جی۔۔۔!"

میں نے کہا "یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو لیکن میں تم کو مجبور نہیں کر سکتا سچ بولنے پر۔"

اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "وہ۔۔۔ آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"کیا پوچھ رہا تھا؟"

"یہی کہ۔۔۔ آپ کا نام کیا ہے۔ آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، کیا کرتے ہیں؟"

"قاسم! اس میں تو چھپانے والی کوئی بات نہیں۔"

قاسم بولا "پہلے تو میں نے کہا تھا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اپنا شک رفع کرنا چاہتا ہوں۔ تم کئی دن سے اس کے ساتھ ہو۔ تمہیں ضرور معلوم ہوگا کہ یہ کون ہے۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے آپ کا نام بتا دیا اور کہا کہ بزنس مین ہیں۔ اکثر پاکستان سے آتے ہیں اور اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ میری بات پر وہ بولا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ اس بندے کا نام ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہے۔"

"شاہ عالم۔۔۔ وہ مجھے شاہ عالم سمجھا تھا؟"

"ہاں جی۔ میں نے کہا کہ جب تم جانتے تھے تو مجھ سے کیوں پوچھنے آئے تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کا نام ناصر عظیم ہے اور مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے غلط بیانی کی۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔ یہ شاہ عالم کون ہے؟"

قاسم نے نفی میں سر ہلایا "پتا نہیں جی۔"

ٹوہ لینے کے لیے میں نے کہا "وہ پاکستان کا سیاسی لیڈر تو نہیں؟"

"ہوگا جی۔ ہم یہاں رہ کے پاکستان کی سیاست کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں۔ بس دو چار نام سُن رکھے ہیں۔ بھٹو صاحب اور ضیاء الحق تھے۔ اپنے نواز شریف ہیں اور بے نظیر ہیں۔ ولی خان اور جتوئی۔ اور ہاں جی وہ تھے اور ترکی ٹوپی والے، نواب زادہ نصراللہ خاں۔"

میں نے ہنس کے کہا "پیر صاحب پگارا کو بھول گئے؟"

"ہاں جی۔ وہ بھی ہیں۔ دراصل یہاں پاکستانی اخبار کم آتے ہیں اور جو آتے ہیں وہ ہر جگہ نہیں ملتے۔ مجھے ویسے بھی ٹائم نہیں ملتا۔ تقریباً چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہے۔ دن بھر کسی کے ساتھ رہتا ہوں۔ بعض اوقات کوئی رات بھر گھومنا چاہتا ہے تو اسے بھی ہر جگہ لے جانا پڑتا ہے۔ درمیان میں کہیں وقفہ ملتا ہے تو کھانا کھا لیا۔ گاڑی میں ہی سو گئے۔"

میں نے کہا "کیوں؟ گھر نہیں ہے تمہارا؟"

"گھر ویسا تو نہیں ہے، جیسا گھر ہوتا ہے۔ ایک کمرا ضرور ہے جس میں چار اجنبی رہتے ہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے بھی یہاں اپنے نہیں ہوتے جناب، سب وہاں سونے کے لیے آتے ہیں اور سونے کے لیے یہاں ویسے رات نہیں ہوتی۔۔۔ جیسے اپنے وطن میں اپنے گھر میں ہوتی تھی۔ ایک ٹائم پر سب لوٹ کے گھر آ جاتے تھے۔ جب تک اباجی تھے چراغ جلتے ہی گھر پہنچنا لازمی تھا۔ کھانا بھی ایک جگہ پکتا تھا اور سب ایک ساتھ بیٹھ کے کھاتے تھے۔ پھر گھر الگ ہو گئے۔ خاندان پھر بھی رہا۔ خوشی غمی کے ہر موقع پر ساتھ ہوتے تھے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ سامنا ہو گیا تو سلام دُعا ہیلو ہیلو کر لی۔ ورنہ اپنے کام سے کام۔ کون کس وقت آتا ہے کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟ کسی کو پتا نہیں چلتا۔ ابھی میں آپ کے ساتھ ہوں، ائرپورٹ سے واپس جاؤں گا اپنے کمرے میں تو پتا نہیں کون ملے گا اور کون نہیں ملے گا۔ سو جاؤں گا کمبل تان کے اور پھر اٹھوں گا تو ممکن ہے کوئی سو رہا ہو۔ میں خاموشی سے نکل جاؤں گا۔ اگر میں ایک ہفتہ کسی کو نظر نہ آؤں تو فکر کسی کو نہیں ہوگی۔ سب فرض کرتے رہیں گے کہ میں بھی ان کی طرح آتا رہا مگر ملاقات نہیں ہوئی تو یہ اتفاق ہے اور اتفاق بھی ایک معمول بن گیا ہے اس لیے کوئی کسی کے بارے میں اچھا بُرا کچھ نہیں سوچتا۔ ہاں کرایہ اور بل ادا کرنے کا وقت آئے گا تو سب پوچھیں گے ایک دوسرے کو۔ اپنے اپنے حصے کی رقم جمع کرنے کے لیے۔۔۔ تو جناب، ایسا ہے وہ گھر۔۔۔" اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے اسے دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع دیا تھا۔ جلاوطنی میں سب کی جذباتی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ سب دل میں تنہائی، اُداسی اور محرومی کا غبار لیے پھرتے ہیں۔ ڈالر پاؤنڈ یا ریال جمع کرکے لوٹنے اور بیوی بچوں کے لیے آسودگی و خوشحالی کے خواب کو حقیقت بنانے کی مجبوری سب کو دوری کا جبر برداشت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

میں نے کہا "پاکستان میں گھر کہاں ہے تمہارا قاسم؟"

"پنڈی میں جی۔۔۔ نالی موری، ایک گاؤں تھا۔ ہماری زمین

تھی وہ سب زرتیاتی اسکیموں میں آگئی۔ لالہ زار کالونی اور کیپ میں کالونیاں بنانے والوں نے خریدلی۔ زمین کی جگہ پیسہ ہاتھ میں آگیا۔ زمین ایک ایکڑ بھی ہو تو ساتھ دیتی ہے اور کنبے کو پالتی ہے۔ پیسہ اس کی قیمت کا دس گنا بھی ملے تو بڑی جلدی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔" قاسم نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا "ہاں۔ زمین خرچ نہیں ہوتی' پیسہ خرچ ہوتا ہے۔"

"ہل چلانے اور فصلیں اگانے والے۔ گائے بھینس' بکریاں اور مرغیاں پالنے والے بھائی اب خراد کی مشین پر کام کر رہے ہیں۔ مگر سہ پچ رہے ہیں۔ زرا کا فور پیا ہوا کوکہ اور نمک ملا کے۔ تیسرا بس کنڈیکٹر ہو گیا ہے اور میں بے گھر ہوں۔ اب واپس جانے کا سوچتا بھی نہیں۔ حالانکہ اُدھر ماں ہے میری۔ باپ تو مر گیا' بہن ایک ہی تھی' وہ سعودیہ چلی گئی۔"

میں نے کہا "شادی نہیں کی قاسم؟"

"شادی۔۔۔" وہ ہنسا "اس کے لیے ڈگر چاہیے جناب اور پکی نوکری۔ دو چار ہزار میں بھی اب تو کچھ نہیں بنتا۔ پاکستان میں رہتا تو شاید ماں کر ہی دیتی۔ وہ نصیب پر بہت یقین رکھتی ہے۔ آنے والی اپنا نصیب ساتھ لائے گی۔ بچے اپنا نصیب لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ روتی ہو گی نوراں بی بی اپنے نصیب کو۔"

"نوراں بی بی۔۔۔ تمہاری ماں۔۔؟"

"نہیں جی۔ اس سے میری شادی ہونی تھی۔ بات پکی تھی' میں بھی کہہ آیا تھا کہ لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ ظاہر ہے انتظار وہ بھی کر رہی ہوگی' ماں بھی۔۔۔ مگر میں کیا کروں کا واپس جا کے۔۔۔" قاسم نے جیسے خود سے سوال کیا۔

"کیا وہاں لوگ فاقے کر رہے ہیں۔ ننگے پھر رہے ہیں اور فٹ پاتھوں پر سو رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تم یہاں خوش ہو۔ آزاد ہو ہر ذمے داری سے۔ شادی کی ضرورت ہی نہیں۔ جیسے باپ مر گیا ایسے ہی ماں مر جائے گی۔ نوراں بی بی بالآخر کسی اور سے شادی کر لے گی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ولایت کے مزے چھوڑ کے جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس نے گاڑی ائرپورٹ کے پارکنگ ایریا میں روک دی "سچ کہتے ہیں آپ بھی۔ بندہ خود غرض اور بے حس ہو جائے تو اچھا رہتا ہے۔ مگر اندر کا دکھ ختم نہیں ہوتا جناب' بڑھ جاتا ہے۔"

میں نے اسے اپنا کارڈ دیا "تم سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ لیکن قاسم کبھی تم مجھ سے ملنا چاہو' جلاوطنی کا عذاب بہت سخت ہو جائے اور تم لوٹ کے گھر جانا چاہو۔۔۔ تو مجھ سے مل لینا۔ چار پانچ ہزار میں اس شخص کے لیے ضرور نکال سکتا ہوں جو محنتی ہو۔ کام کرنا چاہتا ہو مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جلاوطنی ترک کر کے وطن آنا چاہتا ہو۔" میں نے کہا "کسی مجبوری کے بغیر' اپنی خوشی سے اور دوسروں کی خوشی کے لیے۔"

اس نے کارڈ لے کر غور سے پڑھا "مجھے کچھ زیادہ بولنے کی عادت ہے جناب لیکن سننے والوں کو بھی میں نے دیکھا ہے۔ ان میں بُری عادت ہوتی ہے یہ ظاہر کرنے کی کہ وہ بڑی چیز ہیں۔ سارے زمانے کے مسئلے یوں چٹکی بجانے میں حل کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اعتبار کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی۔۔۔ اللہ نے مجھے وسیلہ بنا رکھا ہے کم سے کم چار سو افراد کے روزگار کا۔"

"ایک شخص نے پہلے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ کارڈ بھی دیا تھا۔ اور میں اس پر بھروسا کرتے ہوئے پاکستان چلا گیا تھا۔ وہاں۔۔۔ خیر چھوڑیں۔"

میں نے کہا "سب بتا دیا ہے تو یہ کیوں چھپاتے ہو۔ کون تھا وہ۔ کیا ہوا تمہارے ساتھ؟"

"اس نے مجھے اچھی تنخواہ دی' صرف ایک مہینے۔ دوسرے مہینے اس نے مجھے جو کام بتائے' وہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی پڑھا لکھا باضمیر آدمی نہیں کر سکتا خواہ اس سے دس گنا زیادہ معاوضہ دیا جاتا۔ خدا نے مجھے بچا لیا۔ اگر لالچ میں آ کے میں ایک غلطی کر بیٹھتا تو دوسری کے لیے مجبور ہو جاتا پھر ایک سلسلہ شروع ہو جاتا اور میں بلیک میل ہوتا۔ اس سے پہلے ہی میں نے ایک مہینے کی تنخواہ واپس کی۔ اس شخص سے کہا کہ میں بے وقوف اور بزدل آدمی ہوں۔ تمہارے لائق نہیں' بس مجھے بخش دو۔ میں سمجھ لوں گا کہ کبھی تم سے ملا ہی نہیں تھا۔"

میں نے تجسس کی خاطر پوچھا "آخر کون تھا وہ' نام کیا تھا اس کا؟"

"وہ تم تھے مسٹر شاہ عالم۔ شناخت میں غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔ تم نے تھوڑا سا حلیہ بدلا ہے مگر تم نے بڑی غلطی کی دوبارہ وہی آفر دے کر اور وہی باتیں دُہرا کے۔" اس نے مجھے ایک کارڈ تھمایا اور گاڑی نکال لے گیا۔

میں وہ کارڈ ہاتھ میں لے کر کھڑا رہ گیا۔ محض ایک غلط فہمی کی بنا پر جو پیدا ہو گئی تھی یا کر دی گئی تھی۔ اس پاکستانی ڈرائیور نے میری مخلصانہ پیشکش شکریے کے ساتھ مسترد نہیں کی تھی بلکہ ذلت کے ساتھ میرے منہ پر ماردی تھی کہ تم آج ناصر عظیم بن کے مجھے پھر بے وقوف بنانا چاہتے تھے۔ تم ابھی مجھے نہیں پہچان سکے ورنہ شاید دوبارہ اس شکار پر ہاتھ نہ ڈالتے جو ایک بار زیر دام آ کے نکل گیا تھا۔ پہلے بھی مجھے خدا نے بال بال بچا لیا تھا اور آج پھر مجھے بروقت تمہاری جعلسازی کا علم ہو گیا۔

صاف ظاہر تھا کہ میرے پیچھے آنے والی۔۔۔ کار کے ڈرائیور نے ہی یہ غلط فہمی پیدا کی تھی۔ اس سے پہلے میرے ڈرائیور نے شاید شاہ عالم کے ساتھ میری صورت کی مشابہت پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا اور میرا لندن میں پُرانا ساتھ تھا۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ میں نے نام لے کر اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ "وہ ایک پاکستانی ڈرائیور ہے' قاسم" اور فیجر نے سر ہلا کے کہا تھا "یس سر! قاسم

کی ایسی ہی گُڈ ول تھی۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور اس سے پہلے دوبار میں لندن آیا تھا تو اس کے ساتھ دس دن گزار چکا تھا۔ ایک بار چار دن دوسری بار چھ دن۔ وہ مجھے ہر بار مختلف کاروباری اداروں اور دفتروں میں لے گیا تھا۔ میرے ساتھ گاڑی میں بہت سے معزز لوگ لنچ اور ڈنر کے لیے ساتھ گئے تھے اور انہوں نے مجھے مسٹر عظیم کہہ کے ہی مخاطب کیا تھا۔ قاسم جاہل نہیں تھا اور لندن میں رہ کے تو انگوٹھا لگانے والا بھی انگریزی سمجھنا اور بولنا سیکھ لیتا ہے۔

اچانک اس کو بتا دیا گیا تھا کہ یہ شخص ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہے۔ سانپ کا ڈسا رسّی سے بھی ڈرتا ہے۔ میری بدقسمتی کہ شاہ عالم اسے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کے لیے ایسی ہی "مخلصانہ" پیشکش کر چکا تھا جیسی میں نے کی تھی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ شاہ عالم جیسے سیاست داں نے لندن میں رہنے والے کسی ڈرائیور کی خدمات حاصل کرنے میں کیا فائدہ دیکھا ہوگا۔ قاسم لندن کے گلی کوچوں سے اور اس شہر کے ہر علاقے میں ہونے والے ہر کاروبار سے پوری طرح واقف تھا۔ ممکن ہے شاہ عالم نے پوچھا ہو کہ ہیروئن بیچنے والے کہاں جاتے ہیں۔ انہیں مال کہاں سے ملتا ہے اور مال کی کھپت کے علاقے کون سے ہیں۔ شاہ عالم نے قاسم سے مطالبہ کیا ہو کہ وہ اپنے ساتھ دو چار کلو ہیروئن لے جائے اور ان مخصوص ٹھکانوں پر ایسے لوگوں تک پہنچا دے جن کو وہ جانتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شاہ عالم کا تعلق منشیات فروشوں سے نہ ہو۔ اس نے قاسم کو اسلحے کی سپلائی لائن دی ہو۔

جب میں نے قاسم سے ویسی ہی باتیں کیں جیسی شاہ عالم نے کی ہوں گی تو گویا تصدیق ہو گئی کہ میں ناصر عظیم نہیں۔ اس پُراسرار ڈرائیور نے میرے بارے میں اس کے کان پہلے ہی بھر دیے ہوں گے کہ ہوشیار' یہ شخص شاہ عالم ہے مگر یہاں ناصر عظیم بن کے بھی آتا جاتا رہتا ہے۔ اپنے مذموم غیر قانونی دھندے وہ اسی نام کی آڑ میں چلاتا ہے۔ تم اس کے ساتھ رہے تو مارے جاؤ گے۔

گزشتہ رات ہی میری امیر تیمور سے بات ہوئی تھی اور اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میری اور شاہ عالم کی صورت میں حیرت انگیز مشابہت ہے اور اس نے مجھے ڈبل کا رول قبول کرنے کی پیشکش بھی کی تھی۔ آج یہ واقعہ پیش آ گیا تھا۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے مجھے شاہ عالم سمجھا ہو۔ میرا ذہن اسے اتفاق سمجھ کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہ شوشہ امیر تیمور نے چھوڑا تھا۔

میں نے شاہ عالم کا کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ قاسم نے مجھے وضاحت کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ شاید وہ میری وضاحت بھی قبول نہ کرتا۔ اس نے اپنی جان بچا کے بھاگ جانا بہتر سمجھا تھا۔ میرے سوالات کے جواب بھی اس نے سوچ سمجھ کے احتیاط کے ساتھ دیے تھے۔ وہ میرا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے وہی باتیں کی ہوں گی جو وہ شاہ عالم سے کر چکا تھا اور جیسا کہ اسے اُمید تھی' میں نے دوبارہ اسے وہی آفر دے دی۔

مگر میرے لیے اس سے بھی بڑی اُلجھن منتظر تھی۔ میں نے اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ کاؤنٹر پر پیش کیے تو ایک امیگریشن افسر نے مجھے غور سے دیکھا اور مسکرایا "آپ کسی سیاسی کانفرنس میں یا سیمینار میں آئے تھے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "جی۔۔۔ یہ خالص نجی نوعیت کا کاروباری دورہ ہی رہا۔"

"نجی یا کاروباری؟"

میں نے کہا "دونوں۔۔۔ دراصل کچھ کاروبار سرکاری بھی ہوتے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "وقت مل جاتا ہے آپ کو بزنس کے لیے!"

"میں ان سوالات کا مقصد نہیں سمجھا۔ ہر شخص اپنے ہر کام کے لیے وقت نکال سکتا ہے اور نکالتا ہے۔"

اس نے مُہر لگاتے ہوئے کہا "پلیز ڈونٹ مائنڈ اِٹ۔ میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس بار آپ کی شخصیت میں معمولی سی تبدیلی نظر آئی مجھے۔"

"کیسی تبدیلی۔۔؟"

"دو ہفتے پہلے آپ آئے تھے تو آپ کے بال کچھ براؤن تھے اور آنکھیں بھی۔۔۔ آپ کا ہیئر اسٹائل قدرے مختلف تھا۔"

میں نے کہا "مگر میری آنکھوں کا رنگ اور بالوں کا انداز قدرتی ہے۔"

"پھر آپ نے بالوں کو ڈائی کیا ہو گا اور کنٹیکٹ لینز لگائے ہوں گے۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں رنگ نظر نہیں آتے۔ لیکن آپ کی وہ فرنچ کٹ داڑھی اب کہاں ہے جو تصویر میں ہے" اس نے پاسپورٹ مجھے واپس کر دیا۔ "داڑھی رکھنا یا صاف کرانا آپ کا جمہوری حق ہے۔ شخصی آزادی کا مسئلہ ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ زمین میرے پیروں کے نیچے سے سرکنے لگی ہے۔ اگر وہ میرا نام لے کر مجھے مخاطب کرتا تو شاید میں اُچھل پڑتا یا میرا خفگی کا ردِ عمل شدید ہوتا اور میں کہتا کہ تم نے پی رکھی ہے کیا۔ نام تک صحیح نہیں پڑھ سکتے لیکن اس کی باتوں سے رفتہ رفتہ مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوتا گیا۔ بالوں کا رنگ' آنکھوں کا رنگ۔ اور اب داڑھی۔ میرے پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر میں داڑھی کا کیا سوال۔ اس وقت میں چونکتا یا اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ چھین کے کہتا کہ یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم تو وہ شک میں مبتلا ہو جاتا کہ اپنے ہی پاسپورٹ کے بارے میں میری یہ حیرانی اور پریشانی چہ معنی دارد۔ معاملہ سنگین رُخ بھی اختیار کر سکتا تھا۔

میں نے فوراً اپنی صورت کے تاثرات پر قابو پا لیا اور پاسپورٹ لے کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا کیونکہ میرے پیچھے بھی

aazzamm@yahoo.com

لائن میں کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ بورڈنگ کارڈ لینے سے پہلے میں نے لاؤنج میں پاسپورٹ اور ٹکٹ دیکھے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا اور مجھے اپنے جسم کے مساموں سے پسینہ پھُوٹتا محسوس ہوا۔ دونوں پر میرا نام شاہ عالم لکھا ہوا تھا۔

پاسپورٹ دو سال پُرانا تھا اور اس پر تصویر بالکل میری تھی۔ فرق وہی تھا جو امیگریشن افسر کی نظروں نے دیکھا تھا۔ وہ اس شاہ عالم کو پہچانتا تھا جو سیاست داں تھا۔ شاید آتے جاتے وہ اپنی ساکھ بنانے اور اپنی اہمیت جتانے کے لیے کہتا ہوگا کہ وہ پاکستان کے اہم ترین سیاسی لیڈروں میں شامل ہے جسے برطانیہ میں ہونے والی کسی اہم کانفرنس میں نمائندگی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایسی کانفرنس کا کسے پتا ہوتا ہے۔ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا لفظ لگا کے کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ ٹریڈ فیسٹر کانفرنس فار اکنامک کو آرڈی نیشن۔ تحفظِ ماحولیات' سیمینار آن ڈیموگرافی۔ لوگ پاکستان کے بارے میں بھی کم جانتے ہیں۔ وہاں کے سیاست دانوں کے بارے میں انھیں کیا معلوم۔ لیکن شاہ عالم ذاتی پبلسٹی کو اہمیت دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے امیگریشن کا عملہ صورت سے پہچانتا تھا۔

میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اب میں دوبارہ کاؤنٹر پر جاتا اور کہتا کہ آپ کو کیا خود مجھے اپنے بارے میں شدید غلط فہمی ہوگئی تھی۔ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں تو ہر شخص میری ذہنی کیفیت کے بارے میں شکوک کا اظہار کرتا۔ نشے میں ہونے کا الزام سب سے پہلے آتا۔ پھر شاید یہ اخبار میں خبر سے زیادہ ایک لطیفہ ہوتا کہ ایک پاکستانی سیاست داں شاہ عالم نے خود اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ پیش کیا لیکن بورڈنگ کارڈ لینے سے پہلے وہ اُڑ گئے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ ہی از سوڈرنکڈ۔

اگر میں سیریس ہوجاتا تو بہت سے قانونی مسائل میں پھنس جاتا۔ اگر میں ناصر عظیم تھا تو میرے پاس شاہ عالم کا پاسپورٹ کہاں سے آیا اور میں نے اسے امیگریشن کاؤنٹر پر کیسے پیش کردیا۔ میرے ٹکٹ پر میرا نام ناصر عظیم کیوں نہیں تھا؟ کیا میں جعلی شاہ عالم بن کے سفر کررہا تھا یا شاہ عالم کے پاس دو پاسپورٹ تھے؟ یہ ڈبل گیم آخر کس لیے تھا؟ تفتیش کے لیے کیس چلا جاتا پولیس کے پاس اور تصدیق مانگی جاتی حکومتِ پاکستان سے کہ آخر یہ کیا چکر ہے۔ صورتِ حال کے واضح ہونے تک میں کسی برطانوی جیل میں رہتا۔

میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نے اپنے پاسپورٹ کے گم یا چوری ہونے کا کسی سے تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ یہ پاسپورٹ اور ٹکٹ میں نے بقائمی ہوش وحواس خود کاؤنٹر پر پیش کیا تھا اور امیگریشن افسر کے ہر سوال کا جواب بطورِ شاہ عالم دیا تھا۔ اگر میں ناصر عظیم تھا تو پھر میں نے شاہ عالم کا ٹکٹ اور پاسپورٹ کیسے اور کیوں حاصل کیا تھا؟ یہ بھی ثابت ہوجاتا کہ میں نشے میں ہرگز نہیں تھا۔

میں سمجھ گیا کہ امیر تیمور نے میرے انکار کے باوجود اپنا کھیل شروع کردیا ہے۔ کل رات جب میں اس کے ساتھ تھا تو کوئی میرے کمرے میں پہنچا اور اس نے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ بدل دیا۔ ممکن ہے شاہ عالم خود لندن میں موجود ہو اور یہ کام اسی نے کیا ہو۔ ہوٹل والوں نے اسے بلا تردّد میرے کمرے کی چابی دے دی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ...

جب فلائٹ ڈیپارچر کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی اور مسافروں سے کہا گیا کہ وہ جہاز پر سوار ہونے کے لیے بس میں بیٹھ جائیں تو میں نے عجلت میں اپنا سامان چیک کرا کے بورڈنگ کارڈ حاصل کیا۔ بس میں بیٹھ کے مجھے دوسرا زیادہ پریشان کرنے والا خیال آیا۔ کیا وہ بیگ اور سوٹ کیس میرے ہی تھے جن کو میں نے اپناؤ ڈیکلئر کیا تھا؟ دیکھنے میں وہ ویسے ہی تھے مگر اس جیسے بیگ اور سوٹ کیس لندن میں عام ملتے تھے اور جنھوں نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ بدلا تھا ان کے لیے سامان بدل دینا کیا مشکل تھا۔

مجھے اس گاڑی کا خیال آیا جو میرے تعاقب میں تھی۔ جب میں قمر کے لیے چاکلیٹ خریدنے گیا تھا تو وہ میرے پیچھے آکے رُکی تھی اور اس میں سے اُتر کے ڈرائیور نے میری گاڑی کے ڈرائیور سے بات بھی کی تھی۔ کیا وہ سب سچ تھا جو مجھے قاسم نے بتایا تھا یا اس کی خدمات بھی امیر تیمور نے حاصل کررکھی تھیں۔ اس نے میرا سامان دوسرے ڈرائیور کو دے دیا ہوگا۔ اب وہ میرے خلاف گواہی دے سکتا ہے کہ اس شخص نے مجھ سے بھی جھوٹ بولا تھا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا جس پر ناصر عظیم لکھا ہوا تھا مگر میں اسے جانتا ہوں۔ یہ شاہ عالم ہے۔ اس کا پُرانا کارڈ پہلے سے میرے پاس تھا۔

او مائی گاڈ۔ یہ میں کس شیطانی چکر میں پھنس گیا۔ اب میں خود کو ناصر عظیم ثابت کروں تو مصیبت۔ خاموش رہوں تو مشکل۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے سامان میں اب کیا ہے۔ میرے ہاتھ میں صرف وہ شاپنگ بیگ تھا جس میں ایک پرفیوم ڈاکٹر کمال کی پسندیدہ۔ ایک خوشبو چاندنی کے لیے میری پسند کی اور دو پاؤنڈ چاکلیٹ بہت اعلیٰ قسم کی قمر کے لیے تھی۔ بیگ میں اور سوٹ کیس میں اب کیا ہوگا۔ یہ میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر میرا ہی سامان ہوتا تو میں ایک ایک چیز کی تفصیل بتادیتا مگر ایک نادیدہ ہاتھ نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ میرا نام 'حلیہ' ٹکٹ اور پاسپورٹ' سامانِ سفر۔

شاہ عالم اور اس کا نائب۔ معتمدِ خاص اور دایاں بازو امیر تیمور کوچۂ سیاست کے پرانے مداری تھے اور ہر تماشا دکھا سکتے تھے۔ وہ زمانہ جب سیاست اور شرافت کا چولی دامن کا ساتھ تھا' شاید قائداعظمؒ اور قائدِ ملت پر تمام ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سازشی سیاست کا دور شروع ہوا تھا اور اس کی ابتدا تو کچھ لوگوں کے خیال میں کشمیر کے مسئلے میں جنگ بندی قبول کرنے سے ہی ہوگئی تھی مگر ۱۹۵۱ء کے راولپنڈی سازش کیس اور اس کے بعد پہلے....

وزیرِاعظم کے قتل سے سازشی عناصر کا کردار واضح طور پر سامنے آگیا تھا۔ آج پینتالیس سال بعد سیاست میں شرافت کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر بھی کسی کو گوارہ نہ تھی۔

مجھے سوچنے کا موقع فراہم کرنے والے امیر تیمور نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس نے مجھ سے بات کرنے سے پہلے ہی اس بات کو یقینی بنالیا تھا کہ میں انکار نہ کرسکوں جب اس نے اپنے عزائم کا اظہار اپنی زبان سے کردیا تو پھر اس کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ مجھے میری مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ فیصلہ وہ پہلے ہی کرچکے تھے۔ اب یا تو میں شاہ عالم ثانی بن کے زندہ رہوں گا ورنہ دنیا میں ایک ہی شاہ عالم رہے گا۔ پھر اس کا نقشِ ثانی ناصر عظیم نہیں رہے گا۔

میں سخت پریشانی اور تشویش کا شکار تھا اور عادت کے مطابق عام مسافروں کے ساتھ بیٹھنے کے لیے جارہا تھا کہ مصنوعی مسکراہٹ اور حُسن رکھنے والی ائرہوسٹس نے کہا "دس وے سر۔ فرسٹ کلاس اِدھر ہے۔"

اس نے یقیناً مجھے گاؤدی سمجھا ہوگا جو کسی اور کے خرچ پر پہلی بار جہاز میں بیٹھنے آگیا تھا اور مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ میرا ٹکٹ کس کلاس کا ہے اور جہاز میں داخل ہوکے مجھے کدھر جانا چاہیے تھا۔ میری صورت پر بھی پریشانی سے بارہ بجے ہوئے ہوں گے اور اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن ہونے کے باعث مجھے واقعی گرد وپیش کی پوری خبر نہیں تھی۔ اگر میں احمق نظر آرہا تھا تو یہ فطری بات تھی۔

میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میں سیٹ پر ایسے گرا جیسے میں لندن شہر سے ہیتھروائرپورٹ تک پیدل پہنچا تھا یا پھر میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی۔ میں نے ٹشو پیپر سے پسینہ صاف کیا اور چیف اسٹیورڈ سے کافی مانگی۔

اس نے مسکرا کے معذرت کی "ابھی چند منٹ میں۔"

میں نے اسے ڈانٹ دیا "نو۔۔۔ نو ویٹنگ۔ مجھے ابھی اور اسی وقت کافی چاہیے۔ از دیٹ کلیئر!"

اس نے میری صورت دیکھی اور سمجھ گیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ "آر یو اوکے سر؟"

میں نے کہا "میں بالکل بیمار نہیں ہوں۔ ڈاکٹر نہیں کافی۔"

"یس سر!" اس نے کہا اور کافی لینے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی میرے ساتھ والی سیٹ پر آبیٹھا۔ وہ امیر تیمور تھا۔

"السّلام علیکم شاہ جی۔" اس نے بہ آوازِ بلند خوش دلی سے کہا۔

"تم پر خدا کی لعنت" میں نے مسکرا کے آہستہ سے کہا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے سر!" اس نے بُرا مانے بغیر کہا۔

"یہ حرامی پن تم نے کیا ہے میرے ساتھ۔"

ائرہوسٹس نے ایک ٹرے آگے بڑھائی "یور کافی پلیز۔"

میں نے اخلاقاً کہا "تھینکس۔"
امیر تیمور نے موقع سے فائدہ اُٹھایا "وری گڈ۔ خاص لوگوں کے لیے خصوصی سروس۔ شاہ عالم تو خیر مشہور سیاست داں ہیں مگر ہم بھی انہی کے نائب صدر ہیں۔"
وہ ایک دم محتاط ہو گئی "کیا آپ بھی کافی لیں گے سر؟"
امیر تیمور ہنسا "اوہ نو۔ ہم خصوصی توجہ نہیں مانگتے' بعد میں سہی۔"
دوسری طرف سے ایک شخص اُٹھ کے مجھ سے مصافحہ کرنے آیا "آپ سے مل کے خوشی ہوئی شاہ عالم صاحب۔ بہت اشتیاق تھا۔"
امیر تیمور کھڑا ہو گیا "مسٹر اشتیاق۔ میری جگہ بیٹھ کے اپنے محبوب لیڈر سے باتیں کریں۔ اخباری نمائندے تو نہیں ہیں نا آپ؟"
"نہیں جی" وہ خوش ہو کے تیمور کی جگہ بیٹھ گیا۔
"انٹرویو کی اجازت نہیں ہے؟" اس شخص نے مسکرا کر پوچھا۔
میں نے کہا "دیکھئے' میرے سر میں درد ہے۔"
اس شخص کا رویّہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا "اب تم میری بات سُننے کے بھی روادار نہیں' فون پر تم ملے نہیں' گھر آفس۔۔۔"
میں نے سنبھل کے کہا "ایسی کیا بات ہے۔"
"شاہ جی۔ میں نے دس لاکھ پارٹی فنڈ میں کس لیے دیے تھے۔ میرا کیس ابھی تک وہیں ہے۔"
میں نے سوچ کے کہا "دراصل۔ مصروفیت میں یاد نہیں رہا۔۔۔ کیا کیس تھا تمہارا؟"
اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "اس کا مطلب ہے کہ تم بات کرنا نہیں چاہتے۔"
"یہ کیسے فرض کر لیا تم نے؟" میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔
"فرض کریں۔ پوری یوسف زلیخا سُن کے کوئی پوچھے کہ زلیخا مرد تھا یا عورت تھی' سارا کیس دس بار۔۔۔"
"او کے' او کے۔ ہو جائے گا مگر یہاں نہیں' پلیز۔!"
وہ بولا "پھر کہاں۔۔۔ اور کب۔۔۔؟"
میں نے آنکھیں کھول کے کہا "امیر تیمور سے ٹائم لے لو۔"
وہ مجھے گھورتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ "جب دس لاکھ لینے تھے تو تم نے کہا تھا کہ کہیں بھی آ جاؤ' کسی وقت آ جاؤ۔"
"ایسا بھی ہوتا ہے ایسے کاموں میں ایڈیٹ۔ تم نے جُوا کھیلا تھا کوئی سرمایہ کاری نہیں کی تھی۔ ذرا اپنے قائدے کو بھی دیکھو اور پھر اپنے لہجے کو درست کر لو۔ آئی بات سمجھ میں" میں نے تیور بدل کے کہا۔
وہ مجھ پر جھک کے بولا "شاہ جی۔ آپ تو ناراض ہو گئے۔ میں پانچ اور پیش کروں گا۔ بس آپ کا ایک اشارہ چاہیے۔"
"میں نے کہا نا کہ تیمور سے بات کر لینا۔" وہ چلا گیا' تیمور واپس آ گیا۔
ائیر ہوسٹس خالی مگ لے گئی اور جہاز نے پرواز کی تو میں نے سیف بیلٹ کھولتے ہوئے کہا "تیمور۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"
"انگریزی میں کہتے ہیں کہ انجام اچھا تو کام اچھا۔"
"میرا پاسپورٹ کہاں ہے؟"
"تمہارے پاس اور کہاں؟"
"شٹ اَپ۔ یہ شاہ عالم کا ٹکٹ اور پاسپورٹ ہے۔"
"اب تو اپنا ہی سمجھو اور کہو' سفر شروع کرنے سے پہلے دیکھا نہیں تھا؟"
"کاش کہ دیکھ لیتا۔۔۔"
"دیکھ لیتے تو کیا کرتے؟ سفارت خانے جا کے بتاتے اور پولیس رپورٹ لکھوا کے ڈپلی کیٹ بنواتے۔ ہم نے تو مشکل آسان کر دی تمہاری۔ کوئی پریشانی نہیں ہونے دی۔ دیکھو کیسے مزے سے فرسٹ کلاس میں وی آئی پی بنے بیٹھے ہو۔"
"ناصر عظیم کا ٹکٹ اور پاسپورٹ کہاں ہے؟"
"ہو گا کہیں' مجھے کیا معلوم؟"
"بکواس کرتے ہو تم۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں چوری کرانے والا تمہارے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔"
"کیا چوری ہو گئی تمہارے سامان کی۔ تم نے کوئی رپورٹ لکھوائی' ہوٹل والوں کو بتایا؟"
میرے لیے یہ سب برداشت کیے بنا چارہ نہ تھا "کیا وہ سامان بھی میرا نہیں ہے۔ شاہ عالم کا ہے؟"
"ظاہر ہے۔ شاہ عالم کے ساتھ ناصر عظیم کا سامان کیسے ہو سکتا ہے؟" تیمور نے مسکرا کے کہا۔
"میرے سامان میں۔۔۔ کچھ اہم چیزیں تھیں۔"
"سب کچھ مل جائے گا تمہیں لاہور پہنچ کے" وہ بولا۔
"خدا کے لیے یہ تو بتا دو کہ میرے سامان میں ایسی ویسی کوئی چیز تو نہیں ہے؟" میں نے کہا۔
"ہونی تو نہیں چاہیے۔ آخر تم ایک معزز اور شریف آدمی ہو۔ تم اپنے سیاسی مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔"
"کیا شاہ عالم بھی لندن میں تھا؟"
"کیا تم لندن میں نہیں تھے؟"
میں نے کہا "میری مراد تھی اصل شاہ عالم۔"
"تم ہی اصل ہو" وہ بولا "یہ کبھی مت بھولنا۔ اور اس سے کبھی انکار بھی مت کرنا۔ اب یہ ممکن نہیں رہا۔"
"اگر شاہ عالم لندن میں نہیں تھا۔۔۔ تو اس کے پاسپورٹ پر یہاں آنے کا اندراج کیسے ہوا؟ کیا وہ میرے ہی پاسپورٹ پر واپس جائے گا؟"
"یہ کیسی بچوں والی باتیں ہیں۔ اسے لندن آنے کی کیا

ضرورت تھی؟"
"کیا اس کے پاس دو پاسپورٹ ہیں؟"
"شاہ جی۔ دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔ اور کیا نہیں ہوتا۔"
میں نے کہا "تیمور۔ صرف وہی میرے کمرے میں جا سکتا تھا وہ بھی اس صورت میں کہ داڑھی صاف کرا دے۔"
تیمور نے افسوس سے سر ہلایا "اچھے خاصے سمجھدار بزنس مین ہو تم' اتنا تو سمجھتے ہو گے کہ پیسے کی طاقت سے بڑی طاقت کوئی نہیں۔ جتنے بند دروازے ہیں سب کھل جاتے ہیں۔ تم کو یہ سب سوچنے میں اپنی ذہنی توانائی ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں' آئندہ کے بارے میں فکر کرنی چاہیے۔"
"تیمور' ایک بات بتا دوں تمہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھ سے سب کچھ زبردستی کروا سکتے ہو تو تم بہت بڑا مغالطہ مول لے رہے ہو۔ میں ہرگز وہ رول ادا نہیں کروں گا جو PRISONER OF ZENDA کا تھا۔ میں تمہارا قیدی بن کے نہیں رہوں گا اور نہ تم مجھے کٹھ پتلی کی طرح اشاروں پر چلا سکو گے۔ مجھے جب اور جہاں موقع ملا میں تمہارا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ کسی پریس کانفرنس میں کسی جلسۂ عام میں اعلان کروں گا کہ میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں۔ تمہارا سارا کھیل وہیں ختم ہو جائے گا۔"
"اور تمہارا کیا بنے گا؟"
"میرا کچھ بھی بنے۔ میرے پاس مجبوری کا عذر ہو گا۔ مجھے دباؤ سے بلیک میل کیا گیا تھا اس لیے میں شاہ عالم بنا۔"
"ٹھیک ہے۔ اگر تم کو پرائم منسٹر ہاؤس کے مقابلے میں جیل زیادہ پسند ہے اور تم مرنا ہی چاہتے ہو تو تمہیں کون روک سکتا ہے۔ تمہارے اس انکشاف سے ملک کی سلامتی خطرے میں نہیں پڑے گی۔ کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ آسمان نہیں گر پڑے گا۔ پارٹی کو کم اور شاہ عالم کو زیادہ نقصان ہو گا۔ وہ روپوش ہو جائے گا۔ کچھ عرصے کے لیے۔ یا ہمیشہ کے لیے۔ آنے والے انتخابات میں ہماری سیٹیں کچھ کم ہو جائیں گی لیکن پارٹی رہے گی۔ اس کے بعد والے انتخابات تک ہم سارے معاملات ٹھیک کر لیں گے۔ لیکن تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ قانون سب کو تحفظ فراہم کر سکتا ہے مگر دوست' اس ملک میں قانون صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ تم کس سے تحفظ مانگو گے اور خود کو کیسے بچاؤ گے۔ تم اکیلے ہو اور تمہارے مقابلے پر دشمن ہو گی ایک طاقت ور پارٹی' اس کی پیرا ملٹری فورس "فاتح عالم" جس کا میں کمانڈر ہوں۔ تمہیں کیا معلوم اس میں کیسے کیسے لوگ شامل ہیں۔ سابق ہسٹری شیٹر۔ بدمعاش اور ڈاکو' جیل سے فرار کرائے جانے والے۔"
"میں ایسی باتوں سے نہیں ڈرتا۔"
تیمور ہنسا "مت کھوکھلا لہجہ ہے تمہارا۔ اچانک کسی دن تمہارے ایک کارخانے میں آگ لگ جائے گی۔"
"میرے کاروبار کی مکمل انشورنس ہے۔"
"پھر تم خود آگ کیوں نہیں لگا دیتے۔ اس لیے کہ انشورنس کمپنی سے معاوضہ وصول کرنے کے لیے خود آگ لگانا جرم ہے۔ انشورنس کمپنی تمہیں ایک دفعہ ہرجانہ ادا کر دے گی۔ دوسری بار بھی شاید کر دے پھر انہیں شک ہو جائے گا۔ دوسری اور تیسری جگہ آگ لگی تو تفتیش ہو گی۔ ثبوت ہم فراہم کر دیں گے کہ آگ خود تم لگا رہے تھے۔"
"بلاوجہ کوئی شخص ایسی حرکت نہیں کرتا۔ جب تک کہ وہ پاگل نہ ہو جائے آخر دنیا میں لاکھوں لوگ بزنس کر رہے ہیں۔"
"وجہ بھی ہم بتا دیں گے۔ تم اپنا سرمایہ کیش کرا کے اس ملک سے فرار ہونا چاہتے تھے۔ تمہیں اپنی زندگی خطرے میں محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ خیالی خطرہ نہیں ہو گا۔ تمہیں ٹیلی فون پر دھمکیاں ملی تھیں۔ تم پر قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ تمہارے گھر پر فائرنگ ہوئی تھی۔ پولیس کی رپورٹیں گواہ ہوں گی۔ اس کے علاوہ شاہ جی' خطرہ بھی اکیلے آدمی کو نہیں ہوتا اور سچی بات یہ ہے کہ اکیلا آدمی بہادر بھی بن سکتا ہے۔ سر سے کفن باندھ کے پھر سکتا ہے اور سینہ تان کے کہہ سکتا ہے کہ مار دو مجھے گولی۔ وہ منصب شہادت پر فائز ہونے کی خواہش بھی کر سکتا ہے مگر اکیلا کون ہوتا ہے دنیا میں۔ کچھ رشتے بڑے نازک ہوتے ہیں مثلاً ماں' بہن یا بیٹی کا رشتہ۔۔۔ یا محبوبہ کا رشتہ۔"
"تم شیطان سے زیادہ کمینے ہو۔"
وہ ہنسا "تم نے یہی کہا تھا اور ٹھیک کہا تھا۔ سیاست اور کاروبار میں اخلاقیات کا کیا دخل۔ تمہیں خطرات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ سوچنا چاہیے کہ تمہاری وجہ سے کس کس کی زندگی یا عزت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ خدانخواستہ وہ بوڑھا کرنل کسی حادثے کا شکار ہو جائے۔ تو اس کی پوتی بالکل اکیلی رہ جائے گی۔ یہ بڑی خراب بات ہے۔ یہاں کسی خوب صورت اور جوان لڑکی کو اکیلا رہنے کی اجازت نہیں۔"
"تم جیسے بھیڑیے آ جاتے ہیں۔۔۔ جو مُردار خور۔۔۔"
"جنگل کا قانون تو اسی کو کہتے ہیں اور اب تو عام آدمی بھی جانتا ہے کہ ہمارے شہر جنگل ہو گئے ہیں۔ تمہاری ایک بہن بھی ہے جس کی ساری ذمّے داری تمہارے کندھوں پر ہے۔"
"میں فضول بکواس سُننا نہیں چاہتا۔"
"او کے۔ ہم کام کی بات کرتے ہیں" تیمور نے کہا "تم نے اپنا پاسپورٹ کب کھول کے دیکھا تھا آخری بار؟"
میں نے کہا "شاید چھ مہینے پہلے۔"
"نہیں۔ پانچ ماہ قبل تم جرمنی گئے تھے۔ اس سے چھ ماہ قبل تم لندن آئے تھے۔ دو سال میں تین بار تم لندن گئے۔ دو بار جرمنی اور ایک مرتبہ فرانس' تمہارا یہ پاسپورٹ ساڑھے چار سال پہلے جاری ہوا تھا۔ چھ مہینے بعد اس کی تجدید ہو گی۔"

"تمہاری معلومات غلط نہیں ہیں۔"

"لیکن شاہ جی۔ تمہاری معلومات بڑی ناقص ہیں۔ اگر تم پھر اپنا پاسپورٹ دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ تمہیں پتا چلے گا کہ تم چھ بار لندن جا چکے ہو۔ دس بار پیرس اور دو مرتبہ ٹوکیو۔"

"ٹوکیو تو میں آج تک نہیں گیا۔"

"گئے ہو یار۔ ٹوکیوں کے علاوہ بھی کچھ عیاشی کے ٹھکانے ہیں۔ بنکاک اور ہانگ کانگ۔ تمہارے پاسپورٹ پر انٹری ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

وہ ہنس پڑا "پاسپورٹ دیکھ لینا۔ یقین آجائے گا۔ تم کس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ کتنے دن اور کتنی راتیں کہاں کہاں گزاری تھیں۔ کتنی کاریں اور کتنی لڑکیاں ہائر کی تھیں۔ سب کا ریکارڈ ہے۔"

"یہ سب شاہ عالم کرتا رہا' ناصر عظیم کے نام سے۔"

"ہاں۔ وہ اپنے نام سے کرتا تو تحالکین کبھی نہ کبھی نوٹ لگا لیتے اور اسکینڈل بناتے۔ تمہارے لیے کوئی رسک نہیں تھا کیونکہ تمہیں کوئی نہیں جانتا تھا مگر اب رسک ہو سکتا ہے۔"

"کیا شاہ عالم میرے نام سے جاری ہونے والے ڈپلی کیٹ پاسپورٹ پر سفر کرتا رہا تھا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے نام سے۔ میرا مطلب ہے ناصر عظیم ولد محمد عظیم کے نام سے تو کئی پاسپورٹ بھی ہو سکتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ان پر تصویر کسی اور کی ہوگی۔ پتا کچھ اور ہوگا۔ شاہ عالم نے کوئی جعلسازی نہیں کی۔ وہ پکڑے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ تمہارے اوریجنل پاسپورٹ کو استعمال کرتا رہا۔"

میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا "میرا اوریجنل پاسپورٹ اسے کہاں سے ملا؟"

"تمہارے گھر سے اور کہاں سے؟" امیر تیمور نے اطمینان سے کہا "تمہارے سب ملازم قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ اور تم اپنی چیزوں کی حفاظت بھی نہیں کرتے بلکہ اس معاملے میں خاصے بے پروا آدمی ہو۔ اگر تم ایک بار بھی پاسپورٹ کھول کے اندراجات پر غور کرتے تو سمجھ جاتے کہ کسی نے اسے استعمال کیا ہے مگر ہمیں ایسی کوئی رپورٹ نہیں ملی۔ تم پاسپورٹ اپنے ٹریول ایجنٹ کو بھجوا دیتے تھے۔ وہ سارا انتظام کر دیتا تھا' پاسپورٹ تمہیں واپس مل جاتا تھا' ٹکٹ کے ساتھ۔ تم اسے بریف کیس میں ڈال کے روانہ ہو جاتے تھے۔ تم نے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ اس کے کتنے صفحات بھر گئے ہیں اور اس پر کہاں کہاں کی ویزا اسٹیمپ ہے۔"

"تم میرا پاسپورٹ چوری کرتے تھے؟"

"نہیں۔ چوری کراتے تھے۔ اور استعمال کے بعد واپس کر دیتے تھے۔ ناصر عظیم کتنے دن اور کہاں رہا اور کیا کرتا رہا؟ اس کے کچھ تصویری ثبوت بھی ہیں۔ یہاں میرے پاس بھی ایک دو البم تو ہوں گے۔ دو ویڈیو فلمیں ہیں۔ تم خود دیکھو گے تو مزہ آجائے گا۔ اپنے غصے کو کنٹرول کرو نوجوان۔ تم اب شاہ عالم ہو۔ تمہاری پرسٹیج ہے اور پبلک امیج ہے۔ یوگا کی مشقوں سے تم نے اپنے نفس پر قابو پانا سیکھا ہے۔ تم اعصاب اور ذہن کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکتے ہو۔ یہاں مشتعل ہو کے گالی گلوچ اور مارپیٹ کرو گے تو تماشا بن جاؤ گے سب کے سامنے۔ شاہ عالم کی سیاسی ساکھ خراب ہوگی۔"

"تم میری زندگی خراب کرنے پر تُل گئے ہو۔۔۔"

تیمور نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ تمہارے لیے خوش قسمتی کے سارے دروازے کھل رہے ہیں۔ فائدہ اُٹھانے کے بجائے نقصان اُٹھانے کا کیوں سوچتے ہو۔ خدانخواستہ ہم ناصر عظیم کی مصروفیات کے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔ تمہارا ہر راز اس وقت تک راز رہے گا جب تک تم ہم سے تعاون کرتے رہو گے۔ تصویروں کے البم ویڈیو فلمیں اور دوسرے ثبوت انتہائی محفوظ جگہ پر ہیں۔ جس کا علم صرف مجھے ہے۔ جن کو تم چاہتے ہو ان کی نظر میں تمہاری عزت ہمیشہ برقرار رہے گی اور جب تم صاحبِ اختیار ہو جاؤ گے تو وہ سب کتنے خوش ہوں گے۔"

جہاز بحرِ اوقیانوس پر پرواز کرتا رہا۔ امیر تیمور بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔ میرا ذہن خلا میں معلق رہا۔ جب سفر تمام ہوا تو مجھے یقین آچکا تھا کہ میں ناصر عظیم نہیں 'شاہ عالم ہی ہوں۔

یہ ایک سال پہلے کی بات تھی جب حالات کے جبر نے ناصر عظیم کو شاہ عالم بنا دیا تھا۔ جسے امیر تیمور نے اس کی خوش قسمتی قرار دیا تھا' وہ اتفاق ناصر عظیم کی بدبختی کا نقطۂ آغاز بنا تھا۔ اس کی صورت شاہ عالم سے اس حد تک مشابہ نہ ہوتی تو اس کی زندگی سکون سے گزرتی' ہزاروں پاکستانیوں کی طرح وہ لندن آتا جاتا رہتا اور اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ ذاتی حیثیت کے سوا۔ خود مجھے علم نہیں تھا اور میری طرح پاکستان کے دس کروڑ لوگوں کو علم نہیں تھا کہ سیاسی مداری جو آج تک ہر طرح کی شعبدہ گری سے انہیں حیران' اور پھر پریشان کرتے آئے ہیں اس بار بالکل نیا اور ناقابلِ یقین حد تک انوکھا اور پُراسرار کھیل شروع کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

یہ عین ممکن تھا کہ امیر تیمور سے پہلے بھی کسی نے میری صورت دیکھ کے سوچا ہو یا کسی سے کہا ہو کہ دیکھو اس شخص کی صورت شاہ عالم سے کتنی ملتی ہے مگر ایسا تو زندگی میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہر شخص کو راہ چلتے بازار میں یا سفر کے دوران بس یا ٹرین میں کوئی چہرہ نظر آجاتا ہے جسے دیکھ کے وہ حیران رہ جاتا ہے۔ یار' یہ تو بالکل فلم اسٹار محمد علی ہے۔ کہیں وہی نہ ہو۔ مگر یار' ریلوے کی سیکنڈ کلاس میں۔ گھاس کھا گئے ہو۔ وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے والا شخص ہے جو جہاز میں بھی اکانومی کلاس میں سفر نہیں کرتا۔ کسی کو لگتا ہے کہ ایک صورت ہو بہو اس کے بھائی یا دوست جیسی تھی۔ مگر وہ یہاں کہاں۔ اسے تو انتقال کیے زمانہ ہوا۔ امریکا یا اوپر اللہ میاں کے پاس۔

میری صورت میں شاہ عالم کی مشابہت پر صرف امیر تیمور نے غور فرمایا اور پھر ہم شکل افراد پر بننے والی فلموں اور اسی موضوع پر لکھی جانے والی کہانیوں کے پس منظر میں اس نے سوچا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس اتفاق سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ابھی تک خود اس شخص کو علم نہیں کہ وہ ریڈی میڈ شاہ عالم ہے اور شاہ عالم کو خبر نہیں کہ اسی دنیا اور اسی ملک بلکہ اسی شہر میں ناصر عظیم نام کا ایک آدمی اس کی کاربن کاپی بنا پھر رہا ہے۔ جب امیر تیمور کی سمجھ میں آگیا کہ اپنی اس "دریافت" کو پیٹنٹ کرانے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ کیسے اٹھا سکتا ہے تو اس نے اپنے پورے منصوبے پر بڑی تفصیل سے اور انتہائی احتیاط سے تمام جزئیات پر ہوم ورک کرنے کے بعد دو حصوں میں عمل کیا۔ اس نے میرے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لیں اور پھر اس نے مجھے پوری طرح ٹریپ کرنے کے لیے جال بچھانا شروع کر دیا۔

اس نے معلوم کر لیا کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ کس کے ساتھ رہتا ہوں۔ میری کس سے دوستی ہے اور مجھے کس سے محبت ہے۔ میرے رشتوں کی زنجیر کتنی مضبوط ہے' ان سے میرے تعلق کی نوعیت اور اصلی حقیقت کیا ہے اور جذباتی طور پر ان رشتوں کی تقدیس برقرار رکھنے کے لیے اور ان کو تحفظ فراہم کرنے کی خاطر کس حد تک مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ رشتے میری کتنی بڑی کمزوری ہیں اور ان کو بچانے کے لیے میں مال و زر' اپنے مستقبل اور اپنی زندگی تک قربان کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتا ہوں یا نہیں؟

مجھے پھانسنے کے لیے اس نے اپنی مجرمانہ ذہانت کا بھرپور استعمال کیا تھا۔ اس نے میرا پاسپورٹ حاصل کرنے سے پہلے دیکھا ہوگا کہ کاروباری دورے میں سال میں کتنی بار کرتا ہوں' کب کرتا ہوں اور کہاں جاتا ہوں؟ اس نے میرے کسی نمک حرام ملازم کو بہت بڑی رشوت دی ہوگی۔ میرے سب ملازم میرے یقین کے مطابق قابلِ اعتماد تھے اور مجھ سے خوش بھی تھے لیکن آدمی کا ایمان اور ضمیر بھی بڑا عیار اور سودے باز ہے۔ کسی چالاک دکان دار کی طرح جو پانچ سو کی چیز کے دام ہزار بتاتا ہے۔ گاہک سات سو کہے تو روتا پیٹتا ہے کہ جی اتنے کی تو خرید بھی نہیں۔ ساڑھے سات پر چلّاتا ہے کہ جناب ساری مارکیٹ دیکھ لو۔ پھر ساڑھے نو میں' مجھ سے لے لینا۔ آٹھ پر فریاد کرتا ہے کہ گھاٹا ہو جائے گا۔ چلو یوں کرو پورے نو میں اور گاہک سے ساڑھے آٹھ لے کر رکھ لیتا ہے۔ ایسے ہی ضمیر سے بہانے کرتا ہے۔ یہ تو بڑی بُری بات ہے۔ ایسا کرنا تو غیر اخلاقی جُرات کہلائے گی۔ میں یہ گناہ نہیں کر سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کسی کو معلوم ہو گیا تو۔ پھر قیمت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک مرحلے پر ضمیر صاحب سر جھکا دیتے ہیں کہ اچھا۔ یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ ہم کون سے بڑے پارسا تھے۔ ساری عمر گناہ کیے۔ ایک گناہ اور سہی۔ رہی دنیا کی بات تو وہ پہلے ہمیں کب اچھا کہتی ہے اور ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں' بھاڑ میں جائیں سب۔

تو ایسے ہی میرے کسی نمک خوار نے اپنے وفاداری اور ضمیر کی زیادہ سے زیادہ ملنے والی قیمت وصول کر لی اور امیر تیمور کو میرا پاسپورٹ دے دیا۔ یہ پاسپورٹ میری لکھنے کی میز کی دراز میں یا الماری کے ایک خانے میں بہت سے دوسرے کاغذات' چیک بکس' ڈیپازٹ بکس اور دیگر دستاویزات کے ساتھ پڑا رہتا تھا۔ یہ پاسپورٹ کئی دفعہ گیا اور واپس آیا۔ اس میں بہت سے اندراجات ہو گئے لیکن مجھے پتا نہیں چلا۔ امیر تیمور کا اندازہ ٹھیک تھا۔ میں نے کبھی اسے کھول کے دیکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں اپنے سیکریٹری سے کہتا تھا کہ فلاں تاریخ کو مجھے فلاں جگہ جانا ہے۔ ٹریول ایجنٹ کو فون کرو۔ ٹریول ایجنٹ آتا تھا اور پاسپورٹ لے جاتا تھا۔ پھر ٹکٹ آجاتا تھا' سیٹ کنفرم ہو جاتی تھی اور میں صرف ایک چیک کاٹتا تھا۔ پھر پاسپورٹ ٹکٹ۔ ٹریولرز چیک اور اہم دستاویزات بریف کیس میں ڈال کے روانہ ہو جاتا تھا۔ اور اسی غفلت یا بے پروائی کے باعث اس وقت میرا پاسپورٹ میرے پاس نہیں تھا۔ غالباً شاہ عالم کے پاس تھا۔ اس پر ہانگ کانگ۔ وہ گیا تھا' سنگاپور اور ٹوکیو وہ گیا تھا مگر نام میرا استعمال ہوا تھا۔ اس کی تصویریں اور ویڈیو فلمیں دیکھ کے کون کہہ سکتا تھا کہ وہ میں نہیں۔ خدانخواستہ انہیں چندا دیکھ لے یا قمر تو۔۔۔ اس خیال سے ہی میرے جسم پر ٹھنڈا پسینہ آنے لگتا تھا' میرا دل ڈوبنے لگتا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجاتا تھا۔ انہیں مجھ پر لاکھ اعتماد سہی۔ کیا میری وضاحت انہیں پوری طرح مطمئن کر سکتی تھی؟ خصوصاً ان حالات میں کہ میرے بدنام ماضی کے سائے آج بھی مجھے اپنی زندگی پر سایہ فگن محسوس ہوتے تھے۔ یہ میرے دل کا چور تھا جو اعتماد کرنے والی آنکھوں میں بھی شک بھرا سوال پڑھ لیتا تھا کہ ناصر عظیم۔ بُرائی میں بڑی کشش ہوتی ہے اس لیے کہتے ہیں کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ کہیں تمہارے قدم صراطِ مستقیم سے بھٹک تو نہیں جائیں گے؟ تم پھر طوافِ کوئے ملامت کو تو نہیں جاؤ گے۔ پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے۔

میری نیند بھوک سب اُڑ گئی تھی۔ میں سخت پریشانی میں مبتلا تھا اور ابھی تک کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فیصلہ مجھے نہیں کرنا۔ فیصلہ تو کرنے والے کر چکے تھے۔ مجھے یہ سوچنا تھا کہ کیا میں انکار کر سکتا ہوں۔ انکار کرنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ انکار کے نقصانات کیا ہو سکتے ہیں۔ مجھے یا دوسروں کو اور کیا میں کوئی جوابی کارروائی کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ جس سے امیر تیمور کے ہوائی قلعے زمیں بوس ہو جائیں۔ اس کا منصوبہ فلاپ ہو جائے اور وہ کفِ افسوس ملتا رہ جائے۔

ابھی تک مجھے کچھ نہیں سوجھا تھا اور میں امیر تیمور کے لبوں پر وہ پُرتمسخر فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ سکتا تھا جو سوال کرتی تھی کہ بولو میں

کون؟ مداری' تم کون۔۔۔ بچہ جمورا۔ جو پوچھے گا بتائے گا؟ بتائے گا۔۔۔ نام کیا ہے' ناصر عظیم یا شاہ عالم؟

جب کھانا آیا اور میں نے انکار کردیا تو امیر تیمور نے کہا "کھانا کھالو' سوچنے کے لیے دماغ کو بھی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پیٹ خالی ہو تو عقل فاقہ نہیں کرتی۔ گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔"

"مجھے اب سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"گویا تم سوچ کے کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو۔ ویری گڈ۔۔۔ یہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے سوچنے کے لیے اب کچھ نہیں رہا۔ یہ دوسرا نتیجہ حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ تم کو ایک اچھے ایکٹر کی طرح اسکرپٹ کے مطابق اداکاری کرنا ہے۔ ہدایت کاری میرا کام ہے۔ بلاوجہ اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ جسٹ ریلیکس۔ میرے ساتھ تعاون کی صورت میں تمہارے لیے کوئی رسک نہیں ہے۔ عیش ہی عیش ہے۔ اس مرحلے پر انکار کرکے تم اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ان سب کو برباد و فنا کرنے کی غلطی نہیں کرسکتے۔"

"میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ سب کچھ۔ جو میرے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔" وہ کھاتے کھاتے بولا۔

میں نے کہا "مثلاً کیا تعلق ہے میرا کرنل خان سے؟"

"کچھ نہیں" وہ بولا "آٹھ دس سال سے تم اس کے ساتھ ہو۔ تمہاری زندگی کو کامیابی کے صحیح خطوط پر استوار کرنے والا وہی ہے۔ اس نے تمہیں سنبھال لیا۔ تمہاری تربیت اور راہنمائی کی۔ تمہیں سہارا دیا اور ایک گھر دیا۔ توجہ اور محبت دی۔ ظاہر ہے تم اس کو باپ کی جگہ سمجھتے ہو۔ وہ تمہاری دستگیری نہ کرتا تو شاید تم اسی طرح غلط راستوں پر بھٹکتے ہوئے بالآخر چارلس سوبھراج جیسی کوئی چیز بن جاتے۔ تم لاکھوں کروڑوں کما کے بھی بے گھر رہتے۔ بے عزت ہوتے اور کیا پتا جیل میں سڑ رہے ہوتے یا پھانسی چڑھ چکے ہوتے۔"

"میرے ماں باپ اور گھر کے بارے میں تم نے کچھ معلوم نہیں کیا؟"

"وہ تو خود تم معلوم نہیں کرسکے۔ تم صرف اتنا جانتے ہو کہ تمہارے باپ کا نام عظیم تھا۔ محمد عظیم' عظیم بیگ یا عظیم احمد۔۔۔ کیونکہ عظیم تمہارے نام کا حصّہ ہے۔ تم اسے مسلسل تلاش کررہے ہو۔ باپ کا پتا چل جائے تو تمہیں ماں کے بارے میں معلوم ہوسکتا ہے۔ ماں سے دوسرے بھائی بہنوں کے متعلق مگر تمہاری تلاش کا حاصل صفر ہے۔ تم نے بہت جھک ماری ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں گئے ہو۔ کس کس سے ملے ہو مگر ہر خبر یا افواہ بے بنیاد ثابت ہوئی ہے۔ آخری بار تم کراچی میں ایک پاگل فقیر کے پیچھے لگ گئے تھے جو سڑک پر ننگا ناچ رہا تھا۔"

"وہ فقیر نہیں تھا۔"

"ہاں۔ یہ بات تمہیں اس کے گھر جاکے معلوم ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "اس وقت بھی تم میرا پیچھا کررہے تھے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "میں کہتا ہوں شاہ جی۔ مایوسی گناہ ہے۔ کیا پتا اس میں بھی بہتری ہو۔ شاہ عالم کی پوزیشن میں تمہارے وسائل بہت زیادہ ہوں گے۔ تمہاری رسائی ہر جگہ ہوگی۔ تمہارے اشارے پر ہوگا ہر کام' تمہارے پاس سیکڑوں نہیں ہزاروں کارکن ہوں گے۔ تمہارے ڈسپوزل پر لاکھوں آنکھیں اور لاکھوں ہاتھ ہوں گے جو ساری دنیا کو کھنگال ڈالیں گے۔ فوری طور پر تمہیں جس خاندانی بیک گراونڈ کی ضرورت ہے۔ وہ تو تمہیں مل ہی جائے گا۔ لیکن تم خاموشی سے اس محمد عظیم یا عظیم بیگ کی تلاش جاری رکھ سکتے ہو جو تمہارے یقین کے مطابق تمہارا باپ تھا۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو" میں نے کہا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا "لیکن ہر کام تمہاری مرضی کے مطابق نہیں ہوگا امیر تیمور۔ تم مجھے سوچنے کا موقع دینے پر تیار نہیں ہو۔"

اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "دراصل سوچنے کی گنجائش اب رہی نہیں۔"

میں نے کہا "مگر ابھی ہمارے درمیان معاہدے کی شرائط طے ہونا باقی ہیں۔ یہ یکطرفہ اور غیر مشروط معاہدہ نہیں ہے۔ تم مجھے حکم نہیں دے سکتے کہ آنکھیں بند کرکے دستخط کردو۔ اگر میں تمہارا ساتھ دوں گا تو اسی معاہدے کی بنیاد پر کیونکہ میں تمہارے حکم کا غلام بننے پر مرنے کو اور مارنے کو ترجیح دوں گا۔"

"تم پارٹی کے چیئرمین کی جگہ رہو گے۔ میری حیثیت ثانوی ہوگی۔ پھر تم کو حکم کا غلام کون سمجھ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ بات ابھی سے سمجھ لو کہ خواہ تمہارے عزائم کچھ بھی ہوں۔ تم مجھے کٹھ پتلی بناکے اپنے اشاروں پر نہیں چلا سکو گے۔ جو کام سب کے مفاد میں ہوگا اس سے مجھے انکار نہیں مگر ایسا کوئی کام میں نہیں کروں گا جس کا خمیازہ مجھے یا میری فیملی کو بھگتنا پڑے۔ میری فیملی انہی چار افراد پر مشتمل ہے۔ مجھے ان کے تحفظ کی مکمل ضمانت چاہیے۔"

"وہ بالکل محفوظ رہیں گے" تیمور نے مجھے تسلی دی "ان کا شاہ عالم کے معاملات سے نہ اب کوئی تعلق ہے' نہ بعد میں ہوگا۔ جب وہ INVOLVE ہی نہیں ہوں گے تو ان کے لیے RISK بھی کوئی نہیں۔ ہاں اپنی پوزیشن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تم ان کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہو۔"

"نہیں تم ان کے حال پر چھوڑ دو تو بڑی مہربانی۔ ان کے اور میرے تعلقات کی نوعیت بھی وہی ہوگی جو آج ہے۔ تم اس میں حائل ہونے کی کوشش بھی مت کرنا۔ نہ بالواسطہ طور پر نہ بلاواسطہ۔"

وہ متفکر نظر آنے لگا "یعنی۔۔۔ تم ان سے بھی تعلق رکھو گے؟"

"امیر تیمور۔ یہ کتنا احمقانہ سوال ہے" میں نے کہا "انہی کی وجہ سے تم مجھے بلیک میل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ میری اپنی مجبوری کوئی نہیں تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ تم مجھے مرواسکتے تھے۔ انہیں میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

"یہ ذرا غور طلب مسئلہ ہے کیونکہ ابھی تک تو شاہ عالم کا ان سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں تھا۔"

"مگر میں ناصر عظیم ہوں اور ان کے لیے ناصر عظیم ہی رہوں گا۔ میں ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہوں مگر ان سے نہیں۔ کرنل خان میرے باپ کی جگہ ہے۔ ڈاکٹر کمال میرا بھائی ہے۔ قمر میری چھوٹی بہن' مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے اور چاندنی' وہ میری دنیا ہے۔"

امیر تیمور نے کہا "شاہ جی۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ایک پارٹی کے چیئرمین کو ہر بات معلوم ہوتی ہے۔ صرف پارٹی کے نہیں بعض اوقات حکومت کے راز سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے جو ہمدرد اور ہم خیال' حامی اور روز مختلف محکموں اور حسّاس اداروں میں بیٹھے ہیں۔ وہ گمنام فون کردیتے ہیں یا خفیہ انفارمیشن ڈاک سے بھیج دیتے ہیں۔ دستاویزی ثبوت کسی بدعنوانی کے' برسرِ اقتدار پارٹی کے وزیروں اور ممبروں کے اشارے پر ہونے والے گھپلوں کی تفصیل۔ یہ سب سیاسی مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ کسی اور سے ڈسکس بھی نہیں ہوسکتے۔"

میں نے کہا "جہاں تک تعلق ہے حسّاس نوعیت کے سیاسی معاملات کا تو اتنی عقل مجھ میں بھی ہے کہ انہیں سمجھ سکوں اور فیصلہ کرسکوں کہ کون سی بات کسے بتائی جاسکتی ہے اور کسے نہیں۔ جب تم مجھ پر بھروسا کررہے ہو تو پھر یہ ناممکن ہے کہ کوئی راز مجھ سے چھپا رہے۔ میں تمہارے خلاف ہوجاؤں تو ہر بات تمہارے سیاسی حریفوں تک پہنچا سکتا ہوں۔ اخبار والوں کو لیک کرسکتا ہوں ایسے کہ تمہیں پتا بھی نہ چلے مگر میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ جانتے بوجھتے میں کوئی ایسی حرکت کروں جس کا خمیازہ تمہارے ساتھ مجھے بھی بھگتنا پڑے اور میری فیملی کو بھی۔ لیکن یہ بات میں انہیں یقیناً بتاؤں گا کہ ناصر عظیم سے میں شاہ عالم بن گیا ہوں۔"

"تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ان چاروں کو آزمائش میں نہ ڈالو۔ ممکن ہے تمہارے لیے وہ پوری طرح قابلِ اعتماد ہوں۔ مگر ہمارے لیے مسئلہ یہ ہوگا کہ تمہارے ساتھ ہم ان کی بھی نگرانی کریں۔ وہ پریشان ہوں گے۔ آگے جاکے ان کے لیے مسائل بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ جب تک تم شاہ عالم نہیں بن جاتے۔"

"وہ تو میں بن گیا۔"

"نہیں۔ ابھی تم اس کی ڈپلی کیٹ ہو۔ اس کے ڈبل کی حیثیت سے رہو گے۔"

"شاہ عالم کی مرضی سے؟"

"ظاہر ہے اس کی مرضی سے۔ یہ اس کی خواہش ہے لیکن میں نے تمہیں بتادیا ہے کہ بالآخر تم کو ہی اس کی جگہ لینی ہے۔ بیک وقت دو شاہ عالم زیادہ عرصہ ساتھ نہیں چل سکتے۔ وہ تم پر کڑی نگرانی رکھے گا۔ تم کو اپنی مرضی سے کہیں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ تم جہاں جاؤ گے اس کے خاص محافظ تمہارے ساتھ ہوں گے۔ اور یہ صورتِ حال تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔ مگر کچھ عرصہ تمہیں یہ سب برداشت کرنا ہی پڑے گا۔"

"کتنا عرصہ؟"

"ابھی میں کیا بتا سکتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ رہو گے تو تمہیں اس کی عادات و معمولات کا علم ہوجائے گا۔ وہ کس کس سے ملتا ہے' کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا۔ شاہ عالم کے ماں باپ ہیں۔ ان کے ساتھ شاہ عالم کا رویّہ کیسا ہے۔"

"او مائی گاڈ۔ ماں باپ ہیں تو بھائی بہن بھی ہوں گے۔"

"نہیں۔ اب وہ اکیلا ہی ہے۔ اس کا ایک بھائی امریکا میں کہیں سیٹل ہوگیا ہے۔ بہن بچپن میں ہی مرگئی تھی۔ نانیھال ددھیال؟ جلا ہو گئے۔"

"اس کے کزن' چاچے ماے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "ہیں تو سہی مگر شاہ عالم سے کسی کا رابطہ نہیں۔ اصل خطرہ ہے اس کی بیوی۔"

میں اُچھل پڑا "بیوی۔۔۔! وہ شادی شدہ ہے؟"

"ہاں۔ اس کی بیوی کا نام ہے رخشندہ۔ وہ ماں باپ کے ساتھ رہتی ہے۔"

"کس کے ماں باپ کے ساتھ؟"

"شاہ عالم کے۔ انہیں شاہ عالم نے الگ کوٹھی میں رکھا ہے۔"

"کیا مطلب؟ وہ خود وہاں نہیں رہتا" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے وہ اس کا گھر ہے اور وہ وہیں رہتا بھی ہے۔ میرا مطلب تھا کہ ان کا پارٹی سے یا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ شاہ عالم جب گھر جاتا ہے تو پھر اس کا کسی سے رابطہ نہیں رہتا۔ وہاں کوئی اسے فون نہیں کرسکتا اور اس سے ملنے نہیں جاسکتا۔ اسے بہت کم وقت ملتا ہے اپنی فیملی کے لیے۔ ہفتے میں ایک دو بار وہ چند گھنٹوں کے لیے چلا جائے تو چلا جائے۔ باقی وقت وہ شاہ پیلس میں گزارتا ہے۔ اسے فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"اور اس کی بیوی! وہ بھی گھر سے نہیں نکلتی؟"

"پہلے تو نہیں نکلتی تھی۔ لیکن اب وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔ کبھی اچانک شاہ پیلس پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے مسلسل تنہائی اور عدم توجہی کے باعث وہ نفسیاتی اور اعصابی مسائل سے دوچار ہے۔ کچھ شاہ عالم کی مصروفیات ایسی ہیں جو کسی بھی عام عورت کے لیے قابلِ اعتراض ہوتی ہیں" وہ مجھے آنکھ مار کے ہنسا۔

"اس معاملے میں ہر عورت عام عورت ہوتی ہے" میں نے

کہا "وہ ایک مرد کی ساری محبت چاہتی ہے۔ بلا شرکت غیرے۔ اس کی زکواۃ بھی کسی کو ملے۔ یہ اس سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"شاہ عالم تو عام مرد نہیں ہے۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ وہ عام آدمی نہیں ہے۔ مرد اور عورت کے حوالے سے بات کرو گے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس رشتے میں عام اور خاص کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں چاندنی سے محبت کرتا ہوں تو وہی سب کچھ ہے میرے لیے۔ ملکہ برطانیہ کے لیے بھی ایک ہی مرد سب کچھ ہے۔ محبوب بھی اور شوہر بھی۔ صدرِ امریکا خاص آدمی ہو تو اسے کوئی استحقاق حاصل نہیں ہو جاتا کہ ایک بیوی پر اکتفا نہ کرے۔ آدمی جتنا اہم ہو اس کی اخلاقی ذمے داری اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔"

"یار، تم تو ہو شیخ سعدی۔" امیر تیمور نے بے زاری سے کہا "میں شاہ عالم کی بات کر رہا تھا۔ اگر وہ تمہارے فلسفۂ اخلاق پر عمل نہیں کرتا تو کون کیا کر سکتا ہے۔ اس کا واسطہ ہر قسم کی لڑکیوں سے اور عورتوں سے پڑتا ہے۔ پارٹی ورکر، صحافی، اپنے مسائل لے کر آنے والی۔ اور سب سے بڑھ کر عام لوگوں سے جن میں اس کے پرستار بہت ہیں۔ بندہ بشر ہے۔ کبھی خود پھنس جاتا ہے تو کبھی کسی کو خود بھی پھانس لیتا ہے۔ مجبوری، ضرورت اور مصلحت کے ہزار تقاضے ہوتے ہیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"پھر اسے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"او یار۔ اب کرلی ہے تو میں کیا کروں۔ میری کیا غلطی ہے اس میں اگر اس کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی۔"

"اس لیے کہ بندہ بشر صرف شاہ عالم ہے۔ اس کی بیوی نہیں۔ مجبوری ضرورت یا مصلحت کے تحت وہ کچھ کرے تو فاحشہ!"

"یہ بھی میرا قصور ہے۔ اگر یہ معاشرہ اور اس کی اخلاقی قدریں غلط ہیں یا لوگ دُہرے معیار رکھتے ہیں....." امیر تیمور جھلا گیا "تم کیوں پریشان ہو شاہ عالم یا اس کی بیوی کے لیے۔ اپنی نجی زندگی کے مسائل سے وہ خود نمٹ لیں گے۔ تم کو شاہ عالم کے ڈبل کا رول کرنا ہے، صرف سیاسی رول۔"

"اور اگر اس کی بیوی نے مجھے اپنا شوہر سمجھ لیا!"

وہ مسکرایا "تم آدمی ہو اور قسم کے۔ ذرا مولوی ٹائپ ورنہ میں تو کہتا ہوں کہ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ تم بھی سمجھ لینا اسے اپنی بیوی، گناہ اس کے سر۔ ویسے بھی وہ بڑی زوردار چیز ہے۔ دیکھو گے تو مجھ سے اتفاق کرو گے۔"

"فضول بات مت کرو۔ اگر اس نے یہ جان لیا کہ میں جعلی شاہ عالم ہوں۔"

"وہ کیسے جان سکتی ہے؟"

"امیر تیمور۔ تم شادی شدہ ہو؟"

"ہاں۔ خیر سے دو بچے بھی ہیں۔"

میں نے کہا "پھر کیا تم بیوی کے معاملے میں دھوکا کھا سکتے ہو۔ فرض کرو تمہاری بیوی جیسی دوسری عورت ہو۔ اس کا نقش ثانی۔ تو کیا تمہیں پتا نہیں چلے گا۔ عورت کی نظر تو ایکس رے کرتی ہے مرد کا۔"

"عورت کو خاصا سمجھتے ہو تم" وہ معنی خیز طریقے پر ہنسا "یہ کتابی بات نہیں تجربے سے پتا چلتا ہے۔ خیر، شاہ عالم کی بیوی کو اصل اور نقل کا فرق صرف ایک جگہ معلوم ہو سکتا ہے اور وہ جگہ ہے اس کا بیڈ روم۔ وہاں تم نہ جا سکتے ہو اور نہ جاؤ گے۔ باہر بھی وہ شاہ عالم کسی جگہ اکٹھے نظر نہیں آئیں گے۔ اس کا انتظام کرنا میری ذمے داری ہے۔ اگر کبھی وہ تمہارے پاس پہنچ جائے اور ویسی ہی باتیں کرنے لگے جیسی اپنے شوہر سے کرتی ہے تو تم بھی شاہ عالم جیسا سلوک کر سکتے ہو اس کے ساتھ۔"

"وہ کیا کرتا ہے؟"

"فکر مت کرو۔ ایک بار تم کو یہ سین دکھا دیں گے۔ تم ان کی باتیں خود سُن لینا ورنہ یار اتنا تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ ایک دوسرے سے کیا کہتے ہوں گے اور کیسے پیش آتے ہوں گے۔ ایک عورت ہے جس کا شوہر اسے توجہ اور محبت نام کی کوئی چیز نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے ایک بھرپور اور پُرکشش عورت ہے۔ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ نظر آتا ہے اور گھر سے غائب رہتا ہے۔ اب اگر فرشتے بھی آ کے گواہی دیں کہ شوہر بڑا وفادار ہے اور نیک ہے۔ وہ کسی عورت سے ملتا ہے یا کسی کے ساتھ جاتا ہے تو کام سے۔ مگر کوئی بیوی یہ دل سے نہیں مانے گی۔ مجبوری یا مروت میں کچھ نہ کہے، یہ دوسری بات ہے۔ رخشی نے تو جاسوس لگا رکھے ہیں شوہر کے پیچھے اور وہ اس کو جو رپورٹیں دیتے ہیں وہ جائز حد تک تشویش ناک، افسوس ناک، خطرناک وغیرہ ہوتی ہیں۔ ان حالات میں رخشی کبھی آفس آئے گی تو کیا شوہر کو مردانگی کا تمغا دے گی؟ یا اس کی فتوحات پر خراجِ تحسین پیش کرے گی؟ جواب میں شاہ عالم جیسا شوہر کیا کہے گا اور کرے گا۔ یہ سین تم IMAGINE بھی کر سکتے ہو۔"

"شاہ عالم کے بچے نہیں ہیں؟"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ نہیں ہیں۔ اس کی بیوی نے اتفاقاً نہیں ہونے دیے۔ قہرِ درویش برجانِ درویش۔"

"ایک بات مجھے ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ شاہ عالم مخصوص ضروریات کے لیے اپنا ایک ڈبل رکھنے کے خیال سے متفق ہے مگر کیا وہ مجھے جانتا ہے؟"

"ہاں۔ کسی حد تک" امیر تیمور نے تذبذب سے کہا۔

"کس حد تک۔ کیا اسے معلوم ہے کہ میں کوئی ضرورت مند نہیں ہوں۔ یہ کام کرنا کیوں قبول کر رہا ہوں میں جب کہ میرے پاس اپنے کام بہت ہیں۔ میرا اتنا وسیع کاروبار ہے کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ آج بھی میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں شاہ عالم کو خرید کر خیرات کر دوں یا ضائع کر دوں۔"

"اسے یہ معلوم ہے کہ تم ناصر عظیم ہو۔ اس کے ڈپلی کیٹ بننے کے اہل ہو۔ اس کے پرستار ہو اور شاہ عالم پر اپنی جان تک نچھاور کر سکتے ہو.... اس کا خیال ہے کہ تم ضرورت مند بھی ہو۔ دراصل اسے یہ بتانا ضروری تھا ورنہ وہ شک کرتا۔"

مجھے سخت غصہ آیا "یعنی میں یہ کام پیسے لے کے کروں گا؟ کیا معاوضہ ہو گا میرے اس فراڈ کا۔ اس جعلسازی کا؟"

"ٹیک اِٹ ایزی شاہ جی!"

"بھاڑ میں گئے شاہ جی۔ میں ناصر عظیم ہوں۔"

"آہستہ بولو۔ یہ جہاز والے تو تمہیں شاہ عالم سمجھ رہے ہیں اور دوسرے لوگ بھی۔" اس نے خباثت سے کہا "پاسپورٹ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اور اس دنیا کا قانون کچھ ایسا ہے کہ صرف ثبوت اور گواہ ہوں تو بندہ پھانسی پر لٹک جاتا ہے خواہ اس نے پوری زندگی میں چیونٹی بھی نہ ماری ہو۔ اور گواہ ثبوت نہ ہوں تو اصل قاتل بے فکری سے گھومتا ہے۔"

"اس وقت میرا اصل پاسپورٹ کہاں ہے۔ تم ضرور جانتے ہو۔"

"ہاں۔ تمہارے پاسپورٹ پر شاہ عالم دو دن قبل ہی لندن سے جزائر بالی چلا گیا تھا۔ سیاحوں کی جنتِ ارضی..... غالباً وہاں وہ تمہاری عیش کوشی کے کچھ اور ثبوت چھوڑے گا۔ کسی ہوٹل میں نائٹ کلب میں۔ پھر اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ نئی ویڈیو ریلیز کر دے" اس نے قہقہہ مارا "وہ دو دن بعد پہنچے گا واپس براستہ ہانگ کانگ۔"

میں نے کہا "تم نے کہا تھا۔ کہ اگر میں فرنچ کٹ داڑھی رکھ لوں تو بالکل شاہ عالم نظر آؤں گا۔ اس کا مطلب ہے شاہ عالم کے چہرے پر داڑھی ہو گی جیسی کہ پاسپورٹ پر تصویر میں بھی ہے، رائٹ۔"

"ABSOLUTELY"

"مگر میرے پاسپورٹ پر میری تصویر میں داڑھی نہیں ہے۔"

"شاہ عالم بھی وضاحت پیش کر سکتا ہے۔ جیسی تم نے لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر کی تھی۔ تمہاری داڑھی پہلے تھی اب نہیں ہے، اس کی اب ہے پہلے نہیں تھی۔ اس میں کوئی بات خلافِ قانون نہیں۔ اس کے علاوہ تم سے بات کرنے کے بعد میں نے اسے فون کیا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ سب کام ٹھیک ہو گیا ہے مگر وہ داڑھی صاف کرا دے۔ وہ کوئی مولانا تو ہے نہیں اور نہ داڑھی اس نے شرع کے احترام میں رکھی تھی۔ وہ تو بس ایک اسٹائل کی بات تھی۔ یل برینر کو جانتے ہو؟ بڑا اچھا ایکٹر تھا۔ اسٹائل کے لیے وہ ہر روز سر کا شیو کرتا تھا۔ یہ اس کی انفرادیت تھی۔ ممکن ہے اندر پر کھیر بھی کرتا ہو۔ خیر شاہ عالم نے مجھ سے کہا کہ وہ صاف کرا دے گا۔ اسے کوئی خاص جذباتی وابستگی نہیں ہے اس داڑھی سے لیکن وہ عام آدمی نہیں عوامی آدمی ہے۔ پبلک میگزین یہ سوال ضرور ہو گا کہ اس نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی۔ اس کا جواب بھی معقول ہونا چاہیے اور جواز بھی۔ شاہ عالم کہے گا کہ لندن میں کچھ اسکن پرابلم ہو گئی تھی۔ چہرے پر دانے نکل آئے تھے۔ علاج کے لیے صاف کرانی پڑے۔"

مجھے اس جواب سے کچھ مایوسی ہوئی "گویا سب پہلے سے طے تھا۔ میری رضامندی حاصل کیے بغیر۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تمہیں اعتراض یا انکار نہیں ہو گا۔"

"میں اس وقت انکار کر سکتا ہوں۔"

"بار بار یہ بات کہہ کے تم میری قوتِ برداشت کا امتحان لے رہے ہو" وہ مشتعل ہو گیا۔ "تمہارے اختیار میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔ تم اب میرے رحم و کرم پر ہو۔ میری تحویل میں ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مارشل آرٹ میں ماسٹر ہو لیکن میں بھی احمق نہیں ہوں۔ جا کے ایک چکر اکانومی کلاس کا لگاؤ۔ تمہیں مسٹرڈ کلر کی جینز میں کچھ لوگ نظر آئیں گے۔ ان کی شرٹس الگ ہیں مگر پتلونیں ایک ہی ہیں۔ یہ سب جوان اور صحت مند لوگ ہیں تم جیسے اور یہ سب میرے ساتھ گئے تھے۔ تمہیں لندن سے لانے کے لیے۔ تم نے عقل سے کام لیا اس لیے فرسٹ کلاس میں میرے ساتھ آرام سے بیٹھے ہو ورنہ تمہیں کسی تابوت میں بھی پیک کیا جا سکتا تھا۔ تابوت کارگو سیکشن میں رکھا جاتا اور اندر تم مُردے کی طرح پڑے رہتے۔"

شاید پہلی بار میں نے خود کو نروس محسوس کیا۔ امیر تیمور میری توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا۔ اس نے واقعی میرے لیے انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ تصدیق کے لیے میں نے اکانومی کلاس کا چکر لگا کے دیکھ لیا۔ وہاں چھ افراد مسٹرڈ کلر کی جینز پہنے الگ الگ بیٹھے تھے اور بظاہر عام مسافر تھے۔ صورت اور حلیے سے بالکل بے ضرر لگنے والے۔ ان میں سے کسی نے نظر اُٹھا کے بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ وہ سب رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھے اور ان کے پاس ایک ہی رسالہ تھا۔ وہ سب انگریزی کے قدرے بدنام میگزین پلے بوائے کا تازہ شمارہ لیے بیٹھے تھے اور ظاہر ہے پڑھنے سے زیادہ اسے دیکھنے میں مگن تھے۔ اس طرح چھ افراد نے اپنی جداگانہ پہچان بنالی تھی جس پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

میں بُری طرح پھنس گیا تھا اور اچانک مجھ پر گھبراہٹ سوار ہو گئی تھی۔ عملی طور پر میں ایک مجرم تھا اور قیدی تھا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اعلان کر دینا چاہیے کہ میں ناصر عظیم ہوں اور خود کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ صاف بتا دینا چاہیے کہ امیر تیمور نے مجھے کیسے ٹریپ کیا تھا یا خاموشی سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ میں امیر تیمور پر کوئی الزام عائد تو کر سکتا تھا مگر ثابت نہیں کر سکتا تھا

جیسا کہ میرے خلاف اس کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ سب اتنا خطرناک مواد تھا کہ معاملہ صرف میرے جیل جانے سے ختم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد میرا کچھ بھی نہیں رہتا تھا۔ صرف پیسے کا رشتہ کوئی کے کام نہیں آتا۔ خان جی اور چندا' کمال یا قمر کے بغیر میرا جینا محال تھا اور یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ ان کی اور خود اپنی نظر سے گر جانے کے بعد میں اکیلا ہو جاؤں گا۔ وہ سب مجھے پھر DISOWN کر دیں گے کہ جاؤ تم غلاظت سے آئے تھے اور تمہیں غلاظت کی دلدل ہی پسند تھی۔ میری صفائی' میری قسمیں کون اعتبار کرے گا ان پر۔ اور شاہ عالم یا امیر تیمور جیسے لوگوں کا مقابلہ کرنا بھی آسان کام نہیں۔ نہ جانے وہ میرا کیا حشر کریں گے اور میرے جرم کی کتنی سزا دوسروں کو بھی دیں گے۔

جہاز کے کراچی میں اُترنے سے پہلے ہی میں نے تسلیم کر لیا تھا کہ میں اب ناصر عظیم نہیں رہا۔ اب میں شاہ عالم ثانی ہوں اور جب تک قدرت کا دستِ غیب پھر حالات کو سازگار نہیں کرتا میں ناصر عظیم جتنا بھی چاہوں تو نہیں بن سکتا۔

یہ میرے لیے ایک پُر خطر چیلنج ضرور تھا لیکن میں اس سے خوف زدہ نہیں تھا۔ کسی حد تک میرے لیے اس ایڈونچر کا حصہ بننے میں دلچسپی کا عنصر غالب تھا۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ امیر تیمور جیسے لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میرا یہ عقیدہ رسمی اور زبانی نہیں تھا کہ زندگی کا ہر لمحہ خواہ وہ زندگی میری ہو یا کسی اور کی' خالق و مالکِ کائنات کی مقرر اور عطا کی جانے والی سانسوں اور دل کی دھڑکنوں کا شمار ہے جس میں ایک سانس یا ایک دھڑکن کی کمی بیشی کسی میرے جیسے تو مِ خاکی کے بس کی بات ہی نہیں چنانچہ موت تو اپنے مقررہ وقت پر اسی طرح آئے گی جیسے لکھ دی گئی ہے۔ شاہ عالم کے مسلح محافظ اور باڈی گارڈ' اس کی پیرا ملٹری فورس "فاتح عالم"۔ اس کی سیاسی طاقت اور شیطانی قوت مجھے اپنی مرضی سے نہ مار سکتی ہے اور نہ زندہ رکھ سکتی ہے' وہ مجھے زنجیروں میں جکڑ کے کسی تاریک زنداں کی فولادی سلاخوں والی سنگین دیواروں میں ڈال دیتے تب بھی اپنی تقدیر سے ناامید نہ ہوتا مگر ابھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے حقیقی زندگی کے ڈرامے کا ایک ایسا رول آفر ہوا تھا جو مجھ سے پہلے کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ اس میں ذہانت کے ساتھ تھوڑی سی ہمت اور صلاحیت درکار تھی۔ شاہ عالم مجھے ایک حفاظتی شیلڈ کے طور پر استعمال کرنے کا خواہش مند تھا۔ امیر تیمور مجھے ایک خطرناک سازش کے ذریعے اصل شاہ عالم کی جگہ دلانے کا خواہش مند تھا اور میں؟ کیا میں واقعی وزیر اعظم بننے کا خواہش مند تھا۔ میں اب وہ بچہ نہیں رہا تھا جس نے کہا تھا کہ میں وزیر اعظم بنوں گا بڑا ہو کے لیکن اچانک میرے سامنے ایک ایسی صورتِ حال آگئی تھی جس میں ایک بچے کی آرزو کے حقیقت میں ڈھل جانے کے مواقع اور امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ الٰہ دین کی کہانی تھی جس میں ایک عیار جادوگر نے ایک نادان بچے کو غار کا راستہ دکھایا تھا کہ اس میں اُتر جاؤ اور وہ جادوئی چراغ حاصل کر لو جو تمہاری ہر خواہش پوری کر سکتا ہے۔

آج جادوگر امیر تیمور تھا' میں الٰہ دین اور جادوئی چراغ تھا اقتدارِ اعلیٰ لیکن میں کوئی نادان بچہ نہیں تھا کہ چراغ نہ ملے تو جادوگر مجھے تاریک غار میں بے یارو مددگار مرنے کے لیے چھوڑ جائے۔ آخر کوئی تاریخ سے ہی سبق سیکھتا ہے' مجھے جادوگر کی عیاری کا بھرپور اندازہ تھا اور یہ یقین تھا کہ وہ مجھ پر واپسی کے راستے بند نہیں کر سکتا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ کیا میں اس خطرناک غار میں اُتر کے وہ جادو کا چراغ حاصل کر سکتا ہوں اور پھر بحفاظت باہر آسکتا ہوں! ایک بار وہ چراغ میرے ہاتھ لگ جائے پھر میں اپنے غلام جن سے کہوں گا کہ سب سے پہلے تو اس خبیث جادوگر کو پہنچا دو مریخ پر جہاں سے یہ کبھی واپس نہ آسکے اور ڈیر جن' اگر تم امریکی خلائی شٹل یا راکٹ کی طرح پرواز کر کے زمین کی کشش کے دائرے سے نہیں نکل سکتے تو پھر اسے مادھوری ڈکشٹ بنا کے بمبئی پہنچا دو۔ یہاں وہ شاہ عالم ہوں تو وہاں وہ مادھوری ڈکشٹ۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ سارا زمانہ دیوانہ ہو جائے گا۔

جتنا میں نے اس بارے میں سوچا اتنا ہی مجھے امیر تیمور کی پیش کش کو قبول کرنے کا خیال دلچسپ لگا۔ بس مجھے اپنے دفاع کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ آج تک میں نے جو کچھ کیا (اور میں نے کیا نہیں کیا؟) یہ اس سے بالکل مختلف کام بھی تھا۔ زیادہ حوصلہ آزما بھی اور زیادہ پُر کشش بھی۔ نقصان کا احتمال تو زندگی کے ہر فیصلے کے ساتھ ہے۔ نقصان کاروبار میں بھی ہو سکتا ہے۔ نقصان جُوا کھیل کے ہار جانے میں بھی ہے۔ عشق کا زیاں ہے پھر بھی۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب نے کیا اور سب کچھ گنوا کے کیا۔ لوگ شادی کر کے بھی پچھتاتے ہیں اور جو نہیں کرتے وہ بھی پچھتاتے ہیں۔

وقت بہت کم رہ گیا تھا چنانچہ میں نے اپنے بے ربط خیالات کو منظم کیا اور اپنے ذہن میں ایک سوالنامہ مرتب کیا جن کا جواب مجھے ہاں یا نہیں میں دینا تھا۔

.... کیا میں شاہ عالم کا رول کرنے کی ہمت' صلاحیت اور شوق رکھتا ہوں؟

— کیا اس طرح میں خود کو اور اپنے لواحقین کو امیر تیمور یا شاہ عالم کی سازش یا انتقامی عتاب کا شکار ہونے سے بچا سکتا ہوں؟

— کیا میں یہ خطرناک کھیل شروع کرنے کے بعد فطرت سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتا ہوں؟

— کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک سال بعد مجھے اصل شاہ عالم اور بالآخر ایک اہم ترین سیاسی شخصیت مثلاً وزیر اعظم بننے کا موقع مل جائے؟

— کیا ایک سال تک ناصر عظیم اور شاہ عالم کا ڈبل رول کرنے کے

لیے مجھے خان جی' چندا' کمال اور قمر کو اعتماد میں لینا چاہیے؟

.... کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں ایک سال تک یا اس کے بعد بھی میرے رشتوں کی نوعیت وہی رہے گی جو آج ہے خواہ میرا نام پھر ناصر عظیم ہو جائے یا شاہ عالم رہے؟"

ان سب سوالات کا جواب تھا۔ ہاں' بس ایک آخری ساتواں سوال ایسا تھا جس کا جواب تھا 'نہیں'۔ یہ سوال تھا کہ کیا ڈر سے یا کسی کے (مثلاً خود چندا کے) منع کرنے سے میں امیر تیمور کو انکار کر سکتا ہوں۔ اس سوال کے جواب میں ہاں کہنا میرے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ میں ایک بات بہت اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ سب جو مجھے چاہتے تھے اور میرے اپنے تھے۔ میرے اس فیصلے پر خفا ہو سکتے تھے۔ اسے میری بے وقوفی اور کوتاہ اندیشی قرار دے سکتے تھے۔ چندا مجھ سے روٹھ سکتی تھی۔ مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کے لیے آنسو بہا سکتی تھی' میرے سامنے ہاتھ جوڑ سکتی تھی اور مجھے اپنی قسم دے سکتی تھی (اللہ مجھے اس امتحان میں ڈالے تو میرا دل پتھر کر دے' وقتی طور پر) تاہم مجھے یقین تھا تو ان رشتوں کی بے غرض استواری پر۔ ان میں سے کوئی مجھے چھوڑ نہیں سکتا تھا کہ جاؤ جو تمہارا جی چاہے کرو۔ آج سے تم ہمارے نہیں رہے اور ہم تمہارے لیے غیر ہو گئے۔ نہ چندا مجھے بھلا سکتی تھی اور نہ چھوڑ سکتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے میں ساری دنیا کے بدلے' اس زمین آسمان ساری کائنات کے بدلے اسے گنوا کے کچھ پا نہیں سکتا تھا۔

خیالات کو مجتمع اور منظم کر کے منطقی اور معروضی انداز میں سوچنے اور واضح جواب حاصل کرنے کا یہ طریقہ مجھے مسلسل مشق سے اور کرنل خان کی روحانی تربیت سے حاصل ہوا تھا۔ خیال کو کنٹرول کرو۔ خیال کو ایک سیدھے راستے پر ایک سمت میں رکھو۔ صراطِ مستقیم پر۔ خیال کو آئینے کی طرح صاف رکھو۔ اس پر شک کی گرد نہ پڑے تاکہ تم اس میں خود کو واضح طور پر ویسا ہی دیکھو جیسے تم ہو۔ خیال سے عمل ہے۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

جب امیر تیمور نے کہا "کیا سوچ رہے ہو شاہ جی؟"
میں نے سکون سے کہا "میں نے سوچ لیا ہے۔"
"تمہارے سکون اور اعتماد سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم تیار ہو۔"
میں نے کہا "میری صرف ایک شرط ہے جو تمہیں قبول کرنی ہوگی۔"

"انکار کا حق تم نے پہلے ہی چھین لیا" وہ ہنسا۔
میں نے کہا "ہاں۔ کیونکہ ایسا ہی تم نے بھی میرے ساتھ کیا۔"

"شرط کیا ہے؟"
"میں اکیلا نہیں رہوں گا۔"
وہ کچھ حیران ہوا "میں کچھ سمجھا نہیں۔ اتنے لوگوں کے درمیان اکیلا...؟"

میں نے کہا "وہ میرے اپنے نہیں ہیں۔"
"آئی سی!" وہ بولا "تم انہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو جن کو تم اپنا خاندان کہتے ہو۔"
"نہیں۔ انہیں اپنے ساتھ رکھنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ میں ان کو اپنے ساتھ خطرات کی دلدل میں گھسیٹ لوں۔"
"پھر کیا تم ان کے ساتھ رہوگے؟ یہ ناممکن ہے۔ اگر تم سوچو..."
"میں ان سے قطع تعلق نہیں کروں گا" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں ان کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے جذباتی رشتوں کے آئینے میں بال بھی نہیں آنے دوں گا اور تم اس معاملے سے لاتعلق رہوگے۔"
"مگر یہ کیسے ہوگا؟"
"اس سوال کا جواب خود تلاش کرو۔ لیس اور نو۔ مجھے قطعی جواب چاہیے جس میں کسی ڈپلومیسی کی گنجائش یا آمیزش نہیں ہوگی۔ میرے جواب کا انحصار تمہارے جواب پر ہے۔ تمہارے انکار کا مطلب ہے میرا انکار۔ اور تمہارے اقرار کا مطلب ہے میرا اقرار۔ سب کچھ اس ایک شرط سے مشروط ہے۔"
"اگر میں یہ شرط قبول کرنے سے پہلے سوچنے کی مہلت مانگوں!"

میں نے کہا "تم جتنی مہلت چاہو' لے سکتے ہو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ جلدی تمہیں تھی۔ تم جہاز کے لینڈ کرنے تک بھی جواب دے سکتے ہو۔ دو دن بعد شاہ عالم کے واپس آنے پر بھی۔ اور اس کے بعد بھی بقول شاعر' میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں۔"

"یو آر دی ونر شاہ جی!" امیر تیمور نے ایک مصنوعی ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ملاؤ ہاتھ۔ اب ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ بلکہ نئے زمانے کے محاورے کے مطابق ایک ہی خلائی سیارے میں سوار ہیں۔ پتا نہیں چاند پر اُتریں گے یا زمین پر۔"
"ایک بات تم نہیں جانتے تو جان لو۔ ہیشہ بزدل یا لالچی آدمی مرنے سے ڈرتا ہے۔ تم مجھے صرف ایک بار مار سکتے ہو۔ مگر ایک بار میں بھی تمہیں مار سکتا ہوں۔ ہمارے CHANCES بالکل برابر ہیں۔ اپنے بارے میں خود تمہیں بہتر علم ہوگا کہ تم مرنے سے کتنا ڈرتے ہو۔"

"سچی بات یہ ہے... کہ میں ڈرتا ہوں" وہ بولا۔
میں نے سر ہلایا "دنیا میں دو ہی طرح کے لوگ ہیں۔ ایک جو مر مر کے جیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مر کے جیتے ہیں۔"
"اچھا اب تیار ہو جاؤ" اس نے اپنی سیفٹی بیلٹ باندھتے ہوئے کہا "تم میرے ساتھ جاؤ گے۔"
"تمہارے ساتھ... ابھی...؟"
"ایک گاڑی ایئرپورٹ پر ہوگی۔ نیوی بلیو ہنڈا اکارڈ۔"

میں نے کہا "گاڑی تو ناصر عظیم کے لیے بھی موجود ہوگی۔"

"مگر تم اب ناصر عظیم نہیں رہے۔" وہ بولا "گاڑی کا نمبر ہے زیرو سکس زیرو فائیو۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ مجھے ریسیو کرنے والے۔"

اس نے بھی میری بات کاٹ دی "کوئی نہیں آیا ہوگا ناصر عظیم کو ریسیو کرنے کے لیے۔ ناصر عظیم نے پرسوں ہی لندن کے ایک پبلک کال آفس سے لاہور کے لیے کال بک کرائی تھی۔ اس نے خود قمر سے فون پر بات کی تھی اور کہا تھا کہ کچھ کاروباری معروفیات ایسی ہیں کہ اسے چند دن اور رُکنا پڑے گا۔"

میں نے اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لی "یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے" وہ بولا "اصل بات یہ ہے کہ فی الحال ان میں سے کوئی تمہارا انتظار نہیں کررہا ہے۔ اگر کسی نے سراغ لگانے کی کوشش کی تو اسے مایوسی ہوگی۔ معلوم یہ ہوگا کہ ناصر عظیم نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا تھا۔ جہاں وہ کل تک مقیم تھا۔ اس کے بعد... میں بتا چکا ہوں کہ وہ جزائربالی سے جائے گا ہانگ کانگ اور پھر واپس آئے گا۔"

میں نے کہا "کوئی سُراغ لگانے کے چکر میں نہیں پڑے گا۔"

"ہاں۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"میری آواز سنا کے شاہ عالم نے بات کی ہوگی؟"

"ظاہر ہے۔ اس نے بتایا کہ تمہاری SO CALLED منہ بولی بہن۔"

"صرف میری بہن" میں نے اسے ٹوک دیا۔

"چلو ایسے سہی' تمہاری بہن بہت سیدھی لڑکی ہے۔"

"وہ سب سیدھے لوگ ہیں۔" میں نے کہا "ان کے ساتھ رہ کے میں بھی سیدھا ہوگیا تھا مگر شاید تقدیر کے چکر ابھی ختم نہیں ہوئے۔ مجھے ایک بات بتاؤ تیمور۔ یہ جو تمہارے چھ گارڈز اس وقت جہاز میں موجود ہیں' کیا یہ سب جانتے ہیں کہ تم مجھے کس مقصد سے اپنے ساتھ لے جارہے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ ہر ایک کو بتانے والی بات نہیں ہے۔ وہ میرے باڈی گارڈ ہیں اور میرے ماتحت۔"

"کیا انہوں نے بھی میری اور شاہ عالم کی صورت کی مشابہت کو نوٹ نہیں کیا ہوگا؟"

"اسی حد تک جیسے راہ چلتے لوگوں نے یا تم سے ملنے والوں نے اور پھر اسے اتفاق سمجھ کے نظرانداز کردیا ہوگا۔ ہم شکل لوگ نظر آجاتے ہیں۔"

"جب میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ شاہ عالم کی کار میں۔"

اس نے کہا "وہ شاہ عالم کی گاڑی نہیں ہے۔ میں اپنے باڈی گارڈز کی چھٹی کرجاؤں گا۔ ان کو نائٹ کوچ سے لاہور جانا ہے۔ میں اور تم آج رات ہالیڈے اِن میں گزاریں گے اور صبح جائیں گے۔ گاڑی انہی کی ہے کیونکہ وہاں ہمارے کمرے بک ہیں۔ COMPLIMENTARY پک اینڈ ڈراپ۔"

"تم نے بہت آگے تک کا سوچ رکھا تھا۔ اور سارا انتظام کرلیا تھا۔" میں نے کہا "اتنا یقین تھا تمہیں اپنے آپ پر؟"

"اس یقین کے بغیر میں زندگی میں کوئی مقصد حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ شاہ جی' دیکھ لو آج میں نائب صدر ہوں... پی ایل ایف کوئی عام پارٹی نہیں ہے۔ بہت پہلے میں نے اپنی صلاحیت کو اس میں لگایا تھا جب کوئی یہ رسک لینے پر تیار نہیں تھا۔ یہ سراسر گھاٹے کا سودا تھا اس وقت مگر میں نے شاہ عالم کا ساتھ دیا تھا۔ سچ پوچھو تو پارٹی کی کامیابی میں شاہ عالم کی شخصیت اور اس کی ذہانت کو جتنا دخل ہے۔ اتنا ہی میری محنت کو بھی ہے۔ میں نے پارٹی کا منشور بنایا تھا۔ شاہ عالم کو گائیڈلائن دی تھی۔ اس کے لیے اچھے اور قابل اعتماد ساتھیوں کی ٹیم بنائی تھی۔ ساری پلاننگ میری تھی لیکن آج میری پوزیشن بہت نازک ہے کیونکہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ ایک ایک کرکے سارے پُرانے ساتھی رخصت کردیے گئے ہیں یا خود ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔"

"پھر تم کیسے بچے رہے؟"

اس نے ایک آہ بھری "میں پُل صراط پر چل رہا ہوں۔ میں اس لیے بچا ہوا ہوں کہ میں نے خود کو بچانے کے لیے وہ سب کیا۔ جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں شاہ عالم کا خوشامدی اور چمچہ بن گیا۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ مکمل یس مین۔ میں نے سچ بولنا چھوڑدیا اور ضمیر کی آواز سُننی چھوڑدی۔ شاہ عالم دن کو رات کہے تو میں بھی کہتا ہوں رات۔ اس کی فطرت کی ہر کمزوری اور شہ زوری کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔ کس وقت وہ کیا سُننا چاہتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ اسے کیا پسند ہوگا اور کیا ناپسند۔ نئے آنے والے تو میرے سامنے طفلِ مکتب ہیں اور اسی لیے شاہ عالم مجھ سے خوش ہے۔ مجھے اپنا حقیقی دوست اور خاص آدمی سمجھتا ہے۔ سب سے زیادہ مجھ پر بھروسا کرتا ہے۔"

"پھر تم ڈرتے کیوں ہو۔ جب تمہاری پوزیشن اتنی مضبوط ہے تو پُل صراط پر کیوں محسوس کرتے ہو خود کو۔"

"اس لیے کہ اب شاہ عالم کو کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں رہی۔ پہلے وہ سب کی سُنتا تھا۔ مشورہ قبول کرتا تھا اور تنقید برداشت کرتا تھا۔ تب میں زیادہ پُراعتماد تھا اور سچ بولنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ آج میں جھوٹ بولتا ہوں اور اس سے ڈرتا بھی ہوں۔ اس کے گرد نالائق اور خوشامدی اکٹھے ہورہے ہیں۔ شاہ عالم کو خلوص اور وفاداری کی قدر نہیں رہی۔ میرا پتا کوئی بھی صاف کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شاہ عالم کے کان بھرنے میں کامیاب ہوجائے' اسے مجھ سے بدگمان کردے تو کسی وجہ کے بغیر بھی شاہ عالم کا رویّہ میرے ساتھ بدل سکتا ہے۔ وہ مجھے نکالے گا نہیں۔ ایسے حالات پیدا کردے گا

کہ میں خود ہی اس کا ساتھ چھوڑ جاؤں۔ میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ پھر اس کی تباہی یقینی ہوجائے گی۔"

"اب کیا تم نے اس کی تباہی کا منصوبہ نہیں بنایا ہے؟"

"نہیں' میں آخری وقت تک پوری کوشش کروں گا کہ شاہ عالم سنبھل جائے۔ اپنی ذات کی ان خامیوں کو جان لے جو اس کی نیک نامی اور پارٹی کے مستقبل پر اثرانداز ہورہی ہیں لیکن ایک تو اس کام کے لیے وقت نہیں ہے۔ دوسرے شاہ عالم کو بدلنا شاید ممکن نہیں رہا۔ اس کوشش میں تو مجھے ناقابل تلافی نقصان ہوسکتا ہے۔ میری بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تمہیں بلیک میل کرکے شاہ عالم بننے پر مجبور کیا۔ لیکن میں ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔ مجھے تمہارے تعاون کی سخت ضرورت تھی۔ تم وہی شاہ عالم بن سکتے ہو۔ جو وہ کبھی تھا۔ جیسا اسے ہونا چاہیے۔ میں نے تم پر بڑی ریسرچ کی۔ شاید یہ میری اور مجھ سے زیادہ اس قوم کی خوش نصیبی تھی کہ تم میرے سامنے آگئے۔ شاہ عالم ایک کامیاب سیاست داں کے روپ میں اُبھرا ہے مگر اس کے ساتھ ہی شاہ عالم کی ذات میں وہ ساری خرابیاں نمودار ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کے لیڈر اور سیاست داں بدنام ہیں۔ یہاں کی سیاست بدنام ہے۔ میں نے تمہاری باتوں سے تمہارے کردار سے اندازہ کرلیا کہ تم اس جگہ کے لیے موزوں ترین امیدوار ہو جہاں آج شاہ عالم ہے۔ تم میں ایک اچھے آدمی اور اچھے لیڈر بننے کی صلاحیت ہے۔ یوں سمجھو کہ میں ایک مصوّر تھا' میں نے ایک تصویر بنائی اور اس میں سب رنگ بھرے جو سچائی' پاک بازی' شرافت اور انسان دوستی' بے غرضی اور حب الوطنی کے رنگ تھے۔ اسے میں نمائش میں رکھنا چاہتا تھا اور میرا یہ یقین تھا کہ لوگ اسے پسند کریں گے لیکن بدخواہوں نے اس کے سارے رنگ خراب کردیے ہیں۔ وہ تصویر بدصورت ہوگئی ہے مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ بدعنوان اور بے ضمیر جج اسے ہی انعام کے لیے منتخب کرلیں گے۔ ایسا ہوا تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں... اس تصویر کو ٹھیک نہ کرسکوں تو... تباہ کردوں۔ اور اس کی جگہ دوسری تصویر نمائش میں پیش کردوں۔ جو بالکل اصل کی طرح ہو۔ اتنی ہی خوب صورت اور خوش رنگ جیسی اصلی تصویر تھی اور پھر دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔ بدخواہوں کی اُمیدیں خاک میں مل جائیں اور انعام حقدار کو ملے۔ شاہ عالم برسراقتدار آئے تو وہی شاہ عالم ہو' جو تھا۔ یہ صرف میری کامیابی نہیں ہوگی۔ تمہاری کامیابی ہوگی اور اس قوم کی کامیابی ہوگی جس نے صحیح لیڈر منتخب کیا۔ شاہ عالم صحیح آدمی نہیں ہے۔ تم ہو صحیح آدمی۔ اب بتاؤ کیا میں غلط سوچ رہا ہوں۔ غلط کررہا ہوں۔"

میں دم بخود اس کی وہ بات سُن رہا تھا جس کا ذکر ابھی تک سارے فسانے میں نہیں تھا۔ یہ آخری بات تھی جس نے مجھے قائل کرلیا کہ میں ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہوں۔

"آیئے تیمور صاحب!" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "ہم بھی اُتر جائیں۔"

رات کے وقت بھی کراچی ائرپورٹ پر دن کا سماں تھا۔ میں نے تیمور کو جہاز سے اُتر کے باہر جاتے دیکھا۔ اس کے باڈی گارڈ پہلے ہی باہر نکل گئے تھے۔ میرے پیچھے بہت کم لوگ تھے۔ ان میں وہ شخص بھی تھا جس نے مجھ سے پارٹی فنڈ میں مزید پانچ لاکھ دینے کی بات کی تھی۔ "شاہ جی! ہمارا کچھ خیال کرنا بیوی بچے ہیں چھوٹے چھوٹے۔"

دس کے بعد پانچ لاکھ رشوت میں دینے والا یہ ظاہر کررہا تھا جیسے وہ انتہائی غریب اور مظلوم ہے اور میں نے اس کے لیے کچھ نہ کیا تو خدانخواستہ اس کے خاندان والے فاقہ کشی کا شکار ہوجائیں گے حالانکہ یہ ظاہری بات تھی کہ پندرہ لاکھ لٹانے والے کو اس سے دُگنی رقم کا ناجائز فائدہ تو کم سے کم حاصل ہوگا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اس کا معاملہ کیا ہے۔ یہ بعد میں تیمور سے معلوم کیا جاسکتا تھا چنانچہ میں نے سہلا کے اسے تسلی دی "خیر سے کیا کرتے ہیں بچے؟"

اس نے قدم ملا کے چلتے ہوئے کہا "ایک نے بی کام کیا ہے۔ دوسرے نے پڑھ کے نہیں دیا۔ میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔"

میں نے کہا "تم نے کہا تھا چھوٹے چھوٹے... خیر' بیوی چھوٹی ہوگی تم فکر مت کرو۔ اللہ سب کو پالنے والا ہے۔"

وہ تھوڑا سا جزبز ہوا "انہی بچوں کی ماں ہے جی...."

"اچھا اچھا۔ میں سمجھا تم نے نئی شادی کرلی کسی چھوٹی سی لڑکی سے... ہوتا ہے نا... جب پیسہ بہت آجائے ہمارے پاس تو اور کچھ نہیں سوجھتا۔ بس یہی ایک کارِخیر نظر آتا ہے جس کے لیے شرع سے جواز بھی مل جاتا ہے۔"

"بُرا نہ منائیں شاہ جی تو کچھ عرض کروں۔"

"کرو" میں نے کہا "بُرا ماننے سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑے گا۔"

"داڑھی بڑی جچتی تھی آپ پر۔ اسے صاف کرا کے اچھا نہیں کیا آپ نے' شرع کا حکم ہے۔"

"رشوت دینے اور لینے والے کے بارے میں شرع کیا کہتی ہے اور پھر جس کام کے لیے آپ نے..."

وہ گھبرا کے پیچھے ہوگیا۔ اسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔ باہر نکلنے کے لیے میں نے کسٹم کا گرین چینل استعمال کیا اور کسی دشواری کے بغیر وہ سامان نکال کرلے گیا جو قانوناً میرا تھا مگر مجھ سے پوچھا جاتا تو میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ معلوم نہیں میرا اسباب کہاں اور کیسے بدلا گیا تھا۔ ہوٹل کے اندر میرے سامان میں سے پاسپورٹ چوری کرنے والا کوئی بھی ویٹر ہوسکتا تھا۔ ہوٹل والوں کے پاس کمرے کی چابی رہتی ہے۔ سامان میں میرے دو سوٹ کیس تھے اور ایک بریف کیس تھا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا

وہ بھی میں نے اس وقت گاڑی میں چھوڑ دیا تھا جب میں چاکلیٹ خریدنے گیا تھا۔ یہ بریف کیس اور دونوں سوٹ کیس بدلنے والے اپنے کام کے ماہر تھے۔ مجھے شک بھی نہیں ہوا۔ ان کا رنگ ڈیزائن اور لاک سب بالکل ایک جیسے تھے۔ صرف کندھے پر لٹکا ہوا شولڈر بیگ میرا اپنا تھا مگر اس میں بھی ٹکٹ اور پاسپورٹ شاہ عالم کے تھے۔ بظاہر یہ کام میری گاڑی کے ڈرائیور قاسم نے اس شخص کے کہنے پر کیا جو میرے تعاقب میں تھا۔ قاسم کو دھمکی ملی ہوگی یا رشوت۔ جہاں تک میری اس سے واقفیت تھی وہ ایسا آدمی نہیں تھا مگر مجبور ہونے کے بعد ایسا آدمی بھی ویسا ہو سکتا ہے اور مجبور کرنے کے دونوں طریقے بڑے موثر تھے۔

ایک پورٹر نے میرا سامان گاڑی تک پہنچا دیا۔ میری نظر نے سب سے آگے والی قطار میں کھڑی ہوئی نیوی بلیو اکارڈ کو دیکھا نہیں تھا مگر گاڑی کے شوفر نے آگے بڑھ کے مجھے ویلکم کیا۔ اس کی وردی پر ہالیڈے اِن کا مونوگرام تھا۔

"گڈ ایوننگ سر!" اس نے کہا "آپ کی گاڑی اِدھر ہے۔"

میں نے کہا "تم پہچانتے ہو مجھے؟"

"آپ کو بھلا کون نہیں پہچانتا سر۔ آپ شاہ عالم ہیں" اس نے شائستگی سے کہا۔

پورٹر نے سامان ڈکی میں رکھا۔ میں نے اسے اجرت کے ساتھ مناسب ٹپ دے کر رخصت کردیا اور خود گاڑی میں بیٹھ گیا۔

باخبر ڈرائیور نے کہا "تیمور صاحب بھی آپ کے ساتھ ہی آئے ہیں سر؟"

میں نے کہا "ہاں وہ بھی آرہے ہیں۔"

تیمور اسی وقت نمودار ہوا اور سامان رکھوا کے میرے ساتھ بیٹھ گیا اور گاڑی خاموشی سے روانہ ہوگئی۔ راستے میں ہم نے کوئی بات کی تو اس کا سیاست سے تعلق نہیں تھا۔ شاہراہِ فیصل پر بھی ٹریفک جام ہوجاتا ہے۔ یہ مسئلہ تو لاہور میں بھی سنگین ہوتا جارہا ہے۔ POLLUTION کے مسئلے پر صرف مذاکرے اور سیمینار ہوتے ہیں۔ ماحولیات کے محکمے کا ڈراما بھی ایسا ہی ہے۔ جیسا ہیومن رائٹس کے معاملے کا۔ تیسری دنیا کے مالک میں عملی طور پر کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے مگر جو چاہتے ہیں کہ نہ ہو وہی غالب ہیں۔

اپنے سوئٹ میں پہنچ کے میں نے سامان لانے والے لڑکے کو ٹپ دی اور اسے کہا کہ وہ نیچے جاکے روم سروس والوں کو فوراً کافی کے لیے کہہ دے۔ سامان میں سیٹ کرلوں گا۔ وہ سلام کرکے چلا گیا تو میں نے سامان کو دیکھا۔ ہر سوٹ کیس میں نمبروالا یعنی COMBINATION لاک تھا۔ بریف کیس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ میں نے فون اُٹھا کے تیمور کا نمبر ملایا۔

"تیمور۔ یہ سوٹ کیس میں کیسے کھولوں؟"

اس نے ہنس کے کہا "سوری شاہ جی۔ مجھے بتانا یاد نہیں رہا۔ بسم اللہ سے دونوں کُھل جائیں گے۔"

"یعنی سات سو چھیاسی۔۔۔ اور بریف کیس کا؟"

"اس میں تمہارے کام کی چیز کوئی نہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "پھر کیا میں اسے کھڑکی سے باہر پھینک دوں؟ میں کیوں اُٹھا کے پھرتا رہا اگر۔"

"شاہ جی۔ پلیز فون پر ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ کے کام کی نہ سہی ہمارے کام کی چیزیں ہیں بہرحال۔ میں ابھی آتا ہوں۔ آپ کے سامنے کھول کے سب دکھادوں گا۔"

"گویا تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں۔ ایسے تو کام نہیں چلے گا تیمور۔"

تیمور نے کہا "میں آرہا ہوں۔ اور دیکھو خود بالکل کوشش مت کرنا۔ یہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔"

تیمور نے مجھے بروقت خبردار کردیا تھا۔ میرا آگے بڑھنے والا ہاتھ رُک گیا۔ مجھے شک ضرور ہوا کہ امیر تیمور خواہ مخواہ پُراسراریت پیدا کرکے مجھے متاثر کرنے اور اپنی اہمیت بڑھانے کی کوشش کررہا ہے مگر میں نے خطرہ مول نہ لینا ہی بہتر سمجھا۔ کیا فائدہ ایسی عجلت کا۔ اور اس وقت مجھے چچا غالب کا ایک شعر یاد آیا جو اس صورتِ حال پر ایسے فٹ ہوتا تھا جیسے انگوٹھی پر نگینہ۔

مجھ سے قسمت میں تری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہوجانا

قفلِ ابجد یہی نمبروں والے تالے تھے جو مرزا غالب کے دور میں بھی بنائے جاتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان میں ہندسے نہیں حروفِ تہجی استعمال ہوتے ہوں گے۔ کم سے کم شعر سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیا واقعی اس بریف کیس میں اتنی اہم دستاویزات وغیرہ ہوسکتی ہیں کہ ان کو غیر متعلقہ افراد کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچانے کے لیے بریف کیس کا نمبروں والا لاک کافی نہ سمجھا گیا۔ اضافی اہتمام یہ کیا گیا کہ غلط نمبر ملا کے تالا کھولنے کی کوشش کرنے والا خود اپنی وفات کا ذمّے دار ہو۔ آخر ایسی کیا چیز ہوسکتی ہے اور کیا ہوگا اگر میں نے بریف کیس کھولنا چاہا۔ کوئی دھماکا ہوگا؟ بریف کیس میں سے کوئی ایسی گیس نکلنے لگے گی جس سے میں ہلاک نہ ہوا تو بے ہوش ضرور ہوجاؤں گا؟ ایسے سین بھی میں نے فلموں میں دیکھے تھے کہ اِدھر آپ نے کوئی باکس کھولا، اُدھر باکس میں سے اچھل کر نکلنے والے گھونسے نے آپ کو ناک آؤٹ کردیا۔

لیکن یہ بات مجھے خاصی ناقابلِ اعتبار لگی۔ ایسا ہوتا تو امیر تیمور مجھے پہلے ہی خبردار کردیتا۔ اب تک بریف کیس میرے پاس تھا اور یہ ہوسکتا تھا کہ میں ائرپورٹ سے باہر آتے ہوئے کہیں رُک کے اس میں سے ضرورت کی کوئی چیز نکالنے کی کوشش کرتا۔ اسے کار میں کھولتا یا ہوٹل میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اسی پر طبع آزمائی

کرتا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ میں نے پہلے سوٹ کیس کھولنے چاہے اور مجھے تیمور سے نمبر پوچھنے کا خیال آگیا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ بریف کیس میں جو کچھ ہے وہ اہم ہے اور شاید امیر تیمور کی خواہش ہوگی کہ وہ خود ہی بریف کیس کھولے۔ اپنے خیال کی تصدیق کے لیے میں نے بریف کیس کو غائب کرنے کا سوچا مگر امیر تیمور آنے والا تھا اور میں اس وقت بریف کیس لے کر باہر جاتا تو میری اس کی ملاقات راستے میں ہی ہوجاتی۔

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کے باہر جھانکا تو مجھے چار فٹ نیچے ایک چھجّا سا نظر آیا۔ یہ نیچے والے کمرے کی کھڑکی کو براہِ راست بارش کی بوچھاڑ سے بچانے کے لیے تھا۔ ایسا ہی چھجّا مجھے اپنی کھڑکی سے چار فٹ اوپر بھی نظر آرہا تھا اور اس میں ایک سیلنگ لائٹ بھی نصب تھی۔

میں نے بریف کیس اُٹھایا اور اس چھجّے پر رکھ دیا۔ اس کے لیے مجھے کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کے تھوڑا سا جھکنا پڑا۔ میں سیدھا ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کھڑکی کسی آواز کے بغیر بند کی اور پردہ برابر کرکے کہا "ایک منٹ۔"

تیمور نے اندر آکے اِدھر اُدھر دیکھا "تم نے ابھی تک لباس نہیں بدلا۔ وہ بریف کیس کہاں ہے؟"

میں نے کہا "کون سا بریف کیس؟"

اس نے کہا "وہی جسے تم اپنا سمجھ رہے تھے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "میرے سامان میں تو کوئی بریف کیس نہیں تھا۔"

وہ متفکر ہوگیا "مذاق مت کرو۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیا واقعی وہ اتنا اہم ہے تمہارے لیے؟"

"ظاہر ہے۔"

میں نے کہا "اس میں کیا بم وغیرہ نصب تھا؟ خدانخواستہ میں اسے کھولنے کی کوشش کرتا تو مرحوم کہلاتا۔ اگر ایسی بات تھی تو مجھے نہ بتا کے تم نے بہت بڑی حماقت کی تھی۔"

اس نے میرے اصل سوال کا جواب گول کردیا "چھوڑو یہ ساری باتیں شاہ جی۔ بتاؤ بریف کیس کہاں ہے؟"

میں نے اس کے اشتیاق سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "وہ تو میرے پاس نہیں ہے۔ ایسی خطرناک چیز تھی۔"

"خطرناک نہیں تھی یار!" وہ جھلّا کے بولا "کوئی بم وغیرہ نہیں تھا اس میں۔"

میں نے کہا "اسے میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہوٹل والوں کے حوالے کردیا۔ ایک ویٹر لے گیا۔"

تیمور نے چیں بجبیں ہوکے کہا "کیوں؟"

"میں نے سوچا کہ اتنی اہم اور بیش قیمت چیز کمرے میں نہیں رہنی چاہیے۔ اب ہوٹل والے اسے اسٹرانگ روم میں رکھ دیں گے اور میرے سوا کسی کو بھی نہیں دیں گے۔"

وہ صوفے پر بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم میرا جھوٹ پکڑ سکتے ہو۔ فون کرکے پوچھ لو۔"

"ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "مجھے اپنا بریف کیس واپس چاہیے۔ جیسے تمہارے لیے یہ اہم ہے اسی طرح وہ میرے لیے اہم تھا۔ اس میں میرے مطلب کی بہت سی چیزیں تھیں جن کے گم ہونے سے مجھے نقصان ہوسکتا ہے۔"

"وہ بریف کیس تمہیں مل جائے گا۔ بالکل اسی حالت میں۔"

میں نے کہا "پھر تمہارا بریف کیس بھی تمہیں مل جائے گا۔"

تیمور کا رویّہ ایک دم بدل گیا "جیسی تمہاری مرضی۔ چلو ڈنر کے لیے نیچے چلتے ہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

میں نے کہا "پھر آپ ڈنر تناول فرمائیں۔ میں پہلے غسل کرکے لباس تبدیل کروں گا۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گا" وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

جو میں نے پہلے نہیں کیا تھا وہ اب کیا۔ میں نے ایک ویٹر کو طلب کیا اور بریف کیس اس کے حوالے کردیا "یہ منیجر کو دے دو۔ اس کو بتادینا کہ شاہ عالم صاحب نے دیا ہے۔ اسے حفاظت سے رکھا جائے اور اس وقت دیا جائے جب میں اکیلا اسے لینے آؤں۔ تم چلو میں خود منیجر کو یہ بات سمجھا دیتا ہوں فون پر۔"

اب میں نے اپنے دوسرے سامان کا جائزہ لیا۔ ویسا ہی تھا جیسا میرا لیکن اس میں جتنے کپڑے تھے سب بدل گئے تھے۔ میرے سوٹ، رات کو پہننے کے کپڑے، گاؤن، ٹائیاں، رومال سب بالکل نئے اور بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ ان سب پر لندن کے "ہیروڈز" کا لیبل تھا۔ میرے ذاتی استعمال کی بہت سی چیزیں میری پسند کے مطابق تھیں۔ اگر یہ اسباب شاہ عالم کا تھا تو میں یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ صرف ظاہری شکل و صورت اور عادات و اطوار کی بات نہیں۔ اس کے اور میرے ذوقِ حُسن اور پسندیدگی کے معیار میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ پہلے مجھے "شینل نمبر فائیو" کی خوشبو پسند تھی مگر بعد میں الزبتھ ٹیلر نے اپنی خوشبو متعارف کی تو میں نے شینل نمبر فائیو کو چھوڑ دیا۔ یہ بس کبھی تبدیلی کے لیے رہ گئی تھی اور اس سوٹ کیس میں دونوں قسم کی پرفیوم کی ایک ایک شیشی موجود تھی۔ میں TABAC کی شیونگ کریم اور آفٹر شیو لوشن کو ترجیح دیتا تھا اور سوٹ کیس میں اس کا پورا سیٹ تھا۔ اس میں ہیرے کے کف لنک اور ٹائی پن کے تین سیٹ تھے۔ تین رسٹ واچ تھیں۔ کچھ گفٹ آئٹم تھے مثلاً میرے نام کی ڈائری، نوٹ بک اور پین کے سیٹ جن پر میرا نام سنہرے حروف میں لکھا ہوا تھا۔

یہ تمام اسباب شاہ عالم کا تھا۔ میرا سامان شاید غائب کردیا گیا تھا یا پھر شاہ عالم کے استعمال میں تھا۔ خود شاہ عالم کہاں تھا؟ یہ میں

نہیں جانتا تھا۔ ابھی تو دنیا کے لیے میں ہی شاہ عالم تھا۔ جب یہ بات خود میں نے مان لی تھی تو پھر دنیا کیسے نہ مانتی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بیگ جو میرے شولڈر پر تھا تبدیل ہونے سے بچ گیا تھا۔ اس میں قمری پسند کے دو پاؤنڈ چاکلیٹ تھے جو شاید مجھے کراچی اور لاہور میں تلاش کرنے پر بھی نہ ملتے اور میں واپسی پر اسے چاکلیٹ پیش نہ کرتا تو وہ زبان سے کچھ نہ کہتی مگر اس کی آنکھوں میں مایوسی اور شکایت کا تاثر ایک ہفتے تک اُداسی کے بادل کی طرح نظر آتا۔ پاگل لڑکی' اتنی بڑی ہو گئی مگر بچپن نہ گیا۔ خیر اچھا ہی ہے۔ قمری یہ معصومیت ہی اس کا سب سے بڑا اثاثہ تھا۔ جب عمر کے سفر میں زندگی کی تلخیاں' محرومیاں اور ناکامیاں راستہ روکتی ہیں۔ دکھ اور پچھتاوے آتے ہیں' اعتماد کے بدلے میں دھوکے ملتے ہیں اور اپنائیت کے نقابوں والے چہرے نفرتوں اور عداوتوں سے مسخ نظر آتے ہیں تو پھر آدمی کا چہرا انہی تجربات وحادثات کا آئینہ ہو جاتا ہے۔

زیادہ فکر مجھے اپنے بریف کیس کی تھی۔ اس میں میرے انتہائی اہم کاروباری معاہدوں کے ڈرافٹ' میمورینڈم اور لیٹرز وغیرہ تھے۔ کچھ غیر ملکی بینکوں کے پے آرڈر تھے۔ ان سب کے نہ ملنے سے آئندہ چند ہفتوں میں مجھے کئی لاکھ کا نقصان الگ ہوتا اور میری کاروباری ساکھ بُری طرح متاثر ہوتی۔ تاہم مجھے کچھ اطمینان شاہ عالم کے بریف کیس کو غائب کرنے سے حاصل ہوا تھا۔ وہ اتنا اہم نہ ہوتا تو تیمور اس کے لیے پریشانی میں مبتلا نہ ہوتا۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد میں نے ایک بلیو بلیک سوٹ کے ساتھ کریم کلر کی شرٹ پہنی اور پولکا ڈاٹ ٹائی باندھ کے ڈائننگ ہال میں جا پہنچا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سب کپڑے میرے جسم پر اسی طرح فٹ تھے جیسے میرے ہی تھے یا میں نے خود بنوائے تھے۔

منیجر لابی میں موجود تھا۔ اس نے مجھے وش کیا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "تم نے میرا بریف کیس بحفاظت رکھ لیا ہے۔"

"آف کورس سر۔ ویٹر نے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ کے سوا یہ کسی اور کو نہ دیا جائے" منیجر نے کہا۔

"میں اس کی رسید چاہتا ہوں۔"

"رسید۔!" منیجر نے حیرانی سے کہا "آپ ہم پر اعتماد کر سکتے ہیں سر!"

میں نے کہا "اعتماد نہ ہوتا تو میں وہ بریف کیس تمہارے حوالے کیوں کرتا' لیکن رسید میرے اطمینان کے لیے ضروری ہے۔"

اس نے پریشانی سے کہا "ہم رسید دیتے نہیں.... اور ایسی رسید کسی نے مانگی نہیں.... اس لیے ہے بھی نہیں۔"

میں نے کہا "تم اپنے ہاتھ سے لکھ دو۔"

"کیا لکھ دوں سر! مجھے کیا معلوم۔ اس کے اندر کیا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ فرض کرو وہ خالی ہے' اس میں پتھر بھرے ہیں یا ہیرے۔ تم صرف یہ لکھ دو کہ ایک بریف کیس وصول پایا جس پر شاہ عالم کے دستخط ہیں۔ اس کا رنگ اور میک بھی لکھنا چاہو تو لکھ دو۔ میں اس پر مارکر سے سائن کردوں گا۔ تم مجھے بھی بریف کیس اسی وقت دو گے جب مجھ سے رسید واپس لو گے۔ اس پر لکھواؤ گے کہ بریف کیس وصول پایا اور میرے دستخط حاصل کرو گے۔"

اس نے پیشانی پر ہاتھ ملا "ایسی کیا بات ہے سر.... آئی ہوپ کہ اس میں میرے لیے پریشانی کی بات نہیں۔"

"اگر میرے کہنے کے باوجود تم سمجھتے ہو کہ شاہ عالم بھروسے کے لائق نہیں۔ وہ تمہاری نوکری یا جان لینا چاہتا ہے یا اس ہوٹل کو تباہ کردے گا تو مجھے بریف کیس دے دو۔ میں شیرٹن میں شفٹ کرجاتا ہوں" میں نے کہا۔

اس نے مجھے رسید لکھ دی اور شرمندہ بھی ہوا۔ میں نے اندر جاکے بریف کیس پر دونوں طرف مارکر سے سائن کیے اور لوٹ کر ڈائننگ ہال میں جا بیٹھا جہاں کونے کی آخری میز پر سے تیمور یہ سب کارروائی ملاحظہ کررہا تھا۔

"تم نے بہت دیر کی۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے" وہ بولا "منیجر کیا کہہ رہا تھا؟"

میں نے کہا "وہ پوچھ رہا تھا کہ کیا ہے آخر اس بریف کیس میں تو میں نے بتا دیا کہ گھبرانے کی بات نہیں۔ اس میں ایٹم بم ہے چھوٹا سا.... اتنا ہی بڑا...."

اچانک تیمور کے ماتھے پر شکنوں کے ساتھ چہرے پر بدحواسی کے آثار نمودار ہوئے "او مائی گاڈ۔ یہ یہاں....؟"

میں نے کہا "کیا فرشتۂ اجل کو دیکھ لیا۔؟ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ اگر تم یہاں نہ ہوتے...."

وہ اٹھ کھڑا ہوا "یہ مصیبت تو اِدھر ہی آرہی ہے۔ اچھا دیکھو' میں...."

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "ایسے تم بھاگ کے کہاں جا سکتے ہو۔ آخر کون ہے جس کو دیکھ کر تمہارے فرشتے کوچ کر گئے ہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی "تمہاری بیوی۔"

میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا "میری.... بیوی.... کیا بک رہے ہو؟"

اس نے بے بسی سے سر ہلایا اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ وہ اس میز کے بہت قریب تھی۔ اس کا نام تیمور نے پہلے ہی بتا دیا تھا لیکن ابھی تک میں نے اس کی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ اس کے باوجود میں نے رخشندہ کو اس کے تیوروں سے اور اندازِ حُسن کی شعلہ فشانی سے پہچان لیا۔

وہ سب کے درمیان سے بڑی دلکش مسکراہٹ اپنے چہرے پر

سجائے گزری اور بلاشبہ ہر نظر نے اسے بھرپور خراج تحسین پیش کیا جس کی وہ جائز طور پر مستحق تھی۔ میز پر بیٹھتے ہی اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے تیمور کو نظر بھر کے دیکھا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ اچھا بھلا موکا ٹھ کا اُلو نظر آنے لگا تھا۔ وہ چالاک اور عیّار' جہاں دیدہ اور تجربہ کار سیاست داں بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔

"کیا یہ کہنا ضروری ہے کہ آپ یہاں غیر ضروری ہو چکے ہیں مسٹر تیمور۔ اپنی سیاست سمیت دفع ہو جانا آپ کو مزید بے عزتی سے بچا سکتا ہے۔" وہ کاٹ دار' طنزیہ اور تلخ لہجے میں بات کرتے ہوئے بھی مسکراتی رہی۔

"جی.... میں جا رہا ہوں.... رخشندہ...." تیمور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"رخشندہ.... اتنی بے تکلفی مجھ سے؟" اس نے سرد سفاک لہجے میں کہا "یاد ہے ایک بار تم نے مجھے سرِعام بھابی کہنے کی گستاخی کی تھی تو تمہاری کتنی عزت افزائی کی تھی میں نے۔ آج تم نام لے رہے ہو میرا؟ کیا تم نشے میں ہو یا دماغ چل گیا ہے تمہارا؟"

"آئی.... آئی ایم سوری مسز عالم.... ویری سوری۔" وہ فوراً وہاں سے حواس باختہ فرار ہوا کیونکہ رخشندہ کی آواز بلند ہونے لگی تھی اور قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے دو کاروباری قسم کی گفتگو کرنے والے ڈسٹرب ہوکے تیمور کو گھورنے لگے تھے۔

میں نے اتنی دیر میں خود کو طوفان سے نمٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئی "تو اب یہ نوبت آگئی ہے؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "ہاں۔ یہ نوبت آگئی ہے میری شرافت کی وجہ سے کہ تمہاری زبان موقع محل دیکھے بغیر چلنے لگی ہے۔"

"اسے شرافت کہتے ہو تم؟"

"ہاں۔ اگر میں پہلے دن ہی تمہاری زبان حلق سے کھینچ کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا تو آج تمہاری یہ جُرأت نہ ہوتی کہ تم مجھ سے اور میرے دوستوں سے اس لہجے میں بات کر سکو۔"

"دوست.... کون دوست؟.... تیمور؟" اس نے تیز ہوکے کہا۔

"اپنی آواز کا والیوم کم رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ کل میرے اور تمہارے بارے میں کوئی خبر بن جائے۔"

"کیسی خبر۔؟" وہ مجھے گھورنے لگی۔

"کوئی بھی خبر۔ میں تم کو یہاں سے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں بھی لے جا سکتا ہوں۔ ایک جھانپڑ بھی مار سکتا ہوں تمہیں.... اور پھر واک آؤٹ بھی کرسکتا ہوں تم کو یہاں چھوڑ کے۔"

اس کی صورت پر اُلجھن اور پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ شاید اس کے شوہر نے کبھی اس لہجے میں رخشندہ سے بات نہیں کی تھی۔ وہ خود مجرم تھا اور کوئی اخلاقی مجرم بے خوفی سے سچ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے" اس نے کچھ دیر بعد کہا "میں جانتی ہوں۔"

"مجھے چیلنج مت کرو رخشندہ۔ بعض اوقات غلط یقین ہی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس نے مجھے دُکھی اور ملامتی نظروں سے دیکھا "یہ سوال تو مجھے کرنا تھا؟"

"چلو اب پہل میں نے کردی تو جواب دو۔"

"میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ تم اپنا پروگرام بدل کے اس طرح چوری چھپے کراچی کیوں آئے ہو؟ اور ایسے حُلیہ بدل کے۔"

"رخشندہ' پہلے یہ بتاؤ کہ تم کو کس نے اطلاع دی اور یہ بتایا کہ میں کب آرہا ہوں اور تمہیں اس ہوٹل میں ملوں گا؟"

"مجھے تمہاری نقل و حرکت سے باخبر رکھنے والے بہت لوگ ہیں۔ جن کو تم میری پرائیویٹ سی آئی ڈی کہتے ہو۔"

"آئی سی" میں نے کہا "اتنا بھروسا ہے تمہیں اپنی سی آئی ڈی پر۔"

"بھروسا غلط نہیں ہے۔"

"لیکن مجھ پر بھروسا نہیں ہے تمہیں" میں نے کہا "یہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے رخشندہ۔ اسٹاپ دس نان سنس۔ میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔ آخر میں شوہر ہوں تمہارا؟"

"میں بھی بیوی ہوں تمہاری۔" اس نے چلّا کے کہا۔

"تمہارے شوہر کی حیثیت سے میری کوئی عزت نہیں۔ جو عزت ہے وہ شاہ عالم کی ہے اور وہ نہ تم جہیز میں لائی تھیں اور نہ مجھے تمہارے طفیل ملی ہے۔ اس عزت پر میں ایک نہیں تم جیسی دس رخشندائیں قربان کر سکتا ہوں۔ آئی بات سمجھ میں۔ تمہیں جو اسٹیٹس ملا ہوا ہے وہ ایک بیوی سے بہت زیادہ ہے رخشندہ۔"

وہ خوف زدہ نظر آنے لگی "یہ آج تم مجھے رخشندہ کیوں کہہ رہے ہو بار بار۔ رخشی کیوں نہیں کہتے؟"

میں نے رکھائی سے کہا "اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اس پر غور کرو۔ میری قوتِ برداشت کا امتحان لینے میں تم حد سے بڑھ گئی ہو۔"

"دیکھو عالم۔ مجھے اب کسی کی پروا نہیں۔" غصے میں اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا "میں بھی اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ حد سے تم بہت آگے جا چکے ہو۔ میں صرف تمہارا ساتھ نبھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"چھوڑ دو یہ کوشش رخشی" میں نے سکون سے کہا۔

"کیا مطلب۔ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ میرا خیال ہے کہ تم نشے میں ہو ورنہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔" رخشندہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "اگر میں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا عالم تو...."

"تو کیا ہوگا؟ قیامت آجائے گی؟"

"یہ تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو کہ اس کا نقصان کسے ہوگا۔ میری

کوئی پبلک لائف نہیں ہے اور نہ سیاسی کیریئر ہے۔ میں صرف تمہاری بیوی ہوں لیکن کیا حاصل ہے مجھے اس سے۔ ایک عام آدمی کی بیوی کے برابر بھی عزت نہیں ہے میری۔"

میں نے کہا "دنیا میں ایک ہی شاہ عالم ہے اور اس کی ایک ہی بیوی ہے۔ کیا یہ عزت کم ہے تمہارے لیے؟"

"مجھے دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ تم وزیراعظم بن جاؤ یا سیاست چھوڑ کے پرچون کی دُکان پر بیٹھو۔ میرے لیے صرف شاہ عالم ہو۔ اور میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی کہ تم میرے رہو۔ عزت کا جو تصور تمہارے دماغ میں ہے مجھے وہ عزت نہیں چاہیے۔ تم نے جو رویّہ اختیار کرلیا ہے اس میں بے عزتی محسوس ہوتی ہے مجھے۔ ایک جاہل تو ری پاؤس کی جوتی سمجھتا ہے مگر بیوی کو بیوی تو مانتا ہے۔"

"وہ تو میں بھی مانتا ہوں۔"

"نہیں عالم۔ اب ہمارے تعلقات صرف دنیا کو دکھانے کے لیے ہیں لیکن میں بتا چکی ہوں کہ میرے لیے دنیا کچھ نہیں۔ اگر عورت کو اپنے گھر میں شوہر کی محبت' اس کی توجہ' عزت اور حیثیت حاصل نہیں تو پھر سب بے کار ہے۔ ایک مزدور یا کلرک اور موچی کی بیوی مجھ سے بہتر ہے جو جانتی ہے کہ اس کا شوہر صرف اس کا شوہر ہے۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا "میں بھی کسی اور کا شوہر نہیں ہوں' ابھی تک تو۔۔۔ ویسے تم جذباتی ہو رہی ہو۔ کسی مزدور' کلرک یا موچی کی بیوی کو سوکھی محبت ملتی ہے سوکھی روٹی کے ساتھ۔ یہ شان و شوکت' یہ ٹھاٹ باٹ جو تمہیں میسر ہے یہ تمہیں راس نہیں آرہا ہے شاید۔"

"ان سب چیزوں کی زندگی میں مجھے کبھی کمی نہیں رہی عالم۔۔۔ اور نہ ہوگی۔"

"اس کے باوجود تم ایسے احمقانہ تصورات رکھتی ہو کہ سارا دن جوتے گانٹھنے والا موچی جب پھٹے پُرانے بدبودار جوتوں کی بو میں بسا ہوا اپنے گھر پہنچتا ہے' کسی جھونپڑی جیسے' ٹین کی چھت والے ایک کمرے کے غلیظ اور تاریک گھر میں۔ جس میں چیتھڑے لٹکتے نظر آتے ہیں اور گدڑیاں فرش پر ڈھیر ہوتی ہیں۔ اندر دُھواں بھرا رہتا ہے اور بچّوں کے پیشاب کی بُو کے بھبکے اٹھتے ہیں۔ وہاں اس ماحول میں موچی کی بیوی کو خالص اور سچا پیار ملتا ہے؟ موچی اور موچن دو لوبرڈز کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اور ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔ محبت کے نغمے گنگناتے ہیں اور عشق کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ ان کی زندگی میں پیار ہی پیار ہوتا ہے۔ سکون ہی سکون۔ یہ سب خرافات تمہارے ذہن میں رومانی ناولوں اور زنانہ رسالوں کے ان افسانوں نے بھری ہیں جو کالج کی لڑکیاں لکھتی ہیں۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "تم آج بالکل مختلف باتیں کررہے ہو۔"

میں نے سنبھل کے کہا "کیوں' کیا غلط ہے اس میں؟"

"تم جانتے ہو' میں کتنی حقیقت پسند ہوں۔ تمہارا ساتھ کیوں نبھا رہی ہوں میں آخر؟ کسی وزیراعظم کی بیوی کہلانے کے لیے؟ میں صرف تمہارے عزائم کی تکمیل اور تمہارے مقاصد کے حصول کی خاطر' صرف تمہارے لیے یہ سب برداشت کرتی ہوں۔ تم باہر کی دنیا میں جدوجہد کررہے ہو تو میں اندر رہ کے تمہاری مدد کررہی ہوں۔ دن رات لڑرہی ہوں اپنے آپ سے۔ اور دنیا کی تمسخر اڑانے والی نگاہوں سے۔ اپنوں کی زبان کیا کہتی ہے' غیر کیا سناتے ہیں۔ میں سب سنتی اور دیکھتی ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہارا بھرم رکھتی ہوں۔ کسی پر تمہاری اصلیت ظاہر نہیں ہونے دیتی۔"

میں نے کہا "میری اصلیت۔۔۔؟"

"ہاں تمہاری اصلیت" وہ چلّا کے بولی "اگر میں سب کو بتادوں کہ تم کیا ہو تو تم کیا کروگے۔ مجھے قتل کردوگے یا کرادوگے؟ لیکن اس کے بعد تم کہاں جاؤگے۔ وزیراعظم ہاؤس میں یا پھانسی کے تختے پر۔ تمہاری محبت میری کمزوری ضرور ہے عالم اور میری مجبوری بھی ہے مگر محبت کی ذلت مت کرو۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔۔ تم دھمکی دے رہی ہو؟"

"ہاں۔ میں برباد کردوں گی تمہیں۔ تمہارے کیریئر کو اور تمہارے پبلک امیج کو جو دنیا نہیں جانتی وہ میں جانتی ہوں۔ میرے پاس اتنا بارود ہے عالم کہ مجھے بس ایک چنگاری پھینکنی ہوگی پھر نہ تم رہوگے نہ تمہارے خواب۔ نہ یہ جدوجہد جو تم نے اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کی ہے۔"

میں نے کہا "آہستہ بات کرو۔ اگر حالات واقعی خرابی کی اس انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔ تو ہم ایک باعزت سمجھوتا بھی کرسکتے ہیں۔"

"کیسا سمجھوتا؟"

"اپنی اپنی زندگی اس طرح گزارنے کا جیسی ہم شادی سے پہلے گزارتے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ ہمارے بچّے نہیں ہوئے ورنہ ہم زیادہ مجبور ہوتے۔ تم خود مانتی ہو کہ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ خدا نے حُسن بھی دیا ہے اور لازوال شباب بھی۔ اس کے قدرداں بھی بہت ملیں گے۔ ایک شاہ عالم نہ سہی دوسرا سہی۔"

وہ سکتے کی حالت میں بیٹھی مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی جس سے مجھے غلط فہمی ہوگئی کہ میں نے اس کا دماغ درست کردیا ہے۔ اصل شاہ عالم بزدل تھا یا احمق کہ بیوی اس کے اعصاب پر سوار ہوگئی تھی اور وہ بیوی سے ڈرتا تھا۔ مردانہ وار دوٹوک لہجے میں بات کرتا تو رخشندہ کی مجال تھی کہ۔۔۔

لیکن میری غلط فہمی فوراً رفع ہوگئی جب رخشندہ کا نرم و ملائم گلابی ہاتھ اوپر اٹھا اور اس نے میرے گال پر چٹاخ سے تھپڑ ماردیا۔ اس فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جہاں نہ جانے

کتنی نظریں مجھ پر تھیں۔ وہ ایک دم روتی ہوئی اُٹھی اور سب کے درمیان سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں گال پر ہاتھ رکھے بے وقوفوں کی طرح ہکّا بکّا بیٹھا رہ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کسی اور میز کی طرف دیکھوں یا ویٹرز کی طرف جو یقیناً زیرِ لب مسکرا رہے ہوں گے اور ایک دوسرے کو آنکھیں ماررہے ہوں گے۔ ابے یار' کیا سین ہے۔ تو نے دیکھا' شاہ عالم کی گھروالی نے کیا چانٹا مارا اس کے منہ پر۔ سب کے سامنے۔۔۔ اور اپنے شاہ عالم صاحب گال پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ قسم اللہ کی' میری بیوی ہوتی تو سالی کی ہڈیاں توڑدیتا۔ وہ مجھ پر ہاتھ اُٹھائے' اس کی ناک چوٹی کاٹ کے گھر سے نہ نکال دوں۔

تیمور اسی بدحواسی کی کیفیت میں نمودار ہوا "یہ تم نے کیا کہہ دیا اس سے؟ حد کرتے ہو تم بھی۔ سب کے سامنے تماشا بنالیا خود کو۔ میں نے تمہیں بتادیا تھا کہ وہ کس مزاج کی عورت ہے۔"

میں نے کہا "تیمور۔ بھونکنا بند کرو۔ یہ بتاؤ وہ یہاں آئی کیسے؟"

"میں خود حیران ہوں۔"

"اگر میں ایک جھانپڑ ماردوں اسی طرح تمہارے بھی۔ تو تمہاری سب حیرانی دور ہوجائے گی۔" میں نے غرا کے کہا "کس نے بتایا تھا اسے کہ آج میں یہاں ہوں؟"

"تم سمجھ رہے ہو کہ ایسا میں نے کیا تھا۔۔۔؟"

"اور کون کرسکتا ہے یہ حرامی پن۔ صرف تمہیں معلوم تھا کہ شاہ عالم ابھی پاکستان نہیں لوٹا۔ ناصر عظیم واپس آیا ہے۔"

"قسم خدا کی' یہ حرکت کسی اور نے کی ہے۔ بہت ہیں شاہ عالم کے بدخواہ اور دشمن۔۔۔ جو رخشندہ کو ہی نہیں' دنیا کو بتاتے رہتے ہیں۔ ہر خبر ہر اطلاع پہنچادیتے ہیں۔ خیر اب چلو یہاں سے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت کوئی صحافی یا جاننے والا نہیں تھا۔ میں ہوٹل کے منیجر سے بات کرلیتا ہوں۔ وہ سب سنبھال لے گا۔ کسی اخبار میں کچھ نہیں آئے گا۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "اگر آجائے گا تو فرق پڑے گا شاہ عالم کو' مجھے نہیں۔ کیونکہ میں ناصر عظیم ہوں۔ اور ناصر عظیم ہی رہوں گا' میں جارہا ہوں۔"

"کہاں جارہے ہو" تیمور نے پریشان ہوکے کہا "یار یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔۔۔ سب ہوتا ہے زندگی میں۔ تم کو جوش سے نہیں' ہوش سے کام لینا چاہیے۔ بیٹھو آرام سے' تو پانی پیو۔ ہم یہاں کھانے کے لیے آئے تھے۔"

میں نے کہا "مجھے اب بھوک نہیں رہی۔"

"اچھا یہاں بیٹھو تو سہی۔ کافی پی لو" اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ میں نے کہا "میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ تم کھانا کھاکے آجانا پھر بات کریں گے۔"



"چلو جیسے تمہاری مرضی۔ میں آتا ہوں تو مجھے کمرے میں۔"

اس وقت تک میں پُرسکون ہوکے طے کرچکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس خطرناک کھیل میں شامل ہونا میرے بس کی بات نہیں۔ میں اس کھیل کو آغاز سے پہلے ہی ختم کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

ڈائننگ ہال سے نکل کے میں نے سیدھا منیجر کے کمرے کا رُخ کیا "مجھے اپنا بریف کیس چاہیے۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "یس سر۔ اس رسید پر دستخط کردیں پلیز۔"

میں نے دستخط کرکے رسید اس کے حوالے کی اور بریف کیس لے کر اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ ہوٹل چھوڑنے سے پہلے بل ادا کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ تیمور کی ذمے داری تھی جس نے کمرے بک کرائے تھے۔ ویسے بھی میں اسے بتائے بغیر نکل جانا چاہتا تھا۔

ایک زینہ چڑھ کے مجھے کمرے کی چابی کا خیال آیا۔ چابی میری جیب میں نہیں تھی۔ شاید میں نے ٹیبل پر ہی چھوڑدی تھی۔ میں واپس گیا تو تیمور کھانے میں مصروف تھا۔ اس نے مجھے پھر کھانے کی دعوت دی جو میں نے رُکھائی سے مسترد کردی۔

"میرے کمرے کی چابی ہوگی شاید میز پر۔"

"میز پر۔۔۔۔ یہاں تو مجھے نظر نہیں آرہی ہے" تیمور بولا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا اور میں اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔ اپنے کمرے کے دروازے پر رُک کے میں نے ایک لمحہ توقف میں گزارا۔ پھر میں نے ہینڈل گھمایا' دروازہ کھل گیا۔ اپنے عین مقابل اپنے بیڈ پر میں نے رخشندہ کو دیکھا۔ کمرے کی چابی اسی نے اٹھائی تھی۔ اپنا حق سمجھتے ہوئے۔ اگر وہ کاؤنٹر سے بھی چابی مانگتی تو کوئی اسے انکار نہ کرتا۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھا کے کہا "تم۔۔۔ یہاں۔۔۔؟"

وہ مسکرائی "اور کہاں ہونا چاہیے مجھے۔۔۔؟"

اس سے پہلے کہ میں رخشندہ کی بات کا جواب دیتا کسی نے میرے سر پر کوئی بھاری چیز ماری۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کی بے سود کوشش کی اور پھر وہیں منہ کے بل گرگیا۔

تاریکی چھٹنے لگی اور بے ہوشی کا یہ وقفہ بالآخر ختم ہو گیا۔

میری آنکھوں نے سب سے پہلے ایک روشنی سی دیکھی جو پہلے غیر واضح اور مبہم سی تھی۔ جیسے بادلوں کے غبار سے سورج کا گولا ایک اُجلے دھبے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ پھر میں نے آنکھوں پر زور دے کر اس روشنی کو فوکس کیا تو دیوار پر آویزاں ڈبل شیڈ والی لائٹ صاف نظر آنے لگی۔ اس وال لائٹ کا ڈیزائن کچھ ایسا تھا جیسے دو چھوٹے چھوٹے ٹیبل لیمپ ایک ساتھ جوڑ دیے گئے ہوں۔ ایک کا شیڈ سبز تھا اور دوسری کا نیلا۔ اس وقت نیلے شیڈ والی لائٹ روشن تھی۔ دیوار کے آف وائٹ رنگ پر اس کا نیلگوں اُجالا پھیلا ہوا تھا۔

لائٹ کے عین نیچے تقریباً آٹھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی منقش سیاہ فریم والی تصویر تھی۔ تصویر میں پتھر کی چٹانوں' گول پتھروں اور لمبی گھاس جیسے پودوں کے درمیان سے جھاگ بھرے شفاف پانی کا دھارا بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ پانی اتنا اُجلا اور برفانی تھا کہ اس میں جھاگ کے ساتھ برف کے سفید ٹکڑے بھی پگھلتے ٹوٹتے نظر آرہے تھے۔ یہ یقیناً پہاڑوں سے اُترنے والا پانی تھا جو دھوپ کی تمازت سے پگھلنے والی برف سے بنا تھا۔ پتھروں کے' سبزے کے اور آسمان کی نیلاہٹ کے رنگ اتنے نکھرے ہوئے تھے کہ میں نے پتھروں سے ٹکرانے والے پانی کی پھوار کو اور اس کی برفانی ٹھنڈک کو اور گھاس کے بھیگے پتوں کی نم آلود مہک کو محسوس کیا۔

یہ ایک نظر اور لمحے کا احساس تھا۔ دوسرے لمحے میری نگاہ اس منظر سے ہٹ گئی۔ میں نے دوسری دیوار کو دیکھا۔ پھر تیسری اور چوتھی دیوار کو۔ ان سب پر ایک جیسی وال لائٹس روشن تھیں اور ان کا سکون دینے والا نیلا اُجالا بہت نرم اور خواب آور محسوس ہوتا تھا۔ دیواروں پر سنہرے روپہلے فریم میں دلکش قدرتی مناظر کی تین دیگر تصاویر میں جھیل سیف الملوک کا برف زار تھا تھرپارکر یا کسی اور صحرائی علاقے میں غروبِ آفتاب کا اداس کر دینے والا منظر تھا۔ ایک دُکھی اونٹ' کسی کھجور کے درخت پر بنے آشیانوں کی جانب مائل بہ پرواز پرندے۔ اور ان سب کے سیاہ سائے۔ سُرخ اور نارنجی رنگ سے شام کا تصور ہی ذہن میں ابھرتا تھا حالانکہ یہ صبح کا منظر بھی ہو سکتا تھا۔ تیسری تصویر میں ایک بُتِ کافر اپنے گلابی مرمریں بدن کی ساری تابانی کے ساتھ خود سے بھی زیادہ حسین کار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور کار کسی فرانسیسی یا اطالوی محل کے پس منظر میں سوئمنگ پول اور سبزہ زار کے درمیان کھڑی تھی۔ یہ کسی کار کا اشتہاری پوسٹر تھا' خاصا بڑا' جس میں ذوقِ نظر کے اسباب کی اتنی فراوانی تھی کہ اسے فریم کرا لیا گیا تھا۔ اب جس کا جو دل چاہے دیکھے' محل' باغ' سوئمنگ پول' کار یا اس ہوشربا حسینہ کو۔ فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ یہ تصویر عین میرے سامنے تھی۔ باقی چیزوں پر غور کرنے کا خیال مجھے اس لیے نہیں آیا کہ حُسنِ جاناں کا نظارہ میرے لیے تلخ ثابت ہوا۔

اچانک وہ سوال میرے ذہن میں آگیا جو لاتعداد فلموں میں ہیرو یا ہیروئن نے اس قسم کی سچویشن میں سب سے پہلے کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ـــ میں کہاں ہوں؟ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ کروڑپتی' ارب پتی باپ کی پری وش لختِ جگر خود کو ماہی گیروں یا سپیروں کی بستی کے سردار کے جھونپڑے میں پاتی ہے یا پھر اس کے برعکس غریب ماں کا اکلوتا اور یتیم بیٹا خود کو کسی کروڑپتی ارب پتی باپ کی نورِ نظر کے بیڈ روم میں پا کے یہ سوال کرتا ہے اور اس کے اردگرد جمع کیے جانے والے سوالیہ چہرے بڑے دُکھ سے سرہلاتے ہیں کہ آہ ـــ بے چارے/بے چاری کی یادداشت چلی گئی۔ تین گھنٹے کے لیے کیونکہ فلم ختم ہونے تک وہ بہرحال واپس آجاتی ہے۔

میرے آس پاس سپیرا' مچھیرا' وڈیرا کوئی تھا ہی نہیں ورنہ میں بھی شاید یہ فلمی سوال ضرور کرتا۔ مزید یہ کہ میری یادداشت خیروعافیت کے ساتھ اسی طرح موجود تھی جیسے ایک روایتی شوہر پرست اور مشرقی بیوی ہر حال میں ساتھ رہتی ہے بلکہ اعصاب پر سوار رہتی ہے۔

مجھے ایک دم سب یاد آگیا اور غالب کے مصرعے کو پلٹتے ہوئے ـ سر اُٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا۔ سر کو تکیے سے اُٹھاتے ہی مجھے اس چیز کا خیال آیا جو میرے سر پر ماری گئی تھی۔ یہ خیال آنا ایک فطری سی بات تھی۔ میرے سر میں درد کسی طائرِ بسمل کی طرح قفس کی دیواروں میں تڑپ رہا تھا اور ہر طرف دیوانہ وار ... ٹکرا رہا تھا۔ میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ورنہ شاید میرے کندھے اسے نہ سنبھال پاتے۔ مجھے اپنا سر کسی چٹان کی طرح بھاری محسوس ہوا حالانکہ یہ میرا اپنا اوریجنل اور وہی سر تھا جس میں شاید ایک پاؤ مغز ہو گا اور بقول چندا کے ــــ عقل کے بجائے بھوسا کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔

میں نے سر کا سروے کیا۔ پھر انگلیوں کو اور تکیے کو دیکھا مگر لہو کی سُرخی مجھے دکھائی نہ دی۔ اس سے مجھے اطمینان ہوا کہ سر سلامت ہے۔ پچھلے حصّے میں البتہ مجھے یوں لگا جیسے اس کی گولائی میں فرق آگیا ہے۔ اس پر ایک اُبھار سا تھا جیسے تربوز پر آدھا سنگترا اُلٹا رکھ دیا جائے۔ سنگترے کو چھونے سے تربوز کو خاصی تکلیف ہوئی۔

میں نے آنکھیں بند کر کے سوچا ـــ آخر میرے سر پر کیا چیز ماری گئی تھی؟ ڈنڈا یا پتھر؟ ریوالور کا بٹ یا گلدان ــــ سر پر مارنے کے لیے یہ پسندیدہ اشیا شمار ہوتی ہیں۔ اپنا قیمتی ڈنر سیٹ یا وی سی آر اُٹھا کے کوئی نہیں مارتا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میرے سر پر لاٹھی ماری گئی تھی یا بھینس۔ جواب طلب سوال یہ تھا کہ ایسا کس نے کیا تھا اور کیوں؟

سوال مشکل تھے مگر اپنی بے پناہ ذہانت کے باعث میں نے فوراً حل کر لیے۔ پہلے سوال کا جواب تھا خبیث درجۂ اوّل و خطازاد امیر تیمور۔ دوسرے کا جواب تھا کہ مجھ سے اپنا بریف کیس واپس لینے کے لیے لیکن ان جوابات نے مجھے مطمئن نہیں' مزید مشتعل کیا۔ میں نے اسے ناقابلِ اشاعت گالیاں دیں' دل ہی دل میں۔ یہی کام وہ ایکشن فلموں کے چالاک ولن کی طرح آسانی سے یوں بھی کر سکتا تھا کہ اچانک دروازے کے پیچھے سے ریوالور ہاتھ میں لیے نمودار ہو جاتا اور قہقہہ مار کے کہتا "لاؤ' ہیروں والا بریف کیس مجھے دے دو۔" اور اپنا سر بچانے کے لیے میں کہتا کہ اچھا بھائی' یہ لو بریف کیس۔ مجھے کیا پتا اس میں ہیرے ہیں یا کھیرے؟

مگر نہیں ـــ ہیرو بھی ولن کو بھائی نہیں کہہ سکتا۔ اور امیر تیمور کو میں ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتا چھوڑ کے آیا تھا۔ وہ ایسے کھا رہا تھا جیسے اس کا رزق ختم ہونے والا ہے۔ وہ ریوالور کے ساتھ سامنے کیسے آسکتا تھا۔ وہ پیچھے آکے بھی ڈنڈا اسی صورت میں مار سکتا تھا جب کھانا چھوڑ کے وہ فوراً میرے پیچھے خاموشی سے آجاتا مگر یہ دونوں امکانات میں نے مسترد کر دیے۔ ٹیبل پر جمع ساری خوراک کو پیٹ کے اسٹور میں منتقل کیے بغیر تیمور کا اُٹھنا محال تھا اور اتنی خاموشی سے میرے پیچھے آنا کہ مجھے پتا بھی نہ چلے' ناممکن۔ میرے کان بھی بہت تیز ہیں۔ ایک بار مجھے شک ہوا تھا کہ کوئی چیونٹی میرا تعاقب کر رہی ہے اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو واقعی میرے پیچھے ایک چیونٹی آرہی تھی۔

خیر ـــ بریف کیس جائے جہنم میں۔ نہ مجھے ہیروں سے دلچسپی اور نہ کھیروں سے۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا انشاءاللہ کہ میرے سر کو توڑنے کی کوشش کرنے والا کون تھا؟ زیادہ اہم اور سنسنی خیز سوال یہ ہے کہ وہ میری مبینہ منکوحہ ــــ رخشندہ عرف رخشی جو میرے بیڈ پر تقریباً اسی ہوشربا اور پُرکشش پوز میں دراز تھی جیسے یہ کار پوسٹر والی حسینہ کھڑی ہے ــــ وہ کہاں گئی؟ میں نے پوسٹر کو بغور دیکھا کہ کہیں یہ وہی تو نہیں مگر یہ ولایتی مکھن تھی تو وہ دیسی گھی۔

کیا یہ بیڈ روم اسی کا ہے؟ میں نے اپنی قوتِ مشاہدہ کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے سوچا اور آنکھیں کھول کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وسیع بیڈ کی خالی جگہ پر بستر کی ہر شکن میں' تکیے پر ایک چمکیلے لمبے بال کی سیاہی میں اور ایک انوکھی دلکش مہک میں جو فرنچ پرفیوم اور کسی پُرشباب بدن کی خوشبو کا مجموعہ تھی میرے سوال کا جواب موجود تھا۔

میرے بہت قریب ایک زنانہ نائٹ ڈریس پڑا تھا۔ سرسراتے ریشم اور اُڑتے بادلوں جیسا نرم و لطیف۔ میں ہڑبڑا کے ایک دم اُٹھ بیٹھا اور اس نائٹ ڈریس کو ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ کسی سانپ کی چھوڑی ہوئی کینچلی ہو۔ اس خیال نے مجھ پر لرزہ طاری کر دیا کہ سانپ رات بھر میرے ساتھ تھا۔ اسے زخم خوردہ ناگن سے تشبیہ دینا زیادہ مناسب ہو گا۔ کیا اس ناگن نے مجھے ڈس لیا ہو گا بے خبری میں۔ نہیں' جب مجھے اپنا ہوش نہ تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مجھ سے کوئی حسین ناگن لپٹی ہوئی تھی یا میں کسی اژدہے کے منہ میں تھا۔

اس کے باوجود میرا احساسِ شرمندگی باقی رہا۔ یہ قصور میرا نہیں تھا' رخشندہ کو بھی نیت کی حد تک الزام نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے صورت کے فریب میں کسی شک وشبے کے بغیر مجھے اپنا اوریجنل شوہر مان لیا تھا حالانکہ میں اس کی کاربن کاپی تھا۔ اصل شوہر نہ جانے کہاں ناصر عظیم بنا میری رُسوائی کا سامان کر رہا تھا اور یہاں اس کی خواب گاہ میں اس کی بیوی کے ساتھ ناصر عظیم شوہرِ ثانی کا کردار ادا کرنے پر مجبور تھا۔ بلکہ مجبور کر دیا گیا تھا۔ شوہرِ اوّل کو یہ بات معلوم ہو جائے تو اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہو گا اور عبرت کا بھی۔ وہ مجھے سیاہ کار ثابت کرنے کے لیے دنیا بھر میں منہ کالا کرتا پھر رہا تھا اور یہاں قدرت کے دستِ غیب نے وہ بندوبست کر دیا تھا کہ سارے پہروں اور اخلاقی قدروں کی دیواروں کے باوجود میں اس کے بیڈ روم میں اس کی بیوی کا شوہر بنا ہوا تھا۔ یہ بات نہ اسے معلوم تھی اور نہ اس کی بیوی کو۔ ابھی تک عملاً اور عمداً میں نے رخشندہ کو بیوی کی حیثیت نہیں دی تھی مگر وہ ایسا ہی سمجھتی تھی۔ نہ میں انکار کر سکتا تھا اور نہ اقرار۔ ڈرامائی اور مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ہی یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک تھی۔

مجھے اس مشکل میں ڈالنے والا تیمور تھا۔ ایک بار پھر میں نے اسے دل ہی دل میں بہت گالیاں دیں لیکن یہ بہرحال مسئلے کا حل نہیں تھا۔ جب تک مجھے ہوش نہیں تھا' رخشندہ کے مجھے اپنا شوہر سمجھنے میں کوئی حرج نہیں تھا یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ہاتھوں میری عزت محفوظ تھی۔ بے اعتنائی اور بے وفائی کا الزام اپنی جگہ۔ شاہ عالم اب بھی رخشندہ کا شوہر تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار اپنے گھر ضرور جاتا تھا۔ میں نے خود بھی تیمور سے بڑے دعوے کے ساتھ کہا تھا کہ کوئی بھی ہم شکل زمانے کو دھوکا دے سکتا ہے' خلوت کی رازداں بیوی کی نظر سے اصل اور نقل فرق چھپا نہیں رہ سکتا۔

میں پھر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ رخشندہ کو بھی پتا چل جائے گا کہ میں اس کا جعلی شوہر ہوں۔ ایک دو چھوٹی چھوٹی غلطیاں وہ پہلے بھی پکڑ چکی تھی لیکن کوئی بڑی غلطی بالآخر میرا راز فاش کر دے گی۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ رخشندہ خود مجھے قتل کر دے گی؟ ویسے تو اس نے بہت قتل کیے ہوں گے۔ تیرِ نگاہ سے اور خنجرِ ابرو سے اور حسن کی تیغِ بے نیام سے مگر میرا قتل قدرے مختلف ہو گا۔ اس کے لیے شاید وہ مجھ پر توپ چلاتا یا ٹینک چڑھانا چاہے مگر ریوالور جیسی کوئی چیز اسے ضرور دستیاب ہو گی۔ عورت سب کچھ کر سکتی ہے لیکن کیا رخشندہ جیسی عورت میں اتنی ہمت ہو گی کہ وہ سچ مچ ایک قتل کر دے اور اس کے بعد کے مسائل سے بھی خود ہی نمٹ لے مثلاً لاش غائب کرنا اور جرم کا ہر سُراغ مٹانا۔ حقیقی زندگی میں بڑے بڑے سورما قتل کرنے کا سوچتے ہیں تو اپنی لاش کو پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیکھ کے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ رخشندہ کیسے قتل کر سکتی ہے۔ کیا وہ

قتل کرا سکتی ہے؟ وہ گھر میں رہنے والی عام سی عورت ہے۔ اس کا سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں کہ کسی پروفیشنل یعنی پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کرے۔ شاہ عالم اس کا شوہر ضرور سب کو جانتا ہوگا کہ اس شہر میں کون کیا ہے اور کیا کر سکتا ہے؟ مگر رخشندہ تو شاہ عالم سے بھی نہیں کہہ سکتی کہ اس بدمعاش کو قتل کرا دو کیونکہ تمہاری عدم موجودگی میں یہ دھوکے سے میرا شوہر بن گیا تھا۔ مجھ سے پہلے تو وہ رخشندہ کو قتل کرے گا کہ اُلو کی پٹھی' عقل کی اندھی' یہ شوہر بنا تھا' تو کیسے بیوی بن گئی تھی؟ تجھے شاہ عالم اور ناصر عظیم کا فرق نظر نہیں آیا اور محسوس نہیں ہوا؟

کرنل خان یا خانِ اعظم عرف خان جی کے اقوال زریں سے میں اسی طرح اختلاف کرتا تھا جیسے نیدے مریض پرہیز کے مشورے سے یا کمزوردل انجکشن لگانے پر احتجاج کرتے ہیں۔ پرہیز اور علاج کی افادیت کو تسلیم کرنے کے باوجود۔ سچ کڑوا ہو پھر بھی اپنا وجود تسلیم کرا سکتا ہے۔ خان جی بہت زیادہ نہیں فرماتے تھے مگر جو فرماتے تھے اس کا ہر لفظ ناقابلِ تردید و ترمیم ہوتا تھا۔ ان کی صداقت کو میں نے بارہا واقعات' حالات اور تجربات کی کسوٹی پر بھی پرکھ لیا تھا اور پھر تسلیم کیا تھا کہ میں بغیر کانوں والا خرگوش ہوں۔ گوش فارسی میں کانوں کو کہتے ہیں۔ گوش کے بغیر خرگوش خاصی مختلف چیز بن جاتا ہے۔

خان جی کا ایک اہم ترین قول جس کو ان کے فلسفۂ حیات کا محور قرار دیا جا سکتا ہے' یہ تھا کہ خیال کو کنٹرول کرو۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے خیالوں کے انتشار کو ختم کرو۔ خیال میں ڈسپلن قائم کرو۔ اسے نظم و ضبط اور قواعد کا پابند کرو۔ جس فوج میں ڈسپلن اور ہم آہنگی کے ساتھ ایک مقصد کے لیے اتحاد اور ارتکاز کی صلاحیت نہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ پہلے خیال کو کنٹرول کرو۔ پھر مقصد کا تعین کرو' اس کے بعد ایک وقت میں اپنی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیت اس مقصد کے حصول پر صرف کر دو۔ اسے وہ UNITY OF OBJECT کہتے تھے۔

آہستہ آہستہ خان جی کی تربیت سے میرا ذہن اسی طرح سوچنے لگا تھا جیسا وہ چاہتے تھے کہ میں سوچوں۔ جیسے جنگلی شیر مسلسل محنت اور تربیت سے اشاروں کا غلام ہو جاتا ہے اور ایک آدمی جسے وہ اپنی وحشی قوت سے چند منٹ میں نوش فرما کے ڈکار لے سکتا ہے اسے بندر کی طرح نچانے لگتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت میری تھی۔ میں بھی جنگلی شیر تھا' بے مہار اونٹ تھا یا بحرِ ظلمات کا گھوڑا تھا۔ خان جی نے مجھے سدھا لیا تھا اور اب ایک طرح سے میں ان کا ذہنی غلام تھا۔ سوتے جاگتے میری سوچ ان کے تابع رہتی تھی۔ بالکل اس شخص کی طرح جسے ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔ مجھے ہمیشہ یہ شک رہا اور آج بھی ہے کہ کرنل خان کے پاس کچھ خفیہ پُراسرار اور مافوق الفطرت قسم کی قوت یا صلاحیت ضرور تھی جس کو وہ کسی مداری کی طرح کام میں لاتے تھے تو میں بچہ جمہورا ہو جاتا تھا۔ میں اپنے آپ پر اختیار سے بھی محروم ہو جاتا تھا۔ ہر مداری کی طرح وہ بھی کہتے تھے کہ بچہ جمہورا' جادو کوئی چیز نہیں۔ سب نظر کا دھوکا ہے۔ ہاتھ کی صفائی ہے یا خیال کی طاقت۔ ارشمیدس تو مداری نہیں تھا۔ اتنا بڑا سائنس داں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے خلا میں قدم جمانے کے لیے ایک جگہ دے دو اور ایک لمبا سا بانس یا ڈنڈا' میں زمین کو اس کے محور سے ہٹا دوں گا۔ لوگ ہنس ہنس کے پاگل ہو جاتے تھے۔ نیوٹن کو کریک کہتے تھے۔

اس وقت بھی میں نے خیال کو کنٹرول کیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آنکھ کھولتے ہی چیخ پکار کرنے لگتا۔ چلّانے لگتا کہ کوئی ہے' دروازے بجاتا اور باہر جانے کی کوشش کرتا۔ دروازے مقفل ہوتے تو ان پر مُکّے اور لاتیں مارتا۔ چیزیں اٹھا اٹھا کے دروازے پر مارتا اور اسے توڑنے کی کوشش کرتا لیکن میں نے ہوش میں آتے ہی اپنی ذہنی تربیت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے خیال کو کنٹرول کیا' یہ سوچا کہ میں کہاں ہوں' کیوں ہوں اور میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا؟

جیسے ہی مجھے یقین آیا کہ رخشندہ کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے اور اب وہ مجھے نہ قتل کر سکتی ہے نہ کرا سکتی ہے۔ تو میں نے خود کو کچھ محفوظ اور پُرسکون محسوس کیا۔ بلیک میل کوئی شریفانہ لفظ نہیں اور بلیک میلر کے نام سے ہی ذہن میں ایسے مجرم کا تصور اُبھرتا ہے جو لوگوں کی جان و مال اور آبرو سے کھیلتا ہو اور پھر ان کی مجبوری کو کیش کراتا ہو مگر دیکھا جائے تو تھوڑے بہت بلیک میلر تمام خطا کار انسان ہوتے ہیں۔ میرے جیسے اور آپ جیسے۔ بچے' بوڑھے' جوان۔ مرد یا عورت سب کسی حد تک جذباتی بلیک میلنگ ضرور کرتے ہیں۔ بچہ جب اڑ جاتا ہے کہ ٹافی دوگے تو میں دوا پیوں گا ورنہ نہیں یا میں کلاس میں فرسٹ آیا تو انعام میں بائیسکل ملے گی؟ تو وہ بڑوں کو بلیک میل کرتا ہے۔ بوڑھا مرنے سے اور جوان بھاگنے سے ڈرا کے گھر والوں کو بلیک میل کرتا ہے۔ بیوی روٹھ کے بلیک میل کرتی ہے تو خاوند دوسری شادی کی یا طلاق کی دھمکی سے بلیک میل کرتا ہے۔ ماں جب ہنگامہ کرتی ہے کہ تو نے میرے بھائی کی کانی' لنگڑی' جاہل اور ہمہ صفت بھینس جیسی بیٹی سے شادی نہ کی تو میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی یا باپ عاق کرنے کا نوٹس دیتا ہے تو وہ بھی بلیک میل کرتا ہے۔

رخشندہ کو بلیک میل کرنا میری ضرورت بن گیا تھا۔ اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی کی اور آزادی کی ضمانت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ خود مجھے تیمور نے جس طرح بلیک میل کیا تھا اس کے بعد میرا جوابی طرزِ عمل شریفانہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اتنا احمق نہیں تھا کہ میرے سامنے پاگل کتا ہو تو میں پتھر مارنے کے بجائے اپنی ٹانگ آگے بڑھا دوں۔ کوئی مُکّا مار کے میری بتیسی باہر کرنا چاہتا ہو تو میں حساب لگاتا رہوں کہ نقلی بتیسی پر کتنا خرچ آئے گا۔ پھر میری ٹانگ توڑ دے تو میں سوچنے لگوں کہ بیساکھی کہاں ملتی

ہے۔ مزاحمت اور مقابلہ اور زندگی کی حفاظت کے لیے آخری سانس تک جدوجہد کے ساتھ دشمن کو نیست و نابود کر دینے اور جینے کا حق حاصل کرنے کے لیے ہر مخالف قوت کے وجود کو مٹا دینے کے لیے ایک جنگ ہر گھڑی ہر جگہ جاری رہتی ہے۔ فنا اور بقا کی اس جنگ میں صرف طاقتور باقی رہتا ہے۔ یہ قانونِ ازل ہے' قانونِ قدرت ہے جس کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ سب سوچنے کے بعد میں نے خود کو حالات کے دھارے کے سپرد کر دیا۔ ابھی مجھے خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی اپنائی اور آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی مجھے دیکھنے اور میرا حال پوچھنے ضرور آئے گا۔ میں کسی جنگل یا قید خانے میں نہیں تھا۔ مجھے اس پُرتکلف بیڈ روم میں لا کر لٹانے والے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کو میرا کتنا خیال ہے اور انہیں میری صحت' آرام اور بھلائی کتنی عزیز ہے؟

کچھ دیر بعد اس حالت میں لیٹے رہنا مشکل ہو گیا۔ سردرد سے نجات کے لیے مجھے فوری طور پر اسپرین کی ضرورت تھی۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی اور نقاہت بھی۔ اگر اس وقت مجھے ایک بہت بڑے کلب سینڈوچ کے ساتھ کافی کا بہت بڑا مگ مل جاتا اور اس کے ساتھ اسپرین کی تین گولیاں تو آدھے گھنٹے بعد میری جسمانی توانائی کی بیٹری پوری طرح چارج ہو جاتی پھر میں ٹانگیں اوپر سر نیچے کرکے ہتھیلیوں کے بل کمرے میں چکر لگا سکتا تھا۔ خٹک ڈانس کر سکتا تھا اور اگر امیر تیمور سامنے آ جاتا تو اس کو گیند سمجھتے ہوئے چھت تک اُچھال سکتا تھا' دیوار پر مار سکتا تھا اور فضا میں بلند کرکے کیچ کر سکتا تھا یا کیچ ڈراپ کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اس میں آٹھ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے اور سترہ تاریخ نظر آ رہی تھی۔ ایک وال کلاک کا ٹائم بھی تقریباً یہی تھا۔ طے شدہ طور پر یہ رات کا وقت تھا اور یہ نئے سال کے پہلے مہینے کی سترہ تاریخ تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ درمیان میں ایک رات گزر گئی تھی اور یہ اس کے بعد آنے والی رات تھی۔ پندرہ جنوری کی رات پونے بارہ بجے کے قریب ہی میرے سر کو نشانہ بنایا گیا۔ تین گھنٹے بعد اس المناک حادثے کو پورے دو دن ہو جاتے۔ میں نے پینتالیس گھنٹے سوتے ہوئے بے ہوشی کی کیفیت میں گزار دیے تھے۔

اس بات نے مجھے کچھ حیران کیا۔ سر کی ضرب مجھے ناک آؤٹ کرنے کے لیے کافی تھی مگر اس قسم کی بے ہوشی کا وقفہ دو چار گھنٹے سے زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ اگر چوٹ سے ہوش اُڑانے والا ماہر ہو تو وہ مخالف کی جسمانی قوت کے مطابق ناپ تول کے وار کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شکاری اپنے شکار کے سائز سے گولی کا سائز منتخب کرتے ہیں۔ شیر پر یا ہاتھی پر وہ گولی نہیں چلاتے جو چڑی مار یا کوّے مارنے والے استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح کوّے پر توپ نہیں چلاتے۔

مجھے ناک آؤٹ کرنے والا اناڑی نہیں تھا۔ وہ پولیس کا لاٹھی چارج کرنے والا سپاہی ہوتا یا مجھے انسان نہیں بھینس سمجھتا تو میرا سر پھاڑ دیتا مگر میرا سر کہیں سے بھی کریک نہیں ہوا تھا۔ اس گومڑے سے بھی یہی ثابت ہوتا تھا پھر میں پینتالیس گھنٹے کیسے بے ہوش پڑا رہا؟ عام حالات میں سر کی چوٹ کے نتیجے میں اتنی لمبی بے ہوشی کو ڈاکٹر کوما قرار دیتے ہیں اور پھر مضروب کو آئی سی یو میں رکھا جاتا ہے جہاں اللہ کی مرضی اور ڈاکٹروں کی کوشش سے چند گھنٹوں میں اسے ہوش نہ آئے تو پھر معاملہ سنگین ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بھی ہوش میں آ جانے والا ایک دم اُٹھ کے نہیں بیٹھ پاتا جیسے کہ میں اُٹھ بیٹھا تھا۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر نیم بے ہوشی کے طویل وقفے سے گزرتا ہے اور اس کی صحت رفتہ رفتہ بحال ہوتی ہے۔

مجھے سردرد کے سوا کوئی تکلیف نہیں تھی۔ سردرد کی شدت میں بھی کمی آ رہی تھی جسمانی طور پر میں خود کو فٹ محسوس کر رہا تھا اور ذہنی طور پر تو بے حد مستعد تھا۔ شدید چوٹ سے اڑتالیس گھنٹے تک بے ہوش رہنے والا ایک گھنٹے میں بھی سوچنے سمجھنے کی پوری صلاحیت کے ساتھ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بے ہوش نہیں تھا' سو رہا تھا اور اس نتیجے سے دوسرا نتیجہ یہ اخذ ہوتا تھا کہ میری نیند فطری یا طبعی نہیں تھی۔ کوئی بھی شخص مسلسل آٹھ دس گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتا۔ بہت زیادہ سونے والے یا تھکن اور کم خوابی سے بے حال شخص بارہ چودہ گھنٹے نیند میں گزار لے گا مگر چوبیس گھنٹے تک سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیند میں سارے جسم کے افعال سست پڑ جاتے ہیں مگر نظامِ ہضم و نظامِ اخراج اور تمام اعضائے رئیسہ اپنا کام سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے میں پیٹ خالی ہو جاتا ہے اور آنتیں پہلے قل ہو اللہ اور پھر انا للہ پڑھنے لگتی ہیں تو آدمی خواب میں قورمہ بریانی کھا کے مطمئن نہیں ہوتا۔ بھوکا پیٹ اسے روٹی کا قرض یاد دلا کے جگا دیتا ہے۔ حوائج ضروریہ کا مسئلہ الگ۔

اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مجھے سُلائے رکھا گیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے نہیں دوسروں کی مرضی سے سو رہا تھا۔ ہر چھ آٹھ گھنٹے بعد مجھے خواب آور گولی یا انجکشن دیے گئے ہوں گے۔ یہ سب کسی ماہر ڈاکٹر کی زیرِ نگرانی ہوا ہوگا ورنہ نیند سے بے ہوشی اور بے ہوشی سے فوتیدگی کی سرحد عبور کرتے دیر نہیں لگتی۔ یہ نظر نہ آنے والی اور محسوس نہ ہونے والی سرحد ایک ڈاکٹر کی نظر دیکھ سکتی ہے جو دل کی دھڑکن' نبض کی رفتار اور سانس کی آمد و رفت۔ بلڈ پریشر وغیرہ کی کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے طے کرتا ہے کہ نیند کو جاری رکھنے کے لیے مزید کتنی مقدار میں دوا دی جا سکتی ہے۔

یہ بہت اہم نتیجہ تھا' اس سے یہ ثابت ہوا کہ جتنی دیر میں سوتا

رہا اتنی دیر میں مجھے سُلانے والے بھی فارغ نہیں بیٹھے ہوں گے۔ ان کا مقصد اور مدّعا ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں سوتا رہوں اور وہ دیکھتے رہیں کہ میں سوتے میں کیسا لگتا ہوں۔ انہیں یہ مہلت خاموشی سے کچھ کرنے کے لیے درکار تھی۔ کوئی ایسا کام جو مجھے لاعلم رکھتے ہوئے سرانجام دینا ضروری تھا۔ انہیں ڈر ہوگا کہ میں ان سے تعاون نہیں کروں گا یا ان کے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں روڑے اٹکاؤں گا اور ان سے اختلاف پر ہنگامہ کروں گا۔ انہوں نے مشکل کام آسان کرنے کے لیے مجھے ناک آؤٹ کیا اور پھر سُلا دیا۔

جن حالات سے میں دوچار تھا ان میں یہ حرکت امیر تیمور کے سوا کوئی نہیں کرسکتا تھا مگر اس سے میں تعاون کر رہا تھا۔ اس کی ہر بات مان رہا تھا اور ہمارے درمیان "اخلاقی بنیادوں پر" ایک غیر قانونی معاہدہ بھی ہوچکا تھا۔ پھر اس نے یہ حرکت مجھ سے بریف کیس واپس لینے کے لیے کی ہوگی؟ میرا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ اس کا بریف کیس غائب کردوں یا کوئی ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے قبضے میں رکھوں۔ مجھے اس کے بریف کیس سے زیادہ اپنے بریف کیس میں دلچسپی تھی اور میرا بریف اس کی تحویل میں تھا اور خود میں اس کی تحویل میں تھا چنانچہ بریف کیس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ مجھے بریف کیس دیتا تو میں اس سے کہتا کہ یہ لو اپنا منحوس بریف کیس جس کے بارے میں تیمور نے ایک سنسنی خیز بیان جاری کردیا تھا کہ اس کو کھولنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ میرے بریف کیس میں صرف کاروباری نوعیت کی دستاویزات تھیں جن کے نہ ملنے سے مجھے لاکھوں کا نقصان ہوسکتا تھا۔ شاید امیر تیمور کو میری نیت پر شک ہوگیا تھا کہ میں بریف کیس سمیت فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اس میں کوئی ایسی چیز تھی جو تیمور کے نزدیک بہت قیمتی تھی یا انتہائی خطرناک تھی۔ شاید اس میں پارٹی سیکرٹ تھے' اس کے ایسے سازشی پلان تھے یا میرے خلاف جمع کیا ہوا مواد تھا۔ وہ مواد جس کی بنا پر میں اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونے پر مجبور تھا۔ اس نے میری رنگین راتوں کا حوالہ دیا تھا جن کا عکس تصاویر میں اور وڈیو فلموں میں محفوظ کرلیا گیا تھا اور یہ رُسوا کن مواد میرے عدمِ تعاون کی صورت میں میرے خلاف استعمال کیا جاسکتا تھا۔ یہ تصاویر اور فلمیں اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ان کا مرکزی کردار میں نہیں' شاہ عالم تھا مگر دستاویزی ثبوت اسے ناصر عظیم ثابت کرتے تھے۔ میرے پاسپورٹ پر شاہ عالم نہ جانے کتنے ممالک میں اور کس کس شہر میں گھوما تھا۔ اس نے میرے نام سے سفر کیا تھا چنانچہ بہت سی ائرلائنز کے ریکارڈ پر ناصر عظیم کا نام تھا۔ وہ جن ہوٹلوں میں ٹھہرا تھا وہاں ناصر عظیم کا نام لکھا ہوا تھا اور جن کے ساتھ اس کے روز و شب گزرے تھے وہ اسے ناصر عظیم کے نام سے ہی جانتی ہوں گی۔ ایسی صورت میں میرے انکار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اگر مجھے ناک آؤٹ کرنے کا مقصد بریف کیس واپس حاصل کرنا نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟ غور طلب نکتہ یہ بھی تھا کہ کیا یہ حرکت صرف امیر تیمور کرسکتا تھا؟ بظاہر اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ میرے ساتھ زیادتی کرے اور اچھے خاصے تعلقات کو خراب کرے۔ ڈنر کے بعد میرے اور اس کے درمیان سیاسی لائحہ عمل اور مستقبل کے کردار پر اہم میٹنگ ہونے والی تھی۔

میرا ذہن اُلجھن اور انتشار کی کیفیت سے دوچار تھا۔ رہ رہ کے میرے تصور میں رخشندہ کا وہ پوز آتا تھا جس میں وہ مجھے ہوٹل کے کمرے میں نظر آئی تھی۔ بہت پہلے میں نے الزبتھ ٹیلر کو فلم "کلوپیٹرا" کے پوسٹر میں اسی طرح دیکھا تھا اور بلاشبہ رخشندہ کا وہ انداز بھی کم توبہ شکن نہ تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی کافر ادا "بیوی" کے نظارۂ حسن کی دعوتِ شوق کو قبول یا مسترد کرتا' میرے دل سے بڑی قیامت سر پر ٹوٹی۔ اب اس کا وہ اندازِ دلبری یاد رہ گیا تھا۔ بقول مرزا سودا۔

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

میں نے رخشندہ کو جس حال میں دیکھا تھا وہ بھی مجھے شک میں ڈالتا تھا۔ کیا اس نے عمداً ایسا پوز بنایا تھا۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کہ عکاسی کرنے والا لباسِ شب خوابی۔ اس کا بےباک تبسم اور آنکھوں سے عیاں خودسپردگی کے جذبات۔ کیا یہ جال تھا جو میرے حواس پر بجلی گرانے کے لیے پھیلایا گیا تھا؟ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ دروازے سے اندر آتے ہی میری نظر اسے دیکھے تو میں بس دیکھتا ہی رہ جاؤں۔ برقِ حسن میرے خرمنِ عقل و ہوش کو ایسے جلا کے خاکستر کردے کہ مجھے گردوپیش کی خبر نہ رہے اور حملہ آور جو اس تاک میں تھا۔ اطمینان سے مجھ پر وار کرے۔ وہ کہیں اندرونی دروازے کے ساتھ لگا کھڑا ہوا تھا ورنہ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ رخشندہ نے مجھے کمرے میں قدم رکھتے دیکھا ہو مگر اس حملہ آور کو نہ دیکھا ہو جو سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ عین میرے پیچھے' اگر رخشندہ نے اسے دیکھا تھا تو وہ حیران یا خوف زدہ کیوں نہیں ہوئی تھی۔ اس نے چلّا کے مجھے خبردار کیوں نہیں کیا تھا اور چیخ کیوں نہیں ماری تھی۔ چیخ تو اکثر عورتیں بلاوجہ بھی مار دیتی ہیں۔

یہ مسئلہ کچھ اور گمبھیر ہوگیا تھا۔ اگر مجھ پر وار کرنے والا امیر تیمور نہیں تھا تو دوسرا شخص کون تھا جو رخشندہ سے ملا ہوا تھا یا اس کی مرضی سے اور خواہش پر میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کیا رخشندہ نے مجھے اغوا کرانے کے لیے پیشہ ور ماہرین کی خدمات حاصل کی تھیں۔ انہیں اپنی کارکردگی کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے مواقع بھی فراہم کیے تھے۔ اور بعد میں معاوضہ یا انعام دے کر رخصت کردیا تھا۔ مجھے بے ہوش کرکے پینتالیس گھنٹے تک سُلائے رکھنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ مجھے ہوٹل کے اس کمرے سے منتقل کردیا جائے۔ اس طرح کہ مجھے پتا ہی نہ چلے کہ میں کہاں لے

جایا جا رہا ہوں۔

لیکن ایک بیوی کو کیا ضرورت ہے کہ اپنے شاہ عالم جیسے شوہر کو یوں اغوا کرا کے گھر لائے۔ وہ دنیا بھر میں بھٹکتا پھرے گر لوٹ کے تو گھر ہی جاتا تھا۔ رخشندہ تو شوہر کے ساتھ ایسی غلط حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ شاہ عالم اسے بعد میں ایسی سزا دیتا کہ دوسری دنیا میں بھی اس کی روح عبرت پکڑتی رہتی۔ وہ کتنی بھی تیز' طرّار اور بدزبان یا بدمزاج کیوں نہ ہو' شاہ عالم سے زیادہ عیّار' سفاک اور طاقتور ہونے کا خیال اس کے ذہن میں اسی صورت میں آسکتا تھا جب اس کا دماغ چل جائے۔

پھر کیا رخشندہ کو مجھ پر شک ہوگیا تھا؟ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ تیمور نے میرے ساتھ مل کے کیا سازشی منصوبہ بنایا ہے؟ کیا پتا تیمور کے اور میرے درمیان ہونے والی باتوں کی خبر کسی غدار یا سیکرٹ ایجنٹ نے رخشندہ کو پہنچادی ہو اور وہ مجھے اغوا کرالائی ہو۔ شاہ عالم کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کہ دیکھو یہ ہے جو امیر تیمور غدارِ اعظم کے ساتھ مل کر تمہاری جگہ لینا چاہتا تھا۔ یہ ناصر عظیم ہے۔

مگر یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ اس سازشی منصوبے کی خبر براہِ راست شاہ عالم کو مل گئی ہو۔ اس کا جاسوسی کا نظام بہت مؤثر اور وسیع ہوگا۔ اسی نے مجھے اغوا کرایا ہو۔

خیال کا گھوڑا مفروضات کی راہوں پر بےلگام اور سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ میں نے اسے کنٹرول کیا۔ ایزی مسٹر ناصر عظیم! ایزی' تم کو قبل از وقت اندیشوں میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ فرض کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے کہ تمہیں اغوا کیا گیا ہے اور یہ کام رخشندہ' تیمور یا خود شاہ عالم نے کیا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ یہ خواب گھر کس کی ہے اور کہاں ہے؟ تم کراچی میں ہو یا لاہور میں؟ اس نائٹ ڈریس کی خوشبو تو کچھ نہیں بتاتی کہ یہ رخشندہ کا ہے یا کسی اجنبی میزبان کا' جو خوابوں کی مسافت میں شریکِ سفر رہی۔

خیر۔۔۔ میں نے اپنے آپ سے کہا' جو ہوگا' سامنے آجائے گا۔ گزرے ہوئے وقت کے ایک ایک منٹ کا حساب معلوم ہوجائے گا لیکن اس میں شک نہیں کہ کسی اور کی زندگی گزارنے کا اقرار کرکے تم اپنی زندگی پر اختیار سے محروم ہوگئے ہو۔ دلدل میں اُتر جانے والے کے لیے خود کو کیچڑ سے بچانے کا کیا سوال۔ تمہیں تو فکر کرنی چاہیے کہ کہیں اس میں ڈوب ہی نہ جاؤ۔

باہر سے آنے والی آوازیں سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ ابھی تک میں صرف ایک آواز سُن رہا تھا۔ اسی گھر کے کسی کمرے میں کوئی ٹی وی پر وہ بلیٹن سُن رہا تھا جس کو مارشل لا کے صدارتی دور میں صدرنامہ بھی کہا جاتا تھا مگر پھر یہ "بےخبرنامہ" مشہور ہوگیا کیونکہ اس میں پون گھنٹے تک جو کچھ سُنایا جاتا تھا وہ سب صدر یا وزیراعظم کے بعد ہر صوبے کے گورنر اور وزیرِ اعلیٰ وغیرہ کا فرمایا ہوا ہوتا تھا۔ اس میں خبر کوئی نہیں ہوتی تھی۔ فرمانے والے بھی حال کی بات نہیں کرتے تھے مستقبل کا حال بتاتے رہتے تھے کہ یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ جو کبھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی اس ملک کے سادہ لوح اور اعتبار کرنے والے لوگ تھے کہ یقین سے دستبردار نہیں ہوتے تھے۔

شاید اس گھر میں بھی کوئی بوڑھا' معذور یا مجبور تھا جو صرف سُن سکتا تھا۔ جس کے پاس وقت کا کوئی بہتر مصرف نہیں تھا۔ جس سے ملنے کے لیے آنے والا کوئی نہیں تھا' اور جسے کوئی بلاتا نہیں تھا اور اس سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ ٹی وی کے سامنے رکھا رہتا تھا۔ بےخبرنامے کے الفاظ واضح نہیں تھے مگر نیم زنانہ نیم مردانہ خبرنامے میں آدھے پون گھنٹے تک بولنے والوں کے لہجے' انداز اور آواز میں وہی روز جیسی سپاٹ' بیزارکن یکسانیت تھی جیسے کوئی قاری میں رٹا ہوا جھوٹ کا پلندا ایسے لوگوں کو مجبوراً سُنا رہا ہو جو اردو ہی نہ جانتے ہوں مگر سچ کو سمجھتے ہوں۔

بےخبرنامہ شروع ہونے سے پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے سوا اس گھر میں کوئی بھی نہیں ہے اور جس گھر میں بچے روتے ہنستے اور شور نہ کرتے ہوں' جہاں ساس بہو نہ لڑتی ہوں' چیزیں نہ گرتی ہوں۔ برتن نہ ٹوٹتے ہوں یہاں تک کہ میاں بیوی جھگڑتے بھی نہ ہوں وہ گھر نہیں مکان ہوتا ہے۔ بےخبرنامہ شروع ہونے کے بعد میرے دل کو کچھ تسلی ہوگئی تھی کہ میں کسی ویرانے میں تنہا قید نہیں ہوں۔

پہلے میں نے کسی گاڑی کے انجن کی غراہٹ سُنی تھی۔ پھر گاڑی کے دروازے بند ہوئے تھے اور کوئی عورت اونچی آواز میں کسی کو ڈانٹنے لگی تھی۔ اسے کسی نے بھی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ دیواروں سے باتیں نہیں کررہی ہوگی شاید اس گھر میں اس کو جواب دینے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا تھا یا کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے اونچی آواز میں بات کرسکے۔

پھر جیسے ساتھ والے کمرے سے اس نے چلّا کے کہا "یہ فون کس نے ڈیڈ رکھا ہے؟ حد ہوگئی۔۔۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے کال کیا ہوگا۔ کسی کو نمبر نہیں ملا ہوگا۔"

اب مجھے کوئی شک نہیں رہا۔ یہ آواز رخشندہ کی تھی۔ تیمور نے مجھے بتادیا تھا کہ گھر میں وہ شاہ عالم کے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کے علاوہ گھر میں صرف ملازم ہوں گے۔ وہ رخشندہ کو کیسے جواب دیتے۔ اس کے ساس سسر اپنے کمرے میں ساری دُنیا سے لاتعلق بیٹھے ہوں گے۔ بہت کم لوگ عمر کے اس حصّے میں دنیا سے عملی تعلق رکھتے ہیں۔ تنہائی میں ایک دوسرے کی یا پھر تنہائی کی رفاقت ہی انہیں راس آتی ہے۔ شاہ عالم کے گھر میں وہ آرام سے رہنے اور کچھ نہ کرنے کے سوا کیا کرسکتے تھے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ گھر میں فون بھی ہے۔ اس میں خوش ہونے والی بات کوئی نہیں تھی۔ ایسے کسی بھی گھر میں دوچار فون ہوتے ہی ہیں مگر مجھے ابھی تک نہ کسی ٹیلی فون کی گھنٹی سُنائی دی

تھی اور نہ اپنے کمرے میں کہیں فون نظر آیا تھا۔ بیڈ سائڈ پر ایک انٹرکام ریسیور تھا مگر میں نے اسے استعمال کرنے سے خود گریز کیا تھا۔ اس پر ایک سے نو تک ہندسوں والے بٹن تھے۔ جب تک پتا نہ چل جائے کہ ایک نمبر دبانے سے کون جواب دے گا اور دو نمبر کا کنکشن کہاں ہے اس آلۂ گفت و شنید سے چھیڑخانی مناسب نہیں تھی۔

رخشندہ واقعی ساتھ والے کمرے میں تھی۔ اس نے کسی کو فون کرکے ڈانٹنا شروع کیا "جی' میں رخشی بول رہی ہوں۔ جی' میں نے یہی پوچھنے کے لیے فون کیا تھا آپ کو۔ جی۔ ڈاکٹر صاحب میں نے یہ تو نہیں پوچھا کہ آپ نے فون کیا تھا یا نہیں۔۔۔ جی۔ مجھے معلوم ہے آپ شام پانچ بجے آئے تھے مگر سات بجے کیا ہوا تھا۔ چار گھنٹے ہوگئے۔۔۔ سات بجے نہ سہی آپ آٹھ نو بجے آسکتے تھے۔ اب تو ساڑھے نو ہو رہے ہیں۔ دیکھیے نا' ذمے داری کی بات ہے۔ میں تو بہت مطمئن تھی۔ خیر یہ سب تو ہوتا ہے ڈاکٹروں کے ساتھ۔ اب آپ بتائیں کہ کتنی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔ نہیں' مجھے معلوم نہیں۔ میں ابھی ابھی آئی ہوں خود بھی۔ ان کو دیکھا نہیں ہے۔ سب سے پہلے آپ کو پوچھا تو پتا چلا کہ آپ غائب ہیں۔ ادھر فون بھی آف دی ہک تھا۔ غصہ آنا تو قدرتی بات ہے۔"

اس نے ریسیور رکھا تو یہ آواز بھی میں نے صاف سُنی اور فوراً سید حالیٹ کے آنکھیں بند کرلیں۔

اس نے اندر آکے لائٹس کو تیز کیا۔ ان سب کی روشنی کو DIMMER سے کنٹرول کیا جاتا تھا جو عام طور پر پنکھوں کی رفتار کم زیادہ کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

میں نے اسی خوشبو کو اپنے بہت قریب محسوس کیا جو نائٹ ڈریس میں بسی ہوئی تھی۔ پھر رخشی نے کہا "عالم۔۔۔ تم جاگ رہے ہو؟"

اُلّو کی پٹھی۔ اسے معلوم ہے کہ میں بے ہوش نہیں تھا۔ سو رہا تھا۔ پھر یہ سوال چہ معنی دارد۔ کیا میں جواب دوں کہ نہیں رخشی ڈیئر۔۔۔ میں بدستور سو رہا ہوں"

آنکھیں آہستہ آہستہ کھول کے میں نے اسے یوں دیکھا جیسے منڈی میں بکرا ہر خریدار کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے کہ میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم سے تو نیک اُمید رکھنا ہی عبث ہے۔

سب فلمی مناظر کو یاد کرکے میں نے نقاہت سے کہا "میں۔۔۔ میں کہاں ہوں۔۔۔؟"

رخشی نے میرے قریب بیٹھ کے بلکہ مجھ پر قابلِ اعتراض حد تک جھک کے اور اپنی زلفیں مجھ پر پھیلا کے کہا "تم اپنے گھر میں ہو ڈیئر اور کہاں؟"

میں نے بہت غور فرما کے کہا "اپنے گھر میں۔۔۔" اور پھر اُلّو کی طرح اِدھر اُدھر دیدے گھمائے "کون سا گھر۔۔۔؟"

رخشی سیدھی ہوگئی "ٹھیک پوچھا تم نے۔ ایک گھر تو نہیں ہے نا تمہارا۔ مگر یہ وہی گھر ہے جس میں تم میرے ساتھ رہتے ہو۔"

"تمہارے ساتھ۔۔۔؟" میں نے جیسے خود سے سوال کیا اور رخشی کو دیکھا "تم کون ہو۔۔۔؟"

وہ تلخی سے مسکرائی "یہ چندا کون ہے؟"

"چندا۔۔۔؟" میں نے ویسے ہی سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ جس کا نام نیند میں تمہاری زبان پر تھا۔ کیا خواب میں بھی اسی کی صورت سامنے تھی؟"

"کس کی۔۔۔؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"چندا کی اور کس کی" وہ کچھ جھنجلا کے بولی۔

میں نے حیرانی سے کہا "چندا کون ہے؟"

"دیکھو عالم۔ ڈراما مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ نہ تم نشے میں ہو اور نہ نیند میں۔"

میں نے صورت پر سخت پریشانی کے آثار پیدا کیے "آپ۔۔۔ خفا نہ ہوں۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ لیکن میری سمجھ میں آپ کی کوئی بات نہیں آئی۔ آپ نے مجھے ابھی عالم کہا تھا' کیا یہ میرا نام ہے۔۔۔؟"

وہ میرے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی "عالم۔۔۔ میں نے ابھی ڈاکٹر کو بڑی سخت جھاڑ لگائی ہے۔ اس نے بُرا ضرور مانا ہوگا۔ وہ تم سے شکایت کرے گا کہ بھابی نے اس لہجے میں بات کی۔ مگر عالم' دوستی اپنی جگہ۔ ذمے داری ہے تو پھر بہانے بازی کیسی۔۔۔ مریض تو مریض ہے۔۔۔"

میں نے کہا "کون مریض۔۔۔؟"

"تم اور کون۔۔۔" وہ جھلّا کے بولی "اور کون ہے یہاں؟"

"آپ بھی تو ہیں۔۔۔"

"مجھے کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر ہر دو گھنٹے بعد مجھے دیکھنے کے لیے نہیں آتا۔"

"کون ڈاکٹر۔۔۔؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"تمہارا دوست خورشید اور کون۔۔۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "پتا نہیں۔ ڈاکٹر نے۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ ہاں خورشید۔۔۔ ڈاکٹر خورشید کیا کہتا ہے۔۔۔ میرے بارے میں؟"

"وہ کہتا ہے کہ تم بالکل ٹھیک ہو۔"

"پھر وہ مجھے دیکھنے کے لیے کیوں آتا ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد؟"

رخشی کچھ پریشان نظر آنے لگی "کیوں۔۔۔ مجھے پریشان کر رہے ہو عالم!"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "دیکھیں جی۔۔۔ میں آپ کو بالکل پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو خود بہت پریشان ہوں۔ آپ کہتی ہیں میرا نام عالم ہے۔۔۔ اور یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میں آپ کے ساتھ رہتا ہوں۔"

وہ مجھے گھورنے لگی "تمہیں یاد نہیں۔۔۔؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ لیکن آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں کہ ہم اس گھر میں رہتے ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"عالم۔۔۔ یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے۔ میں رخشی ہوں۔ رخشندہ!"

میں نے یہ نام زیرِ لب دُہرایا "رخشندہ۔۔۔ رخشی۔۔۔ کمال ہے۔ آپ کے علاوہ بھی میری کوئی بہن ہے۔۔۔ بھائی ہے۔۔۔؟"

رخشی نے اپنا سر پکڑ لیا "عالم۔ تم پاگل ہوگئے ہو۔ میں بہن نہیں بیوی ہوں تمہاری۔"

"بیوی!" میں اُچھل پڑا "یعنی۔۔۔ شادی ہوگئی ہے میری؟"

"شادی کے بغیر میں بیوی بن سکتی تھی تمہاری؟"

میں نے کہا "نہیں۔۔۔ مگر کیا واقعی ایسا ہے۔ آپ بیوی ہیں میری۔ کب سے آخر؟ مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔ کب شادی ہوئی تھی آپ کی اور میری۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ کا نام رخشندہ نہیں ہوگا۔ نہ میرا نام عالم۔ یہ اور کوئی چکر ہے۔"

رخشی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ میری اداکاری اسے قائل کرنے لگی تھی کہ یہ اداکاری نہیں ہے۔ "کیا چکر ہے؟ یعنی میں تمہاری بیوی نہیں ہوں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "آپ کے کہنے سے میں کیسے مان لوں۔ ابھی آپ دو چار بچّے لاکے سامنے کھڑے کردیں گی۔۔۔"

"کہاں سے لاؤں گی میں بچّے۔ بچّے ہیں ہمارے؟" وہ تیز ہوکے بولی "تم کو واقعی کچھ یاد نہیں' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"کیا کیسے ہوسکتا ہے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "عالم۔ تمہیں یاد ہے جب تم کراچی میں تھے۔"

"میں کراچی میں تھا۔۔۔ کب؟"

"پرسوں۔۔۔ ہوٹل کے ایک کمرے میں۔"

میں نے ذہن پر زور دیا "کون سا ہوٹل تھا۔۔۔؟"

"ہالیڈے اِن۔۔۔ تمہارے ساتھ امیر تیمور تھا۔۔۔"

میں نے کہا "امیر تیمور؟ کیا عجیب نام ہے۔ کیا کوئی غریب تیمور بھی ہے؟"

"سوچو' وہاں کیا ہوا تھا؟" رخشی نے کہا "جب تم کمرے میں آئے تو تم نے مجھے دیکھا تھا؟"

"پھر۔۔۔ کیا کہا تھا میں نے۔ ہیلو ڈارلنگ! یا آپ کے سلام کا جواب دیا تھا مسلمانوں کی طرح۔ وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔"

"تمہارے سر پر ڈنڈا پڑا تھا" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "کچھ یاد آیا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ آپ نے ڈنڈا مارا تھا۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔؟"

وہ زچ ہوکے بولی "میں نے نہیں۔ امیر۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہارے کسی دشمن نے۔"

غیر ارادی طور پر یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اس نے میرے سامنے امیر تیمور کا نام لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ غیر شعوری طور پر اس کا ذہن یہ تسلیم کرچکا تھا کہ جب مجھے اپنا اور اس کا نام یاد نہیں تو امیر تیمور کا نام خاک یاد ہوگا۔ مگر اس کے ادھورے سچ نے مجھ پر حقیقت کے چودہ طبق روشن کردیے۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ شاہ عالم کے خلاف مجھے سازش میں استعمال کرنے والا اکیلا امیر تیمور ہی نہیں تھا۔ رخشندہ بھی اس کے ساتھ برابر کی شریک تھی۔

رخشندہ کی رضامندی کے بغیر تیمور یہ کام کرہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ میں نے تیمور سے پوچھ لیا تھا کہ کیا تیمور مجھے اپنے ڈپلی کیٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے اور تیمور نے اس کا جواب اثبات میں دیا تھا لیکن کوئی شخص اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک بیوی شوہر کی حرکتوں سے عاجز ہوکے اس کا ڈپلی کیٹ قبول کرنے پر راضی ہوجائے گی۔ بیویاں بڑی صابر و شاکر اور وفاداری کے معاملے میں انتہائی سخت جان ہوتی ہیں۔ وہ ظالم اور نکمّے' نشے کے عادی اور شرابی' چور ڈاکو اور ناقابلِ اصلاح حد تک عشق پیشہ شوہروں کو بھی۔۔۔ سہاگ کی سلامتی کے لیے برداشت کرتی رہتی ہیں۔

تیمور نے ابھی تک شاہ عالم کے کردار کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے وہ ایک بے ضمیر انسان اور بے اصول سیاست داں ثابت ہوتا تھا۔ خود میرا ذاتی تجربہ بھی اس کے معاملے میں ناخوش گوار تھا۔ اس نے خدمتِ خلق اور کارِ خیر کا چکر چلا کے مجھے بھی لوٹ لیا تھا۔ وہ بے ایمانی اور فراڈ کے لیے ثوابِ آخرت اور انسانی ہمدردی کے نام پر لوگوں کے جذبات کو EXPLOIT کرتا تھا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ ایسی ہی بے ایمانی سے معزز اور معتبر ہوتے ہیں مگر جہاں تک ان کی بیویوں کا تعلق ہے انہیں اپنے شوہروں سے عام قسم کی شکایات ضرور ہیں مثلاً عدم توجہی کی مگر وہ اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن ہیں۔ اصلی چیز ہے احساسِ تحفظ' مالی آسودگی' ایک اچھی بیوی بن کے رہنے کی مشرقی روایت کا احترام اور ایک اچھی ماں ثابت ہونے کا خیال۔

رخشندہ کو وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی آرزو کی جاسکتی ہے۔ عزت' شہرت اور دولت۔ رہی عدم توجہی یا بے وفائی کی شکایت تو شاید تمام ہی فلم اسٹار' کرکٹ کے سپر اسٹار' بزنس ایگزیکٹو اور مشہور لوگ عام آدمی کی طرح کولھو کے بیل نہیں ہوتے۔ پبلک لائف میں آنے کے بعد ان کی مصروفیات کا دائرہ ایک گھر (یا ایک عورت) کی حد تک محدود نہیں رہ پاتا اور ان کی بیویوں کو اپنا شوہر سب مصروفیات کے ساتھ شیئر کرنا پڑتا ہے۔

شاید رخشندہ پہلی عورت تھی جس نے شوہر کے اخلاق و کردار کی خرابی کے خلاف بغاوت اور انتقام کے جذبات میں ذلت کی

اس پستی تک گرنا قبول کیا تھا۔ اگر وہ شاہ عالم کو قتل کردیتی تو یہ ایک فطری ردِ عمل ہوتا۔ اگر وہ بے راہ رو ہوجاتی تب بھی الزام صرف اسے نہ دیا جاتا۔ قصوروار شاہ عالم بھی کہلاتا مگر وہ شوہر بدل رہی تھی۔ ایسے جیسے کسی کو بالکل نئے اور قیمتی جوتے میں صرف ایک ٹانکے کا نقص بھی محسوس ہو تو وہ ویسا ہی دوسرا پہن لے۔ کچھ مرد ہمیشہ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے رہتے ہیں۔ رخشندہ اپنے شوہر کو ایسا سمجھنے پر تیار تھی۔ میں نے ہم شکل یا جڑواں بھائیوں کے موضوع پر جتنی فلمیں دیکھی تھیں اور جتنی کہانیاں پڑھی تھیں ان میں کبھی ایسا نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا کہ کسی بیوی نے اصلی شوہر کی جگہ اس کا ہم شکل جانتے بوجھتے قبول کرلیا ہو کہ اصل خراب ہے اور اس کا متبادل اچھا دستیاب ہے تو لاؤ' وہی سہی۔ پتا کسی کو نہ چلے تو ٹھیک ہے۔

"اب کیا سوچ رہے ہو؟" رخشی میری صورت کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"میں... یہی کہ... میرا دشمن کون ہے؟ کسی کو کیا دشمنی ہوسکتی ہے مجھ سے۔ اور کیوں... ایک بات پوچھوں آپ سے...؟"

"یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے... پوچھو۔"

"آپ کا کہنا ہے کہ میرے سر پر کسی دشمن نے ڈنڈا مارا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں۔ ہالیڈے اِن کے کمرے میں... جہاں آپ بھی تھیں۔"

"ہاں۔ میرے تمہارے کمرے الگ تو نہیں ہوسکتے تھے۔"

"ٹھیک۔ جب میں آیا تو آپ وہاں موجود تھیں۔ میں نے سب سے پہلے آپ کو دیکھا۔ یہ ابھی آپ نے بتایا مجھے۔ پھر کسی نے میرے سر پر ڈنڈا مارا۔ یہ بھی آپ نے بتایا' مجھے تو یاد نہیں۔ آپ نے میرے اس دشمن کو ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ کمرے میں تو نہیں ہوسکتا' میرے پیچھے آیا ہوگا۔"

وہ قدرے تذبذب کے ساتھ بولی "ہاں... میں نے دیکھا تھا۔"

"آپ نے اسے منع نہیں کیا تھا... پوچھا نہیں تھا کہ یہ تم کیا کررہے ہو... اور کیوں کررہے ہو؟"

"وہ رُکتا تو پوچھتی نا۔"

"اچھا... میں سمجھ گیا۔ بس وہ ایک دم آیا اور ڈنڈا مار کے بھاگ گیا۔ آپ نے صرف ایک جھلک دیکھی ہوگی اس کی۔"

"ہاں۔"

"آپ اسے دوبارہ دیکھیں گی تو پہچان لیں گی نا...؟"

"پتا نہیں۔ غور سے دیکھنے کا موقع ملتا تو ضرور پہچان جاتی۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس جرح سے وہ کچھ پریشان ہے۔

"آپ نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا' میرے ساتھ؟"

"میں کیا ہر جگہ تمہارے ساتھ جاتی ہوں... مجھے کیا معلوم باہر تمہارے کتنے دوست ہیں تو کتنے دشمن۔"

"اس کا حُلیہ ضرور آپ کے ذہن میں ہوگا۔ اگر پولیس کو رپورٹ لکھوانی پڑے تو آپ بتادیں گی۔ آپ کے سوا کون بتا سکتا ہے۔ خیر ہم ابھی کون سی رپورٹ لکھوانے جارہے ہیں۔ رپورٹ سے ہوگا بھی کیا۔ پولیس اُلٹا ہمیں ہی پریشان کرے گی' میرا مطلب ہے آپ کو۔"

"مجھے کیوں پریشان کرے گی" وہ ناگواری سے بولی۔

"بس... وہ ایسے ہی تفتیش کرتے ہیں... حاصل خاک بھی نہیں ہوتا مگر سوال ایسے کرتے ہیں۔ خصوصاً عورتوں سے... شریف لوگ اسی لیے تو تھانے کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں جو شکایت لے کر جائے اسی کو ملزم بنادیتے ہیں۔ آپ تھانے جائیں گی حملے کی رپورٹ لکھوانے تو آپ کو ہی مشکوک قرار دے کر کہیں گے کہ بی بی' آپ بھی شریکِ جرم لگتی ہیں۔ کہیں خود آپ نے تو حملہ نہیں کرایا تھا۔ سچ سچ بتادیں کون تھا آپ کا وہ یار۔"

"یہ کیسی فضول باتیں کرتے ہو تم" وہ بگڑ کے بولی "کس کی مجال ہے کہ مجھ سے ایسا کہہ سکے۔ میں کیا عام عورت ہوں۔ آخر بیوی ہوں تمہاری اور تم کوئی ایرے غیرے نہیں ہو۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "اچھا۔ یہ بات ہے؟ کیا میں خاص آدمی ہوں' وی آئی پی ہوں؟"

اس نے عاجز آکے کہا "عالم۔ کیوں پاگل کرنا چاہتے ہو تم مجھے۔"

میں نے کہا "دیکھیں جی... دماغ تو میرا کام نہیں کررہا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے کہ میں کون ہوں... آپ ہی بتائیں گی تو یاد آئے گا۔"

"ابھی تک کچھ یاد نہیں آیا تمہیں؟" وہ جھنّا کے بولی۔

میں نے نفی میں سرہلایا "یہ بتائیں... جب میرا وہ دشمن میرے سر پر ڈنڈا مار کے بھاگ گیا تو میں گر گیا تھا۔ ظاہر ہے گر کے بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے کیا کیا تھا' چیخ ماری تھی... شور مچایا تھا؟ ہالیڈے اِن جیسے ہوٹل میں ایسا واقعہ پیش آنے کے بعد ہوٹل والوں نے کیا کیا تھا؟ ان کی اپنی سیکیورٹی بہت مستعد ہوتی ہے۔ انہوں نے پولیس کو بُلایا تھا؟"

"نہیں... کسی نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ میں شور مچاتی یا ہنگامہ کرتی..."

"ٹھیک کہتی ہو آپ... پھر بھی چیخ تو ماری ہوگی آپ نے... مجھے کس نے اُٹھایا تھا؟ خود آپ نے...؟"

"چیخ تو خود ہی نکل گئی تھی منہ سے... مگر پھر میں نے تیمور کو بُلالیا۔ میں بہت خوف زدہ تھی... میری عقل کام نہیں کررہی تھی۔"

"وہی... امیر تیمور...؟"

"ہاں... اسی ہوٹل میں قیام تھا اس کا... اس نے میری مدد کی۔ تمہیں بستر پر لٹایا۔ پھر ڈاکٹر کو بُلایا۔ تیمور نے کہا کہ اس بات کا چرچا ہوگا تو سو افسانے بن جائیں گے۔ اخبار والے پیچھے پڑ گئے تو سیکڑوں سوال کریں گے اور ہم کیا جواب دیں گے۔ ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں کہ وہ کون تھا اور کہاں گیا۔ خود ہوٹل والے نہیں چاہتے تھے کہ پولیس تک بات پہنچے۔ ان کی بدنامی ہوتی ہے... انہوں نے امیر تیمور سے بہت معافی مانگی... اور مجھ سے..."

"کیا ڈاکٹر نے مجھے انجکشن لگایا تھا؟"

"ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ تمہیں آغا خان اسپتال منتقل کردیا جائے۔ سر کی چوٹ کا معاملہ ہے۔"

"اس نے ٹھیک ہی کہا تھا" میں نے رائے دی "پھر آپ نے مجھے اسپتال کیسے شفٹ کیا تھا؟"

"اپنی گود میں اُٹھا کے لے گئی تھی تمہیں" وہ چڑ کے بولی "ظاہر ہے ایمبولینس میں لے جانا پڑا تھا۔"

"یہ... کب کی بات ہے... پرسوں کی؟"

"ہاں۔ دو دن بعد ہوش آیا ہے تمہیں۔"

"آپ مجھے بے ہوشی میں ہی اسپتال سے گھر لے آئیں... اسپتال والوں نے کیسے اجازت دے دی؟"

اس نے محتاط ہوکے کہا "ان کا خیال تھا کہ کوئی سیریس بات نہیں۔ تم خود ہی ہوش میں آجاؤ گے۔ تمہارا علاج گھر پر ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ ہم نے بہتر سمجھا کہ تم کو انہی کی نگرانی میں رکھا جائے۔"

"ہم کون... آپ کے ساتھ وہ بھی تھا... میرا دوست... امیر تیمور؟" میں نے کہا۔

"وہ نہ ہوتا تو میں اکیلی تم کو کراچی سے لاہور کیسے لاتی...؟"

میں نے کہا "لاہور؟ کیا میں لاہور میں ہوں؟ اسی بے ہوشی کی کیفیت میں آپ مجھے کراچی سے لاہور لے آئیں؟"

"اور کہاں لے جاتی... اپنا گھر تو لاہور میں ہی ہے۔"

"اچھا اچھا..." میں نے سرہلایا "یہ ہے اپنا گھر۔ اور لاہور میں رہتے ہیں ہم۔ آپ مجھے ہوائی جہاز سے لائی ہوں گی۔"

"نہیں۔ ایمبولینس کرائے پر لی تھی" وہ بولی "یہ بتاؤ کہ اب طبیعت کیسی ہے۔ کیسا محسوس کررہے ہو تم؟"

"کچھ عجیب سا محسوس کررہا ہوں۔ ذہن میں خلا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ سر میں بھی درد ہے۔ اگر ایک کپ کافی کا مل جائے اور اسپرین کی گولیاں..."

"کیوں نہیں... تم نے پہلے کہہ دیا ہوتا" وہ اُٹھنے لگی مگر اس کے اُٹھنے سے پہلے ایک ہٹا کٹا اور بھاری بھرکم شخص اندر آگیا۔ اس کے چوڑے چہرے پر گھنی داڑھی تھی لیکن سر بالکل صاف تھا۔

"آہا... شاہ جی... بھئی معاف کرنا۔ میں نے غلط وقت پر خلوت میں دخل اندازی کی" وہ ہاتھ پھیلا کے بولا "طبیعت بڑی ہشاش بشاش لگتی ہے... اور موڈ رومانٹک نظر آتا ہے۔"

میں نے سپاٹ چہرہ رکھتے ہوئے اسے غور سے دیکھا "آپ کی تعریف؟"

رخشی نے کہا "بھئی یہ ڈاکٹر خورشید ہیں۔ تمہارے معالج۔"

میں نے سرہلایا "اچھا۔ یہ ہیں ہمارے فیملی ڈاکٹر!"

ڈاکٹر خورشید میرے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا "کیا معاملہ ہے مسٹر عالم... آپ بہت سیریس ہیں۔"

"آپ خود دیکھ لیں۔ انہیں کچھ یاد نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اپنا نام تک بھولے ہوئے ہیں۔ نہ مجھے پہچانا نہ اپنے گھر کو... جب سے ہوش آیا ہے بس سوال پر سوال کیے جارہے ہیں۔"

ڈاکٹر کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا "کب ہوش آیا انہیں؟"

"میں نے آپ کو فون کیا تھا۔ اس سے کچھ دیر پہلے..."

ڈاکٹر نے روایتی طریقے سے مجھے چیک کرنا شروع کیا۔ اس نے میرا بلڈ پریشر دیکھا' دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار دیکھی اور سوچ میں پڑگیا۔ اس نے مجھ سے بے شمار سوالات کیے جن سے میری یادداشت کا امتحان لینا مقصود تھا مثلاً اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا تو میں نے کہا کہ خاتون نے شاہ عالم بتایا ہے۔ خاتون نے بتایا ہے میں ان کا شوہر ہوں' ہر بات میں نے خاتون سے منسوب کرکے کہی۔ باقی کے جوابات گول کرگیا۔

"شاہ صاحب۔ اگر میں آپ کو مال روڈ پر چھوڑ دوں تو وہاں سے آپ اپنے گھر پہنچ جائیں گے؟"

"پتا معلوم ہوگا تو پہنچ جاؤں گا۔"

"یعنی آپ کو گھر کا پتا معلوم نہیں یہ معلوم ہے کہ کون سی سڑک کہاں جاتی ہے؟ ذرا مجھے چیرنگ کراس سے داتا صاحب کے دربار کا اور پھر آرائے بازار کا راستہ بتائیں۔"

میں نے اسے مختلف راستے بتادیے۔ بس سے جانا ہو تو کیا روٹ ہوگا اور اپنی گاڑی میں کون سا راستہ بہتر رہے گا۔ اس نے مجھ سے مال روڈ کی مختلف دکانوں کے بارے میں پوچھا۔ معلوماتِ عامہ کے سوالات کیے۔ پہلے پاکستان کے بارے میں اور پھر دنیا کے بارے میں۔ درمیان میں کافی آگئی۔ اس کے ساتھ کھانے کے لیے بھی بہت کچھ تھا۔ ڈاکٹر نے صرف ایک بسکٹ لیا مگر میں نے بلا تکلف گاجر کے حلوے پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر سینڈوچ کھایا۔ دوسرے مگ کے ساتھ میں نے ایک ساتھ اسپرین کی تین گولیاں نگل لیں۔

ڈاکٹر نے کہا "شاہ صاحب۔ آپ باہر گئے تھے؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ میں تو اسی کمرے میں ہوں۔"

"میرا مطلب تھا ملک سے باہر۔"

"اچھا؟ آپ کو معلوم ہے کہاں گیا تھا؟"

وہ مسکرایا "یہ آپ بتاسکتے ہیں یا پھر آپ کا پاسپورٹ بتائے گا۔ خیر یہ بتائیں کہ باہر آپ کس کام سے گئے تھے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "معلوم نہیں۔"
"اچھا آپ کرتے کیا ہیں؟" وہ بولا۔
"ڈاکٹر خورشید۔ مجھے واقعی بالکل یاد نہیں۔ اگر یہ شاندار گھر میرا ہے تو پھر یقیناً میرا کوئی بہت بڑا بزنس ہوگا یا کوئی بہت منافع بخش سرکاری عہدہ۔"

ڈاکٹر نے اپنی ہار مان لی "مسز عالم۔ میرا خیال ہے کہ آپ کسی ماہر نفسیات یا نیورو فزیشن سے رجوع کریں۔ یہ AMNESIA کا کیس ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ ٹوٹل AMNESIA نہیں ہے' PARTIAL ہے۔"

"مجھے آسان زبان میں بتائیں۔" رخشی نے کہا۔

"آسان زبان میں یوں سمجھ لیں کہ ایک تو چوٹ سے دماغ کا وہ حصّہ متاثر ہوتا ہے جس کا تعلق یادداشت سے ہوتا ہے۔ اسے نقصان پہنچتا ہے اور بنیادی مسئلہ یہ ہے دماغ کے کمپیوٹر کی مشینری کا مسئر کمال۔ کہ کمپیوٹر تو مرمت ہو جاتا ہے۔ اسے سرکٹ یا آئی سی بدل کے پھر نیا بنایا جا سکتا ہے مگر دماغ کا ہر نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا ہے۔ جیسے زخم بھر جاتے ہیں' ٹوٹی ہوئی ہڈی پھر جُڑ جاتی ہے۔ ایسے دماغ کا جو حصّہ چوٹ یا کسی اور وجہ سے خراب ہو جائے تو پھر ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ جو DAMAGE ہو گیا سو ہو گیا۔ وہ REVERSIBLE نہیں ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسی بات نہیں۔ یہ مسئلہ نفسیاتی ہے۔ فزیکل نہیں ہے۔"

رخشی کچھ متفکر اور کچھ حیران ہوئی "نفسیاتی مسئلہ کیسے پیدا ہو گیا؟"

"ہو جاتا ہے مسز عالم۔ بعض اوقات ذہن کسی صدمے کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز والا مسئلہ ہوتا ہے تو ذہن بھی مقابلہ کرنے کے بجائے جان بچانے کو ترجیح دیتا ہے۔ آپ آدمی کی مثال لیں کہ وہ کتنا ہی ہمت والا اور شہ زور کیوں نہ ہو' ایک یا دو سے تو مقابلہ کرے گا مگر اس کے سامنے دس آجائیں تو وہ کیا کرے گا۔ وہ جان بچائے گا۔ پسپا ہونے اور فرار ہو جانے میں عافیت سمجھے گا۔ ذہن کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی صدمہ کتنا شدید ہے۔ اس میں مقابلے کی سکت نہ ہو تو وہ کسی ایک واقعے یا سانحے سے متعلق تمام تفصیلات کو ذہن سے خارج کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کے پاس گانوں کے سیکڑوں کیسٹ ہوں مگر ایک اسے سخت ناپسند ہو تو وہ اس کو صاف کر دے۔ باقی گانے اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس گانے کا ایک بھی بول یا سُر باقی نہیں رہا۔"

"شاہ عالم کی یہ کیفیت۔۔۔ عارضی ہے یا مستقل؟"

"دیکھیے مسز عالم۔۔۔ یہ کیفیت عموماً عارضی ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جیسے ہم ہر غم اور صدمے کو بھول جاتے ہیں ایسے ہی ذہن بھی حقیقت کو قبول کرنے لگتا ہے۔ اب یہ ہر شخص کی خواہش اور قوتِ ارادی کی بات ہے کہ وہ کتنا وقت لیتا ہے۔ کچھ دوائیں مددگار ہوتی ہیں جو نیورو فزیشن کی نگرانی میں ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ اوپن میڈیسن کا فیلڈ الگ ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ سب کچھ نہیں بھولے ہیں اور جو بھولے ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ یاد آجائے گا' انشاء اللہ۔ آپ کا رول دواؤں سے زیادہ اہم ہے۔ آپ انہیں یاد دلاتی رہیں۔ جو بھی یہ بھولے ہوئے ہیں۔"

"یہ تو اپنے آپ کو' مجھے اور اپنی زندگی۔۔۔ سب کو بھولے ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی ڈاکٹر صاحب۔ ایسا کون سا ذہنی صدمہ گزرا ہے ان پر۔ کون سا ایسا سانحہ پیش آیا ہے؟"

"یہ تو آپ ہی بہتر جانتی ہوں گی۔"

"میں جانتی ہوں اسی لیے تو عرض کر رہی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ کاروباری دورے پر گئے تھے اور وہاں سے لوٹ کر آئے تو میں خود کراچی ائرپورٹ پر انہیں ریسیو کرنے کے لیے موجود تھی۔ یہ بالکل ٹھیک تھے۔ ہم بالیڈے اِن میں ایک رات کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ وہاں ایک حادثہ ضرور پیش آیا تھا۔"

بڑوں کے بیچ میں بولنے والے بچّے کی طرح میں نے کہا "امیر تیمور نے میرے سر پر ڈنڈا جو مارا تھا۔۔۔ یہاں" میں نے گومڑی کی نشاندہی کی۔

ڈاکٹر ایک لمحے کے لیے سمجھ نہ پایا کہ میں نے یہ بات مذاق میں کہی ہے یا پاگل پن میں۔ وہ میری صورت دیکھتا رہ گیا "ڈنڈا مارا تھا۔۔۔ کیوں۔۔۔؟"

رخشی کا رنگ بڑی تیزی سے بدلا مگر اس نے فوراً اپنی حالت پر قابو پالیا "نہیں عالم! ڈنڈا کسی نے نہیں مارا۔ تمہارے سر پر گلدان گر گیا تھا۔ بیڈ سائڈ پر سے۔۔۔"

"مگر۔۔۔ مجھے تو تم نے ہی بتایا تھا۔"

وہ ہنسی "میں نے۔۔۔ چھوڑیں ڈاکٹر صاحب' یہ مذاق کر رہے ہیں۔"

اس نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے خاموش رہنے کے لیے کہا ہوگا اور منع کرنا چاہا ہوگا کہ میں سچ نہ بولوں مگر میں اس کی طرف دیکھ ہی کب رہا تھا۔ "اس میں مذاق کی کون سی بات ہے!"

رخشی نے خفت زدہ تیز لہجے میں کہا "پھر تم نے خواب دیکھا ہوگا عالم۔ تم خود سوچو' امیر تیمور دوست ہے تمہارا۔۔۔ وہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں کرنے لگا اور پھر میں بھی تو تمہارے ساتھ تھی اس کمرے میں جب گلدان گرا تھا۔ تمہیں تو خیر پتا ہی نہیں چلا تھا۔ تم بے ہوش ہو گئے تھے۔۔۔ لیکن میں نے دیکھا تھا۔"

ڈاکٹر خورشید مسخرا ضرور نظر آتا تھا مگر بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ معاملہ گڑبڑ ہے لیکن اس نے اپنے رویّے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ کس کی بات کو قابلِ یقین سمجھتا

ہے۔ میری یا رخشی کی۔ وہ بحث میں پڑتا تو صورتِ حال مزید ناخوش گوار ہو جاتی۔

اس نے بیگ کھولتے ہوئے کہا "ابھی تو میں انجکشن لگا دیتا ہوں مسز عالم۔ آگے کیا کرنا ہے' یہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے اور ماشاء اللہ آپ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ اللہ کے فضل سے وسائل کی آپ کو کمی نہیں۔ آپ چاہیں تو انہیں لندن یا امریکا بھی لے جا سکتی ہیں مگر میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں۔ یہاں اپنے پاکستان میں ایک سے ایک ماہر ڈاکٹر ہے۔"

میں نے کہا "یہ انجکشن کس چیز کا ہے؟ میرا مطلب ہے کیا یہ ضروری ہے؟"

وہ مسکرایا "صحت کی بحالی کے لیے ضروری ہے۔"

"صحت ٹھیک ہے میری۔ بس کچھ یادداشت میں گڑبڑ ہو گئی ہے تو آپ نے خود ہی کہا ہے کہ یہ اثر عارضی ہے اور اس کا علاج کسی اسپیشلسٹ کو کرنا چاہیے' آپ یہ انجکشن رہنے دیں۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا "اچھا شاہ صاحب۔ کھائیں پئیں' جان بنائیں' خوش رہیں۔"

میں نے کہا "خوش کیسے رہوں؟"

اس غیر متوقع سوال پر وہ سٹپٹایا "بھئی جیسے ہم رہتے ہیں۔ حالانکہ نہ ایسا عالی شان محل ہے ہمارا۔ نہ اتنی عزت ہے شہر میں اور نہ ایسی حسین اور ذہین بیوی ملی ہمیں۔ جیسے ہم ویسے ہمارے نصیب۔ مگر ہم خوش ہیں پھر بھی۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بیگ اُٹھا کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی رخشی مجھ پر برس پڑی "تم بھی کمال کرتے ہو۔"

میں نے خفت سے کہا "کیا کوئی غلط بات کر دی میں نے؟"

"اس ڈاکٹر سے کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی۔۔۔ کہ امیر تیمور نے تمہارے سر پر ڈنڈا مارا تھا؟"

"اب مجھے کیا معلوم کہ کس کے سامنے کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں۔ تم نے بتا دیا ہوتا۔۔۔"

"تم بچّے تو نہیں ہو کہ میں ہر بات سمجھاؤں۔۔۔"

میں نے کہا "آخر کیا ضرورت ہے حقیقت کو چھپانے کی۔ اچھا ہے اس امیر تیمور کو پولیس غریب تیمور بنا دے۔ فقیر تیمور کر دے۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔۔۔ وہ دوست ہی نہیں تمہاری پارٹی کا سینئر نائب صدر ہے۔ تمہارا دستِ راست ہے۔"

"میری پارٹی۔۔۔؟"

"ہاں' جس کے تم صدر ہو۔"

"وری گڈ۔ اگر میری پارٹی کا نام مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی ہے تو پھر میرا نام نواز شریف یا بے نظیر ہونا چاہیے" میں ہنس پڑا۔

رخشی نے ایک گہری سانس لی "میرا خیال ہے کہ مجھے فوراً ڈاکٹر آغا سے ٹائم لینا چاہیے۔ میں آج ہی بُلا لیتی ہوں انہیں۔ وہ کلینک سے اِدھر آجائیں گے۔"

"یہ ڈاکٹر آغا کیا چیز ہیں؟" میں نے کہا۔

"ملک کے سب سے قابل نیورو فزیشن اور سائیکاٹرسٹ۔ تمہاری میموری کو REVIVE کرنا میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ میں فون کرتی ہوں انہیں۔"

"یہاں سے کیسے فون کرو گی؟"

اس نے انٹر کام کا ریسیور اُٹھا کے زیرو دبا دیا "اس طرح۔۔۔ زیرو سے ہر لائن مل جاتی ہے۔" وہ بولی مگر زیرو دبا کے اس نے کوئی نمبر نہیں ملایا۔

میں نے کہا "یہاں ڈائریکٹ ٹیلی فون کیوں نہیں ہے؟"

"تم نے خود ہٹا دیا تھا تاکہ ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ ہم کال کر سکتے ہیں۔ کوئی ہمیں کال نہیں کر سکتا۔"

"آئی سی۔ اب میں فون کرنا چاہوں تو۔۔۔؟"

اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا "تم کسے فون کرو گے؟"

"میں امیر تیمور کو فون کر سکتا ہوں۔۔۔؟"

رخشی نے کہا "نمبر یاد ہے تمہیں اس کا؟"

میں نے کچھ دیر سوچا "میری کوئی فون بک بھی ہوگی۔ اس میں ہوں گے سب کے نمبر۔ جن سے میرا رابطہ تھا۔"

"ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ کسی سے بات کرو۔ خواہ مخواہ یہ بات پھیل جائے گی کہ شاہ عالم کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ تمہارا کیریئر اور تمہاری ساکھ خراب ہوگی۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ۔ میں کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلنے دوں گی۔ ڈاکٹر آغا کے علاج سے تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ کیا میں اس کمرے سے باہر جا سکتا ہوں؟"

"کیا کرو گے باہر جا کے۔ خود کو تماشا بناؤ گے" وہ نرمی سے بولی "میں نرس کو بھیج دیتی ہوں یہاں۔"

پہلے مجھے شک تھا مگر اب اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میں اس کمرے میں قید تھا۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ فی الحال منقطع تھا۔ مشتعل ہو کے جذباتی ردِّعمل کا مظاہرہ کرنے کے بجائے مجھے اس صورتِ حال سے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ نمٹنے کی ضرورت تھی۔

میں نے کہا "تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ مگر یہ نرس کون ہے؟ میرا مطلب ہے کہ جب تم ہو تو پھر۔۔۔؟"

اس نے مجھے بڑی میٹھی مسکراہٹ سے نوازا "جو نرس کر سکتی ہے' وہ میں نہیں کر سکتی۔۔۔ اور جو میں کر سکتی ہوں' وہ صرف میں کر سکتی ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے کہا "کیا تم کہیں جا رہی ہو؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میں خود ڈاکٹر آغا کے کلینک پہنچ جاؤں اور انہیں گاڑی میں بٹھا کے ساتھ لے آؤں۔ ٹیلی فون پر بتانے سے بہتر ہے کہ میں ان کو خود ہی سب بتادوں۔ تفصیل سے بات کرلوں۔"

"کتنی دیر میں واپس آؤگی تم۔۔؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں" اس نے اپنی کلائی کی سنہری گھڑی میں وقت دیکھا "ساڑھے نو بجے ہیں اس وقت۔ وہ دس بجے تک اپنے کلینک میں بیٹھتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے تک ہم آجائیں گے۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگی؟"

"ابھی تو کافی کے ساتھ اتنا کچھ کھایا ہے۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے جانے کے بعد کوئی مجھ سے ملنے آجائے تو۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "کوئی تم سے ملنے نہیں آئے گا۔"

"اس گھر میں۔۔۔ تمہارے علاوہ بھی تو لوگ ہوں گے۔ میں کسی کو نہیں پہچان سکوں گا۔۔۔"

رخشی نے کہا "نرس کا نام ہے روزی۔۔۔"

"روزی۔۔۔" میں نے زیرِ لب دُہرایا "کیا وہ اسمِ بامسمیٰ ہے۔۔۔ گلاب۔۔۔!"

"ابھی آجائے تو خود ہی دیکھ لینا۔" رخشی مسکرائی "ایک تمہارا سیکریٹری تھا' آصف۔۔۔ اسے تم نے برطرف کردیا تھا۔"

"کیوں برطرف کردیا تھا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ وہ تمہارا سیکریٹری تھا میرا نہیں' ایک خانساماں ہے اور اس کی بیوی۔ وہ یہیں رہتے ہیں۔"

"ان کے نام تو بتادو۔"

"خانساماں بہت پُرانا ہے۔ تقریباً دس سال سے اس گھر میں ہے۔ اس کا نام ہے گلاب دین۔ دو سال پہلے اس نے شادی کی تو بیوی کو میں نے گھر کے کام کاج کے لیے رکھ لیا۔ وہ سرونٹ کوارٹر میں رہتے ہیں۔ بیوی کا نام تو زیتون بانو ہے مگر گلاب دین اسے چنبیلی کہتا ہے۔"

میں ہنس پڑا "گلاب اور چنبیلی۔۔۔ نئی نئی شادی ہے نا۔ بعد میں گلاب بن جائے گا کیکر اور چنبیلی ہوجائے گی گوبھی کا پھول۔"

رخشی اس مذاق سے لطف اندوز نہیں ہوئی "ایک ڈرائیور ہے اکبر خان۔ اسے بھی پانچ چھ سال ہوگئے ہیں۔ اکبر خان نے دو سال پہلے اپنے چھوٹے بھائی اصغر خان کو چوکیدار رکھوادیا تھا۔"

"اصغر خان سے پہلے چوکیدار کوئی نہیں تھا؟"

"تھا۔۔۔ مگر وہ ڈاکوؤں سے مقابلے میں مارا گیا تھا۔ یہ دونوں بھائی بھی سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں رہتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ڈیوٹی بدل لیتے ہیں۔ ڈرائیونگ دونوں کو آتی ہے' دونوں وفادار ہیں۔ ان کے گھر والے کوہاٹ کے پاس کسی گاؤں میں رہتے ہیں' اب میں جاؤں؟"

"ایک آخری بات۔ کیا تمہارے یا میرے گھر والے یہاں نہیں رہتے؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرے والدین اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دو بھائی تھے' ایک کینیڈا چلا گیا' دوسرا آسٹریلیا۔ انہوں نے وہیں شادی کرلی اور وہ مجھے فون تک نہیں کرتے۔ ایک بہن تھی' گزشتہ سال اس کا قتل ہوگیا۔"

"قتل ہوگیا۔۔۔ کس نے قتل کیا؟"

"خود اس کے شوہر نے۔ مگر یہ بات عدالت میں ثابت نہیں کی جاسکی۔ اس گھر میں تمہارے والدین ضرور رہتے ہیں۔ تم اپنے والد کو میاں جی کہتے ہو تو سب میاں جی کہتے ہیں۔ اسی طرح تمہاری ماں کو سب ماں جی کہہ کے بُلاتے ہیں۔۔۔۔ میاں جی کا نچلا دھڑ مفلوج ہے۔ وہ وہیل چیئر پر اپنے کمرے میں اور بالکونی تک پھر لیتے ہیں۔ ماں جی کی آنکھوں کی روشنی کالا موتیا اُتر آنے سے چلی گئی تھی ان کا کمرا اوپر ہے۔ اب باقی باتیں بعد میں۔۔۔ ایسا نہ ہو ڈاکٹر آغا نکل جائیں۔" اس نے پھر اپنی ہیرے کے نگوں والی گھڑی دیکھی اور سنہرے روپہلے رنگوں سے جھلمل کرتا پرس جُھلاتی باہر چلی گئی۔

رخشندہ بلاشبہ حسین اور بھرپور شباب کی کشش رکھنے والی عورت تھی۔ اس کا بدن انتہائی متناسب تھا۔ اس کے سارے نشیب و فراز اور قوس و خم اتنے مکمل تھے کہ لگتا تھا اسے تخلیقِ حُسن اور جمالیات کے نصابی اصولوں کی وضاحت کے لیے بطور ماڈل بنایا گیا ہو پھر رخشندہ کو اپنے حُسن کی قوتِ تسخیر کا احساس کیسے نہ ہوتا۔ معلوم نہیں شاہ عالم کی بیوی وہ اپنی مرضی سے بنی تھی یا مجبوری کے باعث لیکن اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ماڈل بننا ہی پسند کرتی۔ خود نمائی کا جو انداز اس کے لباس اور اطوار میں ملتا تھا اس سے یہی ثابت ہوتا تھا۔

نرس روزی اس کے جانے کے چند منٹ بعد آئی تو میں حیران رہ گیا۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ کافور سفید ہوتا ہے اور افریقہ کے ایک حبشی غلام کا یہی نام تھا۔ روزی کو بھی گلاب سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ تقریباً چھ فٹ قد اور سپاٹ جسم کی عورت تھی جس کے گہرے سانولے رنگ کے چہرے کے نقوش میں مردانہ کرختگی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور کچھ گول تھیں۔ سانپ کی آنکھوں جیسی۔ ان میں مجھے عجیب سی سفاکی بھی محسوس ہوئی۔

"میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں مسٹر عالم!" اس نے انگلش میں کہا۔

میں نے کہا "تم اندر آنے سے پہلے ناک کرسکتی تھیں' اجازت لینے کے لیے۔۔۔ کیونکہ یہ میرا بیڈ روم ہے' اسپتال کا کمرا نہیں۔ اس کے بعد تم شائستگی سے السلام علیکم یا گُڈ ایوننگ کہہ سکتی تھیں۔ ایسا نہ کرنا بدتمیزی کہلاتا ہے۔ تم مسکرا بھی سکتی تھیں اور مجھے مسٹر عالم کے بجائے سر کہہ سکتی تھیں۔ خیر آئندہ خیال رکھنا۔ اب تم یہ کرسکتی ہو کہ اس کھڑکی پر سے پردہ ہٹادو۔"

اس نے سخت بے عزتی محسوس کی "یس سر۔ لیکن یہ پردہ ہٹاکے آپ اندھیرے میں کیا دیکھیں گے۔ کھڑکی کے پیچھے گیلری کی دیوار ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہیں دیکھنے سے اسے دیکھنا بہتر ہوگا۔"

"اگر آپ کو میری موجودگی پسند نہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔ سر!"

"اس عنایت پر میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا مس روزی۔ میں بدتہذیب نہیں ہوں۔ باہر جاتے وقت پردے برابر کردینا۔ دروازے کو آہستہ سے بند کرنا اور یہ خیال رکھنا کہ جب مجھے ضرورت محسوس ہوگی تو میں خدا کے بعد تم کو ہی پکاروں گا۔ فی الحال مجھے صرف سکون اور نیند کی ضرورت ہے۔"

"کیا میں باہر کھڑی رہوں ایک ٹانگ پر اور انتظار کرتی رہوں آپ کی آواز کا؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"تم نے پھر سر نہیں کہا" میں نے دہاڑ کے کہا "میں نے جو کہا تم نے سُن لیا؟ ایک ٹانگ پر کھڑے ہونا یا دو پر' یہ تمہاری اپنی مرضی کی بات ہے۔ تم بیٹھ جاؤ تب بھی مجھے اعتراض نہیں ہوگا مگر میری آواز سُن کے تم نہ آئیں اور مسکراتے ہوئے یس سر نہیں کہا تو میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔"

وہ دہشت زدہ ہوکے باہر نکل گئی۔ اس نے میری ہدایات پر بھی پوری طرح عمل کیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں کھڑا ہوگیا۔ میرے پاس تقریباً ایک گھنٹا تھا۔ رخشی کے واپس آنے سے پہلے مجھے کچھ کرنا تھا۔ میں دبے پاؤں دروازے تک گیا اور ایک ہاتھ سے پردہ ہٹاکے ایک دم دروازہ کھول دیا۔

روزی گھٹنوں پر ہاتھ رکھے رکوع جیسی حالت میں دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی' وہ گھبرا کے پیچھے ہٹی۔

میں نے اس کی کلائی پکڑلی "یہ تم کیا کررہی تھیں؟"

"کچھ۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔" اس نے ہکلا کے کہا اور پھر میری نیت کو بھانپتے ہوئے چلّانے کے لیے منہ کھولا۔

میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبایا اور ایک جھٹکے سے کمرے میں کھینچ لیا۔ وہ دراز قد اور صحت مند عورت تھی۔ اس کے سپاٹ جسم میں غیر معمولی سختی تھی۔ جوان عورت کے جسم کی نسوانیت کے برعکس یہ کسی مرد کا کسرتی بدن محسوس ہوتا تھا۔ اس نے ہاتھ اور لاتیں چلاکے مزاحمت کی مگر پھر سمجھ لیا کہ وہ میرا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

میں نے لات مار کے دروازے کو اپنے پیچھے بند کیا اور لاک کردیا۔ پھر میں نے کہا "مس روزی۔ تمہاری زندگی اور موت کا انحصار تمہارے رویّے پر ہے' میں تم کو مارنا نہیں چاہتا لیکن تم نے حلق سے آواز نکالی تو یہ آخری آواز ہوگی جو تمہارے کان سُنیں گے۔ اس کے بعد تمہاری یہ خشک لکڑی جیسی گردن ٹوٹنے کی آواز تم نہیں سُن پاؤگی۔ یہ مت سمجھنا کہ میں پاگل ہوں۔ میں جو کچھ کررہا ہوں سوچ سمجھ کے بقائمی ہوش و حواس کررہا ہوں۔ تمہیں مار کے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا' آئی بات سمجھ میں؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سہلایا تو میں نے اسے چھوڑدیا۔ وہ ایک دم پلٹ کے مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ اس کا گھٹنا میرے پیٹ میں لگا اور میں تھوڑا سا جھکا تو اس کا سخت ہاتھ میرے شانے پر پڑا۔ یہ ہاتھ اگر میری گردن پر لگتا تو میں منہ کے بل گر کے بے ہوش ہوجاتا۔

حملہ غیر متوقع تھا مگر مجھے سنبھلنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگا۔ میں یوں جھکا جیسے زمین پر گررہا ہوں پھر میرا ایک ہاتھ اوپر اُٹھا اور دوسرا نیچے گیا۔ میں نے اسے دونوں ٹانگوں میں ہاتھ ڈال کے اٹھایا اور اوپر والا ہاتھ گردن پر جماکے جھٹکا دیا تو وہ میرے سر کے اوپر سے گزری اور پیچھے گری۔ میرے پلٹنے سے پہلے وہ تڑپ کر اُٹھی اور دروازے کی طرف دوڑی۔ شاید اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ سیر ہے تو مقابلے پر سوا سیر' لیکن یہ بات بھی محاورے کی حد تک درست تھی ورنہ سیر کا واسطہ من سے پڑگیا تھا۔ اس نے تو مجھے شاہ عالم سمجھ رکھا تھا اور اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ "شاہ عالم" صرف سیاست کے میدان میں جوڑ توڑ کا ماہر نہیں' خالی ہاتھوں سے ہڈیوں کی توڑ پھوڑ کے فن میں بھی چھُپا رستم ہے۔

میں نے ایک جست لگا کے اسے پھر دبوچ لیا۔ اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور اپنے دانت میرے بازو پر جمادیے۔ کسی پاگل کُتیا کی طرح اس نے مجھے یوں کاٹا کہ اس کے دانت بازو کی کھال سے گوشت کی تہ تک اُتر گئے۔ یقیناً میرے خون کا ذائقہ اس نے اپنے لبوں پر محسوس کیا ہوگا مگر مجھے تو درد کی شدت نے بے چین کردیا تھا۔ میں اسے واقعی مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس وقت میرے مقابل کوئی عورت نہیں' ایک خونی بلا تھی اور میں ذرا بھی کمزوری دکھاتا تو شاید وہ فائدہ اُٹھاتی اور میرے ساتھ وہی ہوتا جو میں نے اس کے ساتھ کیا۔

میں نے پیچھے سے اس کی پسلیوں میں گھٹنا مارا اور اوپر سے میرا ہاتھ اس کی گدی سے ذرا نیچے پڑا۔ پسلی اور گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی بھیانک آواز کے ساتھ ہی اس کا جسم ڈھیلا پڑگیا۔ میرے بازو پر اس کے دانت اسی طرح جمے ہوئے تھے۔ میں نے جھٹکا دے کر خود کو اس سے چھڑایا تو وہ فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کا جسم بڑے مکروہ طریقے پر اینٹھنے لگا اور اس کے حلق سے خرخراہٹ نکلنے لگی۔ گردن ٹوٹ جانے سے اس کے سر اور دھڑ کو جوڑنے والی کھال اور گوشت کھنچ گئے تھے اور سر اب شانوں سے کافی دور ہوکے کمر کی جانب مڑگیا تھا۔ میں اس کی کھلی آنکھیں دیکھ سکتا تھا اور وہ زبان جو آدھی دانتوں میں دبی ہوئی تھی اور آدھی باہر نکلی ہوئی تھی۔

کسی وحشی جانور کی طرح جو جنگل میں چرنے والی بھیڑ بکریوں کو مار ڈالے۔ میں نے اس کی لاش کو ٹانگ پکڑ کے گھسیٹا اور دھکیل کر بیڈ کے نیچے کر دیا۔ بیڈ کور برابر کر کے میں واش روم کی طرف لپکا۔ میرے بازو کے زخم سے خون بہہ کر آستین کو تر کر رہا تھا اور ہتھیلی تک پہنچ گیا تھا۔

واش روم انتہائی خوب صورت اور شاندار تھا۔ سائز میں یہ کسی عام گھر کے کمرے سے بھی بڑا تھا۔ میرا اپنا باتھ روم بھی کم پُرتعیش اور شاہانہ قسم کا نہ ہوتا تو میں یقیناً متاثر ہوتا اور ہر چیز کو بڑی حیرت سے دیکھتا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کو رخشندہ جیسی ایک طرح دار حسینہ اپنے بیوٹی پارلر کے طور پر بھی استعمال کرتی تھی چنانچہ اس میں بہت سی چیزیں اضافی تھیں مثلاً سلمنگ مشین' مساج' فیشل کا سامان اور سونا اسٹیم باتھ۔ کیبنٹ بیوٹی سوپ اور لیکوئڈ باتھ آئل اور لوشن کریم کے جار اور پرفیوم کی شیشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سب غسل سے پہلے' غسل کے دوران یا غسل کے بعد استعمال ہونے والی چیزیں تھیں۔ باتھ روم کے ساتھ ہی ڈریسنگ روم تھا جس میں دنیا بھر سے امپورٹ ہونے والا میک اپ کا انتہائی بیش قیمت سامان اس کے علاوہ تھا۔ سدا پُرشباب رہنے اور نظر آنے کی خواہش اور کوشش میں مرد یا عورت ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر الزبتھ ٹیلر ایسا کر سکتی ہے تو رخشندہ کیوں نہیں کر سکتی۔

ڈریسنگ روم کی ایک دیوار کے برابر کیبنٹ میں شاہ عالم کے ہر موسم' موڈ اور موقع کی مناسبت سے استعمال ہونے والے ملبوسات' ڈرائی کلین اور استری کیے ہوئے موجود تھے۔ میں نے خون آلود لباس اُتار کے پہلے زخم صاف کیا اور اس پر اینٹی سیپٹک لوشن انڈیل دیا۔ وقت کم تھا مگر جسم کی کسلمندی دور کرنے کے لیے میں نے دس منٹ میں گرم پانی کے شاور سے غسل کیا اور لباس بدل کے باہر آ گیا۔۔۔۔۔۔ کا ہیٹر آن ہونے کی وجہ سے کمرے میں بڑی خوش گوار حرارت تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ باہر خاصی سردی ہوگی۔ میں نے جینز پر شرٹ اور پل اوور کے ساتھ اٹالین جوگرز پہنے اور ایکشن کے لیے تیار ہو گیا۔

رخشی کے واپس آنے سے پہلے مجھے بہت سے کام کرنے تھے۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ میرا اسباب کہاں گیا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ ہے یا نہیں اور پھر اس عشرت کدے کی قید سے فرار ہونا تھا۔ روزی تام کی اس آدم خور بلا کی لاش بیڈ کے نیچے سے نظر نہیں آ رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ جب تک لاش سڑنے اور بو نہیں دینے لگے گی کسی کا اس طرف دھیان بھی نہیں جائے گا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کی آخری صدائے مرگ بند کمرے سے باہر کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ اکبر خاں اور اصغر خاں میں سے ایک رخشی کے ساتھ گیا ہوگا۔ گلاب اور چنبیلی اپنے کچن کے چمن میں یا ... نٹ کوارٹر کے آشیانے میں نوبیاہتا کبوتر اور کبوتری کی طرح غٹرغوں کر رہے ہوں گے۔ چوکیدار گیٹ پر ہوگا۔ ایک مفلوج باپ اور ایک اندھی ماں اپنی تمام عمر کی محنت اور کمائی پر فخر و مسرت کے جذبات محسوس کرنے کے بجائے زندگی کے آخری ایام ایک پُرآسائش کمرے کی چار دیواری میں قید رہتے ہوئے تنہائی اور کسمپرسی کے دکھ میں گزار رہے تھے۔

میں نے سب سے پہلے دیواروں کا' چھت کا اور ایسی ہر جگہ کا جائزہ لیا جہاں سے کسی کلوز سرکٹ ٹی وی کی آنکھ میری نقل و حرکت کی نگرانی کر سکتی تھی مگر غالباً اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ مجھے ایسا قیدی مان لیا گیا تھا جو اس زنداں میں برضا و رغبت آیا تھا اور جس کے فرار ہو جانے کی نہ وجہ تھی نہ امکان تھا۔

پہلے یہ محض محاورہ تھا کہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں مگر اب ہر شخص جانتا ہے کہ دیواروں میں خفیہ مائیکروفون کیسے چھپائے جاتے ہیں۔ یہ ننھے منے مگر حساس اور طاقتور مائکروفون BUG کہلاتے ہیں اور ان کے استعمال کا سب سے بڑا کارنامہ سب سے بڑی جمہوریہ سپرپاور کہلانے والے ملک کے سب سے طاقتور شخص یعنی صدر نے سرانجام دیا تھا۔ امریکی صدر نکسن کو واٹرگیٹ اسکینڈل میں عدالت سے تیس سال قید کی سزا ہوئی تھی جسے معطل کروایا گیا تھا۔ نکسن نے اپنے انتخابی حریف کے الیکشن آفس میں سراغ رسی کے لیے یہ BUG استعمال کیے تھے لیکن اب یہ لالو کھیت میں بھی دستیاب تھے اور لنڈی کوتل میں بھی۔

ان دیواروں میں' فرنیچر یا سامانِ آرائش میں۔ تصاویر' وال لائٹس یا الیکٹرانکس آلات (ٹی وی۔ سی ڈی پلیئر' وی سی آر وغیرہ) میں کہیں کوئی خفیہ مائکروفون ٹرانسیٹر لگا ہوا تھا تو اس کا سُراغ صرف ماہرین ہی لگا سکتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے انٹرکام کا ریسیور اُٹھا کے دیکھا۔ یہ ڈیڈ تھا۔ رخشی نے مجھے بتایا ضرور تھا کہ زیرو کے بعد میں کوئی بھی نمبر ڈائل کر سکتا ہوں مگر خود اس نے یہاں سے ڈاکٹر آغا کو فون نہیں کیا تھا۔ دوسرے ٹو تک نمبر بھی گھر کے اندر ہی گیٹ' کچن اور دوسرے کمروں کے انٹرکام سے منسلک ہوں گے لیکن اس کا رابطہ منقطع کروا دیا گیا تھا۔

میں نے اس کے تار کا ایک سرا پکڑ کے دیکھا تو باقی تار قالین کے نیچے سے دیوار تک پہنچ رہا تھا۔ دیوار میں ایک ساکٹ تھا اور اس میں انٹرکام کے فون کا پلگ بھی لگا ہوا تھا۔ اسی ساکٹ سے ٹی وی تک ایک سفید اور گول تار جا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بجلی کے تاروں کی طرح دیواروں میں ٹیلی فون اور ٹی وی کیبل تعمیر کے دوران ہی ڈال دیے گئے تھے۔ ایسے ساکٹ ہر کمرے میں ہوں گے۔ ٹیرس اور لاؤنج میں بھی ہوں گے۔ جہاں آسانی ہو یا ضرورت ہو وہاں ٹیلی فون یا ٹی وی کا پلگ لگا لیا۔ ان تاروں کو منقطع کرنا آسان نہیں تھا اور لاحاصل بھی۔ میں نے کارپٹ اُٹھا کے دیکھا تو مجھے انٹرکام کا تار نظر آ گیا۔ اسے بڑی صفائی سے کاٹا گیا تھا اور

دونوں ... کٹے ہوئے حصے وہیں چھوڑ دیے گئے تھے۔

میں نے ایک حصے کے تاروں کی انسولیشن کو دانتوں سے کاٹ کے چھیلا پھر دوسرے حصے کے تار نکالے اور انہیں آپس میں جوڑ دیا۔ ان تاروں میں نو وولٹ کا برائے نام کرنٹ تھا۔ پھر بھی انہیں شارٹ ہونے سے بچانے کے لیے میں نے دونوں ننگے تاروں کے جوڑ الگ رکھے اور ان پر قالین اس طرح ڈھک دیا کہ تار آپس میں ملنے نہ پائیں۔ اس کے بعد میں نے ریسیور اٹھا کے دیکھا تو اس کی ڈائل ٹون سن کے مجھے پہلی کامیابی کی خوشی ہوئی۔ یہ خوشی اس ڈاکٹر کے جذباتی ردِعمل سے مختلف نہیں تھی جس نے اپنی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے کسی قریب المرگ شخص کے دل کو آخری دھڑکن کے بعد بند ہونے سے بچا لیا ہو اور آخری سانس لینے سے پہلے مریض کو موت کے منہ سے چھین لیا ہو۔ بے شک زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اب کوشش جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اس قادرِ مطلق کا وعدہ ہے کہ لیس للانسان الا ماسعیٰ۔ آدمی کو اتنا ہی ملتا ہے جتنی وہ کوشش کرتا ہے۔

اللہ کا نام لے کر میں نے زیرو پر انگلی رکھی۔ ایک میوزیکل بیپ کے ساتھ ہی ڈائل ٹون ختم ہو گئی۔ میں نے خان جی کے بیڈ روم میں موجود اس فون کا نمبر ملایا جس کا علم میرے علاوہ صرف چندا کو تھا یا ڈاکٹر کمال فاروقی عرف اُلو کے پٹھے کو۔

جب میرے کانوں نے دوسری طرف گھنٹی بجنے کی آواز سنی تو میرا دل چاہا کہ میں چلاؤں "نعرۂ قلندری" اور پھر منہ پھاڑ کے حلق سے گیدڑ جیسی آواز نکالوں اور کھلے منہ پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے اور ہٹاتے ہوئے بھنگڑا ڈالوں جیسا کہ میں اور کمال خوشی میں فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کے کرتے تھے۔ جہاں اس کی گنجائش نہ ہو وہاں ہم شریفانہ طریقے پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے اعلان فرماتے تھے "ایسی کی تیسی بے وال کے بودم کی" میں اکیلا یہاں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

تیسری گھنٹی پر خان جی نے اپنی پُرسکون گمبھیر آواز میں کہا "خان!"

میں نے آواز بنا کے کہا "عالمِ بالا سے پانے خاں کے سالے کھانے خاں کا خانِ اعظم کو سلیوٹ۔"

میں نے خان جی کا متبسم چہرہ تصور میں دیکھا "وعلیکم سلیوٹ' مختصریات کرو۔"

میں نے کہا "یہ تو پوچھ لیں کہ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے تم کہو گے کہ اپنے منہ سے۔ یہ عالمِ بالا کہاں ہے؟"

"اسی شہرِ بے مثال میں۔ اپنے لہور شریف میں۔ خان جی مجھے اغوا کر لیا گیا ہے" میں نے بڑی مسرت سے اطلاع دی "اور میں قید میں ہوں۔"

"کس کی قید میں...... بڑے خوش ہو۔"

"رخشندہ... معاف کرنا خان جی۔ منہ سے بے اختیار سچ نکل گیا۔ میری عمر میں آپ بھی یقیناً خوش ہی ہوتے لیکن میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اپنی طبعی شرافت اور فطری شرم و حیا کے باعث۔ خان جی میری آبرو خطرے میں ہے.... اور جان بھی۔"

"سیدھی طرح بتا نا کیوں نہیں چرخے...."

وہ جب خفا ہوتے تھے تو بڑی محبت سے چرخا کہتے تھے۔ غصے میں ہوتے تھے تو گدھا اور بہت زیادہ مشتعل ہوتے تھے تو "یو باسٹرڈ!" لیکن اس کے بعد سامنے والا اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور نہ سالم بتیسی کے ساتھ مسکرا سکتا تھا۔ ان کا فولادی مکا بھی لبوں کے ساتھ ہی حرکت میں آتا تھا۔ میرے ساتھ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا مگر وہ بہت پُرانی بات تھی۔

میں نے کہا "سر۔ کیا آپ شاہ عالم کو جانتے ہیں؟"

"ہاں۔ اس کی اور تمہاری صورت خاصی ملتی ہے۔"

میں نے کہا "آف... یہ بھی جانتے ہیں آپ۔ رخشندہ اس کی بیوی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"بڑی پہاڑ ہے۔ اب کہئے مجھے معلوم ہے" میں نے بھنا کے کہا "ہر بات معلوم ہے تو بتائیں کہ اس کے وہ قل کہاں ہیں جو نظر نہیں آتے اور...."

"گدھے' یہ بکواس بند کر۔ کیا تُو شاہ عالم کے گھر میں ہے؟"

میں نے رقت بھری آواز میں کہا "جی۔ مگر اٹھائیس منٹ انتیس سیکنڈ میں یہاں سے نکل جاؤں گا' انشاء اللہ۔"

"انتیس سیکنڈ بعد کیوں نہیں۔ کیا اٹھائیس منٹ ضائع کرنا ضروری ہیں؟"

"نہیں۔ اس سے پہلے بھی آ سکتا ہوں میں" میں نے کہا "آپ تو جانتے ہیں کہ ہر جینئس کی طرح میں بھی اس دنیا میں قبل از وقت آ گیا تھا۔ میں اکیسویں صدی کا نمونہ ہوں۔"

"میں تجھے لانے کے لیے چندا کو بھیج رہا ہوں۔"

میں نے چلا کے کہا "فہوا لمطلوب" اہلاً و سہلاً مرحبا" مگر دوسری طرف سے خان جی نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

اگلا مرحلہ زیادہ دشوار تھا۔ مجھے فرار کی کوشش سے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ میرا راستہ روکنے والے پہرے دار کہاں کہاں موجود ہیں اور ان سے خاموشی کی زبان میں کیسے نمٹا جا سکتا ہے۔ میری نظر انٹرکام کے بٹنوں پر تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کس بٹن کو دبا کے میں کس سے بات کر سکتا ہوں۔ میں کسی ایک نمبر پر بات کرنے والے سے یہ معلومات حاصل کرتا تو اس سے شکوک پیدا ہو جاتے۔ رخشی نے کہا تھا کہ باہر جا کے خود کو تماشا مت بنانا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری یادداشت کے متاثر ہونے کی خبر کسی کو نہیں تھی اور ہوتی بھی کیسے۔ ابھی میں نے یہ ڈراما پہلی بار صرف رخشندہ کے سامنے کیا تھا۔ ایک طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ لاعلمی کو غیر ارادی غلطی

بتالوں۔

مشہور جاسوس شرلاک ہومز کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مجرم کے ذہن سے سوچنے کی کوشش کرتا تھا کہ میں مجرم ہوتا تو ارتکاب جرم کے بعد کیا کرتا۔ چور ایک شخص کا بہت قیمتی گھوڑا لے گئے اور اسے جنگل میں چھوڑ دیا۔ اس نے پہلے چور کے ذہن سے سوچا اور جنگل تک پہنچ گیا پھر اس نے سوچا کہ میں گھوڑا ہوتا تو کیا کرتا اور کدھر جاتا۔ گھوڑے کے ذہن سے سوچ کے وہ سیدھا وہاں جا پہنچا جہاں گھوڑا اس کے لیے چشم براہ تھا۔

میں نے بھی سوچا کہ میں واقعی شاہ عالم ہوتا تو انٹرکام کے نمبر کس ترتیب اور ترجیح سے الاٹ کرتا۔ میں ایک نمبر یا گیٹ پر چوکیدار کو۔ یا پھر اپنے سیکریٹری کو۔ جسے میں نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر برطرف کردیا تھا۔ ایک نمبر آفس کا ہوتا تو پھر دو نمبر گیٹ کے لیے مناسب تھا۔ تین نمبر... تین نمبر ڈرائنگ روم میں... اوکے۔ چار نمبر... کچن...!

میں نے ایک نمبر ملانے کے لیے ریسیور اُٹھالیا اور اعتماد کے ساتھ بارعب آواز میں کہا "کون ہے اکبر خاں یا اصغر خاں۔"

جواب میں ایک گھبرائی شرمائی چیخ سی سُنائی دی "ہائے صاب جی۔ میں چنبیلی ہوں' حکم کریں۔"

میری گھوڑے کے ذہن والی تھیوری غلط ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "تم گیٹ پر کیا کررہی ہو؟"

"صاب جی! یہ گیٹ نہیں کچن ہے۔ آپ نے ایک نہیں چار نمبر دبا دیا ہے۔"

"ویری گڈ۔" میں نے لائن کاٹ کے خود سے کہا۔ گھوڑے والا نظریہ غلط نہیں ہوا۔ ایک نمبر کے نیچے چار تھا۔ میری انگلی غلط پڑ گئی تھی۔

ایک نمبر سے کسی نے کہا "حکم جناب!"

غالباً ملازمین کے لیے یہ پوچھنا ضروری تھا کہ کیا حکم ہے۔ میں نے کہا "اکبر خاں!"

"سر' وہ بیگم صاب کا گاڑی لے گئی اے..."

میں نے اسے بھی ڈانٹا "اصغر خاں۔ مجھے معلوم ہے' میں یہ پوچھ رہا تھا کہ اکبر کون سی گاڑی لے گیا ہے؟"

"لال والا پاجیرو سر... نیا والی۔"

"اچھا... پھر اب میں کون سی گاڑی لے جاؤں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"جو آپ کا مرضی صیب۔ شی راڈ بھی سروس ہو کے آیا اے۔ ابی ام کو بل دیا اے... خانہ خراب چودہ سو..."

میں نے کہا "تم بل میرے پاس لے آؤ۔"

"ام گلاب دین کو دیتی سر۔"

میں نے غرا کے کہا "اصغر خاں۔ تم میرا حکم ٹال رہے ہو۔ میں تم کو کہہ رہا ہوں اور تم گلاب دین کو سونپ رہے ہو یہ کام۔"

"نہیں صاب۔ ہم اِدھر گیٹ نہیں چھوڑتی... اس لیے۔"

"ایسا نہ ہو تم کو یہ نوکری چھوڑنی پڑے" میں نے کہا۔

وہ گھبرا گیا "آتی صاب۔ ہم خود آتی..."

میں دروازے کے قریب جا کے کھڑا ہوگیا۔ دو منٹ بعد ایک شخص نمودار ہوا جو ہرگز اصغر خاں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا سیاہ فام اور بدصورت شخص تھا۔ اس کی ناک کچھ بیٹھی ہوئی اور پھیلی ہوئی تھی جیسے اس کی ہڈی نکال دی گئی ہو۔ وہ کوئی باکسر بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے بال چھوٹے اور سخت تھے۔ اس نے آدھی آستین کی زرد رنگ کی بنیان پہن رکھی تھی جس پر بلاک پرنٹنگ میں سیاہ رنگ سے ایک نیم عریاں حبشی عورت کے خطوط واضح کیے گئے تھے اور نیچے لکھا تھا "او بے بی" وہ جگالی کرنے کے انداز میں چیونگم بھی چبا رہا تھا۔

"تم اصغر خاں ہو!" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے مسکراتے ہوئے دونوں تنومند بازوؤں کو سینے پر باندھا "میں نے اصغر خاں کو واپس بھیج دیا' یہ لو بل۔"

اس کا لہجہ ذرا بھی مؤدبانہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس گھر کا ملازم ہوتا تو مجھ سے آنکھ ملا کے بات نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اپنے رویّے سے خود کو خطرناک بدمعاش ثابت کرنا چاہتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ روزی کا مردانہ ایڈیشن تھا اور اسے میری نگرانی کے لیے بطورِ خاص لایا گیا تھا۔ یہ اس کی ذمّے داری تھی کہ مجھے باہر نہ جانے دے۔

میں نے اسے بے خبری میں ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا اور مسکراتے ہوئے بل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا "تھینک یو۔"

اس نے نظریں اِدھراُدھر گھما کے کہا "روزی کہاں ہے؟"

مگر اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے میں نے بل کے بجائے اس کی کلائی پکڑلی اور اسے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ لڑکھڑا کے آگے آیا تو میں نے دائیں ہاتھ کا بھرپور پنچ اس کے پیٹ میں مارا۔ اس کا سانس رُک گیا۔ اگر وہ تیار ہوتا تو شاید یہ وار کارگر نہ ہوتا۔ وہ پیٹ کو سخت کرلیتا اور جواب میں ایک مُکّا مجھے رسید کرتا۔ شاید اسے علم نہیں تھا کہ میں خان اعظم کا شاگرد ہوں یا اگر معلوم تھا تو وہ میری مسکراہٹ سے دھوکا کھا گیا۔

وہ کراہ کے جھکا تو میں نے اس کی کنپٹی پر گھٹنا ماردیا۔ یہ وار بھی بہت سخت تھا مگر رہی سہی کسر پوری کرنے کے لیے میں نے بائیں ہاتھ کی کہنی اس کے سر کے پچھلے حصے پر ماری۔ وہ رکوع سے سیدھا سجدے میں چلا گیا اور دائیں کروٹ پر لڑھک کے ساکت ہوگیا۔ میں اسے گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گیا اور فرش پر لٹادیا۔

باہر آ کے میں نے پھر انٹرکام کا ایک نمبر دبایا "اصغر خاں۔ کیا بات ہے۔ میں خود بل لینے گیٹ پر آؤں اور تم کو گیٹ سے باہر کردوں؟"

"وہ... سر... صیب... ام آتی مگر وہ..."

"یہ کیا اگر مگر لگا رکھی ہے؟"

"ام کو بیگم صاب کے چاچے کا پتر روکتی۔ بولتی ام کو بل دو اور دفع ہو جاؤ۔ سر اہمارا کیا قصور۔ آپ اس سے پوچھو۔"

میں نے کہا "وہ بھی ہے یہاں' تم فوراً آؤ۔"

"آتی صیب۔ لیکن آپ اس کو بولو۔ ام سے ایسا بات مت کرے۔ یہ بولتا ہم بیگم صاب کا وہ ہوتی... کزن..."

"تمہارا مطلب ہے کزن۔ اسے میں تمہارے سامنے سمجھا دوں گا" میں نے نرمی سے کہا "تمہاری کوئی بے عزتی نہیں کر سکتا۔"

اصغر خاں بھی ایک منٹ میں آگیا۔ اندر آتے ہی اس نے دائیں ہاتھ سے مجھے سلام کیا اور کلاشنکوف بائیں ہاتھ میں لٹکالی۔ اس نے بیگم صاحب کے کزن عرف چاچے کے پتر کی تلاش میں اِدھراُدھر نگاہ دوڑائی۔

میں نے کہا "اصغر خاں... یہ کلاشنکوف مجھے دو۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے کلاشنکوف مجھے پکڑا دی۔ وہ سمجھا کہ شاید اس سے ہتھیار لینے کا مطلب ہے اس کی نوکری خلاص "سر... اَمارا غلطی۔"

میں نے کلاشنکوف کا بٹ مار کے اسے ناک آؤٹ کردیا "سوری اصغر خاں۔ تمہاری غلطی صرف یہ ہے کہ تم بے وقوف ہو۔"

میں نے اسے ڈریسنگ روم میں شفٹ کیا اور جلدی جلدی تمام الماریوں کی اور درازوں کی تلاشی لی۔ ان میں بہت کچھ تھا۔ طلائی زیورات' ہیرے کے کنگن اور ٹاپس' کیش... مگر جس سامان کی مجھے تلاش تھی وہ نہیں تھا۔ شاید بریف کیس تیمور لے گیا تھا۔ مجھے اس کی کوئی خاص فکر بھی نہیں تھی۔ کپڑوں کے سوٹ کیس جائیں جہنم میں۔ مجھے اپنا وہ شولڈر بیگ درکار تھا جس میں قمر النسا کے لیے چاکلیٹ تھی۔ چاکلیٹ کا تحفہ ہاتھ میں لیے بغیر اس کے سامنے جانا ایسا ہی تھا جیسے آدم خور شیرنی کے سامنے بندوق کے بغیر جانا۔ وہ تو کھا جائے گی مجھے۔ میں نے اپنے اور رخشندہ کے وارڈروب کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے سوچا۔

پھر اچانک وہ بیگ مجھے نظر آگیا۔ میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ میں نے زپ کھول کے اس میں جھانکا۔ وہ اسپیشل چاکلیٹ کا گفٹ پیک اسی طرح دوسری چیزوں کے ساتھ موجود تھا۔ غالباً رخشی نے بیگ کھول کے نہیں دیکھا تھا یا چاکلیٹ کا پیکٹ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے چاکلیٹ پسند ہی نہ ہوں۔ پھر بھی یہ حیرانی کی بات تھی کہ اس نے تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کے بھی اس گفٹ پیک کو کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور نہ یہ جاننے کی کہ آخر یہ چاکلیٹ کس کے لیے لائے گئے ہیں۔ کیا خود شاہ عالم بھی چاکلیٹ لاتا رہتا تھا اور وہ بھی اتنی مقدار میں۔ سات سمندر پار سے۔ مزید یہ کہ بیگ میں بہت سی چیزیں میری ذاتی پسند کی مظہر تھیں مثلاً اس میں جان اشٹین بیک کا شہرۂ آفاق ناول GRAPES OF WRATH تھا۔ سونے سے پہلے مجھے کچھ پڑھنے کی عادت تھی۔ اس کے چند صفحات ہر رات پڑھنے کے بعد میں جہاں سے چھوڑتا تھا اس صفحے کا نیچے والا کونا موڑ دیتا تھا۔ اشٹین بیک نوبل پرائز لینے والا ادیب تھا اور مجھے بہت پسند تھا۔ کیا شاہ عالم کا ذوق بھی اتنا ہی ادب پرستانہ تھا؟ تعداد کے اعتبار سے ہیرلڈ رابنس یا جیمس ہیڈلے چیز قسم کے مصنفوں کی کتابیں بہت زیادہ فروخت ہوتی تھیں۔ بیگ میں اجلے سفید رومالوں کا ایک پیکٹ تھا۔ میں ہمیشہ سفید رومال استعمال کرتا تھا جو چندا بناتی اور دھوتی تھی۔ اس نے ہر رومال کے ایک کونے پر میرے نام کا مونو گرام بھی اتنی مہارت سے کاڑھ رکھا تھا کہ پرنٹ معلوم ہوتا تھا۔ یہ N.A کا مونوگرام ایک نظر میں ۸۳ پڑھا جاتا تھا۔ جب میں باہر جاتا تھا تو ایسے کم سے کم ایک درجن رومال میرے ساتھ ہوتے تھے۔ ان میں سے نصف ہی واپس آتے تھے اور وہ بھی استعمال شدہ۔ باقی میں گم کردیتا تھا۔ میرے اور چندا کے درمیان یہ بھی جنگ کا ایک سبب تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گم وہی چیز ہوتی ہے جس کی آدمی کے نزدیک قدر و قیمت نہ ہو۔ جو چیز عزیز ہو اسے وہ سنبھال کے رکھتا ہے۔ کیا رخشی نے یہ رومال اور میرا N.A کا مونوگرام بھی نہیں دیکھے تھے؟

خیر رخشی بھاڑ میں جائے۔ اس نے کچھ دیکھا تھا تو کیا اور نہیں دیکھا تھا تو کیا۔ اتنا تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ اس نے مجھے لاعلمی یا بے خبری میں شاہ عالم تسلیم نہیں کیا ہے۔ اسے معلوم ہو گا یا پتا چل گیا ہو گا کہ میں شاہ عالم کا نقشِ ثانی ضرور ہوں مگر شاہ عالم نہیں ہوں۔ کیا اسے یہ بھی علم ہو گا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میں نے باہر آتے ہوئے سوچا۔

اب مجھے باہر جانے میں کوئی ڈر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میری نگرانی کے لیے رکھے جانے والی ببول کے کانٹے سے زیادہ سخت پُر آزار اور بدصورت روزی اور رخشی کے کزن اور چوکیدار کو میں نے ان کی ذمّے داری سے سبکدوش کردیا تھا اور وہ اپنی اپنی جگہ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ روزی کو یوم حساب سے پہلے نہیں اُٹھنا تھا۔ باقی دو کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد ہوش میں آجائیں گے۔ اصغر خاں کو مجھے مجبوراً ناک آؤٹ کرنا پڑا تھا ورنہ وہ فرض شناس اور تابعدار شخص تھا۔ شاید وہ مجھے باہر جانے سے نہ روکتا۔ میں اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ بیگم صاحبہ نے میرے بارے میں کیا احکامات صادر فرمائے ہیں۔ کیا مجھے باہر جانے کی اجازت ہے۔ وہ کلاشنکوف اُٹھا کے میری راہ میں حائل ضرور ہو سکتا تھا مگر یہ ناممکن تھا کہ مجھ پر فائر کرے اور کلاشنکوف کا برسٹ مار کے بیگم صاحبہ کو مطمئن کردے کہ اس کے بغیر صاحب کو روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

کسی ارادے اور نیت کے بغیر مجھ سے ایک قتل ہو گیا تھا۔

رخشندہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئی تھی۔ اس نے میری حفاظت کے لیے ایک عورت اور ایک مرد کی خدمات حاصل کی تھیں جو اپنی دانست میں بد معاش تھے۔ ممکن ہے ان کا مجرمانہ ریکارڈ انھیں ایسا ہی ثابت کرتا ہو اور وہ ایک دوسرے کے ساتھی بھی ہوں لیکن رخشندہ نے گھر کے اندر ان کی موجودگی کو جواز عطا کرنے کے لیے ان سے رشتہ جوڑ کے اپنی کم عقلی کا ثبوت دیا تھا۔

اس بدصورت' بدتمیز اور بدکردار شخص کو رخشندہ جیسی حسین وجمیل' مہذب اور معزز عورت کا کزن سمجھنا ایسا ہی تھا جیسے گلی کے کتّے کو پالتو ہرنی کے چاچے دا پتر سمجھنا۔ یہ احمقانہ بات تو اصغر خاں کے ذہن نے بھی قبول نہیں کی تھی۔ روزی کی لاش دریافت کرلینے کے بعد یقیناً رخشی مشکل میں پڑے گی مگر مجھے یقین تھا کہ اس کا "کزن" مناسب انعام واکرام کے بدلے میں اس کی یہ مشکل آسان کردے گا۔ آگے کزن کی مرضی کہ وہ انعام پر ہی اکتفا کرتا ہے یا اکرام پر۔ یا دونوں لے کر بھی قناعت اختیار نہیں کرتا اور اپنی کزن کو بلیک میل کرکے مستقل فائدہ اُٹھانے کی سوچتا ہے۔

کلاشنکوف ہاتھ میں پکڑ کے اور بیگ کندھے پر لٹکا کے اپنے ہی گھر میں پھرنا بڑی بے وقوفی ہوتی۔ مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت بھی تھی تاکہ اور کوئی کزن مل جائے تو میں اس سے اسی کی زبان میں بات کرسکوں لیکن یہ ہتھیار میں ریوالور کی طرح جیب میں نہیں ڈال سکتا تھا اور چھپا کے بھی نہیں لے جاسکتا تھا۔

میں نے خدا پر اور خدا کے دیے ہوئے دو ہاتھوں پر بھروسا کرتے ہوئے' نہایت احتیاط اور عقلمندی سے کام لیتے ہوئے کلاشنکوف ...پر سے اپنے فنگر پرنٹ صاف کیے اور کمرے سے باہر آگیا۔

ابھی میرے پاس پندرہ بیس منٹ تھے۔ میں نے شاہ عالم کے گھر کا معائنہ فرمایا۔ ایک بیڈ روم سے دوسرے بیڈ روم میں گیا۔ پھر ڈرائنگ روم۔ لاؤنج اور اسٹڈی کا جائزہ لیا۔ یہ شاہ عالم کا آفس بھی تھا۔ مجھے یہاں سے اپنے مطلب کا بہت سا مواد مل سکتا تھا مگر مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں نے کوئی چیز چھونا یا اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔

میں اسٹڈی سے باہر آیا تھا جب میں نے لال نیلے پیلے ہرے تمام شوخ رنگ کے پھولوں والے کپڑوں میں لپٹی ہوئی پانچ فٹ کی چنبیلی کو دیکھا۔ وہ دبلی پتلی اور تیکھے نقوش والی عورت تھی۔ اسے خوب صورت یقیناً نہیں سمجھا جاسکتا تھا مگر اس کے سانولے رنگ میں' اس کے انداز کی شوخی اور شرارت سے مسکراتی آنکھوں میں بڑی معصوم سی دلکشی ضرور تھی۔

مجھے دیکھ کے وہ ایسے ٹھٹکی جیسے اس نے اسٹڈی میں سے چور نکلتا دیکھ لیا ہو "صاب جی' آپ...!"

میں نے کہا "چنبیلی۔ کپڑے کیوں نہیں پہنے؟"

وہ بوکھلا گئی "جی..... کپڑے...... یہ ہیں نا..."

میں نے اسے غور سے دیکھا "اچھا۔ یہ کپڑے ہیں' میں تو سمجھا کہ باغ کے سارے پھول توڑ کے گل دستہ بنی پھر رہی ہے۔"

وہ منہ دبا کے ہنسی "ایسا تو اچھا ہے صاب جی آپ کا۔ بیگم صاحبہ کو بھی پسند آئے گا۔"

میں نے خفت چھپانے کے لیے کہا "تو کیا کررہی ہے یہاں۔ اور وہ چھچھوندر کہاں ہے؟ جو تیرا تیل نکالتا ہے..."

وہ دم بخود رہ گئی "چھچھوندر..... میرا تیل...؟"

"ہاں۔ تونے سنا نہیں' چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔"

وہ کھی کھی کرتی بھاگی "ابھی بتاتی ہوں اسے" پھر ایک دم رُک کے اس نے مجھ سے پوچھا "آپ کہیں جارہے ہو صاب جی۔ چائے لاؤں؟"

میں نے کہا "ہاں اور نہیں..... یہ ہے دونوں سوالوں کا جواب۔"

وہ میرے طرزِ عمل سے جتنی خوش نظر آتی تھی اس سے زیادہ حیران تھی۔ اس کی یہی وجہ ہوسکتی تھی کہ شاہ عالم کا رویّہ بھی اس کے ساتھ اتنا ہی مالکانہ ہوگا جتنا رخشندہ کا تھا۔

میں اطمینان سے باہر آگیا۔ ایک ہونڈا اکارڈ پورچ میں کھڑی ہوئی تھی اور سائڈ کی گیلری میں وہ شیراڈ جس کی سروس کا بل مجھے رخشندہ کے کزن نے خود پیش کرنے کی غلطی کی تھی۔ باہر کا باغ اور لان صاف عدم توجہ کا شکار نظر آتے تھے۔ شاہ عالم یہاں ہفتے میں ایک یا دو بار آتا تھا اور وہ بھی رات گزارنے کے لیے۔ رخشندہ کوئی گھر سنبھالنے والی عورت نہیں تھی۔ اسے گھر کو سجانے سنوارنے سے زیادہ خود کو بنانے سنوارنے میں دلچسپی تھی۔ باپ معذور نہ ہوتا اور ماں کی آنکھیں بے نور نہ ہوتیں تو شاید...... دنیاوی اعتبار سے ہر کامیابی حاصل کرلینے والے اپنے بیٹے کی خوشیاں سمیٹتے۔ اس پر ناز کرتے اور عمر کے آخری ایّام کی فراغت میں دولت کی ہر آسائش سے لطف اندوز ہوتے لیکن وہ اس محل کے ایک دور افتادہ گوشے میں باعزت طور پر زندگی کے دن پورے کررہے تھے۔ معذور لوگ بھی احساسِ مسرت سے بے بہرہ نہیں ہوتے اور خوش رہ سکتے ہیں مگر ان کی خوشی کے لیے دوسروں کو اپنی مصروف زندگی میں سے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ شاہ عالم کے پاس سب کچھ تھا مگر وقت نہیں تھا یا تھا تو اپنے گھر کے لیے نہیں تھا جس میں اس کے ماں باپ کے علاوہ اس کی بیوی بھی رہنے پر مجبور تھی۔ اگر وہ رشتوں کو احترام اور اہمیت دیتا تو دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ان کے لیے چوبیس منٹ ضرور نکال سکتا تھا۔

نہ جانے کیوں آگے جاتے جاتے میں واپس لوٹ گیا۔ میں نے لاؤنج میں نیم دائرہ بناکے اوپر جانے والے زینے پر قدم رکھا اور ایک اوپن ٹیرس میں طلوع ہوا۔ اس میں بائیں طرف کے کسی بیڈ روم میں سے اب بھی ٹی وی کی آواز آرہی تھی۔ میں نے اخلاقاً دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہوگیا۔

"السلام علیکم میاں جی' سلام ماں جی" میں نے ایک وہیل چیئر پر ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ضعیف شخص سے اور بیڈ پر لیٹی ہوئی نحیف ونزار عورت کو مخاطب کرکے کہا۔ کمرا بہت پُرتکلف اور پُرآسائش تھا مگر ان کی تکلیف کے اسباب زیادہ عیاں تھے۔ یہ

سب دولت مندی کے اسباب تھے لیکن انھیں محبت میسر نہ تھی۔ بیٹا بے حد مصروف تھا اور بہو ان سے لاتعلق تھی۔ اگر پوتے ہوتے تو شاید وہ اپنی محبت اور شفقت کے سارے خزانے ان پر لٹا کے مسرت حاصل کرلیتے۔ جس وہیل چیئر پر بوڑھا بیٹھا ہوا تھا وہ بہت قیمتی تھی مگر یہ اس کی بے جان ٹانگوں کا نعم البدل نہیں تھی۔ بوڑھی عورت کے لیے ساری دنیا ایک اندھیرے خلا کے سوا کچھ نہیں تھی۔ جس میں وہ صرف اپنے چشمِ تصور سے ماضی کی پرچھائیاں دیکھ سکتی تھی اور یادوں کے چراغ جلا سکتی تھی۔

میری آواز پر میاں جی ایک دم پلٹے اور ضعیف عورت اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ میاں جی کی عمر کسی طرح بھی ساٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی مگر برف جیسے سفید بالوں' اجلی داڑھی اور عمر رفتہ کی طویل جدوجہد اور سختیِ حالات کا حساب دینے والی چہرے کی شکنوں سے وہ ستّر سال سے زیادہ کے نظر آتے تھے۔ یہی حال ماں جی کا تھا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا تھیں۔

"کون پُتّرا؟" عورت نے بے یقینی سے کہا۔

میاں جی نے مجھے نظر جما کے دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا "وعلیکم السّلام شاہ جی۔ خیر تو ہے۔ آج دنیا کو کیا ہوگیا ہے؟ کیا سورج مغرب سے نکلا ہے؟"

میں نے ان کے قریب جاکے کہا "ایسی کیا بات ہے میاں جی!"

"کوئی بات ضرور ہے۔ تیرا اس وقت آنا اور ایسے سلام کرنا..... خیر' تو ٹھیک ہے نا۔ باہر سے کب آیا؟"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے میاں جی۔"

وہ مزید حیران ہوئے "یا میرے خدا! یہ کیسا انقلاب ہے۔ تو ابھی لوٹا ہے اور سیدھا گھر آگیا۔ ہمارا حال پوچھنے کی فرصت مل گئی تجھے؟"

میں نے کہا "آپ کیسے ہیں میاں جی۔ آپ کا کیا حال ہے ماں جی۔"

عورت خلا میں دیکھ رہی تھی "تو عالم ہی ہے نا..."

میاں جی نے طنز سے کہا "ہاں ہاں۔ پریشان مت ہو۔ تو صرف انقلاب کو دیکھ رہی ہے مگر میں صورت دیکھ سکتا ہوں تیرے پتر شاہ عالم کی..."

عورت نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "کمال ہے۔ اپنا شاہ عالم پتر آیا اور مجھے خبر نہیں ہوئی۔"

"کیا خبر نہیں ہوئی جھلی۔ تیرے سامنے کھڑا تجھ سے تیرا حال پوچھ رہا ہے اور کیا چاہیے؟"

"ہاں..... وہ تو ٹھیک ہے مگر..." وہ اپنی بے نور آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ یہ ماتا کی چھٹی حس تھی جو اسے تذبذب میں مبتلا کررہی تھی کہ شاہ عالم نظر آنے والا شاہ عالم کیوں نہیں ہے۔

جو ماں روزِ اوّل سے پیدائش تک اسے اپنی کوکھ میں رکھنے کا دکھ اٹھاتی ہے اور پھر پرورش کے لیے اپنی ممتا کے سوتوں سے حیات بخش دودھ کا امرت پلاتی ہے اور اسے بچّے سے جوان ہوتا دیکھنے کے طویل صبر آزما مراحل سے گزرتی ہے' وہ دھوکا کیسے کھاسکتی ہے۔ اس کی صرف آنکھیں بے نور ہوئی تھیں۔ احساس کی وہ روشنی کم نہیں ہوئی تھی جس سے وہ اپنے لہو کی خوشبو پہچان سکتی تھی لیکن وہ ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والے کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔

میں نے کہا "میاں جی۔ آپ کو یقیناً مجھ سے شکایت ہے کہ میں آپ کی طرف سے غافل ہوں۔ دنیا جہاں کے کاموں میں ایسا اُلجھ گیا ہوں کہ مجھے آپ کے پاس آکر بیٹھنے کی اور آپ سے باتیں کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔"

میاں جی نے ایک آہ بھری "ایسا تو ہوتا ہے بیٹا۔"

"لیکن ہونا تو نہیں چاہیے نا" میں نے کہا۔

"بہت کچھ ہے..... جو نہیں ہونا چاہیے مگر ہوتا ہے۔ اور ہونا چاہیے مگر نہیں ہوتا۔"

"مجھے افسوس ہے میاں جی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ماں جی' میں آپ سے بھی وعدہ کرتا ہوں۔"

خلافِ توقع وہ خوش نہیں ہوئیں۔ "اپنی دھی رانی کے پاس بھی ٹائم نہیں ہے ہمارے لیے۔ نوکروں کے سپرد کردیا ہے ہمیں۔"

میاں جی نے اسے ڈانٹا "چھوڑ..... مت کر ایسی باتیں۔ وہ آیا ہے تیرا حال پوچھنے اور تو بیٹھ گئی ہے بہو کا دکھڑا رونے۔"

"ہاں۔ ایک تو میں ساس ہوں اس لیے ویسے ہی بُری۔ پھر اندھی ہوں تو اور مصیبت..... بچّوں کی اسے ضرورت نہیں۔ اس کی آزادی میں فرق پڑتا ہے نا۔ چل کوئی بات نہیں۔ جب نصیب میں پوتے پوتیاں نہ ہوں تو..."

میاں جی نے اپنی حسرتوں کو دبا کے کہا "وہ بھی ہوجائیں گے بھلئی لوکے..... سب ایویں خافٹ نہیں ہوجاتا۔ بات یہ ہے پتر شاہ عالم کہ پہلے تو وقت ایسے گزر گیا ہے جیسے اُڑ گیا پر لگا کے۔ اور اب رُک گیا ہے تو دن سے رات نہیں ہوتی۔ وقت گزارنا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔"

میں نے میاں جی کے اور ماں جی کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا "فکر مت کریں سب ٹھیک ہوجائے گا بہت جلد۔ آپ کو کچھ چاہیے تو بتائیں؟"

میاں جی مسکرائے "کیا چاہنے سے سب مل جاتا ہے بے وقوف! اگر اوپر والا پوچھے تو ہم بتائیں۔ تجھ سے کیا کہیں۔"

میں نے کہا "میں پھر آؤں گا۔ کل یا پرسوں پھر تسلی سے بات کریں گے۔ ٹھیک..... ابھی تو مجھے جانا ہے۔"

"جا بھئی جا۔ رب راکھا" میاں جی نے محبت سے میرے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا تو ان کی آواز میں رقت تھی اور صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی پوری کوشش کررہے ہیں۔

ماں جی نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "تو..... شاہ عالم ہی ہے نا..... لگتا تو نہیں باتوں سے بھی..... بڑھاپے نے مت ماردی ہے۔"

"جوانی میں تو کون سی بڑی سیانی تھی" میاں جی بولے۔
میں سلام کر کے جلدی سے نکل آیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری جعلسازی پکڑی نہ جائے۔ ایک اندھی ماں صاف نہ کہہ دے کہ چل جھوٹے بے ایمان' تُو نہیں ہے میرا شاہ عالم۔ تو سونے کا بن کے آجائے پھر بھی میں اپنے مٹی جیسے بیٹے کی جگہ تیرے لیے دل کا دروازہ نہیں کھول سکتی۔ مجھے میاں جی کے آنسوؤں کا ڈر تھا جو بے قابو ہو جاتے تو میرے دل پر انگاروں کی طرح گرتے۔ ابھی شاید انہیں بھی سوچنا پڑے گا کہ یہ وہی شاہ عالم تھا۔ ویسا ہی تھا جیسا ہم چاہتے تھے کہ ہو۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ اچانک وہ اتنا اچھا بیٹا کیسے بن گیا۔ اللہ کرے وہ سب سچ ہو جائے جو میں نے دیکھا' سنا اور محسوس کیا۔

میں گیٹ تک پہنچا تو رات کے ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ پچیس منٹ پہلے میں نے خان جی کو فون کیا تھا۔ تین منٹ انتیس سیکنڈ گزرنے سے پہلے ہی چندا کا نمودار ہو جانا اتنا ہی یقینی تھا جتنا میرا ٹھیک وقت پر اس کے استقبال کے لیے باہر موجود ہونا۔ منشی نے بھی واپسی کے لیے یہی وقت دیا تھا۔ ڈاکٹر آغا اگر دس بجے کلینک سے روانہ ہوں تو ساڑھے دس بجے پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ایک ہی وقت میں اس گیٹ کے سامنے سب کی ملاقات ہو جائے' میں نے سوچا... تو کون زیادہ حیران ہوگا؟ رخشندہ مجھے اس طرح گیٹ پر دیکھ کے' چندا یہ جان کر کہ میں شاہ عالم ہوں اور خیر سے رخشندہ کا شوہر بھی... یا ڈاکٹر آغا یہ سوچ کر کہ رخشی نے ان سے کیوں جھوٹ بولا تھا۔ یہاں تو سب کی یادداشت اپنی جگہ پر ہے۔ کسی کی یادداشت کہیں نہیں گئی۔

ایک پتھر جیسی چیز میرے سر پر آکے لگی تو میں اُچھلا۔ مگر وہ پتھر نہیں انڈا تھا۔ اس کی زردی سفیدی میرے بالوں سے بہہ کر کالر کے راستے گردن پر پہنچ گئی۔ میں نے پلٹ کر ایک سائن بورڈ کے سائے کو دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں کرنل خان کی ٹریکٹر ٹائپ جیپ نظر آرہی تھی۔ میں نے سائن بورڈ کی اوٹ میں حرکت دیکھی اور پھر ایک سڑے ہوئے پلپلے ٹماٹر کو اپنی ناک اور پیشانی پر لگتے محسوس کیا۔

سڑک پر سے اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ میں نے دوڑ لگائی تو ایک کار والے نے زبردست بریک لگائے اور پھر خونخوار لہجے میں مجھے وہ گالی دی جس سے شجرۂ نسب ضرور خراب ہوتا ہے مگر غصے میں جو بھی کہا جائے قابلِ معافی ہے۔ میں نے سائن بورڈ کے پیچھے جاکے کہا "الو کی پٹھی۔"

چندا نے غرا کے کہا "تم نے گالی دی مجھے؟"
میں فوراً سنبھل گیا "نہیں۔ گالی تو نہیں' یہ تو بس پیار و محبت میں سلام دعا کا شریفانہ انداز تھا۔"
اس نے تیور بدل کے کہا "نہیں۔ تم نے گالی دی تھی۔"
"او کے۔ او کے' غنڈا گردی نہیں یہاں' آئی ایم سوری۔"

"مجھے انگریزی نہیں آتی۔"
"میں نے کہا کہ مجھے افسوس ہے۔ میں معافی مانگتا ہوں مگر تم نے بھی تو انڈے اور ٹماٹر مارے تھے۔"
"کچھ خدا کا خوف کرو۔ میں نے انڈا مارا تھا' انڈے نہیں۔ جھوٹ بولو گے تو شکل جلے ہوئے منہ والے لنگور جیسی ہو جائے گی اور اس سے تمہارا سر نہیں پھٹ گیا جو اتنی چیخ پکار مچا رکھی ہے۔ نقصان تو انڈے کا اور ٹماٹر کا ہوا نا۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ کیا ضرورت تھی اس کی آخر...؟"
"بس آملیٹ بنا رہی تھی میں اپنے لیے کہ خان جی نے حکم صادر فرما دیا کہ جاؤ اور اس گدھے کو لے آؤ۔ معلوم نہیں تم کو گدھا کیوں کہتے ہیں وہ۔ گدھے خاصا بُرا مانتے ہوں گے اس توہین پر۔ خیر مجھے آنا پڑا فوراً اور میں وہ ٹماٹر' انڈا اور پیاز ساتھ لے آئی کہ تم کھالو... پیاز ابھی باقی تھی..."
"تمہارا دماغ خراب ہے۔"
"کیوں؟ اچھا ہوا نا کہ تمہیں متوجہ کرنے کے لیے میرے پاس کچھ تھا ورنہ یہاں سے کوئی پتھر اٹھا کے مارنا پڑتا۔ خیر اپنے ایمان سے کہو' کیا زبردست نشانہ ہے میرا۔ انڈا تمہاری ناک پر نہیں لگا اور ٹماٹر ناک پر لگا۔"
میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کیا خیال ہے اب چلیں؟"
اس نے جیب سے پیاز نکال کے حسرت سے کہا "یہ تو رہ گیا' خیر چلو۔"
جیپ میں بیٹھنے کے بعد میں نے کہا "اچھا ہوا جو تم سو پیاز اور سو جوتے اپنے ساتھ نہیں لائی تھیں۔"
"تم یہاں کیا کر رہے تھے؟" اس نے کسی تھانے دار کی طرح سوال کیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔
"یہاں میں رہتا ہوں۔ اپنی بیوی رخشندہ کے ساتھ۔ یقین نہیں تو کچھ دیر انتظار کرلو' وہ آتی ہوگی۔"
"رخشندہ... اچھا نام ہے" چندا نے چہرے پر آجانے والے بال ہٹا کے کہا "تم اسے پیار سے کیا کہہ کے پکارتے ہو... رخشی!"
میں نے اسے چونک کے دیکھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"ہم دل کا حال جانتے ہیں بچہ جمورا۔ ڈبل رول صرف فلموں میں نہیں ہوتے۔ سیانے لوگ ڈپلی کیٹ چابی ضرور رکھتے ہیں کہ اصل نہ ہو تو کام آئے" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔
میں بھونچکا رہ گیا "یہ... کیا کہہ رہی ہو تم؟"
وہ میرے سوال کا جواب گول کر گئی "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ تم کاروبار کے چکر میں لندن گئے تھے لیکن ایسے تم کبھی واپس نہیں آئے۔ تن کے دو کپڑوں میں اور وہ بھی اپنے نہیں۔"
"چندا۔ یہ کیا چکر ہے؟"
"میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ یہ کیا چکر ہے۔" اس نے خفگی سے کہا "میں کوئی چکر نہیں چلاتی۔"

"یہ تم کس قسم کے سوالات کر رہی ہو؟ کیا تمہیں کسی نے فون کیا تھا؟"
"ہاں۔ ایک فون تو قمر نے کیا تھا۔ اسے چاکلیٹ کی بہت فکر تھی۔ تمہاری بالکل نہیں۔ دوسرا شاید چڑیا گھر سے آیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ وہ سور کا بچہ آیا ولایت سے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا اس کے لیے پنجرہ تیار ہو گیا ہے؟ ویسے یہ بڑی غلط بات ہوگی اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چڑیا گھر کے واسطے لندن سے سور کا بچہ آئے۔ ایک رانگ نمبر کی کال تھی..."
میں نے ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے سوئچ کو آف کر کے چابی نکال لی۔ انجن بند ہو گیا اور گاڑی کچھ فاصلہ طے کر کے رک گئی۔ "اب تم اِدھر آجاؤ۔ گاڑی میں چلاؤں گا۔"
چندا کھسک کے میری سیٹ پر آگئی۔ ڈرائیونگ میں نے سنبھال لی "تم اب پوری توجہ سے اور انہماک سے اپنی بک بک جاری رکھ سکتی ہو۔"
اس نے آہستہ سے کہا "سچ بتاؤ' تم نے مجھے مس کیا لندن میں؟"
میں ایک دم جذباتی ہو گیا "تمہاری قسم چندا۔ میری زندگی کا کوئی لمحہ تمہاری یاد سے خالی نہیں۔ جب میں رات کو سوتا تھا تو میرے خواب میں اور جب میں جاگتا تھا تو میرے خیالوں میں..."
"پر گر نگلتے ہوئے اور اشک نچوڑتے ہوئے" اس نے پھر بات کاٹ کے دردناک جذباتی لہجے میں کہنا شروع کیا "کوک کی ہر بوتل میں' بیئر اور وہسکی کے ہر جام میں۔ ہر ہوٹل اور نائٹ کلب میں... آہ چندا' میں تم کو کتنا مس کرتا تھا۔"
میں نے کہا "مذاق اڑالو مذاق میرے جذبات کا۔"
"تمہاری رگ رگ کو پہچانتی ہوں میں۔ کتنے بڑے ایکٹر اور ڈرامے باز ہو تم۔ ایک بار فون کرنے کا خیال تو آیا نہیں' ایسی مصروفیت تھی!"
میں نے سر کھجا کے کہا "چندا!... خدا کا شکر ادا کرو کہ میں جیسا گیا تھا ویسا ہی لوٹ آیا۔ خیر و عافیت کے ساتھ۔"
"کیا لندن میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں رکھنا چاہتے تھے گورے؟ کھال میں بھس بھر کے۔" چندا نے تشویش سے کہا "خیر اس میں بھی کوئی نقصان تو نہیں تھا۔ سب تاریخی جانور رکھے ہیں انہوں نے وہاں۔ لاکھوں لوگ تمہیں دیکھنے آتے۔ ٹکٹ لے کر۔ یہاں کوئی مفت میں بھی تمہاری شکل دیکھنے کا روادار نہیں۔"
میں نے کہا "میں جیپ ٹکرا دوں گا زمزمہ سے۔"
"کرنل خان کی جیپ کی ٹکر بھنگیوں کی توپ سے! کل یہ خبر آئے گی جناب۔ اپنے علامہ اقبال نے بھی کہا ہے۔ لڑا دے ممولے کو شہباز سے۔ یہ ممولہ کیا ہوتا ہے؟ اور یہ تم جا کہاں رہے ہو آخر؟ مجھے اغوا کرنا چاہتے ہو... ڈیری گڈ۔"
میں نے چلا کے کہا "شٹ اپ۔ اب بولیں تو دھکا دے دوں گا چلتی جیپ میں سے۔ میں قمر القسا سے ملوں گا پہلے۔"
"میں بھی وہیں لے جاتی تمہیں۔ مگر تم کو اعتباری نہیں ہے مجھ پر" اس نے منہ پھُلا کے کہا۔
قمر کا موڈ زیادہ خراب تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ چاکلیٹ کا پیکٹ دیکھتے ہی وہ ساری ناراضی بھول جائے گی۔ اسے چھیڑنے کے لیے میں نے کہا "سوری مس قمر القسا! اس بار مجھے خیال ہی نہیں رہا چاکلیٹ لانے کا۔"
اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "خیال نہیں آیا؟ بھائی یہ کیا کہہ رہے ہو؟"
"ہاں بھئی۔ کبھی ہو جاتا ہے ایسا۔ میں کاروبار کے سلسلے میں گیا تھا سیر تفریح کے لیے نہیں۔ صبح سے شام ہو جاتی تھی میٹنگ اور ملاقاتوں میں۔ میں تو بس معذرت کرنے آگیا۔"
"اس کی بھی کیا ضرورت تھی" قمر کا چہرہ اُتر گیا "بلکہ آپ واپس بھی نہ آتے تو کیا فرق پڑتا۔"
"بالکل۔ بالکل یہی میں نے بھی کہا تھا۔" چندا نے کہا "تمہاری جگہ میں ہوتی نا تو ایسی شرافت سے بات بھی نہ کرتی۔ میرا ردِعمل بہت خوفناک ہوتا۔"
"کیا کرتیں تم؟" میں نے کہا۔
"کم سے کم گولی ماردیتی ایسے شخص کو' جسے اپنوں کا خیال ہی نہ آئے۔ ایسی بھی کیا مصروفیت۔ اور مصروفیت کیا ہوئی' یہ کون نہیں جانتا۔ بس ہمارا منہ مت کھلواؤ۔ میٹنگ کس سے ہوتی تھی اور ملاقات کس سے...."
حالانکہ قمر سمجھتی تھی کہ چندا جلتی پر تیل چھڑکنا چاہتی ہے مگر اس نے میری وضاحت پر زیادہ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے رونے کی تیاری شروع کی "ٹھیک کہہ رہی ہو تم چندا بھابی..."
چندا ایسے اُچھلی جیسے کسی نے اسے ڈنک مار دیا ہو "کیا کہا... بھابی! مجھے سخت شک ہو رہا ہے اپنے کانوں پر... اور تمہارے دماغی توازن پر۔"
"دونوں ٹھیک ہیں چندا بھابی۔ یہ میرے بھائی ایسے ہی ہیں۔"
میں نے قہقہہ مار کے کہا "ایسی کی تیسی کس کی۔ بے وال کے بودم کی۔ یہ لو... اسی بات پر تمہارا انعام۔ تم نے ثابت کر دیا کہ ایک بہادر بھائی کی بہن کو کیسا ہونا چاہیے۔ اتنی بے خوفی سے ظالم حکمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے۔ میں بھی نہ آدم خور جن سے ڈرتا ہوں نہ کلیجا چبانے والی چڑیل سے۔ تو یہ ہلاکو خان کی پوتی کیا چیز ہے۔"
قمر چاکلیٹ کا پیکٹ دیکھ کے خوش ہو گئی "مجھے معلوم تھا۔ آپ سب کچھ بھول سکتے ہیں..."
چندا نے کہا "دیکھا تم نے اپنے بھائی کو۔ جھوٹ اور فریب کے فن میں طاق ہیں۔ ایسے ایکٹر اور ڈرامے باز ہیں کہ تم کیا چیز ہو۔ شیطان بھی کان پکڑتا ہے ان کے سامنے۔ میری بات چھوڑو'

تمہاری بھائی کہلانے سے بہتر ہوگا کہ میں کسی کنوئیں میں ڈوب کے مر جاؤں۔"

"او کے۔ میں تمہیں ایسے راستے سے گھر لے جاؤں گا آج جس پر ایک ویران کنواں ہے۔ ہمت نہ پڑے تو مجھے بتانا' میں دھکا دے دوں گا۔"

"یہ اس وقت ہوگا جب مرنے سے پہلے مجھ میں مارنے کا حوصلہ نہ رہے اور قمر' آئندہ مذاق میں بھی ایسی بات مت کرنا ورنہ میری اور تمہاری بات چیت بھی نہیں رہے گی۔" چندا نے سنجیدگی سے کہا اور باہر نکل گئی۔

قمر کا چہرہ اُتر گیا "بھائی۔ کیا واقعی اس نے بُرا مانا ہے؟"

میں نے کہا "بڑی ضدی لڑکی ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ مان جائے گی بالآخر۔ اب میں جا رہا ہوں۔"

"بھائی' میں سوری کہہ دوں چندا سے....؟"

"میں منا لوں گا اسے۔ یہ بتاؤ کاروبار تو ٹھیک جا رہا ہے نا۔ میں تیرے لیے بڑے اچھے آرڈر لایا ہوں' کل بتاؤں گا۔"

قمر نے پیکٹ کھول کے چاکلیٹ کھانی شروع کر دی تھی "یہ تو آپ پہلے کبھی نہیں لائے بھائی۔"

"ہاں بھئی۔ یہ میں چاکلینڈ سے لایا ہوں۔ وہاں کے بادشاہ نے مجھ سے خوش ہو کے کہا مانگ کیا مانگتا ہے اور پھر جواب سُنے بغیر حکم دیا کہ اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا جائے۔ سچ مچ ایسا ہو جاتا تو مس قمر کیا حال ہوتا میرا۔ حلق میں موتی پھنس جاتے۔ سانس رک جاتی۔ میں نے فوراً کہا کہ عالم پناہ' میرا منہ موتیوں سے مت بھریں۔ میری ایک پاگل بہن ہے' اس کا منہ ایسے چاکلیٹ سے بھر دیں جو آج تک کسی نے نہ کھائے ہوں۔ اس پر چاکلینڈ کے بادشاہ نے حکم دیا کہ سارے ملک سے بہترین چاکلیٹ بنانے والے حاضر کیے جائیں۔"

قمر ہنسنے لگی "جائیں بھائی' چندا غصے میں بھری بیٹھی ہوگی۔ کیا واقعی وہ آپ کو پسند نہیں کرتی؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لی "پسند تو کرتی ہے مگر میری بہن' اس کی کچھ ایسی شرائط ہیں جو فی الحال میں پوری نہیں کر سکتا۔"

"ایسی کیا شرائط ہیں؟"

"کوئی خاص نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ یہ ہیرا پھیری' ڈرامے بازی' چکر بازی سب چھوڑ دو اور انسان کے بچے بن جاؤ۔ اچھا شب بخیر۔"

چندا واقعی بہت ناراض تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا "چندا۔ یہ لڑکی قمر تو بے وقوف ہے۔"

"بے وقوف نہیں ہے۔ تم نے بے وقوف بنایا ہوگا اسے۔ تم نے پٹی پڑھائی ہوگی ورنہ اس کی مجال کہ میرے سامنے ایسی بدتمیزی کی بات کرے۔"

میں نے کہا "شکر اب اس نے گالی بھی نہیں دی تمہیں۔"

"مجھے گالی سے بُری لگتی ہے یہ بات" چندا نے بگڑ کے کہا۔

میں نے خود کو بہت بے عزت محسوس کیا "تم اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے چندا!"

"یہ کب کہا ہے میں نے کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ نفرت ہوتی تو میں بات ہی نہ کرتی تم سے۔"

"پھر یہ کیا ہے... اگر نفرت نہیں تو محبت کا اقرار کرلو۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ جس سے نفرت نہ ہو اس سے محبت ہو۔ تم اچھے آدمی ہو۔ تم میں بڑی صلاحیت ہے بہت اچھا آدمی بننے کی۔ اتنا اچھا آدمی جسے میرا ذہن قبول کرتا ہو۔ جیسا مجھے کوئی اور نہ نظر آئے۔ اور مجھے یہ احساس ہو کہ اسے میرے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ میں نے اسے گنوا دیا تو سب کچھ گنوا دوں گی۔"

"ابھی نہیں ہوں میں ایسا آدمی!" میں نے اسے نظر جما کے دیکھا۔

"سامنے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم کیا ہو۔ اور تمہیں کیا ہونا چاہیے۔ جیسا میں چاہتی ہوں ویسے بن جاؤ۔"

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں چندا!"

"بکواس فرماتے ہیں آپ۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس کی خاطر مرنا بننے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ میرا تو صرف اتنا کہنا ہے کہ انسان کے بچے بن جاؤ۔ تم اتنا بھی نہیں کر سکتے تو محبت کا دعویٰ کس منہ سے کرتے ہو۔ چلو اب موڈ ٹھیک کر لو ورنہ خان جی پوچھیں گے کہ کیا بات ہے اور مجھے جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ تمہارے لیے تو ایک سانس میں دس جھوٹ بولنا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔"

میں نے گاڑی کو گیٹ سے گزار کے پُرانی کوٹھی کے بائیں جانب والی پورچ میں روک لیا۔ چندا نے مجھے مسکرا کے دیکھا "رونی شکل مت بناؤ۔"

"جو حکم آپ کا" میں نے انگلیاں منہ میں ڈال کے دونوں باچھیں چیرتے ہوئے بتیسی کی نمائش کی "یہ مسکراہٹ چلے گی!"

خان اعظم کچھ مضطرب تھے اور اپنے کمرے میں ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔ میرے سلام کے جواب میں انہوں نے مجھے سینے سے لگایا "بہت دیر کر دی تم نے۔ تم سے پہلے ایک ملاقاتی پہنچ گیا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کون آ گیا اس وقت یہاں؟"

"امیر تیمور۔" خان جی نے کہا "میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"او مائی گاڈ!" میں نے بے اختیار کہا اور شولڈر بیگ نیچے رکھ کے صوفے پر گر گیا "اب میں کیا کروں خان جی!"

"پہلے مجھے بتا کہ مسئلہ کیا ہے؟"

میں نے چندا کی طرف دیکھا "آپ سے شریفانہ زبان میں درخواست کی جاتی ہے کہ یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

چندا فوراً دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی "کسی کے باپ کا گھر ہے جو مجھ سے ایسی بات کہے۔"

"خان جی۔ دیکھ لیں... اس نے پھر وہی بکواس کی۔" میں بھڑک اُٹھا۔

"اسے چھوڑ۔ اپنی کہہ" خان جی بولے "سمجھ لے کہ یہاں بس میں ہوں اور تو ہے۔"

میں اس بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ مجھ میں اور چندا میں کوئی فرق نہیں ہے اور ایسی کوئی بات نہیں جو مجھ سے اور چندا سے ایک ساتھ نہ کی جا سکے۔

میں نے کہا "خان جی۔ یہ اتنی آسان بات نہیں کہ دو جملوں میں ختم ہو جائے۔ پہلے میں امیر تیمور سے مل لوں۔"

انہوں نے سر ہلایا "ٹھیک ہے۔ جیسی تیری مرضی۔"

امیر تیمور' خان اعظم کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں صوفے پر شدید اضطرابی کیفیت میں سیدھا بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

میں نے کہا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اور کہاں جاتا۔ میرا تم سے ملنا بے حد ضروری تھا شاہ عالم۔"

"مہربانی کر کے یہ 'دھواں' اُگلنا چھوڑ دو۔ یہاں اس کی اجازت نہیں ہے مسٹر تیمور... اور یہ مت بھولو کہ میں ناصر عظیم ہوں۔"

وہ خفت سے ہنسا "میں نے دیکھ تو لیا تھا لکھا ہوا...."

"مگر اثر نہیں ہوا تم پر۔ اسی لیے مجھے کہنا پڑا۔"

اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ "تم بہت بے وقوف ہو ناصر عظیم۔"

"نہیں۔ تم نے کوشش کی تھی مجھے بے وقوف بنانے کی۔"

"وہاں سے اس طرح فرار ہو کے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے برہمی سے کہا "کیا یہ باتیں صبح تک ٹالی نہیں جا سکتی تھیں؟"

"میری رخشندہ سے بات ہو چکی ہے" اس نے کہا "اس نے روزی کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔ باقی دو افراد جو تمہارے خلاف گواہی دیں گے وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا ہوتا اگر میں نے انہیں بھی جان سے مار دیا ہوتا۔ میں نہیں ڈرتا ان کی گواہی سے۔ ان کا جو دل چاہے کہیں۔"

"تمہیں معلوم نہیں ہے لیکن وہاں ایک وڈیو کیمرا تھا۔ جو بھی تم نے کیا تھا وہ سب ریکارڈ ہو گیا ہے۔"

"وہ میں نہیں تھا' شاہ عالم تھا۔"

"شاہ عالم ملک میں نہیں ہے۔ تم رات بھر اس کی بیوی کے ساتھ سوتے رہے' دیکھ لینا اس کی فلم بھی" امیر تیمور نے کہا "تم اپنے خون آلود کپڑے بھی باتھ روم میں چھوڑ آئے ہو۔"

میرا دل ڈوبنے لگا لیکن میں نے کہا "پھر؟"

"بلڈ گروپ ٹیسٹ کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس عورت کے ہونٹوں اور دانتوں پر بھی خون جم گیا تھا۔"

"تیمور۔ میں پھانسی چڑھنے کے لیے تیار ہوں۔"

"فضول بات مت کرو۔ ابھی تم بڑی چالاکی سے رخشندہ کو بے وقوف بنا کے نکل آئے۔"

"نکل آنے کا کیا مطلب؟ کیا میں وہاں قیدی تھا!"

"الفاظ کچھ بھی استعمال کیے جائیں۔ مطلب واضح ہے اور ایک ہی ہے۔ تم اب شاہ عالم ہو' تم ناصر عظیم نہیں رہ سکتے۔ مجھے بار بار بلیک میل کرنے کی دھمکی دینا اچھا نہیں لگتا۔ تمہیں حقیقت کو بہادری اور عقلمندی کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔ تمہارے خلاف پہلے ہی بہت مواد اکٹھا کر چکے ہیں ہم" امیر تیمور نے کہا۔

"ہم کون... تم اور رخشندہ؟"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "ہاں۔ تم اس عورت کا مجھ سے موازنہ مت کرو۔ میں نے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اب تک۔ اچھا ہے اگر اس کی مداخلت کم سے کم ہو۔ عملی زندگی کے سنگین مسائل میں عورت کے جذباتی ردِعمل سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ناقابلِ تلافی نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ انکار کرنے کی پوزیشن میں تم پہلے بھی نہیں تھے اور اس وقت تمہارا ابھی رویّہ بے حد معقولیت پسندانہ تھا۔ اب بالکل کچھ نہیں ہو سکتا...."

میں نے اس وقت تک اپنے غصے پر قابو پا لیا تھا "دیکھو تیمور۔ میں نے یہ واضح کر دیا تھا کہ میں اپنے رشتوں سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ یہ گھر میرا ہے اور میرا رہے گا۔"

"اس سے کون انکار کرتا ہے... مگر..."

"تمہاری یہ اگر مگر نہیں چلے گی۔ میرا جب دل چاہے گا یہاں آؤں گا۔ ناصر عظیم بن کے۔ یہ لوگ کسی شاہ عالم کو نہیں جانتے۔ اور انہیں کیا ضرورت ہے اسے جاننے کی۔"

"تمہارے عدم تعاون کے اس مظاہرے سے نقصان صرف تم کو ہی نہیں ہوگا۔ تمہارے یہ رشتے بہت زیادہ متاثر ہوں گے۔ ابھی یہ بہت مقدس ہیں تمہارے لیے۔ پھر تم خود ان کے لیے باعثِ شرم ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "یہ سب تم پہلے بھی بتا چکے ہو۔"

"میرے بتانے میں اور رخشندہ کے سمجھانے میں جو فرق ہے۔ اس کو نظر انداز مت کرو۔"

تیمور ایک رحم دل اور شفیق پولیس مین کا کردار ادا کر رہا تھا جس نے جیل سے فرار ہونے والے مجرم کو تلاش کر لیا ہو۔ وہ اسے گن پوائنٹ پر گرفتار کر کے بھی لے جا سکتا ہو اور گولی بھی مار سکتا

ہو مگر یہ رعایت دے رہا ہوں کہ چلو اب تم جان ہتھیلی پر رکھ کے اپنے گھر پہنچ گئے ہو تو صبح تک مہلت ہے تمہیں۔ واپس جیل تو جانا ہی ہے تمہیں۔ تمہارا جرم اب پہلے سے زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔

میں نے پھر ہتھیار ڈال دیے۔ "میں یہ محسوس کرتا ہوں تیمور کہ تمہیں مجھ سے کیے ہوئے وعدے کا پاس نہیں ہے۔ میرے تعاون کی بنیاد ہی اعتماد پر تھی۔ میں نے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ HONEST رہو گے۔ کوئی جھوٹ نہیں بولو گے۔ مجھے اندھیرے میں نہیں رکھو گے کیونکہ میرے لیے یہ زندگی اور موت کا کھیل ہے جس میں تم نے مجھے میری مرضی کے خلاف دھکیلا ہے۔ بلیک میل کر کے۔ اگر تمہیں قتل کرنے سے مسئلہ ختم ہو جاتا تو میں اسی وقت تمہیں مار دیتا۔"

اس نے سر ہلایا "تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتے۔ ایک میں ہی تو تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارا مددگار، محافظ یا دوست۔"

"بکواس۔ تمہارے لیے میں ایک ریس کا گھوڑا ہوں جس پر تم نے اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اپنی تمام خواہشات اور حسرتیں داؤ پر لگا دی ہیں اور خود اس گھوڑے پر سوار ہو گئے ہو۔ تم خود تو گھوڑے کی جگہ نہیں دوڑ سکتے۔ گھوڑا ہار جائے تو اس پر رقم لگانے والے ڈوب جاتے ہیں مگر وہ دوڑنے پر آمادہ ہی نہ ہو تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔"

"مجھے یہ مثال پسند آئی۔"

"بہتر ہے کہ اس وقت تم جاؤ۔ گھوڑے کو آرام کرنے دو۔"

اس نے سر ہلایا "تم سے پھر کب ملاقات ہوگی اور کہاں؟"

میں نے کہا "مجھے ایک پورا دن اپنے لیے چاہیے۔"

اس نے گھڑی دیکھی "کل رات بارہ بجے یہ دن پورا ہو جائے گا!"

میں نے سوچ کے کہا "شاہ عالم کی واپسی کب تک متوقع ہے؟"

"ایک دو دن میں۔ لیکن اسے تین چار دن لگ جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تیمور۔ ابھی دو سوالوں کے جواب چاہئیں مجھے۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ پھر شاید وہ توقعات پوری نہ ہوں جو تم نے مجھ سے وابستہ کر لی ہیں۔ انہیں کوئی اور پورا نہیں کر سکتا۔ میری جیت میں تمہاری جیت ہے۔ لیکن میری جیت کے باوجود تم ہار سکتے ہو۔ تم نے مجھے بتایا کہ شاہ عالم نے تمہاری دوستی وفاداری اور جانثاری کا صلہ یہ دیا کہ تم سے بدگمان ہو گیا اور اب تم کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگا ہے۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو دُہرا نہیں سکتی؟ ہو سکتا ہے کہ میں زیادہ کمینہ ثابت ہو کے تمہارا بالکل ہی بیڑا غرق کر دوں۔"

اس کا چہرہ اتر گیا "مجھے تم سے یہ اُمید نہیں۔ تم شاہ عالم نہیں ہو۔"

"اپنی امیدوں کی زندگی کے لیے تم کو بھی ثابت کرنا ہوگا کہ تم ایک سچے مخلص اور بھروسے کے قابل شخص ہو۔"

"تمہارے دو سوال کیا ہیں؟" وہ مجھ سے نظر چُرا کے بولا۔

میں نے کہا "نظر ملا کے بات کرو۔ کیا اس خطرناک اور گھناؤنے کھیل میں رخشی بھی اپنی مرضی سے شریک ہے؟"

تیمور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا "ہاں۔ اس کی رضامندی اور شمولیت کے بغیر یہ ناممکن تھا۔"

"مگر تم نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ شاہ عالم کی بیوی رخشندہ ایسی عورت ہے جو ناصر عظیم کو بھی عملاً شوہر تسلیم کرے گی۔ کسی اخلاقی، قانونی یا شرعی جواز کے بغیر۔ مگر یہ بات میں نے خود ہی سمجھ لی اور آگے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ اس کا فیصلہ میں سوچ سمجھ کے کروں گا۔ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی شاہ عالم ملک سے باہر ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تم نے اسے مار دیا ہے یا رخشندہ نے۔ اب رخشندہ تمہیں استعمال کر رہی ہے اور تم رخشندہ کو متبادل شوہر اور شاہ عالم ثانی کے منصوبے کی کامیابی کا یقین دلا چکے ہو۔"

"تم اس موضوع پر رخشندہ سے بات کرنے کی غلطی مت کرنا۔"

"میری لگام ڈھیلی چھوڑ دو تیمور۔ اگر تم مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہو تو مجھ پر...... تم اپنی عقل کا چابک مت استعمال کرو۔ میرے پاس اپنی ذاتی عقل کا بھی خاصا اسٹاک ہے اور اس کی کوالٹی بھی اے ون ہے۔"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاہ عالم ملک سے باہر ضرور گیا تھا۔ جب وہ واپس آتا ہے تو میرے پاس نہیں آتا۔ وہ سیدھا اپنے گھر جاتا ہے۔ رخشندہ کو معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے۔"

"شاہ عالم کے سیکریٹری کو۔ پارٹی کے دوسرے عہدے داروں کو، ان میں تم بھی شامل ہو۔ اخبار والوں کو، کسی کو پتا نہیں چلتا؟ یہ لیڈر ٹائپ لوگ تو ایسی خبریں خود عام کرتے ہیں۔"

"شاہ عالم کے پیش نظر سیکیورٹی کا ایک سبب ہوتا ہے مگر جو زیادہ اہم ہے۔ وہ اپنی نجی مصروفیات کی رازداری ہے۔"

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کے زندہ یا مُردہ ہونے کے بارے میں کوئی بات صرف رخشندہ سے معلوم ہوگی۔"

"وہ تمہیں بتائے گی؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔"

"شاہ عالم کے سارے ملازم پُرانے ہیں مگر سیکریٹری کو اس نے نکال دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سیکریٹری جو گھر میں اس کے آفس کے معاملات کا ذمّے دار تھا۔ رخشندہ میں دلچسپی لینے لگا ہو۔ رخشندہ جیسی عورت کا دل بہت بڑا ہے اس میں ہر پرستار کے لیے جگہ نکل

آتی ہے۔"

"ایک مفروضے کی حد تک تم کچھ بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"رخشندہ اور تمہارے گٹھ جوڑ کے پیچھے بھی ناجائز مراسم کارفرما ہو سکتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم دونوں نے مل کے اسے مار دیا ہو۔ یا کہیں قید کر دیا ہو۔ متبادل انتظام ہونے یعنی مجھ سے اس سازش میں شرکت کی یقین دہانی حاصل نہ ہونے کی صورت میں تم اسے پھر سامنے لے آتے۔"

"میں نے کہا نا۔ تم مفروضات قائم کرنے میں آزاد ہو۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ نہ میرے رخشندہ سے ناجائز مراسم ہیں۔ نہ میں نے شاہ عالم کو قتل کیا۔ نہ قتل ہوتے دیکھا۔ نہ اسے قید میں ڈالا اور نہ مجھے ایسی کوئی بات معلوم ہے۔"

"لیکن یہ ممکن ہے؟"

"دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں۔ شاید رخشندہ تمہارے سب سوالات کے صحیح جوابات دے سکتی ہے مگر اس سے کچھ پوچھنا خطرناک ہوگا۔"

میں نے کہا "تم ایک عورت سے ڈرتے ہو؟ کیا ہے رخشندہ!"

"ایک عورت۔ اس سے تمہیں جذبات کے ساتھ نمٹنا چاہیے۔ عقل استعمال کرو گے تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔ جذبات کا کھیل عقل کے ساتھ کھیلو۔"

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر میں نے گھڑی دیکھی "اوکے تیمور۔ کل رات بارہ بجے پھر ملیں گے۔"

"کہاں؟" تیمور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گا۔ کل تک تم رخشندہ کے ساتھ مل کے باقی معاملات کو ٹھیک کر لو گے، مجھے اُمید ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔

جب کرنل خان اندر آئے تو میں صوفے پر کسی بے جان مجسّمے یا ایک تصویر کی طرح بیٹھا تھا جس کو "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" کا عنوان دیا جا سکتا تھا۔

میں نے کہا "خان جی۔ میں دھوبی کا کتّا ہوں یا کاٹھ کا اُلّو۔"

انہوں نے کہا "صبح دیکھیں گے کون کیا ہے۔ ابھی تو سب کچھ بھول کے سو جا۔ دماغ سے سارے فاسد خیالات کو نکال دے۔"

"میں بڑی مشکل میں ہوں۔"

"ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے بالآخر۔ اگر عقل کی روشنی میں راستہ صاف نظر آتا ہو۔ ذہن میں دُھند ہو تو روشنی بھی دھندلا جاتی ہے۔ چل اُٹھ، میرے ساتھ آ۔" خان اعظم نے کہا اور میں نے ان کی طرف دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں اجنبی راستوں کی بھیڑ میں کھو جانے والا بچہ ہوں۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور وہ مجھے میری خواب گاہ تک لے گئے۔

چندا نے لباس بدل لیا تھا۔ وہ میرے لیے گرم دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھی۔ کسی مزاحمت کے بغیر میں نے گلاس لے کر ایک گھونٹ لیا۔

"یہ کیا ہے۔ کیا ملایا ہے اس میں؟" میں نے کہا۔

"سنکھیا۔ نیلا تھوتھا اور سائنائیڈ۔" وہ بولی "پی جاؤ، تم مرو گے نہیں۔"

دودھ میں ایک انڈا پھینٹ کر ملایا گیا تھا اور بادام تھے۔ چندا کا اعتقاد تھا کہ میری تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیت اسی مکسچر کے سبب سے ہے۔ اس کی زنانہ منطق یا خوش فہمی کا علاج نہ حکیم لقمان کے پاس تھا اور نہ کرنل خان کے پاس۔

میں لیٹ گیا تو خان اعظم نے کہا "اپنی آنکھیں بند کر جے ورے۔ مٹھیاں کھول دے۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑ دے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ اس کمرے کی دیواریں کتنی شفاف ہیں اور اس کی چھت نہیں ہے۔ اوپر تو کھلے آسمان کو دیکھ سکتا ہے نا۔ آدھا چاند اور اتنے بہت سے ستارے بھی نظر آ رہے ہیں۔ ان شفاف دیواروں کا بھی کوئی وجود نہیں۔ یہ صرف ہوا ہے، تازہ اور خنک۔ اس میں پرواز کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ میرا ہاتھ تھامے رہنا۔ کیا اب تو نیچے دیکھ سکتا ہے، یہ دریا ہے۔ دریائے راوی اور اس کے ساتھ جہانگیر کا مقبرہ۔ کتنا سکون ہے یہاں۔ سکون اور سکوت.... مکمل خاموشی.... اور اندھیرا۔"

میں سب کچھ سُن اور دیکھ رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ میں ہلکا ہو کے کسی بادل کی طرح اُڑنے لگا۔ میرا جسم وہیں ساکت رہا۔ میری آنکھوں میں بے خواب نیند اُتر آئی۔ پُرسکون.... گہری نیند۔

صبح میری آنکھ نو بجے کھلی۔ خان جی نے میرے دماغ میں نو بجے کا الارم سیٹ کیا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے میں ٹیلی فون کی گھنٹی سن کے جاگا ہوں۔ فون تکیے پر میرے کان کے ساتھ رکھا ہوا تھا اور اس کی گھنٹی بھی پورے والیوم کے ساتھ بج رہی تھی۔

چندا نے دروازے کی اوٹ سے ڈانٹ کے کہا "بہرے ہو گئے ہو کیا؟ تکیے پر فون رکھا ہے پھر بھی سُنائی نہیں دیتا کچھ۔ ایسا لگتا ہے کہ دماغ کا کچھ بھوسا کان میں بھر گیا ہے۔"

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ گزشتہ رات سوتے وقت اس کمرے میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ میں نے کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے میرے کانوں میں گانے کی آواز آئی "تری گٹھری کو لاگا چور مسافر جاگ ذرا۔"

یہ گانا کے سی ڈے یا آر سی بورال کا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل کے ایسے بہت سے گانے کرنل خان کی میوزک لائبریری کا حصہ تھے۔

"کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟" چندا نے اندر جھانک کے کہا۔

"تمہارے باپ کا؟" میں نے ریسیور رکھا اور پھر اُٹھایا تو ریکارڈ کی سوئی ایک جگہ اٹک گئی تھی۔ جاگ ذرا، جاگ ذرا.... جاگ ذرا۔

"میں بلاتی ہوں انہیں" اس نے دروازے کی طرف منہ کرکے ہانک لگائی "آپ کا فون ہے خان بابا!"

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی اور دوڑ کے باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے باہر سے چندا کے چیخنے کی اور پھر خان جی کی آواز سنی۔

"کس کا فون تھا میرے لیے؟"

"وہ لائن کٹ گئی خان بابا!" چندا نے سعادت مندی سے کہا۔

اس وقت میں شاور کھول کے کھڑا تھا اور بہ آواز بلند گاتے ہوئے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ میں نہا بھی رہا ہوں۔ "آج اک دن ہماری بھی دال گلے گی۔۔۔" پھر میں نے سوچا کہ اب باتھ روم تک پہنچ گیا ہوں تو نہا بھی لوں۔

ناشتے کے بعد میں نے خان جی کو سب کچھ بتا دیا۔ میں بولتا رہا اور وہ سنتے رہے۔ خلوت کدے کی پُرسکوت اور پُرتحفظ' ہمدرد' ہمراز فضا میں بڑا سکون تھا۔ خان جی نے مجھے ایک بار بھی نہیں ٹوکا۔ میری بات نہیں کاٹی۔ نہ مجھ سے کوئی سوال کیا اور نہ کسی ردِعمل کا اظہار۔ ان کا چہرہ جذبات سے عاری اور سپاٹ رہا۔ انہوں نے معمول کے مطابق بے داغ سفید کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ نفاست سے تراشی ہوئی گھنی سفید داڑھی۔ برف کی سفیدی والے ہموار بالوں اور سفید ٹوپی میں دوزانو بیٹھے ہوئے خان جی کی شخصیت کے گرد روحانیت کا پُرتقدس ہالہ سا محسوس ہوتا تھا۔ ان کے چہرے پر طمانیت اور قناعت' خیال کی پاکیزگی اور طہارت کا اُجالا تھا۔ قلندرانہ استغنا کا جلال تھا تو صوفیانہ استغراق کا جمال۔ ان کی یہ مافوق الفطرت نظر آنے والی پُراسراریت اپنے اندر ایک ایسی غیر مرئی طاقت رکھتی تھی کہ جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم۔ فولاد کے دل جس سے پگھل جائیں وہ طوفان۔

انہوں نے ہی میری منتشر زندگی کے پریشان اوراق سمیٹ کر مجھے جینے کا سلیقہ سکھایا تھا۔ مجھے احساس دلایا تھا کہ عمرِ رفتہ کی ناکامیوں' لغزشوں اور خرابیوں پر دُکھی ہوکے آنسو بہانے' پچھتانے اور احساسِ زیاں پر دکھی ہونے کے بجائے مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ عمرِ رفتہ کے ان تجربات کی روشنی میں مستقبل کی کامیابی کا راستہ بنانا بہت آسان ہوگیا ہے۔ جو آدمی ایک بار ڈوبنے سے بچ جائے وہ ساحل پر بیٹھ کے روتا رہے تو احمق مگر تیرنا سیکھ لے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس نے تجربے سے کچھ سیکھا۔ عمر کا کوئی تجربہ کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ جو لوگ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں' ان کی پرورش کرنے والے ہر قدم پر انہیں راہنمائی اور سہارا فراہم کرتے ہیں۔ آیائیں' گورنس' ٹیچر اور ٹیوٹر۔ بہترین درس گاہیں اور اعلیٰ سوسائٹی کا مہذب ماحول۔ خدمت گار اور ہر خواہش پوری کرنے والے والدین کے وسائل۔ کیا ان سے غلطی نہیں ہوتی۔ کیا وہ خطاکار نہیں ہوتے۔ ان سے کوئی گناہ یا جرم سرزد نہیں ہوتا۔ غریب کا بچہ احساسِ محرومی سے بگڑتا ہے تو بڑے بڑے رئیسوں کی اولاد کو دولت کی فراوانی بگاڑ دیتی ہے۔

خان جی نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا تھا اور مجھے مثبت سوچ کی خوداعتمادی عطا کی تھی۔ انہی کی بدولت میں نے خود کو ذلت و رسوائی کی پستی میں مزید گرنے سے روکا تھا اور پھر بلندی کی جانب قدم بڑھانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ بات میں ان سے کہتا تھا کہ خان جی آپ تو مداری ہیں جس نے ایک کوئلے کو اٹھا کے ہیرا بنا دیا تو وہ ہاتھ جوڑ کے کہتے تھے کہ بچّہ جمہورا۔ میں تو بڑا عاجز بندہ ہوں اس قادرِ مطلق کا جو سب سے بڑا ہے۔ اپنے دستِ غیب سے اتنی بڑی کائنات کو تخلیق کرنے والا اور اسے انتہائی خوبی سے قائم رکھنے والا اور توازن کے ساتھ چلانے والا۔ زمین کے ایک ذرّے سے آفتاب تک ستاروں اور سیاروں تک سب کو اسی کے اشارے پر وجود اور فنا ہے۔ جب وہ چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ ہوجاتا ہے۔ خواہ اس کا وسیلہ میرے جیسا بے ہنر ہو۔

جب میری بات تمام ہوگئی تو خاموشی کا ایک وقفہ آیا جو مجھے بہت طویل لگا۔ خان جی کی آنکھیں خلا میں دیکھتی رہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کا جسم میرے سامنے رہ گیا ہے۔ ان کی روح یا ان کا ذہن میرے سارے مسائل کے ساتھ کسی غیر موجود۔ برتر و عظیم ہستی سے راہنمائی حاصل کرنے گیا ہوا ہے۔

بالآخر انہوں نے میری طرف دیکھا "تُو سب کچھ کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں کیا کرسکتا ہوں خان جی۔ کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

"یہ مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔ کیا تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تُو کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس چکر میں مت پڑ کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ تو وہی کر جو چاہتا ہے۔"

"جو میں چاہتا ہوں۔ کیا وہ صحیح ہے؟"

وہ مسکرائے "اس کا فیصلہ کون کرسکتا ہے۔ جو تیرے نزدیک غلط ہے وہ میرے لیے صحیح ہوسکتا ہے اور جو میں صحیح سمجھوں اسے کوئی اور غلط کہے۔"

"مجھے اس کے سوا اپنے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ میں تیمور کی بات مان لوں۔"

"یہ بھی تو اس لیے کہہ رہا ہے کہ تُو بچنا نہیں چاہتا۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "میں جانتا ہوں کہ یہ بہت خطرناک کام ہے لیکن خطرات ہر صورت میں میرا تعاقب کریں گے پھر بھاگنے کے بجائے میں مقابلہ کیوں نہ کروں؟"

"بالکل ٹھیک۔ بھاگنے والا ٹھوکر کھا کے گرسکتا ہے۔ اس کے لیے اچانک فرار کے راستے بند ہوسکتے ہیں۔ وہ ہمت ہار سکتا ہے۔ محصور ہوسکتا ہے اور جان بچا کے نکل جائے تب بھی یہ احساس تو رہتا ہے کہ وہ کم ہمت ہے اور بزدل ہے۔"

"گویا آپ کی حمایت اور تائید حاصل ہے مجھے۔ آپ کی مدد کے بغیر شاید میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

انہوں نے نفی میں سرہلایا "میں کیا اور میری حمایت اور تائید کیا۔ ہر جگہ ہر وقت تیرے ساتھ تو وہی ہے" انہوں نے ایک انگلی اوپر اٹھا دی۔

"مجھے ایک سال دُہری زندگی گزارنی ہوگی۔ ساری دنیا کے لیے میں شاہ عالم بن جاؤں پھر بھی آپ کے لیے تو ناصر عظیم ہی رہوں گا۔ میں آپ سب سے اپنے پُرانے رشتے اسی طرح برقرار رکھنا چاہتا ہوں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ لوگ کسی مشکل میں پڑیں۔"

"بے وقوفی کی بات مت کر۔ کوئی کسی کی وجہ سے مشکل میں نہیں پڑتا۔ رہی بات رشتوں کی' تو انہیں نبھانا ہی اصل آزمائش ہے۔"

"یہ رشتے میرے لیے اتنے ہی محترم اور مقدس رہیں گے خان جی' جتنے آج ہیں۔ میں آپ کے لیے بچّہ جمہورا ہی رہنا چاہتا ہوں۔ قمر کے لیے بھائی' اس لیے نہیں کہ اس کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں یا اسے میرے تحفظ کے بغیر جینا مشکل ہوگا۔ ضرورت مجھے ہے ایک بہن کے پیار کی' مجھے ماں کا پیار تو میسر ہی نہیں ہوا۔ باپ کی جگہ آپ ہیں اور اگر میں کہوں کہ بھائی کی کمی کو کمال فاروقی پورا کرتا ہے تو غلط نہیں۔ آج میرا اپنا ایک پورا خاندان ہے۔ کوئی وزیراعظم ہو جائے یا سکندرِاعظم۔ اپنے گھر میں تو وہی رہتا ہے۔ بیٹا یا بھائی تو کسی کا چاچا یا ماما۔"

"جمہورے' وزیراعظم یا سکندرِاعظم بننا آدمی کی معراج تو نہیں ہے۔ آدمی اگر انسان بن جائے تو سمجھو اس نے عبادت اور عبودیت کا حق ادا کردیا۔ فرشتے سے مشکل ہے انسان ہونا۔"

"میں مانتا ہوں۔۔۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ پہلے اپنی خواہش سے تھا' اب حالات سے ہوں۔"

انہوں نے سرہلایا "میں تیری تقدیر کی بات نہیں کرتا۔ اس ملک کی تقدیر ایسی ہی ہے۔ اب یہاں وزیراعظم بنتے نہیں' بنائے جاتے ہیں ہم اس معاملے میں مجبور ہیں۔"

"لوگ کیوں مجبور ہیں؟"

"جب طاقت اور اختیار نہ ہو تو پھر مجبوری ہوتی ہے۔ اب تو پوچھے گا کہ طاقت اور اختیار تو ہے۔ ملک میں آئین بھی ہے اور قانون بھی ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور بھی ہے۔ یہ انسان کی طاقت نہیں ہے ناصر' انسان کی طاقت ہے اس کی نیت اور اس کا ارادہ۔ جب یہ دونوں ٹھیک نہ ہوں تو پھر وہ مجبور اور بے بس ہوتا ہے۔ وہ بزدل' خود غرض' لالچی' بے ضمیر اور بے کردار ہو جاتا ہے۔ اس ملک کے کروڑوں لوگ خود اپنی طاقت اور اپنے اختیار سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اب وہ ایک ریوڑ ہیں۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہو انہیں جدھر چاہے ہانک لے جائے لوگ خاموشی سے سب دیکھتے رہتے ہیں اور تسلیم بھی کرلیتے ہیں کہ اب یہی حقیقت ہے اور سچ ہے اس لیے صحیح ہے۔ عوام ایک اندھیرے سینما ہال میں بیٹھے

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

ہوئے تماشائی ہیں۔ ان کے سامنے اسکرین پر جو فلم چل رہی ہو' جب تک وہ اندھیرے سے باہر نہ آئیں' اسی کو اپنی زندگی کی کہانی سمجھتے رہتے ہیں۔ اسی میں کھوئے رہتے ہیں۔"

"وہ اندھیرے سے باہر کب آئیں گے' یہ کون سوچے گا؟"

"جو باہر ہیں وہ سوچتے رہتے ہیں۔ فلم کے پروڈیوسر' ڈائریکٹر اور ایکٹر۔ سب سوچتے رہتے ہیں کہ آخر یہ فلم کب تک چلے گی۔ لوگ کب تک واہ واہ کریں گے۔ وہ دوسری فلم شروع کردیتے ہیں اور لوگوں کو پھر اندھیرے میں بٹھا دیتے ہیں۔ فلم کے بعد فلم چلتی رہتی ہے۔ ہر فلم میں وہی لوگ ہوتے ہیں' وہی کہانی ہوتی ہے۔ وہی محمد علی اور ندیم' شبنم یا زیبا۔ وہی سلطان راہی یا رنگیلا۔ ڈائریکٹر' پروڈیوسر سب وہی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ فلم کو زندگی اور زندگی کو فلم سمجھنے لگ گئے ہیں اور یہی بات تیرے حق میں جاتی ہے۔"

میں نے چونک کے کہا "میرے حق میں کیسے جاتی ہے یہ بات؟"

"دیکھ جمہورے۔ اگر یہاں کوئی نظام ہوتا۔ بے عیب نظام کوئی نہیں مگر پھر بھی نظام ضروری ہوتا ہے۔ خواہ معاملہ ایک گھر کو چلانے کا ہو یا ایک ملک کو چلانے کا' اور یہ نظام انہی اصولوں کے مطابق ہوتا جو قانون کی کتابوں میں یا آئین میں درج ہیں اگر تو برطانیہ کا وزیراعظم منتخب ہونا چاہتا تو تیرے چاہنے سے کچھ نہ ہوتا۔ لیکن یہاں اگر کچھ لوگ تجھے وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں تو بن جا۔ اس ایک سال میں وزیراعظم کے عہدے میں پانچ بار تبدیلی آئی جسے یا چاہے وہی سائیں۔ منتخب نمائندے کی بات چھوڑ۔ وزیراعظم وہ بن سکتا ہے جس کے پاس اس ملک کی قومیت اور شہریت تک نہ ہو۔ تو پھر تُو کیوں نہیں بن سکتا۔"

میں نے خوش ہوکے کہا "گویا آپ تائید کرتے ہیں۔۔۔"

"میری تائید کی تجھے کیا ضرورت ہے جمورے" خان جی نے کہا "تُو بننا چاہتا ہے اور کوئی بنانا چاہتا ہے تو میں کون۔ ایک بے وقوف بننا چاہتا ہے اور دوسرا بنانا چاہتا ہے۔ ایک فلم بنانا چاہتا ہے اور دوسرا ہیرو بننا چاہتا ہے تو کیا وہ لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہے۔ ریفرنڈم کراتا ہے کہ لوگو! مجھے بتاؤ' کیا میں فلم بناؤں اور کیا میں ہیرو بن جاؤں؟"

"خان جی۔ یہ معاملہ مختلف ہے۔"

"کیسے مختلف ہے۔ وہ جو شیکسپیئر نے کہا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹرز۔ اسی کو غالب نے کیسے کہا تھا۔ گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب۔"

میں نے کہا "آپ یہ تو بتا سکتے ہیں مجھے کہ میرا یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔ اس میں میرا فائدہ ہے یا نقصان۔"

"اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔ کاروبار کوئی بھی ہو۔ نفع نقصان کا پتا بعد میں چلتا ہے۔ رہی بات صحیح اور غلط کی تو یہ بڑی RELATIVE اصطلاح ہے۔ کب کہاں کس کے لیے۔ کن حالات میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔"

"آپ مجھے فلسفے کی مار دے رہے ہیں۔ راہنمائی نہیں کر رہے ہیں۔ صاف نہیں بتاتے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تو نے میرے پاس آنے سے پہلے زندگی میں کیا نہیں کیا تھا؟"

"میں نے جو بھی کیا تھا اچھا بہرحال نہیں تھا۔"

خان جی نے کہا "نہیں۔ یہ تو آج کہہ رہا ہے۔ کیا اچھا ہے کیا بُرا ہے' اس کا فیصلہ بھی خود تو نے کیا مگر بعد میں.... تجربے کے بعد.... اس کے نتائج سامنے آجانے کے بعد۔ اس وقت جب تو کچھ کرنے جا رہا تھا' تیرا یہ فیصلہ ہوتا کہ یہ غلط ہے اور تجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر اختیار حاصل ہوتا تو شاید تو وہ کام نہ کرتا۔ تجربہ کتاب زندگی کا ایک سبق ہے اور یہ ناممکن ہے کہ تو ایک سبق چھوڑ دے اور اس سے اگلا سبق پڑھے۔ یہ ایسی ہی پاگل پن کی بات ہوگی جیسے کوئی نجومی کے کہنے پر فیصلہ کرے کہ آنے والا سال سخت منحوس ہوگا چنانچہ میں اس کو اپنی زندگی سے خارج کرتا ہوں۔ اس سے اگلا سال گزاروں گا۔ یہ انگریز قوم تیرہ کے ہندسے کو منحوس سمجھتی ہے۔ بہت سے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں تیرہویں منزل نہیں ہوتی۔ بارہ کے بعد لفٹ میں چودہ کا عدد روشن ہو جاتا ہے مگر کیا اس سے تیرہویں منزل کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "آپ کا مطلب ہے کہ سب نوشتہ تقدیر ہے اور میں مجبور ہوں۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی زندگی خود جیتا ہے۔ زندگی میں پہلے بھی بہت سے فیصلے تو نے کسی اور کی تائید و حمایت پر بھروسا کرتے ہوئے نہیں کیے تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مددگار صرف خدا ہوتا ہے۔ کوئی کسی کے ساتھ یا کسی کے لیے مرتا جیتا نہیں۔ فنا اور بقا کی راہ پر ہر مسافر اکیلا ہے۔"

میں نے خفگی سے کہا "یعنی مجھے مدد کی ضرورت پڑے گی تو آپ میرے لیے کچھ نہیں کریں گے۔"

"اگر موقع ملا تو ہم سب تیری مشکل آسان کرنے کے لیے ہر مشکل کا سامنا کرنے ہر جگہ موجود ہوں گے۔ لیکن دن کے چوبیس گھنٹے کے ہر لمحے میں صرف خدا ہی تیرے ساتھ ہوگا۔ ساری بات وقت کی ہے اور موقع کی ہے۔ فرض کر آج تو ابھی فیصلہ کر لیتا ہے تیمور کا ساتھ نہ دینے کا۔ پھر ہم سب کے سامنے ایک ہی مسئلہ ہوگا۔ تیرے لیے انکار کرنا آسان نہیں ہوگا۔ تیمور تجھے بلیک میل کرنے کے سارے حربے آزمائے گا۔ تو یہ کر سکتا ہے کہ روپوش ہو جائے۔ سال چھ مہینے کے لیے بالکل ہی غائب ہو جائے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اب تیمور کے بلیک میل کرے گا لیکن تیمور وہی کرے گا جو اسے کرنا ہے۔ وہ تیری مجبوری کو اپنی شہ زوری بنائے گا۔ تیری بہت سی مجبوریاں ہیں۔ میں ہوں اور چندا ہے۔ قمر ہے اور کمال ہے۔ پولیس کسی ملزم کو برآمد کرنے کے لیے کیا کرتی ہے؟ اس کی بیوی' بیٹی یا بہن کو اٹھا لیتی ہے۔ بوڑھے باپ یا ماں کو پکڑ لیتی ہے پھر ملزم خود تھانے میں حاضر ہو جاتا ہے۔ ہم موجود ہیں تو پھر تو کہاں جا سکتا ہے جسور ہے۔ کیا یہ ممکن ہے تیرے لیے کہ وہ ثریا چندا میں سے کسی ایک کو اٹھا کر لے جائیں اور تو پھر بھی جان بچانے کے لیے روپوش رہے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "گویا میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔"

"راستے انہوں نے بہت پہلے سے بند کرنے شروع کر دیے تھے لیکن تجھے پتا ہی نہیں چلا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ کوئی بھی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ تیمور نے تیرے خلاف کتنے ثبوت اکٹھے کر لیے جو تجھے پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے بھی کافی ہیں۔ خود تجھے یہ معلوم نہیں کہ تو کہاں جا کے کیا کر رہا تھا۔ تیرا نام ہر جگہ استعمال ہوا۔ تجھے موقع ہی نہیں ملا تردید کا۔ یہ کہنے کا کہ میں ناصر عظیم ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ وہ شاہ عالم تھا لیکن تیرے خلاف دستاویزی ثبوت ہیں۔ گواہ اور شہادتیں موجود ہیں۔ آڈیو اور وڈیو کیسٹ ہیں۔ اب میں یا کوئی اور تیری کیا مدد کرتا یا کیسے مدد کرتا جو ہونا تھا ہوتا رہا اور ہو گیا۔ آگے کیا ہوگا' یہ بھی کسی کو معلوم نہیں۔ تو بھی نہیں جانتا۔ اپنے آپ پر اور خدا پر بھروسا رکھ۔ جیسے تو اپنی جان کو ہم سب کے رشتے سے زیادہ عزیز نہیں جانتا۔ ایسے ہی ہم سب کو موقع ملے تو کوئی بھی ایسا نہیں کہ تیری جان بچانے کے لیے خود جان دینے سے گریز کرے۔ یہ خیال تو تیرے ذہن میں آنا بھی نہیں چاہیے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں خان اعظم!" میں نے کہا "وہ وقت جب میں اپنے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ گزر گیا اور بہت کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بس مجھے پتا نہیں چلا اور اب وقت کا پہیہ اُلٹا نہیں گھمایا جا سکتا کہ اسے UN DONE کر دیا جائے۔ آگے جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا چنانچہ مجھے اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ مجھے اس کا پہلے سے علم ہو گیا۔ اب میں سوچ سکتا ہوں' پلان کر سکتا ہوں اور آپ سب سے مشورہ کر سکتا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر آپ کو مدد کے لیے کہہ سکتا ہوں اور ان سب باتوں سے اہم بات یہ ہے کہ جو کچھ ہوا وہ بھی آپ کے علم میں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور آپ کو بتا کے مجھے بلیک میل کرتا' میں نے خود آپ کے سامنے سارے حقائق رکھ دیے۔ میں چندا سے اور کمال سے بھی کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اس طرح نہ میں ان کی نظر سے گروں گا اور نہ اپنی نظر سے۔ وہ سمجھ لیں گے کہ میں نے نہ پہلے کچھ اپنی مرضی سے کیا تھا۔ بلکہ وہ شاہ عالم نے کیا تھا۔ ناصر عظیم کو بدنام کرنے کے لیے۔ اور آئندہ جو مجھے کرنا پڑے گا' وہ میری مجبوری ہے۔"

خان جی نے کہا "آج صبح ایک تحفہ دے گیا تھا کوئی۔ تیرے لیے۔"

میں نے چونک کے کہا "کیا دے گیا تھا' کوئی ٹائم بم....؟"

خان جی مسکرائے "وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہو سکتی ہے۔"

"کون لایا تھا یہ تحفہ؟"

"میں نے اسے دیکھا نہیں۔ وہ رات کو یا صبح کسی وقت یہ تحفہ میرے لیے دروازے پر چھوڑ گیا۔ وہ تیرے کمرے کی الماری میں کتابوں کے درمیان رکھا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "آخر کیا چیز تھی وہ؟"

"ایک وڈیو کیسٹ.... تھا.... کھلے براؤن لفافے میں.... کیسٹ پر لکھا تھا "شاہ عالم کے لیے۔"

"اور.... آپ نے دیکھا.... کیا ہے اس میں؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا.... "لیکن اب میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس میں کیا ہوگا.... تو دیکھ لے۔"

وڈیو کیسٹ مجھے آسانی سے مل گیا۔ خان جی نے اسے یوں رکھا تھا کہ کسی اور کو ایک نظر میں دکھائی نہ دے۔ میری کتابوں کے ذخیرے کو چندا کے سوا دیکھنے والا اس گھر میں کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ خان جی کا ذوق بالکل الگ تھا۔ وہ بڑے سنجیدہ اور خشک موضوعات پر انگریزی میں شائع ہونے والی ایسی کتابیں لاتے تھے جن کو میں "بھیانک" کہتا تھا۔ تاریخ پر تحقیق۔ معاشی اور سیاسی تجزیے یا سماجی مسائل کا فلسفیانہ جائزہ۔ مجھے ان میں دلچسپی ضرور تھی مگر ایسی ضخیم اور ثقیل کتابوں کے چند صفحے پڑھ کے میرا سر گھومنے لگتا تھا۔ میرا ذوق صرف ادبی تھا اور ادب میں بھی فکشن اور شاعری تک محدود تھا۔ میں خود بہت کم کوئی کتاب خرید کے لاتا تھا۔ نئی کتاب فوراً غائب ہو جاتی تھی۔

میں چندا سے پوچھتا تھا "کل میں ایک کتاب لایا تھا' تم نے دیکھی؟"

وہ صاف انکار کر دیتی "نہیں۔ میں واہیات کتابوں سے.... اور ایسی کتابیں پڑھنے والوں سے دور رہتی ہوں۔"

"آپ شوق سے جتنا دور چاہیں رہیں۔ مگر کتاب مجھے واپس کر دیں۔ ابھی میں نے آدھی پڑھی ہے۔"

"باقی آدھی مت پڑھیں۔ اس سے آپ کا کوئی بھلا نہیں ہوگا۔ میں بتا دوں گی اس میں کیا ہے؟"

"مگر ابھی تم نے کہا تھا کہ تم نے کتاب نہیں دیکھی؟"

"کتاب کیا دیکھنے کی چیز ہے۔" وہ مجھے ڈانٹ کر کہتی "کوئی تصویر ہے کہ بس دیکھ لی۔ تم کو پوچھنا چاہیے تھا کہ تم نے کتاب پڑھی۔ تو میں بتاتی کہ پڑھ رہی ہوں ابھی۔ بائی دا وے' تمہیں پروین شاکر کی شاعری اچھی لگتی ہے یا خود پروین شاکر؟"

"ایمانداری کی بات ہے کہ پروین شاکر۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ اٹ۔"

پھر دوسرے تیسرے دن وہ کتاب مجھے تکیے کے نیچے تبصرے کے ساتھ رکھی ہوئی مل جاتی۔ اس پر چندا پنسل سے اپنی ناقدانہ رائے یوں دیتی تھی کہ.... ایسی لغو اور لچر شاعری نوجوانانِ اسلام کے اخلاق و ایمان کے لیے مسرت شاہین سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اتنی بے حجابی کے ساتھ عاشقانہ جذبات کے اظہار پر شاعرہ کو اصلاح کے لیے سات سال کی سزا ہونی چاہیے کہ وہ "بہشتی زیور" کو منظوم کرے۔ آپ کے حق میں بہتر ہے کہ لہو و لعب سے بچیں اور شہرۂ آفاق کتاب "کامیاب مرغی خانہ باتصویر" پڑھیں۔"

اس تبصرے کو میں ربڑ سے مٹا رہا تھا۔ بعض اوقات اندر بھی کہیں کہیں ایسی ہی گل افشانی ملتی تھی۔ میرے ذخیرے کی بیشتر کتابیں چندا نے خریدی تھیں۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ میں کسی کتاب کا یا شاعر کا تذکرہ کرتا تھا یا وہ مجھ سے پوچھتی "تم نے علی پور کا ایلی پڑھی؟"

"علی پور کا ایلی کون ہے؟" میں تجاہلِ عارفانہ سے جواب دیتا۔

"ممتاز مفتی کا ناول ہے۔"

"میں ممتاز کے ڈانس دیکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ کسی مفتی سے میرا آج تک واسطہ نہیں پڑا۔ بہت ڈر لگتا ہے کہ فتویٰ نہ صادر کر دے۔"

"تمہارے پاس ممتاز مفتی کی سب کتابیں ہیں۔"

میں ہار مان لیتا "دراصل.... یہ کتاب میں نے خریدنے کا ارادہ کیا تھا۔ جیب میں پیسے بھی تھے۔ دکان میں بھی گیا تھا میں مگر اسے اُٹھا کے لانا میرے جیسے ناتواں اور نحیف و نزار شخص کے بس کی بات نہیں تھی اور اس وقت مجھے کوئی مزدور نہیں ملا...."

یہ کتاب مجھے یوں ملی کہ میں نے تکیے پر سر رکھا تو تکیہ سخت محسوس ہوا۔ میں نے غلاف میں ہاتھ ڈالا تو اندر سے علی پور کا ایلی برآمد ہوئی۔ تکیے کو ہموار کرنے کے لیے آگے پیچھے دوسری کتابیں بھری گئی تھیں اور اصل کتاب کے اوپر ایک چٹ لگی ہوئی تھی۔

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

ترجمہ (حضرت عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ ہو کر آئے تب بھی گدھا ہی رہے گا۔ کتابیں ڈھونے والا گدھا عالم نہیں ہوتا)

میں نے ویڈیو کیسٹ کتابوں میں سے نکالا تو اس پر بھی ایک تحریر نظر آئی "لاجواب فلم ہے۔ اس سال کا آسکر ایوارڈ اسے

ضرور ملنا چاہیے" پنسل سے لکھی یہ تحریر چندا کی تھی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ کیا اس نے یہ فلم مجھ سے پہلے دیکھ لی ہے؟ اس وقت جب میں خلوت کدے میں خان جی سے باتیں کر رہا تھا وہ یہاں بیٹھی فلم دیکھ رہی تھی؟ کیا اس نے سب دیکھ لیا ہو گا۔ مجھے شاہ عالم کی بیوی کے ساتھ سوتے ہوئے؟ ابھی تو خود مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے سویا تھا اور میرا سونا صرف خواب غفلت تھا یا کچھ اور۔ پھر میں نے روزی کو قتل کیا تھا اور اس کی لاش چھپائی تھی۔ یا میرے خدا! مجھے اس خیال سے ہی پسینا آنے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ چندا نے صرف مجھے پریشان کرنے کے لیے لکھا ہو گا۔

میں نے فلم کے ٹیپ کا کور ہٹا کے دیکھا تو اس پر کوئی لکیر نہیں تھی۔ فلم اپنی اصل حالت میں پوری REWIND کی ہوئی موجود تھی اور ذرا بھی گرم نہیں تھی۔ وی سی آر بھی ٹھنڈا تھا۔ اگر اس نے فلم دیکھی ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا۔ وہ فلم کو ری وائنڈ کر سکتی تھی مگر کیسٹ اور وی سی آر ضرور کچھ گرم ہوتے۔

اس ذہنی پریشانی میں مجھ سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ فلم لگا کے میں دروازے کو اندر سے لاک کرنا بھول گیا۔ فلم شروع ہونے کے چند منٹ بعد میں نے خود کو رخشندہ کے بیڈ روم میں سوتا ہوا دیکھا۔ اس وقت میں اکیلا تھا۔ پھر رخشی اندر آئی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی چندا بھی اندر آگئی "میں اندر آ سکتی ہوں جناب!"

میں نے چونک کے کہا "آپ... اندر آ گئی ہیں خاتون۔ اب اجازت لینے سے بہتر ہے کہ تشریف لے جائیں۔"

وہ کرسی پر جم گئی "اوہو۔ فلم چل رہی ہے۔ ہم بھی دیکھیں گے یعنی... ارے... ہیرو تو آپ ہیں۔ وری گڈ... یہ ہیروئن کون ہے؟ بڑی خوب صورت ہے' بالکل مادھوری ڈکشٹ لگتی ہے۔"

میں نے کہا "لگتی ہے؟ یہ مادھوری ڈکشٹ ہی ہے مگر آپ سے میں نے شریفانہ طریقے سے کہا ہے کہ گیٹ آؤٹ۔"

"آخر کیوں؟ میں فلم دیکھے بغیر تو خیر یہاں سے ہلوں گی نہیں۔ تم نے وی سی آر کیوں آف کر دیا ہے؟"

"تم جاتی ہو کہ میں..."

"یا میں چلا جاؤں۔ نہیں جناب' آپ سے میں ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتی۔" اس نے میری بات کاٹ دی "آپ خود اپنی خوشی سے دفع ہونا چاہیں تو آپ کی مرضی یا احتجاجاً واک آؤٹ کریں تو مزید بہتر۔ ریموٹ مجھے دے جائیں جاتے ہوئے۔"

میں نے چلا کے کہا "میں اٹھا کے باہر پھینک دوں گا ابھی..."

"بہت مشکل ہے" وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی "بلکہ ناممکن ہے اور تم نے فلم نہ چلائی تو میں لوٹا بھر کے پانی ڈال دوں گی تمہارے وی سی آر میں۔ اور ویسے بھی تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے فلم میں..."

"تم نے دیکھ لی ہے فلم؟"

"ہاں۔"

"جھوٹ بکتی ہو تم۔ وی سی آر کسی نے نہیں چلایا۔ نہ فلم چلی۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ فلم چلا کے دیکھی ہے۔ تم نے پوچھا تھا دیکھی ہے' میں نے کہا دیکھی ہے۔ تمہاری کتابوں کے پیچھے رکھی ہوئی تھی۔"

میں نے فلم نکالی اور چل پڑا "تمہارے ساتھ بات کرنا اپنا ہی دماغ خراب کرنا ہے۔"

اس نے میرا بازو پکڑ لیا "ناراض ہو کے مت جاؤ۔ میں نے فلم نہیں دیکھی مگر وہ سب سُن لیا ہے جو تم خان بابا کو بتا رہے تھے۔ میں ادھر دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس فلم میں کیا ہو گا۔"

"اور پھر بھی اسے دیکھنا چاہتی ہو؟"

اس نے کہا "ویسے تو میں بالغ ہوں۔ جو فلم تم دیکھ سکتے ہو وہ میں بھی دیکھ سکتی ہوں لیکن ایسا ویسا کوئی سین آئے تو مجھے بتا دینا' میں آنکھیں بند کر لوں گی۔"

میں نے کہا "چندا۔ میں کیا کروں؟"

وہ ہنسنے لگی "سب کچھ کرو مگر ڈراما مت کرو میرے سامنے۔ اپنی مظلوم صورت بنا کے اتنے دردناک لہجے میں پوچھ رہے ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ تم کچھ مت کرو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"پھر وہی کرو جو تمہارا دل کہتا ہے۔"

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "دل... دل جو کہتا ہے وہ تم کہاں مانتی ہو؟"

"تم بھی تو میرا کہا نہیں مانتے۔"

میں نے کہا "تم کہہ کے تو دیکھو۔ میں ماؤنٹ ایورسٹ سے دیوار چین پر کود سکتا ہوں اور دیوار چین سے بحر الکاہل میں۔"

"اتنی مشکل میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ آسان کام کرو۔ یہ سب ہیرا پھیری اور چکر بازی چھوڑ دو۔ انسان کے بچے بن جاؤ۔"

"میں کیا اپنی مرضی سے کرتا ہوں یہ سب۔ چکر میں میری تقدیر ہے اور ہیرا پھیری میرے ساتھ زمانہ کرتا ہے۔"

"بکواس فرماتے ہیں آپ۔ مجبوری کو عذر بنانا بہت آسان ہے۔"

میں نے کہا "جب تم نے سُن ہی لیا ہے سب کچھ..."

"معاف کرنا۔ میں جھوٹ بول رہی تھی۔ اگر تم بتانا نہیں چاہتے تو مجھے چھپ کر سننے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "چندا۔ تم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ میں نے اپنا ماضی تمہارے سامنے کھلی کتاب کی طرح رکھ دیا... میرا حال..."

"تمہارا حال الجبرے کا سوال ہے جو بالکل میری سمجھ میں نہیں

آتا۔ اس لیے مستقبل کی بات بالکل مت کرنا۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ بتاؤ کہ تم میرا ساتھ دو گی؟ میری مدد کرو گی؟"

"انشاء اللہ۔ بس ارادے نیک ہونے چاہئیں" اس نے جاتے جاتے کہا "ویسے تم خود سوچو کہ کیا تمہیں یہ سوال کرنا چاہیے اور وہ بھی مجھ سے؟"

اس کے اقرار کے انداز نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ میں نے تسلیم کیا کہ عام حالات میں کام آنے والی عقل چندا کے سامنے اسی طرح میرا ساتھ چھوڑ جاتی ہے جیسے حفاظت پر مامور پولیس فورس ڈکیتی کی واردات کے وقت غائب ہو جاتی ہے۔ خان جی نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ میرا فیصلہ کچھ بھی ہو' یہ فیصلہ میرے حق میں بہتری کا باعث ہو یا خرابی کا سبب بنے۔ میں جبر کے تحت کروں یا اپنے اختیار سے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو مجھے اپنا سمجھتے ہیں وہ میرے معاملات سے لاتعلق ہو جائیں اور مجھے ان کی مدد کی ضرورت پڑے تو میرے ساتھ نہ ہوں۔

میں نے بہتر سمجھا کہ اکیلے میں یہ فلم دیکھنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی بار اسے کمال کے ساتھ دیکھوں اور اسے اپنی تقدیر کے اس فیصلے سے بھی آگاہ کر دوں جن میں نہ میری نیت کا دخل تھا نہ ارادے کا۔ گردشِ حالات کا عنواں میرے لاشعور میں دفن اپنے بچپن کی ایک خواہش کو سمجھا جا سکتا تھا مگر وہ ایک نادان اور ناسمجھ بچے کی خواہش تھی جو اندھیرے کا قیدی ہو' وہ سورج کی ساری روشنی چُرا لانے یا چاند کو گھر کا دیا بنانے کی بات بھی نہ کرے تو پھر کیا کرے۔ احساسِ محرومی کے قبرستان میں ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے' خوابیدہ تھیں۔ ان شیر خوار بچوں کی صورت بھی ماں باپ کو یاد نہیں رہتی جو بیس پچیس سال پہلے ان کی زندگی میں کچھ خوشیوں کے اور مسکراہٹوں کے پھول بکھیر کر پیوند خاک ہو گئے تھے۔ اس وقت جب وہ سال بھر کے تھے یا سوا سال کے۔ ان کی معصوم حرکتوں پر زندگی کی ساری امیدوں کا انحصار تھا اور گھر میں مسرتوں کا سب اُجالا انہی کے دم سے تھا۔ جب وہ ماں کو دیکھ کے ہمکتا تھا' باپ کی طرف دیکھتا تھا اور ہاتھ بڑھا کے خاموشی سے التجا کرتا تھا کہ مجھے گود میں اُٹھا لو اور باہر چلو۔ جب وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود بہادر بنتے ہوئے ہاتھ جھٹک کے بلی کو بھگانے کے لیے کہتا تھا "ماؤں" اور چابی والے بندر کو اُلٹی قلابازیاں لگاتا دیکھ کے ہنستا تھا۔ اور پھر جب وہ اچانک مر جائے تو یہ سب کتنا ناقابل یقین لگتا تھا کہ اس کے بغیر جینا ممکن ہو گا مگر پھر ماہ و سال گزرتے جاتے ہیں اور اس کی یاد تک ذہن سے محو ہو جاتی ہے اور کسی کو اس ننھی سی قبر کا پتا نہیں ہوتا جو ہزاروں قبروں کے درمیان کہیں تھی مگر اب نہیں ہے۔

مجھے بھی اس خواہش کے مدفن کا کوئی علم نہ تھا جس نے ایک یتیم خانے میں پرورش پانے والے بچے کی زندگی کے مایوس اندھیروں کو امید کی ایک کرن دی تھی۔ معلوم نہیں میرا وہ دوست کیا بنا جو ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ کیا پتا وہ آج کوئی اسپیشلسٹ ہو جس کے کلینک میں مشورہ فیس ہی سیکڑوں روپے لی جاتی ہو اور جہاں کسی یتیم خانے کے مفلوک الحال غربت زدہ اور لاوارث بچے کے خیال کی رسائی بھی نہ ہو۔ (اور وہ بھی سوچتا ہو کہ میں بڑا ہو کے ڈاکٹر بنوں گا) یا وہ کسی خیراتی سرکاری اسپتال کے بیڈ پر کس مپرسی کے عالم میں پڑا زندگی کی آخری سانسیں شمار کر رہا ہو اور میرا وہ ساتھی جو کانے دجال ماسٹر کے بیدوں کی مار سے مر جانے کے بجائے اپنے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے سوچتا تھا کہ میں ماسٹر بنوں گا' انہی کے ساتھ میں تھا جو وزیر اعظم بننا چاہتا تھا۔ یہ جانے اور سمجھے بغیر کہ وزیر اعظم کیا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ خواہشوں کے سراب کا تعاقب کرتے ہیں تو کامیابی کی کسی منزل تک پہنچ بھی جاتے ہیں۔ جیسے کولمبس نے جو ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے نکلا تھا امریکا دریافت کر لیا تھا لیکن دیوانگی کے خیال کی کون سی منزل ہوتی ہے۔

مجھے اپنی خواہش اسی طرح یاد تھی جیسے والدین کو بیس سال پہلے شیر خواری کی عمر میں مر جانے والے بچے کا صرف نام یاد ہو۔ آج حالات مجھے جس موڑ پر لے آئے تھے ان میں بُری نیت یا ارادے کا قطعی دخل نہ تھا مگر کیسی عجیب بات تھی کہ اس کا رشتہ میری اسی خواہش سے تھا جس کو میں فراموش کر چکا تھا... بچپن کی نادانیاں یاد آئیں تو ان پر ہنسی ضرور آتی ہے مگر مجھے تقدیر کی اس ستم ظریفی پر رونا آ رہا تھا۔

ڈاکٹر کمال فاروقی بڑے کمالِ مسیحائی کے ساتھ اپنے مطب میں ثواب اور بیماروں کی دعائیں سمیٹ رہے تھے۔ ویٹنگ روم میں داخلے کا بیرونی دروازہ بند کر دیا گیا تھا مگر ایک بجے بھی جتنے مریض آ چکے تھے ان کو دیکھنے اور دوا دینے کی اخلاقی ذمے داری کمال اور ان کی فرشتہ سیرت دستِ راست کوئن پر عائد ہوتی تھی۔ کوئن کو میں بہت پہلے مطلع کر چکا تھا کہ اس کا تعلق خطا کار انسانوں کی اس کمینی دنیا سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اس کی ذات میں کوئی انسانی خامی کوتاہی یا کمزوری تلاش کرنے میں ابھی تک ناکام تھا۔ چنانچہ کمال کو بھی میں نے ہی خبردار کیا تھا کہ کوئن پر اتنا انحصار نہ کرے' کسی دن وہ اچانک اس کی نظروں کے سامنے سے ایک نورانی اور غیر مرئی پیکر میں فرشتوں کی طرح عالمِ افلاک کی جانب پرواز کر جائے گی۔

کوئن نے ایک مریض کے باہر آتے ہی اگلا نمبر پکارا تو میں اندر جانے لگا مگر ایک سوکھے سڑے کانگڑی پہلوان نے اچھل کے کہا "اوئے باؤ۔ ایہہ تے ساڈا نمبر اے" اور پھر اپنے ابا کو دھکیل کر اندر لے گیا۔ ابا علالت کے باوجود اس سے کہیں زیادہ صحت مند تھے۔

میں آہ بھر کے کوئن کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا مختصر سا کیبن

گیٹ کے ساتھ ہی تھا جہاں وہ ایک کھڑکی میں سے نسخے وصول کرتی تھی۔ دوائیں پکڑاتی تھیں اور مریضوں کو نمبر والا ٹوکن دیتی تھی اور ان کی باری آنے پر نمبر سے پکار کے انہیں اندر ڈاکٹر کمال کے پاس بھیجتی تھی۔ مردوں کے نمبر سیاہ تھے اور عورتوں کے سفید۔

"ویسے تو تم سیاہ وسفید کی مالک ہو۔ ڈیئر کوئن" میں نے کہا "لیکن تم ایک سنگین صورتِ حال سے دوچار ہو سکتی ہو۔ اگر تمہارے پاس وہ آجائے نمبر لینے جس کو تم نے سیاہ نمبر دیا تو مرد احتجاج کریں گے اور سفید پر خواتین شور مچائیں گی۔"

کوئن مسکرانے لگی "ہمارے لیے وہ صرف مریض ہوتے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "گویا ایسی صورتِ حال سے نمٹ چکی ہو تم۔ آخر کیسے؟"

میں نے اسے دونوں نمبر دے دیے تھے سر۔ گیارہ نمبر بلیک اینڈ وائٹ۔"

میں نے کہا "تم بہت سمجھ دار ہو مس کوئن۔ لیکن تمہارے لیے میرا ایک مفید مشورہ ہے۔ بالکل مفت.... تم ایک نمبر رکھ لو زیرو۔"

وہ ہنسنے لگی "آپ کا لندن کا دورہ کیسا رہا؟"

"بہت خراب۔ تم جیسی کسی لڑکی نے گھاس نہیں ڈالی۔ جنہوں نے ڈالی وہ دس سال سے کم تھیں یا پچاس سے زیادہ۔ بے شک اوسط عمر تیس سال بنتی ہے مگر۔"

کوئن نے اگلا نمبر پکارا اور باہر آنے والے سے پرچی لے لی۔ اسے شیلف سے دوا کی بوتل دی اور دس گولیوں کی ایک اسٹرپ۔ پھر انہیں استعمال کرنے کا طریقہ سمجھانے لگی۔

"ایک خبیث گورے سے بھی ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کہتا تھا کہ ہماری کوئن اچھی ہے۔ میں نے کہا کہ پیسہ تو ہے ہاتھ کا میل۔ تمہاری کوئن کے پاس بہت ہے تو ہمیں کیا۔ ہماری کوئن ایک فرشتہ ہے۔ وہ اڑ گیا کہ فرشتے مذکر ہوتے ہیں۔ فرشتی کوئی مخلوق نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ ہوتی ہے۔ وہ بولا کہ ہے تو جعلی ہوگی۔ میں نے کہہ دیا کہ تمہاری کوئن جعلی۔ میں نہیں مانتا اسے کوئن ورنہ تم بھی مانو کہ ہماری کوئن فرشتہ ہے۔"

"کیوں آپ مجھے گنہگار کرتے ہیں سر۔" کوئن نے کہا۔

"یہ جملہ اتنا ہی مہمل ہے جیسے 'بھینس نہلانے والے' سے کہے کہ کیوں آپ مجھے گورا کرکے گائے بناتے ہیں سر۔ تمہیں خود شیطان بھی گنہگار نہیں کرسکتا.... میری کیا مجال۔"

آخری مریض ڈیڑھ بجے رخصت ہوا تو کمال نے باہر آکے کہا "تو آگیا لندن سے واپس سور کے بچے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں یار۔ اس بار بھی کسی حور شمائل عالی نسب اور دولت مند میم نے مجھے نہیں پھانسا۔ اچھا مس کوئن۔ خدا حافظ۔ کیا پتا یہ تم سے آخری ملاقات ہو۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ کیا بھروسا ہے زندگانی کا۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"

"حسبِ معمول تو فاقے سے مرنے والا ہوگا۔ لیکن میرے پاس بچے کھچے محتاجوں کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے جن کو مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت لگ گئی ہو" کمال نے اپنی ایمبولینس میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آخر میں تیرا دوست ہوں" میں نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

"دوست ہے تو کیا ہوا۔ شوہر نہیں ہوں تیرا کہ نان نفقے کی ذمے داری بھی میری ہو۔ ویسے بھی تیری صحت اچھی لگ رہی ہے مجھے۔ ایک وقت نہیں کھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"بس میں فوت ہوجاؤں گا" میں نے کہا "صحت کا تو یہ حال ہے کہ مجھے ایمبولینس میں لے جانا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ دوست' میں لندن سے آلام ومصائب کی گٹھری باندھ کے لایا ہوں۔"

"حسبِ معمول!"

"نہیں۔ اس بار میری دکھ بھری کہانی میں انتہائی سنسنی خیز موڑ بھی ہیں۔ میں تباہی کے غار میں گرنے والا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ ذہنی طور پر خلاص ہوگیا ہوں۔ اخلاقی طور پر دیوالیہ۔ آج اس دنیا میں ہوں' کیا پتا کل دوسری دنیا میں پہنچا دیا جاؤں۔ اسی لیے میں نے کوئن سے رخصت لی تھی۔ تو بھی کہا سنا معاف کردینا.... جو کچھ بھی تو آج کھلائے گا وہ میرا آخری طعام ثابت ہوسکتا ہے.... کیا تجھ پر رقت طاری ہوئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے یہ سب کچھ۔ اگر واقعی ایسا ہو تو میری زندگی کتنی آسان ہوجائے گی؟"

اس کے فلیٹ میں بردستِ زہر مار کرتے ہوئے اور فرج سے نکالی ہوئی ٹھنڈی بوتل حلق سے اتارتے ہوئے میں نے فلم پھر وی سی آر میں لگائی۔ چندا کے نازل ہوتے ہی میں نے فلم اس سین پر روک دی تھی جہاں رخشی خواب گاہ میں داخل ہوئی تھی۔ اگلا سین ہی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا۔ رخشی نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کے اپنے زیورات اتارے اور میک اپ صاف کیا۔ وہ کسی پارٹی سے لوٹی تھی۔ اس کے موڈ اور لباس سے یہی ظاہر ہوتا تھا پھر اس نے سارے کپڑے اتار دیے اور ہر پہلو سے اپنے جسم کو آئینے میں دیکھ کر تعریفی احساسِ تفاخر سے سہلایا۔ پھر اس نے شب خوابی کا تقریباً شفاف لباس پہنا۔ مجھے جھک کر غور سے دیکھا اور پھر میرے پہلو میں مجھ سے لپٹ کے سوگئی۔ سونے سے پہلے اس نے لائٹس آف کردی تھیں۔

صرف میں ہی نہیں ڈاکٹر کمال فاروقی بھی پلک جھپکائے بغیر اس منظر کی دلکشی میں کھوئے ہوئے تھے۔ مرغ کی ایک ٹانگ میرے ہاتھ میں اور دوسری کمال کے ہاتھ میں تھی اور لقمہ ہمارے

حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ ٹی وی کا اسکرین تاریک ہوگیا تھا۔

"اف.... کیسی بے حیا اور آبروباختہ عورت ہے یہ۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اس کی بے شرمی ملاحظہ فرمائی آپ نے؟"

کمال نے پھر کہنا شروع کیا "بے شرمی کی کون سی بات ہے۔ آخر لباس بدلنے میں' سونے سے پہلے وہ ہر روز ایسا ہی کرتی ہوگی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں تھی جہاں دیکھنے والا اس کے ذاتی شوہر کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"مجھے قائم مقام شوہر سمجھا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن اس معمول کو میں بے حیائی کا نام اس لیے دیتا ہوں کہ دیکھنے والی آنکھ میری نہیں' ایک وڈیو کیمرے کی تھی۔ یہ بات اسے ضرور معلوم ہوگی۔"

کمال نے کہا "پہلی بات تو یہ کہ نیچرل ٹچ دینے کے لیے یعنی منظر میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اس نے جو کیا ٹھیک تھا۔ دوسری بات یہ کہ کیمرا کہاں تھا؟"

"فوٹو گرافی کے زاویے کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کیمرا اس کے دائیں جانب قدرے بلندی پر تھا۔ اور اتنی دور تھا کہ اس نے بیڈ کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل کو بھی فوکس کرلیا تھا۔ میرے پاؤں کیمرے کی طرف تھے اور میرے بالکل سامنے ایک خاصی بڑی تصویر تھی۔ کیمرا اس کے اوپر ہوگا۔"

"کیا لائٹس کے ساتھ ہی اس نے کیمرا بھی آف کردیا تھا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ کیمرا کام کرتا رہتا تو اندھیرے میں کیا دیکھتا اور کیا دکھاتا۔ اچھے کیمرے بہت کم روشنی میں عکس کشی کرلیتے ہیں۔ یہ عکاسی بھی اسی لیے دھندلی ہے کہ فلیش لائٹ نہیں تھی۔ صرف وال لائٹس کا اجالا تھا۔ اگر وہ کیمرا آف نہ کرتی تو تین یا زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں فلم کا کیسٹ چل کے ختم ہوجاتا۔"

کمال نے کہا "کیمرا آف نہیں ہوا' خالی فلم چل رہی ہو تو اسکرین پر روشنی کے نقطے سے چمکتے نظر آتے ہیں۔"

"بالکل نیا کیسٹ ہو تو اسکرین پر ایک نقطہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ لائٹس کے ساتھ ہی اس کیمرے کا کنکشن تھا۔ اس سے دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ رات بھر میں بھی سوتا رہا اور وہ بھی بس سوتی رہی۔ جو کچھ کیمرے نے دکھایا خود رخشی بھی اتنا ہی دکھانا چاہتی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ رات کے دوران اس سے زیادہ کچھ ہوگا بھی نہیں۔ اس لیے کہ نمبر ون' میں اس کا شوہر نہیں تھا۔ نمبر دو یہ کہ میں سویا ہوا نہیں' بے ہوش تھا۔ نمبر تین' رخشی کو علم ہوگا کہ میں نے اب اپنی زندگی کو اخلاق وکردار کے مثالی ڈسپلن کا پابند کرلیا ہے۔"

"اچھا.... یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ اور غالباً خود آپ کو بھی۔"

میں نے کہا "تیرا تو باپ بھی مانے گا الو کے پٹھے۔" میں نے کہا "مجھے اپنی بات منوانا آتا ہے۔ رخشی کو اگر یہ خیال ہوتا کہ رات کو کسی وقت میری آنکھ کھلی تو میرا ردِعمل ویسا ہی ہوگا.... جیسا اس کے شوہر کا ہوسکتا تھا۔ یا کسی ایسے شخص کا جو سمجھتا ہو کہ.... مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے اور یہ یقین آنے کے بعد کہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ درحقیقت ایک اجنبی حسینہ کے بیڈ روم کی خلوت میں ہے اور حسن وشباب کی ساری دولت اس کی دسترس میں ہے۔ وہ قائم مقام شوہر ہونے کے سارے حقوق ادا کردے گا۔ تو وہ کیمرا چلنے دیتی۔ لیکن ایسا کوئی واقعہ پیش آنے کا امکان ہی نہیں تھا۔"

"اب بکواس بند فرما کے فلم آگے چلائیں" کمال نے کہا۔

میں نے وی سی آر کو دوبارہ آن کیا۔ چند سیکنڈ کے بعد کمرا پھر روشن ہوا۔ میں نے رخشی کو اٹھتے دیکھا۔ اس نے پلٹ کے وال کلاک کو دیکھا جس میں رات کے پونے تین بجے تھے۔ اس کلاک کی ایک کھڑکی میں نظر آنے والی تاریخ بھی بدل گئی تھی اور دن بھی منگل کی جگہ بدھ نظر آرہا تھا۔ اس نے مجھے شانے سے پکڑ کے ہلایا اور مجھ پر جھک گئی۔ پھر اٹھ کے کہیں گئی۔ شاید باتھ روم یا پانی پینے۔ وہ کیمرے کے فوکس سے آؤٹ ہوگئی تھی۔

چند منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی اور پہلے کی طرح لائٹس آف کرکے سوگئی۔

کمال نے کہا "تو واقعی ہوش میں نہیں تھا یا کیمرے کے سامنے آنکھیں بند کرلی تھیں؟"

میں نے کہا "ایسا ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ کم سے کم یہ شکوہ نہ رہتا کہ قاتل تھا داڑھی والا اور پھانسی ہوگئی مونچھوں والے کو۔"

"مگر پریشانی کی کون سی بات ہے تیرے لیے۔ جب تو نے کچھ کیا ہی نہیں؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "برادر عزیز۔ یہ پریشانی کی نہیں افسوس کی بات ہے۔"

اگلے منظر نے میرے ہوش اڑا دیے۔ میں کیمرے کے عین مقابل رخشی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کی لائٹس اب بھی آف تھیں مگر بیڈ پر اوپر سے آنے والی سرچ لائٹ جیسی تیز روشنی تھی جس میں یہ منظر تمام تفصیلات کے ساتھ شبِ گزشتہ کے ان لمحات کی کہانی کہتا محسوس ہوتا تھا جو کیمرے کی آنکھ تاریکی میں نہ دیکھ پائی تھی۔ ہم دونوں چت لیٹے تھے اور بظاہر آسودگی کی گہری نیند میں تھے۔ لباس نام کی کوئی چیز نہ میرے جسم پر تھی اور نہ رخشی کے بدن پر۔ میرا ایک ہاتھ رخشی پر تھا اور اس کا ایک ہاتھ مجھ پر۔ ایک منٹ کے بعد فلیش لائٹ آف ہوگئی جو کسی نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ لائٹ کہیں فکس ہوتی تو سائے متحرک نہ ہوتے۔ جس نے لائٹ اٹھا کے اس منظر کو ریکارڈ کیا تھا وہ بیڈ روم کے دروازے کی طرف کھڑا رہا ہوگا اور اس نے ایک ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کے ہم پر روشنی ڈالی ہوگی۔ یہ اندازہ بھی میں نے ان بے جان چیزوں

کے سایوں کی حرکت کی سمت دیکھ کے کیا جو کمرے کی آرائش کا حصہ تھیں۔

کمال نے میری کمر پر مکّا مارا "ہم سے بھی جھوٹ۔ ہمارے سامنے بھی پارسائی کا دعویٰ۔"

میں نے کہا "آپ کی ہونے والی شریکِ حیات کے سرِ عزیز کی قسم۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ یہ زمین پھٹ جائے' اور آپ اس میں سما جائیں۔"

کمال نے کہا "ملاحظہ ہو اگلا سین۔"

رخشی نے لائٹ جلائی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی حالت پر کچھ حیران ہے۔ کم روشنی میں کیمرا اس کی صورت کے تاثرات ریکارڈ کرنے میں ناکام تھا۔ پھر اس نے مجھے ہلا جُلا کے جگانے کی کوشش کی اور میں نے اس کی آواز سنی "اے بدمعاش۔ مکر کرتے ہو" اس نے مجھے جھنجوڑا اور جب اسے یقین آگیا کہ میں واقعی نیند میں نہیں ہوں تو اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس میں صبح کے آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کے باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کا نائٹ ڈریس وہیں پڑا رہ گیا جہاں میں نے اسے دیکھا تھا۔ کیمرے نے اسے باتھ روم میں جاتا نہیں دکھایا تھا۔ یہ میرا اندازہ تھا کہ اس حالت میں وہ اور کہیں نہیں جاسکتی۔ یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ دوبارہ بدلے ہوئے لباس میں نظر آئی۔ اس کے گیلے بال بتاتے تھے کہ اس نے غسل بھی کیا تھا۔ اس نے مجھ پر کمبل پھیلایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کے ہیرڈرائر سے بال خشک کرنے لگی۔ اس کی صورت پر مجھے اُلجھن کے آثار صاف نظر آرہے تھے مگر وہ پریشان یا خوف زدہ بہرحال نہیں تھی۔

بیڈ روم سے نکلتے ہوئے اس نے لائٹس پھر بجھادیں۔ ٹی وی کا اسکرین تاریک ہوگیا۔ لائٹس خود رخشی نے دوبارہ جلائیں تو بیڈ سائڈ پر رکھی ہوئی گھڑی میں ایک بجا تھا۔ ظاہر ہے یہ دوپہر کے ایک بجے کا وقت تھا کیونکہ کیلنڈر میں سترہ جنوری کی تاریخ بھی نظر آرہی تھی۔ میں نے پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد یہی تاریخ دیکھی تھی لیکن اس وقت گھڑی میں آٹھ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے اور وہ رات کا وقت تھا۔ چند منٹ بعد وہ ڈاکٹر نظر آیا جس سے میری ملاقات ہوچکی تھی۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور پھر مجھے ایک انجکشن بھی دیا۔ رخشی اس سے آہستہ آہستہ کچھ کہتی رہی۔ مگر ان کی گفتگو کا کوئی لفظ ریکارڈ نہیں ہوا تھا۔ کیمرے کا مائک ان سے بہت دور تھا۔ انجکشن لگانے کے بعد بھی ان کی بحث جاری رہی۔ ڈاکٹر کچھ وضاحت کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا تھا لیکن رخشی شاید اس سے مطمئن نہیں تھی۔

رخشی بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہی چلی گئی اور کیمرا صرف مجھے دکھاتا رہا۔ پھر جیسے ایک دم منظر بدل گیا۔ اب فلم میرے ہوش میں آنے سے شروع ہوئی اور میں نے وہ سب ملاحظہ کیا جو میں نے کیا تھا۔ یہ خاصا طویل سین تھا جو میرے فرار پر ختم ہوا۔ اس میں جہاں کیمرا مجھے فوکس نہیں کرسکا تھا وہاں اس نے میری آواز ریکارڈ کرلی تھی۔ میں نے رخشی کے نام نہاد کزن سے جو باتیں کی تھیں اور پھر چوکیدار اصغر خاں سے جو کچھ کہا تھا وہ سب صاف سُنا جاسکتا تھا۔ روزی کا قتل کیمرے کے سامنے ہوا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو بیڈ کے نیچے چُھپایا تھا۔ پھر میں باری باری رخشندہ کے بدمعاش کزن کو اور پھر چوکیدار کو باتھ روم کی طرف لے گیا تھا تو کیمرے کے سامنے سے گزرا تھا۔

میرے وہاں سے فرار کے ساتھ ہی یہ وڈیو فلم ختم ہوگئی۔ میں نے کیسٹ کو وی سی آر سے نکال کے دیکھا۔ یہ تین گھنٹے چلنے والا کیسٹ تھا مگر آدھا استعمال ہوا تھا۔ اس میں شک و شبے کی کوئی بات بھی نہ تھی کہ کیمرا مسلسل چلتا رہا تھا۔ کوئی نادیدہ ہاتھ اس میں ایک کے بعد دوسرا کیسٹ لگاتا رہا اور چالیس پینتالیس گھنٹے میں جو دس بارہ کیسٹ استعمال ہوئے ان میں سے قابلِ دید مناظر کو صرف ایک کیسٹ پر منتقل کیا گیا تو صرف نوّے منٹ بنے۔"

میں نے کہا "اب کیا خیال ہے آپ کا؟"

کمال گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا "تو پھنس گیا ہے بیٹے۔"

"یہ بیان اس تھانے دار جیسا ہے جو کسی گھر میں تفتیش کے لیے گیا تھا۔ چوروں نے گھر کا صفایا کردیا تھا۔ تین گھنٹے کی پوچھ گچھ اور سراغ رسی کے بعد اس نے کہا تھا کہ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ یہ حرکت کس کی ہے۔ یہ کام کسی چور نے کیا ہے۔"

کمال نے مسکرانا بھی ضروری نہیں سمجھا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ تیمور نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ اس نے ڈبل گیم کھیلا ہے۔ اس کی سازش کا شکار صرف تو ہی نہیں ہوا۔ رخشندہ بھی ہوئی ہے۔ شاید اسے تیمور نے ہی یقین دلایا ہوگا کہ تو شاہ عالم ہے۔ تو خود تردید نہیں کرسکتا تھا اور تیمور کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اب سوچ اس پر کیا گزرے گی جب اسے پتا چلے گا کہ اس کا شوہر شاہ عالم ابھی ملک سے باہر ہے اور وہ جس کے ساتھ رات بھر اپنی خواب گاہ میں سوتی رہی وہ کوئی بہروپیا تھا۔ شاہ عالم کا ہمزاد یا پھر اس کا جڑواں بھائی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "خواتین ایسے فلمی اتفاقات پر بڑی سنجیدگی سے یقین کرلیتی ہیں۔ مگر ایک بیوی اپنے شوہر کے معاملے میں دھوکا نہیں کھاسکتی۔ ان کی ازدواجی زندگی کے کچھ تجربات اور مشاہدات سوفیصد ذاتی ہوتے ہیں۔ ایسی نازک تفصیلات پر بہت زیادہ روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں۔ رخشندہ ہی یہ فرق نوٹ کرلیتی اگر اس کو موقع ملتا۔ تجھے عملی طور پر پرکھنے کا۔ آپ کا رویّہ اس کے سامنے آیا ہی نہیں۔ جیسا کہ انگریز کہتے ہیں' کھیر کو چکھنے سے ذائقے کا پتا چل جاتا ہے۔ تو رخشی نے بھی کھیر صرف دیکھی ہے۔ دیکھنے میں نظر کو دھوکا ہوا۔ چکھنے کی نوبت آتی تو وہ ضرور ذائقے سے اصل اور نقل کا فرق جان لیتی۔ تو نے غور نہیں کیا' وہ کنفیوژن کا

شکار تھی۔ اس کی صورت کے تاثرات سے اُلجھن واضح تھی۔ جیسے کوئی بات ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے اس پر کافی دیر غور فرمانے کے بعد کہا "ہوں۔"

"ہوں کیا۔۔۔ تیمور اسے بھی بلیک میل کرے گا اور ممکن ہے اس کیسٹ کی ایک نقل اسے ارسال کرچکا ہو۔"

میں نے کہا "تیمور نے مجھ سے کہا تھا کہ۔۔۔ اس کھیل میں رخشندہ شامل ہے۔ اسے شامل کیے بغیر یہ ناممکن تھا۔"

"اس نے جھوٹ بولا تھا۔ بکواس کی تھی۔۔۔ رخشندہ اپنے شوہر سے کتنی بھی بدظن اور برگشتہ ہو۔ اس کے اغوا اور قتل کی کسی سازش میں اس کے کسی دشمن کی آلۂ کار نہیں بن سکتی اور یہ تو ناممکن ہے کہ شوہر کی جگہ اس کا نعم البدل قبول کرے۔ وہ بھی اعلانیہ۔ ساری دنیا کے سامنے ایک ایسے شخص کو شوہر تسلیم کرتی رہے جس کے بارے میں اسے علم ہو کہ وہ ایک نامحرم ہے۔ اس سے ازدواجی تعلقات رکھے اور جس سے اس کا نکاح ہوا تھا اسے بھول جائے کہ چلو پُرانا ہوگیا تھا۔ ویسا ہی نیا مل گیا۔"

"یہ تو میرا ذہن بھی قبول نہیں کرتا تھا۔ موقع ملتا تو میں رخشی سے پوچھتا یا اس کے رویّے سے اندازہ کرنے کی کوشش کرتا۔"

"جو کچھ تیمور چاہتا تھا' تو نے اس سے زیادہ کرکے دکھادیا۔ آفرین ہے تجھ پر سور کے بچے۔ وہ صرف شاہ عالم کے بیڈ روم کی ایک رات پر فلم بنانا چاہتا تھا۔ تو نے اس میں مار دھاڑ اور قتل بھی شامل کردیا۔ اب تو پوری طرح اس کی مٹھی میں ہے۔ اس نے روزی کی لاش کو غائب کردیا ہوگا۔ غائب کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ جادو سے پھونک مارکے اُڑادیا ہوگا۔ اس نے لاش کو ایسی جگہ دفن کیا ہوگا جہاں سے پھر برآمد بھی کیا جاسکے۔ ایک گمنام فون پر پولیس وہاں جاپہنچے گی اور لاش کے ساتھ خون آلود کپڑے بھی نکال لے گی۔ تیرا اپنا خون بھی ملے گا ان کپڑوں پر۔۔۔ اور لاش پر۔۔۔ ان واقعات کے بعد رخشی کے لیے بھی تیمور کی ہر جائز و ناجائز بات ماننا ایک مجبوری بن جائے گی۔ انکار کی صورت میں تیمور یہ وڈیو کیسٹ اس کے اصل شوہر کی خدمت میں پیش کردے گا اور وہ اپنے بیڈ روم میں پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات کی فلم دیکھ کے پہلا کام یہ کرے گا کہ تجھے رخشندہ کے ساتھ دوسری دنیا میں بھیج دے گا۔ اس وڈیو کیسٹ کی گواہی کو نہ کسی کی عقل مسترد کرسکتی ہے اور نہ کوئی عدالت۔"

"سوال یہ ہے کہ رخشندہ کو اتنی بڑی سازش کا پتا کیوں نہیں چلا۔ اس کے بیڈ روم میں وڈیو کیمرا چھپایا گیا تھا۔"

"وڈیو کیمرا پہلے سے لگا ہوا ہوگا۔ کلوز سرکٹ ٹی وی آج کل سیکیورٹی کے نظام کا حصہ ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ایسے کیمرے باہر لگائے جاتے ہیں۔ ان کی پکچر اندر موصول ہوتی ہے۔ بیڈ روم میں اپنے بیڈ کو بھلا کون فوکس کرتا ہے۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے کہ رخشندہ کے گھر میں کوئی تیمور کا مددگار نہ ہوتا تو کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ اِن سائڈ جاب ہے۔ تیمور نے کسی کے ساتھ مل کے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ اندر کوئی تھا جو کیمرے میں فلم بدلتا رہا۔ جس نے فلیش لائٹ میں ایک سین بطورِ خاص ریکارڈ کیا۔ یہی نہیں' فلم لگانے والا ہر تین گھنٹے بعد وڈیو کیسٹ نکال کر دوسرا کیسٹ فٹ کرتا رہا اور پہلے والا تیمور کو پہنچاتا رہا۔ تیمور نے ہر کیسٹ کے قابلِ دید مناظر کی ایڈیٹنگ جاری رکھی اور دس بارہ کیسٹس کا دھماکا خیز مواد ایک فلم پر منتقل کرایا۔ ممکن ہے شاہ عالم کے گھر میں ہی دوسرے وی سی آر پر یہ کام بھی وہی کررہا ہو جس نے کیمرا چھپانے۔۔۔' اسے کمرے کی لائٹس کے ساتھ سیٹ کرنے اور اس میں وڈیو فلم لگانے کی ذمے داری قبول کی تھی۔ اس نے یقیناً اپنے کام کا بھاری معاوضہ وصول کیا ہوگا یا پھر وہ بھی مجبور ہوگا۔"

"مجھے اس پر شک ہے۔ جس کو چوکیدار نے رخشندہ کا کزن بتایا تھا۔ اس جیسے شخص کا شاہ عالم کی غیر موجودگی میں گھر کے اندر پایا جانا اور وہ مردار عورت روزی۔ اگر وہ تیمور کے مددگار تھے تو رخشندہ نے ان کو کیسے قبول کیا تھا۔ کیوں اجازت دی تھی گھر میں رہنے کی۔"

"ممکن ہے انہیں شاہ عالم نے نگرانی یا جاسوسی کے لیے رکھا ہو۔ یہ تو ان سے پوچھا جاسکتا ہے بعد میں۔"

میں نے ہاتھ مل کے پھونک ماری' اور اب۔۔۔ ڈیئر فاروقی صاحب' ذرا میرا ہاتھ دیکھئے اور بتائیے کہ میری عمر کتنی ہے؟"

"میں جوتشی' نجومی یا پامسٹ' وغیرہ نہیں ہوں۔"

"بس۔ آپ صرف گدھے ہیں یا پھر قمر کے ایسے چاہنے والے۔۔۔ کہ میں قمر ہوتا تو کب کا آپ کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد

پاس کرچکا ہوتا۔ چلو یار! ایک ڈاکٹر کی طرح میرا معائنہ فرما کے بتادو کہ میں اور کتنے دن جیوں گا۔"

"اگر ایسے ہی کرتوت رہے تو جاؤ گے جہنم میں مگر کہلاؤ گے شہید۔ دنیا میں دوستوں سے زیادہ تمہارے دشمن بڑھتے جارہے ہیں۔"

"کیوں نہ میں وہ شہرۂ آفاق کتاب پڑھوں۔ دل جیتیے اور دوست بنایئے۔ تم ایک فہرست بناؤ' کس کس کا دل جیتا جائے... اور کسے دوست بنایا جائے۔ پہلی فہرست میں سب سے پہلا نام لکھنا چندا کا۔"

"ابھی تک اس کا دل نہیں جیت سکے آپ۔ تُف ہے تمہاری اوقات پر!" کمال فاروقی نے کہا۔

"میں جارہا ہوں" میں نے کہا "آپ نے دیواروں پر اکثر جگہ دیکھا ہوگا۔ محبوب آپ کے قدموں میں۔ اگر مجھے وہ نقشِ اعظم مل جائے تو چندا خود آکے گرے گی میرے قدموں میں۔ خدا حافظ۔"

میں دروازے تک بھی نہیں گیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کمال نے ریسیور اٹھاکے کہا "کون۔۔۔ شاہ عالم!"

میرے قدم رک گئے۔ ڈاکٹر کمال کے فلیٹ پر شاہ عالم کو فون کرنے والا کون ہوسکتا تھا؟ چندا یا خان اعظم سے مجھے ایسے مذاق کی توقع نہیں تھی۔ رخشی کو یہ نمبر معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسی حرکت تیمور کرسکتا تھا۔

کمال ریسیور پر ہاتھ رکھے میری طرف دیکھ رہا تھا "کیا کہوں؟"

"کس کا فون ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ سے کہا "شاہ عالم کا۔۔۔ میں تو اس کی آواز نہیں پہچانتا۔"

شاہ عالم کی آواز شاہ عالم بھی نہیں پہچانتا تھا۔ ایک اصلی تھا اور ایک نقلی۔ ایک کو خدا نے شاہ عالم بنایا تھا' دوسرا ناصر عظیم تھا مگر خدا کے بندوں نے اسے بھی شاہ عالم بنادیا' زبردستی۔۔۔ میری مرضی کے خلاف۔ مجھے مجبور کردیا گیا تھا کہ میں شاہ عالم بن جاؤں۔۔۔ اور مجبوری صرف میری نہیں تھی' اصل مجبوری ان کی تھی جن کے بغیر میرے لیے جینا بھی مشکل تھا اور مرنا بھی۔ میں انکار کیسے کرسکتا تھا۔

لیکن اس صورتِ حال نے اچانک میرے ذہن کو ماؤف کردیا تھا۔ کیا واقعی اصلی شاہ عالم مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ کیا بات کرے گا مجھ سے۔۔۔؟ اور اس نے کوئی ایسا سوال کیا جس کا جواب دینا بھی اتنا ہی ناممکن ہو جتنا جواب نہ دینا۔۔۔ تو میں کیا کروں گا؟

گزرے ہوئے واقعات کا آسیب نئے اندیشوں کو جنم دیتا تھا مگر میں مجبور تھا کہ ریسیور پکڑ کے شاہ عالم سے کہوں کہ ہیلو۔۔۔ میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔ اب میں ناصر عظیم کہیں تھا۔

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آواز میرے حلق میں پھنس گئی تھی۔

آخر مجھے اتنا نروس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا لیکن اس کے باوجود جو آواز میرے حلق سے برآمد ہوئی وہ ایسی ہی تھی جیسے کوئی مظلوم دولہا نکاح کے وقت قاضی کے سوال پر نکالتا ہے "ہیلو۔۔۔"

جواب میں مجھے اپنی ہی آواز سُنائی دی "ہیلو۔" تو میں نے ریسیور کو کان سے ہٹاکے دیکھا۔ یہ صدائے بازگشت تھی۔۔۔ پہاڑوں سے ٹکرا کے لوٹنے والی اپنی آواز۔۔۔ مگر ٹیلی فون ریسیور کے ایک حصے میں داخل ہوکے دوسرے سے سنائی دینے والی آواز کو بازگشت کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔

میں نے کہا "کون صاحب بول رہے ہیں؟"

اس نے جواب میں کہا "شاہ عالم!"

"شاہ عالم؟ اور کس سے بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟"

"چاہتے ہیں کا کیا مطلب۔ میں شاہ عالم سے بات کررہا ہوں۔"

میں نے کہا "سوری' رانگ نمبر" اور ریسیور رکھ دیا۔

کمال نے کہا "کون تھا؟"

"میں خود۔۔۔" میں نے کہا "پتا نہیں' کہاں سے بول رہا تھا؟"

"تقریباً ہر شخص کو آپ متعدد بار بتاچکے ہیں کہ میں اپنے منہ سے بول رہا ہوں۔۔۔"

گھنٹی پھر بجی۔ ایک بار پھر میں نے وہی آواز سُنی جو سوفیصد میری آواز تھی اور میں نے پھر ہیلو کہا تو وہ بولا "مجھے معلوم ہے کہ یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہ ڈاکٹر کمال فاروقی کا فلیٹ ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر تم کمال فاروقی نہیں' اس کے دوست ناصر عظیم۔۔۔ سوری' شاہ عالم ہو۔" وہ بولا "کیا تم پوچھو گے نہیں کہ مجھے یہ نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

"نہیں' میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔"

"خیر۔۔۔ میں بتاؤں گا۔ میری امیر تیمور سے بات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے کرنل خان کے گھر کا نمبر بتایا۔ وہاں میری بات چندا سے ہوئی۔"

"مس چاندنی خان!"

"آئی ایم سوری۔ میں تکلفات کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔"

"یہ بدتمیزی ہے۔ اسے چندا کہنے کا حق صرف چار افراد کو حاصل ہے۔"

وہ بولا "میں سمجھ گیا۔ تمہارے علاوہ اس کا باپ کرنل خان' قمر اور اس کا منگیتر کمال فاروقی اور۔۔۔۔۔"

میں نے کہا "تم مجھے امپریس کرنے کی کوشش کررہے ہو کہ تم میرے بارے میں کتنی مکمل معلومات رکھتے ہو۔"

"میں صرف وہ بتارہا ہوں جو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ اگر تم خواہ مخواہ امپریس ہورہے ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے بس

چاندنی خان نے بتایا کہ تم شاید ڈاکٹر کمال فاروقی کے ساتھ سرگشت کررہے ہو۔ یہ لفظ میں نے اپنی طرف سے نہیں بولا' یہی کہا تھا خاتون نے' خیر۔ میں نے تمہیں تلاش کرلیا' جیسے بھی کیا۔"

"اور تم خود کہاں ہو اس وقت؟"

"میں۔۔۔ بڑا مشکل سوال کردیا تم نے۔ سچ بولوں اور ٹھیک ٹھیک بتاؤں تو سمجھ لو کہ ہانگ کانگ کے کاروباری علاقے سے ملحق ایک رہائشی عمارت کے فلیٹ میں ہوں۔ فلیٹ کے بیڈ روم میں بلکہ بیڈ پر ہی ہوں۔ کیا تم پوچھو گے نہیں کہ کس کے ساتھ۔۔؟"

"نہیں۔"

"ہاں۔ اس سے کچھ حاصل بھی نہیں۔ نام کچھ بھی بتاسکتا تھا میں۔ اصل نام بھی تمہارے لیے اجنبی ہوتا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرا پروپوزل قبول کرلیا۔ اگر تم لڑکی ہوتے تو پروپوز کرنے کا مطلب کچھ اور ہوتا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"جو تم اکثر کرتے رہتے ہو۔۔۔ اور کسی کو بتاتے نہیں کہ تم کم سے کم ایک بار شادی شدہ ہو۔"

"کیا کروں یار' ہر عشق میں آدمی اتنا ہی مجبور ہوتا ہے۔ جھوٹ بولے بغیر کہیں عشق چلتا ہے؟ شاعروں کے دیوان بھرے پڑے ہیں جھوٹ سے' جسے لوگ رومانی شاعری کہتے ہیں۔"

"تمہیں یہ غلط فہمی کیسے ہوئی کہ میں نے تمہارا پروپوزل قبول کرلیا ہے۔ میری تم سے یہ پہلی نصف ملاقات ہے۔ ٹیلی فونک۔۔۔ اور ابھی تک تم نے مجھے کوئی پروپوزل نہیں دیا۔"

"کیا فائدہ بات کو گھمانے سے۔ امیر تیمور نے تم سے جو کچھ کہا تھا میری طرف سے ہی کہا تھا۔۔۔ اور اس نے مجھے مطلع کیا ہے کہ تم میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔"

"ساتھ دینے کا مطلب اگر وہی ہے جو مجھے تیمور نے بتایا تو پھر میں انکار نہیں کروں گا مگر ایک بار میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ براہِ راست اور تفصیل سے۔"

"جب میں واپس آؤں گا تو ظاہر ہے تم سے ملاقات بھی ہوگی اور مفصل بات چیت بھی۔"

"تمہارا کب تک واپسی کا ارادہ ہے؟"

"ارادہ تو آج ہی لوٹنے کا تھا مگر شاید مجھے دو دن اور لگ جائیں۔"

"اسی فلیٹ میں؟"

وہ ہنسا "نہیں۔۔۔ مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ آج میرا چھٹی کا دن تھا۔ ایک ہفتہ کاروباری مصروفیت رہی۔ دو دن میں میرا کام ختم ہوجائے گا تو میں واپس آجاؤں گا۔ لیکن اس وقت تم سے ایک کام ہے۔"

"کیسا کام۔۔۔؟"

"وہی۔۔۔ جو تم کو کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ٹیلی فون پر اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہیں۔ مجھے تیمور کی زبانی علم ہوا کہ اس نے تمہیں آمادہ کرنے کے لیے خاصی محنت کی اور بڑی ذہانت سے کام لیا۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا "مکاری زیادہ موزوں لفظ ہے۔"

"مجھے تمہارا ہی شکریہ ادا کرنا تھا کہ تم نے تعاون سے انکار نہیں کیا۔"

میں نے کہا "کیا میری جگہ تم ہوتے تو انکار کرسکتے تھے؟"

وہ بولا "پتا نہیں۔ ہر آدمی کی مجبوریاں الگ ہوتی ہیں اور بدلتی رہتی ہیں حالات کے ساتھ لیکن میں ایک بات کا یقین دلا سکتا ہوں تمہیں' تم مجھ پر اتنا ہی اعتماد کرسکتے ہو جتنا میں نے تم پر کیا ہے۔ تمہارا مجھ پر احسان اپنی جگہ۔ میرا ساتھ دے کر تمہیں جو فوائد حاصل ہوں گے۔ اس کا تم تصور نہیں کرسکتے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تصور کی پرواز میں سب کچھ ہے۔ وہ ماضی بھی جو تاریخ کا حصہ ہے اور وہ مستقبل بھی جو اس میں شامل ہوگا۔ اعتبار اور اعتماد جیسے الفاظ کا تعلق تو اخلاقیات سے ہے۔ نفع نقصان کا معاشیات سے۔ ہم جب سیاست کی زبان میں بات کررہے ہیں تو پھر ہمیں ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بے وقوف بنانے کا شوق پورا کرنے کے لیے عوام جو ہیں۔ سارے فیصلے وقت پر چھوڑ دو کیونکہ تم تاریخ بنا نہیں سکتے' تاریخ اپنے فیصلے خود رقم کرتی ہے۔"

"کیا یہ گفتگو کوئی اور بھی سُن رہا ہے؟"

"ہاں۔ ڈاکٹر کمال فاروقی!"

"میرا مطلب تھا۔۔۔ کہیں اور۔۔۔ کوئی ایکس ٹینشن سے اس فون کی۔۔۔"

"یہ لائن یہاں سے ٹیلی فون ایکس چینج تک ڈھائی تین کلومیٹر لمبی ہے اور تم اسے ایکس ٹینشن سمجھ سکتے ہو اس نمبر کی۔ یہاں سے وہاں تک کوئی بھی فون صرف دو پیپر پنوں کی مدد سے لگایا جاسکتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ پھر تم باقی بات تیمور سے کرلو۔ ویسے تو میں تمہیں جانتا ہوں مگر آج تم سے بات کرکے مجھے پورا اطمینان ہوگیا کہ تم اس ذمے داری کو اچھی طرح نبھاسکو گے۔ وش یو گڈ لک۔"

"گڈ لک اگر وش کرنے سے مل سکتی ہے تو اپنے لیے مانگو" میں نے کہا۔

پھر دوسری طرف سے لائن کٹ گئی تو میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

کمال نے کچھ اندازہ تو کرلیا تھا کہ بات کرنے والا کون ہے اور موضوعِ سخن کیا ہے "یہ وہی تھا۔ تمہارا ہمزاد۔۔۔ باس اور نقشِ ثانی!"

میں نے کہا "اب وہ نقشِ اوّل ہے' میں نقشِ ثانی۔"

"کیا چاہتا ہے؟"

"مداری کیا چاہتا ہے بچہ جمورا سے؟"

"اور بچہ جمورا کیا چاہتا ہے؟"

میں نے کہا "بچہ جمورا کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی اپنی کوئی مرضی یا رائے نہیں ہوتی۔ اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو مداری چاہے۔ وہ فقط ایک معمول ہوتا ہے جو ذہنی طور پر پوری طرح مداری کا مطیع اور فرماں بردار ہوتا ہے۔ مداری جیسا تماشا کرنا چاہے بچہ جمورا اسی کے اشارے پر چلتا ہے لیکن سنی سنائی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"یہ تو خرابی ہے سمجھ دانی کی؟" کمال نے انگلی سے اپنے سر کو بجایا۔

"یہ شخص شاہ عالم!" میں نے اپنی بات جاری رکھی "مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ اسے یہ بھی علم ہے کہ میں اس کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں مثلاً یہ کہ اس کا کوئی کریکٹر نہیں اور وہ ایک بے ضمیر شخص ہے۔ اس نے مذہب اور انسانیت کے نام پر دھوکے فریب کا جال پھیلا کے اپنا الو سیدھا کیا۔"

"ایسا بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔"

"انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کا سائن بورڈ لگا کے بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی دکان کھول رکھی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سٹے اور جوئے کے اڈے۔ لاٹری اور انعامی اسکیم۔ نانس کمپنی' میرج بیورو یا ریکروٹنگ ایجنسی۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور سب مل کے ایک ہی کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگوں کے جذبات سے کھیل کے اور انہیں سبز باغ دکھا کے لوٹ رہے ہیں۔ ان کا مال اپنی جیبوں میں منتقل کر رہے ہیں۔"

"سو فیصد لوگ ایسے نہیں ہیں۔"

"مگر ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو وہی کرتے ہیں جو کہتے ہیں اور میں نمک کی نہیں آٹے کی بات کر رہا ہوں۔ کبھی پبلک کی طرف سے پریس میں یا ٹی وی پر انہیں الزام کا سامنا ہو تو وہ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ کے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں کہ بے شک کچھ کالی بھیڑیں ہر جگہ ہوتی ہیں۔ وہ تردید نہیں کرتے' بحث نہیں کرتے سب کی طرف سے صفائی پیش نہیں کرتے۔ صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ خود کالی بھیڑ نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ چند سفید بھیڑیں شاید ہوں گی' باقی کا ریوڑ کالا ہے۔ ان میں سفید بھیڑ کسی کو نظر بھی نہیں آتی۔ ہر شخص اندھا نہیں ہوتا کہ سیاہ و سفید کے فرق کو دیکھ بھی نہ سکے لیکن عقل کے اندھے اکثریت میں ہیں جو پہچان نہیں رکھتے۔ اب ستار ایدھی صرف ایک ہے۔ مدر ٹریسا بھی ایک ہے۔ چند نام اور بھی ہوں گے جو معتبر ہیں۔ کچھ گمنام ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں مگر ہزاروں ہیں جو نیکی کا بزنس کر رہے ہیں۔ سماجی تنظیم' سوشل ورک' خدمتِ خلق' رفاہی ادارے۔ فلاحی مرکز اس قسم کے دھوکے بازی کے دھندے چلانے والے ہزاروں رجسٹرڈ ادارے ہیں۔ ان رجسٹرڈ کو شامل کیا جائے تو شاید لاکھوں ہوں گے۔ اور یہ سب اسی طرح لوگوں کو بے وقوف بنا کے لوٹ رہے ہیں جیسے لائسنس یافتہ جوئے خانے۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ اپنے پاک وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کسی کو جوئے خانے چلانے کا لائسنس نہ دیا گیا ہے اور نہ دیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر کیا یہاں سٹہ اور جُوا نہیں کھیلا جاتا۔ باقاعدہ پولیس کی قانونی سرپرستی میں۔ اور کیا ہر اڈے سے قانون کے محافظ ماہانہ بھتا نہیں لیتے۔ لاس ویگاس میں جوئے خانوں کے لائسنس ہیں تو وہ حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ یہاں حکومت بے بسی سے دیکھتی رہتی ہے۔ جوئے' سٹے کے اڈوں سے پیسہ صرف مالکوں کو ملتا ہے یا انہیں تحفظ فراہم کرنے والوں کو۔ لٹنے والے کون ہیں؟ وہی عوام' نوّے فیصد بے وقوف جن کے بارے میں ٹھیک کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ موجود ہیں دس فیصد عقلمند کیسے بھوکے مر سکتے ہیں۔"

"پھر بھی۔ جوئے خانے اور فلاحی ادارے کو ایک سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔"

"مگر میں رکھتا ہوں" میں نے کہا "آخر کیا کرتے ہیں یہ لوگ؟ یہ لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ایک اس دنیاوی زندگی میں جنت کے سبز باغ دکھاتا ہے تو دوسرا آخرت کی ابدی زندگی میں حقیقی جنت کے۔ پہلے گروہ میں وہ سب شامل ہیں جو دولت مندی کا شارٹ کٹ بتاتے ہیں۔ جُوا کھیلو تقدیر کا پانسا پلٹتے دیکھو۔ ریس کے گھوڑوں پر شرط لگاؤ۔ سٹہ کھیلو' سٹہ کسی بھی معاملے میں راتوں رات لکھ پتی بنا سکتا ہے یا کنگال کر سکتا ہے۔"

"ہاں مگر کنگال ہونے کی بات نہ کوئی سوچتا ہے نہ کرتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کے انتخابی نتائج ہوں یا کرکٹ اور فٹ بال کے ورلڈ کپ' سٹہ چلتا ہے' لوگ پرائز بونڈ خریدتے ہیں۔ لاٹری کے ٹکٹ لیتے ہیں۔ انعامی معمے بھرتے ہیں اور ہزاروں حل بھیجتے ہیں۔ یہ سب پلک جھپکتے میں محنت کئے بغیر دولت مند بننے کے وہ راستے ہیں جن پر چل کے اگر ہزار میں ایک کامیاب ہوتا ہے تو نو سو ننانوے ناکام رہتے ہیں۔"

کمال نے سرہلایا "مگر اسی ایک آدمی کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہوئے مزید ایک ہزار جواری قسمت آزمانے کے لیے آجاتے ہیں کہ کیا پتا ایسے ہی تقدیر ہم پر مہربان ہو جائے۔ اللہ جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ ان سے بھی بڑے احمق وہ ہیں جو دیواروں پر پڑھتے ہیں' دولت آپ کے قدموں میں۔ اور پہنچ جاتے ہیں کسی مداری سے دولت کے حصول کا... کوئی نقش لینے' وظیفہ سیکھنے یا عمل کرانے۔ یہ سوچے بغیر کہ سوا روپے یا سوا سو روپے میں نقش دینے والا یا کوئی وظیفہ اور عمل سکھانے والا خود کیوں خوار ہے۔"

میں نے کہا "بس یار' ہوس نے اندھا کر دیا ہے سب کو۔ لوگ الہ دین کا چراغ تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مدفون خزانوں کے چکر میں رہتے ہیں' پارس پتھر ڈھونڈتے ہیں کہ جس کو چھولیں وہ سونا ہو جائے۔ کیمیا گری کرتے ہیں کہ پیتل سے سونا بنا لیں۔ محنت کئے بغیر قارون کا خزانہ ہاتھ لگ جائے تو دنیا بھی جنت ہو جائے۔ کوئی کار' کاروبار' کیش ہو تو عیش ہی عیش۔ عیاشی کا تصور لامحدود ہے۔ عیاشی کے خواب دیکھنے اور کچھ نہ کرنے والوں کو لوٹنے والے وہ مداری ہیں جو انہیں یقین دلا دیتے ہیں کہ ان کے پاس وہ جادو ہے جس سے ان کے دن پھر جائیں گے۔ ان کے سارے خوابوں کو تعبیر مل جائے گی۔ بالکل اسی طرح دوسرے مداری ہیں جو دوسری دنیا میں جنت کی بکنگ کرتے ہیں۔ آخرت کے ثواب کا بزنس کرتے ہیں۔ وہ خود سب سے بڑے گنہگار ہیں مگر دوسروں کو اللہ کے قہر و غضب سے ڈراتے ہیں۔ موت سے' قبر کے عذاب اور جہنم کی آگ سے ڈراتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ چلو دنیا میں جو گناہ کیے سو کیے' کچھ ثواب بھی کما لو۔ یتیموں کی مدد کرو' بیواؤں کی مدد کرو' بیماروں کی مدد کرو' ننگے بھوکوں کی مدد کرو۔ نیکی کے کاموں کے لیے پیسہ دو۔ پل بنا' چاہ بنا' مسجد و تالاب بنا' ثواب کماؤ' فلاں ملک کے مجاہدین کی مدد کے لیے' فلاں ملک کے قحط زدگان کے لیے' سیلاب سے متاثر ہونے والوں کے لیے' ظلم کے خلاف جہاد میں' جہالت کے لیے۔ بیماروں کے خلاف جہاد میں۔ جہالت کے خلاف جہاد میں۔ فلاں تحریک میں چندہ دیں۔ فلاں یتیم خانے' فلاں جگہ تعمیر مسجد کے لیے۔ خیراتی اسپتال چلانے کے لیے۔ مظلوموں کے لیے۔ چندہ دیجئے اور ثواب کمائیے' دنیا کے گناہ معاف کرا لیجئے۔ جنت میں گھر بنائیے۔ اور پھر سیکڑوں ہزاروں میں سے کوئی انجمن' تنظیم' سوسائٹی' آرگنائزیشن' تحریک یا جماعت اپنے لٹریچر' اشتہارات' پروپیگنڈے' پوسٹر اور کتابچوں' کارکنوں اور کیمپوں کی مدد سے دلوں میں اتر جانے والے نعروں اور تقریروں کی مدد سے لوگوں کے جذبات سے کھیلتی ہے۔ نیکی' شرافت' انسانیت اور ہمدردی کے جذبات کو ابھار کے ان سے کارِ خیر کے نام پر سب کچھ لے لیتی ہے اور دینے والے کو تو خیر نیت کا ثواب مل ہی جاتا ہے مگر یہ مداری انہی کی طرح پرائے مال پر عیش کرتے ہیں جیسے جوئے خانے یا سٹے کے اڈے چلانے والے۔ نیت اور طریقۂ واردات دونوں کا ایک ہی ہے۔ مجھے تو دنیا میں ہر طرف ہر جگہ مداری ہی نظر آتے ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا رہے ہیں۔ ہر مداری نے اپنا مجمع لگا رکھا ہے' میں نے سب کا کھیل دیکھا ہے فاروقی صاحب۔"

"کھیل میں نے بھی دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ شاہ عالم ایک نیا تماشا شروع کرنے والا ہے۔ لیکن دیکھنے کے سوا ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر کرنا چاہیں۔"

"بچہ جمورا کیا کر سکتا ہے؟" کمال نے آہ بھری۔

"بچہ جمورا سارا کھیل چوپٹ کر سکتا ہے۔ مداری کی ایسی تیسی کر سکتا ہے۔ وہ بتا سکتا ہے کہ جادو کی حقیقت کیا ہے۔ ہاتھ کی صفائی کیا ہے اور نظر کا دھوکا کیا ہے کیونکہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ میں نے بھی اب فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"یہی... کہ اس مداری کا کھیل ختم کر دوں۔ میں کیوں شاہ عالم کا بچہ جمورا بن رہا ہوں آخر صرف اس لیے کہ میں اس کی شعبدہ بازی کے سارے اسرار و رموز سمجھ لوں۔ یہ جان لوں کہ اصلیت کیا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ شاہ عالم کیسے زیرو سے ہیرو بنا ہے مگر میرے پاس ثبوت نہیں ہیں اور شہادتیں نہیں ہیں گواہ نہیں ہیں اور دستاویزات نہیں ہیں۔ میں اس کے ہر فراڈ کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتا اور یہ نہیں جانتا کہ اس نے کہاں کہاں کھیل دکھایا ہے۔ کیا کیا تماشے کیے ہیں اور کس کس کو الو بنایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ لینے کے بعد میں سارے زمانے کو بتا دوں کہ اس مداری کے کھیل کی حقیقت کیا ہے۔"

کمال کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا "یعنی تو پھر اپنا کھیل شروع کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔ میں وہی کرنا چاہتا ہوں' جو میں کرتا آیا تھا۔ مجھے احساسِ جرم ہونے لگا ہے کمال کہ خاموش تماشائی بن کے میں نے بزدلی' کم ہمتی اور خودغرضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر میں دیکھتا ہوں کہ کوئی دھوکے باز پیتل کو سونا بنا کے بیچ رہا ہے اور میں خریدنے والوں کو آگاہ نہیں کرتا کہ وہ دھوکے کا شکار ہو رہے ہیں اور میرے پاس کسوٹی ہو پھر بھی میں انہیں پرکھنے کے لیے نہ دوں تو یہ دھوکے باز کی مدد کے مترادف ہے۔ اگر میں اس خیال سے خاموش ہو جاؤں کہ دھوکے باز کی دشمنی مجھے مہنگی پڑے گی تو یہ بزدلی ہے اور اگر میں یہ سوچوں کہ کیوں نہ میں اس سے سودا کر لوں۔ اس پر واضح کر دوں کہ میں پیتل اور سونے کا فرق جانتا ہوں چنانچہ وہ اپنا جعلسازی کا دھندا جاری رکھنا چاہتا ہے تو مجھے بھی اپنی آمدنی میں شریک کر لے۔ تو یہ خودغرضی ہی نہیں جرم میں شراکت ہے۔"

"یہ آپ کا پُرانا فلسفہ ہے۔"

"میں نے ہر مداری کے کھیل میں شریک ہو کے اس کا بھانڈا چوراہے کے بیچ پھوڑا ہے۔ آج تک زندگی کی مسافت طے کرتے ہوئے مجھے جتنے مداری ملے' میں نے ان کا اعتماد حاصل کر کے ان کی ہر کمزوری کا راز جان لیا۔ ہر بدمعاشی کو سمجھ لیا۔ ان کے کالے کرتوتوں کی تہ تک پہنچ گیا اور ان کے پُرفریب ظاہر کا پردہ ہٹا کے باطن کی حقیقت کو دیکھ لیا اور جب مجھے پتا چل گیا کہ ایک مداری کے گروہ میں کتنے بچے جمورے ہیں تو میں نے ان سب کے چہرے پر سے نقاب ہٹا دی۔ انہیں تباہ کر دیا۔ ان کا کھیل ختم ہو گیا تو وہ خود تباہ ہو گئے۔ وہ جان بچا کے بھاگ گئے۔ روپوش ہو گئے یا پکڑے گئے

توکیفرِ کردار کو پہنچے۔"

"تو خود ایک مداری تھا' بلکہ مہا مداری۔"

"ہاں' میں تماشا دکھانے والوں کو تماشائے عبرت بنا دیتا تھا۔ کسی مداری کو پتا نہیں چلتا تھا کہ بچہ جمہورا نظر آنے والا وقت آنے پر کتنا بڑا مداری ثابت ہوگا۔ جب وہ اپنا کھیل دکھائے گا تو ان کا جمہورا کام نہیں آئے گا۔ تو نے ٹھیک کہا کہ میں مہا مداری تھا۔ جو مداری کو فریبِ نظر میں مبتلا کردے۔ اسے ہاتھ کی صفائی دکھائے۔ ایسا تماشا دکھائے کہ اس کی عقل خبط ہوجائے اور ہاتھوں کے طوطے اُڑ جائیں۔"

"لیکن تُو نے یہ کام چھوڑ دیا تھا اُلّو کے پٹھے!"

"بس یار' ایک لڑکی نے جادو کردیا تھا مجھ پر۔ اس کا حسن بڑا ساحر تھا اور اس کی محبت کا طلسم ایسا تھا کہ میرے جیسے مہا مداری کے ہوش گم ہوگئے۔ اس نے اپنے عشق کی ڈگڈگی بجا کے کہا "ہاں تو پھر بولو تم کون؟"

میں نے آنکھیں بند کرکے کہا "تمہارا دیوانہ۔"

"میں کون؟"

"میری جان' میری زندگی۔"

"اپنا نام بتاؤ۔"

"مجنوں۔۔۔ فرہاد۔۔۔ رومیو۔۔۔ مہینوال۔"

"میرا نام بولو۔"

"لیلیٰ' شیریں' جیولیٹ' سوہنی۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"تم سے محبت۔"

"کیا محبت کی جاتی ہے؟"

"نہیں' محبت ہوجاتی ہے۔"

"محبت کیا ہوتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم' میرا دل چیر کے دیکھو۔"

"کبھی پہلے محبت کی ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کیسے جانا کہ یہ محبت ہے؟"

"جیسے بندہ اپنے خدا کو جانتا ہے۔"

"محبت کی خاطر کیا کرسکتے ہو؟"

"سب کچھ۔ اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"جو میں کہوں گی' کروگے؟"

"کروں گا۔"

"ہیرا پھیری چھوڑ دو۔"

"چھوڑ دی۔"

"وہ سب چکر بازی چھوڑ دو جو پہلے کرتے تھے۔"

"چھوڑ دی۔"

"انسان کے بچے بن جاؤ۔"

"بن گیا۔"

"ثابت کرکے دکھاؤ گے؟"

"دکھاؤں گا۔"

ڈاکٹر کمال فاروقی ہنسنے لگا "تُو اسے مداری کہتا ہے۔ مداری تو خود ہے۔ مگر ابھی تک تیرا کھیل جما نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں یار' اسے یقین ہی نہیں آتا کہ میں نے وہ سب کچھ صرف اس کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اب بھی وہ اصرار کرتی ہے کہ انسان کے بچے بن جاؤ۔"

"اس میں چندا کی کیا غلطی ہے۔"

میں نے کہا "سور کے بچے۔ میں پہلے کیا تھا' اب کیا ہوں۔ تجھے فرق نظر نہیں آتا۔ میں نے اپنے آپ کو بدل دیا۔ اپنی زندگی کے اصول اور راستے سب بدل دیے۔ میں وہ نہیں رہا' جو میں تھا۔ آخر کس کے لیے اتنی بڑی قربانی دی میں نے کہ اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔ گلا گھونٹ دیا ضمیر صاحب کا۔ سچ کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک عورت کے لیے کمینہ اور خود غرض بن گیا' مجھے شرم آتی ہے۔"

"ہر وقت؟" کمال نے کسی ڈاکٹر کی طرح سوال کیا "باقاعدگی سے۔۔۔"

میں ہنس پڑا "میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے غلطی کی۔"

"چندا سے بحث کرکے۔"

"اس کی محبت کی خاطر وہ سب کچھ چھوڑ کے' جو صحیح تھا۔ اگر کوئی سپاہی اپنی محبوبہ کے خیال سے محاذِ جنگ چھوڑ کر بھاگ آئے۔ اگر ایک ڈاکٹر کسی لڑکی کے عشق کی وارفتگی میں اپنے اعجازِ مسیحائی سے دستبردار ہوجائے۔ بے نور آنکھوں کو روشنی دینے والا سرجن کسی عورت کے کہنے پر چوڑیوں کی دُکان سجالے۔ تاجر یا اسمگلر بن جائے۔ ایک عالمِ دین تبلیغ چھوڑ دے۔ تو اسے غلطی کہیں گے گناہ یا جرم؟ لیکن محبت ایسے ہی پاگل کردیتی ہے۔"

"ایڈورڈ ہشتم نے ایک بیوہ مسز سمپسن کے لیے برطانیہ کی بادشاہت چھوڑ دی تھی۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ موجودہ ملکۂ برطانیہ الزبتھ کے والد جارج ششم اس کے بعد ہی تخت نشین ہوئے تھے۔ مگر فاروقی صاحب' اس قربانی سے کسی کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ ایڈورڈ ہشتم کے نزدیک وہ کوئی نقصان نہیں تھا۔ اس کی جگہ جارج ششم نے تخت سنبھال لیا۔ کاروبارِ سلطنت اسی طرح چلتا رہا۔ میں نے نیکی کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ کام چھوڑ دیا جس میں فلاح تھی۔ ایک جہاد تھا جو میں نے ہر جگہ جاری رکھا۔ کوئی مداری کسی بھی روپ میں میرے سامنے آیا میں نے وہی روپ دھار کے اس کا بیڑا غرق کردیا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے میں نے کیسے کیسے بہروپ بدلے اور کہاں کہاں نہیں گیا۔ وہ کتنے خطرناک مداری تھے جن کے حصار میں داخل ہوکے میں نے

دھوکے اور جعلسازی' فریب اور بدمعاشی کے بارود خانے میں چنگاری پھینک دی اور سب تہس نہس کردیا۔ وزیراعظم بننے والی بات تو لطیفہ تھی اور ہے۔ تقدیر نے پھر مجھے موقع فراہم کیا ہے ایک مداری کے کھیل کو ختم کرنے کا تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کو اس شیطان کا مکروہ چہرہ دکھانا میرا فرض ہے۔ میں اسے نیست و نابود کرسکتا ہوں تو مجھے یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ اس چیلنج میں پہلے بھی میرے لیے بڑی کشش تھی' تو اسے کچھ بھی نام دے سکتا ہے۔ میری فطرت میں خطرات پسندی شامل تھی۔ مجھے ایڈونچر اچھا لگتا تھا۔ میں مجبور ہوجاتا تھا کہ جہاں بُرائی کو ختم کرنا ممکن ہو وہاں اس کے خلاف کھڑا ہوجاؤں۔"

"مختصر یہ کہ آپ کو پنگا لینا اچھا لگتا تھا؟"

"ہاں یار' میرے اندر سے ایک آواز اٹھتی تھی کہ یہ کام تمہارا ہے' تم یہ کام کرسکتے ہو۔ ایسی کی تیسی کردو اس مداری کی' خدا نے تمہیں عقل دی ہے اور ہمت دی ہے تو پھر نظر کیوں چراتے ہو۔ میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ بہانہ نہیں کرسکتا تھا اپنے آپ سے۔ ضمیر صاحب مجھے کوڑے مارتے تھے کہ اٹھو' آگے بڑھو' یہ ایک مقدس فریضہ ہے۔ یہ جہاد ہے' بزدل اور خود غرض مت بنو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بھی میں نے کسی مداری کا کھیل ختم کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارے تماشا دیکھنے والے میرے احسان مند ہیں۔ میرے شکرگزار ہیں کہ میں نے انہیں دھوکے کا شکار ہونے سے بچالیا۔ تباہی سے بچالیا۔ اس احساس میں بھی بڑا لطف تھا۔ وہی خوشی تھی جو ایک زہریلے سانپ کا پھن کچل کے ملتی ہے جو اندھیرے میں چھپا بیٹھا ہو اور کسی کو معلوم نہ ہو۔ سانپ اپنے قریب آنے والے ہر شخص کو ڈس چکا ہو۔ جس کے ڈسنے سے کسی کا اکلوتا جوان بیٹا مرگیا ہو۔ کسی کا سہاگ اُجڑا ہو اور کسی کو یتیمی ملی ہو۔ اگر میں اسے دیکھ کے ڈر جاؤں۔ بھاگ جاؤں' نظر چُرالوں کہ مجھے کیا' میرے ہاتھ خالی ہیں۔ ماردے گا جس کے پاس لاٹھی ہوگی۔ تو لاٹھی والے کے آنے تک وہ سانپ نہ جانے کتنی زندگیوں کے چراغ گل کردے گا۔ کیا ان سب کے خون کا الزام مجھ پر نہیں آئے گا؟ کہ میں نے اسے بروقت دیکھا تھا اور ماردیا ہوتا تو آج کتنے لوگ زندہ ہوتے۔ بڑا سکون اور اطمینان ملتا تھا ایسے ہر سانپ کو مار کے۔ ایک بار میں نے کسی فلم میں سین دیکھا تھا' ایک خطرناک پاگل فرار ہوگیا تھا اور اس کے ہاتھ خودکار اسلحہ لگ گیا تھا۔ اس نے کئی جانیں لیں اور بہت خوف و ہراس پھیلایا۔ حالانکہ وہ فلم تھی مگر جب بالآخر ہیرو نے اسے مارا تو میں نے بڑے سکون کا سانس لیا تھا۔ جم کاربٹ کی کہانیاں ضرور پڑھی ہوں گی تو نے۔ اس نے کس طرح آدم خور شیر مارے تھے جنہوں نے بستیوں میں دہشت پھیلا رکھی تھی اور جوان گھبرو لوگوں کو اٹھا لے گئے تھے۔ ایسے ہی ڈاکو بھی ہوتے تھے۔ ان آدم خور شیروں یا ڈاکوؤں کو ہلاک کرنے والے کو کیسی طمانیت اور خوشی ملتی ہوگی' سیکڑوں ہزاروں انسانوں کو تحفظ فراہم کرکے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کے اور۔۔۔"

"اور یہ سوچ کے میں کتنا بہادر ہوں' کیا زبردست ہیرو ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہر فتح میں یہ نشہ اور غرور تو ہوتا ہے۔ اور آج اس نشے کے بغیر اپنی زندگی پھیکی اور بے کیف لگتی ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے فاروقی صاحب کہ آپ بس پیسہ کمارہے ہیں۔ کماتے جارہے ہیں۔ ساری ذہانت اور صلاحیت بس اس ایک مقصد کے لیے وقف کردی ہے اور مقصد کوئی نہیں۔ تیرے پاس دولت آئی تو ایک مقصدِ حیات بنالیا تو نے اور آج تجھے وہ خوشی' سکون اور اطمینان حاصل ہے جو مجھے نہیں۔ عمران خان نے بھی نام کمایا تو اسے شہرت اور فتح مندی کی خوشی ملی مگر جب وہ ریٹائر ہوا تو اس نے ساری دولت زیادہ بڑے مقابلے کے لیے وقف کرکے اپنے لیے نیا چیلنج تلاش کرلیا۔ وہ کرکٹ کے میدان سے بڑا میدان ہے۔ جس میں عمران خان نے ورلڈ کپ سے بڑی فتح کا اعزاز حاصل کیا۔ میں صرف چندا کے لیے ریٹائر ہوگیا اور اب جھک ماررہا ہوں' لعنت ہے مجھ پر۔"

"تجھ میں ہمت ہے یہ سب چندا سے کہنے کی؟"

"چندا سے کیا' میں چندا کے باپ سے نہیں ڈرتا۔ میں اسے بتاچکا ہوں۔"

"وہ چاہتی ہے کہ تُو انسان کا بچہ بن جائے۔ تو پھر مداری بننا چاہتا ہے۔ کیا تجھے احساس نہیں کہ اس طرح تو چندا کی محبت سے محروم ہوجائے گا۔"

میں نے قہقہے کے ساتھ کمال کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "دماغ خراب ہے تیرا۔ محبت کیا سکۂ رائج الوقت ہے۔ نوٹوں کا یا سونے کی اینٹوں کا ڈھیر ہے جس سے کوئی ڈاکو مجھے محروم کردے یا جاگیر ہے۔ تیرے پاس ڈگری ہے ایم بی بی ایس کی۔ کوئی تجھے اس صلاحیت اور علم سے محروم کرسکتا ہے' میں بھی ڈاکٹر ہوں' فاروقی صاحب اور چندا بھی ڈاکٹر ہے۔ ہم دونوں نے محبت میں پی ایچ ڈی کرلی ہے۔ نہ وہ مجھے محبت سے محروم کرسکتی ہے نہ خود محروم ہوسکتی ہے۔"

"تو کارڈ چھپوا لے اپنے' ڈاکٹر ناصر عظیم ایم اے (عاشقی) پی ایچ ڈی (افلاطونی محبت)"

"ناصر عظیم! کون ناصر عظیم۔۔۔۔ میں شاہ عالم ہوں اُلّو کے پٹھے۔"

اس نے مجھے کالر سے پکڑ کے اٹھایا "اگر یہ بات ہے تو نکل باہر۔ سؤر کے بچے۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "اپنے باپ کو جانتا ہے تو۔۔۔؟"

اس نے مجھے باہر دھکیل دیا "وہ تو خود تو بھی نہیں جانتا۔"

میں نے اس کے دروازے پر لات ماری "میں جان لوں گا

ایک دن ڈاکٹر کمال فاروقی۔ مجھے معلوم ہو جائے گا بالآخر۔"

اس نے اندر سے ہی کہا "چل بھاگ یہاں سے' مداری کے بچے۔"

پھر اندر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور اس سے پہلے کہ میں نیچے اُترتا' کمال نے پھر دروازہ کھولا اور چلا کے کہا "تیمور کا فون ہے آپ کے لیے شاہ عالم صاحب۔"

شاہ عالم نے کہا تھا کہ تیمور مجھے بتا دے گا اور تیمور نے مجھے بتا دیا کہ مجھے شاہ عالم بن کے کیا کام کرنا ہے۔ وہ پہلا کام تھا جو ناصر عظیم نے شاہ عالم بن کے کیا تھا۔

اور آخری کام کیا تھا؟ یہ کہ میں نے اس کا کام تمام کردیا؟

شاہ عالم کا کھیل ختم ہوا۔ تماشا دکھا کے مداری گیا۔ لیکن اسے میں نے نہیں مارا۔ آج اس کا مزار مرجع خلائق ہے کیونکہ کچھ مداری اس کھیل کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس ملک میں ہی نہیں شاید اس برصغیر میں لاشوں پر سیاست کرنے کا چلن رہا ہے۔ اندرا گاندھی کی چتا جلی تو راجیو گاندھی کے سر پر وزارت عظمیٰ کا تاج سج گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے قتل نے اس کی بیٹی حسینہ واجد کے لیے بنگلہ دیش کی سیاست میں ایوان اقتدار تک پہنچنے کا دروازہ کھول دیا اور اس کی حریف خالدہ ضیا کو خود اپنے شوہر کے قتل سے وہ سیاسی طاقت حاصل ہوئی جس نے بالآخر اسے کامیاب کیا۔ سری لنکا میں بندرا نائیکے کے قتل کا اس کی بیوی نے میدان سیاست میں بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور مظلوم بن کے سارے سیاسی حریفوں کو شکست دی تھی۔ پھر شاہ عالم کو شہادت کے منصب پر فائز کرنے والے اس کی لاش پر سیاست کیوں نہ کریں۔ اقتدار کی رسّا کشی جاری ہے۔ ہر طرف نظر آنے والے بینرز پر پوسٹروں اور نعروں میں شاہ عالم کے "بے گناہ مظلوم" لہو کی پکار ہے۔ ہر مداری چیخ چیخ کر اسے ریاستی قتل قرار دے رہا ہے۔ ہر جگہ انصاف انصاف کی فریاد ہے۔ انتقام' انتقام کا شور ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عالم مر گیا ہے۔ اسے مار دیا گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود شاہ عالم زندہ ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرنے والا شاہ عالم ہی تھا۔ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت خود شاہ عالم اچانک نمودار ہو کے دے گا۔ وہ سب سے بڑا مداری تھا' اور ہے۔

اور میں یعنی ناصر عظیم یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا میرا کھیل بھی تمام ہونے والا ہے۔ ہر کھیل بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ کیسے کیسے مداری تھے جن کا کھیل میں نے ختم کیا' میں خود ان سے بڑا مداری نہ ہوتا تو یہ ناممکن تھا۔

○☆○

میں اتنا بڑا مداری کیسے بنا؟

اس سوال کا ایک شاعرانہ مگر فلسفیانہ حقیقت رکھنے والا مکمل جواب تو یہ ہے کہ۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا تھا وہ لوٹا رہا ہوں میں

ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کی شخصیت کی تکمیل کرنے والے کچھ عوامل تو موروثی ہوتے ہیں۔ جدید تحقیق تو یہ ہے کہ آپ کی شخصیت پیدائشی ہوتی ہے' آپ کی صورت کی طرح سیرت بھی قدرت کی طرف سے ایک سانچے میں ڈھل کے نکلتی ہے اور یہ سانچا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ماں باپ یا ان کے بھی ماں باپ میں سے کسی کی صفات شامل ہو جاتی ہیں۔ اس سانچے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ آپ کا چہرہ' جسمانی ساخت رنگ و روپ۔ بالوں یا آنکھوں کے رنگ' آواز اور انداز کی طرح آپ کی ذہنی صلاحیت اور رجحانات سب پیدائشی ہوتے ہیں۔ تاہم نفسیاتی عوامل بھی اپنا کردار ضرور ادا کرتے ہیں۔ آج کوئی کیا ہے اور کیوں ہے' اس کا جواب ماضی کے ان حالات میں تلاش کیا جا سکتا ہے جس میں اس نے پرورش پائی تھی۔

میرے ساتھ ٹریجڈی یہ ہے کہ مجھے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ بس میرا خیال ہے کہ میرا نام ناصر عظیم ہے تو یقیناً میرے باپ کے نام پر ہوگا اور ناصر میرا نام رکھا گیا ہوگا تو باپ نے اپنا نام جوڑ کے اسے اپنی شناخت بنا لیا ہوگا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ شاید اس طرح میرے باپ نے فخر بھی محسوس کیا ہو۔ ناصر کس کا بیٹا ہے۔ عظیم کا؟ جیسے علامہ اقبال کا بیٹا جاوید اقبال اور لیاقت علی خان کے بیٹے اشرف لیاقت اور اکبر لیاقت۔

اپنی انتہائی کوشش کے باوجود ابھی تک میں اپنے باپ کا پورا نام تک معلوم نہیں کر سکا۔ وہ محمد عظیم تھا' عظیم خان' عظیم الدین' مرزا عظیم بیگ... اس کے نام کے آگے پیچھے کیا تھا۔ وہ شیعہ تھا یا سنی؟ سیّد تھا یا پٹھان' وہ کہاں کا رہنے والا تھا اور کیا کرتا تھا؟ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ میری تلاش جاری ہے اور جاری رہے گی۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ مجھے کسی ذریعے سے کوئی خبر ملی اور میں تصدیق کے لیے نکل کھڑا ہوا کہ شاید مجھے اپنے ماں باپ کا پتا چل جائے۔ مجھے اپنا گھر مل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ میرے کتنے بھائی بہن تھے۔

ایسی ہر تلاش مجھے نہ جانے کہاں کہاں لے گئی مگر انجام ہر بار مایوسی پر ہوا مگر میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ نہ جانے کیوں ایک اُمید کی کرن میرا ساتھ نہیں چھوڑتی اور جستجو کے ہر سفر میں ناکامی کے بعد میرے یقین کو شکست سے محفوظ رکھتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر کوئی تو ہوگا جو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کے حالات کا پورا علم رکھتا ہوگا۔ میں خود اپنے پیروں پر اپنی مرضی سے چل کے تو یتیم خانے نہیں پہنچ گیا تھا۔ اور وہاں رجسٹر میں یہ نام میں نے بقلم خود ہرگز نہیں لکھا ہوگا۔ کسی نے بتایا ہوگا کہ یہ میرا نام ہے۔

ناصر عظیم بہت عام قسم کا نام نہیں ہے جیسے محمد علی یا غلام حسین' رفیق یا سلیم احمد۔ عبداللہ یا عبدالقیوم۔ اگر مجھے یتیم خانے پہنچانے والا میرے نام سے بے خبر ہوتا تو اس کا ذہن کوئی عام اور

سیدھا سادہ نام سوچتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے میرا نام خود مجھ سے پوچھا ہو' تین سال کا بچہ بھی اپنا اور اپنے باپ کا نام ضرور بتا سکتا ہے لیکن ماں کا نام نہیں جانتا۔

میں نے تمام امکانات پر غور کیا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ میرا کوئی نام نہ ہوتا اور میرے باپ کا نام نہ ہوتا تو حرامی میرے نام کا حصہ بن جاتا اور وہاں مجھے اصل نام سے کم اور اس شرمناک صفت کے حوالے سے زیادہ پکارا جاتا مگر ایسا نہیں تھا۔ ایسے لڑکے وہاں تھے جن کو باقاعدہ حرامی ہونے کی سند ملی ہوئی تھی اور اٹھتے بیٹھتے انہیں سب کے سامنے بتایا جاتا تھا کہ وہ گناہ کی پیداوار ہیں۔ ان کا باپ کوئی بے غیرت تھا اور ان کی ماں بے حیا تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اگر خود میں نے ہی اپنا نام ناصر عظیم بتایا تھا تو پھر ایک امکان یہ ہے کہ میں اپنے والدین سے بچھڑ گیا تھا اور کسی میلے یا بازار کی بھیڑ بھاڑ میں۔ بچے بعض اوقات گھر سے اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ واپسی کا راستہ انہیں یاد نہیں رہتا اور وہ اتنے چھوٹے ہوں کہ کسی کو پتا بھی نہ بتا سکیں تو بس روتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی میرے ساتھ ہوا ہو۔ کوئی مجھے اپنے گھر لے گیا ہوگا۔ شاید اس کے پہلے ہی بہت بچے ہوں گے۔ اس کے گھر میں اور اس کے بجٹ میں مزید کسی بچے کے اخراجات برداشت کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی یا اس کی بیوی کسی لاوارث بچے کو گھر میں رکھنے پر راضی نہ ہوئی ہو۔ یہ ہو سکتا ہے اس شخص نے میرے والدین کو تلاش کیا ہو اور جب کوئی سراغ نہ ملا ہو تو مجھے یتیم خانے میں داخل کرا گیا ہو۔

دوسرا امکان یہ تھا کہ میرے والدین مر چکے ہوں اور کسی جاننے والے عزیز یا پڑوسی نے مجھے یتیم خانے پہنچا کے گلو خلاصی کرائی ہو۔ اگر میرے باپ کا کوئی چھوٹا موٹا مکان تھا تو اس پر کوئی قابض ہو گیا ہو اور میرے بارے میں مشہور کر دیا ہو کہ وہ گھر سے نکلا تھا مگر لوٹ کے نہیں آیا۔ کسی نے اسے اغوا کر لیا یا وہ خود گھر سے بھاگ گیا۔ ایسی کہانیاں عام ہیں اور میں بھی ایسی ہی کسی کہانی کا کردار تھا۔

سب سے عجیب وہ خواب تھا جو میں اکثر دیکھتا تھا کہ میری ماں مجھے باپ سے ملوانے ایک پہاڑ پر لے گئی ہے اور باپ' میرا اور ماں کا ہاتھ تھام کے پہاڑ کی چوٹی سے کود گیا ہے۔ خوابوں کی تعبیر بتانے والے اور لاشعور یا تحت الشعور کی مدد سے تحلیل نفسی کرنے والے اس کا کوئی مطلب نہیں بتا سکے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا تعلق ہوش سنبھالنے سے پہلے کے کسی واقعے سے ہے مگر وہ میرے گزرے ہوئے وقت کی اس انتہا تک نہیں پہنچ پاتے جس سے یہ خواب منسوب ہو۔ وہ تحت الشعور کے تاریک مدفن کی اس گہرائی میں نہیں جھانک سکتے جہاں کوئی ناخوشگوار یاد چھپی بیٹھی ہے۔

ڈائری لکھنے کا سلسلہ تو میں نے بہت دیر سے ابھی چند سال قبل ہی شروع کیا تھا۔ میں ہر روز باقاعدگی سے ڈائری نہیں لکھتا تھا۔ جب کوئی خاص واقعہ پیش آتا تھا جو میرے ذہن کو اتنا متاثر کرے کہ اس پر اپنا نقش چھوڑ جائے تو میں فرصت ملتے ہی قلم اٹھا لیتا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں کسی کو سب سُنا رہا ہوں' میں اکیلا نہیں' میرے سامنے کوئی ہے جس سے میں مخاطب ہوں۔ یہ نہیں کہ میں اس دنیا میں اکیلا تھا اور ایسا کوئی نہیں تھا جس سے میں دل کی بات کہہ سکوں' ڈاکٹر کمال فاروقی' جو پہلے صرف کمال تھا۔ چندا اور خان جی' تھے۔ یہ سب ایسے لوگ تھے جن سے میں کچھ چھپا ہی نہیں سکتا تھا۔ جن کے سامنے میں اپنا دل کھول کے رکھ دیتا تھا۔ اپنے دل کا سارا غبار نکال سکتا تھا۔ بیشتر واقعات جو میں نے ڈائریوں میں لکھے ان سب کے علم میں ہیں۔ اس کے باوجود میں ڈائری لکھتے وقت یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے مقابل کوئی ہے جو میری بات بڑے دھیان سے سُن رہا ہے۔ آخر میں کس کے تصور سے باتیں کرتا تھا؟ وہ بے چہرہ بے نام ذات کس کی تھی؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتا' شاید میں اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا۔

جو کچھ ڈائریوں میں ہے اس سے پہلے کے واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ کچھ یادیں بہت واضح ہیں۔ کچھ نامکمل اور دھندلی ہیں۔ مثال کے طور پر یتیم خانے میں گزارے ہوئے وقت کی ساری تفصیلات میری یادوں میں محفوظ نہیں ہیں مگر کچھ یادوں کے نقش اتنے گہرے ہیں کہ مٹائے نہیں مٹتے۔

وہ کون سا یتیم خانہ تھا اور کس شہر یا قصبے میں تھا' یہ میں معلوم نہیں کر سکا۔ میرے ذہن میں اس عمارت کا دھندلا سا تصور موجود ہے۔ کسی بہت پُرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کی طرح جو بیس سال بعد ریڈ اینڈ وائٹ ہو جاتی ہے مگر اس سے عکس کی ماہیت نہیں بدلتی۔ وہ عمارت باہر سے دیکھنے میں کیسی لگتی تھی۔ اندر سے کیسی تھی۔ اس کا کیا ماحول تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے یاد کروں تو سب بتا سکتا ہوں۔ اس پُرانی تصویر کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اس یتیم خانے کو بہت تلاش کیا۔ جب میرے پاس وقت تھا اور وسائل تھے تو میں ایک پلان کے تحت ہر شہر اور قصبے میں گیا جہاں کوئی یتیم خانہ تھا مگر کہیں بھی مجھے وہ جگہ نظر نہیں آئی جو میری یادداشت میں محفوظ تصویر سے مشابہ ہوتی۔ بیس سال بعد کوئی چھو اور کوئی جگہ اپنی اصل حالت میں نہیں ملتی۔ گلی محلے اور بازار سب بدل جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ پرانی نشانیاں باقی رہتی ہیں۔ کوئی درخت کوئی مینارہ۔ کوئی چھجا یا چوبارہ۔ کوئی دریچہ یا محراب۔ کوئی بالے دی ہٹی یا فقیر کا ڈیرا۔ پھر اصل عمارت کا سراغ مل جاتا ہے اور اس کے نقوش خواہ کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں مگر پھر بھی پہچانے جاتے ہیں اور پہچان لیتے ہیں۔ ہاں' ہاں۔ میں وہی ہوں۔ اور تم۔ تم وہی ہو نا......

لیکن وہ یتیم خانہ تو جیسے کرۂ ارض پر ہی نہیں تھا۔ اس کے بھی متعدد اسباب ہو سکتے تھے۔ وہاں اب یتیم خانے کی جگہ کوئی ہوٹل یا

سینما بن گیا ہو۔ رہائشی عمارت یا کارخانہ تعمیر کرلیا گیا ہو۔ کسی نے وہ جگہ خرید کے یتیم خانے کو بلڈوزر سے برابر کردیا ہو۔ یتیم خانے کے بچے ادھرادھر دوسرے یتیم خانوں میں تقسیم کردیے گئے ہوں یا یتیم خانہ کسی اور جگہ منتقل کردیا گیا ہو۔

اگر میری پرورش کسی عام سے گھر میں والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ ہوتی تو پھر میں آدمی ہوتا۔ مداری نہ ہوتا۔ پھر یہ کہانی بھی جنم نہ لیتی۔ میرے لیے اس یتیم خانے کا سراغ لگانا یوں بھی ضروری تھا کہ مداری کا کھیل وہیں سے شروع ہوا تھا۔ اس وقت میری حیثیت بچہ جمہورا سے زیادہ نہیں تھی مگر جب میں وہاں سے نکلا تو خود ایک مداری بن گیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک خداداد صلاحیت تھی ورنہ میرے جیسے وہاں بہت تھے جو اس یتیم خانے سے نکلے تو دنیا میں بھی یتیم اور لاوارث ہی جیئے اور مرے۔

میرے ذہن میں گھوڑوں کے اصطبل یا مرغی خانے جیسی ایک بیرک نما عمارت ہے۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی۔ درمیان میں گراؤنڈ تھا اور سامنے دوسری دو منزلہ بیرک تھی۔ تیسری طرف یعنی احاطے کے گیٹ کے عین مقابل رہائشی علاقہ تھا۔ اس میں سب سے بڑا گھر یتیم خانے اور اسکول کے مالک کا تھا جو کوٹھی کہلاتا تھا۔ باہر سے ہمیں اس کا سرسبز لان اور رنگ برنگے پھول ہی نظر آتے تھے۔ لان کے گرد قدِ آدم اور گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔ اس میں سے ہم مالک کے بچوں کو لان پر کرکٹ کھیلتا دیکھ سکتے تھے اور ان کے ہنسنے کھیلنے، لڑنے اور چلّانے کی آوازیں سن سکتے تھے اور حیران ہوسکتے تھے کہ کیا بچے ایسے بھی ہنس سکتے ہیں اور اتنی بلند آواز میں بات کرسکتے ہیں، بہن بھائی آپس میں یوں لڑسکتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بال نوچ لیں اور کپڑے پھاڑدیں اور پھر روتے ہوئے ماں یا باپ سے شکایت کریں تو انہیں کچھ بھی نہ کہا جائے اور وہ کچھ دیر بعد پھر اسی طرح کھیلنے لگیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ہر صبح ایک سفید رنگ کی چم چم کرتی گاڑی دو لڑکوں اور ایک لڑکی کو اسکول چھوڑنے جاتی تھی اور پھر دوپہر کے وقت واپس لاتی تھی۔ میں ان خوش قسمت لڑکوں میں شامل تھا جنہوں نے اس کوٹھی کو اندر سے دیکھا تھا۔ آج میرا معیار بدل گیا ہے لیکن اس وقت میں کوٹھی کو دیکھ کے دنگ رہ گیا تھا اور جب میں نے کوٹھی کی آرائش، شان وشوکت اور وہاں رہنے والوں کی شاہانہ زندگی کے بارے میں بتایا تھا تو سننے والے دنگ رہ گئے تھے۔

دوسرا گھر اس سے چھوٹا تھا مگر بنگلا کہلاتا تھا۔ اس کے سامنے والے حصّے میں لان کے بجائے صحن تھا اور پکی اینٹوں سے بنی ہوئی چھ سات فٹ اونچی دیوار تھی۔ اس میں یتیم خانے کے منیجر صاحب رہتے تھے جو اسکول کے پرنسپل بھی تھے اور رشتے میں مالک کے سالے تھے۔ میں نے اور میرے علاوہ بہت سے لڑکوں نے یہ گھر بھی اندر سے دیکھا تھا اور ہمیں اس وقت یہ "بنگلا" واقعی بہت بڑا لگا تھا حالانکہ وہ تین کمروں پر مشتمل کوارٹر تھا۔

تیسرے حصّے میں ملازم رہتے تھے۔ ایک کمرا اسکول کے چوکیدار کے لیے تھا اور وہ اس میں اپنی پوری فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسرا کمرا مالک کے ڈرائیور کو ملا ہوا تھا۔ اس میں کچھ عرصے اسکول کا ایک کلرک بھی رہا تھا۔ پھر وہ اچانک غائب ہوگیا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا جو ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا تھا اور ہم سے بھی ہنسی مذاق کرتا تھا۔ اس کی لاش کافی عرصے بعد پولیس نے سرونٹ کوارٹر کے صحن سے کھود کے نکالی تھی اور قتل کے الزام میں چوکیدار کو پکڑ کرلے گئی تھی۔ وہ زیادہ عرصہ جیل میں نہیں رہا تھا۔ مالک اسے چھڑالائے تھے مگر اس کی عدم موجودگی میں گھر مقفل رہا تھا۔ میں نے بڑی جاسوسی کرکے پتا چلالیا تھا کہ چوکیدار کی بیوی بھی غائب ہے۔ چوکیدار نے اسے طلاق دے کے اپنے گھر بھیج دیا تھا مگر اصل اسٹوری کا علم مجھے بعد میں ہوا تھا۔

میرا خیال ہے کہ وہاں سو سوا سو بچے رہتے تھے۔ ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ کچھ نئے بچے آتے تھے تو کچھ نکل بھی جاتے تھے۔ بہت کم خوش نصیب ایسے تھے جن کو بے اولاد لوگ اپنے گھر لے گئے اور وہ کبھی لوٹ کے نہیں آئے۔ وہاں سے بھاگنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں سے کچھ مجھے بعد میں بھی نظر آئے مگر اس حال میں کہ مجھے ان کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا اور ان سے مل کے مجھے یہ احساس ہوا کہ شاید وہ خود بھی یتیم خانے سے فرار ہوکے پریشانی اور پشیمانی کا شکار تھے۔ لیکن ان کا واپس آنا اتنا ہی ناممکن تھا اور اتنا ہی ناقابلِ تصور جتنا دوسری دنیا کو سدھارنے والوں کا لوٹ کر اس دنیا میں آنا۔

یتیم خانے کی ایک الگ دنیا تھی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ایک لڑکا جسے وہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، یتیم خانے سے بھاگ گیا مگر ایک ہفتے بعد واپس آگیا۔ صرف ایک رات کے لیے۔ وہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ صبح وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا ہمیشہ کے لیے، اس کا نام ناصر عظیم تھا۔

مجھے یتیم خانے میں کئی سال ہوگئے تھے۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ جب میں وہاں پہنچا تھا تو میری کیا عمر تھی مگر کچھ عرصے وہاں رہنے کے بعد میں نے خود کو اس ماحول کا عادی بنالیا تھا۔ ابتدائی دنوں میں وہاں کے معمولات میرے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ میں بہت روتا تھا اور بہت مار کھاتا تھا۔ اپنے سے بڑے بچوں سے بھی اور اپنے استادوں سے بھی۔ ان کو استاد کہنا یقیناً استاد کے بلند مرتبے کی توہین کے مترادف ہے کیونکہ وہ سب جلاد تھے یا جیلر تھے اور معصوم لاوارث بچوں کے ساتھ ان کا سلوک ظالمانہ ہی نہیں انسانیت سوز اور بعض اوقات شرم ناک ہوتا تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ مرجاؤں مگر مرنا آسان نہ تھا۔ مجھے موت سے بہت ڈر لگتا تھا۔ میں بھاگ کر بھی کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری عمر کے بچے کو لاوارث پھرتا دیکھ کے پولیس پکڑلے گی یا خرکار اغوا کرلیں گے۔ پولیس ایسے بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اور خرکار ان

کو کیسے بیڑیاں پہنا کے رکھتے ہیں۔ کس طرح ان کو ایک وقت روکھی سوکھی دے کر ان سے کام لیتے ہیں اور کام چوروں کو کوڑے مارتے ہیں، کوئی بیمار ہوجائے تو اسے دوا لینے سے کفن دینا اچھا سمجھتے ہیں۔ کفن دینا بھی محاورے کی بات ہے ورنہ وہ اسے مار کے کہیں بھی گاڑ دیتے ہیں۔ بچوں کی جیل میں کیا ہوتا ہے اور اغوا کرنے والوں کے گروہ کس طرح چھوٹے چھوٹے بچّوں کو مڈل ایسٹ بھیج دیتے ہیں جہاں ان کو اونٹوں پر باندھ کے بٹھادیا جاتا ہے جب اونٹوں کی دوڑ ہوتی ہے اور وہ دہشت زدہ بچے چیختے ہیں تو تماشائی بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ بچے خوف سے مرجاتے ہیں، وہ اس ریس میں روندے جاتے ہیں۔ بچ جائیں تو معذور ہوجاتے ہیں اور ماردیے جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں سلامت رہیں تو غلام بنالیے جاتے ہیں۔ یہ سارے قصے ہمیں بڑی ظالمانہ تفصیل کے ساتھ خود ہمارے اتالیق سُناتے تھے تاکہ ہم یتیم خانے سے بھاگنے کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔

اس کے باوجود جب بچے بڑے ہوجاتے تھے تو موقع ملتے ہی فرار ہوجاتے تھے۔ وہ باہر کی دنیا کو دیکھتے تھے تو انہیں آزادی سے زندگی گزارنا ناممکن نہیں لگتا تھا اور وہ سمجھ جاتے تھے کہ یتیم خانے میں جو کچھ انہیں بتایا جاتا تھا وہ سب سچ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بچوں کو گیراجوں میں اور ہوٹلوں میں کام کرتا دیکھتے تھے۔ اخبار بیچتے اور گاڑیاں دھوتا دیکھتے تھے۔ کوڑا کچرا چنتے اور بھیک مانگتا دیکھتے تھے تو یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے تھے کہ آخر ان کے ساتھ وہ سب کیوں نہیں ہوا جس سے یتیم خانے کے بچوں کو ڈرایا جاتا تھا۔ آخر وہ خود ان بچوں کی طرح آزاد رہ کے ایسا ہی کوئی کام کیوں نہیں کرسکتے۔ کام کرنے کی نیت ہو تو دنیا میں کام کم نہیں۔ وہ دیکھتے رہتے تھے اور سوچتے رہتے تھے اور بالآخر ایک دن غائب ہوجاتے تھے۔

چار پانچ سال سے کم عمر کے بچے بہت کم آتے تھے اور عام طور پر انہیں گود لینے والے پسند کرلیتے تھے۔ بے اولاد لوگ زیادہ عمر کے بچے لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ کچھ چرا کے ہی نہ بھاگ جائے یا انہیں نقصان نہ پہنچادے۔ بہت چھوٹے بچے سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا اور وہ جس گھر میں جاتے تھے وہاں کے ماحول میں پرورش پاکے وہ یقیناً اپنا ماضی بھول جاتے ہوں گے۔

بارہ تیرہ سال سے زیادہ عمر کا بھی وہاں کوئی بچہ نہیں تھا۔ چھ سات سال تک اس یتیم خانے کے ماحول میں ہونے والے ہر ظلم کو برداشت کرنے والا بزدل سے بزدل اور بے وقوف لڑکا بھی بالآخر مزاحمت پر مجبور ہوجاتا تھا اور نکال دیا جاتا تھا یا اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کرلیتا تھا کہ زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے کر دنیا میں اپنا راستہ خود بنانے نکل جاتا ۔ مجھ سے پہلے اور میرے بعد آنے والے ان گنت لڑکے ذلت ورسوائی کی اس دنیا سے نکل گئے مگر میں وہیں رہا۔ اس لیے نہیں کہ میں ان سب کے مقابلے میں کم ہمت تھا یا بے وقوف تھا۔ شاید میں ان سے زیادہ ذہین تھا اور

باہمت تھا۔ چنانچہ میں نے اسی دنیا میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے ' چالاکی اور مکاری سے ' خود غرضی سے اور کمینگی سے ' منافقت اور دوغلے پن سے جینے کا گر آزمانا سیکھ لیا تھا۔ ایک طرف میں نئے پُرانے سب لڑکوں کا لیڈر بن گیا تھا ' میں نے اپنے رویّے سے جس میں شرافت بھی شامل تھی اور بدمعاشی کی طاقت بھی۔ سب پر اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ اس کے لیے میں نے پہلے انتظامیہ کی حمایت حاصل کی تھی۔ انہوں نے مجھے مانیٹر بنادیا تھا۔ نگراں وہ خود تھے مگر یہ سمجھتے تھے کہ مجھ پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ مجھے خوشامد اور جی حضوری ' تابعداری اور جائز و ناجائز فرمانبرداری آتی تھی اور میں ان کے سارے کام رازداری کے ساتھ کرسکتا تھا۔ میں ایسا یونین لیڈر بن گیا تھا جو انتظامیہ کا چمچہ ہوتا ہے مگر مزدور خود اسے ووٹ دے کر منتخب کراتے ہیں۔ نہ میں کسی کا دوست تھا اور نہ ہمدرد۔ جو کچھ میں نے اس وقت کیا وہ آج میرے لیے باعثِ شرم سمجھا جاسکتا ہے مگر بقا کی جنگ کا شرافت ' انسانیت کے اخلاقی اصول ' نظریات اور معیار یا اقدار سے کیا تعلق؟ زندہ رہنے کے لیے کسی بچّے کو سوکھی روٹی کے ٹکڑے بھی نہ ملیں ' خاتون خانہ یہ ٹکڑے چھان بورے والے کو فروخت کرتی ہوں اور چھان بورے والے انہیں بیکری والوں کو بیچتے ہوں جہاں ان سے ڈبل روٹی تیار کی جاتی ہو اور وہ ڈبل روٹی صرف استطاعت رکھنے والوں کو ناشتے کی میز پر ملتی ہو۔ تو کیا اس بچّے کا کسی کتّے کے ساتھ کوڑے کے ڈھیر سے چُن کر کھانا بری بات ہے؟ غیر اخلاقی ہے یا انسانیت سوز حرکت ہے؟ بعض اوقات تو کوڑے کے ڈھیر میں وہ قورمہ بریانی کے ڈھیر بھی مل جاتے ہیں جو آدھی رات کے بعد شادی ہالوں سے سمیٹ کر پھینکے جاتے ہیں۔ جو ندیدے اور پیٹ بھرے مہمان پلیٹوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ تو رات بارہ ایک بجے فقیر بھی نہیں کھاتے۔ غریب غربا نہیں لے جاتے ' اسے کوڑے کے ڈھیر پر اس لیے پھینکا جاتا ہے کہ بیچ سڑک میں یا کسی کوٹھی کے دروازے کے سامنے نہیں ڈالا جاسکتا۔

بعد میں اس عورت کو بھی شرم آئی ہوگی جس نے کسی مجبوری کے تحت اپنی عصمت کا سودا کیا ہوگا۔ میں نے سُنا ہے اور پڑھا ہے کہ جب بنگال میں قحط پڑا تو عورتوں نے ایک مٹھی چاول کے لیے اپنے لختِ جگر بیچ دیے۔ عظیم تر کون سا جذبہ ہے؟ ماتا کا یا پاک دامنی پر غرور کا؟ شیخ سعدیؒ نے کیوں کہا تھا کہ اس سال دمشق میں قحط پڑا تو لوگ عشق کرنا تک بھول گئے۔ ساحر نے کیوں سوال کیا تھا۔ ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟ شرم ' یتیم خانے اور قحبہ خانے چلانے والوں ' ملکوں اور قوموں پر جنگ مسلط کرنے والوں اور زن ' زمین یا زر کے لیے رشتوں کا خون کرنے والوں کو کیوں نہیں آتی؟

میں نے یتیم خانے کی زندگی میں جو کچھ کیا وہ اخلاقیات کے نصاب کی رو سے غلط تھا مگر جیسا کہ میں نے کہا ' وہ بقا کی جنگ تھی۔ یہ جنگ کوڑے کے ڈھیر پر ایک کُتّا اور ایک انسان کا بچہ ایک ہی طرح لڑتے ہیں۔ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے۔ کمزور خورد نا ہوجاتا ہے۔ دنیا میں اخلاقی اصولوں پر ہی ان کی بقا کے لیے کوئی جنگ نہیں لڑی گئی۔ آج آپ ساری دنیا پر نظر ڈالیں کہیں کوئی سیاسی یا معاشی یا مذہبی جنگ شرافت اور اخلاقی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے لڑی جارہی ہے؟

اس کے باوجود مجھے شرم آتی ہے جناب! غلط کار کو اپنی غلطی تسلیم ضرور کرنی چاہیے۔ اگر میں مداری نہ بنتا اور وہ سب مداری نہ ہوتے جو انسانوں کو بچّہ جمورا یا اپنا معمول سمجھتے رہے۔ اپنے جیسا انسان سمجھ کے ان سے انسانیت کا سلوک کرتے تو دنیا میں یہ سب دکھ ' درد ' آلام و مصائب کیوں ہوتے؟

یتیم خانہ پُرانی آبادی کی کسی چھوٹی سی سڑک پر تھا۔ سڑک پر سے تانگے ریڑھے اور سائیکلیں گزرتے رہتے تھے۔ پھر موٹر سائیکلیں اور گاڑیاں بھی گزرنے لگی تھیں۔ رکشا چلنے لگے تھے۔ سامان اور مسافر اٹھانے والی سوزوکی پک اَپ آگئی تھیں۔ پک اَپ میں لمبائی کے رُخ دو سیٹیں لگا کے ٹین کی باڈی بنادی جاتی تھی۔ اس کے اوپر جنگلا بھی ہوتا تھا اور شوقین مزاج ڈرائیور اسے ہر طرف سے خوب سجاتے تھے۔ ایسی گاڑیاں پاکستان کے بیشتر شہروں میں مسافروں کو اسی طرح لاتی لے جاتی ہیں جیسے بس یا ویگنیں۔ اس میں گنجائش تو دس مسافروں کی ہوتی ہے مگر اوپر نیچے چڑھ کے اور پائیدان پر کھڑے ہوکے پندرہ سولہ مسافر آجاتے ہیں۔ ایسی گاڑیاں میں نے کراچی یا لاہور میں نہیں دیکھیں مگر ملتان ' سکھر ' بہاولپور ' پنڈی اور بہت سے ایسے ہی شہروں میں جہاں بس یا ویگن نہیں چلتیں یہی گاڑیاں استعمال ہورہی ہیں۔

وہ بازار بھی اچھا خاصا بارونق تھا۔ اس میں دونوں طرف دکانیں تھیں۔ یہ انارکلی ' جناح اسٹریٹ یا بوہری بازار جیسا شاپنگ سینٹر نہیں تھا۔ یہ کچھ ایسی ہی جگہ تھی جیسے پرانے لاہور کا راج گڑھ یا پشاور میں نوتھیا کا علاقہ۔ نیو کراچی کی لال مارکیٹ یا راولپنڈی میں بَنّی محلّہ۔ یہ سب علاقے اب بہت بدل گئے ہیں۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ تعمیرات بہت زیادہ ہوئی ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں کے ساتھ دکانوں اور مکانوں کے حلیے تبدیل ہوگئے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان علاقوں نے بہت ترقی کی ہے اور دس پندرہ سال بعد وہاں جانے والا خود کو بالکل اجنبی جگہ پر محسوس کرتا ہے خواہ اس کا بچپن وہیں گزرا ہو۔

دکانوں کی قطار کے درمیان یتیم خانہ تھا۔ اس کی بیرونی دیوار کے ساتھ پندرہ بیس دکانیں ضرور ہوں گی جو یتیم خانے کی ملکیت تھیں اور مالک کو ان سے معقول ماہانہ کرایہ بھی ملتا ہوگا۔ سیاہ رنگ کے گیٹ پر جسے پھاٹک کہنا مناسب ہوگا ' ایک بہت پُرانے بورڈ پر لکھا ہوا تھا "شانِ اسلام ہائی اسکول" اور "یتیم خانہ جنت الاطفال" قائم شدہ ۱۹۴۷ء۔ یہاں پہلے کسی ہندو کا اناتھ آشرم اور

پاٹھ شالا تھا یعنی پاکستان بننے سے پہلے بھی یہاں یہی کاروبار ہوتا تھا۔ مالک کو یہ عمارت کلیم میں ملی تھی اور انہوں نے اسی کارِ خیر کو جاری رکھنے میں فائدہ دیکھا جس سے (علامہ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ) مسلماں کے لیے دنیا و دیں میں سرفرازی ہے۔

شانِ اسلام ہائی اسکول نچلی منزل پر تھا۔ دونوں طرف کی بیرک جیسی عمارت کے دس بارہ کمروں میں چھٹی سے دسویں تک کے ہزار ڈیڑھ ہزار بچے تو پڑھتے ہوں گے۔ یہ دیسی یعنی اردو میڈیم اسکول تھا اور اس کا انتظام بھی ایک یتیم خانے والوں کے پاس تھا چنانچہ یہاں آس پاس کی آبادی کے غریب بچّے ہی پڑھنے آتے تھے جس کا مالک کو بہت دکھ تھا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ میں نے یتیم خانے کا روگ نہ پالا ہوتا تو یہاں ایک بہترین انگلش میڈیم اسکول ہوتا اور جتنی آمدنی مجھے اب ہورہی ہے اس سے دس گنا زیادہ ہوتی۔

اوپر کی منزل کے دس بارہ کمرے ' یتیم خانہ جنت الاطفال کے لیے وقف تھے۔ ہر کمرے میں دس پندرہ بچے رہتے تھے اور ہر بیرک میں ایک کمرا نگراں کے لیے تھا جس کو اتالیق کہا جاتا تھا اور یہ بیرک کا پہلا کمرا ہوتا تھا۔ نیچے جانے کا راستہ اسی کمرے سے گزرتا تھا۔ آخری حصّے میں چار غسل خانے تھے جن کو ہم لیٹرین کہتے تھے۔ ایک کمرا کچن کہلاتا تھا جہاں نسبتاً بڑے بچّے اتالیق کی نگرانی میں دال سبزی پکانا سیکھتے تھے۔ آٹا گوندھنا ' روٹیاں پکانا اور کھانا کھلا کے برتن دھونا ' ان سب کاموں کے لیے کوئی ملازم رکھا جاتا تو ہم جو ویسے ہی حرامی اور حرام خور تھے ' نِرے حرام ہوجاتے۔

جنت الاطفال کا شانِ اسلام ہائی اسکول سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہاں صبح کی شفٹ میں لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے اور دوپہر سے شام تک لڑکیوں کی کلاس ہوتی تھی۔ ہماری درس گاہ وہی کمرے تھے جن میں ہم رات کے وقت اپنی اپنی دری بچھا کے اور میلے تکیے لگا کے سوتے تھے۔ سرہانے کی طرف الماریاں تھیں جن میں ہم اپنے اپنے خانوں میں جوتے کپڑوں کے ساتھ بستر بھی ٹھونس دیتے تھے ' صبح یہی جگہ ہمارے لیے درس گاہ بن جاتی تھی۔

ناصر عظیم بھی پہلے دن بہت خوف زدہ اور سہا ہوا تھا۔ جب ہمارے اتالیق یک چشم صوفی نے اسے میرے حوالے کیا تو وہ رو رہا تھا۔ "لے بھئی ناصر۔ تیرے جیسا ہی دوسرا نازل ہوگیا۔ اسے ٹھیک سے سمجھادے کہ انسان کا بچہ بن کے رہے گا تو یہ جنت الاطفال ہے۔ شیطان کی اولاد کے لیے یہ جہنم ہے جہنم ' ہاں۔"

جنت وہ کسی کے لیے نہیں تھا۔ وہاں رہنے والے سب ہی بچّوں کے لیے وہ یتیم خانہ نہیں عذاب خانہ تھا مگر صوفی ہمیشہ ہر نووارد کے سامنے ایسا ہی کہتا تھا۔

اسے چُپ کرانے کے لیے میں اپنے ساتھ لے گیا۔ میں اسی طرح ہر بچے کو اپنا مرید بنالیتا تھا اور پھر اس پر واضح کردیتا تھا کہ اتالیق کے بعد میری اطاعت پر ہی اس کے مستقبل کی بہتری کا انحصار ہے۔ اگر میں چاہتا تو اتالیق کے کمرے میں چارپائی پر آرام سے سوسکتا تھا لیکن اس طرح میں سب سے الگ ہوجاتا اور لڑکے مجھے اپنا دوست نہیں دشمن سمجھنے لگتے۔ میں انہی کے درمیان رہتے ہوئے دوستی اور ہمدردی کے نام پر ان سے دشمنی کررہا تھا۔ میں انتظامیہ کا مخبر تھا اور اتالیق کو بتاتا رہتا تھا کہ لڑکے کیا باتیں کرتے ہیں۔ کیا سوچتے ہیں اور کیا عزائم رکھتے ہیں۔ اس سے میں اوپر والوں کی نظر میں معتبر ہوجاتا تھا تو مجھے وہ سب فوائد حاصل رہتے تھے جن کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ لڑکیوں کے اسکول کی چھٹی ہوجانے کے بعد ہمیں گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلنے کی اجازت تھی۔ دو تین فٹ بال سوسوا سو بچّوں کے لیے قطعی ناکافی تھے مگر سب بچے فٹ بال کھیلنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ آزادی کے اس مختصر سے وقفے میں دوڑ بھاگ کرلیتے تھے ' ہنستے تھے اور چیختے چلّاتے تھے ' باتیں کرتے تھے اور مارپیٹ کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ دن بھر کے تجربات شیئر کرتے تھے اور ایک دوسرے کو بتاتے تھے کہ وہ مستقبل کے لیے کیا عزائم رکھتے ہیں۔ کچھ بچے ایسے بھی تھے جو اس وقت بھی خاموش اور الگ تھلگ کھڑے رہتے تھے ' اداس اور مایوس۔

میرے کمرے میں اور دری پر بیٹھنے کے باوجود وہ لڑکا چپکے چپکے روتا رہتا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ابل کے رخساروں پر بہتے رہے۔ وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال ہی چھوٹا ہوگا مگر میری طرح اس کی صحت بھی اچھی تھی اور وہ صورت سے فاقہ زدہ ' بیمار اور قابلِ رحم بھی نہیں لگتا تھا۔

میں نے اس سے کہا "دیکھو بیٹا ' آخر تم کب تک روتے رہوگے۔ یہاں تو ہم سب کی ایک ہی اسٹوری ہے۔ ہم سب کے ماں باپ ' بھائی بہن ہوتے تو ہم یہاں کیوں ہوتے۔ ہم سب کے نانا نانی ' دادا دادی ' چاچے ماے ' سب مرگئے ہیں۔ اگر کسی کے زندہ ہیں تو انہیں بھی مرا ہوا سمجھو۔ ہم سب کا کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ہم رہ سکتے۔ روکھی سوکھی کھالیتے اور کسی کونے میں سر چھپا کے سوجاتے۔ مگر یہ بات جگہ کی نہیں ' جگہ تو دل میں ہوتی ہے۔"

وہ پھر بھی روتا رہا اور بُت بنا دیوار کو دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "تم کچھ کھاؤ گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

میں نے پوچھا "چائے پیو گے؟ ہوٹل ۔۔۔ ویسے تو کسی کو اجازت نہیں مگر آج تم خود کو میرا مہمان سمجھو۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔"

اس نے پھر انکار میں سر ہلادیا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میرا جی چاہا کہ ایک جھانپڑ رسید کرکے اس کا دماغ درست کردوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔

"اچھا مجھے یہ بتاؤ ' تمہارا گھر کہاں تھا؟"

اس نے کہا "اسی شہر میں۔"

"وہاں تم اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے ' بہن بھائی۔"

اس نے کہا "کوئی نہیں' میں اکیلا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟ تمہارے ماں باپ مر گئے۔ مالکِ مکان نے تم سے گھر خالی کرالیا۔"

"نہیں۔ میرے باپ کا اپنا گھر تھا۔ وہ سوزوکی چلاتا تھا' تین کمروں کا گھر تھا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کہاں گیا وہ گھر؟"

اس نے کہا "میرے باپ نے قتل کردیا تھا۔"

"کس کو....؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ کوئی عورت تھی' اس کے شوہر کو قتل کیا اور پھر اس سے شادی کرلی' وہ پکڑا گیا۔"

"پھانسی ہوگئی اسے؟"

"ہاں۔ اس نے مرنے سے پہلے مجھے اور میری ماں کو اپنے بھائی کے حوالے کردیا تھا' وہ میرا چچا تھا۔ چچا بہت خراب آدمی تھا' بہت ظالم تھا۔ اس کی وجہ سے ایک دن میری ماں چلی گئی۔"

"چلی گئی؟ کہاں چلی گئی؟"

"پتا نہیں' چچا کہتا تھا وہ اب واپس نہیں آئے گی۔ وہ اس کو بہت گندی گالیاں دیتا تھا۔"

"وہ تمہیں بتائے بغیر کہیں چلی گئی؟" میں نے یوں کہا جیسے میری اپنی ماں مجھے بتائے بغیر گھر چھوڑ گئی ہو "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

وہ ڈر کے بولا "چچا نے کہا تھا۔"

میں نے خفگی سے کہا "بے وقوف۔ اسے تمہارے چچا نے.... نہیں.... نکالنا تو مشکل ہے' اس نے تمہاری ماں کو ماردیا ہوگا۔"

"کیا ماردیا ہوگا؟" وہ بولا۔

"اوئے پاگل' جان سے ماردیا ہوگا۔ قتل کردیا ہوگا۔ قتل کرکے کہیں گاڑ دیا ہوگا۔"

اس کا رنگ پیلا پڑگیا اور وہ کانپنے لگا "نہیں.... ایسا مت کہو۔ میرا چچا اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"کس سے؟"

"پتا نہیں۔ وہ کہتی تھی میں مرجاؤں گی یا تم کو مار ڈالوں گی۔ مگر یہ کام نہیں کروں گی۔ میں عزت نہیں بیچوں گی۔"

میں اُچھل پڑا "عزت بیچنے کی بات کی تھی اس نے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "یہ عزت کیسے بیچتے ہیں....؟"

اس کی صورت دیکھ کے مجھے ترس آیا۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا' کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اتنی کم عمری میں یہ باتیں اس کے سمجھنے کی نہیں تھیں۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "تمہیں یہاں کون چھوڑ کے گیا تھا؟"

"میرا چچا۔ اس کی بیوی.... میری چچی بولتی تھی کہ اس سنپولیے کو یہاں سے نکالو ورنہ یہ مجھے بھی ڈس لے گا۔ اگر تم نے اسے نہ نکالا تو میں اس کو زہر دے دوں گی۔"

مجھے سخت غصہ آیا "اور تمہارا بے غیرت چچا۔ وہ تمہیں یہاں چھوڑ گیا؟"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ یہاں تم آرام سے رہو گے اور محفوظ بھی۔ یہاں تمہاری چچی بھی تم کو نہیں مار سکتی اور...."

میں نے کہا "بولو بولو' رُک کیوں گئے؟"

"وہ کہتا تھا.... میری ماں بھی یہاں مجھ سے ملنے آئے گی۔ اس لیے یہاں سے کہیں مت جانا۔ ورنہ وہ تمہیں کہاں تلاش کرے گی۔ اس نے کہا کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ مجھ سے ملنے آئے گا۔ میری لیے چیزیں لائے گا۔ وہ مجھے خرچ کے لیے پانچ سو روپے بھی دے گیا تھا۔"

"پانچ سو روپے' کہاں ہیں وہ روپے؟" میں نے کہا۔

"وہ.... چچا نے اس کو دیئے تھے جو مجھے لایا تھا' تمہارے پاس۔ چچا نے کہا تھا کہ جب ضرورت ہو ماما جی سے لے لینا۔"

"اوئے ماے کی اولاد۔ بے وقوف کے بچّے!" میں نے برہمی سے کہا "وہ کدھر سے تمہارا ماما ہوگیا۔ ایک پیسہ نہیں دے گا وہ تمہیں اور تمہارا چچا تمہیں یتیم خانے میں چھوڑ گیا ہے۔ جہاں سے تم کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم گدھے کے برابر ہوگئے۔ تمہاری عقل کہاں چلی گئی آخر؟"

وہ میرے غصّے سے ڈر گیا "میں.... میں کیا کروں ناصر بھائی؟"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "تم.... تم اپنے گھر جاؤ' تمہیں وہ گھر چھوڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ تمہارے باپ کا گھر ہے تو تمہارا گھر ہے۔ کیا پتا کسی دن تمہاری ماں واقعی لوٹ آئے' میرا خیال غلط ہو۔"

"وہ گھر اب چچا کا ہے' میرا نہیں۔"

"کیوں؟ کیا اس نے گھر بھی اپنے نام کرالیا ہے؟"

"ہاں۔ یہی کہتی تھی چچی۔ وہ کہتی تھی' میرے باپ کے مقدمے میں سوزوکی بک گئی۔ جو باپ نے قرض لیا تھا اپیل کرنے کے لیے' وکیل کی بہت فیس تھی۔ اس نے بھائی سے پیسہ لیا اور مکان اس کو بیچ دیا۔ سارے کاغذات میرے چچا کو دے دیے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ کیا یہ سب باتیں تمہاری ماں کو معلوم تھیں؟"

"میری ماں کہتی تھی کہ چچا جھوٹ بولتا ہے۔ سوزوکی ضرور بک گئی تھی مگر میرے باپ نے اپیل نہیں کی تھی۔ مکان بیچنے کا کیا سوال۔ ہاں کاغذات ضرور اس نے چچا کے حوالے کردیے تھے۔ چچا نے دھوکے سے مکان اپنے نام کرالیا ہے۔ میرا چچا اس کو مارتا تھا کہ اچھا جاؤ عدالت میں کیس کردو مجھ پر' پتا چل جائے گا کہ مکان کس کا ہے۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "ان حالات میں' تمہاری ماں کیسے تم کو چھوڑ کے جاسکتی تھی۔ وہ جاتی تو تم کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ وہ تمہارے بڑے ہونے کا انتظار کرتی۔ محنت مزدوری کرکے تم کو پالتی۔ اور جب تم بڑے ہوجاتے تو چچا سے اپنا حق حاصل

کرسکتے تھے۔ وہ تم کو ایسے ظالم چچا کے سپرد کرکے چلی گئی۔ نہیں' میرا دل نہیں مانتا۔ ضرور تمہارے چچا نے اس کو قتل کردیا ہوگا۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔"

وہ پھر رونے لگا' بھوں بھوں کرکے۔

میں نے اسے تسلی دی "خاموش ہوجا بیٹا' رونے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ مجھے یہ بتا تیرے چچا کا نام کیا ہے' وہ کہاں رہتا ہے؟"

"تم کیا کرو گے؟"

میں سوچ میں پڑگیا "ہاں' میں کیا کرسکتا ہوں۔ خیر تُو فکر مت کر۔ کچھ کریں گے بعد میں۔ ابھی کچھ دن یہاں آرام سے رہ۔ میں تیرے چچا کا پتا چلاتا ہوں اور بات کرتا ہوں کسی سے۔ کسی اور کو کچھ مت بتانا' رونا بھی نہیں۔"

"اچھا۔ آپ کہتے ہو تو...."

میں نے کہا "صوفی سے پیسے بھی مت مانگنا۔ ورنہ وہ بہت مارے گا۔"

"کیوں.... وہ میرے پیسے ہیں۔"

"صوفی کی جیب میں چلے گئے تو اس کے ہوگئے۔ تیرے چچا نے رشوت دی ہے اسے۔"

"رشوت' وہ کیا ہوتی ہے؟"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "کچھ نہیں' یہ بتا عمر کتنی ہے تیری؟"

"نو سال.... دو مہینے پہلے میری سالگرہ تھی۔"

"کون سی کلاس میں پڑھتے تھے؟"

اس نے کہا "دوسری میں۔"

"اتنے بڑے ہوکے دوسری میں....؟"

"جب میں دوسری جماعت میں تھا تو ابّا نے قتل کیا تھا۔ ماں نے مجھے اسکول سے اُٹھالیا۔ بچّے مجھے تنگ کرتے تھے۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

اس نے کہا "میرا نام بھی ناصر ہے۔"

"ناصر کے آگے پیچھے کیا ہے۔ جیسے میں ناصر عظیم ہوں۔"

"میں بھی ناصر عظیم ہوں" وہ مسکرانے لگا۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "مذاق کرتا ہے میرے ساتھ۔"

وہ رونے لگا "قسم خدا کی ناصر بھائی' میرا یہی نام ہے۔"

مجھے سخت خجالت ہوئی۔ مجھے یک چشم صوفی کی بات یاد آئی.... "لے بھئی ناصر' تیرے جیسا ہی دوسرا ماڈل آگیا۔"

"اچھا رو مت۔ چل چپ کرجا ورنہ صوفی آگیا تو بہت مارے گا تجھے۔ یہاں کسی کو بلاوجہ رونے کی اجازت نہیں بلکہ وجہ ہو پھر بھی رونا جرم ہے۔ یہ بڑی خراب جگہ ہے مگر تو فکر نہ کر۔ آج سے تو میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں تیرا خیال رکھوں گا۔ تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ لیکن دیکھ' جو میں کہوں وہی کرنا ورنہ مارا جائے گا بیٹے۔"

اس نے سرہلایا "اچھا ناصر بھائی۔"

رات وہ میرے پاس ہی سویا مگر میں نے دیکھا کہ سونے سے پہلے وہ بہت دیر تک روتا رہا اور اسی چھت کی تاریکی کو گھورتا رہا جس میں لکڑی کے جالوں اور ایک دوسرے کے پیچھے لپکتی چھپکلیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی درخشاں مستقبل کو اس کی نظر دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے ماضی کی دل آزار پرچھائیوں میں گم تھا۔ شاید اُس وقت کو یاد کررہا تھا جب اس کا گھر اس کے باپ کا گھر تھا۔ جہاں اس کی ماں خود کو کسی مہارانی سے کم نہیں سمجھتی ہوگی۔ یا شاید اس وقت کو جب ایک قاتل کو پھانسی گھاٹ سے اس کے اپنے گھر میں لایا گیا ہوگا۔ اور اس نے حیرانی سے دیکھا ہوگا کہ اس کے باپ کی گردن کتنی لمبی ہوگئی ہے۔ اس نے بین کرتی ماں کو دیکھا ہوگا اور پھر وہ سب جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا لیکن اس کی سزا وہ بھگت رہا تھا۔

صبح میری سفارش پر یک چشم صوفی نے ناصر کو میرے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ عام طور پر نوارد کو ایک دو دن یتیم خانے کے معمولات کو سمجھنے میں لگ جاتے تھے پھر اسے سمجھادیا جاتا تھا کہ اب وہ خود بھی انہی معمولات کا پابند ہونے پر مجبور ہے اور جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے اس کے بارے میں سوال کرنا جرم کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ خود ہی سمجھ لے تو بہتر ہے ورنہ خاموش رہے۔ اس دن کا آغاز بھی منہ اندھیرے جاگ کر نماز اور پھر درسِ قرآن سے ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے سب لڑکے بہ آوازِ بلند خوب ہل ہل کے تلاوت کررہے تھے۔ وہ بچّے تھے' انہیں کوئی بتانے یا سمجھانے والا نہیں تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں اس کا مطلب کیا ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ اس میں ثواب ہے اور ثواب کمانے والے کو جنت ملتی ہے۔ گناہ کرنے والا دوزخ میں جاتا ہے۔ گناہ و ثواب کا فلسفہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ تلاوت کرتے وقت اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ شرارت سے ہنستے تھے' ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے اور یک چشم صوفی سے ایک دوسرے کی جھوٹی شکایت کرکے پٹواتے تھے۔

"صوفی صاحب' اس نے ایک صفحہ پڑھے بغیر پلٹ دیا۔"

اونگھنے والا صوفی ایک دم بیدار ہوجاتا تھا۔ "اچھا.... ایک صفحہ پڑھا ہی نہیں' کیوں بے' حرام کے جنے.... ادھر آ.... کیا جلدی تھی تجھے۔ تیری ماں کا نکاح تھا کیا؟ تجھے چھوارے کھانے جانا تھا.... بول...."

بول کے ساتھ ہی پتلی بید شائیں کرکے ملزم کی کھال پر چپک جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صوفی کے لبوں سے گالیوں کا لاوا اُبلنے لگتا تھا "دوزخی' جہنم کے سنپولیے۔ نطفۂ ابلیس' بول.... صفحہ پلٹا تھا' جھوٹ.... جھوٹ.... ہم سے جھوٹ۔ تیری تو.... میں نے خود

aazzamm@yahoo.com

دیکھ لیا تھا۔"

بید مسلسل اس کی کمر، پیٹ، ٹانگوں اور بازوؤں پر پڑتی رہتی تھی۔ تکلیف کی شدت سے بلبلاتے ملزم کی ایسی آوازیں ہر روز ہر طرف سے سُنائی دیتی تھیں۔ شکایت کرنے والا مسکراتا رہتا تھا۔ اس نے بھی مجھے پٹوایا تھا جھوٹ بول کے۔ میں نے بدلہ لے لیا۔ باقی بچے دہشت زدہ یہ سب دیکھتے رہتے تھے اور نظر سپارے پر جمائے زیادہ اونچی آواز میں پڑھنے لگتے تھے۔

صوفی جب پہلی بار کسی ملزم کو سزا دیتا تھا تو اسے مولا بخش سے متعارف کراتا تھا "مولا بخش کو جانتا ہے تو؟ وہ جو موٹا کالا سا ڈنڈا دوسرے استادوں کے پاس ہے، اسے کہتے ہیں مولا بخش۔ اور یہ ۔۔۔ یہ ہے مولا بخش کی گھر والی" وہ اپنی پتلی لمبی چمک دار بید لہرا کے اچانک وار کرتا تھا۔ "ظالم تو مولا بخش بھی ہے۔ مگر اس کی گھر والی ۔۔۔ بڑی ہی نامراد شے ہے بھئی۔"

سورج نکلنے کے ایک گھنٹے بعد ناشتا ملتا تھا۔ دو پاپے اور چائے کا ایک کپ۔ اس وقت تک بچے بھوک سے نیم جاں ہوتے تھے۔ بعض اوقات کسی گھر سے نیاز کی دیگ آجاتی تھی تو جیسے عید آجاتی تھی۔ کبھی بچے کسی گھر میں ختم قرآن کے لیے بُلائے جاتے تھے تو پندرہ بچے ایک بیرک کے اور پندرہ دوسری بیرک سے منتخب کیے جاتے تھے۔ دوسری بیرک کا اتالیق ایک بنگالی تھا۔ سوکھا سڑا، سیاہ رو اور چگی داڑھی والا۔ وہ مولا بخش ہاتھ میں رکھتا تھا مگر اس کا استعمال بہت کم کرتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ رحم دل تھا۔ وہ ایک نفسیاتی مریض تھا اور بچوں کو اذیت دینے کے ایسے طریقے جانتا تھا کہ مولا بخش کی گھر والی کا تشدد عین رحم دلی محسوس ہوتا تھا۔ بنگالی بیرک میں تبادلہ ایسا ہی تھا جیسے قیدی کو عام وارڈ سے بند وارڈ میں منتقل کردیا جائے یا پولیس سے سی آئی اے کی تحویل میں دے دیا جائے۔ بنگالی چیختا چلاتا کم تھا۔ وہ اپنی لنگی سمیٹ کر پاؤں کرسی پر رکھے عقابی نظروں سے سب کی صورت کا جائزہ لیتا رہتا تھا اور اچانک انگلی سے اشارہ کرتا تھا۔

"اش شالا لوڑکا کو پوکڑ لو۔ ایک دم موٹرولی سے پوکڑو۔ شالا کا آنکھ میں شورمہ ڈالو، دو چوٹکی۔"

پھر دو تنومند لڑکے ملزم کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے یا اس کے ہاتھ پیچھے کرکے کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دیتے تھے اور اس کی آنکھوں میں دو چٹکی سرمہ یعنی باریک پسی ہوئی سُرخ مرچ ڈال دی جاتی تھی۔ ملزم تڑپتا تھا اور اچھلتا تھا۔ سر اِدھر اُدھر پٹختا تھا اور ٹانگیں چلاتا تھا مگر اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوتا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے چیخوں کو دبا دیا جاتا تھا۔

"شالا ڈانش کورتا ہے۔" بنگالی مسکراتا تھا۔ سرمہ ناک میں بھی ڈالا جاتا تھا اور جرم انتہائی سنگین ہوتو وہ کہتا تھا "یہ شالا بوہوت حورامی ہے۔ اش کو ایک دم کھاس انجکشن دینے کو مانگتا"

مجرم کو ایک اسٹور میں لے جاکے اس کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا، اس کا ذکر بھی لڑکے سرگوشی میں کرتے تھے تو ان پر کپکپی سی طاری ہوجاتی تھی۔

خصوصی مراعات یافتہ اور پسندیدہ لڑکے ہی باہر قرآن خوانی کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ صرف ایک سپارہ پڑھنے کے بعد انہیں عزت سے بٹھاکے اچھا کھانے کو دیا جاتا تھا۔ ان کی سیر ہوجاتی تھی اور وہ ایک دن کے لیے یتیم خانے سے باہر کی خوب صورت دنیا کے کسی خوب صورت گھر کی خوب صورت زندگی کا نظارہ کر آتے تھے۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔

پہلے دن ناصر نے سپارہ دیر سے ختم کیا تو میں نے اسے وارننگ دی "اتنا آہستہ پڑھوگے تو پٹو گے بیٹا۔"

"میں ایسے ہی پڑھتا ہوں۔ تیز پڑھوں گا تو غلط پڑھ جاؤں گا۔"

میں نے کہا "آدھے گھنٹے میں تین سپارے سب پڑھتے ہیں، دیکھو۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا "پتا نہیں یہ کیا پڑھ رہے ہیں ۔۔۔ اور کیسے ۔۔۔"

میں نے کہا "بے وقوف ۔۔۔ میری طرف دیکھ کے بات مت کرو۔ نظر سپارے پر رکھو ورنہ صوفی پکڑ لے گا۔"

صوفی نے اسے کچھ دیر بعد پکڑ لیا "کیوں بے کیچوے کی اولاد۔ حرام خوری کرتا ہے، آدھے گھنٹے میں ایک پارہ۔"

اس نے کہا "مولوی صاحب، میں اس سے تیز نہیں پڑھ سکتا۔"

صوفی کی ایک آنکھ پھڑکنے لگی "کیا کہا، نہیں پڑھ سکتا۔ اور یہ سب جو تیرے باپ پڑھ رہے ہیں۔"

"یہ غلط پڑھ رہے ہیں۔ میں نے خود سُنا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، یہ گناہ ہے مولوی صاحب۔"

"یہ سب غلط ہیں اور تو ٹھیک ہے" صوفی نے مولا بخش کی گھر والی کو لہرا کے کہا "تو بتائے گا مجھے کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔"

اس دوسرے ناصر عظیم کا بھی مولا بخش کی گھر والی سے اسی طرح تعارف ہوا جیسے پہلے ناصر عظیم کا ہوا تھا۔ ناشتے کے دوران میں اس نے روتے ہوئے اس ظلم کے خلاف فریاد کی تو میں نے اسے سمجھایا کہ وہ سدھر جائے۔ اللہ مجھے معاف کرے، میں نے اس سے کہا کہ "بیٹا۔ دس منٹ میں سپارہ ختم نہ کیا تو مولا بخش کی گھر والی تیری چمڑی اُدھیڑ دے گی۔ پورا پڑھ یا آدھا، سطر چھوڑ یا صفحہ۔ لیکن دس منٹ بعد تیرے ہاتھ میں دوسرا سپارہ ہونا چاہیے۔"

"میں ۔۔۔ میں ایسا نہیں کرسکتا، یہ سخت گناہ ہے۔"

میں نے کہا "گناہ کی اولاد۔ جیسا میں بتا رہا ہوں ویسا ہی کرتا جا ورنہ صوفی تجھے بھیج دے گا بنگالی وارڈ میں۔"

"بنگالی وارڈ! مجھے تو بنگالی نہیں آتی۔"

میں نے کہا "وہاں دو دن رہے گا تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔" بنگالی وارڈ کا حال سن کے وہ کھانا بھول گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ "ناصر بھائی' میں بھاگ جاؤں گا۔"

"ابھی سے بھاگنے کی بات مت کر۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ بھاگ کے جائے گا تو باہر اس سے بھی بُرا ہو گا۔ تجھے پولیس پکڑے گی اور پھر اسی چچا کے پاس پہنچا دے گی' وہ تجھے دوبارہ یہاں لے آئے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تجھے مار ڈالے۔ جیسے تیری ماں کو مارا تھا' اور اس پر کوئی الزام بھی نہ آئے۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو اسے یتیم خانے میں داخل کرا دیا تھا۔ یتیم خانے سے بھاگ کے کہاں گیا' مجھے کیا معلوم۔"

میں نے اسے اغوا کر کے خرکاروں کے ہاتھ بیچنے والوں کے بارے میں بتایا۔ یہ بتایا کہ خرکار کون ہوتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ اسے بچے باہر اسمگل کرنے والوں کے بارے میں بتایا۔ بہت سی باتیں یتیم خانے والوں نے بچوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے مشہور کر دی تھیں۔ کچھ لوگ بچوں کو نچوڑ کے ان کا سارا خون نکال لیتے ہیں۔ باقی پھوک جیسے جسم کو چارے کے ساتھ ملا کے کھاد بناتے ہیں۔ پکا کے ڈبوں میں بند کر دیتے ہیں اور یہ ڈبے افریقہ بھیجتے ہیں جہاں آدم خور لوگ انسانی گوشت کا قیمہ اور قورمہ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ بچوں کو دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے قربان کرنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہیں جو سفلی عمل کے لیے بچوں کے کلیجے خریدتے ہیں' آنکھیں نکالتے ہیں۔

اس میں کچھ سچ تھا تو کچھ جھوٹ مگر میرے منہ سے یہ باتیں سن کے ناصر کے دماغ سے فرار کا خیال ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ میری پناہ میں رہے اور میرا کہا مانتا رہے۔

"دیکھ ناصر! نہ جانے کیوں مجھے تجھ سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ یہاں تو سب ہی مصیبت زدہ ہیں۔ لیکن تیرا اور میرا نام ایک ہے۔ میں تیری مدد کروں گا۔ میں چاہتا ہوں تُو اپنے ظالم چچا سے بدلہ لے۔ اپنی ماں کا پتا چلائے۔ اپنا مکان واپس حاصل کرے۔ ابھی تُو چھوٹا ہے۔ جب تُو جوان ہو جائے گا تو تیرا چچا بوڑھا ہو گا پھر تو اس کو مت چھوڑنا۔ اسے خوب مارنا' اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوانا۔ اسے پھانسی ہو جائے گی۔"

یہ بھی ایک بچے کی خام خیالی تھی۔ میں اسے یتیم خانے کے اندر کسی حد تک تحفظ فراہم کر سکتا تھا مگر باہر کی دنیا کیا ہے۔ ایک تیرہ سال کے بچے کو اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا تھا۔

ابھی ناشتا ختم ہی ہوا تھا کہ صوفی نے اعلان کیا "چلو بھئی گاڑی آگئی' جلدی کرو۔"

ناصر نے پوچھا "کہاں جانے کے لیے گاڑی آئی ہے؟"

میں نے کہا "تو چپکا بیٹھا رہ' گاڑی ہمارے لیے نہیں آئی ہے۔"

بیس بائیس کم عمر بچے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ صوفی نے باری باری سب کی تلاشی لینی شروع کی۔ وہ عادت کے مطابق سب کو گالیوں سے نوازتا جا رہا تھا۔ "سیدھا کھڑا ہو... ہاتھ اوپر اٹھا۔ یہ کیا ہے' تیری بہن کے یار کی چٹھی' نیفے میں کیوں اڑس رکھا تھا اسے۔ بول کیا ہے یہ؟"

سات سال کے بچے نے کانپتے ہوئے کہا "کچھ نہیں جی۔"

"یہ کچھ نہیں" ایک بید... شائیں...

"مولوی صاحب' یہ کاغذ نیچے پڑا تھا' حدیث شریف ہے اس میں..."

ایک اور بید... "دوزخی۔ اسے نیفے میں اڑس لیا۔ کل کو نوٹ ہو گا تو میں چھوڑ دوں گا کہ حدیث شریف ہو گی۔ حرام کے پلے' بے وقوف سمجھتا ہے مجھے۔ اُلّو بناتا ہے۔" شائیں... شائیں... شائیں۔

اگلا شکار "کیوں بے' کتنے پیسے مارے تھے کل' چور کے بچے' بول (شائیں) جھوٹ... پھر جھوٹ... تُو نے پکوڑے کھائے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا' بول پیسے کہاں سے آئے تھے۔ میری سی آئی ڈی کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔"

ناصر خوف سے کانپتے ہوئے یہ سب دیکھتا رہا "یہ... یہ کیا ہو رہا ہے ان کے ساتھ... کون ہیں یہ لڑکے؟"

"یہ لڑکے چور ہیں" میں نے کہا "بے ایمانی کرتے ہیں حرامی۔"

"کیسی بے ایمانی؟"

"پیسے مارتے ہیں۔ لالچی کُتے' حرام لگ گیا ہے منہ کو" میں نے کہا۔

یہ سب باتیں میں نے اسی ماحول میں سیکھی تھیں۔ میں وہی زبان بولنے لگا تھا جو یہاں بولی جاتی تھی۔ بچہ ہمیشہ بڑوں کی زبان بولتا ہے۔ اگر میری پرورش کسی مہذب تعلیم یافتہ اور ادب دوست گھرانے میں ہوتی تو میرے اطوار مختلف ہوتے۔ ابھی تو میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کس حد تک صحیح ہے یا غلط ہے۔ میں صرف یہ سمجھتا تھا کہ اسی لہجے میں یہی باتیں کر کے وہ تمام فوائد حاصل کر سکتا ہوں جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

"یہ سب کہاں جا رہے ہیں ناصر بھائی؟" اس نے کہا۔

"کام پر" میں نے کہا "بھیک مانگنے۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "بھیک مانگنے' کیا یہ فقیر ہیں؟"

"اور کیا بھیک مانگنے والا بادشاہ ہوتا ہے؟"

"مگر یہ کیوں بھیک مانگتے ہیں؟"

میں نے کہا "ہر آدمی کوئی کام تو کرتا ہے۔ یہ بچے پڑھتے نہیں' کچھ سیکھتے نہیں۔ انہیں بھیک مانگنا سکھا دیا گیا ہے۔ کچھ بچے ٹھیکے پر جاتے ہیں' کچھ کرائے پر۔"

وہ پریشان ہو گیا "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"میں تجھے ٹھیک بتا رہا ہوں۔ کچھ بچے ذہین ہیں۔ محنتی ہیں اور اچھے ایکٹر ہیں۔ دن بھر میں اچھی خاصی کمائی کر لیتے ہیں۔ اب یہ لڑکا جو تلاشی دے رہا ہے۔ اس کا کرایہ ہے پچاس روپے روز۔ یہ سو سے زیادہ ہی کماتا ہے۔ پچاس وہ فقیر رکھ لیتا ہے جو اس کو کرائے پر لے جاتا ہے۔ پچاس یہاں دیتا ہے۔ باقی سب اس کے۔ یہ زیادہ کمانے کے لیے زیادہ محنت کرتا ہے۔ صبح سے شام تک' اسے اسامی کی پہچان ہے۔ کبھی کبھی خود اسے پچاس بچ جاتے ہیں مگر صوفی چھین لیتا ہے۔ اس کے پاس دس روپے سے زیادہ نہیں چھوڑتا مگر دس بھی بہت ہیں۔ یہ عیش کرتا ہے۔ پہلے اس کا کرایہ چالیس روپے تھا۔ اب سُنا ہے ایک گرلز اسکول کے چوراہے والا فقیر اس کے ساٹھ روپے روز دینے پر تیار ہے۔ زیادہ تر لڑکے ہر ہفتے ٹھیکے پر جاتے ہیں۔ بدھ کی رات کو فقیر بولی لگاتے ہیں۔ موسم اور تہوار کے حساب سے۔ رمضان میں ہزار روپے تک لگ جاتے ہیں۔"

"ہزار کسے ملتے ہیں؟"

"یتیم خانے والوں کو۔ پھر جتنی کمائی ہو' بولی لگانے والے فقیر کی اور اس کی مرضی وہ لڑکے کو پانچ دے یا دس' دال کھلائے یا مرغی۔"

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا "یہ سب بعد میں۔"

"بعد میں سب فقیر بنیں گے اور اسی طرح لڑکے کرائے پر لے جائیں گے یا ان کی بولی لگائیں گے۔ یتیم خانے والے پکا انتظام رکھتے ہیں کہ کوئی فقیر کسی لڑکے کو لے کر بھاگ نہ جائے۔ دو چار مرتبہ ایسا ہوا تو پولیس نے فقیر تلاش کر لیا۔ تھانے میں خوب مارا۔ یتیم خانے سے تھانے کو بھتا ملتا ہے۔"

"بھتا... وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ہر ہفتے کی بندھی رقم ملتی ہے' تُو بالکل ہی احمق ہے۔"

"یہ لوگ گاڑی میں کیوں جا رہے ہیں؟"

"گاڑی ہر بچے کو وہاں چھوڑ دے گی جو اس کی جگہ ہے۔ فقیر وہاں پہلے سے موجود ہو گا۔ رات کو گاڑی ان بچوں کو واپس لے آئے گی۔ ان کی پھر تلاشی ہو گی۔ سب حساب دیں گے۔ آمدنی کے مطابق ان کو جیب خرچ ملے گا۔ یہ سب اس کام سے بہت خوش ہیں۔ باہر آزاد رہتے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں اور اپنی مرضی سے خرچ بھی کر سکتے ہیں۔ جن کو بھیک مانگتے شرم آتی ہے وہ یہاں پڑھتے ہیں' پڑھتے خاک ہیں' سارا کام کرتے ہیں اور جوتے الگ کھاتے ہیں' چل اب ہمیں بھی جانا ہے۔"

"کہاں' بھیک مانگنے... میں نہیں جاؤں گا۔"

میں نے اس کے ایک تھپڑ مارا "انکار کی عادت چھوڑ دے ورنہ تیرا حشر خراب ہو گا۔"

وہ سہم گیا "غلطی ہو گئی مجھ سے..."

میں نے کہا "اور میں نے تیرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آج سے ہی تیری ٹریننگ شروع ہو جاتی۔ صوفی کہتا ہے کہ جنگل سے آنے والے جانور کو سدھانا پڑتا ہے۔ آج تیری ملاقات مولا بخش کی گھر والی سے ہوتی نا مگر یہ کچھ بھی نہیں' ایک ہفتے تک تیرے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک ہوتا اور تجھ سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا تب تو خود کو انسان نہیں اشاروں پر دُم ہلانے والا کتا سمجھنے لگتا تو تیری پیشی ہوتی۔ پہلے منیجر صاحب کے سامنے اور پھر مالک کے سامنے۔ اس کے بعد فیصلہ ہوتا کہ تجھے کہاں لگایا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس ایک ہفتے میں تو بنگالی وارڈ ہو کر آتا تو پھر تمام عمر سر نہ اُٹھاتا... میں تیری بھلائی کی بات کرتا ہوں اور تو انکار کرتا ہے۔"

"میں نے کہا نا... اب نہیں کروں گا' بس آپ مجھے بچا لو ناصر بھائی۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "بھیک میں بھی نہیں مانگ سکتا تھا لیکن میں نے مانگی۔ اب میں چندہ جمع کرتا ہوں۔ یہ بھیک مانگنے کا شریفانہ طریقہ ہے۔"

"چندہ... جیسے مسجد کا ہوتا ہے؟"

"ہاں ویسا ہی... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تجھے چندہ مانگنے کا طریقہ سکھانے لے جا رہا ہوں" میں نے کہا۔

یک چشم صوفی نے تھوڑی سی منت سماجت کے بعد میری بات مان لی "دیکھ یہ نیا پنچھی ہے' اُڑ نہ جائے۔ ابھی تک اس کے پر بھی نہیں کاٹے گئے۔"

"مولوی صاحب' آپ مجھ پر بھروسا کرو۔ یہ کہیں بھی نہیں جائے گا۔ آپ اس سے قرآن پر ہاتھ رکھوا کے قسم لے لو" میں نے کہا۔

قرآن پر قسم اُٹھوانا وہاں ایک ایسا معمول تھا جس کی اہمیت آہستہ آہستہ ختم ہو چکی تھی۔ نئے لڑکے پہلے پہل قسم کھا کے سچ بولتے تھے یا عہد کی پابندی کرتے تھے مگر بعد میں ان کی عزتِ نفس کا احساس بھی مر جاتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس ماحول میں جھوٹ بولے بنا چارہ نہیں۔ پرانے پاپی کسی تذبذب کے بغیر دن رات حلف اُٹھا کے جھوٹ بولنے کے عادی ہیں' عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ وہ کہتے ہیں کہ جان بچانے کے لیے حرام بھی حلال قرار دیا گیا ہے۔ جبر کے تحت اٹھایا گیا حلف قانوناً بھی بے معنی ہوتا ہے۔ ہم دل سے قسم نہیں کھاتے' رفتہ رفتہ نیا آنے والا بھی اس شرمناک فلسفے کو ذہنی طور پر قبول کرنے لگتا تھا اور پھر دن رات قسم کھا کے جھوٹ بولتا تھا۔

چندہ جمع کرنے والے پُرانے لڑکے تھے جو تربیت کے سارے مراحل سے گزر چکے تھے۔ وہ قابلِ اعتماد بھی سمجھے جاتے تھے اور وفادار بھی۔ دس لڑکوں کی ایک ٹیم کو یتیم خانے کی پک اپ شہر کے مختلف علاقوں میں چھوڑ دیتی تھی۔ یہ کام بڑے منظم طریقے پر منیجر اور پرنسپل کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ پرنسپل خود ہی منیجر بھی تھا۔ وہ اسکول میں پرنسپل تھا اور یتیم خانے میں منیجر۔ مالک کا سالا ہونے

کے علاوہ اس نے گیارہ سال پولیس میں نوکری کی تھی چنانچہ وہ خود کو تھانے دار کہلوا کے بہت فخر محسوس کرتا تھا۔ جب کسی خطرناک مجرم کو اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا یا نئے رنگروٹ کو تو وہ اپنے مخصوص دہشت زدہ کرنے والے لہجے میں بتاتا تھا "اوئے میں نے ساری عمر کی تھانے داری کی ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔ بڑے بڑے چور ڈاکو پکڑے۔" پھر وہ ناقابلِ بیان الفاظ میں بتاتا تھا کہ اس نے بدمعاشوں' دس نمبریوں کو کیسے سیدھا کیا اور علاقے کے غنڈے کیسے اس کے نام پر تھر تھر کانپتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کیا کرتا تھا اور کیسے؟ مشہور یہی تھا کہ گیارہ سال بعد اسے نااہلی اور بدعنوانی کے الزام میں برطرف کردیا گیا تھا اور اس کی تھانے داری بھی کچی تھی مگر زبردست کو جھٹلانے کا حوصلہ کون کہاں سے لاتا۔ پیٹھ پیچھے اسے تھانے دار کہنا بھی توہین کے زمرے میں آتا تھا اور اس کی رپورٹ آگے پہنچ جاتی تھی تو پھر تھانے دار بتاتا تھا کہ وہ تھانے دار سے بھی بڑی چیز ہے۔ ابلیس بھی اس کے آگے کان پکڑتا ہے۔

وہ ایک بدصورت اور سفاک شخص تھا۔ اس پورے نظام کو چلانے کے لیے ایسے ہی لوگ درکار تھے جن کے دل نیکی' خدا ترسی' ہمدردی اور شرافت کے جذبات سے عاری ہوں۔ تھانے دار کا انتخاب مالک نے قرابت داری کی بنا پر نہیں کیا تھا۔ وہ اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی تھا اور اس نے اپنے ماتحت بھی بہت دیکھ بھال کے منتخب کیے تھے۔ وہ اس کے احکامات کی بجا آوری میں' محاورے کے مطابق' شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ثابت ہوئے تھے۔

عام خیال یہ تھا کہ مالک کا اس دنیا میں تقریباً وہی مقام ہے جو دنیا میں (نعوذ باللہ) خدا کا۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ تمام اعلیٰ صفات اس کی ذات کا حصہ ہیں اور وہ مجسم نیکی ہے مگر اس کے قہر و غضب کی بھی انتہا نہیں۔ جو اس کے عتاب کا شکار ہوا وہ دنیا و آخرت میں خوار ہوا۔ مالک بہت کم سامنے آتا تھا مگر اس کے بارے میں خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں' جن سے پتا چلتا تھا کہ وہ مشہور سماجی کارکن ہے اور سیاسی راہنما ہے۔ ہر عید اور بقرعید پر چند لڑکے اس کے گھر جاتے تھے۔ لان میں کھیلتے اور وہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے تھے۔ وہ ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتا تھا اور ہمیں تحفے دیتا تھا۔ فوٹو گرافر اس کی تصویریں اتارتے تھے جو اخباروں میں شائع ہوتی تھیں۔ تحائف کے بڑے بڑے خوشنما پیکٹوں میں سے فضول چیزیں برآمد ہوتی تھیں۔ خود مجھے ایک بار تحفہ کھولنے پر وال کلاک ملا تھا اور دوسری بار گلدان۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں ان چیزوں کا کیا کروں۔ صوفی نے دونوں چیزیں مجھ سے لے کر یتیم خانے کے آفس میں سجادی تھیں۔ وہاں سے وہ پھر مالک کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ میں نے گلدان لاؤنج میں اور کلاک ڈرائنگ روم میں لگا ہوا خود دیکھا تھا۔

نیجر نے شہر کے مختلف علاقوں کا مفصل نقشہ بنا کے ہر گلی بازار کو ایک نمبر دے دیا تھا۔ ایک نمبر علاقے میں کتنے بازار ہیں اور بازار میں کتنی دکانیں۔ کتنی گلیاں ہیں اور ہر گلی میں کتنے گھر۔ ایک ٹیم صبح سے شام تک کتنے حصے کو کور کرسکتی ہے اور کتنی رقم جمع کرسکتی ہے۔ یہ سب اسے معلوم تھا۔ وہ ہر ہفتے ایک پروگرام بنا کے بتادیتا تھا کہ کون سی ٹیم ایک نمبر علاقے میں جائے گی اور کون سی دو نمبر میں۔ ہر ٹیم میں دو لڑکے ہوتے تھے اور تیسرا ان کا نگراں۔ پانچ ٹیموں کے پاس شہر کے تیس علاقے تھے۔ چنانچہ ہر ٹیم اپنے علاقے میں مہینے میں صرف ایک بار جاتی تھی۔ مہینے میں یتیم بچوں کے لیے ایک بار چندہ دینا کسی کو بُرا نہیں لگتا تھا۔ دوسری ٹیم اسی علاقے میں پندرہ دن بعد جاتی تھی نگران کے پاس مختلف نام کی رسیدیں ہوتی تھیں اور انہیں کم کامیابی ہوتی تھی مگر پچاس فیصد لوگ انہیں بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے۔ یہ پرانے بھیک مانگنے والے تربیت یافتہ لوگ ہوتے تھے جو اپنی مظلومیت' اداکاری' جذباتی ڈائیلاگ اور ڈھٹائی کے باعث کچھ نہ کچھ وصول کرلینے کے ماہر تھے۔

پہلے دن میں ناصر کو اپنے ساتھ لے گیا تو میں نے اسے یتیم خانے کی زندگی کے وہ عملی پہلو دکھائے جو نام کے پردے میں اس طرح نظر نہیں آتے تھے جیسے سامنے ہونے کے باوجود دن میں تارے دکھائی نہیں دیتے۔ میں نے اسے دور سے چند بچے دکھائے جو فقیروں کے ساتھ "بزنس" کررہے تھے۔ ایک بچہ اپنے ہاتھوں سے ریڑھی دھکیل رہا تھا۔ یہ ریڑھی تین فٹ لمبی اور اس سے کچھ کم چوڑی تھی۔ اس کے چاروں کنارے ایک فٹ اونچے تھے اور اس میں چھوٹے چھوٹے پہیے لگے ہوئے تھے۔ اس کے اندر ایک شخص سمٹا پڑا تھا۔ اس کے کپڑے میلے اور تار تار تھے۔ سر اور داڑھی کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں گرد تھی اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے بدن کا اوپر والا حصہ دیکھ کے کراہیت سے ابکائی آتی تھی۔ اس کے سینے اور شانوں پر گھاؤ تھے جن پر خون جم گیا تھا۔ زخموں پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں پر میلی پٹیاں تھیں اور نفرت انگیز داغ تھے۔ سفید اور لال پیلے جو مرہم اور دوائیں تھوپنے سے پھیل گئے تھے اور مٹی پڑنے سے گندے ہورہے تھے۔ لڑکا اسے ریڑھی میں ڈال کے ایک فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ یہ فٹ پاتھ لمبائی کے رخ دو سو گز کے قریب تھی اور صرافہ بازار کی دکانوں کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ لڑکا ایک راؤنڈ تقریباً ایک گھنٹے میں پورا کرکے پھر وہیں سے واپس چل پڑتا تھا جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ ہر پھیرے کے بعد اس کی ملاقات عموماً نئے لوگوں سے ہوتی تھی۔

میں نے کہا "تم نے دیکھا ہوگا اس لڑکے کو صبح۔ اس کا کرایہ پچاس روپے روز ہے' اور بہت کم ہے۔"

"کم ہے؟"

"ہاں۔ یہ بڑی منافع والی جگہ ہے۔ یہاں لوگ زیورات خریدنے آتے ہیں۔ عموماً شادی کے لیے۔ ان کے پاس فالتو پیسہ ہوتا ہے اکثر۔ مگر ضرورت کو مجبوری بنا کے جب یہاں غریب آدمی آتا ہے اور ہزاروں خرچ کرتا ہے تو وہ بھی خود کو بادشاہ سمجھتا ہے۔ وہ آسانی سے دس پچاس یا سو کا نوٹ جان و مال کا صدقہ نکال دیتا ہے۔ یہ فقیر میرے اندازے کے مطابق ہزار روپے روز کماتا ہوگا۔"

وہ دم بخود رہ گیا "ہزار روپے.... پھر یہ ایسی حالت میں کیوں پڑا ہے؟"

میں نے کہا "بے وقوف ہزار اس کو تو نہیں ملتے نا۔ ٹھیکے دار اسے سو دو سو دیتا ہوگا۔"

"کون ٹھیکے دار؟"

"جس کی یہ جگہ ہے" میں نے کہا "فقیروں کا ٹھیکے دار۔ یہاں کوئی اور فقیر نہیں آسکتا۔"

"مگر یہ تو سڑک ہے۔"

"فقیروں کا ٹھیکے دار پولیس کو ہر ہفتے بھتا دیتا ہے۔ رشوت..... اس طرح یہ جگہ ٹھیکے دار کو مل جاتی ہے۔ اسے یہاں سے کوئی نہیں ہٹا سکتا اور پولیس خود اس کی حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ ان کو بھی آمدنی میں سے حصہ ملتا ہے۔ ٹھیکے دار چاہے تو یہاں دوسرے فقیر کو لا سکتا ہے اور چاہے تو یہ جگہ کسی دوسرے ٹھیکے دار کو دے سکتا ہے۔ لاکھ دو لاکھ نقد معاوضہ لے کر۔ یہ میرا اندازہ ہے۔ شاید اصل معاوضہ بہت زیادہ ہو۔"

"ٹھیکے دار کون ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔ ہوگا کوئی بدمعاش۔ یا کسی کا خاص آدمی۔ کسی وزیر کے ڈرائیور کا بھائی یا کسی افسر کے خانساماں کا ماموں۔ ہر روز کی کمائی میں سے پچاس روپے لڑکے کو ملتے ہیں جو یہ صوفی کو دیتا ہے۔ پچاس ساٹھ خود مار جاتا ہوگا۔ حالانکہ واپسی میں پھر اس کی تلاشی ہوگی مگر یہ لڑکے بھی طریقے جانتے ہیں۔ سو دو سو فقیر کو ملتے ہوں گے۔ وہ بھی سو روپے مار جاتا ہوگا۔ ٹھیکے دار کو چھ سات سو ملیں تو تین چار سو اس کے۔ باقی پولیس کے' ہر جگہ ایسے ہی چلتا ہے۔"

"مگر یہ فقیر تو بہت بیمار ہے۔ مرنے والا ہورہا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ سب ڈراما ہے۔ مداری کا کھیل ہے۔ فقیر کے زخم پر جو خون ہے وہ جیلی ہے لال رنگ کی۔ باقی داغ ہلدی چونے کے ہیں۔ یہ ذرا بھی بیمار نہیں ہے۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال مصنوعی ہیں۔ اندر سے اس کا سر بالکل صاف ہے۔ یہ رات کو واپس جاکے نہا دھولے گا اور صاف کپڑے پہن لے گا تو پہچانا بھی نہیں جائے گا۔"

"تم کو معلوم ہے..... یہ کہاں رہتا ہے؟"

"نہیں۔ مگر اس کا کوئی گھر ہوگا۔ بیوی بچے بھی ہوں گے جو کہیں اور اسی طرح بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ سب مل کے کماتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک پیشہ ہے۔"

"تم کبھی ملے ہو ٹھیکے دار سے.....؟"

"ہاں۔ میں نے اسے دیکھا ضرور ہے۔ وہ صبح ہر فقیر کو خود چھوڑنے بھی آتا ہے اور رات کے وقت خود لے جاتا ہے۔ دن بھر کا حساب کتاب لیتا ہے اور کوئی فقیر گڑبڑ کرے تو اس کی جگہ بدل دیتا ہے جہاں اس کی آمدنی گھٹ جاتی ہے یا پولیس اسے اٹھا کرلے جاتی ہے اور تھانے میں خوب مارتی ہے۔ وہ نئی جگہ تلاش کرتا رہتا ہے اور خریدتا بھی ہے۔ نئے فقیر بھرتی کرتا ہے اور ان کو بھیک مانگنا سکھاتا ہے۔ ان کو بولنا سکھاتا ہے۔ رونا اور آواز میں درد پیدا کرنا سکھاتا ہے۔ یہ فقیر ایک مداری ہے جو اپنا تماشا دکھا کے لوگوں سے پیسے بٹور رہا ہے مگر جو انہیں یہ تماشا کرنا سکھاتا ہے' وہ خود کتنا بڑا مداری ہوگا۔ اس کا تو خود اندازہ کرلے۔"

اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ میں نویں جماعت کا امتحان دینے والا تھا۔ نہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور نہ بالغ لیکن زندگی اگر عمر کے تجربات کا نام ہے تو میں نے تیرہ سال کی عمر میں دنیا کو اور دنیا میں رہنے والوں کو' ان کے بدلے چہروں کو اور رویوں کو اتنا دیکھ لیا تھا جو شاید عام حالات میں بیس بائیس سال تک اسکول' کالج اور پھر یونیورسٹی میں پڑھ کے ایم اے کرلینے والا نہیں دیکھ پاتا کیونکہ اس کی دنیا بڑی محدود ہوتی ہے۔ جو میں آج بتارہا ہوں اس میں انداز بیاں میرا اپنا ہے۔ ممکن ہے میں نے ناصر سے یہ ساری باتیں ایسے نہ کی ہوں۔ میرے الفاظ مختلف ہوں مگر حقائق یہی تھے۔ جو کچھ میں نے اسے بتایا تھا میرے علم میں اور تجربے میں تھا۔ وہی تھا جو میں دیکھ سکتا تھا اور محسوس کرسکتا تھا۔ میرا مشاہدہ اچھا تھا اور میری ذہانت خداداد تھی جس کی مدد سے میں نے ہر مداری کو پہچانا اور پھر جو کچھ اس سے سیکھا اسی سے مداری کو مات دی۔ میں اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا تھا اور اسی پر خوش تھا کہ سب کو بے وقوف بنا کے میں فائدے میں رہا۔ لیکن یہ پہلا تجربہ اس اعتبار سے مختلف تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ ہر مداری کے ساتھ بچہ جمہورا کا کردار ادا کرنے میں کوئی کامیابی پر فخر کی بات نہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں بہت کچھ غلط ہو رہا ہے اور میں صرف اپنا الو سیدھا کرکے مطمئن ہوں۔ اس طرح میں خود بھی بُرائی میں شریک ہوں۔ بُرے آدمی کا مددگار ہوں' بُرائی پھیلا رہا ہوں۔

دراصل اپنے ہم نام سے ملنا میری زندگی کا وہ موڑ تھا جس نے میری سوچ کو اور میری شخصیت کو بدل کے رکھ دیا۔ وہ پہلا تجربہ تھا جس نے میرے احساس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید میں آج وہ نہ ہوتا' جو میں تھا۔

بعض اوقات مجھے ایک اور بڑا عجیب سا خیال آتا ہے۔ آخر اس لڑکے کا نام ناصر عظیم ہی کیوں تھا۔ بلاشبہ اس نام کے لوگ بہت ہوں گے مگر غور طلب بات یہ ہے کہ یتیم خانے میں پرورش پانے والے ایک ناصر عظیم کے پاس دوسرا ناصر عظیم کیسے پہنچا اور

aazzamm@yahoo.com

کیوں پہنچا؟ کیا اس کے پیچھے بھی دستِ غیب کا کوئی انتظام تھا جس نے .... میرے ہی ہم نام سے مجھے پھر ملوایا اور صرف ایک تجربے سے آشنا کرانے کے لیے جس کی شدت نے میرے وجود میں انقلاب برپا کردیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنا چہرہ نہ دیکھتا ہو تو قدرت اس کے مقابل آئینہ لے آئے کہ لو دیکھو، تم کون ہو اور کیا ہو۔ اور پھر آدمی کو پتا چلے کہ اس کی شخصیت کتنی قابلِ نفرت، مکروہ اور گھناؤنی ہے۔

ظاہر ہے اس احساس کے بعد ہی انسان خود کو بدل سکتا ہے۔ خدا نے مجھے ایک شاک دینے کے لیے ناصر عظیم کو بھیجا کہ ناصر عظیم، دیکھو۔ ایک تم ہو اور ایک یہ ہے۔ اگر تم سمجھو تو اس میں تمہارے لیے درسِ عبرت ہے اور کرنا چاہو تو ایسے ہر ناصر عظیم کے لیے تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔ کسی اور کے ساتھ کچھ بھی ہوا تم کو احساس نہیں تھا مگر جب ناصر عظیم کے ساتھ ہوا تو تمہیں لگا کہ تمہارے ساتھ ہوا۔

میں نے ناصر کو ایک اور فقیر دکھایا جو اندھا نہیں تھا مگر یتیم خانے کے ایک لڑکے کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے ہر ایک کے سامنے بڑی درد بھری آواز میں گڑگڑا رہا تھا۔ ایسی مثالیں بہت تھیں جہاں مداری سرِعام تماشا کررہے تھے اور دیکھنے والوں کی نظر دھوکا کھانے کی عادی تھی چنانچہ مداری پیسہ بٹور رہے تھے اور چھوٹے مداری کو بڑا مداری لوٹ رہا تھا اور بڑے مداری کا مقابلہ اس سے بڑے مداری سے تھا۔ جو جتنا بڑا مداری تھا اتنا ہی بڑا اس کا کھیل تھا۔

دوپہر سے کچھ پہلے ناصر نے کہا "تم نے ابھی تک چندہ جمع کرنا شروع نہیں کیا؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "وہ بھی کرلیں گے بیٹا۔ جلدی کیا ہے، پہلے یہ بتا تیرے چچا کا گھر کہاں ہے، میرا مطلب ہے تیرا گھر؟"

اس نے کہا "وہ تو بہت دور ہے۔"

"تجھے پتا معلوم ہے؟ اگر ہم وہاں جائیں....؟"

"نہیں۔ چچا مارے گا مجھے، میں نہیں جاؤں گا" وہ بولا۔

"پھر انکار۔ تو مار کھائے گا مجھ سے۔ ایسی کی تیسی تیرے چچا کی جو میرے سامنے تجھے کچھ کہے۔ اس کے علاوہ میں صرف وہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ تیرے چچا یا چچی کو پتا نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "نام کیا ہے اس کا؟"

"محمد وسیم شیخ" وہ بولا "مگر ہم پیدل اتنی دور کیسے جائیں گے۔"

"ہم رکشا یا تانگے میں چلے جائیں گے" میں نے کہا۔

"پیسے ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے کہا "پیسے بہت بیٹا۔ یہ جو بینک ہے نا۔ یہ میرا ہے، تجھے یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ آکے دیکھ لے۔"

وہ ڈرتے ڈرتے میرے ساتھ بینک میں گیا۔ یہ بینک کی ایک چھوٹی سی شاخ تھی۔ اندر آٹھ دس افراد کام کررہے تھے۔ ان میں سے تین چار کاؤنٹر پر تھے۔ میں ایک کونے میں بیٹھے ہوئے باریش شخص کی طرف گیا اور اسے سلام کیا۔

اس نے سر اٹھاکے مجھے دیکھا اور خوش ہوکے بولا "ناصر میاں، کیسے ہو.... آؤ بیٹھو، تم تو جمعرات کو آتے تھے۔"

میں نے کہا "انکل سمیع! آج میں پیسے جمع کرانے نہیں، نکلوانے آیا ہوں۔"

وہ حیران ہوئے "خیریت تو ہے نا، کتنے پیسے چاہئیں۔"

"زیادہ نہیں۔ صرف سو روپے" میں نے کہا "مگر مجھے چیک لکھنا نہیں آتا۔"

انہوں نے جیب میں سے سو کا نوٹ نکالا اور مجھے دے دیا "کیا کروگے چیک لکھ کر۔ اگلی جمعرات کو بھی آؤگے نا، واپس کردینا۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا "آپ بہت اعتبار کرتے ہیں مجھ پر۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر.... یہ سو روپے.... تم کیا کروگے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم غلط جگہ خرچ نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "اسے ضرورت ہے۔ یہ بھی یتیم خانے میں ہے انکل سمیع!"

اس نے کہا "میرا نام بھی ناصر عظیم ہے انکل!"

سمیع صاحب مسکرائے "بھئی واہ، کیا عجب اتفاق ہے۔"

میں نے کہا "انکل، پوری بات میں آپ کو پھر بتاؤں گا، ابھی وقت نہیں ہے۔"

انہوں نے کہا "بھئی چائے پی لو۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں۔ کھانا منگوا لیتے ہیں کچھ، میں اپنے لیے تو لایا تھا۔"

"نہیں انکل، کام زیادہ ضروری ہے، خدا حافظ۔"

باہر آکے ناصر کو سخت حیرانی ہوئی "کیا واقعی یہ تمہارے انکل تھے؟"

میں نے ہنس کے کہا "بے کیا انکل نظر نہیں آرہے تھے؟ اتنی سیاہ داڑھی والی آنٹی کیسے ہوسکتی ہیں؟"

"میرا مطلب تھا۔ تمہارا کیا رشتہ ہے ان سے؟"

"کچھ نہیں۔ وہ ایک آدمی اور ایک اچھے مسلمان ہیں۔ جس شخص میں یہ دونوں خوبیاں ہوں وہ کسی تعریف کا محتاج نہیں رہتا۔"

"مگر تم ان کو کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "افسوس ہوتا ہے مجھے یہ بتاتے ہوئے۔ مگر میں کیا کروں، اگر میں سچ بولتا تو بات نہ بنتی۔ میں نے جھوٹ بول کے ان سے ایک رشتہ قائم کرلیا۔ یہ مجبوری اور انسانیت کا رشتہ تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں یتیم خانے میں رہتا ہوں کیونکہ میرے ماں باپ بھائی بہن سب مرچکے ہیں، دنیا میں میرا کوئی نہیں۔"

"یہ جھوٹ کیسے ہوگیا، یہ تو سچ ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ سچ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچ کا خود مجھے پتا نہیں۔ میرے ماں باپ کون تھے.... کہاں رہتے تھے۔ میں یہاں کب آیا تھا۔ یہ بات بہت پرانی ہے۔ آٹھ دس سال پہلے کی۔ جب مجھے ٹھیک سے بات کرنا بھی نہیں آتی تھی تو کوئی مجھے یہاں چھوڑ گیا ہوگا۔ جب میں بڑا ہوا اور میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تو مجھے کوئی بتانے والا نہیں تھا۔ یہاں ویسے تو سب کچھ لکھا جاتا ہے۔ جیسے تم کو لانے والا تمہارا چچا تھا تو اس کا نام محمد وسیم شیخ اور اس کا پتا لکھا گیا ہوگا، اس نے دستخط بھی کیے ہوں گے رجسٹر میں۔ اس نے تمہارے باپ کا نام اور پتا بھی لکھوایا ہوگا اور ممکن ہے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی بھی دی ہو مگر مجھے کچھ بھی نہیں ملا۔ یہاں مالک اور منیجر تو وہی ہیں مگر یہ جو اتالیق کہلاتے ہیں۔ ہمارے نگراں اور جیلر۔ یہ بدلتے رہتے ہیں۔ یک چشم صوفی تین سال سے ہے۔ بنگالی کو چار سال ہوچکے ہیں۔ کلرک بھی تین بار بدلے ہیں میرے سامنے۔ یا تو خود یتیم خانے والوں نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ رجسٹر نہیں مل رہا ہے۔ یا واقعی رجسٹر نہیں ملا۔ یہاں آنے جانے والوں کا پورا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور وہ ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ لوگ دس پندرہ سال بعد آجاتے ہیں کسی گم شدہ بچے کو تلاش کرتے ہوئے۔ کبھی کبھی پولیس بھی آجاتی ہے۔ دو بچے گھر سے بھاگے تھے۔ یہاں سے پکڑے گئے۔"

"کیوں بھاگے تھے؟"

میں نے چڑ کے کہا "مجھے کیا معلوم یار۔ باپ مارتا ہوگا۔ سوتیلی ماں ہوگی یا تیرے جیسی کہانی ہوگی۔ چچا یا ماں مارتے ہوں گے۔ ظلم کرتے ہوں گے۔ خیر چھوڑ اس بات کو۔ چل کہیں کھانا کھاتے ہیں پہلے۔"

ہم نے فٹ پاتھ کے کنارے پڑی بینچ پر بیٹھ کے ایک ریڑھی والے سے بریانی خرید کے کھائی۔ ناصر کے لیے میرے دل میں ہمدردی کے جذبات ایک نیا تجربہ تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ میرا ہم نام تھا، میں نے اس کو پہلے دن ہی اپنا لیا تھا۔ یوں جیسے وہ چھوٹا بھائی ہو۔ ورنہ اس سے پہلے نہ جانے کتنے بچے آئے جن کی زندگی کی کہانی زیادہ دردناک تھی مگر میں نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔

"یہ جو سمیع صاحب ہیں" میں نے کھانا کھاتے ہوئے بتایا "بینک میں ملازم ہیں۔ میں اپنا حساب بینک میں کھولنا چاہتا تھا مگر بینک والے پوچھتے ہیں کہ تمہیں کوئی جانتا ہے؟ شناختی کارڈ کی کاپی دینا پڑتی ہے اور جاننے والا فارم پر دستخط بھی کرتا ہے۔ جاننے والا بھی ایسا ہونا چاہیے جس کا بینک میں اکاؤنٹ ہو۔ ایک بچے کا اکاؤنٹ تو صرف اس کے ماں باپ کھول سکتے ہیں یا اس کی پرورش کرنے والے۔ مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میری ضمانت کون دیتا۔ ایک دن یہ بینک سے نکلے تو میں ان کے پیچھے ہولیا۔ انہوں نے اس دن... کچھ سامان خریدا تھا، یوٹیلٹی اسٹور سے۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں تھیلے تھے۔ میں نے کہا کہ سر، تھیلے مجھے اٹھانے دیں۔ انہوں نے دیکھے بغیر کہہ دیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ جناب میں زیادہ مزدوری نہیں لوں گا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے مزدور کی ضرورت ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے تو مزدوری کی ضرورت ہے سر، میں بھیک مانگنا نہیں چاہتا۔ محنت کرکے کمانا چاہتا ہوں۔ جو آپ کا جی چاہے دے دیں۔ آپ ایک روپیہ دیں گے تو میں شکریہ ادا کرکے قبول کرلوں گا۔ ویسے آپ دس روپے بھی دیں گے تو نہیں لوں گا۔ اس بات پر سمیع صاحب نے رُک کر مجھے غور سے دیکھا اور دونوں تھیلے مجھے پکڑا دیے۔ ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں پہنچ کے انہوں نے مجھے دس روپے دینے چاہے تو میں نے انکار کردیا۔ میں نے کہا سر، آپ مجھ پر ترس کھاکے اتنے پیسے دے رہے ہیں، مزدوری اتنی نہیں بنتی۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا کہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔ رکھ لو، مگر میں نے کہا کہ آپ مجھے اتنی ہی مزدوری دیں جتنی کسی اور مزدور کو دیتے۔ پھر میں خوشی سے لوں گا۔ انہوں نے پوچھا کہ اپنی خوشی سے تم کتنے لوگے۔ میں نے سوچ کے کہا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے۔ انہوں نے مجھے پانچ روپے دیے تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور سلام کرکے واپس چل پڑا مگر میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ متاثر ہوچکے ہیں۔ انہوں نے مجھے آواز دے کے بلایا اور اور میرا نام پوچھا۔ پھر یہ پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ میں نے نام بتادیا مگر اور کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ بہت حیران ہوئے مگر میں نے کہا کہ اپنے حالات بتاکے میں سوالی نہیں بننا چاہتا۔ یہ نہیں چاہتا کہ کوئی میری بات سن کے کہے کہ لڑکا بڑا اُڑانے باز ہے۔ کیا اسٹوری سناتا ہے یا مجھ پر یقین کرے تو مجھے خیرات زکوٰۃ دینے پر تُل جائے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ میری کچھ ذمے داریاں ہیں جو میں خود محنت مزدوری کرکے پوری کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ ماشاءاللہ۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ دنیا میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ کبھی مجھ سے کوئی کام پڑے تو بتانا۔ اس کے چند دن بعد میں نے ان کو بازار میں دیکھا۔ وہ پرچون کی دکان سے کچھ خرید رہے تھے۔ ساتھ والی دکان سے ایک شخص نے دس کلو آٹے کی تھیلی خریدی تو میں نے اس سے وہی بات کی جو سمیع صاحب سے کرچکا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے سب سنا، ان کا خیال تھا کہ میں نے انہیں نہیں دیکھا ہے۔ اس شخص نے مجھے بُری طرح جھڑک دیا۔ ابے چل بھاگ یہاں سے۔ مزدوری کا بچہ، شکل سے جیب کترا لگتا ہے۔ میں نے کہا۔ سر، مزدوری نہ دیں مگر گالی بھی نہ دیں۔ وہیں کھڑی ہوئی ایک عورت نے میری طرف دو روپے کا نوٹ بڑھایا تو میں نے انکار کردیا۔ ماں جی، میں خیرات نہیں لیتا۔ پھر میں دوسرے شخص سے مخاطب ہوگیا جس نے بیس کلو آٹا خریدا تھا لیکن اس نے نسبتاً شرافت سے کہہ دیا کہ اسے مزدور کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ اب سمیع صاحب نے مجھے پیچھے سے پکارا۔ میاں ناصر صاحب، ذرا اِدھر آئیں۔ میں نے پلٹ کے دیکھتے ہوئے

سخت حیرانی کا اظہار کیا۔ اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے کہا "بھئی ہمارا یہ سامان گھر پہنچانا ہے۔ دس کلو چاول ہیں اور اتنا ہی آٹا ہے۔ کیا پیسے لوگے؟" میں نے کہا "سر' جو آپ کے نزدیک جائز ہو۔" اب دکان دار اور مجھے جھڑکنے والے شخص کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ سمیع صاحب کو جانتے تھے کہ اپنے محلے کے آدمی ہیں مگر انہوں نے سمیع صاحب کو میرا نام لے کر پکارتے سنا تھا۔ جب انہوں نے پوچھا تو سمیع صاحب نے کہا "دیکھو بھائی' خدا نے سب انسان ایک جیسے نہیں بنائے۔ کسی کو جانے بغیر اس پر تہمت لگانا کتنا بڑا گناہ ہے" میں نے کہا کہ سر' آپ چھوڑیں اس بات کو۔ میں تو روز ہی سنتا ہوں سب کی۔ میں نے دیکھا کہ مجھے جھڑکنے والا سخت شرمندہ سا کھڑا تھا۔ میں دونوں تھیلے کندھے پر رکھ کے سمیع صاحب کے پیچھے چل پڑا۔ اس دن انہوں نے مجھے اپنے گھر میں بلالیا اور اپنی بیوی سے ملوایا "بھئی' یہ ہے وہ حق حلال کی روزی کمانے والا غیرت مند نوجوان جس کا ہم نے ذکر کیا تھا۔ اس کا نام ناصر عظیم ہے۔ اللہ اس کا حامی و ناصر ہو۔ اس کا حوصلہ اس کے وجود سے زیادہ عظیم ہے۔" پھر انہوں نے مجھے اصرار کرکے روکا اور مجھے چائے پلائی۔ میں نے مجبوری کی اداکاری کرتے ہوئے ان کو بتادیا کہ میں لاوارث ہوں۔ یتیم خانے میں رہتا ہوں۔ پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔ رہنے اور کھانے کو مل جاتا ہے۔ محنت مزدوری سے کچھ پیسہ جمع کرنا چاہتا ہوں کہ دسویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکوں۔ میٹرک کے بعد میں یتیم خانے میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنی رہائش کا مسئلہ بھی ہوگا۔ اس وقت تک کچھ رقم ہوگی تو پرائیویٹ امتحان دوں گا اور کوئی کام کروں گا۔ نوکری تو مجھے ملے گی نہیں کیونکہ عمر کم ہے۔ اخبار بیچوں گا' دوپہر کے وقت اور گاڑیاں دھوکے پیسہ کماؤں گا۔ شام کے کالج میں داخلہ ملا تو ضرور لوں گا۔ میں کسی درزی کے پاس یا موٹر مکینک کے پاس کام بھی تو نہیں سیکھ سکتا۔ وہ میری عمر کے بچوں کو نہیں رکھتے اور اس کے علاوہ ضامن مانگتے ہیں۔ میں خود بھی ترقی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے اعلیٰ تعلیم ضروری ہے۔ سمیع صاحب اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے مجھے گلے لگالیا اور مجھے بہت دعائیں دیں۔ "تمہارے ارادے نیک ہیں تو اللہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا" ان کا دو کمروں کا مکان تھا اور چار بچے بھی تھے مگر انہوں نے کہا کہ میں چاہوں تو ان کے ساتھ رہنے آجاؤں۔ میں نے صاف انکار کردیا اور ان کو قسم دے دی کہ وہ کبھی ترس کھا کے مجھے نکما نہیں بنائیں گے۔ مجھے مفت خوری کی عادت نہیں ڈالیں گے اور نہ یتیم خانے آکے میری مدد کریں گے۔ میں اپنی مدد آپ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر خدا خود میری مدد کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا میٹرک کے بعد تم اپنی تعلیم کا خرچہ مجھ سے لے لینا۔ میں نے اس سے بھی انکار کردیا۔ میرے یقین اور حوصلے نے ان کو حیران کردیا تھا۔ اتنی کم عمر کا بچہ اور اتنا بلند حوصلہ۔ اس زمانے میں ایسی دیانت داری سے رزق حلال پر بھروسا کرنے کی عادت اور اپنی محنت سے ترقی کرنے کی یہ لگن۔ ایسا کامل اعتقاد۔ سبحان اللہ۔ جزاک اللہ۔ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے یتیم خانے سے تصدیق کی ہوگی۔ ان کو پتا چل گیا ہوگا کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ایک ہفتے بعد میں ان سے ملنے بینک گیا تو وہ بہت خوش ہوئے "آؤ میاں ناصر' بڑی تمنا تھی تم سے پھر ملنے کی" میں نے کہا "کیا آپ یتیم خانے آئے تھے؟" انہوں نے کچھ شرمندہ ہوکے کہا "صرف تم سے ملنے' تمہاری مدد کرنے کے لیے نہیں۔ منیجر نے بھی تمہاری تعریف کی اور کہا کہ بہت ذہین اور محنتی لڑکا ہے" میں نے کہا "آپ نے میرے لیے وہاں پیسے یا کوئی چیز تو نہیں دی تھی؟" انہوں نے کہا "تم نے قسم نہ دی ہوتی تو ضرور دیتا۔" میں نے کہا "وہ چیز یا رقم بھی مجھے نہ ملتی۔ اچھا کیا آپ نے قسم کا لحاظ کیا۔ آج میں ایک کام سے آیا ہوں آپ کے پاس" انہوں نے کہا "بتاؤ' بھئی ہم کیا کرسکتے ہیں تمہارے لیے' ہمیں بڑی خوشی ہوگی" میں نے کہا "میں بینک میں اپنا حساب رکھنا چاہتا ہوں۔ میں جو کچھ بچاتا تھا محنت مزدوری کرکے وہ ایک شخص کے پاس رکھواتا تھا۔ اللہ اسے معاف کرے' میں اس کا نام بھی نہیں لوں گا۔ وہ میری ساری جمع پونجی ہضم کرکے بھاگ گیا۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتا تھا اور ایک دکان پر سیلزمین تھا۔ اس نے نوکری اور مکان دونوں چھوڑ دیے ہیں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ دبئی چلا گیا ہے میرے پیسے سے....." سمیع صاحب نے سخت افسوس کا اظہار کیا "یہ تمہارا ہی ظرف اور حوصلہ ہے کہ اب بھی اس شخص کو گالیاں نہیں دے رہے ہو مگر تمہاری رقم کتنی تھی آخر۔ دبئی جانے میں تو ہزاروں خرچ ہوتے ہیں" میں نے کہا "سر' حساب تو میں نے رکھا نہیں تھا۔ مجھے اس پر بھروسا تھا۔ میرا خیال ہے کہ چار پانچ ہزار ہوں گے۔ اتنے میں دبئی کا ٹکٹ تو مل جاتا ہوگا" سمیع صاحب دم بخود رہ گئے "چار پانچ ہزار۔ اتنی رقم کیسے جمع کی تم نے؟" میں نے عاجزی سے کہا... "محنت مزدوری سے۔ ہر ہفتے کبھی پچاس ساٹھ دیتا تھا' کبھی سو ہوجاتے تھے۔ عید کے زمانے میں دو سو تک کی مزدوری کی میں نے" وہ مجھے نظر جمائے دیکھتے رہے۔ انہیں میری بات سن کے سخت صدمہ پہنچا تھا اور وہ ایسے غمزدہ تھے جیسے ان کا اپنا نقصان ہوا ہے۔ جب میں نے کہا کہ اب میں اپنی بچت بینک میں رکھنا چاہتا ہوں تو انہوں نے فوراً فارم منگوا کے خود ضامن کی جگہ دستخط کردیے۔ میرا بینک اکاؤنٹ کھل گیا اور میں نے ہر جمعرات کو سمیع صاحب کے پاس رقم جمع کرانی شروع کردی۔ کبھی ساٹھ کبھی ستر' کبھی سو۔"

ناصر نے کہا "اس سے پہلے تم پیسہ کہاں رکھتے تھے؟"

میں نے کہا "ایک خفیہ جگہ تھی۔ سب لڑکوں کی ہوتی ہے۔ کوئی زمین میں دبا کے رکھتا ہے' کوئی کسی دیوار کے خانے میں۔ کوئی پیڑ کے تنے میں چھپاتا ہے تو کوئی کسی کے پاس رکھواتا ہے۔ نقصان سب اٹھاتے ہیں۔ پتا چل جائے تو رقم غائب ہوجاتی ہے یا برآمد

کرلی جاتی ہے۔ خود مجھے دوبار نقصان ہوچکا تھا۔ ایک بار تو پتا ہی نہیں چلا کہ رقم کون لے گیا۔ دوسری بار صوفی کو شک ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے تھانے دار کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تو میں نے اسے آدھی رقم دے کر جان چھڑائی۔ جب رقم بینک میں جمع ہونے لگی تو مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ میں جتنی رقم سمیع صاحب کو دیتا تھا گنے بغیر دیتا تھا۔ ظاہر یہ کرتا تھا کہ مجھے پتا نہیں' وہ مجھے تلقین کرتے تھے کہ یہ حدیث ہے.... حضورؐ نے تاکید فرمائی ہے کہ جب لین دین کرو تو لکھ لیا کرو۔ میں اپنے پاس پورا حساب رکھتا تھا۔ تقریباً چھ مہینے بعد میں نے سمیع صاحب کی عدم موجودگی میں معلوم کیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جتنی رقم میرے حساب سے ہونی چاہیے تھی میرے اکاؤنٹ میں اس سے دُگنی رقم تھی۔ میں نے سمیع صاحب سے شکایت کی تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ اتنی ہی رقم میرے اکاؤنٹ میں خود ڈال دیتے تھے جتنی میں جمع کراتا تھا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ وہ نیک نیتی سے میرے نقصان کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور زکوٰۃ پر میرا حق بنتا ہے۔ مجھے صدقے اور فطرہ کی رقم قبول کرنے میں بھی عار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ غریب' مسکین اور یتیم کے لیے حلال ہے اور غریب' مسکین' یتیم ہونا نہ جرم ہے نہ گناہ۔ نہ ہی باعث شرم ہونا چاہیے کیونکہ سب کچھ منجانب اللہ ہے۔ میں نے قائل ہوکے کہا "سر۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے فوراً مجھے ٹوک دیا "خبردار ناصر میاں' آئندہ مجھے سر مت کہنا۔ یہ انگریزوں کا طریقہ ہے اور سر میں خناس بھرتا ہے" میں نے کہا "تو کیا میں آپ کو انکل کہہ سکتا ہوں؟" وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے گلے لگالیا۔ بعد میں انہوں نے ایک ایک کو بتایا کہ میں کون ہوں اور کس قسم کے خیالات رکھتا ہوں۔ بینک میں سمیع صاحب کی بہت عزت تھی۔ ان کی بات کا اثر یہ ہوا کہ وہ سب جو زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ صدقہ اور فطرہ دیتے تھے' سب میرے حساب میں رقوم جمع کرانے لگے۔ بینک کے علاوہ باہر سمیع صاحب کے دوست احباب بھی میرے خیالات سے سخت متاثر ہوئے۔ خاص طور پر میری اس بات سے کہ ناصر کسی کے احسان کا روادار نہیں اور خیرات کے نام پر مدد قبول نہیں کرتا۔ اس کے بعد تو میرا بینک اکاؤنٹ یوں بڑھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"کبھی کوئی یہ بات صوفی کو بتادیتا پھر؟"

"کیسے بتادیتا۔ سمیع صاحب میری قسم کا ذکر جو کررہے تھے۔ اور پھر اتنی فرصت کسے تھی کہ یتیم خانے میں مجھ سے ملنے آئے۔ رقم بینک میں جمع ہورہی تھی اور کبھی میں نے ایک پیسہ نہیں نکالا تھا۔ سمیع صاحب اپنی شرافت اور ایمانداری کی زندہ مثال تھے۔ ان کی ذات شبہے سے بالاتر تھی۔ بعد میں تو یہ ہوگیا تھا کہ کوئی بھی سلپ بھرتا تھا اور کچھ رقم بھی میرے حساب میں شامل ہوجاتی تھی جس کا سمیع صاحب کو بھی پتا نہیں چلتا تھا۔"

"ایسے کوئی پیسہ جمع کراسکتا ہے تمہارے حساب میں؟" ناصر نے حیران ہوکے پوچھا۔

"ہاں۔ پیسہ جمع کرانے میں کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن نکال کوئی نہیں سکتا جب تک چیک پر سمیع صاحب کے دستخط نہ ہوں۔"

"تم بھی نہیں نکال سکتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ جب میں بالغ ہوجاؤں گا۔ اٹھارہ سال کا' تو پھر میرے دستخط چلیں گے۔ تم نے دیکھا آج سمیع صاحب نے اپنی جیب سے سو روپے فوراً دے دیے۔ میں پانچ سو مانگتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ چیک بھی نہ لکھتے۔ پوچھتے ضرور کہ ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے آخر۔ سو روپے کی رقم معمولی تھی اور میں نے پہلی بار مانگی تھی۔ انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ فوری ضرورت ہے ورنہ اتنی رقم تو میں ہر جمعرات کو خود انہیں دیتا ہوں۔ اب انہیں کیا معلوم' کبھی تو میں خود کسی سے سلپ بھروا کے پانچ پانچ سو روپے بھی جمع کراتا رہا ہوں۔"

ناصر نے کہا "اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے تمہارے پاس؟"

"میرے ساتھ رہوگے تو پتا چل جائے گا بیٹے!" میں نے کہا۔

بریانی والے نے کہا "چلو اب بہت باتیں کرلیں۔ پیسے نکالو۔"

میں نے اسے سو کا نوٹ دیا اور ناصر سے کہا "اب چلتے ہیں تمہارے گھر کی طرف۔"

ناصر کی عقل میری باتوں نے خبط کردی تھی "کیا تمہیں معلوم ہے۔ اس وقت تمہارے پاس کتنا پیسہ جمع ہے بینک میں؟"

بریانی والے نے مجھے غور سے دیکھا "واہ بھئی' سیٹھ آدمی ہے تو ذرا سا لونڈا ہے دیکھنے میں۔"

میں نے کچھ دور آکے ناصر کو ڈانٹا "پاگل کے بچے۔ یہ بات کیا سب کے سامنے پوچھنے والی تھی۔ تو مروادے گا مجھے اور خود بھی مرے گا۔ اگر کوئی بات صوفی کے سامنے کی نا۔"

اس نے فوراً کہا "غلطی ہوگئی مجھ سے۔ قسم خدا کی' میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا' کتنی رقم ہے تمہارے پاس؟"

اس کے تجسس میں میرے لیے حیرت سے زیادہ فخر کا سامان تھا "آخری بار جب میں نے معلوم کیا تھا تو ستاون ہزار تھے.... کچھ اوپر۔"

"ستاون.... ہزار....؟" ناصر کے قدم فٹ پاتھ پر جم گئے اور منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "کتنے دن پہلے؟"

"دو مہینے ہوگئے۔ دراصل اب میں پوچھتا بھی نہیں۔ ہوں گے ساٹھ ہزار سے اوپر" میں نے کسی حد تک غرور کے ساتھ کہا "لیکن بیٹا' ادھر تیری زبان سے کچھ نکلا کسی کے سامنے' ادھر میں نے تیری گردن مروڑی۔"

ناصر چھوٹا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ اسے اپنے گھر کا پتا معلوم نہ ہوتا۔ اس نے مجھے گھر کا نمبر بھی بتایا اور یہ بھی کہ اسی محلے میں چچا کی المونیم کے برتنوں کی دکان ہے۔ وہاں جانے کے لیے ہم نے تانگے میں سفر کیا جو میرے خیال میں غیر ضروری تھا۔ دراصل میں

چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں اور ویسے بھی سڑگشت کا عادی تھا اور دن بھر میں دس میل چلنا میرے لیے عام سی بات تھی مگر ناصر کے لیے وہ فاصلہ بہت تھا۔ اس طرح ہمارا کچھ وقت بھی بچ گیا۔

میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ میں ناصر کے چچا سے ملوں یا اس گھر کے دروازے پر دستک دے کر پوچھوں کہ کیا وسیم شیخ صاحب یہاں رہتے ہیں۔ میں نے ناصر کو دور ہی چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ قریب جانے سے ڈرتا تھا کہ چچا نے دیکھ لیا تو بہت مارے گا یا چچی کی نگاہ پڑ گئی تو وہ چچا کو بتادے گی اور پھر چچا یتیم خانے پہنچ جائے گا۔ اس گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے نہ جانے کیوں میں نے ایک شخص کو موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے دیکھا تو رک گیا۔

میں نے بڑے ادب سے کہا "سر۔ کیا آپ یہاں رہتے ہیں؟"

اس نے میرے سوال پر حیران ہو کے پوچھا "ہاں۔ یہی سمجھ لو۔ ابھی رہتا تو نہیں مگر یہ مکان میں نے خرید لیا ہے۔ تھوڑا سا کام ہو جائے رنگ روغن کا۔ پھر فیملی کو بھی لے آؤں گا۔ کیا تم اسی محلے میں رہتے ہو؟"

میں نے کہا "جی سر۔ کس سے خریدا ہے آپ نے یہ مکان؟"

"وسیم شیخ سے۔ تم جانتے ہو نا انہیں۔۔۔"

"جانتا ہوں سر۔ اسی لئے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ مکان خرید کے بہت بڑی غلطی کی ہے اور زیادتی بھی۔"

وہ جاتے جاتے رُک گیا "کیا غلطی کی ہے بھئی اور کیا زیادتی؟"

میں نے کہا "کیا آپ نہیں جانتے کہ مکان اس کا نہیں تھا؟"

"پھر کس کا تھا؟" وہ میری سنجیدگی پر مسکرانے لگا۔

"اس کے بھائی کا تھا" میں نے کہا "عظیم شیخ نام تھا اس کا۔ اس نے ایک قتل کر دیا تھا اور اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی تھی۔ اس کی ایک بیوی تھی اور ایک بچہ۔"

"نہیں۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ دوسری بیوی کے لیے ہی اس نے قتل کیا تھا" وہ بولا۔

"میرا مطلب تھا سر۔ اس گھر میں ناصر رہتا تھا اور اس کی ماں۔ ناصر کے چچا نے مکان پر قبضہ کر لیا اور۔۔۔ انہیں گھر سے نکال دیا" میں نے بہتر سمجھا کہ ناصر کی ماں کے بارے میں کوئی بات نہ کروں "وسیم شیخ اس مکان کا مالک نہیں تھا۔ وہ تو بھائی نے مرتے وقت۔۔۔ میرا مطلب ہے پھانسی ہونے سے پہلے۔ سب کچھ اسی کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ مکان ناصر عظیم کا ہے سر۔"

"تم ناصر عظیم کے کیا ہو؟"

میں نے کہا "میں اس کا دوست ہوں۔ میرے والد وکیل ہیں۔ آپ کے ساتھ دھوکا ہوا ہے سر۔ ناصر آپ پر کیس کر دے گا۔ آپ ہار جائیں گے' یہ مکان آپ کو ناصر کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا "تم اپنی عمر سے بڑھ کے باتیں کرتے ہو۔ کیا نام ہے تمہارے وکیل والد کا۔"

"رشید۔۔۔ عبدالرشید۔"

"تم۔۔۔ رشید صاحب کے بیٹے ہو؟۔۔۔ ان کی شادی تو ابھی دو تین سال پہلے ہوئی تھی۔۔۔ کیا اس سے پہلے بھی۔۔۔"

میں نے کہا "جی۔۔۔ میں ان کی پہلی بیوی کا بیٹا ہوں۔"

"پھر میں انہی سے بات کرلوں گا' رشید صاحب سے۔ میں خود وکیل ہوں۔ مجھے تمہارے دوست سے ہمدردی ہے۔ اس کا جو نقصان ہوا اپنے باپ کی وجہ سے۔ وہ سب تو مجھے معلوم ہے کہ اس نے کس کو قتل کیا تھا اور کیوں۔۔۔ لیکن اس نے اپنی جائداد کے معاملے میں کاغذات بھائی کے نام کرکے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اگر وہ مکان اپنی بیوی کے نام کرتا تو کچھ نہ ہوتا۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ عورت ذات جائداد کو کیسے سنبھالے گی حالانکہ سنبھالنا کیا۔ تین کمروں کا مکان تھا جس میں وہ خود رہتی۔ ناصر کے باپ کی زندگی میں بھی مکان کی رجسٹری وسیم شیخ کے نام ہو چکی تھی۔ اس کو پھانسی ہونے سے شاید ایک ہفتہ پہلے۔ میں نے بہت دیکھ بھال کے مکان خریدا ہے' آخر میں بھی وکیل ہوں۔ اس معاملے میں مقدمے بازی سے کچھ نہیں ہو گا۔ مکان اب تمہارے دوست کو نہیں مل سکتا۔"

میں نے کہا "لیکن سر۔۔۔ کل تک تو وہ یہاں رہتے تھے۔"

"کل تک۔۔۔" اس نے مشکوک لہجے میں کہا "کل تو میں نے قبضہ لیا ہے ان سے۔ مکان خالی تھا اور مجھے تو محلے والوں نے کچھ اور ہی باتیں بتائی ہیں۔"

"کیا باتیں سر۔۔۔؟"

"چھوڑو۔ تم ابھی بچے ہو" وہ پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

"پلیز سر۔ آپ مجھے بتادیں۔"

وہ میرے لہجے پر حیران ہوا "دیکھو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ناصر کی ماں۔۔۔ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔۔۔ اسی لیے ناصر کے باپ نے اسے چھوڑ دیا تھا۔۔۔"

"یہ جھوٹ ہے" میں نے غصے سے کہا۔

"مجھے جھوٹ سچ سے کیا۔ جو مجھے معلوم ہوا میں نے تمہیں بتادیا۔ تمہارا دوست ناصر اب کہاں ہے' تم جانتے ہو؟"

"وہ۔۔۔ ہمارے گھر میں ہے۔۔۔ میرے ساتھ۔"

"وسیم شیخ صاحب کہتے ہیں کہ وہ گھر سے ان کی بیوی کا بہت سا زیور اور کافی نقد رقم لے کر فرار ہو گیا تھا۔ ساٹھ ستر ہزار کی چوری کا کیس تھا جو انہوں نے درج نہیں کرایا۔ یہ بتادینا رشید صاحب کو۔"

"سر۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وسیم شیخ نے جھوٹ بولا ہے آپ سے۔ ناصر ایسا لڑکا نہیں ہے۔"

"بھئی مجھے تو پتا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے' وہ بھاگ کر کہاں گیا ہو گا۔ اپنی آوارہ ماں کے پاس۔ انہوں نے آوارہ

نہیں' فاحشہ کہا تھا۔ رپورٹ لکھواتے تو خود ان کی بدنامی ہوتی۔ آخر ان کے بھائی کی بیوی اور بھتیجے کا معاملہ تھا" اس نے موٹر سائیکل کو گیئر میں ڈالا اور روانہ ہو گیا۔

میں کچھ دیر مکان میں پڑے تالے کو دیکھتا رہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس تالے کو توڑ دوں اور ناصر سے کہوں کہ آجا اپنے گھر میں رہ آرام سے۔ مگر مجھے نتائج کا اندازہ تھا۔ مکان خریدنے والا عام آدمی ہوتا تب بھی ہم پکڑے جاتے' وہ تو وکیل تھا۔ اس نے مکان خریدا تھا تو کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا تھا۔ مکان اب ناصر کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وکیل نے ٹھیک کہا تھا۔ ناصر کے باپ نے ایک غلطی کی تھی' مکان بھائی کے نام کرکے۔ ایک گناہ کیا تھا اپنی بیوی کو چھوڑ کر پرائی بیوی کے ساتھ تعلقات استوار کرکے اور ایک جرم کیا تھا قتل کرکے۔ گناہ کی سزا کا معاملہ آخرت سے تھا۔ جرم کی سزا ناصر کے باپ کو بھی مل چکی تھی اور دوسری عورت کو بھی۔ غلطی کا خمیازہ ناصر عظیم بھگت رہا تھا۔ صرف وسیم شیخ فائدے میں رہا تھا۔ بھائی کے مرنے سے پہلے ہی اس نے مکان پر قبضہ کر لیا تھا۔ بھائی کے مرنے کے بعد اس نے بیوہ بھابی کو غیر اخلاقی زندگی گزارنے پر مجبور کیا اور پھر شاید ناکام ہو کے قتل کر دیا۔ میرا ذہن اس وقت بھی یہ بات قبول نہیں کرتا تھا کہ کوئی عورت ایسے حالات میں اپنے بچے کو چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ اب اس نے مکان بیچ کے ساری رقم ہتھیالی تھی اور ناصر کے خلاف ایک بے بنیاد الزام عائد کر دیا تھا کہ وہ چوری کرکے بھاگ گیا۔ اسے وہ دھوکے سے یتیم خانے میں چھوڑ آیا تھا۔

میں سخت طیش کے عالم میں وہاں واپس گیا جہاں ناصر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے سب بتادیا۔ اگر میں اس کے باپ کو بُرا بھلا کہتا' جس کی وجہ سے ان کا بسا بسایا گھر اُجڑ گیا تو وہ زیادہ رنجیدہ ہوتا۔ میں تو اس کی ماں کو بھی قصوروار سمجھتا تھا جس نے ناصر کو لاوارث چھوڑ دیا۔ اس پر لازم تھا کہ جیسے ہی اسے وسیم شیخ کی نیت میں فتور کا علم ہوا' وہ شور مچاتی۔ محلے والوں کو بتاتی' پولیس کے پاس جاتی۔ مکان واپس حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتی۔ آخر محلے والے اور ان کے رشتے دار جانتے ہوں گے کہ مکان کس کا تھا۔ کوئی اس کی مدد ضرور کرتا۔ اسے تو وسیم شیخ کو قتل کر دینا چاہیے تھا۔ خود قتل ہو گئی' بے وقوف عورت۔

یہ سب سوچ کے مجھے غصہ بھی آرہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ اب مجھے یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ وکیل موقع پاتے ہی ساری باتیں وسیم شیخ کو بتائے گا اور شاید کسی عبدالرشید ایڈووکیٹ سے بھی تذکرہ کرے گا کہ اس کی پہلی بیوی کا بے وقوف لڑکا اس سے کیا کہہ رہا تھا۔ فکر مجھے یہ تھی کہ کہیں وسیم شیخ یتیم خانے نہ پہنچ جائے یا ناصر کے خلاف اب رپورٹ نہ درج کرا دے۔ یہ باتیں میں ناصر سے کرتا تو وہ اور پریشان ہوتا۔

میں نے کہا "تیرے چچا کی دکان کہاں ہے بیٹے؟"

اس نے کہا "دوسری طرف۔"

میں نے پلٹ کے کہا "چل ذرا اسے بھی دیکھ لیں۔"

اس نے میرا بازو پکڑ لیا "نہیں۔ وہاں چچا ہو گا۔ اس نے دیکھ لیا مجھے تو۔۔۔"

"تو کیا ہو گا؟ وہ کھا جائے گا تجھے۔۔۔ ابے ایک تو اُس۔۔۔ نے تیری ماں کو مار ڈالا۔۔۔"

"نہیں ناصر بھائی' ایسا مت کہو۔۔۔"

"میرے کہنے پر مت جا۔ خود سوچ بیٹے' اگر مکان تیری ماں کے نام پر ہوتا تو کیا تیرا چچا ایسے بیچ سکتا تھا۔ تیری ماں نے ہی اس کمینے کا مقابلہ نہیں کیا یا شاید مقابلہ کرنے کی وجہ سے ہی وہ ماری گئی۔ مگر اب تُو ہمت سے کام لے۔ تیری جگہ میں ہوتا تو ایسے چچا کی۔۔۔ دیتا" میں نے غصے میں گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

"اس نے جھوٹا الزام لگایا ہے مجھ پر۔۔۔"

"ہاں' مگر وہ اس کو سچ ثابت کر دے گا۔ تُو پکڑا جائے گا خواہ مخواہ اور پولیس بھی تیری کھال میں بھس بھر دے گی۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ رونے لگا۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "رو مت۔۔۔ ورنہ اور ماروں گا میں۔ رونے سے کوئی کام ہوتا ہے۔ مردوں کی طرح مقابلہ کر۔ دنیا نے سب کچھ چھین لیا تجھ سے اور تو ہے کہ آنسو بہا رہا ہے۔ ہمت سے کام لے' ایسی کی تیسی کر دے اس چچا کی' قتل کر دے اسے۔"

وہ سہم گیا "ایسی باتیں مت کرو ناصر بھائی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے افسوس سے سہلایا "ابے یہی تو سمجھا رہا ہوں کہ ڈرنا چھوڑ دے ورنہ اپنی جان سے بھی جائے گا اور کیا بچا ہے تیرے پاس؟"

اس نے کہا "میں آگے نہیں جاؤں گا۔ چچا کی دکان موڑ کے بعد ہے۔ درزی کی دکان کے ساتھ والی۔ برتنوں کی ایک ہی دکان ہے۔"

میں نے اسے وہیں رُکنے کو کہا اور خود آگے بڑھ گیا مگر موڑ کاٹنے کے بعد مجھے المونیم کے برتنوں کی کوئی دکان دکھائی نہ دی۔ میں آگے تک گیا اور پھر لوٹ کے آیا۔ درزی کے ساتھ والی ایک دکان میں بڑھئی اپنا کام کر رہا تھا۔ دوسری طرف مٹھائی کی دکان تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ اتنا معلوم کیا ہے تو باقی بھی پتا چل جائے۔

میں نے درزی سے پوچھا "سر۔ یہاں ایک برتنوں کی دکان تھی؟"

وہ میرے سر کہنے پر مسکرایا "ہاں تھی۔"

میں نے کہا "دکان کے مالک وسیم شیخ صاحب تھے۔"

"ہاں بھائی تھے" وہ کپڑے پر قینچی چلاتے ہوئے بولا "پرانی

بات ہے۔"

"کتنی پُرانی سر؟"

"ا بے یہ کیا سرسرلگا رکھی ہے۔ آج کتنے دن ہو گئے... دس دن' ہاں دس دن پہلے یہ حلوائی آیا تھا۔ برتنوں کی دکان اس سے پہلے ختم ہو گئی تھی۔ سارا مال کسی نے اٹھا لیا تھا۔"

"اور وسیم شیخ صاحب...؟"

"وہ گیا یہاں سے... ہم سے تو کہہ رہا تھا کہ لاہور جا رہا ہوں۔ آگے اللہ جانے مگر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟"

میں نے اداس چہرہ بنا کے کہا "مجھے کچھ پیسے لینے تھے ان سے۔"

"کتنے پیسے تھے...؟" اس نے نظر اٹھا کے دیکھے بغیر کہا۔

صرف اسے چونکانے کے لیے میں نے کہا "ساڑھے سات ہزار" اور پھر واپس چل پڑا۔

"کیا ہوا... چچا کو دیکھا؟"

میں نے کہا "وہ بھاگ گیا بیٹے۔ سب کچھ سمیٹ کر لاہور چلا گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا' صبر کر۔ چل کچھ چندہ وصول کر لیں... پھر واپس۔"

میں ناصر کو اپنے ساتھ ایک کوٹھی میں لے گیا۔ عادت کے مطابق میں نے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کو سر کہہ کے مخاطب کیا اور سلام کر کے اس سے ہاتھ ملایا وہ خوش اخلاق اور مہربان شخص تھا۔

"اوے ناصر صیب۔ کیا حال ہے" وہ بولا "خو یہ کون اے تمہارا ساتھ؟"

میں نے کہا "سر' یہ بھائی ہے میرا۔"

"چا اچا... جاؤ' بیگم صیب ام سے پوچا' ام بولا ابی نئیں آیا۔ آج خو دیر ہو گئی۔"

میں سیدھا اندر گیا۔ کوٹھی کے اندر چھوٹا سا باغ اور لان تھا۔ اس پر دو بچے لوڈو کھیل رہے تھے۔ لڑکا بڑا تھا' تقریباً ناصر کی عمر کا۔ اس نے اندر جا کے اپنی ماں کو میرے آنے کی اطلاع دی۔ ایک بہت اسمارٹ قسم کی عورت ہاتھ صاف کرتی ہوئی باہر آئی اور مجھے دیکھ کے مسکرائی۔

"آج تم نے بہت دیر کی ناصر۔ میں دوپہر کے کھانے پر تمہارا انتظار کرتی رہی۔"

میں نے کہا "آنٹی' بس کچھ کام پڑ گیا تھا۔ امتحان کا داخلہ فارم لینے گیا تھا۔ فارم بھر دیا تو تصدیق کا مسئلہ تھا۔"

"پھر... تصدیق ہو گئی یا میں صاحب سے کہوں؟"

"تصدیق ہو گئی مگر..."

"امتحانی فیس کا مسئلہ ہو گا۔ کوئی بات نہیں۔ یہ لو دو سو روپے ہیں' کم ہیں تو بتا دو۔"

میں نے کہا "کافی ہیں آنٹی' بلکہ بہت ہیں۔ آپ کی مہربانی ہے۔"

"بھئی ایسی باتیں مت کرو۔"

لڑکا پیچھے سے بولا "سر۔ کیا آج پڑھائیں گے نہیں؟"

لڑکی نے اسے ڈانٹا "کیوں نہیں پڑھائیں گے' تمہیں تو روز چھٹی چاہیے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "بھئی آج ہمارا یہ بھائی ساتھ ہے' آج چھٹی۔"

لڑکے نے خوشی سے چیخ ماری اور لان کی طرف دوڑا۔ میں نے اجازت لی اور باہر آ گیا "یہاں میں روز ایک گھنٹا ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ اس کے مجھے دو سو روپے ملتے ہیں مگر یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی یہاں کھاتا ہوں۔ آج بھی جو دو سو دیے ہیں وہ الگ ہیں۔"

"کیا یہ بات معلوم ہے کسی کو؟"

"ابھی تک تو نہیں معلوم۔ چھ مہینے ہو گئے مجھے ٹیوشن پڑھاتے۔ یہ عورت خود بھی ڈاکٹر ہے مگر اس کا ڈاکٹر شوہر کہتا ہے کہ تمہیں کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' وہ بہت بڑا ڈاکٹر ہے' بہت امیر آدمی ہے۔"

"کتنی جگہ ٹیوشن پڑھاتے ہو تم؟"

"چار جگہ' چار گھنٹے" میں نے کہا "گیارہ سو تو یہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آمدنی کے بڑے ذریعے ہیں۔ تجھے آہستہ آہستہ سب معلوم ہو جائے گا۔"

"چندہ کب جمع کرو گے؟" وہ بولا۔

میں ہنس پڑا "چندہ ابھی جمع ہو جاتا ہے۔"

ایک ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کے میں نے پانچ پانچ دس دس روپے کی رسیدیں کاٹیں' ان پر مختلف نام تھے۔ ایک رسید بیس کی بھی بنائی سب ملا کے میں نے سترہ رسیدیں کاٹیں۔ میں نے ایک سو اسی روپے چندہ اکٹھا کیا تھا جو متوقع اوسط سے کہیں زیادہ تھا۔

معلوم نہیں کیوں میرے ہمنام اس یتیم لڑکے ناصر عظیم کا خیال میرے اعصاب پر سوار ہو گیا۔ مجھے وہاں آنے والے تقریباً ہر لڑکے کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ کیا حالات تھے جن کی وجہ سے وہ یتیم لاوارث ہو کے اس جہنم میں پہنچے تھے جہاں میں اپنی زندگی کے آٹھ نو سال برباد کر چکا تھا۔ ہر لڑکے کی کہانی دردناک تھی۔ وہ سب مظلوم اور زمانے کے ستائے ہوئے تھے۔ ان کی بدبختی کے ذمے دار اپنے بھی تھے اور پرائے بھی۔ ہم جو یتیم خانے کے سنگدلانہ ماحول میں احساس سے عاری ہوتے جا رہے تھے' کسی کی داستانِ رنج والم سے متاثر ہونا بھی بھول گئے تھے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیتے تھے کہ تقدیر کے آگے کسی کی نہیں چلتی اور دنیا میں تو سب کچھ ہوتا ہے۔

سارا قصور اس کے نام کا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی اور نہیں' میں خود ہوں جو اس کے ساتھ ہوا' ایسا ہی میرے ساتھ بھی

ہوا ہو گا۔ آج مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں یہاں کب اور کیسے پہنچا تھا۔ کل کو یہ دوسرا ناصر عظیم بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔ کیا ہو گا اس کے پاس بتانے کو؟ باپ کون تھا؟ عظیم شیخ' کہاں گیا... پھانسی چڑھ گیا۔ ماں کون تھی... کہاں گئی۔ بھاگ گئی' مر گئی۔ مار دی گئی۔ کچھ پتا نہیں۔ گھر کہاں تھا۔ چچا نے چھین لیا' جھوٹ... سب جھوٹ۔ میرے پاس بھی بتانے کو کچھ نہیں۔ میری بات کے جھوٹ سچ کا بھی پتا نہیں۔ دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ اور وہ لوگ جو کسی ناصر شیخ کو یتیمی دے کر اس سے سب کچھ چھین لیتے ہیں۔ اس کی شناخت' اس کے حوالے' اس کے رشتے' گھر کی چھت کا سایہ' ماں کی محبت اور باپ کی شفقت' زندگی کا حُسن' جینے کی تمنا' خواہشات اور تمنائیں اور ان کے بدلے' ڈر' خوف... عدم تحفظ' احساسِ محرومی و کمتری۔ دکھ اور عذاب دیتے ہیں۔ ان کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ وہ نہ دُنیا کے نظامِ انصاف کی گرفت میں آتے ہیں نہ قدرت کے۔ ان کو سزا تو ملنی چاہیے۔ ان کے ساتھ وہی ہونا چاہیے جو انہوں نے دوسروں کے ساتھ کیا تھا۔

یہی وہ خیالات تھے جو بالآخر میری شخصیت' میری سوچ اور نظریات میں انقلاب کا سبب بنے۔ میں نے سوچا کہ کیا فائدہ ایسے مر مر کے جینے سے۔ خیرات میں ملنے والی زندگی کی رعایتوں سے۔ خوشامد سے حاصل ہونے والی خود غرضانہ آسائش کی خوشی سے۔ اپنے ضمیر کی آواز کو دبا کے ایک خلش مول لینے میں۔ منافقت اور ریاکاری' دوغلے پن اور حتیٰ ذہانت سے لوگوں کو بے وقوف بنا کے میں کیا کما رہا ہوں؟ کچھ نہیں۔ میں صرف اپنی عزتِ نفس گنوا رہا ہوں۔ میں خود اپنی نظر میں رُسوا ہوتا جا رہا ہوں۔ جسے میں کامیابی سمجھنے لگا ہوں' وہی میری ناکامی ہے۔ اصل کامیابی تو شیطان کی ہے جو چاہتا ہے کہ میں اسی طرح بُزدلی اور کمینگی کے راستے پر آگے بڑھتا جاؤں۔

صبح میں نے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے یتیم خانے میں داخلے کا رجسٹر دیکھا تو مجھے ایک اور صدمہ پہنچا۔ اس میں ناصر عظیم کے باپ کا نام عبدالوحید قریشی لکھا ہوا تھا۔ اس کا پتا بھی غلط تھا' اس کو داخل کرانے والا کوئی چراغ دین دھوبی تھا جو ساتھ والے گھر میں رہتا تھا۔ اس دھوبی نے اپنا شناختی کارڈ تو نہیں دکھایا تھا مگر عبدالوحید قریشی مرحوم کے شناختی کارڈ کی کاپی ضرور فراہم کی تھی۔

میں نے یہ بات ناصر کو بتائی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اتنا کچھ ہو گیا اور ابھی تُو پوچھ رہا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے اس دنیا میں بے وقوف کے بچے اور ہو رہا ہے۔"

"تم مجھ پر کیوں خفا ہو؟"

"میں خفا نہیں ہوں۔ آگ لگی ہوئی ہے مجھے۔ تیرا وہ... چچا ہوتا نا میرے سامنے... یا وہ مجھے مل جاتا کہیں..."

"تو... کیا کرتے تم؟"

"میں مار ڈالتا اسے۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"کیسے مار ڈالتے' قتل کر دیتے اسے؟"

"ہاں اسے میں قتل کر دیتا۔ بھاگ گیا تجھے چھوڑ کے وہ دھوکے باز۔ اگر وہ کہتا کہ میں اس کا چچا ہوں تو تجھے یتیم خانے والے داخل ہی نہ کرتے۔ اس نے جھوٹ بولا' خود کو دھوبی بتایا۔ تیرے باپ کا نام تک چھین لیا تجھ سے۔ اب تو دنیا کو کیا بتائے گا۔ کون ہے عبدالوحید قریشی' تیرے سچ کو دنیا میں کون تسلیم کرے گا۔"

بالآخر میرے جذبات کا آتش فشاں سرد پڑ گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان حالات میں ناصر عظیم بھی صبر کے سوا کچھ نہیں کر سکتا اور میں بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ پہلے دن سے اسے جو تحفظ میری وجہ سے حاصل ہو گیا تھا وہ حاصل رہا۔ کبھی کبھی مولا بخش کی گھر والی ضرور اس کا حال پوچھ لیتی تھی مگر وہ کبھی بنگالی وارڈ میں نہیں بھیجا گیا۔ اس کی پیشی کبھی تھانے دار کے سامنے نہیں ہوئی۔ خود اس نے بھی میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق ڈھال لیا۔ وہ میرے ساتھ چندہ جمع کرنے جاتا رہا اور میں نے پوری کوشش کی کہ وہ میری طرح جینے کا ڈھنگ سیکھ لے مگر اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی۔ میں اسے اپنی آمدنی میں سے عیش بھی کراتا رہا اور میرا خیال تھا کہ جب بالآخر دسویں کا امتحان دینے کے بعد میں یتیم خانہ چھوڑ کے جاؤں گا تو اسے بھی اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔ اس وقت تک میرے اکاؤنٹ میں موجود رقم لاکھ سے اوپر ہو گی۔ شاید لاکھوں میں ہو۔ آہستہ آہستہ میں نے اس اکاؤنٹ میں اضافے کے نئے طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ مسیح صاحب کا تبادلہ دوسری برانچ میں ہو گیا تھا مگر میرا اکاؤنٹ وہیں تھا۔ وہ مطمئن تھے کیونکہ میں نے کبھی اس میں سے ایک پیسہ نہیں نکالا تھا۔ ان کے دستخطوں کے بغیر نکال بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک دن اتفاق سے میں نے اخبار میں اشتہار پڑھا۔ کسی غریب آدمی نے اپنے جوان بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے امداد کی اپیل کی تھی۔ اس کے دونوں گُردے ناکارہ ہو گئے تھے اور اسے ایک گُردہ بدلوانے کے لیے تین چار لاکھ روپوں کی ضرورت تھی۔ مخیر حضرات سے رقم ایک بینک اکاؤنٹ میں جمع کرانے کی درخواست کی گئی تھی۔ یہ اشتہار پڑھ کے میں سوچ میں پڑ گیا۔ بینک میں تو میرا بھی اکاؤنٹ تھا۔ کیا لوگ اس میں پیسہ جمع نہیں کرائیں گے' اگر ایسا ہی کوئی اشتہار میں دوں۔

میں نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ اشتہار دینے میں صرف دو ڈھائی سو روپے کا خرچہ ہے۔ بہت سوچ کے میں نے ایک مضمون بنایا بلکہ بنوایا۔ ایک کالج کے لڑکے نے میری مدد کی۔ اشتہار میں ایک لاوارث یتیم طالب علم کے لیے قرضِ حسنہ کی اپیل تھی جو ناداری

کے سبب اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہے۔ اشتہار چھپوانے کے لیے بھی مجھے ایک ڈراما کرنا پڑا کیونکہ میں خود سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے مجھ سے پیسے لیے اور اشتہار چھپوا دیا۔ میں نے کہا کہ اخبار والے کسی بچے کے کہنے سے اشتہار نہیں چھاپیں گے وہ تو شناختی کارڈ بھی مانگتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے اس چکر میں پڑنے سے انکار کردیا مگر بالآخر مجھے ایک سادہ لوح بوڑھا مل گیا۔

میں نے اپنی طرف سے ایک جُوا کھیلا تھا۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس قسم کی جذباتی اپیل کا لوگوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ یتیم خانے میں تعمیرِ مسجد کا چندہ دینے میں لوگ اب بخل سے کام لینے لگے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ بہت سے غلط لوگ کارِ خیر کے نام پر فراڈ کررہے ہیں۔ کوئی بھی کسی کا نام لیتے ہوئے ڈرتا تھا مگر حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا۔

اشتہار کا ردِّعمل حیرت انگیز تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ اپنے دلوں میں نیکی اور ہمدردی کے کتنے جذبات رکھتے ہیں۔ وہ کارِ خیر کے لیے کچھ نہ کچھ دینا چاہتے ہیں۔ مستحق کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر پیشہ ور مانگنے والوں نے ان کے اعتماد کو ختم کردیا ہے۔ پندرہ دن میں تقریباً چالیس ہزار روپے جمع ہوئے اور یہ رقم ہر طرح سے موصول ہوئی۔ نقد اور چیک کی صورت میں۔ ایک عورت نے اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں بیچ دیں کہ یہ سونا بیچ کے رقم بینک میں ڈال دی جائے۔ بہت سے لوگوں نے تصدیق چاہی تو بینک والوں نے یہی کہا کہ ہاں' اکاؤنٹ ایک یتیم لاوارث بچے کا ہے۔ مگر وہ حیران تھے کہ اچانک سارا شہر اس یتیم لاوارث بچے کی مدد کے لیے کیوں ٹوٹ پڑا ہے۔

حقیقت زیادہ عرصے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ دوسرے دن ہی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ اشتہار کا ردِّعمل ہے۔ اشتہار کس نے دیا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا مگر امدادی رقوم لینے سے انکار بھی کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ زیادہ تر کراس چیک تھے جو واپس نہیں ہوسکتے تھے۔ نقد رقم جمع کرانے والے آئے اور پیسے دے کر چلے گئے۔

دو ہفتے بعد میری ملاقات مسیح صاحب سے ہوئی تو وہ سخت غصے میں تھے "یہ حرکت تمہاری تھی؟" انہوں نے اخبار میرے سامنے پٹخ دیا۔

میں نے کہا "کون سی حرکت... کیا ہے اخبار میں؟"

"پڑھو یہ اشتہار" انہوں نے گرج کے کہا "کس کا اکاؤنٹ نمبر ہے یہ؟"

میں نے کہا "اکاؤنٹ نمبر تو میرا ہے مگر اشتہار میں نے نہیں دیا؟"

"جھوٹ بکتے ہو تم" وہ دہاڑ کر بولے "یہ صریح دھوکا ہے۔ فراڈ ہے۔ تمہیں نہ تعلیم کے لیے رقم چاہیے نہ تم محتاج ہو کسی کے... لیکن اس طرح چالیس ہزار آگئے تمہارے اکاؤنٹ میں۔ تمہارا کچھ نہیں گیا' بدنامی میرے حصے میں آئی۔"

میں نے کہا "میں قسم کھا سکتا ہوں انکل' اشتہار میں نے نہیں دیا' آپ معلوم کرسکتے ہیں۔"

"کیا معلوم کروں میں' اور کسی کو کیا ضرورت تھی اشتہار دینے کی؟ کیوں تمہارے حساب میں پیسہ جمع کرائے گا کوئی۔ یہ دلچسپی صرف میری تھی۔ میں نے ہر ایک سے کہا کہ اس لڑکے کی مدد کرو' صدقہ فطرہ سب اسی کو دو۔ یہ مستحق ہے' محنت مزدوری کرکے ایک ایک پیسہ جوڑ رہا ہے اپنے مستقبل کے لیے۔ اس نے کبھی ایک روپیہ واپس نہیں لیا۔ سب سمجھتے ہوں گے کہ یہ حرکت بھی میں نے ہی کی ہوگی۔ توبہ توبہ' میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔"

میں نے کہا "انکل' آپ کو قسم پر بھی اعتبار نہیں؟"

انہوں نے میری ایک نہیں سنی "وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میری عزت کی بنیادیں اتنی کچی نہیں ہیں۔ میری دیانت داری شبے سے بالاتر ہے۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ مجھے بے وقوف بنایا گیا ہے۔ میں واقعی بے وقوف تھا۔ اب میں نے معلوم کیا ہے تو مجھے پتا چلا ہے کہ تم کیا چیز ہو۔"

میں نے کہا "پھر اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس ذمے داری سے سبکدوش کرو۔ میں باز آیا تمہاری سرپرستی سے' کسی اور کو بناؤ۔"

یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے اس لیڈی ڈاکٹر سے کہا جس کے دو بچوں کو میں ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا اور میرا اپنا بینک اکاؤنٹ کھل گیا۔ میں نے ساری رقم اس نئے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنے کی درخواست دی جس پر مسیح صاحب نے دستخط کیے اور مجھ سے کہہ دیا کہ آئندہ وہ میری صورت کبھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ میں نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا۔ ان کی صورت دیکھنے کا مجھے بھی کوئی شوق نہیں تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نیکی میرے بہت کام آئی۔

پھر اچانک وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ ناصر عظیم ایک دن اچانک غائب ہوگیا۔ وہ میرے ساتھ ہی چندہ جمع کرنے گیا تھا مگر جب میں واپس آیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ میں نے ایک گھنٹے تک اس کا انتظار کیا اور پھر لوٹ آیا۔

مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کی گمشدگی کا ردِّعمل کتنا شدید ہوگا۔ سب سے پہلے صوفی نے ہنگامہ کیا "کھوگیا... کیسے کھوگیا؟ ابے تو صاف کیوں نہیں کہتا کہ تو نے اسے بھگا دیا۔ تو پہلے دن سے اس کا سگا بنا ہوا تھا۔ اس کا اور تیرا نام ایک تھا اس لیے تو اس کا باپ بن گیا تھا۔ سچ بتا وہ کہاں ہے' نہیں تو میں تیری کھال کے جوتے بنا کے تیرے سر پر ماروں گا... اور اتنے ماروں گا... کہ تیری—"

مفاقات کے ساتھ ہی اس نے مولا بخش کی گھروالی کا بے دریغ استعمال شروع کردیا تھا۔ یہ میرے لیے انتہائی غیر متوقع اور باعثِ ذلت تھا۔ میں نے مخبری کرکے' لڑکوں کی باتیں بتا کے ان کی شکایتیں کرکے' ان کے راز فاش کرکے اتنی عزت پائی تھی کہ معتبر ہوگیا تھا اور خصوصی مراعات کا مستحق سمجھا جانے لگا تھا۔ میری وجہ سے یتیم خانے کی آمدنی میں اضافہ ہوا تھا۔ باغیانہ خیالات رکھنے والوں کی سرکوبی ہوئی تھی اور شریفانہ عناصر کی نشاندہی۔ میں نے خفیہ رقوم برآمد کرائی تھیں اور چھاپے پڑوائے تھے۔ لڑکوں کو مجھ پر بھروسا تھا' وہ ہر بات مجھے بتا دیتے تھے۔ انہیں کبھی شک نہیں ہوا تھا کہ درپردہ میں ہی ان کا دشمن ہوں۔

صوفی سے مار کھا کے مجھے اپنی اوقات معلوم ہوگئی۔ یتیم خانہ میرے لیے ایک ایسی جگہ تھی جہاں میں آرام سے رہتا تھا اور مجھے لیڈری ملی ہوئی تھی۔ میں نہ محتاج تھا اور نہ مجبور۔ اگر میں صوفی کو بتا دیتا کہ میرے پاس بینک میں کتنا پیسہ ہے تو وہ کہتا کہ میں پاگل ہوگیا ہوں یا پھر صدمے سے بے ہوش ہوجاتا۔ اس وقت اچانک میرے وجود میں بغاوت کی ایک لہر اٹھی۔ یہ طاقت مجھے اپنی ذات پر اعتماد سے حاصل ہوئی تھی۔ میں نے اچانک صوفی کا ہاتھ پکڑلیا۔ اس سے بید چھینا اور گھٹنے پر مار کے دو ٹکڑے کردیا۔

معمولی سرکشی کی سزا کے مستحق بنگالی وارڈ بھیج دیے جاتے تھے مگر میں نے تو اعلانِ جنگ کردیا تھا "کانے دجال۔ وہ اپنی مرضی سے گیا ہے' میں قسم کھا کے بتا رہا ہوں اور تجھے اعتبار نہیں' تو جہنم میں جا مردود۔ اب میں بھی یہاں نہیں رہوں گا... ظالم' جلاد' تو دوزخی ہے۔ شیطان کا چیلا ہے۔"

میں نے دھاڑیں مار مار کے روتے ہوئے صوفی پر حملہ کردیا تھا۔ اس نے دوسرے لڑکوں کو حکم دیا کہ مجھے ہر طرف سے گھیر کر ماریں' لڑکوں میں حکم عدولی کی جرأت نہ تھی۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے رسیوں میں جکڑ کے تھانے دار کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس ایک رات میں مجھے پتا چل گیا کہ پکا تھانے دار کیا ہوتا ہے۔

تین دن تک میں فرش پر پڑا رہا اور میرے زخموں پر مکھیاں بھنکتی رہیں۔ لڑکے مجھ سے دور دور رہے۔ کسی میں مجھ سے ہمدردی یا غم گساری کا حوصلہ نہ تھا۔ مجھ سے بہت سے معافی نامے لکھوائے گئے تھے اور حلف اٹھوائے گئے تھے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں زندہ تھا۔ تھانے دار نے تو پورا بندوبست کردیا تھا کہ مجھے مار کے پچھلی دیوار کے ساتھ گاڑ دیا جائے۔ شاید اس نے مجھے ڈرانے کے لیے یہ ڈراما کیا ہو مگر اس نے صوفی سے کہا تھا کہ دو قبر کھود جو گڑھا کھودیں صبح ہونے سے پہلے۔ پھر خود صوفی نے میری سفارش کی۔ میرے سابقہ رویے کی بنا پر جاں بخشی کی سفارش کی۔ یہ کہا کہ شاید مجھے کسی نے کچھ کھلا دیا تھا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا کہ میں نے ایسی باتیں کہہ دیں۔

میں نے فیصلہ تو کرلیا تھا کہ اب میں یتیم خانے میں نہیں رہوں گا۔ یہی نہیں' میں باہر جا کے یتیم خانے کے صوفی' بنگالی اور تھانے دار' سب کا خانہ خراب کروں گا۔ میں اخبار والوں کو بتاؤں گا کہ یہاں یتیم بچوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔ ان سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔ چندہ اکٹھا کرنے کو کہا جاتا ہے اور یہ سب رقم یتیم خانے کا مالک اور اس کا سالا کھا جاتے ہیں۔ پچھلے آٹھ نو سال میں جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ سب بتاؤں گا' پھر پتا چلے گا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا' مجھے ثبوت حاصل کرنے تھے' یہ معلوم کرنا تھا کہ یتیم خانے کو حکومت کی طرف سے کتنی امداد ملتی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ مالک بڑے بڑے لوگوں سے عطیات وصول کرتا ہے۔ ہر سال لاکھوں روپے جو مختلف اداروں سے ملتے ہیں سب اس کی جیب میں جاتے ہیں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں یہ ثبوت اور معلومات کیسے حاصل کروں گا۔ بچہ ہونے کے باوجود میرا شعور اس حد تک پختہ تھا کہ مجھے اپنی مشکلات کا بخوبی علم تھا۔ میں جانتا تھا کہ چندے کی رسید بُک پر رقم خود بچے لکھتے تھے اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ انہوں نے یہ رقم یتیم خانے والوں کو دی۔ شاید بعد میں وہ رسید بُکس بھی غائب کردی جاتی ہوں گی۔ ہر مہینے چندے کے لیے نئی رسید بُک دینے کا اور کیا مطلب ہوسکتا تھا۔ پچھلی رسید بُک آدھی باقی ہو یا ایک تہائی' واپس لے لی جاتی تھی۔ بچے رسید دیتے وقت صرف اس حصے پر تاریخ ڈالتے تھے جو چندہ دینے والے کو دیا جاتا تھا۔ اس پر نام کے ساتھ پورا پتا بھی لکھا جاتا تھا۔ جو حصہ باقی رہ جاتا تھا اس پر صرف نام ہوتا تھا اور تاریخ نہیں ہوتی تھی۔ وہ یقیناً آمدنی بہت کم اور خرچ بہت زیادہ دکھاتے ہوں گے۔ یہ کیسے ثابت ہوگا کہ بچے فقیروں کو کرائے پر اور ٹھیکے پر دیے جاتے تھے اور اس طرح یتیم خانے والوں کو کتنی آمدنی ہوتی تھی۔ ان کا تعلق جن فقیروں سے تھا وہ صاف انکار کردیں گے۔ فقیروں کے ٹھیکے دار بدمعاش ہیں اور پولیس کو بھتا دیتے ہیں۔ بچے ان کے خلاف کیسے زبان کھولیں گے۔

یہ سب سوچ سوچ کے میں مایوسی کا شکار ہونے لگتا تھا۔ اگر میں تحقیقات شروع کرتا تو فوراً انتظامیہ کو خبر ہوجاتی اور میری زندگی پھر خطرے میں پڑجاتی۔ یہ بہت طاقتور اور ظالم لوگ تھے۔ ان سے ٹکر لینا یا ان کے خلاف کچھ ثابت کرنا میرے جیسے بچے کے لیے ناممکن تھا۔ نہ پولیس ان کے خلاف انکوائری کرے گی اور نہ میری رپورٹ درج ہوگی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ الٹا مجھے چوری یا بدکاری کے الزام میں گرفتار کرا دیا جائے حالانکہ چور وہ سب تھے اور میرے علم میں وہ واقعات بھی تھے جہاں بچے کے ساتھ سزا کے طور پر بدفعلی کی گئی تھی۔

میں نے کسی نتیجے پر پہنچے بغیر یتیم خانہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اگر مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا تو میں باہر جا کے سوچوں گا اور دیکھوں گا کہ میں کیا کرسکتا ہوں اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ میں کسی صورت

aazzamm@yahoo.com

اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ تین دن بعد میری حالت کچھ سنبھلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میری سابقہ پوزیشن بحال نہیں ہو سکتی۔ نہ میں آزادانہ طور پر کہیں آ جا سکتا ہوں اور نہ کسی سے رابطہ رکھ سکتا ہوں۔ عملاً اب میں ایک قیدی تھا۔ مجھے فکر تھی کہ مجھ سے ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کا کیا ہو گا۔ میں نے پہلے کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔ تین دن کی تو کوئی بات نہیں' میں بیماری کا بہانہ کر سکتا ہوں مگر ایک ہفتے تک میں غائب رہا تو وہ دوسرا ٹیوٹر بھی رکھ سکتے ہیں۔

اُس رات ناصر لوٹ آیا۔ وہ میرے پاس آیا تو بہت خوش تھا مگر اسے دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

اس نے میرا حال پوچھا تو میں نے اس کے جھانپڑ مارا "کمینے۔ احسان فراموش' میرا حال پوچھتے ہو' نظر نہیں آتا تمہیں؟"

اس نے قمیص ہٹا کے آگے پیچھے سے میری حالت دیکھی تو رونے لگا "یہ کیا ہوا ۔۔۔ اور کیسے ہوا؟"

میں نے کہا "یہ تمہاری وجہ سے ہوا۔ وہ تو مجھے مار کے گاڑ رہے تھے مگر خدا نے مجھے بچا لیا۔ تمہاری ذمے داری میں نے لی تھی۔"

"غصہ مت کرو ناصر بھائی۔ میں بتاتا ہوں۔"

میں نے اس کے ایک اور تھپڑ رسید کیا "اب کیا بتاؤ گے تم ذلیل کتے' تم نے مجھے دھوکا دیا ہے' مجھے تمہارے ساتھ نیکی کا کیا صلہ ملا؟"

وہ روتا رہا "ناصر بھائی۔۔۔"

میں نے اسے اور مارا "خبردار جو مجھے بھائی کہا' حرامی پلے۔"

اس نے کہا "تم جتنی گالیاں چاہے دے لو۔ مگر میری بات بھی سن لو' میں نے اپنے چچا کا پتا چلا لیا ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا چچا۔"

"اس دن جب تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ تو وہ اچانک مجھے نظر آگیا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اسی شہر میں ہے۔ میں نے اس کا گھر بھی دیکھ لیا ہے۔ مجھے معاف کر دو ناصر بھائی۔"

میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا بیٹا۔ اب تو میں خود بھی باہر نہیں جا سکتا۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے' میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔"

"تم نے کہا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے۔"

نہ جانے کیوں مجھے اس کی صورت دیکھ کے رحم آگیا۔ اس کے خلاف میرے دل میں جتنا غصہ تھا وہ اسی طرح کم ہونے لگا تھا جیسے دھواں فضا میں تحلیل ہوتا ہے۔ "ٹھیک ہے۔ تو جیسے آیا تھا ویسے ہی نکل جا۔ ابھی کسی کو تیرے آنے کا پتا نہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب کے گھر جا سکتا ہے نا؟"

وہ تذبذب میں پڑ گیا "مجھے پتا سمجھا دو۔۔۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "یہ بتا۔ تُو نے تین راتیں کہاں گزاریں؟"

اس نے کہا "مجھے چچا نے پکڑ لیا تھا۔ اس نے مجھے اپنا پیچھا کرتے دیکھ لیا تھا۔"

"بے وقوف۔ اتنا نزدیک جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بولا "مگر تو میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اندر چلا گیا تو میں نے سوچا کہ نمبر نوٹ کر لوں۔ میں دروازے کے سامنے سے گزرا تو وہ ایک دم باہر نکلا اور اس نے مجھے اندر گھسیٹ لیا۔"

"پھر۔۔۔ اس نے بہت مارا ہو گا تجھے؟"

"ہاں۔ وہ سمجھ گیا کہ میں یتیم خانے سے بھاگ آیا ہوں۔ اس نے مجھے ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی اس کے پرانے گھر پہنچا تھا اور اس وکیل سے ملا تھا جس نے میرا مکان خریدا ہے۔ وکیل نے بتایا کہ اس لڑکے کا نام ناصر عظیم ہے' وہ خود کو کسی وکیل عبدالرشید کا بیٹا بتاتا تھا مگر وکیل عبدالرشید کی کوئی پہلی بیوی نہیں۔ اس کی تو شادی ہی ابھی تین چار سال پہلے ہوئی ہے۔ میرا چچا سمجھ گیا کہ یتیم خانے سے فرار ہو کے میں کہیں اور چلا گیا ہوں۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ اس نے خود ہی پوچھا کہ کیا تم کسی وکیل سے یا اخبار والے سے ملے ہو اور میں نے کہہ دیا کہ ہاں' وہ گھبرا گیا اور اس کی بیوی نے مجھ سے ایسی باتیں شروع کر دیں کہ تم تو ہمارے اپنے ہو۔ وہ گھر نہ سہی' یہ بھی تمہارا گھر ہے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے تمہارے ماں باپ کی بدنامی ہو گی۔ چلو تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمہیں اسکول میں داخل کرا دیں گے' آخر تم ہمارے بچوں کی طرح ہو۔ اس کی یہ باتیں بڑی عجیب تھیں کیونکہ چچا سے زیادہ وہ میری دشمن تھی اور اس کی زبان۔۔۔ خدا کی پناہ! وہ گالی دیے بغیر مجھ سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔ اس کے رویے نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا۔ رات کو انہوں نے مجھے سونے کے لیے بستر دیا اور کھانا بھی۔ میں نے سب کے ساتھ کھایا۔ پھر میں نے ظاہر کیا کہ میں سو گیا ہوں اور وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ چچا نے مجھے بھی ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہارا اندازہ ٹھیک تھا۔۔۔ میری ماں کو بھی۔۔۔"

"قتل کیا گیا تھا" میں نے اس کی خاموشی دیکھ کے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور پھر رونے لگا۔ وہ حد درجے حساس اور جذباتی طور پر کمزور لڑکا تھا۔ "میں نے خود سنا' چچی کہہ رہی تھی کہ اسے تو تم نے وہیں گاڑ دیا تھا۔ اس کا کیا کرو گے؟" چچا نے گھبرا کے کہا "پاگل کی بچی' آہستہ بول۔ کہیں تیرا باپ جاگ نہ رہا ہو" چچی نے کہا "میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے پتا ہے وہ کب کا سو گیا" چچا نے کہا "اس کا بھی کچھ سوچیں گے" چچی بولی "یہاں تو پکا فرش ہے۔ اسے خراب مت کرنا" چچا نے کہا "او بابا' یہ عورتوں کے سوچنے کی بات نہیں ہے' جو کرنا ہو گا میں کر لوں گا۔ ہر بار ایک ہی طریقہ ضروری نہیں۔ ہزاروں طریقے ہیں اس سے چھٹکارا پانے کے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کسی کو شک نہیں ہوا اور ہم وہاں سے نکل آئے" چچی نے کہا "مجھے تو صحن میں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اُس منحوس مکان میں نہیں رہ سکتی تھی میں۔ لیکن اب اس فتنے کا کچھ کرو" چچا بولا "ہو جائے گا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ یہ وہاں سے نکلا کیسے؟ ضرور کسی نے نکالا ہو گا اسے۔ اب تو ہمارا اس شہر میں رہنا بھی ٹھیک نہیں" چچی بولی "تم سب کو اتنا بے وقوف کیوں سمجھتے ہو آخر۔ پہلے ہی نکل جاتے ہم تو اچھا تھا۔ تم نے کہا کہ اس شہر میں کون تلاش کرے گا ہمیں" چچا بولا "بس غلطی ہو گئی۔ میں نے مشہور تو کر دیا تھا کہ لاہور جا رہا ہوں۔ مگر اب لگتا ہے سچ مچ جانا پڑے گا" چچی بولی "میری مانو تو اسے بھی ساتھ لے چلو۔ وہیں کرنا جو بھی کرنا ہے" اور چچا نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"آج کی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی" وہ بولا "بچے جلدی سو جاتے ہیں' چچا اور چچی بھی عشا کی نماز کے بعد سو جاتے ہیں۔ کھانا وہ مغرب کے بعد کھا لیتے ہیں ناصر بھائی' کیا ان کی نماز قبول ہو گی؟"

میں نے کہا "خدا کی باتیں' خدا ہی جانے۔"

اچانک یک چشم صوفی نمودار ہوا "وہ حرام کا نطفہ آیا ہے یہاں" اس نے خون آشام لہجے میں کہا اور میری طرف بڑھا۔

ناصر نے میرے ساتھ چادر کے نیچے پناہ لینے کی کوشش کی مگر وہ چھپ کیسے سکتا تھا۔ صوفی نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور کھڑا کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ناصر کانپ رہا ہے۔ کمرے میں سونے والے کچھ لڑکے جاگ اٹھے تھے اور پُرخوف تجسس کے ساتھ اس منظر کا ڈرامائی کلائمیکس دیکھنے کے منتظر تھے۔

"کہاں گیا تھا۔۔۔ اور گیا تھا تو لوٹ کے کیوں آیا۔۔۔؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے معاف کر دیں مولوی صاحب!" ناصر منمنایا۔

صوفی نے اسے مزید گالیاں دیں "معاف کر دوں۔۔۔ تیرے جیسے ک۔۔۔ کو۔ ابھی تو تجھے بلایا ہے تھانے دار صاحب نے' پہلے وہ معاف کر دیں۔"

تھانے دار کے نام پر میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے سوچا کہ اسے بچانے کے لیے کچھ کہوں مگر اب میری وہ پہلے جیسی حیثیت نہیں رہی تھی۔ میں اس کی سفارش کرتا تو شاید اس کے ساتھ میری بھی پیشی ہو جاتی اور تھانے دار کے ساتھ دوسری رات گزارنے کا تصور ہی اتنا لرزہ خیز تھا کہ میری ہمت جواب دے گئی۔ میں نے بزدلوں کی طرح اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا اور اپنے کان بند کر لیے۔ وہ معافی مانگتا رہا' فریاد کرتا رہا۔ مجھے آوازیں دیتا رہا اور چلاتا رہا مگر صوفی اسے گھسیٹ کر لے گیا۔

میں جاگتا رہا اور چہرے پر تنی میلی داغ دار چادر کو گھورتا رہا۔ میرے کانوں میں خاموشی کے باوجود چیخوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ یہ ناصر کی آواز تھی۔ وہ بُری طرح چلا رہا تھا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ کپڑا میرے منہ میں بھی حلق تک ٹھونس دیا گیا تھا۔ اس کو کپڑے اتار کے چھت سے الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ جیسے قصاب کی دکان پر ذبح کیے ہوئے اور کھال اُترے ہوئے بکرے لٹکے نظر آتے ہیں۔ اس کے بدن کی نازک جلد پر بید پڑ رہے تھے۔

اس کام کے لیے خاص طور پر بنگالی کو طلب کیا گیا تھا۔ وہ اذیت پسندی کا ذہنی مریض تھا اور تشدد کے حیا سوز طریقے استعمال کر کے اسے بڑی راحت ملتی تھی۔ چشم تصور سے میں دیکھ سکتا تھا کہ ناصر کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بنگالی اس کو سُرمہ لگا رہا ہے۔ اس کو پھڑکتا دیکھ کے خوش ہو رہا ہے۔ وہ اس کے جسم کو جلتے سگریٹوں سے داغ رہا ہے اور پھر اس کے زخموں پر نمک ملا پانی ڈال رہا ہے۔ اسے طاقت کا خاص انجکشن لگا رہا ہے۔

کچھ لڑکے ابھی تک جاگ رہے تھے اور آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ میں وہی باتیں سوچ رہا تھا کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ صرف میں جاگتا رہا اور ایک بھیانک رات کے سفاک اندھیرے میں امید کی روشنی کے لیے بھٹکتا رہا۔ آخر ایسا کب تک ہو گا۔ میں نے کیا جرم کیا تھا یا مجھے پیدا کرنے والوں نے کیا گناہ کیا تھا جس کی سزا یہ زندگی ہے۔ کہتے ہیں بعض اوقات ماں باپ کے اعمال کی سزا اولاد کو بھگتنی پڑتی ہے مگر یہ سزا دینے کا اختیار قانون کو ہے یا خدا کو۔

میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا اور میرے اندر کا وہ پاگل کتا پھر غرا رہا تھا جو مار کھا کے دبک گیا تھا۔ میرے لیے وہ رات بھاری ہو گئی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ابھی صرف ایک گھنٹا گزرا تھا مگر مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے پوری رات گزر گئی۔ بالآخر میں چادر پھینک کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے خالی جگہ پر اپنا تکیہ لمبائی کے رخ رکھا۔ پردے کی طرف جوتے اس طرح رکھے کہ پاؤں نظر آئیں اور چادر کو دونوں طرف سے دبا دیا۔ اب ایک نظر میں یہی لگتا تھا کہ کوئی کمر کے بل سیدھا سو رہا ہے۔

راستے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت دیکھنے والا بھی کوئی نہیں مگر خوف مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں اندھیرے کی پناہ میں رہوں۔ میں ایک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا تھانے دار کے کوارٹر کی طرف بڑھا۔ ابھی رات کے گیارہ بجے تھے۔ مالک کی کوٹھی میں روشنی تھی۔ تھانے دار کے گھر میں بھی لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ کان لگا کے کچھ سننے کی کوشش کی مگر اندر سے کوئی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ دیوار پر چڑھ کے اندر اُتر جاؤں اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس کمرے تک پہنچ جاؤں جو تھانے دار کا آفس تھا اور جہاں ملزم تفتیش کے لیے پیش ہوتے تھے مگر یہ انتہائی خطرناک کام تھا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو میرا انجام ناصر سے زیادہ عبرت ناک ہوتا۔ خوف سے میرے جسم پر ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا پیشاب خطا ہونے والا ہے۔ میرے پیٹ میں مروڑ سے اٹھ رہے تھے۔ اپنی حالت پر مجھے شرم آئی۔ میں تو اپنے آپ کو بہت چالاک اور بہادر سمجھتا تھا لیکن میں انتہائی خودغرض اور بُزدل ہوں۔ میری ساری ہوشیاری صرف اپنے مفاد میں تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ کسی اور کے لیے کچھ کر سکوں۔ اگر کسی پر ظلم ہوتا دیکھوں تو اسے ظلم کہنا بھی میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے

aazzamm@yahoo.com

اس لڑکے کو چھوٹا بھائی کہا تھا۔ اس کے تحفظ کی ذمے داری قبول کی تھی مگر میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس دیوار کی دوسری طرف اس کے ساتھ وہ سلوک ہو رہا ہے کہ اس کی ماں زندہ ہوتی اور دیکھتی تو غم سے اس کا کلیجا پھٹ جاتا۔ وہ اپنے ہی گھر کے آنگن میں دفن ہے۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا ہے۔ مڑا تڑا اور بدوضع۔ لیکن اس کی روح اس وقت کتنی بے چین ہوگی۔

میں دیوار سے دور کھڑا ہو کے اور دیوار پر سر رکھ کے رونے لگا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے ہاتھ خالی ہیں اور میرے مقابل کانا دجال ہے' بنگالی جلاد ہے اور سفاک تھانے دار ہے۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے زیادہ طاقتور ہیں لیکن ان کی اصل طاقت ان کی بدمعاشی ہے۔ ایک پہلوان بھی بہت طاقتور ہوتا ہے مگر وہ کسی پر ظلم ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اکھاڑے میں اپنے حریف کو داؤ پیچ سے چت کر سکتا ہے مگر کسی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ تشدد نہیں کر سکتا اور کسی کی جان نہیں لے سکتا کیونکہ وہ بدمعاش نہیں ہوتا۔ بدمعاش کی طاقت اس کے جسم کی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ ایک شیطانی طاقت ہوتی ہے جس کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ نیت سے اور خیال سے ہوتا ہے۔

میں جیسے گیا تھا ویسے ہی لوٹ آیا۔ اپنے آپ سے شرمندہ اور شکست خوردگی کے احساس سے رنجیدہ۔ اپنی بے بسی پر اندر ہی اندر کرب سے ٹوٹتا ہوا اور اپنے غصے کی آگ میں خود ہی جلتا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت کہیں سے میرے ہاتھ میں کلاشنکوف آجائے' میں دیوار پھاند کے تھانے دار کے گھر میں گھس جاؤں اور سب کو بھون کے رکھ دوں۔ ان کی لاشیں وہیں پڑی رہ جائیں اور میں ناصر کے ساتھ نکل جاؤں۔ میں نے سنا تھا کہ کلاشنکوف کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ کہاں سے ملتی ہے یہ کلاشنکوف۔ اور کتنے کی ملتی ہے۔ کیا وہ سب رقم جو میرے پاس محفوظ ہے ایک کلاشنکوف خریدنے کے لیے کافی ہوگی۔ پھر میں ان سب کو چن چن کے مار ڈالوں گا۔ ناصر کے چچا کو بھی اور اس کی خبیث روح رکھنے والی بچی کو بھی۔

آہستہ آہستہ صبح کا سوگوار اُجالا پھیلنے لگا۔ گھڑی کی سُوئیاں رینگتے رینگتے ساڑھے پانچ تک پہنچ گئیں۔ ناصر لوٹ کے نہیں آیا۔ یک چشم صوفی کا منحوس سایہ فرشتۂ اجل کی طرح نمودار ہوا۔ اس نے ہر روز کی طرح چلّا کے سب کو مخاطب کیا۔ "اٹھو جاؤ' حرام کے جنو۔ روز مُردوں کی طرح پڑے رہتے ہو مردودو۔ ہر روز اٹھانا پڑتا ہے مجھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ میں تمہارے باپ کا ملازم ہوں۔۔۔" اس نے عادت کے مطابق گالیاں دے دے کر اور لاتیں' ٹھڈے مار مار کے لڑکوں کو اٹھانا شروع کیا۔

لڑکے معمول کے مطابق اٹھے' ان کے دن کا آغاز ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہ اس سلوک کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ اٹھ کے اپنے بستر سمیٹنے لگے اور لیٹرین جانے کے لیے اور وضو کرنے کے لیے دھکم پیل کرنے لگے۔ میں نے ساری رات سخت کرب میں جاگ کے گزاری تھی۔ اب میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔

صوفی سید ھا میری طرف آیا "تُو اینڈ رہا ہے ابھی تک۔۔"

میں نے گالی کو نظر انداز کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا "مولوی صاحب۔۔۔ وہ لڑکا ناصر کہاں ہے' جسے آپ لے گئے تھے؟"

"میں۔۔۔ میں لے گیا تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔" وہ پہلے چونکا تھا مگر پھر اس نے خود کو سنبھال لیا "وہ واپس چلا گیا۔"

"کہاں واپس چلا گیا؟" میں نے کہا اور خود کو یہ سوال کرنے سے باز رکھا کہ وہیں جہاں ہم سب کو لوٹ کے جانا ہے؟

"اس کا چچا لے گیا اسے" مولوی نے بدحواسی یا بے خیالی میں کہہ دیا۔

میں پوچھ سکتا تھا کہ اچھا؟ اس کا کوئی چچا بھی تھا؟ کہاں رہتا تھا وہ چچا؟ یہ وہی چچا تو نہیں جو اسے عبدالوحید قریشی مرحوم کا بیٹا ثابت کر کے چراغ دین دھوبی کے نام سے یتیم خانے میں داخل کرانے آیا تھا؟ جس نے اس کی ماں کو قتل کر کے اسی گھر کے صحن میں گاڑ دیا تھا جس کی وہ مالکن تھی؟ جو مکان دکان سب بیچ کے لاہور چلا گیا تھا؟

مگر مجھ میں اتنی عقل تھی اور مجھے اپنے آپ پر اتنا کنٹرول تھا کہ میں ان تمام سرکش سوالات کی یلغار کو روک دوں۔ انہیں سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کر دوں کہ ٹھہرو' صبر سے کام لو' سب کو جواب ملے گا مگر وقت آنے پر۔ ابھی ہنگامہ آرائی سے کچھ حاصل نہیں۔ میں نے اپنی صورت سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اپنے ردِ عمل پر قابو پالیا اور اپنے جذبات کو عقل کی کمان میں دے دیا۔

صوفی نے خود ہی وضاحت کی "دراصل اس کا کوئی دور کا عزیز تھا جو خود کو چچا کہتا تھا۔ وہی داخل کرانے آیا۔ وہ خود ہی لے گیا' لیکن تجھے کیا؟"

میں نے کہا "مجھے کیا' میرا تو اس سے ہمدردی کرنا ہی جرم بن گیا۔ میں نے اپنا اعتبار کھو دیا۔ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

صوفی نے کہا "چل سب ٹھیک ہو جائے گا' غلطی بندے سے ہی ہوتی ہے۔"

دوسرے دن میں نے ناصر کی تصویر دیکھی۔ وہ زندہ ناصر کی تصویر نہیں تھی۔ اس کی لاش کی تصویر تھی۔ اگر یتیم خانے والوں کو معلوم ہوتا کہ تصویر کے ساتھ خبر میں بھی ناصر کا نام ہوگا تو شاید وہ اس دن اخبار ہم تک پہنچنے ہی نہ دیتے۔ یہ شام کا اخبار تھا جو صوفی ایک دکان دار سے منگوا لیتا تھا۔ بعض اوقات اسے خیال نہیں آتا تھا یا فرصت نہیں ملتی تھی۔ اخبار لڑکے دیکھتے رہتے تھے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے اخبار کے اندر والے صفحے پر مسخ شدہ لاش کی تصویر دیکھ لی۔ تصویر بہت صاف تھی لیکن ناصر کا چہرہ بالکل صاف نہیں پہچانا جاتا تھا۔ خبر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ کسی نامعلوم گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہونے والے لڑکے کی لاش سرکاری اسپتال میں رکھی ہوئی ہے۔ ابھی تک لاش کی شناخت نہیں

ہو سکی۔ پولیس کو ورثا کی تلاش ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس کی لاش کچلی ہوئی تھی۔ یقیناً اس پر سے کوئی کار یا بھاری گاڑی گزری تھی مگر اس کا چہرہ بچ گیا تھا۔ گاڑی کا پہیہ اگر چہرے پر سے گزرتا تو کچھ بھی شناخت کے لیے نہ بچتا۔ اس کا چہرہ زخمی اور سوجا ہوا ضرور تھا مگر کچلا ہوا نہیں تھا۔

جب میں نے وہ تصویر دیکھی تو مجھے ایسا لگا جیسے آگ میں دہکائی ہوئی چھری میرے دل کو کاٹتی ہوئی گزر گئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنا وجود تاریکی میں تیرتا محسوس ہوا مگر درد کا مد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ میں نے سب کی نظر بچا کے اخبار کو تہ کیا اور قمیص کے اندر چھپا لیا۔ سینے کے اندر میرا سانس گھٹ رہا تھا اور مجھے ایسے خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی جو مجھے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھے۔ اب مجھے کلاشنکوف خریدنی چاہیے۔ مجھے کسی پیٹرول پمپ سے پٹرول حاصل کر کے یہاں وہاں ہر جگہ آگ لگا دینی چاہیے۔ اگر ایک بل ڈوزر ہو تو اس عمارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کچھ مٹا دوں۔ نابود کر دوں۔ ناصر کے چچا کا گھر بھی نیست و نابود کر دوں۔ یہ سب لوگ اپنے محفوظ گھروں میں ہی دفن ہو جائیں۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے کم سے کم پاگل تو ضرور ہو جانا چاہیے۔ میں کپڑے اتار کے سڑک پر دوڑتے ہوئے چلا سکتا ہوں۔ ناصر مر گیا۔ ناصر عظیم مر گیا' ناصر عظیم کو قتل کر دیا گیا۔ مجھے قتل کر دیا گیا۔ آج کی تازہ خبر۔

لیکن کچھ دیر بے چینی سے اِدھر اُدھر چکر لگانے کے بعد میں خاموشی سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ چوکیدار نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے کہا کہ میں صوفی کے لیے پان لینے جا رہا ہوں۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ صوفی کے لیے میں ایک کلومیٹر دور سے "بھائی جان کا پان" لاتا تھا۔ یہ پان کی مشہور دکان تھی جہاں ایک روپے سے پانچ روپے تک کا پان ملتا تھا اور شوقین یہاں بڑی بڑی دور سے پان کھانے آتے تھے۔ صوفی کو اسپیشل نوبہار میٹھا پان پسند تھا جو دو روپے کا ملتا تھا۔

میں سیدھا سرکاری اسپتال گیا۔ میں نے اخبار نکال کے تصویر کئی لوگوں کو دکھائی مگر وہ سب بہت مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اُدھر چلے جاؤ' فلاں سے بات کرو' تمہارا کیا رشتہ ہے اس سے؟ پولیس سے رابطہ کرو' مُردہ خانے جاؤ' بالآخر ایک عمر رسیدہ نرس نے میری مدد کی۔

میں نے کہا "سسٹر! میرا بھائی تین دن سے لاپتا ہے' مجھے شک ہے کہ یہ اسی کی لاش ہے۔"

"ہوائے' تم پولیس کے پاس گیا؟" وہ بولی۔

"گیا تھا۔ انہوں نے مجھے ٹال دیا اور اسپتال بھیج دیا۔"

"کیا نام تھا تمہارا بھائی کا؟"

"ناصر عظیم" میں نے کہا "کوئی مجھے مُردہ خانے نہیں جانے دیتا۔"

"او کے۔ میرا ساتھ آؤ" وہ غالباً اینگلو انڈین تھی۔

بہت سی لاوارث۔۔۔ ٹوٹی پھوٹی' بدبُو دیتی اور سڑتی۔۔۔ خون آلود اور بھیانک چہروں والی لاشوں میں ناصر کی لاش کہیں نہیں تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔

میں نے کہا "سسٹر۔ لاش تو اِدھر نہیں ہے۔"

اس نے کہا "پھر کوئی لے گیا ہوگا' وہ کوئی اور ہوگا۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے میری مدد کرو۔ وہ میرا بھائی تھا۔ کوئی اسے غلطی سے لے گیا ہوگا۔"

"او نو مین' غلطی سے۔۔۔"

میں نے کہا "خداوند یسوع مسیح کا واسطہ تمہیں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ لاش کون لے گیا ہے۔ میں اسے ایک نظر دیکھ کے اطمینان تو کر لوں کہ وہ میرا بھائی نہیں تھا" میں نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

آنسو میرے وجود میں اس طرح جمع تھے جیسے ڈیم کی دیوار کے پیچھے پانی رکا رہتا ہے۔ جب میں نے خود ہی اس بند میں شگاف ڈالا تو آنسوؤں کا ریلا خود بہہ نکلا۔ میں اس کے پیروں میں گر گیا۔ ایسے تماشے کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ اتنی متاثر ہوئی کہ خود بھی رونے لگی۔

"اٹھو' اٹھو مائی سن! مجھے گنہگار مت کرو۔ چلو میں تم کو پتا بتا دیتی ہوں" اس نے مجھے اٹھا کے کہا اور پھر سینے پر صلیب بنائی "خدا تمہارا مددگار ہو۔ ہم سب پر رحم کرے۔"

پتا رجسٹر میں لکھا ہوا تھا۔ لاش لے جانے والا عبدالوحید قریشی تھا۔ ناصر کے چچا نے وہ نام استعمال کیا تھا جو اس نے یتیم خانے میں ناصر کے باپ کا۔۔۔ لکھوایا تھا۔ غلطی اس سے یہ ہوئی کہ اس نے وہاں مرحوم لکھوایا تھا اور اب وہی باپ جو مر چکا تھا اپنے بیٹے کی لاش لے گیا۔ تاہم پتا اس نے مختلف لکھا تھا۔ گزشتہ رات میں نے ناصر سے اس کے چچا کے گھر کا نیا پتا نہیں پوچھا تھا مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ اب پتا مل گیا ہے تو پھر کسی دن گھر بھی دیکھ لیں گے۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ چچا نے اپنا نیا پتا لکھوایا تھا۔ اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس نے حادثے کا شکار ہو کے مر جانے والے بھتیجے کو خود دفن کر کے دنیا کی ہمدردی سمیٹنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ یہ وہی بھتیجا تھا جو اس کی بیوی کا زیور اور نقد رقم لے کر بھاگ گیا تھا۔ یتیم خانے کا تو کسی کو علم ہی نہیں تھا۔ کسی کو ناصر سے ہمدردی نہیں ہوگی۔ چچا کی تعریف ہوگی' کتنا دکھ ہے بے چارے کو بھتیجے کی موت کا۔

ضابطے کی قانونی کارروائی میں دیر ہو جانے سے لاش کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچی تھی۔ گھر کے باہر بچھی ہوئی دری پر پانچ چھ افراد چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی مجھ پر توجہ نہیں دی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے ان کی صورتیں دیکھتا رہا۔ یہ سب محلے دار لگتے تھے۔ ایک بچے کی المناک حادثاتی موت پر ان کا دکھی

ہونا فطری تھا مگران میں سے کوئی بھی غم سے نڈھال نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر بعد اندر سے نکلا اور سب کے درمیان سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے گھٹنوں میں سر چھپا کے جھٹکے لینا شروع کیا۔ جیسے وہ ضبط سے کام لینے میں ناکام ہے اور چیخ چیخ کے بھی نہیں رو سکتا۔ کسی نے اس کے شانے پر ہمدردی سے ہاتھ رکھا اور غالباً صبر کی تلقین کی۔

"صبر کیسے کروں بھائی!" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور چشمہ ہٹا کے اپنی آنکھوں میں غیر موجود آنسوؤں کو رومال سے صاف کیا "مرحوم بھائی کی اکلوتی اولاد تھا۔ پہلے باپ گیا' پھر ماں گئی۔ میں نے ہی اسے پالا تھا۔ وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ میرا تو گھر خالی ہو گیا۔ کچھ نہیں رہا میرے پاس؟" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے گہری آہ بھری۔

"کیوں۔۔۔ وہ پیسہ ختم ہو گیا جو اپنے بھائی کا مکان بیچ کے ملا تھا؟" میں نے اچانک کہا "اس گھر کا سامان کہاں گیا؟"

وہ تڑپ کے ایسے اُچھلا جیسے کسی نے پیچھے سے اس کی گردن پر انگارہ رکھ دیا ہو۔ "کیا بک رہے ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سپاٹ لہجے میں کہا "یہ وہی بھتیجا ہے نا جو تمہاری بیوی کا زیور اور نقد رقم لے کر بھاگ گیا تھا۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ کسی نے بہکایا ہوگا اسے۔۔۔ بچہ تھا۔۔۔"

"مگر تم نے بچے کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی" میں نے کہا۔

"بکواس کرتے ہو تم۔۔۔ جھوٹ بول رہے ہو۔"

"ہاں" میں نے کہا "تم نے اسے یتیم خانے میں داخل کرانے کے بعد یہ کہانی مشہور کی تھی۔"

سب لوگ اب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا رویّہ ہی میرے سچ کی دلیل تھا۔ یہ سب غلط ہوتا تو وہ مشتعل ہو کے مجھے مارنے دوڑتا مگر۔۔۔ اپنا دفاع کر رہا تھا۔ لوگ اس سے بھی زیادہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ تیرہ سال کے اس بچے کو جس کے منہ میں بہت بڑی زبان تھی۔ اس خطرناک حد تک زبان دراز بچہ ان کے لیے ایک عجوبہ تھا۔ میں دل زدہ اور پریشان حال نظر آتا تھا۔ میرے لہجے میں نفرت کے آتش فشاں کا کھولتا ہوا لاوا تھا اور انتقام کی پیاس تھی اور پاگل پن تھا مگر جھوٹ نہیں تھا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ میرا سچ تسلیم کر لیا گیا ہے اور اسی نے ناصر کے قاتل چچا کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہاں سب نئے محلے دار تھے جو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

ناصر کے چچا نے جھوٹ کا سہارا لیا "یتیم خانے میں داخل کرادیا تھا' یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم' میرا خیال ہے کہ تم غلط جگہ آ گئے ہو کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم۔"

ناصر کے چچا نے معنی خیز لہجے میں لوگوں سے کہا "میرا خیال ہے کہ۔۔۔ پاگل ہے کوئی' ناصر عظیم تو میرے بھتیجے کا نام تھا۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ ایک ساتھ سارا سچ اگل دینے میں کوئی عقل مندی نہیں۔ وہ مجھے جھوٹا اور پاگل بنا چکا ہے۔ ابھی میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ کوئی گواہ۔ ناصر کا چچا مجرم ہے مگر اس پر فردِ جرم عائد کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ایسا نہ ہو' وہ پولیس کو بلا لے۔ پولیس مجھے تھانے لے جائے گی کہ چلو اپنا بیان لکھواؤ۔ اس کے بعد ہم رپورٹ درج کریں گے۔ ناصر کو دفن کر کے اس کا چچا تھانے پہنچ جائے گا اور اپنے ساتھ یتیم خانے کے تھانے دار کو بھی لے آئے گا۔ میری زبان کا سچ ریکارڈ سے جھوٹ ثابت ہو جائے گا۔ پھر وہ رشوت دے کر الٹا مجھے پھنسا دیں گے۔ مجھ پر کوئی بھی الزام عائد ہو جائے گا۔ میں جیب کترا ہوں یا ہیروئن کی پڑیا بیچتا ہوں۔ جب میں حوالات سے سچ بولنے کی سزا پا کے بالآخر رہائی پاؤں گا یا جیل کاٹ کے باہر آؤں گا تو ناصر کا چچا یہ مکان بیچ کے کہیں جا چکا ہوگا۔ اس نے ایک بار شہر نہ چھوڑ کے غلطی کی تھی۔ دوسری بار وہ ملک سے ہی فرار ہو جائے گا۔

میری خاموشی نے ناصر کے چچا کو موقع فراہم کیا کہ وہ صورتِ حال کو سنبھال لے۔ اس نے میرے قریب آ کے پوچھا "کون ہو تم' یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں بلاوجہ مسکرانے لگا "تم یہاں کیا کر رہے ہو' تم کون ہو؟"

اس نے میرے ایک جھانپڑ رسید کیا "چل بھاگ یہاں سے۔ ورنہ دماغ درست کر دوں گا تیرا۔"

میں نے دیکھا کہ لوگ مشکوک اور تذبذب میں مبتلا ہیں۔ میں نے سوالات بڑی سنجیدگی سے کیے تھے اور میرے لہجے میں دیوانگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان سوالوں نے ناصر کے چچا پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی مگر جھوٹ سچ کا پتا چلانا لوگوں کا کام نہیں تھا۔ وہ پڑوسی کی حیثیت سے جنازے میں شرکت کے لیے آئے تھے اور جلد از جلد واپس اپنے گھر جانا چاہتے تھے۔ اگر وہاں زیادہ لوگ موجود ہوتے تو شاید کچھ کھسک جاتے مگر پانچ چھ افراد وہاں بیٹھے رہنے پر مجبور تھے۔

اندر سے ایک عورت کے بین کرنے کی آواز آنے لگی تو میں نے کہا "کیا میں اسے دیکھ لوں' آخری بار؟"

ناصر کے چچا کی صورت پر اُلجھن اور پریشانی کے آثار نمودار ہوئے "کیسے دیکھ لوں' اچھا میں سمجھ گیا۔۔۔ تم ناصر کے دوست ہو۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ جہاں وہ پہلے رہتا تھا۔"

وہ مجھے اندر لے گیا "یہ سب تمہیں کس نے بتایا تھا؟ تم یتیم خانے سے آئے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ لیکن میں کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اگر تم مجھے دس ہزار روپے دے دو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "دس ہزار روپے۔۔۔ تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟"

"ہاں" میں نے کہا "میں اور ناصر ایک ساتھ کراچی جانا

چاہتے تھے۔ وہ مر گیا' اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

"کراچی جانے کے لیے دس ہزار روپے۔۔۔"

"وہاں میں خالی ہاتھ تو نہیں جا سکتا" میں نے کسی عیّار شخص کی طرح کہا۔

"تمہاری عمر زیادہ نہیں' لیکن تم بہت خطرناک ہو" اس نے بے یقینی سے کہا "اگر میں انکار کر دوں تو۔۔۔ کیا کرو گے تم؟"

"ابھی تو میں واپس چلا جاؤں گا" میں نے سکون سے کہا "لیکن مجھے تمہارے پُرانے گھر کا پتا معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے صحن میں۔۔۔"

اس نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "اچھا۔۔۔ آہستہ بولو۔ میں تم کو دس ہزار روپے دوں گا۔ مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم پھر کبھی لوٹ کر نہیں آؤ گے۔۔۔ اللہ میری توبہ۔۔۔ کیا زمانہ آ گیا ہے' ناک برابر لونڈے بلیک میلر بن گئے ہیں۔"

میں نے کہا "تم زمانے کی نہیں اپنی فکر کرو۔ جلدی بولو' کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"ٹھیک ہے۔ دس ہزار لے کر دفع ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے۔ میں پھر تمہاری صورت نہ دیکھوں۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ تم مجھے بھی قتل کر کے کہیں گاڑ دو گے" میں نے کہا "میں ایک بچہ ہوں تمہارے مقابلے میں۔ مجھے ڈرنا چاہیے تم سے۔۔۔ بالکل ٹھیک۔ میں بھی اپنی جان کا دشمن نہیں ہوں' نکالو دس ہزار۔"

"ابھی' اسی وقت۔۔۔؟" وہ بولا۔

"یہی وقت ہے وسیم صاحب!" میں نے اس کا نام لے کر اسے ایک جھٹکا دیا "ورنہ مجھے معلوم ہے کہ تم نے ناصر کے والد کا یتیم خانے میں کیا نام لکھوایا تھا اور وہاں کس کے شناختی کارڈ کی کاپی دی تھی۔ خود تم چچا بن کے نہیں گئے تھے وہاں۔۔۔"

"اس وقت دس ہزار نہیں ہیں میرے پاس؟" وہ ہکلانے لگا۔

"یہ وقت نکل گیا تو پھر کچھ نہیں ہوگا' میں گیا تو گیا۔"

"کل صبح۔۔۔ میں بندوبست کر لوں گا۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کس کا بندوبست کرو گے' پولیس کا۔۔۔؟ کل جمعہ ہے۔ بینک تو بند ہوں گے۔ میں صبح آؤں گا تو میرا استقبال پولیس کرے گی اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا میں اکیلا جیل جاؤں گا؟ نہیں ناصر کے چاچا جی ہم ایک ساتھ جائیں گے' پھر تم کو پھانسی ہونا یقینی ہے۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا "بکواس بند کرو۔۔۔ میں۔۔۔ لاتا ہوں دس ہزار۔۔۔ مگر پہلے تم قسم کھاؤ۔۔۔"

"قسم کھاتے ہیں شریف لوگ۔ بدمعاش کی زبان ہوتی ہے۔"

"بدمعاش۔۔۔ تم بدمعاش ہو۔ خود کو بدمعاش سمجھتے ہو؟" اس کا صدمے سے بُرا حال ہو گیا "اتنے چھوٹے ہو ابھی تم۔"

میں نے کہا "پہلے بڑے بڑے ریڈیو آتے تھے۔ اب پاکٹ سائز آ رہے ہیں۔ نئے زمانے کے بدمعاش بھی چھوٹے ہیں مگر زیادہ خطرناک ہیں۔ تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ صرف دس ہزار میں جان چھوٹ رہی ہے۔ میں معلوم کر لوں گا کہ تم نے اس وکیل کو مکان کتنے میں بیچا تھا۔ تین چار لاکھ تو ملے ہوں گے۔ سامان الگ۔۔۔"

اس نے کہا "تم یہاں ٹھہرو۔ میں دس ہزار لاتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں ناصر کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کفن میں بھی اندازہ ہوتا تھا کہ ناصر کے جسم کا بایاں حصّہ کچلا ہوا ہے۔ اس طرف سے کفن کا کورا سفید تھا سُرخ تھا اور یہ سُرخی پھیل رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک زیادہ واویلا کر رہی تھی' وہ ناصر کی چچی ہوگی۔

میں نے جھک کر لاش کا چہرہ دیکھا۔ اس پر سُوجن تھی۔ گہرے نیل تھے جو اب سیاہ پڑ گئے تھے۔ اس کی ایک آنکھ حلقے سے باہر تھی۔ دوسری مقابلے میں زیادہ اندر دھنسی ہوئی لگتی تھی۔ چوٹوں اور زخموں کے نشان بہت واضح تھے۔ کرب اور اذیت کا ہر لمحہ اس کی صورت پر مجسم نظر آتا تھا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے وہاں میں لیٹا ہوا ہوں۔ وہ ساری اذیت میں نے ہی جھیلی تھی۔ تشدد کا سارا جان لیوا عذاب میں نے برداشت کیا تھا۔ میرے ہی جسم پر ساری مشقِ ستم ہوئی تھی۔ میں ہی تو تھا جسے مارنے کے بعد مرنے کے لیے سڑک پر پھینک دیا گیا تھا۔ اور جب گاڑی کا پہیہ میرے وجود کو کچلتا ہوا گزرا تھا تو میرے آدھے بدن کی ہڈیاں کیسے چٹخ کے ریزہ ریزہ ہوئی تھیں۔ بائیں شانے سے بائیں پنجے تک۔ کیسے میرے آدھے جسم کی کھال پھٹ گئی تھی اور گوشت خون کے ساتھ سڑک پر لکیر بن کے پھیل گیا تھا۔ میرے آدھے حصے کو اس دیو ہیکل پہیے نے کتنی بے حسی کے ساتھ پیس کے رکھ دیا تھا۔

وہ بھی ناصر عظیم تھا اور میں بھی ناصر عظیم تھا۔ ناصر عظیم نے موت کے اس پُراذیت آخری لمحے میں کیا سوچا تھا۔

سُوجے ہوئے مکروہ چہرے والی اس شکستہ تن' خون آلودہ لاش نے اچانک آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور کہا "میں سوچ رہا تھا کہ شاید تم مجھے بچالو گے۔ کسی دن تم میرا گھر مجھے واپس دلوادو گے۔۔۔ اور مجھے میری ماں سے بھی ملوادو گے۔۔۔"

میں پلٹ کر بھاگا۔ میں نے خوف زدہ اور پریشان نظر آنے والے ایک قاتل کے ہاتھ میں دس ہزار کے نوٹ دیکھے۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں اسے دھکیل کر نکل گیا۔ نہ جانے میں کب تک بھاگتا رہا اور کب تک چلتا رہا۔ ایک آواز مسلسل میرے تعاقب میں تھی۔

میرے قاتل نے کہا تھا کہ قسم کھاؤ۔۔۔ صرف دس ہزار میں وہ کیا کچھ خریدنا چاہتا تھا مجھ سے۔ اس بے آسرا یتیم لہو کی سُرخی جو کفن کی سفیدی پر غالب آ رہی تھی؟ اپنے ہی گھر کے آنگن میں دفن ایک عورت کا سڑا ہوا ڈھانچا! اور اس گھر پر غاصبانہ قبضے کا اختیار جو ایک بھائی کی امانت تھا؟ صرف دس ہزار میں وہ سب خون معاف کرانا چاہتا تھا۔ اس نے ناصر کی ماں کا خون کیا تھا۔ ناصر کا

خون کیا تھا اور اپنے بھائی کے اعتماد اور اس رشتے کی تقدیس کا خون کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صرف دس ہزار لے کر میں قسم کھاؤں۔

قسم تو اس رات میں نے کھائی تھی مگر اس کی قیمت نہ دس ہزار تھی نہ دس لاکھ اور نہ دس کروڑ۔ میں نے اپنے ہر قاتل سے اپنے ہر خونِ ناحق کا انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔ ظلم کو اور جبر کو اپنی تقدیر سمجھتے ہوئے خاموشی سے برداشت نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ کسی نمرود کی خدائی کو تسلیم کرتے ہوئے سر نہ جھکانے کی قسم کھائی تھی۔ وہ جو ناصر عظیم تھا، اس قسم پر قائم رہا۔

ایک ناصر عظیم وہ تھا جو میرا ہم نام تھا، جسے میں نے اپنا چھوٹا بھائی کہا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے تحفظ فراہم کروں گا اور اسے اس کا حق دلاؤں گا مگر کچھ بھی نہ کرسکا اور دنیا نے اس سے سب کچھ چھین لیا اور پھر اسے بڑی بے رحمی سے ہلاک کر ڈالا۔

دوسری قسم میں نے برسوں بعد چندا کے سامنے کھائی تھی۔ اس وقت میں یعنی ناصر عظیم خود کو مداری کہتا تھا اور زندگی کو ایک تماشا۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ میرا تو کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ میں جس نگر گیا مداری کا کھیل دکھایا۔ مال سمیٹا اور اپنی راہ لی۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔ پھر اچانک تقدیر مجھے اس گھر میں لے گئی جسے میں اپنا سمجھ سکتا تھا۔ مجھے وہ لڑکی مل گئی جس کو اپنانے کے لیے میں دنیا کو چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے کہا، ختم کرو یہ مداری کا کھیل۔ انسان کے بچے بن جاؤ۔ اور میں نے کہا کہ بن جاؤں گا اگر تم میری بن جاؤ۔ اور اس نے کہا کہ میری قسم کھاؤ، میں نے کہا "میں تمہاری قسم کھاتا ہوں۔"

چندا یہ سمجھتی ہے کہ میں اپنی قسم پر قائم نہیں رہا۔ جب میں ناصر عظیم سے شاہ عالم بنا تو میں نے مداری کا نیا کھیل شروع کردیا تھا۔ وہ میری مجبوری کے عذر کو تسلیم نہیں کرتی تھی مگر میں جانتا ہوں کہ اس وقت میں خود ناصر عظیم کو مار کے شاہ عالم کی زندگی گزارنے پر رضامند نہ ہوتا تو پھر کسی اور بدبختی کی ایسی ہی موت میرا بھی مقدر ہوتی جو دس سال کی عمر میں پہلے ناصر عظیم کو ملی تھی۔ ناصر کے چچا جیسے ہی لمبے ہاتھ رکھنے والے ظالم، لالچی اور بے ضمیر لوگ میرے مقابل تھے۔ شاہ عالم کا مزار تو پھر بھی مرجع خلائق ہے۔ میری بے نام ونشان وگمنام قبر کا کہیں سُراغ نہ ملتا۔ میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے مداری تھے جنھوں نے کہا کہ اب تم شاہ عالم ہو، ناصر عظیم کو ہم نے اپنے کرتب سے غائب کردیا ہے۔

میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ مجھے امید تھی کہ کسی دن میں یہ کرتب سیکھ جاؤں گا تو شاہ عالم کو غائب کردوں گا اور ناصر عظیم پھر سب کے سامنے ہوگا۔ بالکل اُسی طرح اور ویسا ہی جیسا وہ غائب ہوتے وقت تھا۔

○☆○

تیمور کسی بھنگ کھا جانے والے گدھے کی طرح کمرے میں گھوم رہا تھا۔ دولتی مار کے اس نے ٹھنڈی چائے لانے والے ملازم کو باہر نکال دیا تھا اور پھر میز الٹ دی تھی۔ غصّہ اسے مجھ پر آرہا تھا مگر وہ مجھ پر نہیں اُتار سکتا تھا۔

"تم بھی حد کرتے ہو" اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ایک بہت بڑا کلاک دیوار پر عین اس کے سامنے تھا "دو گھنٹے ہوگئے۔"

"دو گھنٹے سترہ منٹ" میں نے میز پر مُکا مارا "اگر اسی طرح تم میری زندگی کے سترہ منٹ کم کرتے رہے..... ہر دو گھنٹے بعد۔"

"خدا کے لیے سیریس ہوجاؤ شاہ جی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ آخر اس عورت کو کیسے پتا چلا.....؟"

"یہ تم اس کے مقابلے میں اپنی نااہلی کا اعتراف کر رہے ہو۔ تم نہیں پتا چلا سکے مگر اس نے معلوم کرلیا۔"

"شاہ عالم کا فون پہلے تمہارے پاس آیا تھا!"

"غلط۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیمور کو سب معلوم ہے" میں نے کہا۔

"جب میں نے تمہیں فون کیا تو تم وہاں نہیں تھے۔ اور تمہارا وہ خبیث دوست....."

میں نے کرسٹل کا آرائشی گلدان اُٹھایا اور کونے میں اِستادہ وینس کے مجسمے پر کھینچ مارا۔ مجسمے کی ناک ٹوٹ گئی، گلدان بکھر گیا۔

"یہ..... یہ کیا حرکت ہے۔ تم پاگل ہوگئے ہو؟" حیرت سے تیمور ساکت ہوگیا۔

"پھر کبھی تم نے ڈاکٹر کمال فاروقی کی شان میں کوئی گستاخانہ لفظ اپنی زبان سے نکالا تو شاید تمہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا" میں نے کہا۔

تیمور نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وہ تو جاچکے ہیں۔ کہاں تشریف لے گئے تھے آپ۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں نے سب جگہ فون کرکے معلوم کیا... اور تم سے پہلے یہ مصیبت نازل ہوگئی۔"

وہ اسی وقت اندر آگئی۔ تیمور نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی مصیبت تھی۔ اس کا حُسن آفت تھا تو شباب شامت اور انداز قیامت۔ قتل کے سب ساماں، اس کے پیکر کی رعنائی میں کم نہ تھے کہ اس نے اپنے خوب صورت ہاتھوں میں ریوالور بھی اُٹھالیا تھا۔ تیمور کا منہ کھلا رہ گیا تھا اور وہ اپنی جگہ پتھر کے بُت کی طرح منجمد ہوگیا تھا۔

اس نے ایک ادائے ناز سے اپنے بالوں کو پیچھے کیا اور مسکرائی "میں تم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی... اور تم انکار نہیں کروگے..... کیوں ڈارلنگ!"

میں نے نہایت احمقانہ انداز میں پہلے اوپر نیچے اور پھر دائیں بائیں سہلایا۔

شبنم سے وہ میری پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔ اس سے پہلے اخبار کے عام قاری کی حیثیت سے میں نے کچھ پڑھا اور سُنا تھا کہ وہ کوئی خطرناک قسم کی صحافی ہے۔ کوئی صحافی خطرناک نہیں ہوتا، خطرناک کوئی خبر ہوتی ہے جس سے خطرناک لوگ خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ اگر ان کی نوکری خطرے میں پڑ جائے، عزت کا جنازہ نکل جائے یا جان کے لالے پڑ جائیں۔

عام آدمی ایسی خبریں پڑھ کے بہت خوش ہوتا ہے اور پھر سب کو سُناتا پھرتا ہے۔ عام آدمی بن جانے کے باوجود میں یہ دونوں کام نہیں کرتا تھا۔ میرے لیے ایک ڈی ایس پی کی خودکشی بھی صرف ایک واقعہ تھی جس کی ذمّے دار شبنم کی کوئی خصوصی رپورٹ تھی۔ ایک وزیر صاحب نے اس کے خلاف بیان بازی کی اور پھر ہتکِ عزت کا مقدمہ بھی دائر کیا تھا۔ ڈیڑھ دو کروڑ کا ہرجانہ بھی مانگا تھا مگر بعد میں نہ جانے کب اور کیسے یہ معاملہ دبا دیا گیا تھا۔

مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ وہ ایسی ماڈل گرل ٹائپ کی صحافن ہوگی۔ اس نے جینز کی پتلون پہن رکھی تھی جس کا نیلا رنگ جگہ جگہ سے اُڑا ہوا تھا۔ اس پر سیاہ رنگ کی خاصی لمبی مردانہ کالر، آدھی آستین اور دو جیبوں والی شرٹ تھی جو پتلون سے باہر تھی۔ اس کے پیروں میں پُرانے ملگجے کینوس شوز تھے جن کا اصل رنگ کب کا اُڑ چکا تھا۔ کندھے پر لٹکا ہوا براؤن بیگ بھی کسی کباڑی کا تحفہ نظر آتا تھا۔ اس کے بازو اور چہرے کا رنگ قدرے گندمی، کچھ سانولا اور زیتونی تھا مگر گردن کے نیچے قمیص کے اوپر والے کھلے بٹن سے جہاں تک نظر جاسکتی تھی اس کی جلد میں گندم کے خوشوں کا سنہرا پن تھا۔ وہ میک اپ سے عاری تھی اور بالوں کو بھی اس نے عجیب لاابالی انداز میں سمیٹ کر پونی ٹیل بنالی تھی۔

ایسے لباس اور حلیے میں اس نے اپنے حُسن وشباب کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو اناڑی کوچبان ریس کے گھوڑے کو تانگے میں جوت کے کرسکتا ہے۔ کوئی عورت اپنے حُسن کی قوتِ تسخیر کے دائرے سے ناآشنا ہو، یہ نہ جانتی ہو کہ اس کے وجود کی مقناطیسی کشش پر کیسے فولادی بازو رکھنے والے مرد کچے دھاگے سے بندھے چلے آئیں گے، یہ ناممکن ہے۔ شبنم نے جانتے بوجھتے اپنی نسوانیت کے حُسن کو اسی طرح کیموفلاج کیا تھا جیسے زمانہ جنگ میں سنگِ مرمر سے مزیّن عمارتوں پر مٹی اور کیچڑ مل دیتے ہیں۔ صحافت کے پیشے کو وہ اپنے لیے میدانِ جنگ سے کم نہیں سمجھتی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ حُسن وشباب اس کا خفیہ ہتھیار ہے۔

میں نے دنیا دیکھی تھی۔ میں شرط لگا سکتا تھا کہ یہی لڑکی کسی فیشن بوتیک سے ملبوس کا انتخاب کرتی اور پھر کسی بیوٹی پارلر سے برآمد ہوتی تو قتلِ عام کرتی۔ اسے ایک نظر دیکھ کے مردوں کے دل دھڑکنا بھول جاتے اور جب دھڑکتے تو دھک دھک نہ کرتے، شب..... غم..... شب غم کرتے۔ اگر وہ یورپ میں ماڈل ہوتی تو ٹاپ کے فیشن میگزین اس کو ایسا ڈسپلے دیتے کہ ہماری قومی غیرت کا توخیر

جنازہ نکل جاتا مگر وہ اپنی نمائش کر کے اتنا کمالی جتنا ہمارے باپ کے بیوروکریٹ اپنے اختیارات کی توپ چلا کے نہیں کما سکتے۔

یہاں وہ نہایت فضول اور کسی حد تک مضحکہ خیز حلیے میں پھر رہی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایک عورت کی حیثیت سے وہ کسی مرد کو نہ متوجہ کرنا چاہتی تھی اور نہ چونکانا۔ قابل توجہ "خبر" ہونی چاہیے' چونکانے والا کوئی انکشاف ہونا چاہیے۔ تاہم اپنی ذات کے تغافل اور بے نیازی کے اس رویے سے بہت کم فرق پڑتا تھا۔ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے تھے۔ مثلاً میں خود... کوئی صحافی دیکھنے کی چیز نہیں ہوتا مگر کسی بھی مرد کے لیے شبنم پہلے ایک پُرکشش عورت تھی اور اس کے بعد صحافی۔ شبنم اس کے برعکس سوچتی تھی تو یہ اس کی کج فہمی تھی مگر قصوروار وہ مردوں کو سمجھتی تھی۔

میری محویت کو دیکھتے ہوئے تیمور نے خفگی سے "بس شبنم! واٹ از آل دس نان سنس!"

"یہی تو ہے وہ سوال جس کا جواب پوچھنے کے لیے میں تمہارے چیئرمین کو اغوا کر کے لے جا رہی ہوں' تم کو کچھ کرنا چاہیے تیمور صاحب" وہ بولی۔

"پاگل پن کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔"

"میرے پاس ہے تیمور صاحب! بڑا تیر بہدف نسخہ ہے" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی "بعد میں بتاؤں گی' انشاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"چلیں آپ جائیں یہاں سے پلیز!" تیمور نے بدمزگی سے کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے تیمور صاحب۔ میں آپ کے چیئرمین کو اغوا کر کے لے جا رہی ہوں اور آپ کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ الٹا مجھے این او سی دے رہے ہیں کہ جاؤ' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وفاداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ مجھے روکنے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دیں مگر آپ کی بلا سے شاہ عالم کو میں لے جاؤں یا افریقہ کے آدم خور لے جائیں۔ آپ ایسے ہی چیئرمین بن سکتے ہیں۔"

میں نے سنبھل کے کہا "کیا اغوا کیے جانے والے کی بات بھی سُنی جائے گی مس اغوا کنندہ۔"

وہ ہنسی "عالی' میں تو سمجھی تھی کہ تم ابھی تک خفا ہو۔ اس لیے بات نہیں کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "جو اغوا کرتے ہیں' وہ قتل بھی کر دیتے ہیں۔ قتل تم نے پہلے کر دیا' اب اغوا کر کے کیا ملے گا تمہیں۔"

"وہی جو میرے نصیب میں ہے۔ محرومی' مایوسی' دل شکنی" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "مگر عالی' یہ چکر کیا ہے۔ تمہارا لہجہ اور رویّہ بدلا ہوا ہے آج۔"

تیمور نے جھنجلا کے کہا "آخر کس اُلّو کے پٹھے نے تمہیں اندر آنے کی اجازت دی ہے اس وقت؟"

"کیا میں اجازت کی پابند ہوں؟" وہ صوفے پر جم گئی۔

"بالکل نہیں" میں نے کہا "لیکن شبنم' سوال وقت کا ہے۔ میں اغوا ہونے کے لیے تیار ہوں مگر تم پانچ بجے کے بعد آ جاؤ۔"

"وعدہ؟" اس نے ریوالور میز پر رکھ کے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "وعدہ تم کرو کہ بھولو گی نہیں۔"

تیمور نے ریوالور کو غور سے دیکھا "خاتون... مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس اس کا لائسنس ضرور ہوگا اور اسے ساتھ رکھنے کا اجازت نامہ بھی... لیکن یہ جرم ہے۔ اس طرح اسلحہ نکال لینا' آخر یہ میرا گھر ہے۔"

"میں تو سالگرہ کا تحفہ لائی تھی۔ تمہارے بچے کے لیے۔ آج کل کے بچے ایسے ہی کھلونوں سے کھیلتے ہیں اور اس کے ذمے دار تم ہو تیمور' آج نقلی ہوگا اس کے ہاتھ میں تو کل اصلی بھی استعمال کرے گا... انشاء اللہ... اس پیشے میں..."

"میرا کوئی ارادہ نہیں ہے اپنے بچوں کو سیاست میں لانے کا۔"

"ہاں۔ مروانے کے لیے غریب کے بچے جو ہیں۔ تمہارے بچے تو پڑھیں گے امریکا میں اور پھر کینیڈا میں سیٹل ہو جائیں گے۔ کبھی تم نے سوچا ہے تیمور صاحب کہ خود تمہارے بچے کیا سمجھتے ہوں گے تمہیں..."

تیمور نے کہا "وہ فخر کرتے ہیں اپنے باپ پر۔"

"شاید ٹھیک ہی کہا تم نے۔ منافقت ان کے خون میں بھی ہوگی۔ دنیا کے سامنے وہ ضرور فخر کا اظہار کریں گے خواہ دلی طور پر وہ کتنے ہی شرمندہ کیوں نہ ہوں۔"

"کیوں... میں کوئی چور ڈاکو ہوں' موچی یا نائی ہوں؟" تیمور نے رعونت سے کہا۔

"کسی محنت کش سے اپنا مقابلہ مت کرو۔ اگر باعث شرم نہیں تو پھر اپنے بچوں کو اس پیشے سے دور کیوں رکھنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے پھر مداخلت کی "پھر آپ آ رہی ہیں نا پانچ بجے۔ مجھے اغوا کرنے کے لیے۔ مغوی آپ کو چشم براہ ملے گا۔"

"یہ آپ جناب والا لہجہ مجھے شک میں مبتلا کر رہا ہے' جناب عالی!"

"شک کیسا؟" میں نے کہا۔

"ایک شعر سنو... یوں تو پہلے بھی ہوئے ہم سے کئی بار خفا۔ لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہم ہے تمہارا۔ تم سے خفا ہو کے ہم جی سکتے ہیں؟ دراصل ہم اس وقت ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں بات کر رہے تھے۔"

"اہم میٹنگ! یہ تو خبر ہے میرے لیے... کیونکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم واپس آ گئے ہو' ایسی رازداری سے..."

میں نے کہا "پلیز شبنم! یہ سب آف دی ریکارڈ ہے۔ اسے خبر مت بناؤ' میں تم سے درخواست کروں گا کہ راز کو راز ہی رہنے دو۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر سرہلایا "ٹھیک ہے عالی' تم حکم دے سکتے تھے۔ درخواست کیوں کر رہے ہو؟ کیا پانچ بجے میں یہاں آ جاؤں؟" وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی اور پھر لوٹ آئی۔

"میں... فون کر کے بتا دوں گا۔"

"یعنی اب میں پانچ بجے تک کہیں نہ جاؤں۔ گھر میں فون کے سامنے بیٹھی رہوں۔ مجھے تو جانا ہے جلسے میں" اس نے جیسے خود سے سوال و جواب کیے۔

"کون سے جلسے میں؟" میں نے کہا۔

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "کیا آج شہر میں دو جلسے ہو رہے ہیں؟ اگر تم کہو گے تو میں نہیں جاؤں گی۔ ویسے وہ سیاسی حریف ہے تمہارا' رقیب نہیں۔"

تیمور نے کہا "آپ جائیں بی بی' اپنا کام کریں۔ پانچ بجے تو جلسہ شروع ہوگا۔"

اس نے سوچ کے کہا "تم بتاؤ عالی' جاؤں کہ نہ جاؤں؟"

میں نے کہا "میں تمہیں کیسے روک سکتا ہوں' کام ہے تمہارا۔"

"اچھا یار' نہیں جاتی۔ تم بُرا مانتے ہو تو..."

"لاحول ولا قوۃ۔ میں کیوں بُرا مانوں گا۔"

"جناب عالی' تمہارا موڈ اور لہجہ بتا رہا ہے۔ رپورٹ تو مجھے مل ہی جائے گی کسی اور سے بھی" وہ بولی۔

"دیکھو' تم واقعی غلط سمجھ رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلسے میں جاؤ جو خبر تم لا سکتی ہو شاید اور کوئی نہیں لا سکتا" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا "او کے۔ میں جانتی ہوں کہ اس جلسے کی تمہارے نزدیک کیا اہمیت ہے۔ تم کسی کو بتائے بغیر آخر کس لیے آئے ہو۔"

کچھ سمجھے بغیر میں نے بات کو گول مول کر دیا "سمجھ دار ہو ماشاءاللہ۔"

"پھر ہاتھ تو ملا لو..." اس نے خفت آمیز شکایتی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری..." اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مجھے اپنے اور اس کے ہاتھ کے درمیان کاغذ کے ایک پُرزے کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"جناب عالی! اپنی تشریف آوری کو کب تک سیکرٹ رکھو گے تم؟" وہ بولی۔

میں نے تیمور کی طرف دیکھا "بس آج کا دن... یا کل تک۔"

اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ تیمور کا موڈ سخت خراب تھا۔ شبنم کے باہر نکلتے ہی اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ اس کا پی آر او سیکریٹری میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ وہ خاصا مستعد اور اسمارٹ آدمی تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسی نے مجھے ریسیو کیا تھا اور کہا تھا "تیمور صاحب' آپ کے منتظر ہیں سر!" اور پھر مجھ سے پہلے ہاتھ بڑھا کے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ پی آر او تیمور کا سیکریٹری بھی تھا اور جس کمرے میں وہ بیٹھتا تھا' وہ ملاقات کرنے والوں کے لیے ویٹنگ روم کا کام بھی دیتا تھا۔ اگر تیمور اندر اپنے آفس میں مصروف ہوتا تھا تو ملاقاتی اس کمرے کے آرام دہ صوفوں پر باری کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ یہ تیمور کی "مصروفیت" کی نوعیت پر بھی منحصر تھا اور ملاقاتی کی ذاتی اہمیت پر بھی کہ اسے کتنی دیر بعد شرف باریابی حاصل ہوتا ہے۔ شاہ عالم کے علاوہ بھی کچھ وی وی آئی پی قسم کے لوگ تھے جن کے لیے اطلاقاً بھی اپنی آمد کی اطلاع دینا ضروری نہیں تھا۔ جب وہ آتے تھے تو پی آر او خود دوڑ کے ان کے لیے دروازہ کھولتا تھا اور وہ رُکے بغیر سیدھے اندر پہنچ جاتے تھے۔ کچھ وہاں قیام کرتے تھے تو ان کو فوراً چائے کافی یا سگریٹ اور اخبار وغیرہ پیش کر دیا جاتا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جو وہاں اونگھتے اور جماہیاں لیتے رہتے تھے۔ باربار کلائی کی گھڑی دیکھتے تھے بالآخر اپنی خودی کو بلند رکھنے کے لیے انہیں کوئی ضروری کام یاد آ جاتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں تیمور کو گالیاں دیتے ہوئے پی آر او سے مسکرا کے کہتے تھے کہ چلو بھئی پھر کبھی سہی۔ جو سیاسی اخلاقیات کے تقاضوں سے ناواقف تھے یا غرض کے تعلق کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تھے اور بداخلاقی کے اس رویے پر برہمی کا اظہار کرتے تھے وہ خود اپنی ذلت کا سبب بنتے تھے۔ پی آر او سخت ذھیٹ تھا اور اس کے پاس سب کے لیے وہی معذرت خواہانہ انکسار۔ "سر جی' آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ میں تو ملازم بندہ ہوں۔ آپ دس گالیاں دے سکتے ہو۔ سو جوتے مار سکتے ہو مجھے۔ لیکن میں کیسے آپ کو اندر جانے دوں۔ کچھ تو خیال کریں جی میری نوکری کا۔ بال بچے دار آدمی ہوں۔ ابھی کھڑے کھڑے نکال دیں گے مجھے تو میں کہاں جاؤں گا۔" ظاہر ہے اس کے بعد ناراض شخص بھی پگھل جاتا تھا اور اسے کہتا تھا "نہیں بھئی' تم کو تو کچھ نہیں کہا ہم نے لیکن تیمور صاحب کو بتا دینا کہ ہم بھی گئے گزرے نہیں ہیں' ہاں... کہ ان کے روبرو کھڑے کتّے کی طرح دُم ہلاتے رہیں' کام پڑے گا تو ہمارے ہی پاس آئیں گے وہ بھی' حساب برابر کر لیں گے ہم... ہاں..." پھر وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے یا پیر پٹختے رخصت ہو جاتے تھے۔

ایسے ذمے دار اور چاق و چوبند شخص کا آفس میں سو جانا خلاف معمول بات تھی۔ تیمور نے اسے ہلا کے کہا "زبیری... یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ سونے کی جگہ ہے' رات بھر کیا کرتے رہے..."

زبیری نے بڑی مشکل سے سر اُٹھا کے آنکھیں کھولیں اور پھر سو گیا۔

تیمور نے اسے زیادہ شدت سے ہلایا "کیا ہوا ہے تمہیں زیبری۔ ہوش میں آؤ' مجھے بتاؤ تمہیں نیند کیوں آرہی ہے؟"

زیبری نے نیند میں بولنے والے کی طرح بوجھل آواز میں کہا "ش...یوں.... غم...."

"تمہاری سمجھ میں کچھ آیا؟" تیمور نے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔ اس نے کچھ کھالیا ہے۔ کیا اسے عشق تھا کسی سے؟"

"عشق.....ہاں۔ لیکن عشق کا کچھ کھانے سے کیا تعلق؟" تیمور بولا۔

میں نے کہا "عشق میں ناکامی پر آدمی کچھ بھی کھا سکتا ہے۔ سنکھیا' نیلا تھوتھا۔ اس نے غالباً خواب آور گولیاں کھالی ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم بھی۔ جس سے عشق تھا وہ اب اس کے دو بچوں کی ماں ہے۔"

میں نے کہا "خاصی معقول وجہ ہے یہ بھی۔ بیوی بن جاتی ہے تو محبوبہ نہیں رہتی' یہی ناکامیٔ عشق ہے۔"

مگر تیمور نے میرے فلسفۂ عشق پر غور کیے بغیر پھر زیبری کو جھنجوڑنا شروع کیا "کیا کھایا ہے تم نے.....بولو کیوں کھایا ہے؟"

زیبری نے جواب میں پھر کسی چیز کے کھانے جیسا نام لیا مگر اس بار میں نے کسی عظیم سراغ رساں کی طرح جائے واردات پر سے ایک رنگین کاغذ کا پرزہ اٹھالیا "ہاہا.....پکڑلیا....." میں نے وہ ریپر لہرا کے کہا۔

"کیا پکڑلیا...!" تیمور نے حیرانی سے کہا۔

"یہ دیکھو' چیونگ گم کے پیکٹ کا ریپر۔ اس سے مجرم پکڑا جائے گا۔ اس پر فنگر پرنٹ ہوں گے...."

تیمور نے کہا "چیونگ گم' زیبری... تم نے چیونگ گم کھائی ہے۔ اوہ مائی گاڈ' میں سمجھ گیا.... یہ اسی اُلّو کی پٹھی کی کارستانی ہوگی۔ میں بھی حیران تھا کہ زیبری کے ہوتے ہوئے وہ اندر کیسے گھس آئی۔ اور وہ بھی ہاتھ میں ریوالور لے کر' نقلی ہی سہی مگر دیکھنے میں تو اصلی لگتا تھا۔"

"خواب آور چیونگ گم۔ شبنم کہاں سے لائی؟" میں نے کہا۔

"تم نہیں جانتے اس کو۔ سب کچھ کرسکتی ہے وہ... دیکھ لو اسے تمہارے یہاں موجود ہونے کی خبر مل گئی۔ وہ شیطان کی نہیں شیطان اس کا چیلا ہے۔ ایسی خبیث بدروح ہے اس کے اندر۔"

میں نے کہا "کیا اسے گالیاں دینے سے بہتر یہ نہیں ہوگا کہ تم کسی ڈاکٹر کو بلالو۔ ایک بے ضرر سا ہاتھ دکھا گئی وہ۔ میرے خیال میں تو خطرے کی کوئی بات نہیں' شبنم اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ کوئی خطرناک چیز کھلا دیتی۔"

"شاہ جی.... شاہ جی... تم نہیں جانتے اسے" تیمور نے پھر کہا۔

"چلو میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔ تم جانتے تھے اسے' پھر شور کیوں مچا رہے ہو" میں نے کہا "تم بھی کچھ کرو۔"

تیمور نے چلّا کے کسی کو آواز دی "الٰہ دین۔ الٰہ دین کے بچے... جن کی اولاد کیا بہرا ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا "ممکن ہے الٰہ دین بھی سو رہا ہو سکون کی نیند۔"

میرا خیال ٹھیک تھا۔ دروازے کے باہر برآمدے میں رکھی ہوئی کرسی پر الٰہ دین بھی منہ کھولے اور سر پشت سے لگائے پڑا ہوا تھا۔ تیمور کے جھنجوڑنے اور چلّانے پر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر دھڑام سے فرش پر گر کے پھر سو گیا۔

تیمور کا غصے سے بُرا حال ہو گیا "تم نے دیکھا تھا نا' کیسے مسلسل منہ چل رہا تھا اس کا۔ بات کرتے ہوئے بھی۔"

میں نے کہا "پتا نہیں یہ لڑکیاں ببل کیسے بناتی ہیں۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر کبھی کامیاب نہیں ہوا' تمہیں آتا ہے یہ آرٹ؟"

تیمور نے سخت ناگواری کا اظہار کیا "اس لڑکی نے سب کو پریشان کر رکھا ہے۔ ماری جائے گی کسی دن۔ اب میں پولیس کو رپورٹ کرتا ہوں تو ثبوت کوئی نہیں میرے پاس۔ گواہ صرف تم ہو اور تمہاری موجودگی کا ابھی کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ صاف اقدامِ قتل کا مقدمہ بنتا ہے۔ عام آدمی کو پولیس اٹھالاتی ہے اور گواہ ثبوت سب پیدا کرلیتی ہے مگر اس کو چھوٹ مل جائے گی۔ صحافی کی اولاد' جو بولے اسے خبر کا ہوّا دکھا کے ڈراتی ہے۔"

میں نے کہا "ڈرنے والی بات نہ ہو کوئی تو خبر کی اہمیت بھی نہ رہے۔ اگر ہماری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہو' کوئی راز نہ ہو جس کے افشا ہونے کا خوف ہماری کمزوری بن جائے۔"

میری باتیں تیمور کو بالکل پسند نہیں آرہی تھیں "تم بیٹھو' میں کسی ملازم سے کہتا ہوں کہ انہیں کہیں لٹا دے۔ ڈاکٹر کو بلالینا ہی بہتر ہے۔ یہ اطمینان ہو جائے گا کہ تشویش کی بات نہیں۔ آج ہی اُٹھ جائیں گے' یومِ حشر تک صورِ اسرافیل کے انتظار میں نہیں پڑے رہیں گے۔"

تیمور کا آفس اس کی کوٹھی سے ملحق گیسٹ ہاؤس یا انیکسی میں تھا۔ نچلی منزل پر دو بیڈ روم تھے۔ ان میں سے ایک عام ملاقاتیوں کے لیے تھا' اس میں قالین پر دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ صوفہ سیٹ ایک ہی تھا۔ اس کے سامنے سینٹر ٹیبل رکھی رہتی تھی۔ یہ ترتیب کسی چھوٹی موٹی پریس کانفرنس کے لیے بھی موزوں تھی اور کسی میٹنگ کے لیے بھی۔ قائداعظم کی تصویر صوفے کے پیچھے تھی۔ اس کے بغیر یہ سیٹ اَپ مکمل نہیں ہوتا تھا۔ اس میں ایک طرف میز پر ٹی وی اور وی سی آر رکھ دیے گئے تھے۔ دوسری طرف اندر تیمور کے آفس میں کھلنے والے دروازے کے ساتھ زیبری چھوٹی سی آفس ٹیبل پر فون رکھے اور کرسی ڈالے براجمان رہتا تھا۔

اوپر کی منزل کے دو بیڈ روم خصوصی مہمانوں کے لیے وقف تھے جن کی غیر سیاسی اور پُراسرار نوعیت کی خلوت میں دخل اندازی انتہائی سنگین نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال میں ہی ممکن تھی۔ اچانک پتا چلے کہ خلیفۂ وقت' وزیراعظم یا سپہ سالار میں سے کوئی نیند میں چلتا ہوا آگیا ہے۔ آدم خور شیر نچلی منزل پر سب کو نوش فرمانے کے بعد اوپر کی سویٹ ڈش بھی چکھنا چاہتا ہے یا اطلاع ملی ہے کہ بھارت اسی انیکسی میں اپنا خفیہ ایٹمی دھماکا کرنے والا ہے۔ باقی سب جو ہوتا رہتا تھا غیر اہم تھا مثلاً خلیفۂ وقت کی "ناگہانی" موت' زلزلے یا سیلاب کی تباہ کاری۔ مارشل لا یا وزیراعظم کی رخصتی' والد صاحب یا والدہ صاحبہ کی وفات حسرت آیات۔ کسی بیوی کا ایک اور بچّہ پیدا کرنا۔ ولی عہد کا جوانی کی نادانی کے باعث کہیں قتل غپاڑہ یا دست درازی کرتے ہوئے پکڑا جانا۔ یہ سب زندگی کے معمولات میں شامل تھا جن سے کوئی سنگین ہنگامی صورتِ حال پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ کاغذ کا پُرزہ جو شبنم نے مجھے تھمایا تھا ابھی تک میری مٹھی میں دبا ہوا تھا حالانکہ میں اسے پتلون میں ڈال کے بھی رکھ سکتا تھا۔ تیمور نے کچھ نہیں دیکھا تھا اسے موقع بھی نہیں ملا تھا کہ میری بند مٹھی پر غور فرما کے شک میں مبتلا ہوتا۔ اس کے فوری طور پر واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور چند منٹ میں ایک پورے صفحے کا خفیہ پیغام پڑھا جاسکتا تھا مگر مجھے حالات کے تجربے نے محتاط رہنا سکھا دیا تھا۔ یہاں دیواروں کے صرف کان ہی نہیں' آنکھیں بھی ہوتی تھیں۔ نہ جانے کس کونے سے کسی کیمرے کی نظر مجھ پر جمی ہوئی ہو۔

میں نے باتھ روم کا رُخ کیا اور دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد سپاٹ دیوار کی طرف منہ کر کے چرمر ہو جانے والے کاغذ کے پُرزے کو کھولا۔ اس پر صرف ایک سطر کی تحریر تھی "غلط مشورے دینے والے تم سے غلط فیصلہ کرا کے تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔"

یہ ایک سطر مجھے پہلی بار میں ہی ازبر ہو گئی تھی مگر میں کاغذ کے اس پُرزے کو گھورتا رہا۔ یہ گفٹ پیپر کا ٹکڑا تھا۔ اس کے پیچھے کارٹون چھپے ہوتے تھے اور ان کے ساتھ ہیپی برتھ ڈے کے الفاظ۔ غالباً وہ اس میں کھلونا پستول گفٹ پیک کر کے لائی تھی۔ اس کو ویٹنگ روم میں بیٹھ کے زیبری کی کسی بات سے شک ہوا یا خود اس نے زیبری کو باتوں میں لگا کے کچھ اُگلوالیا اور اس کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ کسی طرح مجھے خبردار کرے۔ نوٹ بک اور پنسل ہر صحافی کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ کاغذ اور پین یا بال پوائنٹ زیبری سے بھی مانگ سکتی تھی۔ یہ اس نے گفٹ پیپر کا کونا پھاڑ کے لپ اسٹک سے پیغام کیوں لکھا؟ یہ رنگ وہی تھا جو شبنم کے ہونٹوں پر نظر آرہا تھا۔

کھلونا پستول کے لپیٹنے کے لیے اس نے اخبار کے آدھے صفحے کے برابر گفٹ پیپر ضرور استعمال کیا ہوگا۔ لیکن پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ کیا اس نے صرف ایک سطر لکھنے کے لیے اس کا کونا پھاڑ لیا تھا۔ پھر باقی گفٹ پیپر کہاں گیا۔ تحفہ خوب صورتی سے پیک کر کے پیش کیا جائے تو اچھا لگتا ہے۔ پھر اس نے کھلونا پستول کی پیکنگ کیوں کھولی تھی۔ شاید زیبری نے اصرار کیا ہو گا کہ ایسے تحفہ دینے کی اجازت نہیں۔ کسی دن کوئی ٹائم بم گفٹ پیپر میں لپیٹ کر اور سالگرہ مبارک کا کارڈ لگا کے تیمور صاحب کو تھما دے گا اور تیمور صاحب کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات ایک ہی ہو جائے گی۔ آپ اسے کھول کر دکھائیں' قائل ہو کے یا مشتعل ہو کے شبنم نے گفٹ پیپر خود ہی پھاڑ دیا ہوگا۔ جب ضرورت پڑی تو اس نے اسی کاغذ کے ایک کونے کو استعمال کرلیا۔ وہ اپنے بیگ سے کاغذ قلم نکالتی یا زیبری سے مانگتی تو اسے شک ہو جاتا۔ حالانکہ یہ شک پیدا کرنے والی بات بھی نہیں۔ پھر کیا بات تھی؟ خیر ہوگی کوئی فضول سی وجہ۔ لڑکیاں بعض اوقات غیر موجود خطرات اور بے بنیاد اندیشوں کے وہم میں مبتلا ہونا پسند کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ گفٹ پیپر کا باقی حصہ کہاں گیا۔ اگر اس نے احتجاجاً اس کے ٹکڑے کر دیے تھے تو وہ ٹکڑے بھی آفس میں ہی مل جانے چاہئیں۔

تیمور نے اپنے پی آر او کو اور الٰہ دین کو سوتے میں اُٹھوا کے گاڑی میں ڈلوا دیا تھا اور اب برآمدے میں کھڑا ڈرائیور کو ہدایات دے رہا تھا "ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ تو گاڑی سے مت اُتارنا۔ ڈاکٹر سے کہنا کہ باہر آ کے انہیں دیکھ لے۔ کوئی انجکشن وغیرہ دینا ہو تو وہیں لگا دے۔ اور پھر انہیں گھر چھوڑ آنا۔ ڈاکٹر کو بھی سمجھا دینا۔ اور ان کے گھر والوں کو بھی۔"

میں نے زیبری کی ویسٹ پیپر باسکٹ یعنی ردّی کی ٹوکری دیکھی۔ اس میں سگریٹ کے خالی پیکٹ' استعمال شدہ ٹی بیگس اور فالتو کاغذوں کے ساتھ گفٹ پیپر کے ٹکڑے بھی تھے جو زیبری نے خود ہی نیازمندانہ شرافت سے اٹھائے ہوں گے' سامنے شبنم جیسی آفت کی پرکالہ عرف شیطان کی خالہ نازو ادا کی آتش بازی میں مصروف ہو تو زیبری جیسے مرد اس کے قدموں کی خاک بھی اپنی پلکوں سے چن سکتے ہیں اور اس سرمۂ محبوبی کو آنکھوں میں لگا کے خوابِ وصل دیکھنے کی امید بھی کرسکتے ہیں۔

اگر شبنم کو پہلے سے کچھ معلوم ہوتا تو وہ اتنا تردد کیوں کرتی۔ وہ مجھے فون نہیں کرسکتی تھی تو مفصل پیغام دے سکتی تھی۔ یقیناً یہاں پہنچنے کے بعد ہی اسے کوئی ایسی بات معلوم ہوئی تھی جس نے اس کو سرخیٔ لب سے یہ تحریر لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ممکن ہے اسے پہلے سے علم ہی نہ ہو کہ شاہ عالم بنفسِ نفیس یہاں موجود ہے۔ وہ تیمور کے بیٹے کو سالگرہ کا تحفہ دے کر چلی جاتی مگر اس اطلاع پر شبنم کی رگِ صحافت پھڑک اُٹھی اور اس نے اندازے سے یا کسی اور بات سے کوئی نتیجہ اخذ کرلیا۔ دولاکھ سیانا سہی مگر زیبری کے پاس شبنم ایسی عورت کے جادو کی گولی سے بچنے کے لیے کوئی بلٹ پروف دل بہرحال نہیں تھا۔

تیمور پھر آیا تو میں ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی میں محو تھا۔

"یہ اچھا نہیں ہوا شاہ جی!" اس نے صوفے میں دھنس کے کہا۔

میں نے کسی فلاسفی کی طرح کہا "ہمیشہ سب اچھا نہیں ہوتا۔ تم ذرا میری سیاسی بصیرت میں اضافے کے لیے یہ فرماؤ کہ ایسا کیا اہم مسئلہ تھا جس کے لیے مجھے زحمت دی گئی۔ آخر تم سینئر نائب صدر کس لیے ہو۔ شاہ عالم کی عدم موجودگی میں چیئرمین کے سارے اختیارات تمہارے پاس کیوں نہیں ہیں؟"

"میں اس وقت قائم مقام چیئرمین ہوں" تیمور نے کہا "سوائے پارٹی منشور میں ترمیم کے یا خود چیئرمین صاحب کو معزول کرنے کے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"ابھی تو نہیں مگر فرصت ملتے ہی میں وقت ضائع کرنے کے لیے پارٹی کا منشور بھی پڑھوں گا" میں نے کہا۔

"آج ایگزیکٹو باڈی کی ایک اہم میٹنگ ہے۔"

"کیا ایگزیکٹو کمیٹی کی غیر اہم میٹنگ بھی ہوتی ہے۔ ہونی تو چاہیے جس میں لوگ فضول بکواس کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو لطیفے اور اشعار سُنائیں۔ کوئی اچھی کام کی بات کریں۔"

"تمہیں یہ غیر سنجیدہ رویّہ ترک کرنا ہوگا ورنہ لوگوں کو شک ہو جائے گا" تیمور نے کہا۔

"کیا شک ہو جائے گا' یہ کہ شاہ عالم کا دماغ چل گیا ہے!"

"ہاں۔ پارٹی ڈسپلن کوئی کھیل نہیں ہے۔ شاہ عالم صرف اس لیے چیئرمین نہیں ہے کہ اس نے پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ پارٹی کو نیچے سے اوپر تک کنٹرول کرتا ہے۔ وہ کوئی پیر یا روحانی پیشوا نہیں کہ احترام اور عقیدت کے جذبات رکھنے والے اس کے ایک اشارے پر سر کٹانے کو تیار ہو جائیں۔ وہ سیاسی لیڈر ہے۔ قیادت کرتا ہے' کمانڈ کرتا ہے۔ وہ حکم دیتا ہے تو اس یقین کے ساتھ کہ تعمیل ہوگی۔ اس کے پاس اختیار ہی نہیں وہ طاقت بھی ہے جس سے سب ڈرتے ہیں' یہ اس کا خوف ہے اور دہشت ہے جس نے اس کی پوزیشن مستحکم کر دی ہے۔ وہ خود بھی زمانہ شناس ہے اور انسانوں کی پرکھ رکھتا ہے۔ اس کا تجربہ ہے اور مشاہدہ ہے۔ وہ ہر شخص کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہے اور سب کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے کہ کون کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔"

"کیا سوچ رہا ہے؟ کیا وہ ٹیلی پیتھی بھی جانتا ہے؟"

تیمور نے کہا "آدمی اپنی سوچ کا اظہار کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی کے سامنے کر بیٹھتا ہے اور شاہ عالم کی سی آئی ڈی بڑی زبردست ہے۔ کیا یہ کمال کی بات نہیں ہے کہ ایک خفیہ تنظیم ہے جو اسے پل پل کی خبر دیتی ہے مگر اس تنظیم کا وجود ابھی تک ثابت نہیں ہوا۔ یقیناً اس میں خاص خاص لوگ ہوں گے۔ جن پر وہ اعتماد کرتا ہے۔ مگر یہ لوگ کون ہیں اور کتنے ہیں۔ اس کا علم ان لوگوں کو بھی نہیں۔ ہر شخص اسے براہِ راست انفارمیشن دیتا ہے۔ کسی اور کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"ایسی کوئی تنظیم تمہارے وہم کا کرشمہ تو نہیں؟"

وہ تلخی سے مسکرایا "صرف مجھے ہی نہیں' پارٹی کے ہر سینئر رکن کو اس کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ جو بات تجربے سے ثابت ہو اسے واہمہ نہیں سمجھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "کیا تم بھی۔۔۔؟"

اس نے میرا مطلب سمجھ کے کہا "نہیں۔ مگر ایسے تو ہر شخص انکار کرے گا' تم کسی پر بھی بھروسا نہیں کر سکتے۔"

"سبحان اللہ۔ یہ حال ہے اس جماعت کا جس کا نام ہی امن' محبت اور آزادی ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے؟"

"افسوس کی کیا بات ہے اس میں؟" تیمور بولا۔

"یہ ڈکٹیٹر شپ ہے۔ یہ لوگ کس منہ سے جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔"

تیمور ہنسا "جمہوریت۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے بھائی اور کہاں ملتی ہے؟ کورس کی کتابوں اور سیاسی تقریروں میں؟ ہم تو خیر تیسری دنیا کے پسماندہ اور ترقی پذیر اقوام میں شامل ہیں مگر وہ جو چیمپئن بنتے ہیں جمہوری نظام کے۔ ساری دنیا کو جمہوریت کا مطلب سمجھاتے ہیں۔ کیا وہی خدائی فوج دار نہیں بنے ہوئے ہیں' پولیس مین آف دی ورلڈ۔ طاقتور کے لیے بجا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا فلسفہ پہلے بھی رائج تھا' آج بھی ہے۔ کمزور کے مفاد میں ہے کہ وہ طاقتور کی پناہ میں رہے اور اس کی اطاعت کرے۔ عقیدہ ضرور ہے ہمارا کہ رزق دینے والا خدا ہے اور خودی کو کر بلند اتنا والا شعر بھی زبردست ہے مگر کیا ہمارے کسی قائد یا سیاسی لیڈر میں اتنی ہمت ہے کہ امریکی کانگریس کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھ دے کہ۔۔۔ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی' جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ نہیں چاہیے ہمیں امریکی گندم۔ نہیں چاہیے ہمیں امریکی اسلحہ کیونکہ۔۔۔ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

میں نے کہا "پانی پی لو۔ تمہارے جذبات کا ریڈی ایٹر بہت گرم ہو رہا ہے۔"

اس نے انٹر کام اُٹھایا اور اپنے گھر کے کچن میں کسی سے بات کی "کافی بھیجو۔" اس نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا "یہ صرف شاہ عالم کا رویّہ نہیں۔ یہاں تو ہر سیاسی جماعت ایک آدمی کے نام پر چل رہی ہے۔ اس کی ذاتی دکان ہے جسے وہ خود چلاتا ہے۔ سارے نامزد عہدے ہوتے ہیں۔ کسی جماعت میں صدر کا انتخاب اکثریت کے ووٹوں کی بنیاد پر آج تک نہیں ہوا۔ یہاں بھی ون مین شو ہے۔ رفتہ رفتہ سب نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ شاہ عالم ان سے زبردست ہے۔ اگر شاہ عالم ہے تو وہ ہیں اور جماعت کا وجود ہے۔ ورنہ کچھ نہیں۔"

میں نے افسوس میں سر ہلایا "چنانچہ بغاوت اور سرکشی کا

خیال کبھی کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔"

"ارے بھائی' جما جمایا چلتا ہوا کاروبار ہے۔ کیا اتنا آسان ہے اس پر قبضہ کرنا۔ کسی نے غلط فہمی کے باعث یا کسی کے اُکسانے پر سوچا کہ میں چیئرمین ہو جاؤں تو وہ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ آج انہیں کوئی جانتا نہیں' ان کی سیاسی موت واقع ہو گئی۔"

میں نے کہا "صرف سیاسی موت!"

تیمور نے سپاٹ لہجے میں ٹھہر ٹھہر کے کہا "کسی کی طبعی موت کا ذمّے دار شاہ عالم کو کبھی نہیں سمجھا گیا۔ لیکن یہ جو ملک عمر دراز ہے' لگتا ہے اس کی عمر کچھ مختصر ہوگی۔"

میں نے کہا "کون عمر دراز؟"

"ملک عمر دراز قصوری جو سابق سینئر نائب صدر تھا' مجھ سے پہلے۔"

اچانک مجھے کچھ یاد آیا "آج۔۔۔ اسی کا جلسہ ہے؟"

"ہاں۔ تم نے شبنم کے سامنے ایسی سیاسی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ میں تو سر پیٹ کے رہ گیا۔ آخر کون سی دنیا میں رہتے ہو تم۔ سارے شہر میں اس کے پوسٹر اور بینر نظر آ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اب تک میں صرف فلمی پوسٹر دیکھتا تھا اور دیواروں پر بھی حکیموں یا نجومیوں کے اشتہار دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ لیکن نام سے مجھے یاد آ گیا کہ موچی دروازے کے باہر کوئی عظیم الشان تاریخی جلسۂ عام ہے۔"

تیمور مسکرایا "عظیم الشان تو خیر پہلے بھی ہوتا تھا مگر آج کل ہر سیاسی جلسہ اور جلوس تاریخی بھی ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کو پہلے ہی بتا دیا جاتا ہے اور بعد میں ثابت بھی کر دیا جاتا ہے پریس ریلیز کے اعداد و شمار سے۔"

"یعنی ملک عمر دراز باغی ہے جس کی سیاسی موت واقع نہیں ہوئی' یہ تو خطرناک بات ہے۔"

"آج ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس اسی مسئلے پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا ہے۔ زبان دراز ملک عمر دراز کی رسّی بھی اتنی ہی دراز ہو گئی ہے۔ شاہ عالم نے خود ڈھیل دی پہلے کہ اپنا آدمی ہے۔ سمجھانے سے راہِ راست پر آ جائے گا مگر اسے شہ دینے والے دوسرے لوگ ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"جو چاہتے ہیں کہ آئندہ انتخابات سے پہلے ہمارا بھی کوئی فارورڈ گروپ بن جائے' پارٹی کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ آئندہ انتخابات میں ہم قطعی اکثریت حاصل نہیں کر سکتے مگر ہماری پوزیشن اتنی مضبوط ضرور ہوگی کہ کوئی بھی ہماری حمایت کے بغیر حکومت تشکیل دے ہی نہیں سکتا اگر اس سے پہلے ہی ووٹ تقسیم ہو گئے تو فائدہ دوسروں کو ہوگا۔"

"کیا یہ بات عمر دراز نہیں سمجھتا؟"

"بہت اچھی طرح۔ اسے اپنی قدر و قیمت کا پورا اندازہ تھا۔ اس نے تو فقط نہ تیو اُدھار کے فارمولے پر عمل کیا ہے کہ کل کا کیا بھروسا۔ شاہ عالم اسے کوئی فضول سی وزارت پکڑا دے۔ ماحولیات یا اقلیتی امور کی۔ وہ پارٹی کا اہم ستون تھا۔ اسے ہلانا آسان نہیں تھا لیکن پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ جب اُمید نظر آئی تو کوشش کرنے والوں نے طاقت بڑھا دی اور اس وقت تک بڑھاتے رہے جب تک عمر دراز کو احساس نہیں ہو گیا کہ اتنا تو اسے شاہ عالم بھی نہیں دے سکتا خواہ اسے صنعت و تجارت کی وزارت دے دی جائے یا تعمیرات و ترقی کی۔ ہمارے پاس تمام تفصیلات ہیں۔"

"ملک عمر دراز کو بلیک میل کرنے کی حکمتِ عملی پر غور کیا جائے گا آج کے اجلاس میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "جو شخص بانی ارکان میں سے ہو اور پھر ترقی کرتے کرتے سینئر نائب صدر کے عہدے تک پہنچ جائے۔ وہ بلیک میل کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ آج کے جلسے سے پہلے بھی وہ بہت کچھ بولتا رہا ہے مگر آج وہ سنسنی خیز انکشافات کا ایٹم بم گرانے والا ہے۔ ہر ایرے غیرے کو اتنی اہمیت نہیں ملتی' عمر دراز کے پاس بھی کچھ تھا بلکہ بہت کچھ ہے۔"

میں نے کہا "کیا اسے واپس خریدنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی؟"

"ہمارے مقابلے پر ایک پورا کنسورشیم تھا۔ یوں سمجھ لو کہ ایک طرف بولی دینے والی کوئی پاکستانی فرم ہو اور اس کے سامنے ملٹی نیشنل کمپنیاں آپس میں اتحاد کر لیں۔ تو مقابلہ کیسا۔۔۔ ہم صرف وعدے کر سکتے تھے۔"

"اور اسے وعدہ پر اعتبار نہیں ہوگا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔"

"یہی سمجھ لو" تیمور نے سوچ کے کہا "دراصل شاہ عالم کے رویے کی تبدیلی سے کچھ لوگوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سب پُرانے کارکن تھے۔ مخلص اور جذباتی لوگ۔ انہی کی جدوجہد اور قربانیوں سے پارٹی بنی اور شاہ عالم لیڈر بنا۔ اسے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی' اس ملک میں بلکہ اس برصغیر میں اور کسی حد تک تمام ترقی پذیر اور غربت زدہ ملکوں میں جہاں تعلیم کا تناسب کم ہے' شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا ایک پیٹنٹ نسخہ ہے جو سب استعمال کرتے ہیں۔ مقصد سب کا ایک ہی ہوتا ہے کہ آج جو اقتدار کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اسے ہٹا کے خود اس پر قابض ہو جاؤ۔ غلط کام تو ہر حکومت کرتی ہے۔"

میں نے کہا "شاید حکومت کا کام ہی غلط کام کرنا ہے۔"

"اسے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ تو ایک دلدل ہے۔ اس میں اتر جانے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کے ہاتھ صاف رہیں اور دامن پر داغ نہ آئے۔ کسی بھی حکومت کے خلاف تحریک شروع کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے سرمایہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ میں میدانِ سیاست کا اچھا شہسوار بننے کی بنیادی صلاحیت

ہے تو سرمایہ کاری کرنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ سرمایہ باہر سے بھی فراہم ہوجاتا ہے۔ سرمایہ ہو تو کارکن بہت۔ آپ کسی غیر متنازع مسئلے پر تنازعہ کھڑا کریں۔ اسے اصولی اختلاف یا قومی مفاد کا نام دے کر بولنا شروع کریں۔ اسمبلی میں' پریس کانفرنس میں' جلسے جلوسوں میں' حکومت کی مشینری فوراً حرکت میں آجائے گی اور کوشش کی جائے گی آپ کا منہ بند کرنے کی۔ سودے بازی ہوگی' تک مکا کے لیے۔ اس مرحلے پر آپ نے انکار کردیا تو اگلا مرحلہ صبر آزما ہوگا۔ آپ کے خلاف مقدمات قائم ہوں گے۔ آپ کے اہلِ خانہ کو ہراساں کیا جائے گا۔ کسی کی بھینس یا کانسٹیبل کی ٹوپی چرانے سے قتل تک کے مقدمات کا سامنا خود لیڈر بننے والے کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک ہی ضمانت ہونے سے پہلے دس مقدمے اور قائم کردیے جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر کارکن آگے آتے ہیں۔ مظاہرے' دھرنے' بھوک ہڑتالی کیمپ اور احتجاجی مارچ۔ یہ سب رائے عامہ کو متوجہ کرنے والے ذرائع بڑے شہروں میں ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ وہاں اخبارات زیادہ ہیں اور غیر ملکی نمائندے بھی فوراً پہنچ جاتے ہیں۔ کراچی' لاہور' اسلام آباد میں اور پشاور' کوئٹہ میں۔ جب پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے تو اگلا مرحلہ ہے تشہیر کا۔ پندرہ بیس لڑکے رات کو رنگ اور برش لے کر نکلیں اور شہر میں جو صاف جگہ ملے اسے نعروں سے بھر کے خراب کردیں۔ نعرے سب پرانے ہیں۔ فلاں کتا ہائے ہائے' فلاں قاتل کو پھانسی دو۔ فلاں کو چھوڑ دو۔ جواب دو حساب دو۔ اس وقت کوئی اخبار ہو جو آپ کے بیانات کی شہ سرخی بنائے۔ پولیس کے مظالم کی منہ بولتی تصویریں لگائے۔ دو چار کالم لکھنے والے ہوں جو حکومت کے خوب لتے لیں۔"

میں نے کہا "غلط وقت پر چلائی جانے والی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی خواہ یہ فارمولا کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو۔"

"بالکل ٹھیک۔ صحیح وقت کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ ہر بار انتخابات کے بعد جو حکومت آتی ہے وہ کچھ دن خاصی اُٹھا پٹخ کرتی ہے۔ بیوروکریسی کے بدعنوان عناصر کا اکھاڑ پچھاڑ۔ پچھلی حکومتوں کی بداعمالیوں کی اصلاح اور احتساب کے دل خوش کرنے والے اعلانات۔ جب حکومت کے قدم جم جاتے ہیں تو سب کچھ خاموشی سے پھر ویسا ہی ہوجاتا ہے جیسا کہ تھا۔ زید کی جگہ عمر اور عمر کی جگہ بکر کے آنے سے فرق بھی کیا پڑ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کچھ عرصے بعد ووٹ دینے والوں کو احساس ہونے لگتا ہے کہ انہیں پھر بے وقوف بنایا گیا۔ سب کچھ تو وہی ہے ویسا ہی ہے اور وہیں ہے' وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ لاقانونیت۔ پولیس کے مظالم' رشوت اور بدعنوانی' منافقت اور بے ضمیری۔ سب پہلے سے بڑھ گئے ہیں۔ عوام کی فرسٹریشن بڑھ جاتی ہے۔ مایوسی' ناکامی اور بے بسی کے جذبات کسی خاموش آتش فشاں کے لاوے کی طرح پکنے لگتے ہیں۔ ایسے میں کوئی مداری اپنی ڈگڈگی لے کر آجائے اور اپنا کھیل شروع کردے تو وہ کامیاب۔"

"شاہ عالم نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟"

"ہاں۔ اور بڑے زور شور سے کیا تھا۔ اس کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ کارکن اکٹھے کرسکے۔ ہر شہر میں اس کے بچے جمورے تھے۔ وہ نعرے لگاتے تھے' پکڑے جاتے تھے تو حوالات میں جوتے کھاتے تھے۔ جھوٹے مقدمات میں جیل جاتے تھے' جلسے جلوس میں پٹتے تھے اور لاٹھی چارج میں ہڈیاں تڑواتے تھے۔ شاہ عالم کیا کرتا تھا۔ صرف ہدایات جاری کرتا تھا۔ یہ بتاتا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد کیا کرنا ہوگا۔ کارکنوں کو شاباش دیتا تھا۔ ان کی ضمانت کراتا تھا۔ رشوت دے کر پولیس کے تشدد سے بچاتا تھا۔ ان کے گھر جاتا تھا۔ عیادت یا تعزیت کے لیے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا تھا۔ جو جیل جاتے تھے ان کے بیوی بچوں کو اس سے دگنی رقم دیتا تھا جو وہ کماتے تھے۔ مرجانے والے "شہید" کارکنوں کے لواحقین بھوکے نہیں مرتے تھے۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر وہ ان کے بیٹوں کو ملازمت دلادیتا تھا یا ان کا وظیفہ مقرر کردیتا تھا۔ یہ سب اخباروں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کی خوب پبلسٹی ہوتی تھی اور جذباتی کارکن سمجھتے تھے کہ شاہ عالم دردمند دل رکھنے والا انسان ہے۔ وہ انہی میں سے ہے۔ ان کے مسائل اور دکھ درد کو سمجھتا ہے۔ اس کا امیج ایسا بنایا گیا جیسے اس قوم کو بالآخر قائداعظم اور قائدِ ملت جیسا ہی ایک لیڈر مل گیا ہے۔ وہ نجات دہندہ آگیا ہے جو مشکلات کے طوفان میں گھری قوم کے سفینے کو ساحلِ مراد تک لے جائے گا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا؟

"کیا ہوا؟" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"وہی جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ شاہ عالم کامیابی کی منزل کے قریب پہنچا تو پرانے' قربانیاں دینے اور مصائب جھیلنے والے کارکنوں کو پیچھے دھکیل کر ہار پہنانے دوسرے لوگ آگئے۔ زمیندار' وڈیرے' تاجر' صنعت کار' بدعنوان بیوروکریٹس۔ جو اسے مستقبل کے حکمران کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ ان کے پاس خاص سمجھ بوجھ ہوتی ہے' ایسے لوگوں کی شناخت کے لیے۔ شاہ عالم نے بھی بہت محنت کی تھی۔ اپنا بہت پیسہ خرچ کیا تھا بے وقوف اور غریب کارکنوں سے تحریک چلوانے پر اور اپنی پبلسٹی پر۔ اسے سب وصول کرنا تھا۔ اصل سے دس گنا یا سوگنا نہیں' ہزار گنا۔ کیونکہ جنہوں نے اس کے لیے سرمایہ کاری کی تھی۔ وہ بھی تو امیدوار تھے کہ اختیار شاہ عالم کے ہاتھ میں ہو تو وہ بھی اپنی خدمات کا معاوضہ وصول کریں۔ کارکن اسے کیا دیتے' وہ تو ہاتھ پھیلا کے کھڑے ہوجاتے کہ اب اپنے وعدے کے مطابق ہماری جھولی بھردو۔ ہمیں نوکری دو۔ انصاف دو' تنخواہ بڑھاؤ۔ مہنگائی کم کرو' رشوت ختم کرو۔ ہمارے سب مسئلے حل کرو۔ کون کرسکتا ہے یہ کام؟ الٰہ دین کے چراغ کا جن بھی ہو تو بھاگ جائے۔"

"چراغ لے کر بھاگ جائے یا الٰہ دین کے جھانپڑ مار کے" میں نے اس سے اتفاق کیا "اس نظام کو اب کون بدل سکتا ہے۔ پیغمبری اور معجزات کا دور گزر گیا۔ اب تو قطب اور ولی تک نہیں پیدا ہورہے۔"

"نتیجہ پھر وہی۔ پرانے کارکن نظرانداز کیے گئے۔ انہیں پیچھے دھکیل دیا گیا۔ بھلا دیا گیا۔ وہ بددل اور مایوس ہوکے چلّانے لگے تو ان کی فریاد کو بغاوت اور سرکشی کا نام دیا گیا اور ان کی بنیادی رکنیت تک منسوخ کردی گئی۔ وفاداری اور خلوص کے معنی بدل گئے۔ اب وہ جن کے پاس شاہ عالم کو دینے کے لیے کچھ تھا۔ جن کے پاس وسائل تھے یا اختیارات تھے' پارٹی کے عہدے دار ہوگئے اور انہوں نے اپنی مرضی سے نئے ممبر بنائے' منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔ یہ شعر پڑھ کے آٹھ آٹھ آنسو بہانے والے تمہیں بہت ملیں گے جن کو آج کوئی جانتا بھی نہیں۔"

"شاہ عالم کے ساتھ اب کوئی پرانا ساتھی نہیں؟"

"پرانے بس وہی ہیں جو پیدائشی طور پر لیس مین ہیں۔ جی حضوری کرنے والے چمچے۔ ان کو تم بے صلاحیت' کم ہمت یا بے غیرت' جو چاہو سمجھو۔"

"اپنے منہ سے تم اپنی تعریف کررہے ہو؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اور کیا کروں میں۔ سب کا انجام دیکھ کے بھی عبرت نہ پکڑوں۔ صبر کا میٹھا پھل دوسروں کو کھانے دوں۔"

"تمہارے سامنے عمر دراز کی مثال ہے۔"

"تقدیر ہر ایک پر اتنی مہربان نہیں ہوتی" وہ بولا "کچھ لوگ کامیابی کی پہلی ہی سیڑھی پر لڑکھڑا جاتے ہیں۔ کچھ اوپر جاکے پھسل جاتے ہیں۔ یا گرادیے جاتے ہیں۔ عمر دراز بہت خوش قسمت تھا کہ اتنا اوپر چلا گیا۔ لیکن کامیابی کی آخری سیڑھی پر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ابھی شاہ عالم ٹاپ پر ہے اور ٹاپ پر ایک ہی شخص رہ سکتا ہے۔ دو کی جگہ ٹاپ پر نہیں ہوتی۔"

"پھر اب شاہ عالم کیا کرے گا؟ اسے دھکا دے کر نیچے گرادے گا' خود شرافت سے اس کے لیے جگہ خالی کردے گا؟"

"شرافت کا لفظ سیاست کی لغت میں شاید غیر ضروری ہے" تیمور نے کہا "شاہ عالم وہ مداری ہے جو سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں ہر روز نیا جادو کا کھیل دکھا سکتا ہے۔"

"اور اگر لیپ کا سال ہو..... پھر؟"

وہ ہنسا "تین سو چھیاسٹھواں شعبدہ ان سب کی اُمیدوں کو خاک میں ملادے گا جنہوں نے عمر دراز کو بانس پر چڑھایا اور اتنی بلندی تک پہنچادیا۔ وہ شاہ عالم سے بڑے مداری نہیں ہیں۔ سب منہ دیکھتے رہ جائیں گے تمہارے فیصلے کے بعد۔"

"میرا فیصلہ؟ میں نے کون سا فیصلہ کیا ہے جس کا خود مجھے علم نہیں۔"

"ہم ملک عمر دراز کو پورے عزت و احترام کے ساتھ واپس

aazzamm@yahoo.com

لے آئیں گے' اسے وہ سب کچھ دیں گے جس کا وہ متمنی ہے۔"
"مگر کیسے؟"
"شاہ عالم کا قول ہے۔ جو ایک بار بک سکتا ہے وہ پھر خریدا جاسکتا ہے۔ مٹی سونا' کوٹھی کوٹھری' عورت مرد۔ ان کی عزت اور ایمان۔ سب کچھ بک سکتا ہے۔ بات صرف قوتِ خرید کی ہے۔ کون کتنی قیمت لگا سکتا ہے۔"
میں نے کہا "چنانچہ؟"
"چنانچہ آج ہم اتفاقِ رائے سے ایک قرارداد پاس کریں گے۔ کریں گے کیا' کرچکے ہیں۔" تیمور بولا "میں ابھی تمہاری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"
"کسی اجلاس کے بغیر۔ میں نے تو سُنا تھا کہ ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوگا۔"
"تم سمجھ لو کہ ہوگیا۔ شاہ عالم نے قرارداد کا مسودہ بھیج دیا۔ باقی سب نے اس پر دستخط کردیے۔ اس سے زیادہ ان کا کام بھی نہیں۔ تم کو یعنی شاہ عالم کو باضابطہ طور پر یہ اختیار دیا گیا ہے کہ تم عمر دراز سے ذاتی طور پر مل کے اس کی ناراضگی دور کرو۔ ہر غلط فہمی رفع کرو اور پھر اسے پارٹی کے صدر کا عہدہ پیش کرو۔"
"صدر کا عہدہ؟" میں اچھل پڑا "شاہ عالم کی جگہ؟"
"شاہ عالم چیئرمین ہے۔ صدر کا عہدہ ابھی تک نہیں تھا۔ ایگزیکٹو کمیٹی نے اس عہدے کی منظوری بھی دی ہے۔ ملک عمر دراز صدر ہوگیا تو میں اس کا ماتحت رہ جاؤں گا۔ میری پوزیشن نمبر تین ہوگی۔"
"تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ سب اس نے محض پارٹی کا صدر کہلانے کے لیے کیا تھا؟ اور اس پیش کش کے بعد وہ اباؤٹ ٹرن ہوجائے گا۔ اُلٹے قدموں واپسی کے لیے رضامند ہو کے آج ہی لوٹ آئے گا۔ آج وہ کسی جلسے سے خطاب نہیں کرے گا' کوئی انکشاف نہیں کرے گا؟"
"ہم اسے جلسے سے پہلے ہی یہ پیش کش پہنچادیں گے۔ جلسہ شروع ہونے میں تو ابھی پانچ گھنٹے باقی ہیں۔"
"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ تم سے ملنا بھی پسند نہیں کرے گا۔"
"بالکل ٹھیک۔ اس نے مجھ سے یا کسی اور سے ملنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ مگر وہ تم سے ملنے کے لیے تیار ہے۔ مسٹر شاہ عالم' جانتے ہو کیوں؟ تاکہ وہ انکار کرکے تمہاری مزید تذلیل کرسکے۔ اور پھر تم سے ملاقات اور تمہاری پیش کش کا ذکر آج کی تقریر میں کرے۔ فخر سے اعلان کرسکے کہ اس کے ضمیر کو خریدنے والے کیا قیمت لگا رہے تھے مگر اس نے اصول پر قائم رہتے ہوئے ان کی رشوت کو حقارت سے ٹھوکر ماردی۔ عمر دراز کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں خرید سکتی' تالیاں۔۔۔"
میں نے کہا "سری۔ پھر اس کوشش کا فائدہ؟"

اس نے کہا "تم قرارداد ملاحظہ کرو۔ دشمنی کے باوجود سیاست میں وضع داری کا ایک ضابطۂ اخلاق ہے۔ عمر دراز ایک بجے اپنے آفس میں تمہارا استقبال خود کرے گا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ اسے وہ اپنی کتنی بڑی فتح سمجھ رہا ہوگا۔ خوشی سے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر ہوگا کہ اس کی چالوں نے شاہ عالم کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ خود چل کے اس کے در تک آنے پر مجبور کردیا۔ کہاں وہ وقت کہ شاہ عالم کے حکم پر سر کے بل حاضر ہونا پڑتا تھا' کہاں یہ وقت کہ شاہ عالم نے درخواست کرکے ملاقات کا وقت لیا ہے۔ اس جلسے کے اعلان نے تو اس کی راتوں کی نیند حرام کردی ہوگی۔"
"اس کا ایسا سوچنا غلط بھی نہیں۔"
تیمور نے قہقہہ مارا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ وہ عیش کرتا پھر رہا ہے باہر۔"
"اتنا بھروسا ہے اسے۔۔۔ کہ یہ چال کامیاب رہے گی؟"
"نتیجہ آج ہی تمہارے سامنے آجائے گا۔"
میں نے قرارداد کو پڑھا۔ اس میں سب وہی تھا جو تیمور نے مجھے بتایا تھا۔ یہ پارٹی کے مرکزی سیکریٹریٹ کا لیٹرہیڈ تھا جس پر' سینئر نائب صدر' دو نائب صدور اور سیکریٹری جنرل کے علاوہ بھی ایک درجن افراد کے نام تھے جنھوں نے قرارداد کی اتفاقِ رائے سے توثیق کی تھی۔
"اوکے۔ میں ملک عمر دراز سے مل کر اسے قائل کرتا ہوں۔ حالانکہ مجھے اس رُسوا کن مشن میں کامیابی کی اُمید نظر نہیں آتی۔"
"وہ تمہارے ساتھ بدتمیزی نہیں کرے گا۔ اپنے آفس میں اس کے ساتھ چند قریبی ساتھی ہوں گے۔ اس کا اسٹاف ہوگا' اخبار والا کوئی نہیں ہوگا۔"
"اور میں اکیلا جاؤں گا' تم کو بھی میرے ساتھ چلنا چاہیے۔"
"مشکل یہ ہے" تیمور نے خفت سے کہا "وہ حرام زادہ میری صورت سے الرجک ہے۔ تم دیکھ لینا' وہ مطالبہ کرے گا کہ امیر تیمور کی چھٹی کرو پہلے' پھر میں صدر بننے کے امکانات پر غور کروں گا۔ میں ساتھ گیا تو تم کو بھی دروازے سے ہی لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن تمہارے ساتھ دو عہدے دار جائیں گے۔ ایک نائب صدر وکیل قریشی اور جنرل سیکریٹری صاحب داد خاں۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"
"محافظ باڈی گارڈ کوئی نہیں؟"
"نہیں۔ سب غیر مسلح ہوں گے۔ ملاقات صرف تمہارے اور عمر دراز کے درمیان ہوگی۔ بند کمرے میں۔ شاید اس کی سیکریٹری موجود ہوگی۔"
"پھر میں بھی اپنی سیکریٹری کو ساتھ لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہاری سیکریٹری؟"
"میں نے تم سے کہا تھا کہ پرسنل اسٹاف میرا اپنا ہوگا۔"
تیمور نے سہلایا "یعنی تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ تمہاری جگہ میں ایسی حماقت نہ کرتا۔"
"مگر تم میری جگہ نہیں ہو۔"
"بڑا رسک ہے اس میں' ایک ایسی لڑکی۔۔۔"
میں نے کہا "تم اپنی رائے کو محفوظ رکھو۔ رسک اگر میرے لیے نہیں ہے تو چندا کے لیے کیوں ہے؟"
"جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن اب وقت کہاں ہے؟"
"یہاں سے ملک عمر دراز کا آفس کتنی دور ہوگا؟" میں نے کہا۔
"دس منٹ میں پہنچ جاؤ گے تم۔"
میں نے کہا "تو ٹھیک آدھے گھنٹے میں واپس آجاؤں گا میں' اپنی سیکریٹری کے ساتھ۔ اتنی دیر میں وہ بھی پہنچ جائیں گے۔ نائب صدر اور جنرل سیکریٹری۔"
تیمور اس فیصلے سے خوش نہیں تھا مگر وہ مجبور تھا۔ اس کے کہنے پر میں سیاہ شیشوں والی ایک وائٹ کرولا میں پھر رہا تھا جو ہے کا ماڈل تھی اور اتنی عام تھی کہ خاص لوگ اس میں بیٹھنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ عام آدمی کے لیے یہ شاندار گاڑی تھی جسے وہ حسرت سے دیکھنا بھی لاحاصل سمجھتا تھا۔ میری سہولت کے لیے اس میں موبائل فون نصب کرادیا گیا تھا اور فی الحال میں خود ہی اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔
گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے چندا کو فون کیا حالانکہ مجھے شک تھا کہ میرا یہ فون ٹیپ نہ کیا جارہا ہو۔ اس کے ریسیور اُٹھاتے ہی میں نے بہ آوازِ بلند کہا "لاحول ولا قوۃ۔۔۔"
اس نے کہا "کیا آئینے میں اپنی صورت نظر آرہی ہے؟"
"ہاں۔ مگر لعنت بھیج رہا ہوں اپنی عقل پہ۔۔۔"
وہ ہنسی "جو چیز خدا نے نہیں دی تمہیں اس پر لاحول پڑھنے سے کیا حاصل۔"
"یہ عشق چیز ہی ایسی ہے مس چندا۔ بندے کی مت ماری جاتی ہے۔ کوہِ قاف کی چار پریاں بیک وقت نکاح میں آنے کے لیے مقابلۂ حُسن کرانے پر تیار ہیں مگر دل آجاتا ہے کسی بھتنی یا چڑیل پر۔ تم تو جانتی ہو مجھ پر فریفتہ ہونے والی حسینانِ عالم کی فہرست میں کیسے کیسے نام ہیں۔"
"ہاں۔ ایک تو ہر جمعرات کی شام آتی تھی۔ وے سوہنے باؤ' صدقے تیری جوانی دے' اک روپیا دے دے" اس نے ایک ڈراؤنی شکل والی فقیرنی کی نقل اُتاری "اور ایک جسے تم نے سڑک پر کتنی شرافت سے سلام کیا تھا اور اس نے جھاڑو سے صدقہ اُتارا تھا تمہارا۔۔۔ اور وہ بارہ چھٹانک کے شوہر والی بارہ من کی دھوبن' بھاتاں۔۔۔ کیسی دردناک نظروں سے تکتی رہتی تھی تمہیں۔ کہتی تھی کہ جی بس چار ٹانگیں ہوتیں اور دو کان۔ تو بالکل مرنے والے کی صورت ہے۔ وہ بھی جوانی میں ایسا ہی تھا۔ تیس سال گاڑی کھینچی۔"
میں نے خفگی سے کہا "جھوٹا قصہ سنانے سے بہتر یہ ہے کہ تم مجھے براہِ راست یہ اطلاع دو کہ ہمارے بچّوں کو لوگ گدھے کے بچے کہیں گے۔"
"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ انسان کے بچے بن جاؤ' ابھی وقت ہے۔"
میں نے کہا "وقت بہت کم ہے۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ تم تیار ہوجاؤ ساڑھے دو منٹ میں۔ ورنہ جس حالت میں ملوگی گاڑی میں ڈال کے لے آؤں گا۔"
"میں چاول اور مسور کی دال پکا رہی تھی۔"
"مسور کی دال؟" میں نے چلّا کے کہا "پھر وہی مسور کی دال۔ منہ دیکھا ہے تم نے میرا۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ کسی دن میں تمہارے کچن کی ہنڈیا سے ہنڈیا بجادوں گا۔ ابھی تو مجھے فرصت نہیں۔ اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت بھی ہے۔ تم اب سوا دو منٹ میں اپنے پونے سولہ سنگھار کرکے تیار ہوجاؤ' میں پہنچ رہا ہوں۔"
"جانا کہاں ہے' یہ تو بتادو" اس نے کہا۔
"تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "ابھی تو خیر کام سے جاؤ گی لیکن چندا' بالآخر تم کو اس گھر سے میرے ساتھ جانا ہوگا اور میں چاہتا ہوں کہ ابھی وقت ہے' تم انتخاب کرلو' میں یا مسور کی دال۔"
"ہزار بار تو بتاچکی ہوں کہ مسور کی دال" وہ بولی "کھانی پڑے گی دن میں تین بار پکے گی ناشتے میں' دوپہر اور رات کے کھانے میں۔"
"تین دن کیوں' مسلسل چالیس دن پکاؤ' میرے چہلم تک۔"
میں نے کہا اور فون بند کردیا مگر ابھی میرا غصّہ کم نہیں ہوا تھا۔ میں نے پھر نمبر ملایا اور چلّا کے کہا "اپنے باپ سے کہنا کہ بارات اور ولیمے کے کھانے میں مسور کی دال پکوا لے۔ ڈوب مروں گا میں کسی دیگ میں۔ پھر دال میں کالا ہے کے بجائے محاورہ ہوگا دال میں دولہا ہے" میرے ریسیور رکھنے سے پہلے خان جی کی آواز سُنائی دی "آپ نے کس نمبر پر ڈائل کیا ہے؟"
میرا دل بیٹھ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ خان جی نے میری آواز پہچانی نہ ہو۔
وقت بہت کم تھا۔ کرنل خان نے قرارداد کا مسودہ پڑھا۔ شبنم کی دی ہوئی وارننگ دیکھی اور پھر میری بات پر غور کیا۔
"یہ دستخط تم نے کیے ہیں' چیئرمین صاحب!"
میں نے نفی میں سر ہلایا "قرارداد شاہ عالم نے بھیجی ہے۔ اس کا مضمون خود اسی نے باہر سے کمپوز کرایا ہوگا۔ باقی سب نے یہاں

آنکھیں بند کر کے دستخط کیے ہیں جو ان کا کام ہے۔"
"شاہ عالم نے تمھیں کہاں سے فون کیا تھا؟"
میں نے سر کھجا کے کہا "یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گیا تھا۔ تیمور کو معلوم ہوگا۔"
"کیا وہ اس وقت اسی شہر میں موجود نہیں ہو سکتا؟"
"آپ کنفیوژن مت پھیلائیں۔ وہ خود یہاں ہوتا تو مجھے کیوں بھیجتا ملک عمرو راز سے ملنے کے لیے۔"
"تیمور کو فون کر کے پوچھو کہ شاہ عالم اس وقت کہاں مل سکتا ہے۔ اس کا فون نمبر معلوم کرو" کرنل خان نے کہا۔
میں نے تیمور کا نمبر ملایا "تیمور۔۔۔!"
"شاہ جی۔ آپ کہاں ہیں؟ یہ لوگ آپ کے منتظر ہیں۔"
میں نے کہا "تو انھیں انتظار کرنے دو۔ دس منٹ کی تاخیر سے آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ مجھے شاہ عالم کا نمبر چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔"
"میں۔۔۔ میں کیا بتاؤں شاہ جی، مجھے تو معلوم نہیں۔"
"تمھیں معلوم ہے" میں نے کہا "آخر تم ہی اسے مذاکرات کے کامیاب ہونے یا ناکام ہونے کی اطلاع دو گے۔"
"وہ خود فون کرے گا۔"
میں نے کہا "تیمور۔ مجھے شک ہے کہ اس نے باہر سے فون نہیں کیا تھا۔۔۔ وہ یہیں موجود ہے۔ اور جب تک میرا شک رفع نہیں ہوگا میں نہیں آؤں گا۔"
چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "اچھا۔۔۔ میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ شاید زبیری نے نوٹ کیا ہو؟"
ایک منٹ تک میں نے ہولڈ کیا پھر تیمور نے مجھے ہانگ کانگ کا ایک نمبر دیا "یہ ہوٹل ہے کوئی۔ روم نمبر آپریٹر ملا دے گا۔"
"جو فون اس کار میں ہے۔ کیا وہ آئی ایس ڈی ہے؟"
"انٹرنیشنل کال تم ڈائریکٹ ڈائلنگ سے کر سکتے ہو" وہ بولا۔
"اس کو آئی ایس ڈی کہتے ہیں۔" میں نے کہا اور فون بند کر کے باہر گیا۔ اپنی کار کے فون کا ریسیور اٹھا کے میں نے تیمور کا دیا ہوا نمبر ملایا۔
"مجھے مسٹر شاہ عالم سے بات کرنا ہے۔"
"یس سر۔" آپریٹر نے کہا "یور گڈ نیم پلیز!"
"تیمور۔۔۔ فرام پاکستان" میں نے کہا۔
آپریٹر نے کچھ دیر بعد کہا "میرا خیال ہے کہ وہ کمرے میں موجود نہیں۔"
"کیا آج تم نے ان کو دیکھا ہے؟"
"اوہ یس۔ ممکن ہے وہ ڈائننگ ہال میں ہوں۔ دس منٹ پہلے وہ میرے سامنے سے گزرے تھے۔ ایک بہت حسین خاتون کے ساتھ۔ جو ان کی بیوی ہیں۔"
"تم ان کو ڈائننگ ہال میں تلاش کرنے کے لیے کسی کو بھیج سکتی ہو، دس از سو ارجنٹ۔"
"میں کوشش کرتی ہوں سر، آپ ہولڈ کریں۔"
میں انتظار کرتا رہا۔ غالباً آپریٹر نے بٹلر کو بلایا ہوگا۔ اس نے مارکر سے ایک گتے پر لکھا ہوگا "مسٹر شاہ عالم" اور یہ کارڈ کسی ڈنڈے پر لگا کے ڈائننگ ہال میں گیا ہوگا "ٹیلی فون کال فار مسٹر شاہ عالم پلیز" اس نے ہر میز کے قریب سے گزرتے ہوئے اعلان کیا ہوگا۔ اگر شاہ عالم وہاں ہوگا تو فوراً متوجہ ہوگا۔ کارڈلیس فون بٹلر کے ہاتھ میں ہوگا۔ جو بھی ہاتھ بڑھائے گا اسے تھما دے گا۔
بار بار گھڑی دیکھنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مجھے پانچ منٹ انتظار کرنا تھا۔ بالآخر شاہ عالم نے کہا "ہیلو۔"
"تم شاہ عالم بول رہے ہو؟" میں نے کہا۔
اس نے میری آواز پہچان لی "تم۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟"
"ابھی تک تو ہے۔ تم کب آ رہے ہو؟"
"اس وقت ہانگ کانگ کے چار بزنس مین میرے ساتھ تھے" وہ بدمزگی سے بولا "اور وہ عام لوگ نہیں ہیں، بزنس میگنٹ ہیں، تائی کون، صرف یہ پوچھنے کے لیے تم نے مجھے ڈسٹرب کیا؟"
"کیا ان کے ساتھ بھی ان کی بے حد حسین بیویاں ہیں، جیسے تمھارے ساتھ ہے۔"
"فضول باتیں مت کرو۔ تم وہاں گئے نہیں؟"
"بس میں جا رہا ہوں۔ تم نے بتایا نہیں کہ کب واپسی کا ارادہ ہے۔"
"کل یا پرسوں۔۔۔ پرابلم کیا ہے آخر؟"
"پرابلم ہے۔۔۔ رخشی۔۔۔ تمھاری بیوی۔ اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ میں اس کا شوہر نہیں ہوں۔"
اس نے برہمی سے کہا "کیا ضرورت ہے تمھیں میرے گھر جانے کی۔ میں ہفتے میں ایک بار جاتا تھا۔"
"پھر کوئی مسئلہ نہیں، خدا حافظ" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔
"اگر وہ ہانگ کانگ میں ہے۔ پھر کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہم چلتے ہیں" خان جی نے میری بات سن کے کہا۔
"ہم؟ یعنی ہم سب۔۔۔ خان جی، میرے ساتھ صرف سیکریٹری جا سکتی ہے۔"
خان جی نے سرہلایا "شوفر بھی تو ہونا چاہیے تمھارا اپنا۔ گاڑی کیا تم خود چلاؤ گے۔"
ہم تینوں کو ساتھ دیکھ کے تیمور خوش نہیں ہوا "تم مذاکرات کے لیے جا رہے ہو۔ پُرامن مذاکرات کے لیے۔ پھر اس مار دھاڑ سے بھرپور خطرناک بڈھے کو۔۔۔"
میں نے اسے ٹوک دیا "کرنل خان۔ ایک انتہائی امن پسند انسان ہیں جن سے ایک چیونٹی کو بھی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ مگر امن کے لیے جنگ ضروری ہے۔ اپنے دفاع کا حق بھی مجھے حاصل ہے اور اپنے تحفظ کا ذمّے دار بھی میں خود ہی ہوں۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ میں کوئی رسک نہیں لوں گا۔ تمھارے انتظامات کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہو مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔"
"ہمارے پاس پروفیشنل لوگ ہیں جن کے پاس مہارت ہے اور تجربہ ہے۔ وہ خصوصی تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں جو اہم سیاسی شخصیات کو لاحق ہر قسم کے خطرات کی پیش بندی کرنا اور ان سے نمٹنا جانتے ہیں۔"
"کرنل خان نے فوج میں تیس سال صرف پیریڈ کرتے یا سلامی لیتے نہیں گزارے تھے تیمور۔ وہ خود کمانڈو تھا۔ اس کی اسناد اور اعزازات ملاحظہ کرنا چاہو تو کسی دن گھر آ جاؤ۔ وہ فیلڈ انٹیلی جنس میں سروس کا شاندار ریکارڈ رکھتا ہے اور کشمیر، رن کچھ اور ۶۵ء یا ۷۱ء کی جنگ میں جو کارنامے سرانجام دے چکا ہے ان کے بارے میں جاننا چاہو تو اس کے سینئرز سے مل کے دیکھو۔ ایسے جنرل ہیں جو کرنل خان کو دیکھ کے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس کے سیلوٹ پر شرمندگی بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بات عہدے کی نہیں، عزت کی ہے۔ تمھارے جو سیکیورٹی والے ہیں کرنل خان کے سامنے طفلِ مکتب ہوں گے۔ ایسے نہ جانے کتنے کمانڈوز کا وہ خود انسٹرکٹر رہا ہے۔"
"اچھا!" تیمور کی حیرت اس کی صورت پر دیکھی جا سکتی تھی "ایسے لوگ گمنامی کی زندگی تو نہیں گزارتے۔"
"ہاں۔ وہ مشیر ہو سکتا تھا۔ دفاعی امور سے تعلق رکھنے والے کسی بھی ادارے کا سربراہ بن سکتا تھا۔ اپنی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی چلا سکتا تھا مگر اس نے پوری لگن سے زندگی کے تیس سال وطن کی نذر کیے، اب اتنے ہی سکون کے ساتھ زندگی کے باقی دن صرف اپنے لیے جینا چاہتا ہے۔"
"اچھا اب تم قریشی اور صاحب داد خان کو یہ سب مت بتانا۔ وہ سب جو میں جانتا ہوں کسی اور کے علم میں نہیں ہے۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اگر وہ سوال کریں تو تم کہہ سکتے ہو کہ اس مشن میں رازداری اہم تھی چنانچہ تم اپنی گاڑی بھی استعمال نہیں کر رہے ہو۔ سب ایک ہی گاڑی میں جائیں گے۔ ڈرائیور بھی نہیں ہے۔ سیکریٹری کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ آصف کو تم نے نکال دیا تھا۔ یہ سیکریٹری بن جائے گی اگر تم اس کی کارکردگی سے مطمئن ہوئے۔ فی الحال یہ پروبیشن پر ہے۔"
قریشی اور صاحب داد خان ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ظاہری شکل و صورت میں قریشی سیاہ رو دُبلا پتلا اور لمبا تھا۔ اتنا سنجیدہ تھا کہ افسردہ نظر آتا تھا۔ صاحب داد خان اس کے برعکس کوتاہ قامت۔۔۔ اور گول مٹول تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بولنے اور ہنسنے کا عادی تھا۔ اگر میں اس کی ذرا بھی حوصلہ افزائی کرتا تو مشکل میں پڑ جاتا۔ اسے کنٹرول میں رکھنے کے لیے مجھے حد سے زیادہ متانت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔
قریشی نے مجھ سے ہاتھ ملا کے صرف اتنا کہا "کیسا وقت گزرا، آپ کا باہر؟"
صاحب داد نے ہنس کے کہا "لو جی، یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ یار، ہانگ کانگ میں اپنے چیئرمین صاحب کا وقت ایسے گزرا ہوگا کہ ان کو وقت کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا ہوگا۔"
میں نے کہا "یہ ایک کاروباری دورہ تھا۔"
"کاروبار تو اپنا بھی ٹھیک ٹھاک ہے جناب عالی۔ مگر اپنے نصیب میں یہ مزے نہیں۔ ہانگ کانگ اور سنگاپور کی جنت کے بس خواب ہی دیکھتے ہیں۔ پھیرے لگاتے ہیں آڑھتی بازار کے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر بلاوجہ قہقہہ لگایا۔
میں نے اسے سخت نظروں سے دیکھا "اس وقت ہم ایک پُرانے ساتھی سے ملنے جا رہے ہیں۔"
"نمک حرام تے حرامی عمرو راز۔ ایک گھنی داڑھی والا؟"
میں نے کہا "صاحب داد۔ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ میں سب کے بارے میں جانتا ہوں کہ کون کیا ہے؟ تمھارے بارے میں بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ ملک عمرو راز کی ناراضگی دور ہو جائے۔ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے تو سب کو معلوم ہو جائے گا لیکن ابھی یہ بات اخبار والوں کو بھی پتا نہیں ہے۔"
صاحب داد نے سرہلایا "تیمور صاحب نے ہمیں لیکچر پلا دیا ہے۔ بڑی لمبی ڈوز دی ہے، آپ فکر ہی مت کریں۔"
"ہم ایک ہی گاڑی میں جائیں گے۔ ڈرائیور نیا ہے۔ آصف کی برطرفی کے بعد میں نے عارضی طور پر ایک سیکریٹری کو چانس دیا ہے۔ ان کے سامنے ہم کوئی بات آپس میں بھی نہیں کریں گے۔ اب چلو ورنہ دیر ہو جائے گی۔"
قریشی میرے دائیں طرف کرنل خان کے پیچھے رہا۔ صاحب داد بائیں جانب چندا کے پیچھے بیٹھا اور مجھے درمیان میں رکھا گیا۔ تیمور کے خیال میں یہ ضروری تھا۔ دونوں طرف کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ چپکا دیا گیا تھا، اندر سے باہر کا منظر ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے سورج گہرے بادلوں میں روپوش ہے اور دھوپ کہیں نہیں ہے۔ باہر سے دیکھنے والے کو اندر کچھ بھی نظر نہیں آ سکتا تھا مگر تیمور کا مشورہ یہ تھا کہ قریشی یا صاحب داد کو پہلے اُتر کے گرد و پیش کا جائزہ لینا چاہیے کہ کوئی اخبار والا یا فوٹو گرافر تاک میں نہیں۔ اگر ایک بات شبنم کو معلوم ہو سکتی ہے تو اس کا کیا بھروسا۔ خاص خبر کے چکر میں وہ خود چھپ کے وہاں پہنچ جائے یا وعدہ کر لینے کے باوجود کہیں بک دے کہ اس نے شاہ عالم سے ملاقات کی ہے جبکہ دوسروں کو اس کے واپس آنے کی خبر تک نہیں۔ صحافی کی دھاک ایسی ہی خبروں سے بیٹھتی ہے جس پر صحافی تک بھونچکے رہ جائیں اور بے اختیار پوچھیں کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا اور وہ پُرتفاخر مسکراہٹ کے ساتھ کہے کہ بھائی، سورس ہیں اپنے۔ اس کے علاوہ

...عورت ذات راز کو زیادہ دیر راز رکھے تو اس کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے یا اسے ڈیپریشن ہونے لگتا ہے۔ پھر حلفیہ رازداری کے وعدے پر کسی کو راز کی بات بتا کے ہی اسے چین آتا ہے۔ ملک عمرو راز کے وعدے پر آنکھ بند کرکے اعتبار کرنا بھی کوئی عقل مندی نہیں۔ بے شک ظاہری وضع قطع سے وہ بندہ مومن ہے مگر جنگ ختم ہونے تک دشمن کو صرف دشمن ہی سمجھنا چاہیے۔ دھوکا' فریب اخلاقی طور پر معیوب مگر جنگ کی حکمتِ عملی کی کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے۔

قریشی نے اپنے وعدے کا پاس رکھا مگر صاحب داد کے لیے خاموش بیٹھنا محال تھا "سوجی سیکریٹری تو آپ نے ماشاءاللہ اچھی رکھی ہے۔ دیکھنے میں بھی... ہوشیار لگتی ہے۔ وہ جو آصف تھا' ایویں ہیرو بنا پھرتا تھا۔"

میں نے کہا "صاحب داد۔ میں کوئی کام سوچے سمجھے بنا نہیں کرتا۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے' کیا ہم جانتے نہیں شاہ جی" وہ بولا "بندے کی بڑی پہچان ہے آپ کو۔ جیسے وہ کہتے ہیں نا' سالی آدھی گھروالی۔ تو جناب سیکریٹری بھی آدھی مالک سے کم نہیں ہوتی۔"

"تم کوئی اور بات نہیں کرسکتے" میں نے کہا۔

"چلو شاہ جی آپ کو لطیفہ سناتے ہیں ایک۔ سیکریٹری کی ہوشیاری کا۔ کسی بلڈنگ میں کوئی بندہ اوپر سے گرگیا۔ سڑک پر ٹپک گیا کسی کھلی کھڑکی سے۔ نیچے سڑک پر شور مچا تو باس نے اپنی سیکریٹری سے کہا کہ دیکھو کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ جناب فرسٹ فلور سے گرا ہے کوئی۔ باس بڑا حیران ہوا جی کہ سیکریٹری کی نظریں تو ٹائپ رائٹر پر ہیں۔ اس نے اٹھ کے کیا پلٹ کے بھی نہیں دیکھا پھر کیسے بتادیا کہ بندہ فرسٹ فلور سے گرا ہے یا ٹاپ فلور سے۔ لڑکی صاحب نے پوچھا کہ تمہیں کیا الہام ہوا ہے ادھر بیٹھے بیٹھے۔ سیکریٹری نے کہا کہ سر' میرے کان تو بند نہیں ہیں۔ باس کو بڑا غصہ آیا کیونکہ کان تو اس کے بھی بند نہیں تھے۔ اس نے غصے سے میز پر مکا مارا اور کہا کہ کانوں سے کیسے پتا چل سکتا ہے الّو کی پٹھی' جاکے دیکھتی کیوں نہیں تو پتا ہے سیکریٹری نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے ایسے بدتمیز باس کی نوکری فوراً چھوڑ دی ہوگی اور استعفیٰ اس کے منہ پر مار کے چلی گئی ہوگی۔"

وہ خوب ہنسا "او نہیں شاہ جی۔ یہ تو لطیفہ ہے لطیفہ۔ اس کی سیکریٹری نے کہا کہ جناب کوئی ٹاپ فلور سے گرتا ہے تو آواز آتی ہے... آ... دھم۔ مگر فرسٹ فلور سے گرتا ہے تو آواز آتی ہے دھم... آ... جیسے ابھی آئی تھی۔"

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی روک کے کہا "اچھا' پھر کیا ہوا؟"

"پھر... باس نے کہا کہ تم جیسی سیانی لڑکی کو یہاں میرے دفتر میں نہیں' میرے گھر میں ہونا چاہیے" وہ بلبلا کے ہنسا اور قریشی کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔

میں نے اسے خبردار کرنے کے لیے کہا "میری یہ سیکریٹری صاحب زادی ہیں نئے شوفر کی۔ اور نئے شوفر سابق فوجی ہیں۔"

وہ محتاط ہوگیا "اچھا جی۔ یہ کیا تھے فوج میں...؟"

"باکسر..." میں نے کہا "جو ایک بار مقابلے پر آتا تھا اسے تین جگہ جانا پڑتا تھا۔ ڈینٹسٹ کے پاس' ہڈیوں کے ڈاکٹر کے پاس اور ماہرِ امراضِ چشم کے پاس۔"

"توبہ!" صاحب داد بولا "آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس کیوں؟"

میں نے کہا "اسے دن میں تارے نظر آجاتے تھے۔ میرا مطلب ہے آنے لگتے تھے۔"

خان اعظم نے پیچھے دیکھے بغیر کہا "سر۔ آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں بھئی' میں تو انہیں شرمندہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔"

چندا نے پلٹ کے کہا "سر۔ وہ سیکریٹری جس کا واقعہ آپ نے ابھی سنایا تھا' وہ میں ہی تھی۔"

میں نے کہا "اچھا! اور اوپر سے کیا صاحب داد خان گرے تھے؟ لڑھک گئے ہوں گے بے پیندے کے لوٹے کی طرح۔"

ڈھیٹ ہونے کے باوجود صاحب داد کا چہرہ شرمندگی سے لال پڑگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے اس کی بکواس کے جواب میں بکواس فرمائی ہے اور میری شہ پر ڈرائیور نے اور اس کی بیٹی نے بھی کرم۔ نہ اپنے چیئرمین کو کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ اس کی سیکریٹری کو جس کے ساتھ بیک وقت باس بھی ہو اور باپ بھی۔

عمرو راز کا آفس پرانی آبادی کا ایک گھر تھا۔ شاید دس مرلے پر بنا ہوا۔ چالیس سال پہلے یہ علاقہ غیر آباد تھا۔ جب نیا بنا ہوگا تو یہ مکان بھی کوٹھی یا بنگلا کہلاتا ہوگا مگر اب اس کے آس پاس دو کنال اور چار کنال کے پلاٹوں پر محل جیسی تعمیرات ہوگئی تھیں اور تجارتی عمارات بن گئی تھیں۔ چالیس سال تک عدم توجہی کا شکار رہنے والا یہ بنگلا اب رنگ و روغن سے محروم عام سا گھر لگتا تھا۔

سامنے والے گیٹ پر خاصی رونق تھی۔ جلسے کا انتظام کرنے والے کارکن آجارہے تھے۔ اخبار والے اور فوٹوگرافر پھر رہے تھے اور خاصی تعداد میں گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ قریشی کے مشورے پر ہم گاڑی کو پچھلی طرف لے گئے۔

میں نے عمرو راز سے فون پر رابطہ کیا' اس نے کہا "تمہیں دیر ہوگئی ہے۔"

میں نے کہا "میں پہنچ گیا ہوں... مگر..."

"مگر کیا۔ ارادہ بدل گیا ہے" اس نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ تمہارے گیٹ پر اجتماع ہے اخبار والوں کا۔"

"پھر کیا ہوا' تمہارے دشمن تو نہیں ہیں وہ؟"

"میں قبل ازوقت کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔"

وہ ہنسا "تمہیں شرم آتی ہے نا۔ بے غیرتی محسوس ہوتی ہے۔ اخبار والے پوچھیں گے کہ سر آپ اس وقت یہاں کیسے؟ راجا بھوج خود گنگو تیلی کے گھر..."

"چلو تم یہی سمجھ لو۔ ابھی کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔ آخر میں مہمان ہوں تمہارا۔ میری حفاظت کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"حفاظت کرنے والا خدا ہے" وہ بولا "مگر خیر میں راستہ صاف کرادیتا ہوں۔ تم گاڑی میں سیدھے اندر آجاؤ۔ کسی اخبار والے یا فوٹوگرافر کو اندر نہیں آنے دیا جائے گا۔ گیٹ بھی بند کردیا جائے گا تمہیں خفت سے بچانے کے لیے۔"

میں نے کہا "میں ایک سفید کرولا میں ہوں۔"

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟ وہ اپنی گاڑی کیوں نہیں لائے؟"

میں نے کہا "رازداری پر ہم اتفاق کرچکے تھے۔ اور کیا سبب ہوسکتا ہے۔ اپنی گاڑی میں نہ آنے کا۔ میرے ساتھ پرسنل اسٹاف ہے۔ شوفر۔ سیکریٹری' قریشی اور صاحب داد۔"

"ٹھیک ہے۔ تیمور نے یہی بتایا تھا۔ سیکیورٹی والے سب کو چیک کریں گے۔ باقی سب کو باہر ہی انتظار کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "میری سیکریٹری ساتھ رہے گی۔"

"نہیں۔ صرف میں اور تم بات کریں گے" وہ بولا "میرے پاس تمہارے لیے آدھا گھنٹا ہے۔ جو میں صرف اس لیے ضائع کررہا ہوں کہ تمہاری طرف سے بہت زیادہ اصرار تھا۔ ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ اب کچھ نہیں ہے بات کرنے کے لیے۔"

"بہت کچھ ہے۔" میں نے کہا "تمہیں پتا چل جائے گا۔"

کار جب گیٹ میں داخل ہوئی تو کسی نے بھی اسے اہمیت نہیں دی تھی لیکن اس کے بعد جب بہت سے لوگ باہر نکالے گئے۔ جن میں کچھ اخباری نمائندے بھی تھے۔ اور گیٹ بند کیا گیا تو سنسنی پھیلنا قدرتی بات تھی اندر جو کارکن موجود تھے ان میں سے بیشتر بانی ارکان تھے جو شاہ عالم کا ساتھ چھوڑ کے عمرو راز کے ساتھ ہوگئے تھے۔ کچھ دوسری جماعتوں کے لوگ تھے جو عمرو راز سے انتخابی اتحاد کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ یہ سب لوگ مجھے پہچانتے تھے اور جب میں کار سے برآمد ہوا تو ان کے چہرے تصویرِ حیرت بن گئے۔ کچھ لوگ طنزیہ انداز میں مسکرائے تو کچھ نے میری تشریف آوری پر ناپسندیدگی کے جذبات کا کھل کے اظہار بھی کیا مگر میں نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ میرے ساتھ آنے والوں کو الگ کمرے میں بٹھادیا گیا' تلاشی لینے کے بعد صرف مجھے اندر اس کمرے میں پہنچادیا گیا جہاں میری عمرو راز سے پہلی ملاقات ہورہی تھی۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ مولوی ٹائپ آدمی ہے اور خاصا کریک ہے۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ اس نے بیان بازی سے پارٹی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور ہدف بنایا شاہ عالم کے ذاتی کردار کو۔

میں نے اپنے سامنے چالیس سال سے زائد عمر کے اس شخص کو دیکھا جو اپنی صورت یا حلیے سے ذرا بھی سیاسی لیڈر نہیں لگتا تھا۔ اس عمر میں سر کے بال اڑ جانا ایک فطری امر تھا لیکن ٹوپی اس نے نماز پڑھنے کے لیے سر پر رکھی تھی۔ جانماز تہ کرکے رکھتے ہوئے اس نے ٹوپی بھی اتار دی۔ اس کی داڑھی واقعی ایک بالشت لمبی تھی اور اس کے بالوں کی سیاہی پر سفیدی غالب آنے لگی تھی۔ وہ ٹخنوں سے اونچے شرعی پاجامے اور کرتے میں ایک عام قسم کا غریب آدمی لگتا تھا۔ غربت کی یہ تحریر اس کی صورت پر بھی نمایاں تھی۔ خوشحالی اور فراغت کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے جس کی چمک عمر کے ساتھ ماند نہیں پڑتی مگر محنت کش ہاتھوں کا کھردرا پن اور سختیِ ایام کے تفکرات جو چہرے پر دکھ اور عذاب کے نقش چھوڑ دیتے ہیں اور تلخ تجربات کا درد جو آنکھوں سے جھانکتا ہے۔ اس کے ماضی کو کھلی کتاب کی طرح پیش کرتا تھا۔ شاید وہ خود بھی اس ماضی سے نظر چرانے کا قائل نہیں تھا۔

"شاید ابھی تک کسی کو تمہارے آنے کی خبر بھی نہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ میں ایئرپورٹ سے سیدھا تیمور کے پاس گیا اور پھر یہاں چلا آیا' اسی میں کچھ دیر ہوگئی۔"

"پہلے بتاؤ کیا پیو گے' ویسے تو کھانے کا وقت ہے۔"

میں نے کہا "کھانے کے لیے وقت نہیں ہے' چائے کافی کچھ بھی منگوالو۔"

اس نے میز پر رکھے ہوئے انٹرکام کا ایک بٹن دبا کے چائے کے لیے کہا۔ اس کا آفس بھی بہت معمولی تھا۔ قالین' صوفے پردے سب پرانے تھے۔ زیادہ حیرت مجھے اس کے رویے پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کا لہجہ پُرعداوت ہوگا۔ وہ مجھے ذلیل کرنے کے لیے الفاظ میں زہر اگلے گا۔ اس کی باتوں میں نفرت کا زہر بولے گا اور لہجے میں طنز کی تلخی ہوگی۔ خدا نے اسے موقع دیا تھا کہ وہ اپنی ذلت کا سارا حساب نہ سہی کچھ قرض آج بے باق کردے۔ بغاوت اس سے پہلے بھی لوگوں نے کی تھی مگر کامیاب صرف وہ ہوا تھا۔ اس نے شاہ عالم کے سرِپُرغرور کو جھکادیا تھا۔ اس حد تک کہ اصرار کے ساتھ درخواست کرکے اور خود چل کے وہ اس سے کچھ کہنے آیا تھا۔ اس کی انداز میں انتقامی غرور کی شعلہ نشانی ہوگی اور اطوار میں گستاخانہ سرکشی۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ پُرسکون اور شائستہ اطوار کا مالک تھا اور مجھ سے ایسے پیش آرہا تھا جیسے اس کے اور میرے درمیان کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ہم پرانے دوست ہیں جو بہت دن بعد ملے ہیں۔ وہ پُراعتماد بھی تھا اور اس کے رویے میں غرور یا انتقامی جذبات کا شائبہ تک نہ تھا۔

شاہ عالم کا رول ادا کرنے کا یہ پہلا موقع تھا چنانچہ میں اپنی

طرف سے بہت محتاط تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی نگاہ اصل اور نقل کے فرق کو محسوس نہ کرلے۔

"تم بہت بدل گئے ہو شاہ جی" اس نے بالآخر کہا۔

میں نے خود کو سنبھال کے کہا "میں تو وہی ہوں ملک صاحب۔ وقت بدل گیا ہے اور دیکھا جائے تو ان بدلے ہوئے حالات کے ذمّے دار صرف تم ہو۔"

"اس کا مطلب ہے غلط فہمی ہوئی تھی مجھے۔ تم آج بھی یہ سمجھتے ہو کہ غلطی صرف دوسروں سے ہوسکتی ہے" وہ بولا "تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"یہ بات نہیں۔ شکایت بھی اپنوں سے ہوتی ہے مگر آپس کے معمولی اختلافات کو بنیاد بنا کے راستہ بدل لینا۔"

اس نے اپنے اشتعال کو دبا کے کہا "چھوڑو شاہ عالم۔ یہی ہے تمہارا اصلی روپ کہ تم انہیں معمولی اختلافات کہتے ہو۔ آج بھی قصوروار مجھے سمجھتے ہو۔ ایک میں ہی کیا' میرے جیسے سیکڑوں ہیں جو اس دن کو روتے ہیں جب انہوں نے تمہاری باتوں میں آکے اپنا سب کچھ تم پر قربان کردیا تھا۔ اور وقت آنے پر تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تمہارے سامنے لب کھولنا بھی جرم تھا۔ وہ کس سے فریاد کرتے' تم نے انہیں تباہ کردیا۔ خیر چھوڑو پرانی باتیں۔ یہ دفتر کھل گیا تو تمہارے لیے حقائق کا سامنا کرنا مشکل ہوجائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ضبط کا حوصلہ نہیں ہے تم میں۔ اور پھر میں بھی نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ اس طرح پیش آؤں جیسے تم میرے ساتھ پیش آئے تھے۔"

"تمہیں سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہے۔"

"نہیں۔ یہاں تم نے خود کو میرا مہمان کہا ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرکے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ تم جو چاہو سمجھو لیکن میں کم ظرف نہیں ہوں۔ دشمنی میں بھی وضع داری کے ادب آداب کا خیال رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر ذاتی انتقام لینا ہوتا تو میں اصولی اختلاف کی بات نہ کرتا۔ میں تم کو تمہارے گھر میں گھس کے قتل کردیتا۔ تمہارے خاندان کے ہر فرد کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا جیسا تم نے کیا تھا اور پھر تمہارے گھر کو بھی آگ لگادیتا۔ لیکن شاہ عالم' میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑا۔ میں دنیا کی کسی عدالت میں جاتا بھی تو کیسے اور حاصل کیا ہوتا' سب سے بڑی عدالت میں ہوجائے گا فیصلہ۔ اس دنیا میں بھی مکافاتِ عمل ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ فرطِ جذبات سے اس کی آواز گلوگیر ہوگئی تھی۔ مجھے تیمور نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ شاہ عالم اور عمرِدراز کے درمیان اختلافات کی نوعیت اصولی سے زیادہ ذاتی اور اس حد تک پرعناد تھی۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری ملک صاحب۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔"

اس نے مجھے چونک کے دیکھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم تو۔۔۔ نعوذ باللہ' خود کو خدا سمجھ بیٹھے تھے' بڑی جلدی ہوش آگیا۔"

"ہمارا بہت پُرانا ساتھ تھا' درمیان میں بہت کچھ ہوا۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا مگر آج میں اس لیے آیا ہوں کہ ہم کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "یہ تو بنیاد ہی غلط ہے شاہ جی۔ میرے پاس اب کیا رہ گیا ہے تمہیں دینے کو۔ سب کچھ تو چھین لیا تم نے۔۔۔"

میں نے کہا "میں تمہارے سارے نقصانات کی تلافی کرسکتا ہوں۔"

"اچھا؟ وہ کیسے؟" اس نے زہر آلود تلخ لہجے میں کہا "وہ سب مجھے واپس دلاسکتے ہو؟"

میں نے کہا "پُرانی باتوں کو بھول جاؤ۔"

وہ بھڑک اُٹھا "بھول جاؤں' کاش میں بھول سکتا۔۔۔ وہ سب۔۔۔"

میں نے کہا "ملک عمرِدراز صاحب۔ ذاتی طور پر میں کیا کرسکتا ہوں؟ اگر معافی سے تلافی ہوسکتی ہے تو میں سب کے سامنے تم سے معافی بھی مانگ سکتا ہوں۔"

"ڈراما مت کرو شاہ جی۔ کس کس سے معافی مانگوگے آخر تم اور اپنے کس کس جرم کی؟ میری طرح تم نے سیکڑوں کو ڈسا ہے وہ تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ میری بات اور ہے۔ اللہ نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔ عزت اور ذلت وہی دیتا ہے۔"

میں اس کی باتوں سے سخت اُلجھن میں پڑگیا تھا۔ "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ یہ سمجھ لو کہ میرا یہاں آنا بھی اس کی منشا ہے۔ جو عزت تمہیں حاصل تھی یا آج حاصل ہے' تم اس سے زیادہ کے مستحق تھے' یہ دیکھو۔"

میں نے ایگزیکٹو کمیٹی کی قرارداد اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے مضمون پر ایک نظر ڈالی اور حیرانی سے بولا "یہ کیا ہے؟ میرا کیا تعلق اس سے؟"

میں نے کہا "میں خصوصی اختیارات کے ساتھ تم سے ملنے آیا ہوں۔"

"مجھے تمہارے خصوصی اختیارات سے کیا؟"

میں نے کہا "میں تم کو منانے آیا ہوں۔ واپس لے جانے کے لیے۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا اور پھر ہنس پڑا "بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا شاہ عالم' تم بہت بڑے مداری ہو' میری سمجھ میں تمہارا یہ کھیل نہیں آیا۔"

"یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ تم پہلے سینئر نائب صدر تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم صدر کا عہدہ سنبھال لو۔"

"صدر کا عہدہ۔۔۔!"

"ہاں۔ منشور میں ترمیم کرکے تمہارے لیے جگہ نکالی گئی ہے۔"

وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے ہوش مند شخص کسی نشے میں دُھت شرابی کی طرف دیکھتا ہے۔ "مجھے تم پر افسوس ہورہا ہے۔ ایک معمولی سی ناکامی کے خوف نے تمہارے ذہن کو اتنا متاثر کیا ہے۔ ناقابلِ یقین لگتی ہے مجھے یہ بات' سچ بتاؤ یہ تجویز کس کی تھی' تیمور کی۔۔۔ یا خود تم نے ایسا سمجھا کہ ایسا ہوسکتا ہے؟ اس قسم کی مفاہمت ممکن ہے؟"

"کسی اور سیاسی جماعت میں تم صدر بن سکتے ہو؟ جو آج تمہاری حمایت کررہی ہیں۔"

"مجھے بے وقوف مت سمجھو شاہِ عالم۔ کیا صدر اور کیا سینئر نائب صدر۔ سب تمہارے لیے پالتو کتے ہیں۔ تمہارے اشارے پر دُم ہلانے والے۔ جو دُم نہ ہلائے اسے تم لات مار کے نکال دیتے ہو۔ یہ جو آج تمہارے ساتھ آئے ہیں۔ انہیں پہلے نہیں دیکھا میں نے۔ ایک تیموری ہے جو ابھی تک تمہارے تلوے چاٹ رہا ہے۔ مگر آج وہ خود تمہارے ساتھ نہیں آیا چیئرمین صاحب' آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ تم سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔۔۔ تم اس سے الرجک ہو۔"

"یہ بھی اس نے کہا ہوگا۔ اگر میں تمہیں مہمان کی حیثیت دے سکتا ہوں شاہ عالم' سوچو ذرا۔۔۔"

میں نے گھڑی دیکھی "ملک عمرِدراز۔ مجھے ایک موقع دو۔ تم کو میرے دستِ راست کی حیثیت حاصل ہوگی۔ میں پارٹی کی تنظیم نو کروں گا۔ ہم سب پرانے کارکنوں کو واپس لے آئیں گے۔ تم صدر بن جاؤ' ہم مل کے سب ٹھیک کرلیں گے۔"

"تم واقعی یہ چاہتے ہو؟" اس نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے بہت کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے تاریکی میں رکھا گیا۔۔۔ یا میں خود بھٹک گیا اور مجھے دوست دشمن کی پہچان نہیں رہی۔"

"تم جانتے ہو۔ یہ کتنا ناممکن ہے مگر ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لیے پہلا قدم تم اُٹھاسکتے ہو تو میں تیار رہوں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا اس کے لیے؟"

"معمولی سی قربانی دینی ہوگی۔ چیئرمین مجھے بنادو' صدر تم بن جاؤ۔"

"یہ۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے" میں نے کہا۔

"پھر کچھ نہیں ہوسکتا۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "پتا نہیں کیوں یہ خوش فہمی تھی تمہیں کہ آج کا جلسہ۔۔۔"

میں نے کہا "چائے کے لیے شکریہ' خدا حافظ۔"

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے ملنا شروع کیا "میری طبیعت۔ پتا نہیں کیا ہورہا ہے مجھے؟"

میں اس سے ہاتھ ملا کے باہر آگیا۔ وہ اس وقت خاصی تکلیف میں نظر آرہا تھا۔ اذیت کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے اور وہ کرسی پر بیٹھ کے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کی حالت میں یہ تبدیلی اچانک آئی تھی۔

باہر ایک الگ کمرے میں کرنل خان کے ساتھ صرف چندا تھی۔ انہیں دوسرے ملاقاتی مہمانوں سے الگ بٹھادیا گیا تھا۔ چائے کے خالی کپ اور کچھ خورونوش کا سامان ایک چھوٹی سی میز پر ان کے سامنے بھی رکھا ہوا تھا۔ صاحب داد اور قریشی کو موجود نہ پاکے مجھے حیرانی ہوئی۔

"وہ میرے نائب صدر اور معتمدِ خصوصی کہاں چلے گئے؟" میں نے کہا۔

"انہوں نے اس بات کا خاصا بُرا مانا تھا کہ ان کو مذاکرات سے دور رکھا گیا۔ انہوں نے کہا کہ پھر ہمیں یہاں لاکے ذلیل کرانے کی کیا ضرورت تھی اور اٹھ کے چلے گئے تھے" خان جی نے مجھے مطلع کیا "اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنے۔"

اندر سے کسی نے کہا "ڈاکٹر کو بُلاؤ۔ ملک صاحب کی طبیعت کچھ خراب لگتی ہے۔"

میں نے کہا "خان جی۔ مجھے کچھ معاملہ گڑبڑ نظر آرہا ہے۔ نکل چلیں فوراً۔"

چندا اُٹھ کھڑی ہوئی "ٹھیک کہتے ہو تم۔ مجھے بھی خطرے کی بُو محسوس ہورہی ہے۔"

ہم باہر آئے تو مجھے وہاں کچھ افراتفری سی محسوس ہوئی۔ ہماری گاڑی وہیں گیٹ کے پاس موجود تھی۔ چند پرانے کارکنوں نے ہمیں واپس جاتا دیکھ کے کچھ کہا۔ ایک بات خاصی اشتعال انگیز تھی مگر میں نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ خان جی نے ڈرائیونگ سنبھالی تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ میں اور چندا اس وقت تک پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔

"یہ قریشی اور صاحب داد کہاں رہ گئے؟" میں نے تشویش سے کہا۔

"ہوسکتا ہے وہ واپس چلے گئے ہوں" چندا بولی "اور اگر اندر ہی کہیں ہیں تو آجائیں گے بعد میں۔ آپ چلیں بابا!"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ نروس تھی "چلیں خان جی" میں نے بھی کہا۔

خان جی نے گاڑی آگے بڑھادی۔ اس وقت پیچھے سے کسی نے چیخ کے کچھ کہا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو ایک بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کٹا شخص برآمدے میں دوڑ رہا تھا اور ہماری طرف اشارہ کررہا تھا۔ وہ غالباً چوکیدار سے کہہ رہا تھا کہ ہماری گاڑی کو روکے۔

"خان جی۔ رُکنا نہیں ہے خواہ راستے میں کوئی بھی آئے" میں نے کہا "ہم پھنس گئے تو مشکل میں پڑجائیں گے۔"

چندا نے کہا "اپنا سر نیچے کرلو۔ پیچھے مت دیکھو بے وقوف۔"

خان جی نے ہارن پر ہاتھ رکھا اور پاؤں ایکسیلریٹر پر۔ گاڑی ایک دم آگے بڑھی۔ میں اور چندا اتنا آگے جھک گئے تھے کہ پیچھے سے دیکھنے والے کو نظر بھی نہیں آسکتے تھے۔ چندا نے میرے سر کو گدی سے پکڑ کے دونوں ٹانگوں کے درمیان کردیا تھا۔ اب میں آگے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ سب لوگ آگے بڑھے تھے جن کو وہاں روک دیا گیا تھا۔ انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ شاہ عالم اور ملک عمر دراز کے درمیان مفاہمت کے لیے تصفیہ خیز مذاکرات ہورہے ہیں۔ یہ بڑی سنسنی خیز اطلاع تھی۔ کیا واقعی شاہ عالم اپنی انانیت پسندی کے خول سے نکل کے خود یہاں آگیا ہے؟ کیا وہ اپنے ہی ایک پُرانے کارکن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خوف زدہ ہے؟ کل تک تو وہ اسے پاگل کہتا تھا اور اس کی سیاسی تحریک کو انگریزی محاورے کے مطابق "چائے کے کپ میں طوفان" پھر کیا جلسے کی کامیابی کے امکانات نے شاہ عالم کو مجبور کردیا ہے؟ کیا اس مرحلے پر ملک عمر دراز اور شاہ عالم کے درمیان مفاہمت ممکن ہے؟ سیاست میں حرفِ آخر کچھ نہیں اور مداری کے بندر کی طرح لالچ کی ڈگڈگی پر راتوں رات سیاسی قلابازی کھانے والے ڈھیٹ عوامی نمائندے بھی کم نہیں۔ کوئی انھیں لوٹا' تھالی کا بینگن' ڈھولی کا کتا کہتا ہے تو کہتا رہے۔ ایک کروڑ لے کر خود ایسا کہنے والے بھی اصول پرستی کا راگ بھول جائیں گے اور سر جھکا کے زبانِ خلق کی ہر بات سنیں گے۔ ہاں جی میں لوٹا' میرا باپ لوٹا' میرا دادا لوٹا۔ ہم ڈھولی کے دھوبی کی نسل سے تعلق رکھنے والے۔ جس کا جو دل چاہے کہے۔ جتنی اونچی آواز میں چاہے اعلان کرے۔ جلسۂ عام میں کہے اور اخبار میں بیان شائع کرائے۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں' قافلہ چلتا رہتا ہے۔ فرق کسی کی بکواس سے نہیں پڑتا۔ گالی سُن کے پی جانے سے بھی کچھ نہیں ہوگا مگر ایک کروڑ سے یقیناً فرق پڑتا ہے اور بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ یہی ہے بنیادی حقیقت جو فراموش نہیں کی جانی چاہیے۔ جذبات کے کھیل میں اپنا نقصان کرنے والا احمق۔

قیاس آرائیاں کرنے والے یقیناً بہت بے قرار ہوں گے اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی کہ دو دشمن مل رہے ہیں۔ کیا جنگ ختم ہوجائے گی؟ نہیں جنگ جاری رہے گی۔ شاہ عالم کبھی ملک صاحب کی شرائط پوری کرنے پر راضی نہیں ہوگا۔ ملک صاحب کسی قیمت پر اسے معاف کرنے والے نہیں ہیں۔ ملک شریف آدمی ہے' شاہ عالم عیار ہے۔ آج کا جلسہ کھٹائی میں پڑگیا۔ ملک کو اکسانے اور اس کی سیاسی تحریک کو اس مقام تک لانے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ۔ اخبار نویس' تجزیہ نگار' سیاسی پنڈت' مبصر اور سٹے باز۔ خیال کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ شرط لگالو' ایسا ہوگا.... ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

خان جی کا راستہ بھی انہی لوگوں نے روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ وہ ہجوم کی شکل میں آگے بڑھے ہوں گے کہ شاہ عالم کو گھیر لیں اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ کردیں۔ اسے کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور کردیں۔ کوئی ایسی بات جس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ نو کمنٹس کے بھی بہت سے مطلب نکلتے ہیں۔ پُرانے گھاگ صحافی چہرے پڑھ لیتے ہیں۔ آنکھوں میں جھانک کر اندازے قائم کرلیتے ہیں۔ صورت دیکھ کر سیاسی موسم کی پیش گوئی کردیتے ہیں۔ صحیح ہوگئی تو واہ واہ۔ اور غلط ہوگئی تو نہ آہ نہ واہ۔

مجھے خان جی کی مہارت پر بھروسا تھا۔ معلوم نہیں انھوں نے اس ہجوم میں سے راستہ کیسے بنایا۔ میں نے بہت سے چہرے دیکھے جو سیاہ شیشوں پر جھکے ہوئے تھے۔ لوگ گاڑی پر ہاتھ مار رہے تھے اور گاڑی کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ پیچھے جیسے شور بر محشر بپا تھا۔ بہت سے لوگ چیخ رہے تھے پھر ایک فائر ہوا۔ اس کے بعد دوسرا۔ یا ہرنہ جانے کس شخص نے چیخ ماری۔ گولی پیچھے والے ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی گزر گئی۔

میں نے کہا "تم ــــ چندا" ذرا دیکھ کے بتاؤ' کیا گولی مجھے لگی ہے؟"

"کیا پتا اگلی گولی لگ جائے' کلمہ پڑھ لو" وہ بولی۔

خان اعظم نے اعلان کیا "خطرہ ٹل گیا ہے بچو۔"

میں نے سر اُٹھا کے پیچھے دیکھا۔ ملک عمر دراز کا آفس مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ کار کی رفتار اب اتنی زیادہ نہیں تھی مگر خان جی نے صراطِ مستقیم پر نہ چلنے کا عہد کرلیا تھا۔ وہ ہر موڑ پر دائیں بائیں اسٹیرنگ گھماتے تھے۔ اس کے نتیجے میں پچھلی سیٹ پر میں اور چندا بھی لڑھکتے رہنے پر مجبور تھے۔ ریس ہمارے اور تعاقب کرنے والوں کے درمیان تھی۔ کرنل خان کی طرح مجھے بھی یقین تھا کہ جب ہم فائر سے بچ کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے تو کچھ لوگ یقیناً گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں اسٹارٹ کرکے ہمارے تعاقب میں دوڑے ہوں گے۔

"میں نے جب پیرس ڈیکار ریلی جیتی تھی' مس چندا!" میں نے خود کو سنبھال کے کہا "تو راستے میں جناب کئی دریا آئے... اور... پہاڑ۔ ہمالیہ سے بھی اونچے... اور ایسے گھنے جنگل خاتون... کہ میں نے دیکھا' مچھر بھٹک رہے تھے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کے لیے... اور دلدل.... الامان۔ ان میں اگر کچھ منہ کھولے پڑے تھے مجھے ہڑپ کرنے کے لیے۔ مگر مچھ کے مقابلے میں اگرچہ آدم خور ہوتا ہے مگر میں گزر گیا۔"

"پچھلے سال بھی ایک مشہور ڈرائیور گزر گیا تھا" اس نے اپنے بالوں کو پھر ہیر بینڈ میں اکٹھا کیا۔

"میرا مطلب تھا' کوئی رکاوٹ میری راہ میں حائل نہیں ہوسکی۔"

"اچھا اچھا۔ کون ڈرائیو کررہا تھا تمھیں؟" وہ بولی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرے ساتھ بڑا دھوکا کیا تیمور نے۔"

چندا نے کہا "ایسا بھی ہوتا ہے۔ اور سب کو دھوکا دینے والوں کو قدرتی طور پر زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "مس چاندنی۔ تم دیکھ لینا' میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

مس چاندنی نے کہا "بے شک تمھاری باتوں سے غصہ ٹپک رہا ہے۔ بلکہ بہہ رہا ہے اسی طرح جیسے ناک بہتی ہے۔ لیکن اس جملے کی ساخت پر غور کیا جائے تو اس سے یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے کہ تم کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑو گے؟"

خان جی نے کہا "مسٹر چیئرمین! کیا آپ کو یقین ہے کہ ملک عمر دراز سے مذاکرات کے لیے جو وفد تشکیل دیا گیا تھا اس میں سب لوگ جینوئن تھے؟"

میں نے ان کے سوال پر غور کیا "وکیل قریشی اور صاحب داد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کو تیمور کے ایما پر شامل کیا گیا تھا۔"

"بھئی ان کا اصل نام کچھ اور بھی ہوسکتا ہے" خان جی نے کہا۔

میں نے جھینپ کے کہا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"سوچنے سے دماغ پر زور پڑتا ہے۔ اوور لوڈنگ سے بریک ڈاؤن کا خطرہ رہتا ہے" چندا بولی۔

"جب وہ اُٹھ کر گئے۔ تو مجھے شک ہوا تھا۔ یہ تو شاید پہلے سے طے تھا کہ مذاکرات ون ٹو ون ہوں گے۔ براہِ راست شاہ عالم اور ملک عمر دراز کے درمیان۔ کیا انھیں یہ بتایا نہیں گیا تھا؟ یا ان کے کھیل کا انحصار اسی بہانے پر تھا۔"

"چندا سمجھی نہیں" میں نے کہا۔

"تو تم سمجھادو" چندا نے کہا۔

خان اعظم نے کہا "وہ دونوں اُٹھ کر گئے تو انھوں نے کہا تھا کہ وہ اپنے پُرانے ساتھیوں سے ملیں گے۔ پُرانے ساتھی ان کے دوست نہیں رہے۔ یہ ایک فضول بات تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے قریشی کی آواز سُنی۔ اس نے ایک ملازم سے کہا تھا کہ یہ چائے اندر لے جاؤ۔ ملک صاحب بغیر چینی کے پیتے ہیں۔ شاہ عالم دودھ استعمال نہیں کرتے۔ جو چائے ہمارے لیے لائی گئی تھی اس میں بھی دودھ اور چینی شامل نہیں تھے۔ الگ رکھے گئے تھے کہ پینے والا اپنی پسند کے مطابق استعمال کرلے۔ پہلی ٹرے خادم اندر لے گیا تھا۔"

میں نے کہا "خان اعظم۔ ابھی آپ نے قریشی کا حوالہ دیا تھا۔"

"ہاں۔ اس نے دروازے کے خاصے قریب آکے یہ بات کہی تھی اس لیے میں نے سُنی۔ ٹرے اندر لے جانے والا وہی تھا۔ جس نے فائر کیا تھا۔"

"میں نے فائر کرنے والے کی صورت نہیں دیکھی تھی۔"

"میں نے دیکھ لی تھی۔ بیک ویو مرر میں" خان جی نے کہا "اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ وہ سانڈ جیسا مضبوط تھا۔"

"میں سمجھ گیا۔ جب میں نے دیکھا تو وہ برآمدے میں ہمارے پیچھے دوڑ رہا تھا اور چیخ رہا تھا کہ انھیں روکو۔ وہ باڈی گارڈ اور ذاتی ملازم ہوگا ملک عمر دراز کا۔ مگر کرنل صاحب' یہ معاملہ کچھ مشکوک ہے کہ چائے لاکر اسے دینے والا قریشی تھا۔"

"میرے لیے اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ آواز میں نے سُنی تھی اور میرے کان دھوکا نہیں کھاسکتے۔ یہ تو بچی جانتا ہے چرخے۔"

"آئی ایم سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔"

"اور کیا مطلب تھا۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ قریشی کوئی غدار ہو۔ کیا ملک عمر دراز کے ساتھیوں میں ایسا کوئی نہیں جس کی وفاداری کو خریدا جاسکتا ہو اور خرید لیا گیا ہو۔ چائے اس نے بنائی۔ یا وہ کچن سے چائے لایا تو اس نے دودھ میں کچھ شامل کردیا۔ شاہ عالم چائے میں دودھ نہیں ڈالتا۔ ملک عمر دراز شاید دودھ زیادہ ڈالتا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ چائے کم اور دودھ زیادہ پیتا ہے۔"

"چائے میں۔ چینی میں اور کھانے پینے کی کسی چیز میں کچھ ڈالا جاتا تو رسک سب کے لیے تھا لیکن ہم سب خیروعافیت سے ہیں۔"

چندا نے کہا "لیکن بابا۔ قریشی اسی کار میں سے اُترا تھا۔ سب کے سامنے۔"

"سب نے یہی سمجھا ہوگا کہ قریشی کو ہمیں لانے کے لیے بھیجا گیا ہوگا یا اس نے کہہ دیا ہوگا کہ میں باہر انھیں ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا۔ ان کی گاڑی کو اندر لانے کے لیے اپنا آدمی ساتھ ہو تو چوکیدار بھی شک نہیں کرتا پھر عمر دراز نے بھی اجازت دے دی تھی" خان اعظم نے کہا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صاحب داد خان بھی درحقیقت کوئی اور ہوگا۔" میں نے چندا سے کہا "ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟ میں مانتا ہوں کہ میں ایک فاترالعقل گدھا ہوں' ناقص العقل مخلوق بہرحال نہیں ہوں۔"

"مگر تم گدھے ہو۔ یہ تم نے تسلیم کرلیا ہے۔" چندا نے بیگ سے ڈائری نکالی "میں تاریخ اور وقت لکھ لوں تو دستخط کردینا۔"

ڈائری میں ہر اندراج تھا جب میں نے غصے میں یا چڑ کے اپنے آپ کو بے وقوف یا پاگل یا احمق کہا تھا۔ آخری دستخط میں نے تین مہینے پہلے کیے تھے جب خود کو چنڈو خانے کا اُلّو قرار دیا تھا اور اس سے بھی پہلے ایک مخبوط الحواس لاوارث بیل۔ تازہ اندراج پر بھی مجھے دستخط کرنے پڑے۔ ان خطابات سے ڈائری کے تین صفحے

بھر گئے تھے۔

"اگر وہ مر گیا خان اعظم' تو کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟" چندا بولی "اسے دفن کردیا جائے گا۔"

"اس کی فکر تجھے کیوں ہے۔ شاہ عالم جانے اور اس کا کام۔ اس نے کتنی آسانی سے اور ہوشیاری سے ایک خطرناک حریف کا کام خود تمام کردیا اور الزام سے بھی بچ گیا۔ جس کا جی چاہے تصدیق کرلے۔ وہ ہانگ کانگ میں ہی ملے گا اور وہاں اس کی موجودگی کے گواہ بھی عام لوگ نہیں ہوں گے۔"

"سچ کہا آپ نے۔ وہ لنچ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار بزنس مین تھے۔ بڑے توپ قسم کے۔ جو اس پر الزام عائد کریں گے وہ خود پشیمان ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا دولت خانہ بے دولت ہوگیا ہے۔ جو عجوبے یہاں پائے جاتے ہیں ان کی وجہ سے عجائب خانہ زیادہ موزوں نام ہے" میں نے چندا کی طرف دیکھ کے مسکراتے ہوئے کہا "اب آپ اندر پیدل جائیں' میں یہ سواری لے کر جاتا ہوں۔"

چندا نے کہا "کہاں؟ اس سواری کو چھوڑنے؟"

"بس چندا۔ یہاں اب کیا ہے میرے لیے۔ نہ کوئی آس نہ امید۔ میں نہ ناصر عظیم ہوں نہ شاہ عالم۔ نہ میں کسی کا ہوں نہ کوئی میرا۔ مجھے نکل جانا چاہیے ٹنڈرا کے خطے کی طرف۔"

"صحرائے گوبی زیادہ پُرفضا مقام ہے" چندا نے کہا اور اندر غائب ہوگئی۔

خان جی نے کہا "شاہ عالم کی واپسی تک تجھے روپوش رہنا ہوگا۔"

"بھیس بدل کے پھرنے میں تو کوئی خطرہ نہیں" میں نے کہا اور گاڑی کو گھما کے واپس لے گیا۔

ٹیلی فون اُٹھا کے میں نے امیر تیمور کا نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت تک میں وہ ایک سو ایک گالیاں منتخب کرچکا تھا جو مجھے تیمور کو دینی تھیں مگر مجھے خاصی مایوسی ہوئی جب دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے بھی نہیں اُٹھایا۔ غالباً وہ متوقع ردِ عمل کے خوف سے بیوی بچوں سمیت کہیں بھاگ گیا تھا۔ اب شاہ عالم سے رابطہ بھی مشکل نظر آتا تھا مگر میں نے کوشش کرکے دیکھنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

سیکسی آواز اور چینی لہجے میں انگریزی بولنے والی اس آپریٹر نے کہا "مسٹر شاہ عالم' سوری سر! وہ چیک آوٹ کرگئے ہیں ابھی کچھ دیر پہلے۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے وہ لنچ کر رہے تھے ڈائننگ ہال میں۔ اس وقت فون کیا تھا میں نے۔"

"یس سر' مسٹر تیمور فرام پاکستان!"

"ہاں۔ ان کے ساتھ ہانگ کانگ کے چار مشہور بزنس مین تھے۔ کیا ان میں سے کسی ایک کا نام معلوم ہوسکتا ہے۔"

"اوہ نو سر۔ یہ تو بالکل ہی ناممکن ہوگا۔ کوئی مہمان کسے لنچ پر بلاتا ہے۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کیا وہ کوئی ایڈریس دے گئے ہیں۔ جہاں ان کے پیغامات اور ملاقاتی ارسال کیے جائیں۔"

"نو سر۔ اور میں کیا کرسکتی ہوں آپ کے لیے۔"

"کچھ نہیں۔ تمہاری آواز سُن کے دل تو چاہتا ہے کہ میں کچھ کروں۔ مگر خیر۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے میں تمام صورتِ حال سے کیسے باخبر رکھ سکتا ہوں۔ پھر مجھے شبنم کا خیال آیا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔

اس نے ریسیور اُٹھا کے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "میں پیاسا بول رہا ہوں۔ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم' کیا یہ ممکن ہے؟"

وہ شاید سخت حیران تھی۔ "تم.... عالی...؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اپنے منہ سے۔ آخری بار یہ منہ دیکھنا چاہتی ہو جو کسی کو دکھانے کے لائق نہیں رہا تو فوراً آجاؤ۔"

"جناب عالی' کہاں آجاؤں میں؟"

"وہیں جہاں میں ہوں" میں نے کہا "ہم وہاں ہیں جہاں سے۔ ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی' تم بتاؤ' خبر کیا ہے؟"

"عالی۔ کیا یہ سچ ہے....؟"

"تم دل دار ہو۔ میرا مطلب ہے دل رکھنے والی۔ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"تم سے کچھ بعید نہیں۔"

"کیا تم میرے سچ پر یقین کروگی؟" میں نے افسردگی سے کہا۔

"پتا نہیں۔ سچ کیا ہے؟" وہ بولی۔

"تم واقعی میری فون کال کا انتظار کررہی تھیں؟"

"ہاں' اعتبار نہ ہونے کے باوجود۔" وہ بولی "کیوں فون کیا تم نے مجھے آخر؟"

"میں اغوا ہونا چاہتا ہوں۔ وعدے کے مطابق۔ کیا گاڑی ہے تمہارے پاس؟"

"وہی گاڑی ہے جسے تم موبائل ڈربا کہتے ہو۔ اپنی ہیرو میں بیٹھے ہوتا؟"

میں نے کہا "آکے دیکھ لینا۔ جناب عالی فرشِ خاک پر ملیں گے۔ یہ بتاؤ کتنی دیر میں پہنچ سکتی ہو تم۔ مجھے اغوا کرنے کے لیے؟"

"عالی۔ آج کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

"وہی جو پہلے نہیں ہوا تھا۔ حیران بعد میں ہونا۔ پہلے پتا سمجھ لو... اور دیکھو یہ بات تمہارے دوسرے کان نے بھی سُنی تو پھر میں کبھی نہیں ملوں گا۔ کہیں بھی نہیں ملوں گا۔ تمہارے خوابوں میں

بھی نہیں آؤں گا۔" میں نے اپنا پتا اُسے سمجھایا۔

وہ ہنسی "مجھے بالکل یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو۔ ایسی باتیں تم نے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ خیر' تم کوئی چکر دے رہے ہو مجھے تب بھی میں گلہ نہیں کروں گی جناب عالی' میں آتی ہوں تقریباً آدھے گھنٹے میں۔"

میں نے فون کو ہینگر میں لٹکایا اور گاڑی کی ڈکی کھول کے دیکھا۔ اس میں انجن آئل کا آدھا بھرا ہوا ٹن رکھا تھا۔ میں نے ڈکی میں ہی الٹ کے اسے خالی کردیا۔ پھر میں موڑ پر واقع..... پٹرول پمپ تک گیا۔ عام طور پر پمپ والے' ایک احمقانہ پابندی کے باعث ڈبے میں پٹرول دینے سے پہلے لینے والے کی صورت دیکھتے ہیں کہ یہ کہیں آگ لگانے کا ارادہ تو نہیں رکھتا۔ آگ لگانے والے پٹرول عراق یا ایران سے منگوا سکتے ہیں ورنہ کسی بھی موٹر سائیکل یا کار سے نکالنے میں کم وقت لگتا ہے۔ مجھے پٹرول دینے والا میری صورت سے دھوکا کھا گیا اور اس نے بلا تذبذب اور اعتراض ڈبے میں چار لیٹر پٹرول بھردیا۔

میں دس منٹ میں واپس پہنچا اور کار کو ایک اُجڑے چمن والی کوٹھی میں لے گیا۔ اگر کوئی باہر آتا تو میں کسی کا نام لیتا اور سوری کہہ کے واپس ہوجاتا مگر بند دروازوں سے خانہ ویرانی عیاں تھی۔ میں نے پٹرول کے ڈبے کو اندر سیٹوں پر خالی کیا۔ انجن اسٹارٹ کرکے خود باہر نکلا اور دروازہ بند کرکے کھلی کھڑکی سے جلتی ہوئی دیا سلائی اندر پھینک دی۔ پیٹرول کے بخارات اس وقت تک اندر بھر چکے تھے۔ ایک معمولی سے دھماکے کے ساتھ آگ نے گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں نے دوڑ کے درمیانی دیوار عبور کی اور پیچھے والی سڑک پر اُتر گیا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی اور گلی ویران تھی۔ کسی نے بھی مجھے چوروں کی طرح برآمد ہوتے نہیں دیکھا۔

چند منٹ بعد میں پھر وہیں تھا جہاں سے کچھ دیر پہلے میں نے شبنم کو فون کیا تھا۔ پیپل کے درخت کے نیچے ایک فقیر سو رہا تھا۔ ایک ہیروئن کا عادی سگریٹ جلا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر قسمت کا حال بتانے والا اپنے طوطے کے ساتھ قیلولہ کر رہا تھا۔

یہ بس اسٹاپ ہی تھا مگر بس کچھ دور موڑ کے پاس ٹھہرتی تھی' وہاں ٹین کا ایک شیڈ بھی تھا۔ میں نے ہیروئن پینے والے کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ جانے کو ترجیح دی۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"ڈرو نہیں' میں شریف آدمی ہوں" میں نے کہا۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ شریف آدمی تو میں ہوں" وہ بولا۔

اسی وقت شبنم کی پانچ چھ سال پُرانے ماڈل کی سوزوکی ایف ایکس نمودار ہوئی۔ اس کو میں نے گرے کلر اور لٹکتے بمپر سے پہچان لیا تھا مگر شبنم کی نظر مجھے دیکھ چکی تھی۔ اس نے کار میرے سامنے لاکے روک دی۔

"دیکھ لو۔ میں واقعی فرشِ خاک پر ہوں" میں نے کہا اور کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہوگیا۔ ہیروئن پینے والے نے مجھے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا اور پھر ایک گالی دی "شریف زادہ...." میں نے شبنم کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کردیا "چلو۔"

وہ مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی "عالی۔ آخر یہ چکر کیا ہے۔ کم سے کم مجھے تو بتادو۔ تم یہاں کیوں بیٹھے تھے اس طرح؟"

"تمہارا انتظار کررہا تھا۔ اب مجھے اغوا کرکے دنیا دے اس نکڑ لے جاؤ جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ میں سب بتادوں گا۔ یہ اخبار مجھے دے دو تاکہ میں اپنے سامنے کرلوں۔ اور ہاں' آج تم کچھ زیادہ حسین لگ رہی ہو۔"

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "اگر تم پاگل نہیں ہوئے ہو عالی' تو میں ضرور پاگل ہوجاؤں گی" اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

میں نے کہا "ملک عمر دراز کے بارے میں تازہ ترین خبر کیا ہے؟"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟"

"اسے میں نے زہر نہیں دیا شبنم!"

"ایک سو ایک چشم دید گواہ ہیں تمہارے خلاف۔ اور مرتے وقت بھی ملک نے تمہارا اور صرف تمہارا نام لیا تھا۔ تم جانتے ہو آخری وقت میں دیے گئے بیان کو قانون سچ سمجھتا ہے۔"

میں نے کہا "غلط ہے یہ اصول۔ فوت ہوتے وقت کون پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں ہوتا ہے۔ اگر اس قسم کے حالات میں مجھے مرنا پڑے تو دمِ آخر میری نگاہوں میں نیلی کی تصویر ہوگی۔ ممکن ہے اسی کا نام لب پر آجائے کہ اسی نے قتل کیا ہے مجھے۔ سب سے زیادہ۔"

"حالات و واقعات کی گواہی کو تم کیسے جھٹلاؤ گے؟ یہ طبعی موت تو نہیں تھی نا۔"

میں نے کہا "تمہیں کم سے کم پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی طبیعت میرے سامنے ہی بگڑنے لگی تھی۔ کچھ ہارٹ اٹیک جیسی کیفیت تھی جو اچانک پیدا ہوئی تھی۔ مگر ہارٹ اٹیک تو اچانک ہی ہوتے ہیں۔ ملک کی عمر بھی دیکھو' چالیس سال سے تو اوپر ہی ہوگی۔ اور اس کے حالات.... میرے اندازے کے مطابق' خاصے سخت رہے۔"

"تمہارے اندازے کے مطابق۔ یعنی تم جانتے نہیں.... کم سے کم میرے سامنے تو اتنے انجان مت بنو" وہ برہمی سے بولی۔

"دیکھو۔ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو مت پکڑو۔ میں ذرا پریشان ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے ملک عمر دراز کے بارے میں" میں نے کہا "کوئی وجہ بھی ہونی چاہیے اس الزام کے پیچھے۔ اگر میں نے اسے قتل کیا تو کیسے؟ گولی ماردی یا خنجر گھونپ کے ہلاک کردیا یا گلا گھونٹ دیا۔"

"تم نے اسے زہر دیا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیسے زہر دیا؟" میں نے کہا "وہ میرا نہیں اس کا آفس تھا۔ کیا وہی اس کا گھر بھی ہے؟"

شبنم نے پھر مجھے چونک کے دیکھا "تمہارا کیا خیال تھا کہ اسے سپورٹ کرنے والوں نے رہائش کے لیے عالی شان کوٹھی بھی دے دی ہوگی جس کے نہ بیوی بچے نہ ساتھ رہنے والے بھائی بہن۔ اسے تو ایک کرا بھی بہت ہے۔ اسی گھر میں اس نے اپنی دنیا آباد کی تھی۔ تم نے اس کے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ اسے تنہا اور لاوارث کردیا۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "میں نے!۔۔۔ تم بھی ایسا سمجھتی ہو۔۔۔ خیر کسی دن میں ثابت کردوں گا کہ یہ جھوٹ تھا۔"

"کچھ سچ کسی ثبوت کے محتاج نہیں ہوتے جناب عالی۔"

"دیکھو شبنم۔ ملک عمر دراز نے میرے ہاتھ سے کوئی چیز بھی نہیں لی تھی۔ نہ میں نے اسے سگریٹ آفر کی۔ سگریٹ ہم دونوں نہیں پیتے۔ نہ ٹافی اور چیونگم جیسی کوئی چیز۔ چائے اس کے کچن سے آئی تھی اور خود اس نے بنا کے مجھے ایک پیالی دی تھی۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت اسے شک ہوتا کہ میں نے کوئی زہر میں بجھی ہوئی سُوئی چبھودی ہے تب بھی یہ الزام آسکتا تھا مجھ پر۔ دور بیٹھے بیٹھے میں نے اسے زہر کیسے دے دیا آخر؟"

"اس کا گواہ کون ہے کہ چائے خود ملک عمر دراز نے بنا کے تمہیں دی تھی؟" شبنم بولی۔

"تمہارا مطلب ہے۔ چائے میں نے بنائی تھی اور عمر دراز کی پیالی میں نظر بچا کے زہر ڈال دیا تھا؟" میرا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں۔ الزام عائد کرنے والے کہہ رہے ہیں۔ چائے کے برتن پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیے ہیں۔"

"او مائی گاڈ۔ اپنا گواہ تو میں خود ہوں۔۔۔ اور کوئی نہیں تھا وہاں۔ جو تھا وہ مرگیا۔ شبنم' میرا لحاظ کیے بغیر ایک بات بتاؤ' یہ ملک عمر دراز تمہارے خیال میں کیسا آدمی تھا؟"

"وہ اچھا آدمی تھا' ایمان دار اور بااصول۔ اسی لیے وہ گھاٹے میں رہا۔ ہماری قومی تاریخ روز اوّل سے آج کے دن تک ایسے ہی عبرت آموز واقعات سے بھری پڑی ہے۔ عبرت دوسرے پکڑ رہے ہیں۔ ہم بچے کھچے اصول پرست اور مخلص لیڈروں کو پکڑ رہے ہیں۔ انہیں معتوب کررہے ہیں۔ بالآخر ذلت کے ساتھ سیاست سے نکال دینے کے لیے۔"

میں نے کہا "میری بھی رائے یہی ہے۔۔۔ اب۔۔۔"

"اب۔۔۔ کی مرے قتل کی بعد اس نے جفا سے توبہ" وہ تلخی سے بولی۔

"وہ ایک دین دار شخص تھا۔ خدا سے ڈرنے والا۔ جب میں اس کے پاس گیا تو وہ ظہر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوا تھا۔"

"نماز اس نے کبھی قضا نہیں کی تھی۔ یہ سب جانتے ہیں۔ وہ روزے دار تھا۔ حج بھی کر آیا تھا مگر اپنے نام کے ساتھ حاجی نہیں لکھتا تھا۔"

"ایسا شخص مرتے وقت جھوٹ نہیں بول سکتا شبنم۔ میں بڑا کمینہ ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے ساتھ کسی دشمن کو بھی لے جاؤں۔ کسی ایسے شخص کا نام لوں جس کے پھانسی چڑھنے سے کسی کو فائدہ ہو۔ میرے بیوی بچوں کو' میری پارٹی کو۔ حالانکہ خود میرے لیے آخری وقت میں کلمہ پڑھنے کے بجائے جھوٹ بولنے کا تصور بھی محال ہے۔ ملک عمر دراز نے ایسا کیا ہو۔ یہ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا میرے منہ میں خاک' محمد علی کلے کا مرتے وقت اعتراف کرنا کہ وہ سکہ تھا۔"

وہ کچھ قائل ہوئی "پھر حقیقت کیا ہے' تم مجھے سمجھاؤ۔"

"یہ بیان اس سے منسوب کیا گیا ہے" میں نے کہا "وہ تردید کرنے نہیں آسکتا۔ اور اس کے گواہ بھی وہی ہوں گے مس شبنم جنہوں نے یہ قتل کیا' اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے۔ کیا ملک عمر دراز کی موت فوری واقع ہوگئی تھی یا اسے اسپتال لے جایا گیا تھا؟"

"اس کے فزیشن کو بلایا گیا تھا۔ مگر وہ پہنچا تو ملک کا انتقال ہوگیا۔ اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں۔"

"کیوں معلوم نہیں؟" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "اتنی بڑی صحافی ہو تم۔۔۔"

"اس لیے معلوم نہیں جناب عالی! کہ صحافت سے زیادہ مجھے آپ کے عشق نے خوار کر رکھا ہے۔" وہ جھنّا کے بولی "میں بیٹھی ہوئی تھی ٹیلی فون سے لگ کر' تمہاری کال کا انتظار کررہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری آج ملک عمر دراز سے ملاقات طے ہے۔ مجھے کیا' کسی کو یہ علم نہیں تھا۔ وہ تو مجھے آپا صفیہ نے فون کرکے کہا۔"

"آپا صفیہ! کیا وہ بھی تمہاری طرح ہی ہیں۔؟"

"بدتمیزی مت کرو" وہ بولی "مجھے تو دوڑنا چاہیے تھا خبر کے لیے مگر یہ خبر عام ہوگئی تھی۔ ابھی کچھ دیر میں ضمیمے چھپ جائیں گے۔ سارے ہی اخبار والے دوڑے ہوں گے اپنی اپنی رپورٹ بنانے اور شاید کسی کو خیال بھی آیا ہو کہ شبنم نہیں آئی' شبنم پاگل اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھر رہی ہے۔"

"جان۔۔۔ غالباً تم دل کہنا چاہتی تھیں" میں نے کہا۔

"دل گیا بھاڑ میں۔ اس پر اختیار ہوتا اپنا تو میں تمہارے ساتھ ہوتی۔ کتنا خطرہ مول لیا ہے میں نے تمہیں پک کرکے۔"

"اغوا کرکے" میں نے اس کی تصحیح کی "طے شدہ پروگرام کے مطابق۔"

"تمہیں معلوم ہے اس وقت کیا صورتِ حال ہے شہر میں۔

جلسہ تو خیراب کیا ہوگا۔ مگر جلوس نکالے جائیں گے۔ ہنگامے ہوں گے۔ توڑ پھوڑ ہوگی۔ اب تک پولیس اور پیرا ملٹری فورس نے ایمرجنسی کا اعلان کرتے ہوئے گشت شروع کردی ہوگی۔ دیوانے لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہوں گے۔ خنجر' ریوالور لیے سینہ کوبی کررہے ہوں گے۔"

"ہاں یہ ڈراما تو ہوتا ہی ہے۔"

"ڈراما نہیں۔ یہ اجتماعی ہسٹریا بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ تم ایک مشتعل ہجوم اور ایک مشتعل فرد کی سائیکالوجی کے فرق کو سمجھتے ہو تو اندازہ کرلو کہ اس وقت غیظ و غضب کے جذبات کا رُخ کس سمت میں ہوگا۔ کس کی ذات ہوگی؟ اور میں اس ذاتِ شریف کو اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہوں۔ تم پھر بھی قدر نہیں کرتے میرے جذبات کی۔"

"قدر۔۔۔ قدر تو کرتا ہوں۔"

"مگر تم میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ تم شادی شدہ ہو۔ اس لیے کہ تم بدنامی سے ڈرتے ہو۔ اس لئے کہ تمہارے جذبات وہ نہیں جو میرے ہیں اور اس لیے کہ تم رخشندہ کو چاہتے ہو۔ سب سچ ہوسکتا ہے اس آخری بات کے سوا۔ نہ اسے تم سے محبت ہے نہ تم کو اس سے۔"

"آخر وہ بیوی ہے میری" میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

"وہ مجبوری ہے تمہاری۔ گلے میں پڑا ہوا طوقِ غلامی ہے اور تم اس کے گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہو۔ تمہیں اپنی پبلک لائف کا امیج خراب ہونے کی فکر نہ ہوتی تو تم کب کا اسے چھوڑ چکے ہوتے۔ اور اسے ڈر نہ ہوتا کہ تم اسے ہی نہیں' اس کے سارے خاندان کو تباہ کرسکتے ہو۔ تو وہ تم پر لعنت بھیج کر بھاگ گئی ہوتی تمہارے محل کی قید سے۔ اسے عیاشی کی زندگی ملی ہوئی ہے اور تم نے آزادی بھی دے رکھی ہے اسے کہ جو چاہو کرو۔"

"یہ بھی یقین ہے تمہیں۔"

"کیا یہ یقین غلط ہے۔ تم نے خاموش مفاہمت کرلی ہے۔ اس نے تمہاری عیاشیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ اور اب زبان بھی بند کرلی ہے۔ تم نے اسے مشروط آزادی دی ہے۔ تمہاری بدنامی نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی اسکینڈل تم افورڈ نہیں کرسکتے۔ مجھے دیکھو' کتنی ڈھٹائی سے بلکہ بے حیائی سے۔ اعتراف کرلیتی ہوں کہ میں تم پر مرتی ہوں۔ اور یہ بھی بتادیتی ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔"

"چنانچہ لوگ تمہیں پاگل سمجھتے ہیں۔"

"سمجھتے رہیں۔ اب تو سب نے سمجھانا بھی چھوڑ دیا ہے اور مجھ پر ترس کھانا بھی۔ مگر مجھے دیکھو کہ سب کچھ چھوڑ کے تمہارے ساتھ جارہی ہوں۔ اگر اس وقت ہم کہیں پھنس جائیں۔ خدا نخواستہ کوئی حادثہ ہوجائے اور لوگ جمع ہوجائیں۔ تو تمہیں پہچان جائیں گے اور پھر تمہارے ساتھ جو حشر میرا ہوگا' وہ میری گاڑی کو آگ لگادیں گے اور مجھے تمہارے ساتھ اس قتل میں برابر کا شریک سمجھ لیا جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ فرار ہورہی تھی۔ یا تمہیں فرار کرارہی تھی۔ مشتعل کارکن میرے فلیٹ کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ میری نوکری' عزت اور زندگی سب داؤ پر لگے ہوئے ہیں اس وقت۔ بتاؤ مجھے کون عورت ہے جو اتنی ہمت رکھتی ہے۔ اتنی قربانی دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔" وہ اتنی نروس اور جذباتی ہورہی تھی کہ ہسٹریا میں مبتلا ہوچکی تھی' وہ رورہی تھی۔

"پاگل لڑکی۔۔۔ خود کو سنبھالو۔ دیکھو میں نے بھی تم پر ہی اعتماد کیا۔ اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہے کوئی۔۔۔ مذاق کی بات الگ ہے۔ میں نے خود کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ تمہارے حوالے کردیا ہے مکمل طور پر۔ کل جب میری بے گناہی ثابت ہوجائے گی تو کس کا نام تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا' میرے نام کے ساتھ۔"

"کل کس نے دیکھی ہے" وہ مایوسی سے آنسو پونچھ کے مسکرائی "کل تم پھر شبنم کو جوتے کی نوک پر رکھو گے۔ ایسی بہت ہیں تم پر مرنے والی۔"

"نہیں شبنم۔ ایسی غلط بات مت کرو۔ میں اپنے گھر بھی جاسکتا تھا روپوش رہنے کے لیے۔"

"نہیں' تم گھر نہیں جاسکتے تھے۔ تمہیں اپنے گھر کی سلامتی عزیز ہے۔ وہاں تمہاری بیوی رہتی ہے۔ تمہارے والدین ہیں۔ ان پر الزام نہ آئے۔ انہیں نقصان نہ اُٹھانا پڑے۔ اس لیے تم گھر نہیں گئے۔ اب تک پولیس کے مسلح جوان اس گھر کو اپنی حفاظت میں لے چکے ہوں گے۔ مشتعل بلوائیوں کو دور رکھنے کے لیے۔ میں تم کو اپنے فلیٹ میں لے جارہی ہوں۔ بے شک وہاں آکے بلوائی مجھے اور تمہیں مار ڈالیں۔ آگ لگادیں وہاں۔"

"وقت آنے پر میں تمہارے اس احسان کا بدلہ ضرور ادا کروں گا۔"

"اچھا۔!" اس نے کار کو سیڑھیوں کے سامنے روک دیا "گویا احسان کا قرض اُتارا جاسکتا ہے۔ قیمت ادا کرکے۔ یا بدلے میں احسان کرکے۔ یہ لو چابی' میں کار کو آگے پارک کرکے آتی ہوں' جہاں ہمیشہ پارک کرتی ہوں' تم چلو۔"

میں چابیاں ہاتھ میں تھامے بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ مجھے معلوم ہی کہاں تھا کہ اس کا فلیٹ کون سا ہے۔ ابھی تک میں یہ فیصلہ کرنے سے بھی قاصر تھا کہ مجھے یعنی شاہ عالم کو دیوانگی کی حد تک چاہنے والی اس لڑکی کے سامنے سچ کا اعتراف کرلینا چاہیے یا اسے بے وقوف بنا کے اس کا جذباتی استحصال جاری رکھنا چاہیے۔ یہ قابلِ شرم حرکت تھی مگر میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ حقیقت کا علم ہوجانے کے بعد اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ شاہ عالم کے لیے تو اس کے جذبات نہیں بدلیں گے۔ یہ جاننے کے بعد کہ اصلی شاہ عالم اس وقت ہانگ کانگ میں ہے کیا وہ مجھے پولیس کے حوالے

نہیں کردے گی اور تاریخِ صحافت کی سب سے بڑی خبر کا ایٹم بم گرا کے راتوں رات شہرت کی اس بلندی تک پہنچ کے اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھائے گی جس کا خواب سارے صحافی دیکھتے ہیں مگر ان کی زندگی میں یہ موقع کبھی نہیں آتا۔ وہ مجھے دھوکے باز اور جعلساز سمجھے گی اور شاہ عالم اس کا محبوب ہے۔ سارے جہاں میں ایک ہے۔ اس جیسا کوئی اور بھی ہو' اس سے یہ کب برداشت ہوگا۔

وہ لوٹ کر آئی تو میں وہیں کھڑا چابیوں سے کھیل رہا تھا۔

"یا میرے خدا۔ تم کتنی بے خوفی سے کھڑے ہو یہاں۔" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے آگے دھکیلا "سب جانتے ہیں تمہیں یہاں' اچھی طرح پہچانتے ہیں۔"

"تمہاری وجہ سے؟" میں نے کہا۔

"ہاں میری وجہ سے" وہ بولی "کیا تم نے دیکھا نہیں ہے۔ کیا کچھ لکھ جاتے ہیں لوگ میرے دروازے پر۔ دیواروں پر تمہارے نام کے ساتھ میرا نام کیسے آتا ہے۔"

اس نے فرسٹ فلور کے کارنر فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ میں نے تو یہاں پہلی بار قدم رکھا تھا مگر شاہ عالم یہاں آتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے شبنم بدنام تھی۔ ایک ماڈرن' مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کے شہری' مسلمان اور انسان ہونے کے باوجود ابھی تک مردوں نے عورت کو اکیلے رہنے کا حق نہیں دیا ہے۔ اگر وہ کسی مرد کے سہارے کے بغیر عزت آبرو کے ساتھ جینا چاہے تو کوئی مرد باپ یا بھائی بن کے اس کی عزت کا رکھوالا اور اس کا سہارا بن کے آگے نہیں آتا۔ جو اس کی ہمت کرے وہ صرف تہمت مول لیتا ہے۔ شریف مرد جو اپنے اپنے گھروں میں ماؤں' بہنوں' بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں کسی عورت کی مجبوری کا عذر قبول ہی نہیں کرسکتے۔ ایسی اکیلی کیوں ہے آخر' کہاں گئے ماں باپ' رشتے دار' پکا شوہر ملا نہیں اور یہ کچے شوہر تلاش کرتی رہی۔ آجاتے ہیں پتا نہیں کون کون۔ ہم تو روز نیا چہرہ دیکھتے ہیں پردۂ اسکرین پر۔ عزت دار لوگ رہتے ہیں یہاں۔ ایسی عورتوں کی وجہ سے سب پر حرف آتا ہے۔ ہم تو ایک دن نہ رہنے دیتے جی ایسی عورت کو مگر کیا کریں' صحافی ہے' پولیس اور انتظامیہ اس کے ساتھ ہے۔ صحافی کا لیبل ہٹا کے دیکھے کوئی' جو ہم دیکھنے پر مجبور ہیں۔ اللہ توبہ۔

شبنم کسی کا نمبر ملا رہی تھی اور وہ شاید مل نہیں رہا تھا۔ تنگ آکے اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا "اب ایسے کیوں بیٹھے ہو؟"

"پھر کیا کروں؟" میں نے کہا۔

"عالی' پریشان ہونے سے کچھ فائدہ نہیں" وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"مجھے بھوک لگی ہے" میں نے کہا "پیٹ خالی ہو تو دماغ نیچے معدے میں آجاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔"

"کھانا کھاؤ گے؟" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"نہیں۔ کافی اگر مل جائے تو کافی ہے۔ چائے ہو تو چائے ہے۔ فرج میں بھی کچھ تو ہوگا۔" اس کے قرب کی خوشبو میرے حواس مختل کرنے لگی تھی۔

"تم واقعی اَپ سیٹ ہو۔ ہے نا یہی بات؟ کافی خود بنا کے لاتے تھے' میرے لیے بھی۔ کم آن' سب ٹھیک ہوجائے گا" اس نے میرے گلے میں بانہیں حمائل کرکے میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا اور پھر میرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگی۔

اس کے گداز بدن کی گرم خوشبو میں ایک ہیجان خیز پرفیوم بھی شامل تھی۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ شاہ عالم کے ساتھ اس کے مراسم کس حد تک دوستانہ یا عاشقانہ تھے۔ مجھے یہ علم تھا کہ وہ عیاش آدمی ہے اور عورت اس کی سب سے بڑی کمزوری بن چکی ہے' دولت مل جانے کے بعد۔ شبنم جیسی کسی عورت کو وہ گلے کا ہار بنانے کا قائل نہیں ہوگا مگر شبنم کے جذباتی استحصال سے اس کو مملکت کے چوتھے ستون کا سہارا حاصل تھا۔ وہ خود EXPLOIT ہونے کے لیے تیار تھی تو شاہ عالم اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیوں نہ کرتا ہوگا' پبلک لائف میں اسکینڈل سے بچنے کے لیے وہ شبنم سے رابطے کی تردید بھی کرتا ہوگا مگر شبنم نے کسی اسکینڈل کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جس کے کردار پر کوئی انگلی بھی اُٹھا سکے۔ جو اسے جانتے تھے وہ مانتے تھے کہ اس کی نظر شاہ عالم کے سوا کسی پر نہیں ٹھہرتی اور شاہ عالم کے عشق کی دیوانگی کا اعتراف وہ برملا کرتی تھی۔ جس کا جو جی چاہے کہے جو چاہے سمجھے۔ شاہ عالم مجھے لفٹ نہیں دیتا' نہ دے۔ وہ شادی شدہ ہے' ہوا کرے۔ مجھے کوئی اس کی داشتہ کہتا ہے' کہتا رہے۔ جب میں تن من سے اس کی ہوگئی' ڈھیر ہوگئی۔ وہ میرا محبوب ہے تو ہے۔ ظاہر ہے اس انتہا کے بعد زبانِ خلق بھی تھک ہار کے خاموش ہوجاتی ہے۔ زبانِ خلق اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی کیونکہ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ جو ڈرتا ہے وہی مرتا ہے۔ شبنم سے بزدل' غیبت کرنے والے ڈرتے تھے۔ وہ کوئی گلے سے بچھڑ جانے والی لاوارث بھیڑ نہیں تھی جسے ہوس کے بھوکے بھیڑیے گھیر کے شکار کرلیں' وہ عرفِ عام میں جنگلی بلی تھی۔ شیرنی تھی۔ یہ بھیڑیے اس پر دوری سے غراتے رہتے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجتی تو شبنم کی مجھ سے قربت کا انجام کیا ہوتا۔ میں اپنے خیالات میں محو تھا اور یہاں آکے واقعی پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا مگر شبنم نے میری محویت کا غلط مطلب نکال لیا تھا۔ اس نے میری خاموشی کو نیم رضا اور عافیت کی ضرورت کو خودسپردگی کی اجازت سمجھ لیا تھا۔ نہ جانے کب اور کیسے میرا ذہن بھٹک گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں شبنم کے اس فلیٹ میں نہیں' کہیں اور ہوں جہاں مجھ پر چندا کے لطف و کرم کی چاندنی نچھاور ہورہی ہے۔ اس کی پُرسکون اور نرم ٹھنڈک میرے وجود میں نشہ بن کے اُتر رہی ہے۔ ساری

کائنات کا سکوت ایک سحر آفریں احساس کی نغمگی میں ڈوب گیا ہے اور میں چاندنی میں ایسے تحلیل ہورہا ہوں جیسے چاندنی جھیل کے ساکت اور شفاف پانی کی تہ تک اترتی ہے۔

یہ خواہش کا سراب تھا' فریبِ آرزو تھا اور طلسمِ خیال تھا جس نے مجھے بڑی عیاری سے محصور کرکے تقریباً شکار کرلیا تھا۔ جب ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے حقیقت کی دنیا میں کھینچا تو میں سخت شرمندہ ہوا۔ شبنم نے خود کو سنبھالنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور شاید کان بھی بند تھے کہ اس نے فون کے چلّانے کی پروا نہیں کی۔

اس نے مجھے پھر اسیر کرلیا۔ مگر میں اب پوری طرح ہوش میں آچکا تھا' میں نے کہا "....فون...؟"

اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور مسکرادی "چھوڑو اسے عالی۔"

میں نے کہا "کوئی ضروری فون ہوگا۔"

"مجھ سے بھی زیادہ ضروری؟" اس نے کہا۔

میں نے نرمی اور محبت سے خود کو چھڑالیا "بھوکے پیٹ عشق نہیں ہوسکتا۔"

"اچھا۔ ذرا تم کافی بناؤ" وہ فون کی طرف بڑھی۔ اس کی صورت سے ناآسودگی اور مایوسی کے ساتھ پسپائی کی خفت کے جذبات بھی عیاں تھے۔ جن کو اس نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے بڑی منافق مسکراہٹ میں چھپالیا تھا۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے میں نے توبہ کی۔ خدا سے پناہ مانگی کہ مجھے اس عورت کے حُسن و شباب کی گمراہ کرنے اور فنا کرنے والی سفلی علم کی شیطانی طاقت جیسی کشش سے محفوظ رکھ اور اعتراف کیا کہ اس عورت کی قوتِ تسخیر کے سامنے ہر مرد سرنگوں ہوسکتا ہے اگر اسے عواقب کا خوف نہ ہو۔

فلیٹ کا جائزہ میں پہلے ہی لے چکا تھا۔ یہ دو کمروں کا نیا فلیٹ تھا اور مجھے اس میں ضرورت و آرائش کا سب سامان بھی نیا لگ رہا تھا۔ بیڈ' پردے' قالین تقریباً نئے تھے۔ جدید وضع کا ایک صوفہ دوسرے کمرے میں مہمانوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ ڈیکوریشن پیس اور دیواروں پر آویزاں تصاویر سے بھی شبنم کے ذوقِ جمال کا اندازہ ہوتا تھا۔ کچن بھی بہت صاف ستھرا تھا اور پورے گھر کی ترتیب اور سلیقے میں کسی عورت کا ہاتھ واضح طور پر کارفرما محسوس ہوتا تھا۔

ابھی میں چولہا جلانے کے لیے ماچس تلاش کررہا تھا اور کیبنٹ کھول کے کافی بنانے کے اسباب تلاش کررہا تھا کہ وہ آگئی۔

"اُفوہ... ابھی تک کھڑے ہو" اس نے ایک کونے سے ماچس اُٹھا کے چولہا جلایا اور کیتلی اس پر رکھ دی "مجھے جانا ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شاہ عالم تو جانتا ہوگا کہ کافی کہاں ہے اور چینی کہاں "کس کا فون تھا؟"

"پریس کانفرنس ہے۔ ملک عمرو راز کے آفس میں" اس نے دوسری کیبنٹ سے مگ نکال کے کہا۔

"شہر کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"تھوڑے بہت ہنگامے ہوئے ہیں۔ جلسہ منسوخ کردیا گیا ہے اور جلسہ گاہ کو پولیس نے خالی کرالیا ہے۔"

"عمرو راز کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملی ہے یا نہیں؟"

"یہ تو وہاں جا کے معلوم ہوگا۔ ویسے تم اس رپورٹ پر زیادہ بھروسا مت کرو۔ رپورٹ کچھ بھی لی جاسکتی ہے۔"

میں نے سر ہلایا "ہاں۔ رپورٹ سے ثبوت مل جائے گا کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ اس سے مجھے بھی اختلاف نہیں مگر زہر دینے والا کون تھا؟"

"زہر تم نے دیا تھا۔"

"میں ایک جھانپڑ رسید کردوں گا پھر یہ بات کہی تو...."

"جنابِ عالی' میں نقارۂ خدا کی بات کررہی ہوں' زبانِ خلق کی۔"

اس نے مگ میں گرم پانی ڈال کے ہلایا اور چولہا بند کردیا۔ دونوں مگ اٹھائے اس نے کھانے کی میز پر رکھے اور فرج میں سے کچھ نکالنے لگی۔

میں نے کہا "شبنم' اگر میں تمہارے ساتھ چلوں..."

اس کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کے نیچے گر گئی۔ اس نے جھک کر اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ فرج کا دروازہ کھولے کھڑی رہی اور پھر میری طرف پلٹی "میرے ساتھ.... کہاں...؟"

"پریس کانفرنس میں" میں نے کہا "اور شہر میں یہ دیکھنے کے لیے کہ صورتِ حال کیسی ہے؟"

اس نے نیچے سے ڈبل روٹی اٹھائی۔ مکھن اور جام نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ "اس وقت یہی ہے۔"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"کیا جواب دوں ایسی احمقانہ بات کا۔ تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ فون کرو اپنی پیاری بیوی کو۔ پتا چلاؤ کہ تیمور کہاں ہے؟" اس نے سلائس پر مکھن پھیلاتے ہوئے کہا "باہر نکلے تو تمہاری خیر نہیں۔"

میں نے کہا "خیر تو یہاں بھی نہیں میری۔"

وہ ہنسی "کیا یہ صحیح ہے کہ تم ملک کو منانے گئے تھے۔ تم نے اسے کوئی پیش کش کی تھی صلح کے لیے؟"

"ہاں' میں نے کہا تھا کہ تم پارٹی کے صدر بن جاؤ۔ پھر تم جو کہو گے میں کروں گا۔ وہ کہنے لگا کہ ایسے نہیں' مجھے چیئرمین بنادو' اگر تم واقعی اپنے ارادے میں مخلص ہو" میں نے کہا "مجھے اس کے لیے خصوصی اختیارات دیے گئے تھے۔ تم ایگزیکٹو کمیٹی کی یہ قرارداد دیکھ سکتی ہو۔ اس پر سب کے دستخط ہیں۔ صدر کے عہدے کی گنجائش نکالی گئی تھی مگر وہ بننا چاہتا تھا چیئرمین۔"

"اس نے یہ بات غیر سنجیدگی سے کہی ہوگی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔" اس نے قرارداد کے مضمون پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور بفرضِ محال میں مان جاتا..... پھر...؟"

"وہ انکار کردیتا' اب تم اور وہ ساتھ ساتھ چل ہی نہیں سکتے تھے۔ عالی یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "قرارداد کا اصل مسودہ ہے اور کیا ہے؟"

اس نے حیرانی سے کہا "اور یہ نام..... ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کے سارے نام میرے لیے اجنبی ہیں۔ کیا تم نے پُرانی کمیٹی کو برطرف کرکے نئے لوگوں کو شامل کیا تھا؟"

"نہیں نئے..... نہیں' میرا مطلب ہے اتنے نئے بھی نہیں۔"

"مگر پہلے جو لوگ تھے۔" وہ سوچ میں پڑگئی "خیر..... تم جو چاہو کرو۔ مجھے تمہاری سیاست سے کیا لینا دینا۔ تم پرائم منسٹر ہاؤس میں رہو' اپنے گھر میں یا جیل میں؟ شبنم کے دل میں کوئی اور نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "آخر تم کیوں چاہتی ہو مجھے؟ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔"

"جو لوگ تمہیں جانتے ہیں۔ تمہارے ظاہر اور باطن سے واقف ہیں۔ ان کے نزدیک تم انسان ہو نہ آدمی' تم ایک شیطان ہو۔"

میں نے کہا "تمہیں بھی سب معلوم ہے' میرے بارے میں....."

"ہاں۔ مگر مجھے فرق نہیں پڑتا" اس نے کہا۔

"آخر کیوں؟"

"عقل کا جواز مت پوچھو مجھ سے۔ تم میں ہے کوئی بات جو خود میری سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہارے سامنے میں خود کو اتنا بے بس اور مجبور کیوں محسوس کرتی ہوں۔ کوئی جادو ہے تمہارے پاس۔ جو صرف مجھ پر اثر کرتا ہے۔ اسے ایک حیوانی کشش نہیں سمجھا جاسکتا۔ میں ایک اشارہ کردوں تو تم سے زیادہ خوبرو مرد جو مجھے دور سے دیکھ دیکھ کے آہیں بھرتے ہیں اور میرے قریب آنے کے حیلے تلاش کرتے ہیں' وہ میرے قدموں پر سر رکھ دیں گے۔ تمہاری خاطر میں نے صحافت کے پیشے میں بددیانتی کی۔ اپنے فرض کے تقاضوں کو نظرانداز کیا۔ پردہ پوشی کی تمہارے عیوب کی۔ بلکہ جرائم کی۔ جیسے اس وقت میں تم کو یہاں لے آئی ہوں زمانے سے چھپا کے۔ ایسی وفاداری کی توقع تم اپنی بیوی سے نہیں کرسکتے۔ میں نے بڑے بڑے نامی گرامی سیاست دانوں کی پرائیویٹ لائف کو پبلک کردیا۔ ایسے ایسے راز فاش کئے کہ وہ رُسوا ہوگئے۔ میں نے لاکھوں کی رشوت قبول نہیں کی۔ مجھے تحفے میں یا انعام کے طور پر کار' کوٹھی سب مل سکتے تھے۔ اور وہ تم جیسے خطرناک لوگ تھے جو مجھے اُٹھوا لیتے تو میرا پتا نہ چلتا۔ مگر میں ثابت قدم رہی۔ ایک تم ہو کہ تم پر میں نے سب کچھ لُٹادیا اور تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔"

میں اس کے جنونِ عشق سے متاثر ہوگیا تھا "ایک سیاست داں کی حیثیت سے تم کیا سمجھتی ہو مجھے۔ میں شبنم سے نہیں' اس صحافی سے پوچھ رہا ہوں جس نے کسی کی غلطی کو نہیں بخشا۔"

اس نے کافی کا خالی مگ رکھا اور مجھے گھورتی رہی "تم کسی سے کم نہیں ہو شاہ عالم۔ تم نے وہی کیا ہے جو اس ملک کے بے ضمیر لیڈر کرتے رہے ہیں۔ شاید ان سے بڑھ کے سیاہ کارنامے تمہارے ہوں گے۔ تم نے صرف دشمن بنائے ہیں' دوست نہیں۔ تم زور' زبردستی' جبر اور دہشت سے لیڈر بھی بن گئے مگر لوگ تم سے ڈرتے ہیں اور جہاں خوف ہو وہاں صرف نفرت ہوتی ہے۔ تم سے کوئی محبت کیسے کرسکتا ہے۔ سوائے ایک پاگل عورت کے جس کا نام شبنم ہے۔"

میں اپنے بارے میں ان تمام انکشافات سے حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ میں نے اپنے لیے شیطان کے ہمزاد کا رول قبول کرلیا تھا۔ بے شک میں نے ایسا اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا۔ مجھ پر شاہ عالم نے وہی ہتھکنڈے آزمائے تھے جو اس کی سیاست کے انداز سے منسوب تھے۔ اس نے مجھے ٹریپ کیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا اور اس نے میرے لیے ایک ایسا جال پھیلادیا جس میں میرے ساتھ سب گرفتار ہوگئے۔ میں اور چندا' قمر اور کمال۔ اور خان اعظم۔ یہ نہ پکڑے جاتے تو میں رہائی پر اسیری کو ترجیح دیتا مگر انہی رشتوں نے مجھے بلیک میل ہونے پر مجبور کردیا۔

شبنم یہ سمجھتی تھی کہ میں سب کچھ جانتا ہوں مگر میں جانتا تھا کہ اپنے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ میرے پاس سطحی معلومات تھیں جو مجھے تیمور سے ملی تھیں اس نے مجھے شاہ عالم کی زندگی اور شخصیت کا صرف روشن پہلو دکھایا تھا اور اس کے "خلاف" استعمال کرنے کے لیے اس کے کردار کے کچھ منفی پہلو بھی بیان کئے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے شاہ عالم کی ہدایت پر مجھے اس کا آلۂ کار بنانے کے لیے ساری منصوبہ بندی کی تھی۔ اس نے سب جھوٹ بولا تھا اور غلط بیانی کی تھی۔ شاہ عالم کی فطرت کے قابلِ نفرت پہلو کو اس نے مجھ سے چھپالیا تھا۔ وہ شاہ عالم کا خاص آدمی تھا اور اس نے بڑی ذہانت سے کام لیا تھا۔ اس نے مجھے شاہ عالم بنا کے میرے ہاتھوں ایک قتل کرادیا تھا۔ یا مجھے قتل میں ملوث کردیا تھا۔ اس سے شاہ عالم کو دُہرا فائدہ پہنچا تھا۔ اس کا سب سے خطرناک سیاسی حریف ثابت ہونے والا ملک عمر دراز اس کی راہ سے ہٹ گیا تھا اور بہت جلد اس کی حمایت کرنے والوں کے مقدر میں ذلت کا عذاب بھی تھا' جب وہ کھل کے شاہ عالم کا نام لیں گے۔ ایک سو ایک چشم دید گواہ پیش کریں گے اور شاہ عالم کے سیاسی کیریئر کے خاتمے کے لیے شہید ملک عمر دراز کی لاش پر سینہ کوبی کرتے ہوئے مطالبہ کریں گے کہ قاتل کو سرِعام پھانسی دی جائے تو شاہ عالم مسکراتا ہوا ہانگ کانگ سے کوئی فلائٹ پکڑے گا۔

اس کی روانگی کی خبر شائع کرانے کے لیے تیمور نے پیشگی بندوبست کرلیا ہوگا۔ آج اس کے جہاز میں سوار ہوتے وقت سی آف کرنے والوں کو ہاتھ ہلانے کی باتصویر خبر شائع ہوگی تو کل وہ مسکراتا ہوا سیکڑوں لوگوں کے سامنے جہاز سے کراچی ائرپورٹ پر اُترے گا۔ اسے پہنچنے میں چوبیں گھنٹے کیوں لگے؟ ویل..... وہ سنگاپور گیا جہاں وہ فلاں کے ساتھ ڈنر پر مدعو تھا۔ ڈنر میں فلاں فلاں تھے۔

سنگاپور میں ایک رات قیام کے بعد وہ آج وطن کے لیے روانہ ہوا۔ پھر ہکابکا لوگ اور اخبار والے اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اخباروں کی شہ سرخیوں کے ساتھ۔ یہ کیا ہے مسٹر شاہ عالم' یہ کیا ڈراما ہے۔ یہ کیسا مداری کا کھیل ہے۔ آپ کے خلاف تو سیاسی حریفوں نے ملک عمر دراز کے قتل کی ایف آئی آر بھی درج کرادی ہے اور وہ اخبار دیکھ کے حیرانی سے کہے گا۔ "جنٹلمین! مجھے لگتا ہے یہاں سب پاگل ہوگئے ہیں۔ میں نے تو کل سے کوئی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ میں بھی آپ لوگوں سے یہی سوال کرتا ہوں کہ یہ کیسا مداری کا تماشا ہے۔ کون ہے یہ مداری جس نے میری عدم موجودگی میں یہ کھیل دکھایا۔ اب میں آگیا ہوں تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔ آج میں اپنے وکیلوں سے مشورہ کرنے کے بعد کل پریس کانفرنس میں سب بتاؤں گا۔"

اس کے سیاسی حریفوں کو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔ ایک سو ایک چشم دید گواہ جھوٹے ثابت ہوں گے جنہوں نے شاہ عالم کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کو جھوٹا قرار نہیں دیا جاسکے گا۔ اس کے بعد یہ سوال پھر سامنے آئے گا کہ ملک عمر دراز کو کس نے قتل کیا تھا۔ شاہ عالم کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانے کی خواہش میں کس احمق نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی؟ شاہ عالم ان کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ کرے گا۔ شاید ان پر شک کا اظہار کرے گا جنہوں نے ملک عمر دراز کو اس کے خلاف اکسایا تھا اور اس کی حمایت کی تھی۔ ان کی سیاسی دکان کا بھٹا بیٹھ جائے گا اور رہی سہی کسر ہتکِ عزت اور ہرجانے کے دعوے سے پوری ہوگی۔ شاہ عالم سے بڑا مداری کوئی نہیں' یہ پھر ثابت ہوجائے گا۔

اس انکشاف سے خود شبنم پر کیا گزرے گی؟ وہ تو سوچ سوچ کے پاگل ہوجائے گی کہ جس شخص کو وہ شاہ عالم سمجھ کے اپنے ساتھ لے آئی تھی وہ کوئی جعلساز تھا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ایک شاہ عالم بیک وقت دو جگہ پایا جائے۔ وہ لاہور میں بھی ہو اور ہانگ کانگ میں بھی۔ اصل شاہ عالم ان میں سے کون تھا؟ وہ ہانگ کانگ والا یا لاہور والا۔ کیا تیمور یہ بات جانتا تھا؟ شبنم مجھے اپنے ساتھ لاکے خود شریکِ جرم ہوگئی تھی۔ وہ کسی کو کیا بتائے گی' اور بتائے گی تو اس پر یقین کون کرے گا۔ لو بھائی' یک نہ شد دو شد۔ ایک کافی نہیں تھا اسے کہ اس نے دوسرا پیدا کرلیا۔ پیدا کرلیا کیا معنی؟ ہاہاہا۔ بھئی حاصل کرلیا' خرید لیا' بنوالیا۔ سائنس کمشن کا دور ہے۔ پیدا کرنے کے پُرانے مطلب میں بڑا فرق پڑگیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ شاہ عالم اسی چکر میں ہانگ کانگ گیا تھا۔ اپنے جیسا دوسرا بنوانے کے لیے۔ سکس ملین ڈالر مین والا آئیڈیا ہے۔

اور جب شاہ عالم کے ہانگ کانگ میں ہونے کی اطلاع ملے گی تو اس کی بیوی رخشندہ کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ اس کے دو خصم ہیں۔ ایک حقیقی اور ایک مجازی۔ ایک لکاہی اور دوسرا....."

شبنم نے جاتے ہوئے کہا "میں آجاؤں گی ایک گھنٹے میں۔ پوری رپورٹ لے کر آؤں گی۔"

"یہاں لاؤ گی رپورٹ۔ اپنے اخبار کو نہیں دوگی؟"

"آج میں یہ کام آپا صفیہ کے سپرد کردوں گی ورنہ تو مجھے آدھی رات ہوجائے گی" اس نے میرے قریب آکے پھر مجھ پر ایک جذباتی یلغار کی "آج میں خود کھانا پکاؤں گی تمہارے لیے۔ تم پہلی بار میرے مہمان ہوئے ہوتا۔ بخت جاگا غریب خانے کا۔"

میں نے خود کو چھڑا کے کہا "یہ تم سیاہ مردانہ قمیص کیوں استعمال کرتی ہو ہمیشہ۔ اور یہ اوپر والا بٹن....."

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "تم کو بھی یہ انداز اچھا لگتا تھا۔ اب جی بھرگیا ہے دیکھ دیکھ کے تو بتادو مجھے کیا پہننا چاہیے؟"

میں نے اس سے دوسرا غلط سوال کیا "اور یہ خوشبو کون سی ہے۔ پاگل کرنے والی؟"

وہ خوش ہوکے ہنسی "بدمعاش۔ خود لاتے ہو پاگل ہونے کے لیے اور مجھے پاگل بناتے ہو۔"

اس کا دوسرا حملہ زیادہ شدید تھا مگر میں نے اسے باہر دھکیل دیا "اتنی بے قراری بھی اچھی نہیں' ساری رات پڑی ہے۔"

اس کا چہرہ گلنار ہوگیا "میں نہیں جاتی۔"

"تمہارا جانا بے حد ضروری ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ ہی رہوں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے عالی!"

"کیا میں بھیس بدل کے نہیں جاسکتا یا برقع اوڑھ کے۔"

وہ ہنسی "میں باہر سے تالا لگا کے جارہی ہوں۔ کوئی بھی آئے گا تو تالا دیکھ کے لوٹ جائے گا۔ کوئی فون مت اٹینڈ کرنا۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرے پاس زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا تھا۔ شاہ عالم کے ہانگ کانگ میں ہونے کا راز اس سے پہلے بھی فاش ہوسکتا تھا۔ میرا ڈبل رول میری گردن میں پھانسی کا پھندا بن گیا تھا۔ افشائے راز سے قبل ہی میرا غائب ہوجانا ضروری تھا۔ مجھے شاہ عالم اور اس کے حواریوں کے بارے میں بہت کم معلوم تھا لیکن جو معلوم ہوا تھا وہ انتہائی قابلِ نفرت تھا۔ وہ شیطانی کھیل دکھانے والے مداری تھے۔ ان کے سازشی ذہن بہت خطرناک حد تک تخریبی اور انسانیت کش تھے مگر اس کے ساتھ ہی ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور انہوں نے اپنے گرد بدمعاشی کی ایسی سلطنت قائم کررکھی تھی جس میں ان کی طاقت کا

قانون چلتا تھا اور اپنے گھمنڈ میں وہ نمرود کی خدائی سے بڑھ گئے تھے۔

مجھے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر کے شاہ عالم نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ سوتے ہوئے کتے کو سونے دو۔ جاپانی کہتے ہیں خاموش آتش فشاں کے دہانے کو مت چھیڑو۔ خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰؑ ہمیشہ پیدا کیا ہے چنانچہ آج بھی کوئی طاقت کے نشے میں بدمست ہو کے لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کردے اور زمانے کو للکارتا پھرے کہ ہم چو من دیگرے نیست۔ جیسے کسی نے بگاڑ کے یوں کردیا ہے کہ ہم چو من ڈنگرے نیست۔ کہ ہم جیسا کوئی بیل نہیں۔ گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ شاہ عالم کی شامت نے اسے مجھ سے پنگا لینے پر مجبور کیا تھا۔

اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ تیمور نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا سب بکواس تھی۔ نہ ہٹلر کی طرح شاہ عالم کو اپنے کسی ہم شکل کی ضرورت تھی جسے وہ ڈبل کے طور پر استعمال کر سکے۔ نہ یہ ممکن تھا کہ میں شاہ عالم کی جگہ ایوانِ اقتدار میں پہنچ جاؤں۔ صرف اس لیے کہ میری اور اس کی صورت میں سرِمو فرق نہ تھا۔ ابھی تو خود اس کی منزل دور تھی۔

اس نے محسوس کیا تھا کہ ملک عمرِدراز کی صورت میں اچانک ایک کمزور دشمن نے اتنی طاقت پکڑلی ہے کہ اس فتنے کا سدِّباب ضروری ہوگیا ہے ورنہ وہ اس کی سیاسی جماعت پی ایل ایف کو ہائی جیک کرلے گا۔ اس سے بددل اور بدگمان سیاسی کارکن اس کے سیاسی حریف اور دشمن عمرِدراز کو آگے لا رہے تھے۔ شاہ عالم نے اس کے اصولی اختلاف پر عمرِدراز کو سزا دینے کی کوشش ضرور کی ہوگی اور اس کی سرکشی پر اس کی سرکوبی کا بھی سوچا ہوگا مگر شاید یہ عمرِدراز کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بچا رہا اور شاہ عالم کے خلاف طاقت پکڑتا رہا۔ اپنے غرور میں شاہ عالم نے اسے اہمیت نہیں دی اور یہی سمجھتا رہا کہ وہ ایک چیونٹی ہے۔ جب چاہوں گا اسے مسل دوں گا مگر خدا کو غرور اور تکبر پسند نہیں اور وہ مغرور کا سر نیچا کرنے کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ سے ایسا ہی عبرت آموز بندوبست کرتا ہے کہ چیونٹی ایک ہاتھی کو گرا دیتی ہے اور ایک مچھر نمرود کو مار ڈالتا ہے۔

شاہ عالم جوانی، طاقت اور دولت کے نشے، شہرت اور عزت کے خواب اور اقتدار کی ہوس میں ملک عمرِدراز کے بڑھتے ہوئے طوفان کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ہانگ کانگ، سنگاپور اور پیرس کی رنگینیوں میں گم تھا اور اس تصور میں گم تھا کہ بہت جلد اس پر ایوانِ اقتدار کے دروازے کھلنے والے ہیں۔ جب اسے ہوش آیا تو پانی سر سے گزرنے والا تھا۔ ملک عمرِدراز کی مقبولیت اس کے لیے خطرہ بن چکی تھی۔

اس خطرے سے نجات پانے کے لیے اس نے اپنے شاطر ذہن کو استعمال کیا جس پر اسے بہت غرور تھا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ مجھ سے مل چکا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ میں اس کا ڈپلی کیٹ ہوں۔ اس نے مداری کی طرح ایک نیا تماشا دکھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سارا کھیل تیمور کو سمجھایا اور خود اطمینان سے شراب و شباب کے کھیل میں لگا رہا۔ میرے اور اس کے پاسپورٹ تیمور نے بدلے اور جب وہ مجھے قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ قدرت نے مجھے ایک سنہری موقع عطا کیا ہے۔ میرے نام اقتدار کی لاٹری نکل آئی ہے اور میں چاہوں تو آسانی سے شاہ عالم کی جگہ لے سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں فیصلہ کرسکتا میں نے خود کو شاہ عالم کے ٹکٹ اور پاسپورٹ پر سفر کرنے پر مجبور پایا اور تیمور نے مجھے شاہ عالم بنا کے چھوڑا۔ واپسی کے راستے خود بخود بند ہوتے چلے گئے۔ نادیدہ ہاتھ مجھے ان راستوں پر دھکیلتے رہے جو جرم و گناہ کی بھول بھلیوں کے راستے تھے۔ میں شاہ عالم کے بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ اس کی بیوی رخشندہ کے ساتھ سوتا رہا۔ اس منظر کی فلم بندی ہوگئی۔ پھر میرے ہاتھوں روزی کا قتل ہوا۔ دوسرے بدمعاش کو میں نے صرف ناک آؤٹ کیا تھا مگر اسے بعد میں قتل کردیا گیا۔ اس دُہرے قتل کی واردات کو ایک خفیہ کیمرے کی آنکھ نے دیکھا اور پھر وہ فلم مجھے دکھائی گئی۔ میں رخشندہ کے بیڈ پر اس کے ساتھ تھا۔ میں نے روزی کو مار کے اس کی لاش بیڈ کے نیچے چھپائی۔ میں نے اس کے نام نہاد کزن کو بھی مار کے باتھ روم میں ڈالا۔ پھر چوکیدار کو ٹھکانے لگایا۔ اسے بھی میں نے صرف اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے خاموش کیا تھا مگر اب مجھے شبہ تھا کہ وہ بھی زندہ نہیں ہوگا۔ میں اسے ڈریسنگ روم میں گھسیٹ کر لے گیا تھا اور فلم میں کسی بے ہوش آدمی کو یا کسی لاش کو گھسیٹنے کا سین ایک جیسا ہی نظر آتا ہے۔

جب میں ہر طرف سے محصور ہوگیا تو میرے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ شاہ عالم نے واقعی مداری کا وہ کھیل دکھایا تھا کہ میری نظر اس کی حقیقت کو سمجھ ہی نہ پائی۔ میں اس لیے بھی ڈر گیا کہ انکار کا خمیازہ چندا کو اور قمر کو بھگتنا پڑتا۔ خان اعظم اور کمال کو بھگتنا پڑتا۔ تیمور نے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ خود مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا تھا اور جو کچھ خان اعظم نے یا کمال نے سُنا اور دیکھا اس سے ثابت بھی یہی ہوتا تھا کہ انکار کرکے پہلے میں ذلت و رسوائی کا طوق اپنے گلے میں ڈالوں گا اور بالآخر پھانسی کا پھندا۔ میرے حق میں اقرار ہی بہتر تھا۔ اس سے مجھے وقتی طور پر تحفظ حاصل ہوجاتا تھا۔ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت مل جاتا تھا اور مداری کے کھیل میں بچے جمہورے کی طرح شریک ہو کے اس کے کھیل کو سمجھ سکتا تھا۔

شاہ عالم نے مجھے آلۂ کار بنایا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ درخواست یا منت سماجت سے ملک عمرِدراز کو ملاقات کے لیے راضی کرلیا۔ وہ ویسے بھی شاہ عالم کے مقابلے میں شریف آدمی تھا۔ مردم گزیدہ اور شاہ عالم کے مظالم کا نشانہ بننے والے عمرِدراز نے

اپنے بدترین دشمن سے بھی ملنا منظور کرلیا اور جیسا کہ میں نے دیکھا۔ اس نے میرے ساتھ فراخ دلانہ شرافت کا برتاؤ کیا۔

شاہ عالم نے یا تیمور نے باقی سب طے کرلیا تھا۔ ایگزیکٹو کمیٹی کی وہ قرارداد ایک ڈھونگ تھی۔ اس میں سارے نام بوگس تھے۔ اسی لیے شبنم ان ناموں کو دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔ ایسا کوئی اجلاس بُلایا ہی نہیں گیا ہوگا۔ میں نے ناواقفیت کی بنا پر قرارداد کو اصل سمجھ لیا اور مان لیا کہ مجھے واقعی ملک عمرِدراز سے مل کر اسے صدارت پیش کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ تیمور نے میرے سامنے تصویر کا ایک ہی رُخ رکھا تھا۔ اس نے شاہ عالم کو صرف احسان فراموش، بدکردار، خوشامد پسند، بدعنوان سیاست داں، پُرانے رفیقانِ کار اور جانثاروں کی قدر نہ کرنے والا اور مغرور بتایا تھا۔ اس کے مظالم اور جرائم کی تفصیلات نہیں بتائی تھیں لیکن اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے اخلاق اور قانونی جرائم کی فہرست بہت طویل ہوگی۔ سیاسی اقتدار کے تماشے میں اس جیسے مداری کے لیے انسانوں کی جان و مال اور آبرو صرف استعمال ہونے والی چیزیں تھیں۔ حصولِ مقصد کا ذریعہ۔ اقتدار کی انتہائی بلندی سے دنیا پر فاتحانہ نظر ڈالنے کے لیے اسے انسانی سروں کا مینار بنانا پڑتا تو اس کے نزدیک یہ غلط نہ تھا۔ تاریخ اس کی گواہ ہے اور تاریخ کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ لشکر کے سپاہی یا رعایا اگر تخت و تاج حاصل کرنے کی جنگ میں اپنی جانوں کا نذرانہ دیتے ہیں، سر کٹاتے ہیں اور تختِ شاہی تک جانے والے راستے پر اپنے لہو کی سُرخی سے ریڈ کارپٹ بچھاتے ہیں۔ حشرات الارض کی طرح کچلے جاتے ہیں اور بھلا دیے جاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کے سر پر تاج سجانے کے لیے لاکھوں بچے یتیم کردیے جاتے ہیں اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہوجاتی ہیں تو یہ ان کا نوشتۂ تقدیر اور ظلِ سبحانی کا پیدائشی حق۔

شاہ عالم نے تاریخ کے اس تاریک پہلو کو فلسفۂ حیات بنا کے اپنے سیاسی کیریئر کا بلیو پرنٹ تیار کیا تھا۔

اس کے نزدیک میری ضرورت اور اہمیت ختم ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے ایک مقصد کے لیے منتخب کیا تھا اور وہ مقصد عین اس کی منصوبہ بندی اور توقعات کے مطابق حاصل ہوگیا تھا۔ اس نے مداری کی ڈگڈگی بجائی اور کہا۔ دیکھو دیکھو، اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ شاہ عالم ایک ہے کہ دو۔ مہرباں، قدرداں، ایک شاہ عالم ہانگ کانگ میں ہے، ایک شاہ عالم لاہور میں ہے۔ ایک اور ایک کہتے ہوئے تماشا دیکھنے والوں نے بہ آوازِ بلند کہا "دو۔" "اب دیکھو یہ شاہ عالم کیا کر رہا ہے۔ یہ شاہ عالم کہاں ہے، یہ شاہ عالم کس کے ساتھ ہے۔ یہ ہانگ کانگ میں ہے۔ یہ ہوٹل کا شاہانہ وی آئی پی سوئٹ ہے۔ اس کے ساتھ جو حسینہ ہے وہ ملک افرنگ سے آئی ہے۔ تو مہربان قدردان، اب دوسرے شاہ عالم کو دیکھو، وہ لاہور میں کیا کر رہا ہے۔ کہاں ہے؟ کس کے ساتھ ہے۔

"بچہ جمہورا ... میں کون؟"

"عامل۔"

"تو کون؟" ڈگڈگی بج رہی ہے، ڈگ ڈگ۔

"معمول" تماشا دیکھنے والے دم بخود منہ کھولے کھڑے ہیں۔

"جو پوچھوں گا بتائے گا؟"

"بتاؤں گا استاد۔"

"ایک نام کے دو آدمی ہوسکتے ہیں؟"

"ہوسکتے ہیں" ڈگ... ڈگ... ڈگ۔

"ایک صورت کے دو آدمی ہوسکتے ہیں؟" ڈگ، ڈگ، ڈگ، ڈگ۔

"ہوسکتے ہیں۔"

"ایک آدمی کے دو باپ ہوسکتے ہیں۔"

"ہوسکتے ہیں استاد۔"

قہقہہ... ڈگڈگی... کھیل جاری ہے۔

"تو بچہ جمہورا! ایک شاہ عالم کہاں گیا؟"

"کہاں گیا استاد؟"

"سب کو بتاؤ۔"

"وہ قتل کرنے گیا۔ اس نے سب کے سامنے قتل کیا۔ دشمن کو زہر دے کے مار دیا۔"

"اور دوسرا شاہ عالم!" ڈگ، ڈگ، ڈگ... ڈگ۔

"وہ ہانگ کانگ میں عیش کرتا رہا۔"

"آگے کیا ہوگا؟"

"ایک شاہ عالم غائب ہوجائے گا۔"

"کیوں بچہ جمہورا!"

"ایک بچے کے دو باپ نہیں ہوسکتے۔"

مجمع کی بے اختیار ہنسی، ڈگڈگی کی آواز۔

"ایک شاہ عالم کیسے غائب ہوگا؟"

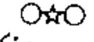
"جیسے ہر چیز غائب ہوجاتی ہے۔ مداری کے جھرلو سے۔ ہر روز نہ جانے کتنے لوگ غائب ہوجاتے ہیں۔ جوان لڑکیاں گھروں سے غائب ہوجاتی ہیں۔ کسٹم کے گودام سے ہیروئن غائب ہوجاتی ہے۔ پولیس کے مال خانے سے اسلحہ اور حوالات سے مبینہ ملزم غائب ہوجاتا ہے۔ نلکوں سے پانی غائب ہوجاتا ہے۔ بازار سے کبھی چینی تو کبھی آٹا غائب ہوجاتا ہے۔ مجرم غائب ہوجاتے ہیں۔ کروڑوں کے فنڈ غائب ہوجاتے ہیں۔ زرِمبادلہ کے ذخائر غائب ہوجاتے ہیں۔ یہ سب غائب کرنے والے غائب ہوجاتے ہیں۔ یہی ہے کھیل مداری کا۔ چپ کر بچہ جمہورا۔ ورنہ مداری تجھے بھی غائب کردے گا۔"

ڈور لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی تو میں چونکا۔ میری نگاہ گھڑی کی طرف گئی۔ دو گھنٹے ہوگئے تھے۔ شبنم لوٹ آئی تھی۔ مداری کا کھیل دیکھنے میں کتنا وقت گزر گیا۔ یہ شبنم ہی ہوسکتی تھی۔ پولیس بھی ہوسکتی تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے احتیاطاً اندر سے بھی دروازے کو

کنڈی لگادی تھی۔
بہت پہلے اپنے ہم نام ناصر عظیم کی خون آلود لاش دیکھ کے میں نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ ویسے ہی اس وقت میں نے دوسرا فیصلہ کیا۔ شاہ عالم ایک ہے' شاہ عالم ایک ہی رہے گا۔

پھر میں کھڑکی کی طرف دوڑا اور ہاتھ روم کے پائپ کو پکڑ کے نیچے اُتر گیا۔ ایک شاہ عالم کا غائب ہونا ضروری ہے۔ میرا یا اس کا۔ اور یہ تو جنگ ہے۔ اگر اس کو حق حاصل تھا مجھے غائب کرنے کا۔ ناصر عظیم کو غائب کرنے کا تو مجھے بھی اتنا ہی حق حاصل ہے کہ اسے غائب کردوں۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور وقت بہت کم ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہوگا مگر مجھے یقین تھا کہ اب ایسا ہی ہوگا۔



برسوں پہلے جب میں نے اپنی خونی کفن والی لاش کی خاموش پکار سُنی تھی تب بھی میں نہیں جانتا تھا کہ جو کچھ میں سوچ رہا ہوں' وہ کیسے ہوگا مگر میرے اندر کی ایک آواز کہہ رہی تھی کہ یہ ہونا چاہیے اس لیے ہوگا۔ کچلی ہوئی بے آسرا یتیم لاش اس جھوٹ کے خلاف چلّا رہی تھی جو بولا جارہا تھا لیکن اس کی آواز کوئی نہیں سُن رہا تھا۔ وہ ظلم کے خلاف فریاد کررہی تھی۔ اپنے داغ داغ بدن پر کھلے ہوئے زخموں کے متعفن پھول دکھارہی تھی مگر دیکھنے والوں کے دل پتھر تھے۔ وہ جھوٹ کو سچ تسلیم کررہے تھے اور ظلم کو نوشتۂ تقدیر مان رہے تھے۔

میں وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ ان بے حس پتھر کے انسانوں کے سامنے میرا چیخنا چلّانا لاحاصل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری بھی نہیں سُنیں گے۔ وہ سُن سکتے ہیں مگر وہ سُننا نہیں چاہتے یا ان کے پاس سُننے کی فرصت نہیں ہے۔ انہیں اس سے قطعی سروکار نہیں کہ کون کیسے جیتا ہے اور کیسے مرتا ہے۔ جب تک کہ اس سے براہِ راست ان کی اپنی زندگی کے معمولات متاثر نہ ہوں اور یہ خود غرضانہ سفاک رویّہ ان کی بزدلی کا غماز ہے کیونکہ وہ ظلم ہوتا دیکھ سکتے ہیں اور ظالم کو طاقتور مان لیتے ہیں اور ان کے لیے مقابلہ کرنے سے ظلم اور ناانصافی کو نوشتۂ تقدیر مان لینا بہت زیادہ آسان ہے۔

رات ہوگئی تھی اور میں ایک راؤنڈ اباؤٹ یا چوراہے کے درمیان چرس اور ہیروئن پینے والوں' تیل مالش کرنے اور کرانے والوں' ننگے بازوں اور اپنے جیسے بے گھر انسانوں کے درمیان مگر ان سب سے الگ بیٹھا رو رہا تھا۔ میں ایک تراشی ہوئی سبز جھاڑی تھا جو دُھوئیں کے تہ در تہ جم جانے سے اپنی شادابی کھوچکی تھی۔ میں سائے میں تھا چنانچہ کوئی بھی مجھے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ذاتی طور پر میں وہاں تھا ہی نہیں۔ میں کسی سنسان تاریک قبرستان میں تھا جہاں ایک نئی قبر کی مٹی ابھی گیلی تھی اور اس پر ڈالے گئے منافقت کے پھول شرمندہ پڑے تھے۔ میکانکی انداز میں ہاتھ اُٹھا کے منہ پر پھیر لینے والوں کی دعائیں عرش تک باریاب نہ تھیں کیونکہ ان کے الفاظ میں نیت کا خلوص بھی نہ تھا مگر شاید خدائے کریم جو سب جانتا ہے اور کسی کی سفارش نہیں مانتا۔ اسے پہلے ہی بخش چکا تھا اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے چکا تھا۔ رسمِ دنیا نبھانے کی مجبوری کے باعث جو لوگ وہاں تک آئے تھے وہ اب شکم سیر ہوکے اپنے گھروں میں آسودگی کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہے تھے اور شاید الف نون کی پُرتمسخر باتوں پر ہنس رہے تھے۔

ناصر کا چچا اپنے گھر میں خود کو بہت محفوظ اور پُرسکون محسوس کررہا ہوگا اور اپنی بیوی کو بتارہا ہوگا کہ اس کی تدبیر نے ان کی تقدیر بدل دی ہے۔ سب ٹھیک ہوگیا۔ اب کسی سے کوئی خطرہ نہیں لیکن ایک بات پریشان کررہی ہے۔ وہ حرامی جو دس ہزار مانگنے آیا تھا' سُور کا بچہ۔ کُتّے کی اولاد۔ توبہ توبہ' شیطان اس کے سامنے کان پکڑے۔ وہ تھا تو اسی یتیم خانے کا مگر وہ لوٹ کر وہاں نہیں گیا ہوگا۔ کہیں وہ پھر اپنی منحوس صورت لے کر سامنے نہ آجائے۔ پھر دس ہزار نہ مانگ بیٹھے۔ آخر کیا کرے گا وہ دس ہزار کا۔ ایک بچے کو دس ہزار کے لیے کوئی بھی قتل کرسکتا ہے اور وہ پھر مجھ سے دس ہزار مانگنے آیا تو میں بھی قتل کردوں گا۔

اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔ میں نے اپنے سامنے تیل سے چپڑے بالوں والا ایک ستا ہوا سیاہ چہرہ دیکھا جس کے دانت اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ وہ پان چبارہا تھا اور میٹھے پان کے قوام کی خوشبو اس کے دہانے سے پھوٹ رہی تھی۔ اس نے زرد قمیص پہنی ہوئی تھی جس پر نوٹ چھپے ہوئے تھے اور گلے میں لال رومال ڈال رکھا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ کچھ مانوس لگا۔

"کیوں بے وزیراعظم کیا تکلیف ہے تجھے" وہ بولا۔

اس کی آواز نے کھٹ سے میموری کے کمپیوٹر سے اس کا نام نکال لیا "تو۔۔۔ تو رئیس ہے۔۔۔ خبیث۔"

"تو پہلے ہی رورہا ہے ورنہ میں تیرے دانت توڑ دیتا مکا مار کے۔ اب کوئی۔۔۔ رئیس کو خبیث نہیں کہہ سکتا۔"

میں نے کہا "تو دوست تھا میرا۔ تو کہاں چلا گیا تھا؟"

وہ بولا "کیا وہاں ساری عمر رہ سکتا ہے کوئی۔ تو بھی تو نکل آیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ مگر میں نے بہت دیر کی۔ کس سرکس میں ہے تو؟"

"سرکس! ابے پاگل ہوگیا ہے۔ گھاس کھاگیا ہے۔ میں تجھے سرکس کا جوکر لگتا ہوں۔"

میں نے کہا "شاید تجھے یاد نہیں۔ تو ہاتھ چھوڑ کے سائیکل چلاتا تھا۔ اور پھر پاؤں بھی اٹھا کے ہینڈل پر رکھ لیتا تھا۔ اور اسی طرح ایک دن تو کانٹے سوئی میں گھس گیا تھا۔"

وہ ہنس پڑا "اس کی تو۔۔۔ سڑک کوٹنے والا انجن ہوتا تا تو وہ چڑھا دیتا میں اس پر۔"

"تو کہتا تھا کہ میں بڑا ہوکے سرکس میں کام کروں گا۔"

اس نے مجھے ایک سگریٹ پیش کی "سرکس اب کہاں رہے شہروں میں بیٹا۔ مداری رہ گئے ہیں۔ سرکس میں عقل' ہمت' مہارت اور تجربہ کام آتا ہے اور اس میں وہ ہوتا ہے 'کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ ایڈونچر' جسمانی کرتب دکھانے والے اپنی جان سے کھیلتے ہیں۔ مداری ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔ یوں جھرلو پھیرتے ہیں۔ جادو کی ڈنڈی گھماتے ہیں۔ پھر رومال جھاڑ دیتے ہیں۔ گیند غائب' گلاس کے نیچے سے کبوتر غائب۔ دوسرا گلاس اٹھایا' کبوتر موجود۔ یہاں ایسے ہی کھیل تماشے ہورہے ہیں بیٹا۔ حاضر غائب کے' چکر بازی کے۔"

"تو بھی۔۔۔ چکر بازی کررہا ہے۔ مداری بن گیا ہے کیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "کوشش کررہا ہوں بیٹے۔ جان جوکھوں کا کام ہے۔ کچھ سیکھ لیں تو وارے نیارے۔ ہم بچ بچ کے رئیس۔ ہر وقت باہر لندن' امریکا' ورنہ اندر۔ ہمیشہ اندر۔ کبھی ایک جیل میں تو کبھی دوسری جیل میں۔ سگریٹ نہیں پیتا تو۔"

میں نے انکار کردیا "اس سے کینسر ہوجاتا ہے۔"

وہ ہنستے ہنستے گالیاں دینے لگا "ابے تو نے دیکھا ہے کبھی۔ یہ جو سالے اتنے قیمتی سگریٹ پیتے ہیں' شرابیں اُڑاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو ہوا ہے کینسر۔ قسم اللہ کی' ایک بار کینسر وارڈ میں گیا تھا سب کے سب کنگلے پڑے تھے وہاں۔ ویسے ہی ان کی زندگی کون سی جینے لائق تھی۔ تو کیا سو سال جیئے گا ایسی زندگی' بھوکا ننگا رہ کے۔ ابے اس سے تو بہتر ہے عیش کر اور آدھی زندگی گزار کے مرجا۔"

میں نے کہا "تو عیش کر یار' مجھے رونے دے۔"

"آخر ہوا کیا ہے۔ کیا یہاں بیٹھ کے رونے سے سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ایسا ہے تو پھر روتا رہ ساری رات" رئیس نے دُھوئیں کا کش لگا کے ہوا میں یکے بعد دیگرے تین چھلے معلق کرنے کا کرتب دکھایا۔

میں نے کہا "میں ایک آدمی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک دم اُچھل پڑا۔ اس کے منہ سے سگریٹ گرگئی تھی۔ اس نے سگریٹ اٹھا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "آہستہ بول پاگل کے بچے۔ یہاں وہ بھی بیٹھے ہیں۔"

"وہ کون؟"

"پولیس کے مخبر" اس نے میرے کان میں کہا "میں بھی ہوں۔"

"تو جاکے بتادے پولیس کو۔ ابھی میں نے کون سا قتل کیا ہے لیکن قتل تو مجھے کرنا ہے اس کو ایک دن" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا "تو نے کچھ کھایا ہے؟"

میں نے کہا "میرا دل نہیں چاہتا۔"

"ابے کھانا دل میں نہیں' پیٹ میں جاتا ہے۔ چل اپنے بھی ڈنر کا ٹائم ہوگیا ہے۔ بول کیا کھائے گا۔ آج تو میرا مہمان ہے۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا "جو تو کھائے گا وہی میں بھی کھالوں گا۔ مگر رئیس' مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔"

"کسی کو مارنا ہے تو اپنے آپ کو مت مار۔ بھوکا رہے گا تو خود مرجائے گا سالے۔ اچھا ایسا کرتے ہیں' میں بند کباب اور بوتلیں لاتا ہوں۔ اُدھر فٹ پاتھ پر بیٹھ کے کھائیں گے' تو بیٹھ یہاں۔"

میں ایک بند دکان کے سامنے بنی ہوئی فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ وہ الگ جگہ تھی۔ وہاں روشنی بھی کم تھی اور موزیک کا فرش صاف اور ٹھنڈا تھا۔

رئیس نے بند کباب کا ایک لفافہ میرے سامنے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ٹھنڈی بوتل پکڑادی "یہ اسپیشل بند کباب ہے انڈے والا۔ کھاکے دیکھ' تیری بھوک خود کھل جائے گی۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ احساسِ غم نے میری بھوک کو سُلا رکھا تھا۔ رئیس کی باتوں نے مجھے ایک دوست اور غم گسار کی موجودگی کا احساس دلادیا تو میرا غم سے بوجھل دل تھوڑی دیر کے لیے آزاد ہوگیا۔ میں نے سارا دن کچھ کھائے پیئے بغیر گزار دیا تھا۔

"پہلے کسی کو قتل کیا ہے تو نے؟" رئیس نے کھاتے کھاتے پوچھا۔

میں نے کہا "نہیں مگر ہر کام کبھی تو کرتا ہے آدمی' جو پہلے نہیں کیا ہوتا۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "ہاں۔ جیسے وہ پہلی بار پیدا ہوتا ہے۔ پہلی بار شادی کرتا ہے۔" وہ بولا اور پھر زور سے ہنسا "اچھا قتل کیسے کرے گا تو؟ رائفل ۔۔۔ سے بول۔۔۔ تڑ تڑ تڑ۔۔۔" اس نے خالی بوتل کو رائفل ۔۔۔۔ کے انداز میں پکڑا۔ "یا دستی بم مارے گا۔ ایسے" اس نے بوتل کو گھما کے دور گھاس پر پھینک دیا "بوم۔"

میں نے کہا "تو مذاق سمجھ رہا ہے میری بات کو۔"

"کیا تجھے معلوم ہے کہ قتل کرنے کی سزا کیا ہے؟ پھانسی۔۔۔ جانتا ہے کیا ہوتی ہے پھانسی۔۔۔"

"نہیں" میں نے کہا "مجھے پہلے کبھی پھانسی نہیں ہوئی۔"

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "یہ ہوئی نا بات۔۔۔ اب تیرا دماغ ٹھکانے پر ہے۔ بتا معاملہ کیا ہے؟"

میں نے اسے سارا معاملہ بتادیا۔ ان دس ہزار کے بارے میں بھی بتادیا جو میں نے ایک قاتل کو بلیک میل کرنے کے مانگے تھے مگر وصول کیے بغیر بھاگ آیا تھا۔

"یار' افسوس تو مجھے بھی بہت ہوا یہ سب سُن کر" وہ بولا "مگر میری مان تو بس بھول جا یہ بات بھی۔ سب ہوتا ہے دنیا میں اور ہوتا رہے گا۔ تو دیکھ کہ خود تیرے اور میرے ساتھ کیا نہیں ہوا؟"

میں نے کہا "اس وقت میں مجبور تھا۔ بے بس تھا کیونکہ میں بہت چھوٹا تھا۔"

aazzamm@yahoo.com

"اور اب تُو بہت بڑا ہوگیا ہے" وہ طنز سے بولا "اتنا بڑا کہ جو حرامی پن کرے گا اسے جان سے ماردے گا۔"

"میں ناصر عظیم کے چچا کو قتل کرنے کی قسم کھا چکا ہوں۔"

"اس لیے کہ تیرا اور اس کا ایک نام تھا۔"

میں نے کہا "وہ میرا بھائی تھا۔"

"ابے چھوڑ... ایسے رشتے روز بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ رہی قسم کی بات تو دن میں دس بار میں کھاتا ہوں اور توڑتا ہوں۔"

"تو گناہگار ہے کفارہ ادا کردے۔"

وہ پھر بہت ہنسا "ابے کفارے کی اولاد۔ میرے ساتھ کچہری چل کے دیکھنا۔ کیسے کیسے مومن آتے ہیں۔ حلف اُٹھاتے ہیں قرآن پر ہاتھ رکھ کے" اس نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا "پیسے لیتے ہیں جھوٹی گواہی دینے کے۔ پولیس ان کو بتا دیتی ہے کہ انہیں کیا کہنا ہے اور وہ چشم دید گواہ بن جاتے ہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا "قرآن پر ہاتھ رکھ کے جھوٹی قسم کھاتے ہیں۔"

"ہاں۔ اللہ معاف کرے۔ میں بھی کھا چکا ہوں دوبار۔ ہزار روپے پہلی بار ملے تھے۔ دوسری بار دو ہزار' دیکھ نا یار' ہماری بھی تو مجبوری ہے۔ اللہ مجبوروں کو معاف کرنے والا ہے۔ ڈاکا تو نہیں ڈالا میں نے۔ جیب تو نہیں کاٹی' اور پھر میری وجہ سے ایک آدمی بچ گیا ورنہ اسے پھانسی ہوجاتی۔ جان بچانا تو نیکی ہے نا اور اس کا ثواب اور جھوٹی قسم کا گناہ' حساب برابر۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ میں نے کیا تجھ سے کچھ کہا ہے۔ پوچھا ہے کہ تُو ایسا کیوں کرتا ہے۔ تیرے کہنے سے آسمان نیچے اور زمین اوپر نہیں ہوسکتی۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگا "میں بڑا گناہگار ہوں یار' اللہ جانتا ہے۔"

"تُو نے کسی قاتل کے لیے گواہی دی تھی کہ اس نے قتل نہیں کیا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"حالانکہ قتل اسی نے کیا تھا؟" میں نے کہا "ہوا کیا تھا؟"

اس نے کہا "جھگڑا زمین کا تھا۔ باپ زمیندار تھا اور بہت بوڑھا اور بیمار تھا مگر مرنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بیٹے زمین بیچ کے شہر جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے پہلے تو مشہور کردیا کہ باپ کا دماغ چل گیا ہے۔ پھر کچھ جھگڑا بڑھا تو باپ نے عاق کردینے کی دھمکی دی' بیٹوں نے اسے ماردیا۔"

"کیسے ماردیا؟"

"گلا گھونٹ دیا اس کا سوتے میں۔ پھر اس کی لاش ایک زمیندار کے باغ میں آم کے درخت سے لٹکادی۔ تاکہ ایسا لگے کہ اس نے خودکشی کی ہے' بیماری سے تنگ آکے۔ پھر وہ صبح صبح لاہور آگئے۔ ان کے گاؤں کا کوئی بندہ وہاں تھانے دار تھا۔ اسے سب بتادیا' اس نے کہا کہ میں سب ٹھیک کرلوں گا مگر پچاس ہزار لوں گا۔"

"زمین کتنے کی تھی؟"

"زمین لاکھوں کی تھی" رئیس بولا "وہ مان گئے۔ میں نے لاش صبح دیکھی۔"

"تو نے... تو اس باغ میں کیوں گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں کام کرتا تھا اس باغ میں یار۔ مالی کے ساتھ۔ میرا کام تھا طوطے اُڑانا۔ اور ان پرندوں کو بھگانا جو پھلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ میں غلیل لے کے پھرتا رہتا تھا۔ مالی کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے لاش دیکھی تو مالی کو بتایا اور اس نے مالک کو۔ مالک نے مالی کو بھی بہت مارا اور مجھے بھی کہ حرامی سوتے رہتے ہو۔ پتا نہیں کون یہاں لاش ٹانگ گیا۔ اب خواہ مخواہ پولیس کا خرچہ۔ پولیس آئی تو پتا چل گیا کہ لاش دس میل دور کے زمیندار کی ہے۔ کوئی بہت بڑا زمیندار نہیں تھا وہ۔"

"لاکھوں کی زمین تھی اور بڑا زمیندار نہیں تھا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے تُو نے بڑے زمیندار نہیں دیکھے۔ ان کی اتنی زمین ہوتی ہے کہ خود ان کو پتا نہیں ہوتا کہ کہاں سے کہاں تک ہے۔ گھوڑے پر بیٹھ کے چلتے جاؤ تو شام ہوجائے۔"

میں نے اس کی گپ کو اخلاقاً قبول کرلیا "پھر پولیس نے کیا کارروائی کی؟"

"انہوں نے باغ کے مالک سے بھی خرچہ پانی وصول کیا اور پھر لاش لے کر مرنے والے کے گھر چلے گئے۔ ان کی بیویوں نے بتایا کہ لڑکے تو کل سے شہر گئے ہوئے ہیں۔ پھر لڑکوں کی تلاش میں بندہ شہر گیا تو ساتھ ہی وہ تھانے دار بھی آگیا۔ ان کے درمیان سارا معاملہ طے پاگیا تو انہوں نے مجھے بُلایا اور تھانے دار نے پوچھا کہ تُو نے لاش کب دیکھی تھی؟ میں نے کہہ دیا کہ صبح سات بجے' تھانے دار نے میرے تھپڑ مارا اور بولا کہ جھوٹ بکتا ہے میرے سامنے۔ لاش تُو نے رات گیارہ بجے دیکھی تھی۔ زمیندار کے بڑے بیٹے نے کہا کہ یتیم ہے جی۔ اسے مت مارو۔ پھر اس نے مجھے ہزار روپے دیے اور یہ سمجھایا کہ جیسا تھانے دار صاحب بتائیں وہی کہنا ہے۔ بڑا حرامی پن کیا انہوں نے میرے ساتھ یار۔ مجھے پانچ ہزار تو دیے مگر اسی طرح عقل آتی ہے آدمی کو۔ دوسری بار معمولی سی گواہی تھی۔ میں نے دو ہزار اینٹھ لیے' تُو نے بڑی غلطی کی۔"

"کیا غلطی کی؟"

"وہ دس ہزار دے رہا تھا اور تُو چھوڑ کے بھاگ آیا؟"

"بس یار' مجھے شرم آئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اس کی لاش بیچ کے قیمت وصول کررہا ہوں" میں نے کہا۔

اس نے مجھے ایک گالی دی "الٹی کھوپڑی کے۔ یہ خیال کیوں نہیں آیا تجھے کہ دس ہزار بہت کم ہیں۔ اس کی سزا تو پھانسی تھی۔ پھانسی نہ ہو تو عمر قید ہوتی ہے۔ عمر قید سے بچ سکتا ہے آدمی اگر

وارث پیسے لے لیں۔ اور معاف کردیں۔"

"پیسے لے کر معاف کردیں؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ مرنے والا تو مرگیا۔ دوسرے کو پھانسی ہوگی تو ہمیں کیا ملے گا۔ قاتل کے وکیل اور گھر والے آدمی کی حیثیت کے مطابق سودا کرتے ہیں کہ چلو لاکھ دو لاکھ لے لو' معاف کردو۔ پارٹی بڑی ہو تو دس پندرہ لاکھ بھی کچھ نہیں۔ زندگی سے بڑی تو کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مقتول کے وارث بھی سوچتے ہیں کہ اب تو رونے کی فرصت بھی نہیں۔ کوئی کب تک رو سکتا ہے آخر۔ پیسہ بیوی بچوں کے کام آئے گا۔"

"سب تو ایسا نہیں کرتے۔"

"نہیں یار۔ جن کو بدلہ لینا ہوتا ہے وہ بدلہ لیتے ہیں۔ تو نے دس ہزار بھی چھوڑ دیے۔ اس سے تو ایک لاکھ لینے تھے۔ اتنی سزا وہ خوشی سے تو قبول نہ کرتا۔ مجبوری میں دیتا' اس کا باپ بھی دیتا۔"

میں نے کہا "مگر یار مجھے وہ نہیں لینا' خون بہا۔ میں اسے معاف نہیں کرسکتا۔"

"ابے تو دس ہزار میں تجھے کوئی مل جاتا' جو تیرا کام کردیتا۔"

میں نے ایسی باتیں پہلے نہیں سُنی تھیں "میرا کام کردیتا؟"

"ہاں۔ اُجرت پر سارے کام ہوجاتے ہیں۔ قتل بھی' اغوا بھی' مار پیٹ بھی۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے جو لوگ اجرت پر ایسے کام کرتے ہیں' کیا... پکڑے نہیں جاتے؟"

"نہیں پاگل خانے' وہ تجربہ کار اور ہوشیار لوگ ہوتے ہیں۔ اور ان کو پولیس کا ڈر بھی نہیں ہوتا۔ یا تو وہ انہی کے بندے ہوتے ہیں ورنہ مک مکا ہوجاتا ہے۔"

"مک مکا!"

"ہاں یار۔ جیسے زمیندار نے کیا تھا۔ سودا ہوجاتا ہے آپس میں اور پیسہ لے کر معاملے کو دبادیا جاتا ہے یا بس ایسے ہی خانہ پُری کے لیے قانونی کارروائی بھی کرتے ہیں اور بندے کو یا بات کو اِدھر اُدھر گھما پھرا کے ٹھنڈا کردیتے ہیں۔"

مجھے اس معاملے سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ "میں سمجھا نہیں' بندے کو کیسے گھماتے پھراتے ہیں اور بات کو کیسے ٹھنڈا کرتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "یار اب کیسے سمجھاؤں تجھے۔ فرض کرو دن دھاڑے سب کے سامنے کسی کا قتل ہوجائے اور قاتل پکڑا بھی جائے تو اور بات ہے۔ پولیس اسے پکڑ لے گی اور پرچا بھی کاٹ دے گی۔ آگے لمبی کہانی ہوتی ہے۔ جو پکڑا جاتا ہے اس کے گھر والے پولیس کی منت سماجت کرتے ہیں اور اسے مار سے بچانے کے لیے پیسہ بھی خرچ کرتے ہیں۔ حالانکہ اسے مارنے کی کیا ضرورت ہے جو خود قتل سے انکار نہیں کررہا ہے اور دس بندے گواہ ہیں کہ اس نے مارا۔ مگر چھترول نہ ہو تو مال نہیں ملتا۔ اس کے بعد عدالت میں چالان پیش کرنے کا معاملہ لمبا ہوجاتا ہے۔ پھر پیشی لمبی ہوتی ہے۔ اگر پیسہ ہے تو سالوں ایک ہی عدالت میں لگ جاتے ہیں۔ گواہ جاتے ہیں اور گواہی دیے بغیر اگلی پیشی کی تاریخ لے کر آجاتے ہیں۔ ان کی تو زندگی عذاب ہوجاتی ہے اس چکر میں۔ وہ توبہ کرلیتے ہیں کہ آئندہ ان کے باپ کو بھی کوئی ان کے سامنے ماردے تو وہ گواہی میں نہیں پڑیں گے۔ کام چھوڑ کے سارا دن عدالت میں کھجل خوار ہونا کوئی آسان بات ہے۔ جن کے لیے پیسہ خرچ کرنے والا کوئی نہ ہو ان کو پھانسی بھی ہوجاتی ہے ورنہ چھوٹی عدالت سے بڑی عدالت اور سب سے بڑی عدالت تک کیس پہنچنے میں کیس ختم ہوجاتا ہے۔ گواہ اِدھر اُدھر ہوجاتے ہیں یا فوت ہوجاتے ہیں ورنہ پولیس اپنے گواہ لے آتی ہے اور جن کا بندہ قتل ہوتا ہے وہ بھی جان چھڑاتے ہیں۔ لیکن فرض کرو قتل کسی کے سامنے نہ ہو' تو کام بہت آسان ہوجاتا ہے۔ جیسے زمیندار کے قتل کو خودکشی بنادیا تھا۔ کسی کو حادثہ بنادیتے ہیں۔ مار کے سڑک پر ڈال دیتے ہیں اور رات کو اس پر سے کوئی گاڑی گزر جاتی ہے۔ زہر سے مار کے ہارٹ فیل کی رپورٹ بھی لی جاسکتی ہے۔ بیٹا' سب پیسے کا کھیل ہے۔ مال خرچ کرسکتا ہے کوئی تو قانون اپنا' قاتل پکڑا ہی نہیں جاتا۔ غلط بندے کے سر الزام ڈال کے وقت ضائع کرتے ہیں تفتیش میں۔ یا کوئی لاوارث مل جائے تو اس کو لٹکوا دیتے ہیں۔ مجھے تو پتا ہے ایک بندے کی بیوی کو رات کے وقت کسی چور نے قتل کردیا تھا۔ بیوی کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے شور کیا تو چور نے اس کے سر پر ڈنڈا مارا اور وہ ڈنڈا وہیں پھینک کے بھاگ گیا۔ پولیس نے شوہر کو پکڑلیا۔ اس پر قتل ڈال دیا اور وجہ یہ بتادی کہ اس کی کسی سے یاری تھی۔ دوسری شادی کرنے کے لیے اس نے پہلی بیوی کو خود مارا۔ کوئی چور شور نہیں' اس بندے کی کسی نے نہیں سُنی۔ اس کو اتنا مارا کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے مان لیا کہ قتل خود اس نے کیا تھا۔ اس کے پاس پیسہ ہوتا تو بچ جاتا۔ پولیس کو کیا ضرورت ہے قاتل کو تلاش کرنے کی اور تفتیش کے چکر میں پڑنے کی۔ چالان پیش کردیا کہ قاتل خود مدعی ہے۔ ان کی ذمے داری ختم۔ اور اگر مارا جاتا چور' تب بھی وہی پکڑا جاتا کہ اس کی بیوی کا کوئی آشنا تھا جو اس سے ملنے آیا تھا' شوہر نے قتل کردیا۔"

میں نے کہا یہ تو بڑی ناانصافی ہے۔"

وہ ہنسا "انصاف ملے گا اللہ میاں کے پاس بیٹا۔ یا پھر اس کو جو طاقتور ہو۔ جس کے پاس سفارش ہو یا پیسہ ہو۔ میں نے تجھے ایک مثال دی تھی مگر ایسا ہوا تھا۔ ایک بندے نے خود بیوی کو مارا۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے اور پولیس کو پیسہ کھلا کے کیس ڈکیتی کا بنادیا کہ ڈاکو مار گئے' گھر کا کچھ سامان اِدھر اُدھر کردیا۔ تالے توڑ دیے۔ پھر ایک دو فائر کیے اور شور مچادیا۔ چور۔ چور... پکڑو... اِدھر گئے ہیں۔ اُدھر گئے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ بعد میں چار چور پکڑے گئے ڈاکا ڈالنے کے بعد۔ انہوں نے یہ مان لیا کہ ہم نے

aazzamm@yahoo.com

اس عورت کو بھی مارا تھا۔"

"کیوں مان لیا۔ جب انہوں نے قتل نہیں کیا تھا؟"

"ان کا معاملہ سیٹ ہو جاتا ہے پولیس سے یار۔ ڈاکوؤں سے بھی تو مال ملتا ہے ان کو۔ وہ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان دے کر کیس ختم کراتے ہیں اور پولیس ظاہر کرتی ہے کہ اتنے عرصے تک وہ تفتیش کرتے رہے' جرم کا سُراغ لگالیا' بعد میں سب ختم ہو جاتا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "تجھے تو سب معلوم ہے یار۔ تو پولیس کا مخبر بھی ہے۔ ہے کوئی ایسا بندہ تیری نظر میں جو قتل کردے... اس کو۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا "بندہ تو مل ہی جاتا ہے۔ مگر بیٹا' یہ کوئی راج مزدور کا یا موٹر مکینک کا کام نہیں ہے۔"

"کتنی اُجرت لے گا وہ... پانچ دس ہزار؟"

اس نے میرے ایک دھپ مارا "اوئے پاگل خانے' کیا ہوتے ہیں پانچ دس ہزار۔ لاکھ دو لاکھ ہوں تو بندہ ایسے غائب جیسے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔"

میرا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا "لاکھ دو لاکھ۔"

"اب بھول جا اس کو۔ اپنے آپ کو ضائع مت کر...."

میں نے کہا "رئیس۔ میں نے قسم کھائی ہے۔ کیا تو میری مدد نہیں کرے گا؟"

"تیری مدد کروں' قتل میں؟ ابے ایسی بات بھی منہ سے مت نکال ورنہ اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا۔"

"کیوں یار۔ تجھے سارے طریقے معلوم ہیں" میں اس کی قانون دانی سے سخت متاثر ہو چکا تھا "قتل میں خود کروں گا۔ بس تو کسی طرح مجھے بچالینا۔ تیری جان پہچان ہے پولیس سے۔ کک مکا کرادینا۔ وہ کسی اور کے سر ڈال دیں یہ قتل' ایسا بندوبست ہوجائے۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے۔ ابے اپنی عمر دیکھ سالے اور ارادے دیکھ۔ تو نے قتل کیا تو پکڑا جائے گا۔ کک مکا کیا ایسے ہی ہو جاتا ہے۔ یہ پولیس والے اپنے باپ کا لحاظ نہیں کرتے۔ میں تو بس مخبری کرتا ہوں۔ کبھی کبھی پکڑ کے بند بھی کر دیتے ہیں مجھے۔ اپنی کار گزاری دکھانے کے لیے۔ میری جان پہچان سے کچھ نہیں ہو گا۔ روٹی کھانے کے پیسے نہیں ہیں جیب میں' رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہان ہمارا۔ یہ گانا سُنا ہے تو نے' دماغ سے نکال دے قتل کا یہ خیال۔ میں یار ہوں تیرا' اس لیے مشورہ دے رہا ہوں۔ کوئی اور ہوتا تو پولیس کو بتادیتا۔ یہ بتا تو یتیم خانے سے کب نکلا؟"

"ابھی یار... کل۔"

"اور اب کہاں جائے گا؟ ہے کوئی ٹھکانا؟ نہیں ہے تو میرے ساتھ چل۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے ٹھکانوں کی کمی نہیں۔ اور دو لاکھ تو شاید نہ ہوں مگر ایک لاکھ میں کوئی تیار ہو تو میں قتل کرانے کے لیے دے سکتا ہوں۔ وہ سمجھتا میرے دماغ کا واقعی کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔

میں نے کہا "ایک جگہ ہے جہاں میں رہ سکتا ہوں۔"

"تیرا تو کوئی دور کا رشتے دار بھی نہیں تھا" رئیس بولا۔

"ایک بڑھیا ہے۔ اس کا میں چھوٹا موٹا کام کردیتا تھا۔ کھانا بھی کھلاتی تھی مجھے اور کہتی تھی کہ میرے ساتھ رہ۔ مجھے بھی ضرورت ہے سہارے کی' بیمار ہوں اور اکیلی ہوں۔"

"کیوں... گھر والا... اور بچے کوئی نہیں؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "شوہر مر گیا' بچے چھوڑ گئے۔ اس کے پاس ہے ایک کمرے کا گھر' تین مرلے پر۔"

"اچھا۔ تو وہاں رہے گا اور کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "کچھ بھی کر سکتا ہوں میں۔"

اس نے میرا مذاق اُڑایا "قتل بھی کر سکتا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھ یار۔ بھیک میں نے کبھی مانگی نہیں۔ کتنے لونڈے ہیں اپنے جاننے والے جو بھیک مانگ کے عیش کر رہے ہیں۔ چندہ بھی اب میں جمع نہیں کر سکتا۔ یتیم خانے والے میرے پیچھے لگ جائیں گے۔"

"یہ معاملہ خراب ہے بیٹا' کیسے بچے گا تو ان کی پکڑ سے!"

میں نے کہا "اگر ایسی بات ہوگی تو میں... لاہور چلا جاؤں گا۔ ورنہ کچھ دن غائب رہوں گا۔"

"کب تک غائب رہے گا۔ انہیں خبر مل جائے گی۔ لڑکے جو گلی محلوں میں چندے جمع کرتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ ان میں کوئی تجھے دیکھ لے گا' ہاں لاہور جانے والی بات ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "تو کہاں رہتا ہے؟"

اس نے کہا "اپنا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ یہاں ملتا ہوں ورنہ شام کے وقت سنیما کے باہر۔ آپاجی کے ساتھ۔"

"آپاجی کون؟ تیری...."

"ابے نہیں' میری کچھ نہیں" اس نے مجھے آنکھ ماری "میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ دس روپے روز دیتی ہے۔ کبھی کبھی... خیر چھوڑ۔ تو بچہ ہے ابھی۔ نہیں سمجھے گا۔ ہے تو ایویں ہی... مگر جوان ہے اپنی طرح پیار سے۔"

رئیس مجھ سے واقعی عمر میں تین چار سال بڑا تھا اور اس کی جان بھی اچھی تھی۔ جو اس کے کہنے کے مطابق کھانے پینے اور موج کرنے سے بنی تھی۔ مجھے اس کی آپا سے ملنے کا کوئی خاص اشتیاق نہیں تھا مگر میں نے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد اس سے ملوں گا اور پھر اس کے مشورے سے کوئی کام کروں گا۔ اس نے مجھے ہوٹل میں کام کرنے' کسی گیراج میں ملازم ہونے یا گھر میں برتن دھونے اور بچے کھلانے جیسے "گھٹیا" کام کرنے کے خیال پر سخت شرمندہ کیا تھا۔

"اب ایسی باتیں سوچتا رہا نا تو ترقی نہیں کرے گا۔ سالے دن

بھر محنت کرے گا' ہوٹل میں دوڑ دوڑ کے "گاڑیوں کے نیچے لیٹ کر ڈبریاں ٹائٹ کرتے کرتے اور گالیاں کھاتے کھاتے تیرا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ملے گا کیا' روز کے پانچ دس روپے۔ ایک وقت کا کھانا' محنت کی کمائی میں خواری ہی خواری ہے بیٹے۔ جو... کچھ نہیں کر سکتے نا" اس نے ایک گالی کے ساتھ کہا "وہ غلامی کرتے ہیں اور ساری عمر غلام ہی رہتے ہیں۔ ابے ہمت ہے تو کوئی بڑا کام کر۔ لمبا ہاتھ مار' اِدھر یا اُدھر۔ باہر یا اندر۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ میں اندر جانے والے کام نہیں کر سکتا۔ ہمت تو بہت ہے مجھ میں... مگر جیل جانے کی نہیں۔"

"پھر خاک ہمت ہے۔ ابے عزت آنی جانی چیز ہے۔ جیب میں مال ہو تو جینے کا مزہ ہے۔ دنیا اپنی جیب میں ورنہ کچھ نہیں۔ واپس چلا جا یتیم خانے میں۔ اور دیکھ' پکڑے جاتے ہیں بے وقوف۔ مجھے معلوم ہے تو بڑا سیانا تھا۔ ہم سب کے مقابلے میں افلاطون تھا۔ تو وزیراعظم بننے کی بات کرتا تھا۔ اب برتن دھونے اور بچے کھلانے پر آگیا۔"

میں نے کہا "وزیراعظم... ابھی تو نہیں بن سکتا نا۔"

"تو کبھی نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ تو... ہے" اس نے میرے نام کے ساتھ میری شخصیت کی ایک غیر موجود صفت منسوب کردی۔

اس وقت میں نے تردید نہیں کی اور اس سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ رات کے دس بجے میں ڈاکٹر مشہود الظفر کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اس کا نام میرے لیے بہت مشکل تھا چنانچہ میں اسے ڈاکٹر مشہور کہتا تھا۔ میں اس کے تین بچوں کو بڑی محنت سے ٹیوشن پڑھاتا تھا اور ایسی باتیں کرتا تھا جن سے بچے بھی خوش رہتے تھے اور اس کی بیوی زیادہ خوش ہوتی تھی۔ مثلاً اس کی صورت کے نقوش میں تھوڑی بہت مشابہت ایک مشہور فلمی ہیروئن کی تھی لیکن وہ کالی تھی اور موٹی بھی ہو رہی تھی حالانکہ اس کی شادی کو صرف دس سال ہوئے تھے۔ ایک دن میں اس فلمی ہیروئن کی تصویر کسی فلمی رسالے سے نکال کے لے گیا اور جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھی چہرے پر رنگ گورا کرنے والی کریم مل رہی تھی تو میں نے اس سے کہا کہ بیگم صاحب' دیکھیں آپ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے وہ تصویر اس کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ "کتنی ملتی ہے اس سے آپ کی صورت!"

اس نے تصویر کو اور پھر خود کو آئینے میں دیکھا اور شاید اسے آئینے پر اعتبار نہیں آیا تو اس نے مجھ سے مسکرا کے کہا "بدتمیز۔"

میں نے کہا "آپ ناراض ہو گئیں بیگم صاحب۔ میں نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔"

اس نے اُداسی سے مسکرا کے کہا "نہیں' ناراضی کیسی۔ مگر کہاں میں' کہاں یہ...."

میں نے کہا "بس آپ کا تھوڑا سا وزن زیادہ ہو گیا ہے۔ آپ چند دن میں کم کر سکتی ہیں۔ اور یہ فلم اسٹار تو میک اَپ سے حسین نظر آتی ہیں۔"

اس نے خوش ہو کے مجھے اور مختلف زاویوں سے اپنے جسم کو دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس لی "ٹھیک کہتا ہے تو۔ کتنا شوق تھا مجھے فلم میں کام کرنے کا۔"

میں نے کہا "قسم خدا کی' آپ فلموں میں جاتیں نا... تو بس آج ہر فلم میں آپ ہی آپ ہوتیں۔ آپ کی آواز بھی اتنی اچھی ہے۔ ڈانس سیکھ سکتی تھیں آپ۔"

انہوں نے فخریہ مسرت سے اطلاع دی "ڈانس کرتی تھی میں۔ کالج کے ڈراموں میں بہت حصہ لیا۔ فلم میں چانس بھی مل رہا تھا مگر پہلے ابا آڑے آگئے کہ نہ' بس اب گھرداری سیکھو۔ آگے جا کے گھر سنبھالنا ہے تمہیں۔ قسمت میں ڈاکٹر لکھا تھا جس کو دن رات چیر پھاڑ سے ہی فرصت نہیں۔ نہ کوئی شوق نہ دلچسپی۔ بس پیسہ ہی پیسہ ہے۔ میرے تو سارے ارمان گھٹ کے رہ گئے۔"

"آپ نے کہا ہوتا ڈاکٹر صاحب سے... کہ میں کام کروں گی فلموں میں۔"

اس نے مجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھا "پاگل ہوا ہے لڑکے۔ انہوں نے مجھے اسکول میں پڑھانے کی اجازت تو دی نہیں کہ کیا ضرورت ہے' کس چیز کی کمی ہے۔ وقت گزارنے کا مسئلہ ہے تو میرے ساتھ چلو۔ اسپتال میں کام کرو' نرسنگ سیکھ لو۔ فلم کی بات کرتی تو ناک کا مسئلہ آجاتا۔"

ایسی باتوں سے کون عورت خوش نہیں ہو گی۔ توجہ نہ ملنے کی شاکی ہر بیوی رہتی ہے۔ یہ سمجھے بغیر کہ شوہر میں اور چاہنے والے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کو اس کی اور گھر کی ذمے داری کا احساس ہے اور دوسرا فارغ ہے عشق کرنے کے لیے۔ عملاً محبت وہ کرتا ہے جو عزت' آرام اور تحفظ فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے دن و رات محنت کرتا ہے۔ محبت بھرے مکالے بولنا تو شاید سب سے آسان کام ہے۔

بیگم بنگلے کے لان میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی اور درخت میں اُلجھے چاند کو تک رہی تھی۔ اس کے بچے اندر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے شاید وی سی آر پر کوئی کارٹون فلم لگا رکھی تھی۔ مضحکہ خیز آوازوں کا شور باہر تک سُنائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے حیران رہ گئی۔ "تم ناصر.... اس وقت؟ تین دن سے کہاں تھے؟"

میں ان کے پیروں میں بیٹھ گیا "بیگم صاحب۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔"

"ارے.... اُدھر کرسی پر بیٹھو" انہوں نے کہا "مجھے بتاؤ' کیا بات ہے؟"

میں نے ان کو ناصر کی موت کے بارے میں سب بتادیا۔ یہ بھی کہ کیسے چچا نے اس کے باپ کے مرتے ہی مکان پر قبضہ کیا۔ پھر اس کی ماں سے پیشہ کرانا چاہا۔ اس نے انکار کیا تو اسے مار کے گھر

کے صحن میں گاڑدیا۔ پھر ناصر کو فرضی نام سے یتیم خانے میں داخل کرایا۔ مکان بیچا اور بالآخر ناصر کو بھی مارڈالا؟"

روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی۔ میں نے وہ سب مظالم گنوائے جو یتیم خانے والوں نے مجھ پر اور ناصر پر کئے تھے۔ ان کے قابل نفرت کاروبار کی تفصیلات کا ذکر کیا۔ یہ بتایا کہ میں نے وہاں رہ کے بھی کس طرح خود کو محفوظ رکھا۔ تعلیم حاصل کی اور ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر مجھے شرم آئے۔ میں نے محنت مزدوری کی۔ (آپ بینک کے فلاں صاحب سے پوچھ لیں) ٹیوشن پڑھائی لیکن بھیک کبھی نہیں مانگی۔ اور پیسہ جمع کرتا رہا کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو کچھ کروں گا۔ کوئی عزت کا کام۔

میری باتوں نے بیگم صاحب کو بھی رُلادیا۔ انہوں نے فوری طور پر میرے لیے پچھلے حصّے میں سرونٹ کوارٹر کا ایک حصّہ خالی کرایا جو اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور یوں میری رہائش کا مسئلہ بھی حل ہوگیا اور میں محفوظ بھی ہوگیا۔ یتیم خانے والے میری تلاش میں اس گھر تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور پہنچ بھی جاتے تو ان کا اندر داخل ہو کے مجھے واپس لے جانا مشکل تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اگلے دن مجھ سے ساری کہانی پھر سُنی پھر انہوں نے سوچتے ہوئے کہا "ہوں۔۔۔!"

"ہوں کیا؟" ان کی بیوی بولی "آپ کے اتنے مراسم ہیں۔ آج ہی رپورٹ لکھوائیں اس خبیث کے خلاف دُہرے قتل کی۔"

انہوں نے ٹہلتے ہوئے سہلا کے پھر کہا "ہوں..."

"کیا ہوں ہوں کئے جارہے ہیں۔ کیا پوسٹ مارٹم سے قتل ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس لڑکے کا بھی اور اس کی ماں کا بھی۔ پولیس لاشیں نکلوا کے اس کا پوسٹ مارٹم کراسکتی ہے اور ایک بار وہ پولیس کے ہاتھ لگ جائے گا تو اپنا جرم خود قبول کرے گا۔ پولیس کو آتا ہے سب کچھ اُگلوانا..."

"یہ تو ٹھیک ہے بیگم مگر قانونی معاملات اتنے آسان نہیں ہوتے۔ تم چاہتی ہو فریق میں بنوں، میں تھانے جاؤں اور ایف آئی آر درج کراؤں۔ پہلا سوال تو یہی ہوگا کہ میرا کیا تعلق ہے اس لڑکے سے؟"

"آپ اس کی طرف سے ایف آئی آر لکھوادیں۔"

"چلو یہ بھی ہوگیا۔ اب تم کیا سمجھتی ہو کہ رپورٹ لکھتے ہی پولیس جائے گی اور قاتل کو پکڑے گی۔ دوپہر تک پوسٹ مارٹم ہو جائے گا اور شام تک تفتیش مکمل ہو جائے گی۔ ارے بھئی' یہ عدالتی چکر مہینوں چلتے ہیں۔ ایک وکیل کرنا پڑے گا۔ اس کی فیس بھی ہوگی۔ اسے پھانسی دلوانی ہے تو وکیل بھی بڑا کرنا پڑے گا ورنہ وہ اپنے دفاع کے لیے بڑا وکیل کرے گا تو صاف بچ جائے گا۔ قدم قدم پر کوئی قانونی مسئلہ ہوگا۔ پوسٹ مارٹم کے لیے الگ کیس ہوگا۔ مجسٹریٹ' ایم ایل او' کیمیکل ایگزامنر۔ پتا نہیں کتنے لوگ INVOLVE ہوں گے۔ سب کا منہ کھلا ہوا ہے آج کل بیگم۔ کیس کو رشوت کے پہیّے نہ لگاؤ تو وہیں رُک جاتا ہے۔ کم سے کم بھی دو سال چاہئیں۔ اس صورت میں کہ وکیل دلچسپی لے اور میں بھی اس کیس میں لگا رہوں۔ تم جانتی ہو وقت نہیں ہے میرے پاس اور پھر پیسہ۔۔۔"

میں نے کہا "سر۔ پیسہ تو میرے پاس ہے' آپ جانتے ہیں۔"

وہ مجھ پر برس پڑے "ہاں جانتا ہوں۔ لکھ پتی ہو تم مگر کیا پیسہ پیسہ کرکے جو رقم تم نے اکٹھی کی تھی وہ اس لیے تھی کہ اپنے بجائے ایک ایسے شخص پر خرچ کردو جس کو پھانسی پر لٹکا کے بھی تم کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ لڑکا واپس نہیں آسکتا۔ یہ انتقام لینے کا جذبہ کوئی قابل تعریف چیز نہیں۔ قبائلی معاشرے کا جاہل آدمی آج بھی اسی چکر میں نسل در نسل دشمنی بڑھاتا ہے۔ خود بھی تباہ ہوتا ہے۔ اپنے خاندان کو اور آنے والی نسلوں کو بھی برباد کرتا ہے۔ تم ایک مہذب معاشرے میں ہو۔ جذبات سے نہیں عقل سے کام لو۔ معاف کرنا سیکھو' معاف کرنے میں بڑائی ہے۔ اپنا انصاف کا معاملہ اللہ پر چھوڑو۔ آخر وہ بھی تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

شاید ڈاکٹر صاحب کی کوئی بات غلط نہیں تھی مگر مجھ پر جذبات کا غلبہ تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ میری مدد نہیں کرنا چاہیے۔ کسی حد تک یہ بھی درست تھا۔ ان کو اپنے گھر کی اور اپنی نیک نامی کی فکر تھی۔ یہ خوف تھا کہ یتیم خانے کے بدمعاش کہیں ان کے بچوں کو نہ اٹھوالیں۔ ناصر عظیم کے خلاف کوئی ایسی رپورٹ نہ لکھوادیں کہ پولیس یہاں آجائے۔ ہم بھی خواہ مخواہ ملوث ہوجائیں ملزم کو پناہ دینے کے الزام میں۔ ان کا اور پولیس کا گٹھ جوڑ ہے۔

بیگم صاحبہ نے دبے دبے لہجے میں کہا "خیر یہ تو ناممکن ہے۔ آخر آپ کے بھی تعلقات ہیں۔ اور ڈی آئی جی صاحب دوست ہیں آپ کے۔"

"وہ آج یہاں ہے۔ کل نہ جانے کہاں ہوگا۔ اور کیا وہ گارڈ بٹھادے گا ہمارے گھر پر۔ بچے بکتر بند گاڑی میں اسکول جائیں گے۔ دیکھو میاں ناصر' خود بھی سکون سے رہو اور ہمیں بھی رہنے دو۔ تم اچھے لڑکے ہو۔ محنتی ہو' میرے بچوں کو پڑھاتے ہو اور سب تمہیں پسند کرتے ہیں اس لیے تم یہاں رہ سکتے ہو۔ اپنی تعلیم جاری رکھو اور کسی چکر میں مت پڑو۔ خدا نے چاہا تو ایک دن تم بھی ڈاکٹر بنو گے میری طرح۔ میرا باپ کیا تھا۔۔۔ ایک چپراسی۔"

اس وقت جب وہ اپنی لگن اور محنت سے حاصل ہونے والی عزت' شہرت اور دولت کی بارہا سُنی ہوئی کہانی سُنانے میں مصروف تھے۔ میں ان سے کہتا کہ میں نے کیا قسم کھائی تھی تو شاید وہ مجھے گھر سے نکال دیتے کہ اچھا پھر کہیں اور جاکے اس پر عمل کرو۔ تم تو بہت خطرناک عزائم رکھتے ہو ابھی سے۔ تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے اس گھر پر اور میرے بچوں پر۔ اصولاً تو مجھے تم کو پولیس کے حوالے کردینا چاہیے تاکہ وہ تمہیں اصلاح کے لیے بچوں کی

جیل بھیج دیں مگر مجھے معلوم ہے وہاں اصلاح نہیں مجرمانہ ذہن کی تربیت ہوتی ہے۔ اس لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے انتقام کی ذمّے داری کسی اور پر ڈالو اور مجھے معاف کرو۔

میں نے جو قسم کھائی تھی اس پر میں نے بہت عرصے بعد عمل کیا مگر یہ حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہی مجھ پر دولت کی طاقت کا نشہ غالب آنے لگا تھا اور میں بھی ساری دنیا کو اس طاقت کے حصول کے لیے کوشاں اور اس کے سامنے سرنگوں دیکھنے لگا تھا۔ دولت الٰہ دین کے چراغ کا جن تھی جس کے اختیار میں سب کچھ تھا۔ یہ چراغ میرے ہاتھ آگیا تھا۔ اب میں محنت کی عظمت کے فلسفے کو کیسے اہمیت دے سکتا تھا۔ میرے لیے ڈاکٹر انجینئر' افسر بننا سب بے کار اور وقت کا زیاں تھا۔ محنت کرنے والے گدھے تھے یا خچر تھے جو جتنا بوجھ اُٹھاتے تھے اتنا ہی ان پر اور لاد دیا جاتا تھا۔

O☆O

برسوں بعد گردش حالات نے مجھے پھر اس پُرخطر راستے پر دھکیل دیا تھا۔ جس پر اَب میں چلنا نہیں چاہتا تھا لیکن سوال پھر اپنی بقا کا تھا۔ میں زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے کے لیے کسی کے سامنے دست طلب پھیلانا نہیں چاہتا تھا۔ کسی سے یہ حق خیرات میں نہیں مانگنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی دنیا خود بنائی تھی۔ میں غلط راستے سے صحیح منزل پر پہنچ گیا تھا۔ اب میرے پاس سب کچھ تھا۔ رشتوں کا احترام' کامیابی کی لگن' آبرومندانہ اور پُرتحفظ زندگی۔ روشن مستقبل اور چندا کی محبت۔ میں اپنی اس پُرسکون' پُرمسرت اور عافیت کے احساس کی جنت میں خوش تھا۔ نہ اس سے باہر جانا چاہتا تھا اور نہ کسی کو اس میں خلل اندازی کی اجازت دے سکتا تھا۔

لیکن تقدیر ایک ستم ظریف مداری ہے۔ بہت پہلے اس نے ایک کھیل شروع کردیا تھا جب دنیا میں دو بچے ایک ہی جیسے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے گھر اور ماں باپ سب الگ تھے۔ ان کے نام بھی الگ تھے مگر خاموشی سے اپنا کھیل جاری رکھنے والی تقدیر نے اچانک ان کو ایک دوسرے کے مقابل لاکے کہا۔ اب تم میں سے ایک رہے گا کیونکہ تم دونوں ہی شاہ عالم بن گئے ہو۔ ایک زمین پر دو آسمان نہیں ہوسکتے۔ ایک کائنات کو دو خدا نہیں چلاسکتے۔

جب میں شبنم کے فلیٹ کی کھڑکی کے راستے نیچے اُتر کے فرار ہوا تو میں یہ چیلنج قبول کرچکا تھا۔ اگر میں شاہ عالم ہوں تو پھر مجھے ہی باقی رہنا چاہیے کیونکہ پہلا شاہ عالم خود اپنے لیے اپنے آس پاس کے انسانوں کے لیے اور اس معاشرے کے لیے شرمناک حد تک ناقابل قبول ہوگیا ہے۔ اس کا وجود انسانی بدن میں کینسر کی طرح ہے جس کو جتنا جلد پھیلنے سے روک دیا جائے اچھا ہے اور اگر روکا نہ جاسکتا ہو تو کاٹ کے پھینک دیا جائے۔ اسی میں فلاح ہے اور عافیت ہے۔ میرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

کھڑکی سے میں فلیٹوں کی عقبی دیوار والے احاطے میں اُترا

تھا۔ دیوار پھاند کے میں ایک ذیلی سڑک پر آگیا۔ وہاں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ کوئی بڑا ہوتا تو شاید مجھ سے پوچھتا کہ دروازے آخر کس لیے رکھے جاتے ہیں۔ صرف چوروں اور جانوروں کی وجہ سے 'تم کیا ہو؟

پچانے جانے کا اندیشہ پہلے بھی تھا مگر اب مجھے ہر طرف خطرہ ایک دیوار کی طرح حائل نظر آرہا تھا۔ یہ احساس کی شدت کا کرشمہ تھا کہ میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کہیں بھی خطرے سے محفوظ نہیں میں فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے سمندر میں ڈوبنے والا کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب تیرنے کی کوشش میں مصروف ہو کہ شاید اُدھر سمندر پر ہی کنارہ ہو۔ جب کہ کنارہ تاحدِ نظر کہیں نہ ہو۔

اگر میں بھاگنے لگتا تو زیادہ مشکوک ہو جاتا۔ گلی کے موڑ پر میں نے سڑک عبور کرنی چاہی تو گاڑی جیسی چار پہیوں پر متحرک کوئی مشین رینگتی ہوئی مخالف سمت سے آئی اور میں اس سے ٹکرا کے گر پڑا۔ یہ چلبلی تھی جس کو جناب ابوبکر آزاد صاحب بقلم خود چلاتے ہوئے لا رہے تھے۔ غنیمت یہ ہوا کہ موڑ پر گاڑی خود بخود رُک چکی تھی چنانچہ عملاً میں نے ہی گاڑی کو ٹکر ماری۔ اس عجیب الخلقت گاڑی سے میرا پہلا تعارف ہی زیادہ خوش گوار حالت میں نہیں ہوا تھا۔

ابوبکر آزاد صاحب نے اندر سے دروازے کی چٹخنی کھولی اور چھڑی سمیت برآمد ہوئے۔ انہوں نے چشمے کے اوپر سے مجھے ملاحظہ کیا "اچھا تو یہ آپ ہیں؟" انہوں نے کہا "ہم پوچھتے ہیں کہ ابوبکر آزاد تو ہم ہیں۔ تم کو کس نے آزاد کر دیا ہے' بولو۔" انہوں نے اچانک چھڑی گھما کے میری ٹانگ پر رسید کی۔

میں نے کہا "السلام علیکم حضرت۔ اچھا طریقہ ہے یہ ملاقات کا۔"

"کیں تو ہم نے کہا نامعقول۔ ٹکر تم نے ماری ہے یا ہم نے؟ اور تمہارا کیا ہے' بٹے کٹے جوان آدمی ہو۔ اس ضعیفہ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ ابھی میں آپ کی اس منحوس گاڑی۔۔۔"

انہوں نے چھڑی میرے دوبارہ رسید کی "منحوس۔ منحوس گاڑی۔۔۔ چلبلی کو منحوس کہتے ہو گستاخ۔ اس سے زیادہ مبارک تو منکوحہ بھی نہیں ثابت ہوئی ہمارے حق میں۔ اور اس کے نیچے تم کیسے آسکتے تھے' چلبلی کو کیا تم نے اندھا بیل سمجھ رکھا ہے۔ میاں خدا نے اسے عقل دی ہے۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ ابوبکر آزاد کی کار کیا صحبت کے فیض سے محروم رہ سکتی تھی۔ دیکھ لو وہ خود رُک گئی تمہیں دیکھ کے بلکہ۔۔۔" وہ کھی کر کے ہنسے "سچ تو یہ ہے کہ تم سامنے نہ آتے تب بھی وہ رُک جاتی' اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔"

"گاڑی کا ہارٹ فیل!"

"پھر گاڑی۔۔۔ چلبلی' شریکِ حیات سے زیادہ رفیقِ حیات ہے ہماری۔ دماغ ہی نہیں' دل بھی رکھتی ہے۔ دل کیا ہوتا ہے برخوردار' انسان کی باڈی کو چلتا پھرتا رکھنے والی مشین' تو چلبلی کا انجن پھر کیا ہوا؟"

"اوہ۔ اس کا انجن بند ہو گیا تھا۔"

"ہاں بھئی۔ ہم نے سوچا اب بیچ سڑک اسے روکیں گے تو خواہ مخواہ ٹنک چڑھی کار کا حسن و شباب اور میک اپ خراب ہو گا۔ ہم نے گاڑی گلی میں موڑلی تھی خود ہی کہ کچھ تو ہو گا۔ کسی کا دروازہ' کوئی کھمبا' درخت' گاڑی روکنے کے لیے کچھ ضرور دستیاب ہو گا۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا "گویا بریک بھی نہیں ہیں۔"

"بھئی فیل ہو گئے تھے۔ نالائق ہیں نا۔ ہم کبھی فیل نہیں ہوئے۔ خیر تم بتاؤ کہیں تمہارے گھٹنوں کے بال بیرنگ تو خراب نہیں ہوئے۔ بریک تمہارے بھی زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ خیر تم اچھے وقت پر ملے۔ اب ہم بیٹھتے ہیں اندر۔ تم اب تھوڑا سا دھکا لگاؤ' شاباش' چلبلی ذرا روٹھ گئی ہے۔"

میں نے کہا "اسے آپ ایک ہی بار راوی کے پل سے دھکا کیوں نہیں دے دیتے۔"

انہوں نے مجھے چھڑی رسید کی "بدتمیز۔ جاہل' تمہاری والدہ ماجدہ کی عمر سے زیادہ عمر ہے چلبلی کی۔ دادی کے برابر ہو گی۔ دادی ہے تمہاری تو بتاؤ اسے دھکا دو گے راوی کے پل سے۔۔۔ ناخلف۔"

میں نے اسے تھوڑا سا دھکیلا تو وہ اسٹارٹ ہو گئی۔ ابوبکر آزاد چلائے "اب میاں کہیں جانا ہے تو آجاؤ۔ ٹیکسی کا خرچ بچ جائے گا۔"

میں گاڑی کے ساتھ دوڑا اور اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا اگلا دروازہ بند تھا مگر باہر کوئی ہینڈل نہیں تھا۔ آزاد صاحب نے اندر سے اس کی چٹخنی کھولی تو دروازہ پورا کھل گیا۔ میں اندر بیٹھنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچا۔ دروازے کو بند کرنے کے لیے مجھے اندر سے ویسی ہی چٹخنی لگانی پڑی جیسی گھر کے دروازوں میں ہوتی ہے۔ "آپ اُدھر کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم تو کہیں نہیں جاتے۔ چلبلی لے جاتی ہے ہمیں" وہ ہنسے "اوہو' اس میں تو پیٹرول بقدرِ قطرۂ اشکِ بلبل رہ گیا ہے۔"

میں نے گڑبڑا کے کہا "جی۔۔۔ کیا ختم ہو گیا؟"

"نہیں' ابھی ہے۔ اتنا ہی جتنا کہ۔۔۔ بلبل کی آنکھ میں آنسو کا قطرہ۔ فارسی میں کہا تھا تو تم خاک نہیں سمجھے تھے۔"

پیٹرول پمپ پر انہوں نے کہا "بھائی صاحب' ستائیس روپے کا ڈال دو۔"

"ستائیس روپے کا کیا حساب ہوا؟" پیٹرول پمپ والا چکرا گیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میاں تم سمجھاؤ اسے کہ ستائیس کتنے ہوتے ہیں۔ بھئی ہمیں جتنی ضرورت ہو گی اتنا ہی خرچ کریں گے نا۔ اس نامعقول کے کہنے سے پورے پانچ لیٹر یا پچاس روپے کا کیوں ڈلوائیں آخر۔"

انہوں نے پیٹرول ڈلوا کے دس ہزار کا پُرانا نوٹ نکالا۔ پیٹرول ڈالنے والے لڑکے کے انکار پر ان کی باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا "میاں ذرا کھلا تو نکالو' بس ستائیس روپے' اب کیا کریں ہم۔۔۔"

میں نے ستائیس روپے دے کے کہا "آپ اس نوٹ کی حفاظت کریں۔ ایسا نہ ہو کسی دن یہ بچ بچ خرچ ہو جائے۔"

چلبلی نے جب پھر خرام ناز کا مظاہرہ کیا تو انہوں نے کہا "بھئی وہ تمہارے سوال کا جواب تو رہ گیا تھا۔ ہم جا رہے تھے اپنے اصطبل۔ بھئی جہاں گدھے گھوڑے آج کل ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جا رہے ہیں۔ ہمارا دفتر۔۔۔ بڑی سنسنی خیز خبر ملی ہے کہ کسی نے تمہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہ عالم کو مقتول فرما دیا کسی نے۔۔۔"

"شاہ عالم کو۔۔۔ یا شاہ عالم نے کسی کو؟"

"اوہ۔۔۔ پروف ریڈنگ کی کیا ہولناک غلطی سرزد ہو جاتی۔ قاتل کو ہم اگر مقتول لکھ دیتے اور مقتول کو قاتل۔ تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ مقتول کے خلاف کیس بن جاتا۔۔۔ اور قاتل۔۔۔ خیر میاں شاہ عالم' اچھا کیا تم نے بتا دیا۔"

میں اچھل پڑا "شاہ عالم۔۔۔ حضرت' میں ناصر عظیم ہوں۔"

انہوں نے چشمے کے اوپر سے مجھے بغور دیکھا۔ "سچ کہتے ہو۔ دراصل اب نظر کمزور ہو گئی ہے ہماری۔۔۔ اور نظر کیا' عقل بھی استعمال ہوتے ہوتے گھس گئی ہے' ہمارے جوتے کے سول کی طرح۔ پھر غور طلب یہ بات بھی ہے کہ قاتل ہو یا مقتول۔ شاہ عالم یہاں کہاں' بھئی وہ یا تو اوپر ہو گا یا اندر۔ یا عالمِ ارواح میں اور یا پھر ہانگ کانگ میں۔"

میں نے کہا "وہ ہانگ کانگ میں ہے۔"

"اچھا!" انہوں نے مجھے گھورا "تمہیں بھی معلوم ہے گویا۔ یہ بھی بتا دو کہ کہاں ہے وہ نامعقول۔ کسی نے اس کی چند تصاویر ارسال فرمائی تھیں بغرضِ اشاعت۔ مگر میاں۔۔۔ وہ ہم نے ورلڈ میں رکھ لیں۔ قابلِ دید تصاویر تھیں۔ قابلِ اشاعت نہیں' تم دیکھو گے۔"

میں اس بے وقوف بن کے بے وقوف بنانے والے شخص کی عیاری سے سخت پریشان ہونے لگا تھا۔ اگر میں اس سے پوچھتا کہ وہ کس قسم کی تصاویر تھیں تو یہ تجسس نہ جانے کیا گُل کھلاتا۔

"اور ہاں بھئی' تم آخر کرتے کیا ہو۔ آوارہ گردی کے علاوہ اور عمر رسیدہ شریف کاروں کو ٹکریں مارنے کے سوا۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنی فرزندی میں لے لیں۔۔۔ خوش قسمتی ہے تمہاری' بدقسمتی ہماری۔"

میں پھر اُچھل پڑا "یہ۔۔۔ کیا فرما رہے ہیں آپ۔۔۔ میرا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے شادی کرنے کا۔ اور پھر آپ کی بیٹی سے۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔"

"گستاخ۔۔۔ جاہل' تم پر دو بید اُدھار رہے۔ اگر ہم اس وقت چلبلی کو کمان نہ کر رہے ہوتے۔ تو ضرور تمہاری ٹانگیں توڑ دیتے بید مار کے۔ شادی ہم نے نہیں کی تو تمہاری کیسے کرا دیں۔۔۔ اور بیٹی کہاں سے لائیں تمہارے لیے۔ مگر پھر بھی۔۔۔ تم نے توہین کی ہماری بیٹی کی۔۔۔ اور ہماری۔۔۔ یعنی اگر ہوتی۔۔۔ تو کیا لاحول کے قابل ہوتی۔"

"پھر مطلب کیا تھا آپ کا؟"

"بھئی ہم چاہتے تھے کہ تم کو کچھ ادب' آداب سکھا دیں۔ اخبار میں کام کرنے کے۔ دراصل کچھ معاملات ہوتے ہیں جوانوں کے۔ اس عمر میں ہمارے لیے سخت باعثِ شرم ہوتی ہے کوئی ایسی وڈیو فلم دیکھنا۔ جیسی آج کسی نامعقول نے ہمیں دے دی۔ لاحول ولا قوۃ۔ بڑی شرم ناک حرکت تھی وہ اور شرم بھی آئی ہمیں وہ فلم دیکھ کے۔ میاں ازدواجی تعلقات کی فلم بنانا۔ توبہ توبہ۔۔۔ پتا نہیں کیا مقصد تھا اس حرکت کا۔"

میرے رونگیں رونگیں میں خوف سرایت کرنے لگا تھا۔ کہیں وہ اُسی فلم کی کسی کاپی کا تذکرہ تو نہیں کر رہا تھا جو مجھے تیمور نے دی تھی۔

گاڑی کو اس نے اچانک ایک تھانے کے مقابل روک لیا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ "یہ۔۔۔ یہ کہاں آگئے آپ۔۔۔؟"

"بھئی۔۔۔ ایک کام یاد آگیا۔ باتوں میں بھول گئے تھے ہم۔ اب گاڑی کو اندر لے جاتے تو روکتے کیسے۔۔۔ تھانے کی عمارت گر جاتی یا کوئی تھانے دار گر جاتا۔ تم جانا نہیں' بلکہ آجاؤ اندر۔ گاڑی اسٹارٹ کرانے کے لیے سخت ضرورت ہے ہمیں تمہاری۔ اور ہم ویسے بھی وعدہ کر چکے ہیں تمہیں گھر چھوڑنے کا۔۔۔"

اسی وقت اندر سے تیمور برآمد ہوا۔

وہ اپنی گاڑی کی جانب جا رہا تھا جو تھانے کے باہر موجود دو گاڑیوں کے درمیان ترچھی کھڑی تھی مگر میں نے تیمور کی گاڑی کو پہچان لیا۔

ابوبکر آزاد نے اپنی طرف کے دروازے کی کنڈی کھولی مگر دروازہ پھر بھی نہیں کھلا تو انہوں نے اسے شانے سے دھکیلا۔ پھر تھوڑا سا گھوم کے ایک لات ماری۔ "اُف' بھئی چلبلی! یہ کیا نامعقولیت ہے۔ تم بھی ضد پر آجاتی ہو موقع محل دیکھے بغیر۔ اب ہم کیا سر کے بل کھڑکی میں سے باہر طلوع ہوں بلکہ تولد ہوں" وہ بڑبڑائے' اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

میں نے دوسری طرف سے باہر آنے کے بعد تیمور کی طرف دیکھا پھر ابوبکر آزاد سے مخاطب ہوا "قبلہ میں ابھی آیا۔"

"ارے بھئی ممنو..... ایسے کہاں بھاگے جارہے ہو۔ مثل شترمرغ در صحرا..... ہم آتے ہیں ابھی دومنٹ میں اندر سے فارغ ہوکے۔ یہاں جو کوتوال ہے نا' ہم سے اس نے سرعام بدتمیزی کی تھی۔ کوئی ایک مہینا قبل۔ اس وقت ہم معروف تھے بہت' آج ایک دندان شکن جواب سوجھا ہے' فرصت بھی ہے۔"

میں نے تیمور کی طرف جاتے ہوئے کہا "میں یہیں ہوں۔ چلبلی پر نظر رکھوں گا۔ آپ اطمینان سے اس گستاخ کی سرکوبی فرمایئے۔"

"سرکوبی!" وہ بلغم کی آواز میں ہنسے "بھئی خوب کہا۔ یہ بھی فرمائیں گے کسی دن۔"

تیمور ابھی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ میں دوسری طرف کے گیٹ سے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ایسا بدحواس ہوا جیسے میں کوئی آدم خور شیر ہوں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ پورے پاکستان میں چڑیا گھر کے سوا شیر کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس کا حیران' پریشان اور خوف زدہ ہونا برحق تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے کہا "تم.....!"

میں نے کہا "نہیں۔ فرض کرلو کہ یہاں میں نہیں فرشتۂ اجل بیٹھا ہے جو صرف عالمِ نزع میں دکھائی دیتا ہے۔ تم سخت اذیت میں مبتلا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تھانے کے سامنے ہارٹ فیل ہونے سے فوت ہوجاؤ۔"

وہ زبردستی مسکرایا "تم یہاں کیا کررہے ہو خدا کے بندے!"

میں نے کہا "میں تمہیں ڈھونڈ رہا تھا عبداللہ۔ اچھا ہوا تم یہاں مل گئے۔"

اس نے گاڑی ریورس کرکے نکالی "میرا نام عبداللہ کب سے ہوگیا؟"

"تم نے مجھے اردو میں خدا کا بندہ کہا۔ میں نے عربی شریف میں کہہ دیا۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

ایک معمولی سا دھماکا ہوا اور تیمور کی گاڑی نے چلبلی کے مڈگارڈ میں ڈینٹ ڈال دیا۔ وہ نروس تھا ورنہ چلبلی کافی دور تھی۔ اس نے گیئر بدلے بغیر اپنی گاڑی آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ ایکسیلیٹر دبانے سے گاڑی ایک دم پیچھے ہوئی تو تیمور کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے فوراً بریک لگائے۔

"اف۔ تم نے چلبلی کو ٹکر ماردی۔"

تیمور ہکلانے لگا "چلبلی..... کوئی خاتون نیچے آگئی؟"

میں نے کہا "نکل چلو یہاں سے تیمور ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ چلبلی نام ہے ابوبکر آزاد کی شریکِ حیات خاندانی مرسیڈیز کا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ اندر گیا ہوا ہے۔"

تیمور نے سکون کا سانس لیا اور گاڑی آگے بڑھائی "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ نقصان تو میرا ہوا ہوگا۔ اس چھکڑے کا کیا جسے کباڑی تول کے بھی نہ لے۔"

میں نے کہا "ہمت ہے تو کسی دن یہ بات ابوبکر آزاد کے منہ پر کہوا اور دیکھو خیریت چاہتے ہو تو شرافت سے اس کے دفتر میں حاضر ہوکے معافی مانگ لینا اور چلبلی کے معقول علاج معالجے کی ذمے داری قبول کرلینا ورنہ وہ معلوم کرلے گا اور عاقبت تو تمہاری پہلے ہی خراب ہے' دنیا میں بھی روسیاہ۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔ یہ بتاؤ تم اس کے ساتھ تھانے کیا لینے آئے تھے؟" تیمور نے کہا۔

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں؟"

"یہاں ہمارے مخالفین نے ایف آئی آر درج کرائی ہے۔ میں وضاحت کے لیے آیا تھا کہ اس سے زیادہ لغو الزام کیا ہوسکتا ہے کہ شاہ عالم اس وقت بھی ہانگ کانگ میں ہے اور کہا جارہا ہے کہ وہ عمردراز سے ملنے گیا اور اسے زہر دے کر ماردیا۔ خود عمردراز کے گھر اور آفس میں جہاں درجنوں کارکن اور محافظ موجود تھے۔ میں نے پریس ریلیز کی کاپی دے دی ہے یہاں بھی اور ہر اخبار کو بھی۔"

"مگر یہ سچ ہے کہ عمردراز کو شاہ عالم نے قتل کیا۔"

"فضول بات مت کرو۔"

میں نے کہا "اب شاہ عالم کے ہاتھوں تیمور بھی قتل ہوسکتا ہے اور یہ کوئی فضول بات نہیں ہے۔"

"کیوں؟ میرا جرم کیا ہے؟"

"تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے ناصر عظیم کو شاہ عالم بنا کے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا بلکہ آلۂ قتل کے طور پر۔"

"گویا تم نے بھی یقین کرلیا ہے مخالفین کی باتوں پر کہ مرتے وقت جو کچھ عمردراز نے کہا تھا وہ سچ ہے۔ اس نے شاہ عالم کا نام لیا تھا تو قاتل شاہ عالم ہوگیا۔ میرا نام لیتا تو میں ہوجاتا۔ صرف دو افراد ہیں جو خود کو چشم دید گواہ کہتے ہیں اور یہ الفاظ عمردراز سے منسوب کررہے ہیں حالانکہ ایسا نہ دیتا' وہ کوئی بیان دینے کا سوچنے سے پہلے ہی مرگیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا تم دیکھ رہے تھے؟"

"یہی سمجھ لو۔ ہمارا آدمی دیکھ رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ عمردراز ایک دم گرا اور مرگیا۔"

میں نے کہا "تمہارا یہ آدمی دراصل عمردراز کا ساتھی تھا۔ کوئی خاندانی قسم کا ضمیر فروش۔ غداری جس کے خون کی جدی پشتی نسلی صفات میں شامل ہوگی کہ اس نے پہلے شاہ عالم کو چھوڑا اور اب عمردراز کے لیے آستین کا سانپ ثابت ہوا۔"

"یار سب ہوتا ہے دنیا میں اور دنیا کی سیاست میں۔ لیاقت علی خان سے ضیاء الحق تک۔ مروانے والے سات سمندر پار کے لوگ تھے مگر مارنے والے تو انہی کے قریبی ساتھی تھے۔"

میں نے کہا "جو میرے ساتھ گئے تھے۔ وہ صاحب دار اور قریشی نہیں تھے۔ وہ قراردادِ بھی بوگس تھی۔"

اس نے ڈھٹائی سے مسکرا کے گردن ہلائی "جو قریشی بنا ہوا

تھا' وہ ان کا آدمی تھا۔"

میں نے کہا "تم نے مجھ سے بھی جھوٹ بولا۔ میری لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے..... نطفۂ خر۔"

"اگر تمہیں بتادیا جاتا..... تو شاید تم نہ جاتے" وہ بولا۔

"تجھ جا بیٹا سولی رام بھلی کریں گے۔ یہ ایسی ہی بات تھی۔ تم نے مجھے ایک قتل کے مشن پر بھیجا تھا۔ اگر مشن ناکام ہوجاتا یا میں پکڑا جاتا تو وہیں میرے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جاتے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "تمہیں بحفاظت نکال لانے کا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "آپ بکواس فرماتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں تھا وہاں دور دور تک۔ یہ تو میری دور اندیشی یا قسمت تھی کہ میں نے اپنی حفاظت کا خود انتظام کرلیا تھا۔ تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مجھے مروانے میں سگ زادے۔"

"یہ غلط فہمی ہے تمہاری" اس نے گاڑی ایک طرف روک دی۔

"تیمور۔ اگر میں ایک ہاتھ مار کے تمہاری گردن توڑ دوں اور پھر تم سے کہوں کہ یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"ہاں۔ دراصل میں جلد باز اور بے وقوف نہیں ہوں ورنہ ایسا ضرور کرتا۔ چند سیکنڈ میں ہی' خود تمہیں پتا نہ چلتا کہ تم فوت ہوچکے ہو۔ پھر میں فوراً اسٹیئرنگ سیدھا رکھتے ہوئے بریک لگا کے گاڑی کو سنبھال لیتا۔ گاڑی کو ایک سائڈ پر روک کے خود تمہاری جگہ بیٹھ جاتا اور تمہیں لے جاتا ہیڈ مرالہ جہاں گاڑی میرے قابو سے باہر ہوجاتی اور سیدھی جاتی پانی میں۔ میں دروازہ کھول کے چھلانگ مارتا اور تیرتا ہوا باہر آجاتا۔ خبر یہ آتی کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ میرا بچ جانا ایک معجزہ قرار پاتا۔ کیسی اسکیم ہے؟"

"ایسی باتیں مت کرو۔ تم بنا بنایا کھیل بگاڑ دوگے۔"

میں نے کہا "وہ تمہارا کھیل تھا مداری کے بچے۔ میرا کھیل اب شروع ہوا ہے۔ تدبیر کی اہمیت اپنی جگہ۔ مگر تقدیر سے بڑا مداری کون ہے؟ دیکھو اس نے تم کو کس بہانے وہاں بلایا۔ اور مجھے کیسے وہاں پہنچایا۔ تم پریس ریلیز دینے کے لیے تھانے گئے جو مشکل سے پانچ دس منٹ کا ہی کام ہوگا۔ اگر تم نکل جاتے تو پھر میرے ہاتھ کہاں آتے۔ مجھے وہاں لے گئے ابوبکر آزاد۔ میں ان کی چلبلی سے ٹکرا گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے گاڑی کو دھکا لگوایا اور پھر دعوت دی مجھے گھر پر ڈراپ کرنے کی مگر لے آئے یہاں۔ یہ ابوبکر آزاد بھی بڑی کائیاں چیز ہے تیمور۔ بہت ہی حرامی ہے۔ الو بن کے الو بناتا ہے آدمی کو۔ اس کو یقیناً کوئی شک ہوگیا ہے۔ اس نے مجھے غائب دماغی کے باعث نہیں' جانتے بوجھتے شاہ عالم کہنے کی کوشش کی۔ صرف یہ جتانے کے لیے کہ میں وہی ہوں یا ویسا ہی ہوں۔"

"تم ایسے کیوں پھر رہے ہو۔ تمہیں روپوش رہنا چاہیے۔"

میں نے کہا "[illegible] تم روپوش ہوتے تھے [illegible] کیوں؟ تم کو کس کا ڈر تھا۔"

"مشتعل مخالفین مجھے بھی نقصان پہنچا سکتے تھے" وہ بولا۔

میں نے کہا "اور شاہ عالم کے ماں باپ۔ اس کی بیوی رخشندہ؟"

"انہیں پورا تحفظ فراہم کردیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی تیمور۔ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ میں ہانگ کانگ میں نہیں ہوں۔ وہ سوفیصد یقین کے ساتھ حلف اٹھانے کو بھی تیار ہوں گے کہ انہوں نے مجھے رخشندہ کے ساتھ گھر کے اندر دیکھا تھا۔ مثلاً وہ ڈاکٹر جسے رخشندہ نے طلب کیا تھا اور جس کے سامنے میں نے یادداشت کے گم ہوجانے کی بے مثال اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کسی ڈاکٹر کو جعلی بیماری کے ڈرامے سے بے وقوف بنانا آسان نہیں ہوتا۔ شاہ عالم کے والدین ہیں' گھر کے ملازم ہیں اور خود میری سینہ منکوحہ....."

"رخشندہ کی طرف سے تم مطمئن رہو۔ اب وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ زبان کھول سکے۔" تیمور معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔

"تم نے اسے بھی ویڈیو فلم کی ایک نقل فراہم کی ہوگی۔"

"اسے خاموش رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔"

"یعنی اسے واقعی علم نہیں تھا کہ اس کے بیڈ روم میں ایک ویڈیو کیمرا نصب کردیا گیا ہے۔" میں نے حیرانی سے کہا "جو اس کی پرائیویٹ لائف کو ریکارڈ کررہا ہے۔"

"اس کو خاموش رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ پھر میں نے اسے فون کرکے کہہ دیا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ شاہ عالم ہانگ کانگ میں ہے' یہاں نہیں۔"

"اور اس نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ نہیں پوچھا کہ وہ شاہ عالم نہیں تھا تو پھر کون تھا جو میرے ساتھ اس بیڈ روم میں تھا اور یادداشت گم ہوجانے کا ڈراما کررہا تھا۔"

"اس نے پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ جو بھی تھا' شاہ عالم نہیں تھا۔ اسے یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ اسی میں اس کا اور شاہ عالم کا فائدہ ہے بصورتِ دیگر شاہ عالم یہ فلم دیکھ کے خوش نہیں ہوگا۔"

"کیا اس نے تمہاری آواز پہچان لی تھی؟ اسے معلوم تھا کہ تم تیمور ہو۔"

"نہیں۔ میں نے آواز بدل کے بات کی تھی۔"

میں نے کہا "پھر اس نے پوچھا ہوگا کہ تم کون ہو اور یہ سب کیا ہورہا ہے؟"

تیمور نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ میں نے کہا کہ میرا نام جان کے کیا کروگی۔ میں جو بھی ہوں تمہارا بہی خواہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ شاہ عالم کو یا تمہیں کسی قسم کا نقصان ہو۔ تمہاری نجی زندگی متاثر ہو یا تمہارا پبلک امیج خراب ہو۔ وہ چلانے لگی کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم بلیک میلر ہو۔ مجھ سے رقم اینٹھنا چاہتے ہو اور شاہ عالم کو بھی

بلیک میل کرکے سیاسی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہو۔ پھر خود ہی کہنے لگی کہ نہیں وہ شاہ عالم ہی تھا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔ آخر میں اس کی بیوی ہوں۔ سچ بتاؤ' یہ کیا کھیل ہے۔ کہاں لے گئے ہو تم لوگ اسے۔ تم نے ضرور اس کو کچھ کھلا دیا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کے دماغ پر اثر ہوگیا تھا۔ تم نے اسے کوئی انجکشن دیا ہوگا جس سے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ کیا کرنا چاہتے ہو تم لوگ آخر اس کے ساتھ۔ اگر اسے کچھ ہوا..... میں نے کہا کہ ابھی تک تو وہ محفوظ ہے مگر اس نے میری بات نہ مانی تو شاہ عالم کو۔ نقصان پہنچ جائے گا اور اس کی ذمے دار وہ خود ہوگی۔ پھر میں نے اسے بتا دیا کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ وہ خود فون کرکے اس سے بات کرسکتی ہے اور پوچھ سکتی ہے کہ چوبیس گھنٹے اس نے کہاں گزارے تھے۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ شوہر کی بات پر بھی یقین نہ کرے اور خود ہانگ کانگ چلی جائے یا اپنے کسی جاسوس سے معلوم کرائے کہ شاہ عالم جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ اور یہ فیصلہ بھی وہ خود کرسکتی ہے کہ اسے اپنے شوہر سے کیا پوچھنا چاہیے اور کیا نہیں۔ مثلاً اسے یہ سوال کرنا چاہیے یا نہیں کہ تم ہانگ کانگ میں تھے تو پھر میرے ساتھ کیسے تھے۔ تم بیک وقت دو جگہ نہیں ہوسکتے۔ تم اسے جھوٹا اور دھوکے باز سمجھو کہ وہ راتوں رات آیا اور واپس ہانگ کانگ پہنچ گیا۔ آنے جانے میں وقت بھی کتنا لگتا ہے اور جب کسی کا پہلے سے اس قسم کا منصوبہ ہو تو وہ فرضی نام سے ریٹرن ٹکٹ بھی حاصل کرلیتا ہے اور سیٹ بھی اور یہ سارا انتظام شاہ عالم جیسے شخص کے لیے کیا مشکل ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاہ عالم تمہیں پاگل سمجھے مگر فلم دیکھنے کے بعد وہ سمجھ جائے گا کہ تم پاگل نہیں ہو۔"

میں نے کہا "پھر..... کیا اس نے شاہ عالم کو فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ اس نے فون کیا اور خاصی جرح کی۔ شاہ عالم کی ازدواجی زندگی پہلے بھی خوش گوار نہیں سمجھی جاسکتی تھی۔ رخشندہ اس کی غیر سیاسی مصروفیات کے بارے میں سب جانتی ہے اور شاہ عالم سے اس کا جھگڑا ہی اس مسئلے پر رہتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم نے میرے پیروں میں نکاح کی زنجیر ڈال دی ہے اور بیوی بنا کے مجھے اپنے گھر میں قید کردیا ہے۔ یہ شادی دنیا کو دکھانے کے لیے ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو اور تمہارا ایک گھر اور خاندان بھی ہے۔"

"وہ شاہ عالم کو چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟"

"وہ تو کمبل کو چھوڑتی ہے' کمبل اسے نہیں چھوڑتا" تیمور بولا "شاہ عالم کا سیاسی امیج خراب ہوتا ہے طلاق یا بیوی کی علیحدگی سے۔ اس نے رخشندہ کو صاف بتا دیا ہے کہ وہ صرف مر کے الگ ہوسکتی ہے۔"

"جیسے پرانے وقتوں کے لوگ کہتے تھے کہ شوہر کے گھر میں بیوی کی ڈولی آتی ہے اور پھر وہاں سے اس کا جنازہ ہی جاتا ہے۔"

"اگر شاہ عالم سیاست داں نہ ہوتا' تمہارے جیسا دولت مند کاروباری آدمی ہوتا تو روز ایک بیوی کو طلاق دیتا اور دوسری کو گھر لاتا مگر وہ اس قسم کا اسکینڈل اور بدنامی افورڈ نہیں کرسکتا۔ رخشندہ اس سے بہت ڈرتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ شاہ عالم کتنا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے غیظ و غضب کا نشانہ اکیلی وہ نہیں ہوگی۔ اس کے ماں باپ' بہن بھائی سب مشکل میں پڑجائیں گے۔ شاہ عالم کی غنڈا فورس ان سب کا جینا عذاب کردے گی۔"

"اس غنڈا فورس کے کمانڈر تم ہو۔ جو فاتح عالم فورس کہلاتی ہے اور جس کا ہر رکن فاتح۔"

"ہر سیاسی جماعت کے پاس نوجوانوں کی ایسی تنظیم ہوتی ہے... خیر چھوڑو یہ بات۔ شاہ عالم نے رخشندہ کو مطمئن کردیا ہے۔ عام حالات میں وہ اس کو گالیاں دیتا کہ الو کی پٹھی' تو کون ہوتی ہے مجھ سے پوچھنے والی کہ میں کہاں تھا اور کہاں نہیں تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ رخشندہ یہ پوچھے گی۔ اس نے رخشندہ کو بہت سے حوالے فراہم کردیے کہ فلاں سے پوچھ لو' فلاں سے معلوم کرلو۔"

"اس نے کہا نہیں کہ تمہیں تو میں خود ائرپورٹ پر ریسیو کرچکی ہوں۔"

"نہیں۔ اگر وہ ایسی بات کہتی تو شاہ عالم کہتا کہ مجھے ریسیو کرنے کے بعد تم مجھے کہاں لے گئی تھیں' اپنے ساتھ' اپنے گھر' اس کا اگلا سوال ہوتا کہ تم نے مجھے اپنے بیڈ روم میں بھی سلایا ہوگا۔"

"تیمور۔ آخر وہ کراچی ائرپورٹ کیسے پہنچ گئی تھی مجھے لینے کے لیے۔ اس کو معلوم تھا کہ میں واپس آرہا ہوں۔ یہ بھی معلوم تھا کہ کس فلائٹ سے۔ پھر اس نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔"

"یہ میرے لیے بھی حیرانی کی بات تھی۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا مگر وہ بگڑ گئی کہ اپنے شوہر کے آنے کی خبر مجھے نہیں ہوگی تو کیا تمہاری بیوی کو ہوگی۔ میرے بھی ذرائع ہیں۔ آخر شاہ عالم کی بیوی ہوں میں۔ ضرور کہیں نہ کہیں سے یہ انفارمیشن لیک کرگئی۔ ہماری بات کسی نے سن لی۔ اور اس کو بتا دی۔ یا کسی نے دیکھ لیا۔"

"دیکھا تو بہت سے لوگوں نے تھا۔ ہانگ کانگ ائرپورٹ پر۔ جہاز میں اور پھر کراچی میں۔ تم ان سب کو کیسے جھٹلاؤ گے۔"

"سچ وہی ہوگا جو شاہ عالم کل یا پرسوں اپنی پریس کانفرنس میں بتائے گا۔ اول تو کوئی یہ سوال نہیں کرے گا اور کیا تو وہ کہہ دے گا کہ مجھے کیا معلوم آپ نے کس کو شاہ عالم سمجھ لیا تھا۔"

"مگر پاسپورٹ اور ٹکٹ....."

تیمور نے کہا "یہی اس کا اصل پوائنٹ ہوگا کہ جب وہ ہانگ کانگ میں تھا تو اس کی سیاسی ساکھ ختم کرنے کے لیے جعلسازی کی گئی۔ کسی نے شاہ عالم بن کے اس کے نام سے سفر کیا۔ پھر یہاں عمر دراز کا قتل ہوا تو ایف آئی آر شاہ عالم کے خلاف کاٹ دی گئی۔ میں ہانگ کانگ میں تھا اور کس وقت کس کے ساتھ تھا۔ کہاں تھا اور کیا کررہا تھا۔ اس کے گواہ بہت ہیں اور وہ گواہ انتہائی معزز اور معتبر ہیں۔"

میں نے کہا "رخشندہ بھی سمجھ تو گئی ہوگی کہ یہ جعلسازی تھی۔"

"نہیں۔ ایک عورت کے ذہن میں ڈپلی کیٹ کی بات نہیں آسکتی۔ وہ کیسے مان سکتی ہے کہ اس حد تک مشابہت عملی زندگی میں بھی ممکن ہے جو فلمی کہانیوں کی بنیاد ہوتی ہے۔ وہ سمجھے گی کہ شاہ عالم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔ وہ خود آیا اور ایک ڈراما کرکے واپس چلا گیا۔ اس کے آنے کا اصل مقصد عمر دراز کو قتل کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے پکا بندوبست بھی کیا کہ اس کی ہانگ کانگ میں موجودگی ثابت ہو۔ اس میں شک کی گنجائش بھی نہ ہو۔ عمر دراز مارا گیا اور قتل کا الزام شاہ عالم پر عائد کرنے والے بھی مارے گئے کہ انہوں نے سیاسی دشمنی کے چکر میں اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ جو سچ ثابت نہ ہو وہ جھوٹ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا پوسٹ مارٹم کی رپورٹ مل گئی ہے؟"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کیا ہوگا۔ مجھ سے پوچھ لو" تیمور مسکرا دیا۔

"یہی ہوگا کہ موت فلاں زہر سے واقع ہوئی۔"

وہ ہنسا "جاؤ ہم ایسے اناڑی مداری نہیں ہیں۔ دنیا میں ایسے زہر بہت ہیں جن سے موت تو واقع ہوجائے مگر علامات بالکل ہارٹ اٹیک کی ہوتی ہیں اور ان کا جسم میں سراغ بھی نہیں ملتا جو ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کرتے ہیں وہ موت کا سبب ہارٹ فیل ہونا کہتے ہیں۔ دل کا شدید دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون" وہ ہنس پڑا۔

میں نے کہا "ایسا کیا تمہارے ساتھ نہیں ہوسکتا۔"

"سب کے ساتھ ہوسکتا ہے" اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"پھر یہ قتل کی ایف آئی آر کیسے لکھی گئی؟"

"یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھے بغیر درج کرادی گئی تھی۔ اور ایس ایچ او کو لکھنی پڑی۔ اچانک مشتعل ہجوم اور سیاسی لیڈر تھانے میں داخل ہوکے یہ مطالبہ کریں تو اکیلا تھانے دار کیا کرسکتا ہے۔ وہ لاٹھی چارج کرائے یا فائرنگ سے انہیں منتشر نہیں کرسکتا۔ وہ تھانے کا حشر نشر کردیتے۔ جب یہ رپورٹ سامنے آئے گی تو ادھر نے شاہ عالم کے حامی شور مچائیں گے۔ جواب میں وہ دھاندلی کا الزام عائد کریں گے۔ دوسرا میڈیکل بورڈ بنانے کے لیے شور مچائیں گے اور امید ہے کہ اپنی مرضی کی رپورٹ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوجائیں گے۔ ابھی تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا کہ رپورٹ میں موت کی وجہ زہر کے سوا بھی کچھ ہوسکتی ہے۔ دوسری دفعہ وہ ڈاکٹروں کو خبردار کردیں گے۔ اپنی اور بیوی بچوں کی خیریت چاہتے ہو تو رپورٹ ہماری مرضی کی دو۔ بیوی بچے سب کی کمزوری ہوتے ہیں۔ اس دھمکی کے سامنے ایمانداری' فرض شناسی' اصول پرستی سب دھری رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت بھی عمر دراز کی پشت پناہی کررہی تھی۔ قتل ثابت ہونے سے شاہ عالم پر الزام نہ آئے یہ الگ بات ہے۔ پارٹی کو نقصان

ور ہو گا۔ مگر اتنا نہیں جتنا عمر دراز پہنچانے والا تھا۔ بات سمجھ میں آگئی ہو تو ہم چلیں؟"

میں نے کہا "ضرور چلو۔ مگر ادھر تم کہاں جا رہے تھے؟"

"میں اپنے سسرال منتقل ہو گیا تھا۔ عارضی طور پر۔"

"فی الحال کتنے سسرال ہیں تمہارے؟" میں نے کہا۔

"صرف دو۔ نمبر دو زیادہ محفوظ ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "تمہاری پہلی بیوی اس وقت کی یادگار ہو گی جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔"

"یادگار بھی نہیں وہ آثارِ قدیمہ ہے۔ میرے پہلے چھ بچوں کی ماں۔ ریلوے کے ایک ریٹائرڈ کلرک کی بیٹی' جاہل وہ پہلے ہی تھی۔ اب بدصورت بھی ہے۔"

میں نے کہا "اور دوسری ہو گی تمہارے شایانِ شان۔ جیسی شاندار اور خوب صورت کوٹھی یا کار۔ ویسی ہی ایک سوشل وائف۔ جو تمہارے لیے ایک STATUS SYMBOL ہو گی۔"

"اس کے بغیر گزارا نہیں پبلک لائف میں۔" اس نے جھینپ کے کہا۔

"ہر مشہور شخص کی زندگی کا ہر لمحہ پبلک پراپرٹی بن جاتا ہے۔ اس کے ذاتی استعمال کی ہر چیز کو اشتہار میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جہانگیر خاں فلاں جوتے پہنتا ہے۔ آپ بھی پہنئے' وسیم اکرم فلاں کولڈ ڈرنک پیتا ہے' آپ بھی پیجئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ فلاں سپراسٹار فلاں کی بیوی کے ساتھ پھرتا ہے' آپ بھی پھریے یا فلاں اپنی بیوی سے مار کھاتا ہے' آپ بھی کھایئے۔ خیر یہ بتاؤ کہ تمہاری اوریجنل اولین وضع دار اور وفادار بیوی آج بھی تم سے محبت کرتی ہے۔"

اس نے شرمندگی اور افسوس سے سر ہلایا "ہاں۔"

میں نے کہا "تم مجھے اپنے سسرال مت لے جاؤ۔ مجھے پہلے اپنے گھر جانا ہے۔"

"اور اس کے بعد؟"

"مجھے سوچنا پڑے گا کہ اپنی حفاظت کے لیے کیا کروں؟" میں نے کہا "ابھی تک اللہ نے مجھے بچایا۔ آگے بھی وہی بچائے گا مگر یہاں کسی نے مجھے پہچان لیا تو اصل شاہ عالم بعد میں آئے گا۔ مشتعل کارکن پہلے میری تکا بوٹی کر دیں گے اور میرے ساتھ تمہاری بھی۔"

تیمور کی گاڑی ائرکنڈیشنڈ تھی اور اس کے شیشے بھی سیاہ تھے چنانچہ ہماری صورت باہر سے نظر نہیں آسکتی تھی مگر ہم باہر کے سارے مناظر دیکھتے آئے تھے۔ کئی جگہ نوجوان احتجاج کے بہانے ٹائر جلانے کا شغل کر رہے تھے اور اس تفریح سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ سڑکیں بلاک کرنے کے بعد درمیان میں کرسی رکھ کر کرکٹ بھی کھیل رہے تھے۔ بیشتر دکانیں بند ہو گئی تھیں یا کرا دی گئی تھیں۔ جلسے میں جانے والے اب ٹولیوں کی شکل میں سڑکوں پر گھوم رہے تھے یا گلی محلے میں جمع ہو کے سیاسی بدمعاشی پر اپنے اپنے زریں خیالات کا اظہار فرما رہے تھے۔ شہر کی فضا میں سخت کشیدگی تھی جسے پولیس اور فوج کے گشت سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بروقت حفاظتی اقدامات سے ہنگامے پھیلنے نہیں پائے تھے اور مجموعی صورتِ حال کنٹرول میں نظر آتی تھی۔

تیمور کا ارادہ اپنی گاڑی میں ہی بیٹھے رہنے کا تھا مگر میں نے اسے اُتر کے اندر آنے پر مجبور کر دیا۔ "تمہیں اتنی جلدی کیا ہے۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا تمہارا یا میرا سراغ لگانے" میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

"اگر پریس ریلیز کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں گھر سے بھی نہ نکلتا۔"

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے تیمور کہ صرف ایک پریس ریلیز دینے کے لیے کسی پارٹی کا سینئر نائب صدر خود تھانے جائے اور اس تھانے میں جہاں اس کے خلاف ایف آئی آر لکھوائی گئی ہو۔ تمہارے مرتبے کے لیڈر صرف بیان جاری کرتے ہیں یا ڈی آئی جی وغیرہ سے مل کر صورتِ حال کی وضاحت کر دیتے ہیں۔"

اس نے کہا "یہ ٹھیک ہے... مگر اس وقت پارٹی آفس میں کوئی نہیں' سب روپوش ہیں ڈر سے۔"

"پارٹی کا مرکزی دفتر پولیس اور فوج کی حفاظت میں ہے۔"

"وہ... دراصل... مجھے ایک نقل لینی تھی ایف آئی آر کی۔ اور ایک جوابی ایف آئی آر بھی درج کرانی تھی۔"

"مقتول کے خلاف؟"

"اس کے کچھ کارکنوں کے خلاف... مگر ایس ایچ او خبیث سامنے نہیں آیا۔ وہ اندر چھپ گیا اور اس کے ماتحت نے کہہ دیا کہ ان کا تو کچھ پتا نہیں۔ ماتحت نے معذرت کی کہ جنابِ عالی' میری نوکری خطرے میں مت ڈالیں۔ انچارج صاحب سے بات کریں۔ مجھے معلوم ہے اتنی آسانی سے ہماری رپورٹ نہیں لکھی جائے گی جتنی آسانی سے ہمارے خلاف درج کی گئی... میں سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے باہر چلا جاؤں۔ ورنہ کچھ بعید نہیں مجھے گرفتار کر لیا جائے خواہ مخواہ۔"

میں نے کہا "خواہ مخواہ۔ میرے سامنے تو ایسا مت کہو۔ باہر جانے والی بات بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں بلکہ... تم کو میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"میں... میرا ارادہ ملک سے باہر جانے کا تھا' آج رات۔"

میں نے کہا "میں بھی آج ہی جاؤں گا مگر ملک سے باہر نہیں' کراچی۔"

"کراچی کیوں؟"

"تم نے کہا تھا کہ شاہ عالم کل پرسوں کراچی میں پریس کانفرنس کرے گا۔ ہم اسے کراچی ائرپورٹ پر ریسیو کریں گے۔"

"آج میں نائٹ کوچ سے نکل جاتا تو کل لندن کی کوئی فلائٹ مل جاتی۔"

میں نے کہا "ہم نائٹ کوچ سے نہیں' بائی روڈ جائیں گے تیمور اور تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ مگر یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے ہم جائیں گے شاہ عالم کے گھر۔ اس جگہ کو پولیس اور فوج نے حفاظتی گھیرے میں لے رکھا ہو گا۔ میرا وہاں جانا کسی صورت مناسب نہیں۔ میں پہچان لیا جاؤں گا۔"

"پھر تم ایسی حماقت کیوں کر رہے ہو؟"

"میں چھپ کر جاؤں گا۔ فکر مت کرو۔ تمہاری پریس ریلیز کے جھوٹ کا راز فاش نہیں ہو گا۔" میں نے کہا "ہم اس گاڑی میں جائیں گے۔ تمہاری گاڑی کو پولیس افسران ضرور پہچانتے ہوں گے۔ اسے کوئی نہیں روکے گا اور نہ اس کی تلاشی لی جائے گی' رائٹ!"

"ایسی بات تھی تو' یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "ہم سے میری مراد ہم دونوں نہیں ہے۔ ان حالات میں میرا کہیں بھی اکیلا جانا ٹھیک نہیں۔ میرے ساتھ ایک محافظ ہو گا اور ایک ہو گی میری سیکریٹری۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا "تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے بٹھا دیا "ہاں تیمور۔ کرنل خان اور چندا بھی میرے ساتھ ہی رہیں گے... اور تم بھی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے غالباً خطرے کی بو محسوس کی۔

"جب ایسا ہو گا تو تم دیکھ لو گے" میں نے کہا "تم انکار نہیں کرو گے کیونکہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ ویسے بھی آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے جانا دوسرے کی مرضی سے۔"

اس نے میرے لہجے سے میری نیت کو بھانپ لیا۔ "تم... کیا کرنا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "تمہارا کھیل ختم ہو گیا تیمور۔ یہ میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔ اب میرا کھیل دیکھو۔ پہلے تم نے مجھے استعمال کیا تھا۔ اب میں تمہیں استعمال کروں گا۔ تم نے چالاکی اور عیاری سے کام لیا تھا۔ مجھے ضرورت پڑی تو میں طاقت بھی استعمال کروں گا۔ میں شاہ عالم ہوں اور تم میرے سینئر نائب صدر ہو۔ تمہیں تو میرا ساتھ دینا چاہیے۔"

"مگر تم... ناصر عظیم ہو..." وہ بولا۔

میں نے ہنس کے کہا "ارے نہیں تیمور۔ میں شاہ عالم ہوں۔ تم نے ہی مجھے شاہ عالم بنایا تھا۔ اب میں شاہ عالم بن گیا ہوں تو تم کہتے ہو کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اصل شاہ عالم بن جاؤں۔ کسی ڈپلی کیٹ کی مجھے کیا ضرورت ہے۔"

اس کا رنگ اڑ گیا۔ "کیا... کیا تم اسے... شاہ عالم کو..."

میں نے اقرار میں سر ہلایا "اصل شاہ عالم کو میں پہلے بھی جانتا تھا لیکن وہ ایک سرسری سی ملاقات تھی۔ وہ ایک نوسرباز تھا۔ یہ شاہ عالم ایک لیڈر ہے۔ قیادت کرنے والا۔ سیاسی قیادت کرنے والے شاہ عالم کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی پرائیویٹ اور پبلک لائف کے وہ سب پہلو بھی اب میرے سامنے آگئے ہیں جو میری نظر سے پوشیدہ تھے۔ جن کا علم انہیں بھی نہیں جو اسے اپنا لیڈر اپنا راہ نما اور قائد مانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ اصل شاہ عالم کا کردار بہتر طور پر ادا کر سکوں۔ اور یہ نیا شاہ عالم ویسا ہی ہو گا... جیسا ہونا چاہیے۔"

"اور جیسے تم ہو!" اس نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ جیسا میں ہوں اور میں کیا ہوں' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تم جعلی شاہ عالم..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "فرض کرو تیمور کہ ایک ہی نمبر کے ایک جیسے دو نوٹ ہوں۔ ایک اصلی دوسرا نقلی۔ اصلی پرانا' گندا اور خراب ہو۔ ناقابلِ قبول ہو اور نیا جعلی اور ایسا ہو کہ کسی ماہر کا باپ بھی فرق کا پتا نہ چلا سکے۔ تو میرا خیال ہے کہ اصل کو ضائع کر دینا چاہیے۔ اس وقت تمہارے سامنے دو شاہ عالم ہیں۔ ایک ہانگ کانگ میں ہے اور دوسرا تمہارے سامنے۔ تمہارے خیال میں کون سا اچھا ہے۔ ظاہر میں تو دونوں ایک ہیں۔ باطنی صفات اور کردار کے اعتبار سے کون سا شاہ عالم زیادہ موزوں اور قابلِ قبول ہے۔ اصلی یا نقلی۔ اگر اس ملک کا لیڈر بننا ہو تو مجھے بننا چاہیے یا شاہ عالم کو۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم مجھے نہیں جانتے ہو۔ بہت ریسرچ کی تھی تم نے مجھ پر۔"

اس نے تلخی سے کہا "میری بات چھوڑو۔ تم خود اپنے بارے میں کیا جانتے ہو۔ کچھ بھی نہیں۔ تمہاری ماں کون تھی۔ باپ کون تھا۔ رہی کردار کی بات تو کیا تمہارا ماضی تمہارے لیے باعثِ فخر ہے؟ تمہارا کردار اصل شاہ عالم سے اچھا تھا؟ قابلِ رشک سمجھا جا سکتا ہے؟"

"اگر تمہارا مقصد مجھے مشتعل کرنا تھا۔ تو اس میں تمہیں کامیابی نہیں ہو گی تیمور۔ حسب نسب کو اب کون پوچھتا ہے۔ اگر میرا باپ کوئی بھنگی تھا یا میری ماں کسی قلی کی بیٹی تھی تو میرے لیے بہت زیادہ فخر کی بات ہے اور میری کامیابی عظیم تر ہے ان کے مقابلے میں جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ شاہزادوں کی طرح پلے بڑھے "کانونٹ اور مشن کالج میں پڑھنے کے بعد ولایت چلے گئے اور واپس آئے تو ڈپٹی کمشنر ہو گئے۔ باپ کا بزنس سنبھال لیا یا جاگیر کے وارث بن گئے۔ کسی جدوجہد کے بغیر کامیابی ان کو ورثے میں مل گئی۔ رہی یہ بات کہ کیا آج میرا کردار شاہ عالم کے مقابلے میں قابلِ رشک ہے یا نہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے جیسے یا شاہ عالم جیسے لوگوں کے لیے ہونا چاہیے۔ تمہارے لیے تو عمر دراز کا کردار بھی قابلِ رشک تھا۔ تمہارا رشک بدل گیا حسد میں چنانچہ تم نے اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔"

"جیسے تم شاہ عالم کو ہٹا رہے ہو۔"

"سیاست کبھی میرا پیشہ نہیں تھا۔ تم نے مجھے اس دلدل میں کھینچا اور اب میں پھنس گیا ہوں تو مجھے خود بھی ڈوبنا منظور نہیں۔ میں کسی اور کو بھی ڈوبتا نہیں دیکھ سکتا۔ اگر مجھے اپنے اطراف گندگی نظر آتی ہے تو میں اپنی آنکھیں بند کر کے نہیں گزر سکتا اور نفرت سے ناک سکیڑ کے دوسری طرف منہ نہیں کر سکتا۔ میں اس گندگی کو صاف کروں گا۔"

"یہ تم کتابی باتیں کر رہے ہو....."

"ہاں۔ میں نے جو بھی سیکھا ہے کتابوں سے سیکھا ہے۔ کتابیں سب سے اچھی دوست اور رہنما ہوتی ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے زندگی کا سبق کتابوں سے لیا۔ ان میں کتاب مقدس بھی شامل ہے۔ مجھے نیکی بدی کا فرق کتابوں نے سمجھایا۔ شاہ عالم کے پاس سب کچھ ہے مگر یہی اخلاق اور انسانیت کا درس اس نے نہیں پڑھا۔ وہ کسی کی کیا راہنمائی کر سکتا ہے جو خود اندھا ہو۔ اور اسی لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس کی جگہ میں لے لوں۔ اس کے تمام حوالوں کے ساتھ۔ میں اسے بھی جانتا ہوں اور اپنے آپ کو بھی۔"

"چنانچہ فیصلہ صرف تم کر سکتے ہو کہ اسے نہیں رہنا چاہیے اور تمہیں رہنا چاہیے" وہ بولا "یہی ہے وہ اخلاق اور انسانیت کا درس۔"

میں نے کہا "یہ میری مجبوری بھی ہے تیمور۔ اگر میں ایسا نہیں کروں گا تو تم مجھے جینے دو گے؟ جس طرح تم نے مجھے ٹریپ کیا اور اب بلیک میل کر رہے ہو۔ جیسے تم نے مجھے باتوں کے اور سازش کے جال میں الجھایا اور مجھ سے وہ سب کرا دیا جو میں کبھی نہ کرتا۔ اگر مجھے اختیار حاصل ہوتا۔ مگر وہ تمہارا منصوبہ اور تمہارا فیصلہ تھا۔ میری زندگی کے بارے میں' میری زندگی کوئی لاوارث مکان نہیں تھی جس پر تم غاصبانہ قبضہ کر کے اپنا گھر آباد کر لو۔ کار نہیں تھی کہ تم چرا کے گھومو پھرو۔ اس میں کسی کو اغوا کرو یا ڈکیتی کی واردات کرو اور پھر کہیں بھی چھوڑ کے چلے جاؤ۔ تمہارا مال نہیں تھی کہ جیسے چاہو خرچ کرو۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور یہ زندگی صرف میری ہے۔ تم نے اسے غلط استعمال کرنے کی طاقت حاصل کر لی ہے۔ اب یہ بقا کی جنگ ہے۔ میں نے تمہیں تباہ اور ختم نہ کیا تو تم مجھے تباہ اور ختم کر دو گے۔ مجھے شاہ عالم بن کے سیاست کی دکان چلانے کا شوق نہیں ہے اور نہ یہ خوش فہمی کہ شاہ عالم بن کر میں خلق خدا کی بہتر خدمت کر سکوں گا۔ یہ بات ہے توفیق کی۔ خدا نے توفیق دی تو یہ بھی ہو گا مگر ابھی تو مسئلہ ہے میری زندگی کا۔ یا شاہ عالم زندہ رہ سکتا ہے یا میں۔ اگر میں نے اسے ختم نہ کیا تو وہ جب تک چاہے گا مجھے اپنے مذموم مقاصد کے لیے بلیک میل کرے گا اور جس دن محسوس کرے گا کہ اب میں بے مصرف یا خطرناک ہو گیا ہوں۔ اس دن مجھے اسی طرح ٹھکانے لگا دے گا جیسے قاتل کسی آلۂ قتل کو ٹھکانے لگاتا ہے۔"

تیمور کی حالت غیر ہو رہی تھی "تم۔ اسے مار دو گے..... قتل کر دو گے؟"

"آج ہی میں نے عمر دراز کو قتل کیا ہے' تمہارے لیے۔ ایک قتل اپنے لیے کر دوں گا تو دنیا کو کیا فرق پڑے گا۔ دنیا کو پتا بھی نہیں چلے گا تیمور کہ اس کی آبادی میں ایک فرد کم ہو گیا ہے۔"

"تم..... مجھے بھی..... مجھے تو نہیں مار دو گے نا" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اس کا فیصلہ خود تمہیں کرنا ہے۔ تمہارے پاس بھی یہی ایک زندگی ہے۔ تم کل اور اس کے بعد بھی' جب تک تمہارا وقت پورا نہیں ہو جاتا۔ ایسے ہی جی سکتے ہو۔ مجھ سے اسی طرح وفادار رہتے ہوئے جیسے تم شاہ عالم کے وفادار تھے۔ تم اس پوزیشن میں نہیں رہو گے کہ انکار کر سکو یا بغاوت کرو۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو میرے اور تمہارے درمیان زندگی اور موت کی سرحد بن کے موجود رہے گا۔ یہ سرحد نہ نظر آتی ہے نہ محسوس ہوتی ہے اور یہ ایک دن کی بات ہے یا دو دن کی۔ چوبیس گھنٹے سے اڑتالیس گھنٹے تک تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ اس کے بعد ایک ہی شاہ عالم رہ جائے گا..... میں....."

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ اس کا ذہن غالباً مزاحمت ترک کر کے مفاہمت اختیار کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول

قیمت 250
محصول ڈاک 30

ہزار داستان

کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں

